یعنی

حضرت سید احمد شہیدؒ کی جماعتِ مجاہدین نے
ایک سو سال میں اسلام کے احیاء، اسلامی حکومت
کی بحالی اور ملک کی آزادی کے لیے جو
جہاد کیے، اُن کی مفصل سرگزشت

غلام رسول مہر

کتاب منزل لاہور

سیّد احمد شہید کے سلسلے کی چوتھی اور آخری کتاب

۱۸۳۱ء سے زمانہ حال تک جماعتِ مجاہدین کے حیات افروز کارنامے

غلام رسول مہر

کتاب منزل لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ می خواہی، ز خاکی بیش ازاں خواہی

چناں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا
شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی

اقبالؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدّمہ

چگونہ مے بہ میاں آورم دریں مجلس
کہ بادہ حوصلہ سوز است و جملہ بدمستاند

سیّد احمد شہید کے سلسلے کی یہ تیسری اور آخری کتاب ہے۔ اس پر وہ سفر اختتام کو پہنچا، جس کے لیے سروسامان اور تگ و تاز میں میری زندگی کے کم و بیش بیس سال صرف ہوئے :

در شمار ار چہ نیاورد کسے حافظ را
شکر کاں محنتِ بے حد و شمار آخر شد

اسلامی ہند کی تاریخ کا یہ باب آج تک کسی بھی شکل اور کسی بھی زبان میں نظم و ترتیب نہ پاسکا۔ بے شک اس کے متفرّق پہلو مختلف صورتوں میں وقتاً فوقتاً پیش ہوتے رہے، لیکن ان کی حیثیت ایسی تھی، جیسے کسی طویل اور مسلسل داستان میں سے کوئی ورق کہیں سے اٹھالیا اور کوئی کہیں سے۔ نہ پیش کرنے والے کو یہ اندازہ تھا کہ اس کا سیاق و سباق کیا ہے، نہ پڑھنے والے پر یہ حقیقت واضح ہوسکتی تھی کہ یہ ایک منظّم و محکم سلسلۂ مجاہدات کی کڑیاں تھیں، جن کی وضع و ساخت میں فداکارانِ اسلامیت و آزادی کا بیش بہا خونِ حیات پوری ایک صدی تک بے دریغ صرف ہوتا رہا۔ ایسے ہی مجاہدات قوموں اور مُلکوں کے لیے سربلندی کا سرمایہ، ارجمندی کا زینہ اور زندگی کا حاصل تسلیم کیے جاتے ہیں :

رہِ غیرت خطرناک است، پہنایش تماشا کن
دراں وادی کہ عشق اوست تن با سر نمی سازد

اس حیات افروز داستان کے اوراق ایک سو سال کی مدت میں اس درجہ منتشر ہو چکے تھے کہ ان کی فراہمی اور شیرازہ بندی اہلِ قلم کے ایک بڑے گروہ کی اجتماعی سعی و ہمت کے بغیر بروے کار نہ آسکتی تھی۔ چہ جائیکہ مجھ ایسا فرومایہ علم و عمل اتنے بڑے کام کے سرانجام کا ذمّہ تنہا اٹھا لیتا۔ سیّد صاحب اور ان کی جماعت کو جن ناسازگار حالات سے سابقہ پڑا، ان کی تفصیل بڑی ہی دردناک اور الم انگیز ہے۔ ایک طرف سکھ اور انگریز تھے، جن کے سیاسی مقاصد کا تقاضا یہ ہوا کہ اس حقانی جماعت کے اصلی کارنامے منظرِ عام پر نہ آنے دیں یا ان کے گرد و پیش غلط بیانیوں کے سیاہ اور دبیز پردے اس پیمانے پر تان دیں کہ کسی کو حقیقت تک پہنچنے کا خیال ہی نہ آسکے۔ دوسری طرف مقامی رؤسا و خوانین تھے، جن کی انفرادی غرض مندیاں اور کام جوئیاں ان پاک نفس مجاہدین کو زیادہ سے زیادہ رسوا کرنے میں سرگرمِ عمل رہیں سب سے آخر میں مدعیانِ شریعت و طریقت کا مقدّس گروہ تھا، جو مذہبی نقطۂ نگاہ سے اس جماعت پر مسلسل عتاب و غضب کی بجلیاں گراتا رہا۔ ان میں سے بعض اصحاب نیک نیّت بھی ہوں گے، تاہم وہ غلط فہمی کا شکار ہوئے اور ان کی دانش و بصیرت نے پے در پے ٹھوکریں کھائیں۔ بعض کی تمام مخالفانہ سرگرمیوں میں اغیار کی تحریک و انگیخت کے شواہد یکسر آشکارا نظر آتے ہیں۔ خود سیّد صاحب کے ارادت مندوں نے زیادہ سے زیادہ حالات قلم بند کر لینے کا پورا اہتمام کیا، لیکن انھیں چھپائے رکھنے کے اہتمام میں بھی کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ مدت گزر جانے کے بعد وہ قلمی دفاتر یک جا محفوظ نہ رہ سکے اور کسی کو یہ بھی خبر نہ رہی کہ بکھر بکھر کر کہاں کہاں پہنچے۔ معاملہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حالات جس انداز میں لکھے گئے تھے،

وہ پُرانا تھا اور ہمارے زمانے کے لیے اسے کسی بھی درجے میں سازگار نہ سمجھا جا سکتا تھا۔
غرض ہماری ملّی غیرت اور اسلامی حمیّت کی اس سب سے زیادہ پُرتاثیر داستان کے گُم ہو جانے میں کوئی بھی کسر باقی نہ رہی تھی، تاہم اسے سیّد صاحب اور ان کی جماعت کے خلوص کا زندہ اعجاز سمجھنا چاہیے کہ اس عاجز کو یہ داستان تفصیلاً مرتّب کر دینے کی توفیق ارزانی ہوئی۔ کیا عجب ہے کہ یہی ناچیز خدمت محاسبۂ اعمال کے وقت مغفرت کا وسیلہ اور عفو و کرم کی دستاویز بن جائے:

امید ہست کہ بیگانگیِ عُرفی را
بہ دوستیِ سخن ہائے آشنا بخشند

اس طویل سلسلے سے جو اَب تقریباً دو ہزار صفحات پر پھیل گیا ہے، محض داستان سرائی مقصود نہ تھی بلکہ چند نہایت اہم حقائق و مقاصد پیشِ نظر تھے، جن کا اجمالی نقشہ یہ ہے:

۱۔ ہم جس عہد کو دورِ زوال سے تعبیر کرتے ہیں، وہ ناکامیوں اور مایوسیوں کی شبِ تاریک ہی نہ تھی، اس میں سربلندی کے لیے جانبازی اور ارجمندی کے لیے سرفروشی کی درخشاں کرنیں بھی جلوہ گر ہوتی رہیں، جن کی ضیا گستری عہدِ عروج کی شوکت آرائیوں کو بھی پیغامِ خجالت دے رہی تھی۔ افسوس کہ جو آنکھیں تاریکی کی شدّت میں بصیرت کی دولت ضائع کر چکی تھیں، وہ روشنی کی ان کرنوں سے بہرہ اندوز نہ ہو سکیں۔ ان میں بلند ترین درجہ سیّد احمد شہید کی تحریک کو حاصل تھا، جو خالص اسلامی مقاصد کے لیے خالص اسلامی بنیادوں پر اپنی نوعیّت کی ایک ہی تحریک تھی۔ ضروری تھا کہ اس تحریک کی سرگزشت مرتّب ہو جاتی۔ اس کے بغیر ہماری تاریخ مکمّل نہ سمجھی جا سکتی تھی۔

۲ ۔ عام تاثر یہ ہے کہ ہم نے حکم و فرماں فرمائی سے محرومی کے بعد اس سرزمین کی آزادی اور یہاں اسلامیّت کی بحالی کے لیے کچھ بھی نہ کیا - برادرانِ وطن نے گزشتہ دس بیس سال میں جہادِ آزادی کے متعلق جو کتابیں مرتّب کیں، ان میں عموماً غیر مسلم اکثریت ہی کی سرگرمیوں کو نمایاں کیا گیا - اس وجہ سے یہ خیال تقویت پکڑ گیا کہ مسلمان ایک مرتبہ پستی میں گرے تو پھر نہ اٹھ سکے - حکمرانی کے ساتھ ہمّت و غیرت کی متاع بھی کھو بیٹھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وسیع ملک کی آزادی کے لیے جو سرفروشانہ کارنامے مسلمانوں نے انجام دیے، ان کی نظیر کوئی دوسری قوم پیش نہیں کر سکتی اور مسلمانوں کی قربانیوں کے مقابلے میں دوسری قوموں کی قربانیاں سمندر میں چند چلّوؤں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں، لیکن اسے کیا کہا جائے کہ اسلامی قربانیوں کی سرگزشت معرضِ ترتیب ہی میں نہ آسکی اور جہادِ آزادیِ وطن کا یہ پورا باب گم ہو کر رہ گیا - میں نے یہ باب مستند تاریخی شواہد کی بنا پر مرتّب کر دیا ہے تاکہ مسلمانوں کا درجۂ ایثار و سرفروشی سب پر آشکارا ہو جائے - مقصود مقابلہ نہیں، یہ ہے کہ اس طویل جہاد کا گوشہ گوشہ سامنے آجائے ورنہ ظاہر ہے کہ اعلیٰ مقاصد کے لیے قربانیاں مشترکہ دولت ہوتی ہیں، خواہ ان کا مصدر و منشاء کوئی گروہ اور کوئی قوم ہو اور ان پر سب کو یکساں فخر و مباہات کا حق حاصل ہوتا ہے۔

۳ ۔ پھر سیّد صاحب کی تحریک کے سلسلے میں دو اور پہلو بھی غور طلب تھے:
اوّل یہ کہ مسلمانوں کی اس جماعت نے اسلامیّت و آزادی کے لیے جہاد اس وقت شروع کیا، جب یہاں کے اکثر گروہوں پر فی الجملہ افسردگی و

بے حسی طاری تھی - ان کے درمیان حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہنگامۂ مسابقت بپا تھا - یہاں تک کہ جہاد کی عزت و حرمت کے اندازہ شناس بھی بہت کم لوگ تھے - اکثر اس کے نام ہی سے ہراساں و گریزاں تھے - دوم اس جماعت کا مقصد و مدعا حصولِ آزادی کے سوا کچھ نہ تھا اور وہ اس کے لیے کسی مادی معاوضے یا دنیوی منفعت کے کبھی طلب گار نہ ہوئے - وہ پورے سوا سو سال تک بے پروایانہ اور بے دریغ اپنی جانیں اور مال اس راہ میں قربان کرتے رہے اور ان کے دل ایک کلمۂ تحسین کی آرزو سے بھی کبھی ملوث نہ ہوئے - ان کی قربانیوں کے مقابلے میں وہ اعمال و حرکات کیونکر لائے جا سکتے ہیں، جن کے ساتھ اخباروں کے نفس پرور مقالے، پھولوں کے ہار، جلسوں اور جلوسوں کے ہمہمے، شہرت طلبی کے ولولے اور گوناگوں مادی معاوضوں کے ہنگامے وابستہ تھے - بےنفسی اور للّٰہیت کی یہ داستان ان لوگوں کی بلند اسلامیت کا کرشمہ تھی اور اس میں ہم سب کے لیے بصیرت و موعظت کا نہایت قیمتی سرمایہ موجود ہے ۔

۴ - اس داستان کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اسے ہمارے حالات سے خاص مناسبت تھی - سید شہید نے جب دعوتِ اصلاح و جہاد کا علَم بلند کیا تھا تو ملک کی عام کیفیت بعد کے دَور سے یقیناً قدرے متفاوت تھی - تاہم ان کی بے سروسامانی ہماری بے سروسامانی سے مختلف نہ تھی - بہ ایں ہمہ وہ اللہ کا نام لے کر اٹھے اور عزیمت و استقامت کے اعجاز سے وہ تحریک پیدا کر دی، جس کی آگ کے شعلوں نے پچیس سال تک سکھوں کو اور ایک سو سال تک برطانیہ جیسی قاہر قوت کو

مسلسل آتش زیرِ پا رکھا۔ ہمارے لیے اس سرگزشت سے استفادہ کی صورت بجز اس کے کیا تھی کہ یہ مرتب صورت میں ہمارے سامنے آجاتی۔

یہ مقدس بزرگ پاک و ہند کے ایک دور افتادہ گوشے میں اپنے خونِ حیات سے مراد کے نقش بٹھاتے اور روشن مستقبل کے خط و خال سنوارتے رہے۔ آج کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان کے دلوں میں کیسے کیسے ولولے موج زن تھے اور دماغوں میں کیا کیا انتظامی نقشے بسے ہوئے تھے۔ جن کی زندگیوں کا ہر سانس ادائے فرض اور رضائے حق کے لیے وقف رہا، ان کی عظمت کا اندازہ ہم لوگ نہیں کر سکتے، جو فرض اور رضا کے صحیح مفہوم سے بھی یکسر ناآشنا ہیں۔ وہ پیشِ نظر مقاصد کے لیے جانفشانیوں کی شیفتگی میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے:

مشتِ خاشاکِ نظیریؔ شعلۂ کر دو نشست
باد شمعِ انجمن را تا بہ پایاں زیستن

کیا ہمارا داعیۂ حق شناسی اس امر کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا کہ ان کی یاد بر طرز شایاں تازہ رکھی جائے؟

میں نے اس اہم کام کا ذمہ اٹھایا تھا تو خواب و خیال بھی نہ تھا کہ اس کے سرانجام میں مہلتِ حیات کی اتنی لمبی مدت صرف ہو جائے گی۔ اب دیکھتا ہوں تو قلب کی یہ کیفیت ہے گویا کل رختِ سفر باندھا تھا اور آج منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ بے شک محنت بڑی ہی دلگیر اور مشقت بہ درجۂ غایت صبر آزما تھی، تاہم اس کی حلاوت و دل پذیری کا یہ عالم تھا کہ ذوق و وجدان اب تک اسی لذت و سرور کی موجوں میں ڈوبے ہوئے ہیں:

رفتیم بسر زود دریں محفلِ رنداں
ساقی مئے تندے بہ ایاغِ دلِ ما ریخت

جو کچھ میں نے لکھا ہے، مجھے پورا احساس ہے کہ یہ حرفِ آخر نہیں اور انسان کی

کون سی کوشش کسی کام میں حرفِ آخر سمجھی جا سکتی ہے؟ ابتدائی ادوار کی سرگزشت میں بھی بعض خلا محسوس ہوتے ہیں، جنھیں میں پُر نہ کر سکا اور آخری دَور کے توسیکڑوں افراد و رجال ہیں، جن میں سے اکثر کے نام بھی معلوم نہ ہو سکے اور بعض کے نام معلوم ہوئے تو حالات نہ مل سکے۔ تاہم ایک خاکہ تیّار ہو گیا ہے، جس کا ہر حصّہ تاریخی شواہد پر مبنی ہے۔ یہ خاکہ اربابِ ذوق کے لیے مزید تحقیق میں مشعلِ راہ کا کام دے گا۔ جن اصحاب سے امداد ملتی رہی، ان کے اسمائے گرامی حواشی کتاب میں جا بجا درج ہیں خاص شُکریّے کے مستحق مولانا محمد اسمٰعیل (جماعت اہلِ حدیث کے ناظمِ اعلیٰ) ہیں، جن کی محبّانہ اعانت آخری دَور کے سوانح کی ترتیب میں برابر شامل رہی ؂

خود کتاب کے متعلق کچھ کہنا میرے لیے زیبا نہیں، البتہ یہ عرض کر سکتا ہوں کہ نہ صرف اردو میں بلکہ ہر زبان میں اپنے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔ میں نے اس کے لیے کہاں کہاں سے مواد فراہم کیے، پھر کن کن کاوشوں سے انھیں ایک مستند دستاویز کی حیثیت میں مرتّب کیا؟ ان سوالات کا کسی قدر جواب آپ کو ملاحظہ کتاب سے مل سکے گا۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ سالہا سال کی تگ و دو کے بعد جگہ جگہ سے پھُول چُن کر ایک گلدستہ تیار کر سکا ہوں، شہیدانِ راہِ حق کی بارگاہ میں اس سے بہتر تحفہ پیش کرنے کی استطاعت مجھ میں نہ تھی:

با خونِ صد شہید مقابل نہادہ اند
عمرے کہ ما بہ آتشِ افسانہ سوختیم

مسلم ٹاؤن۔ لاہور
۲۔ستمبر ۱۹۵۶ء

مہؔر

فہرست مضامین

پہلا حصّہ

(شیخ ولی محمد اور مولوی نصیر الدین منگلوری)

دوسرا حصّہ

(مولوی سیّد نصیرالدّین دہلوی)

پانچواں حصّہ

ہندوستان کے اندر

(مقدّمے اور قیدیں)

چھٹا حصّہ

(جنگ امبیلہ سے آخر تک)

ساتواں حصّہ

اندرونِ ملک

پہلا حصّہ

(شیخ ولی محمّد اور مولوی نصیر الدّین منگلوری)

پہلا باب

شہادتِ امام اور تجدیدِ نظام

شہادتِ امام

سید صاحب نے ۲۴۔ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (۶۔ مئی ۱۸۳۱ء) کو بروز جمعہ ۱۱-۱۲ بجے کے درمیان بالاکوٹ میں شہادت پائی۔ ہم بتا چکے ہیں آپ کی شہادت نہیں بلکہ گم شدگی کی خبر پھیل گئی تھی۔ جس کسی کے کان میں یہ خبر پہنچی، اس نے لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیا اور دیوانہ وار آپ کی تلاش میں سرگرداں پھرنے لگا۔ بہت سے مجاہدین اسی سرگردانی کی حالت میں شہید ہوئے۔ اس اثناء میں سکھوں کا دباؤ بڑھتا گیا اور مجاہدین پیچھے ہٹتے ہٹتے اُس پہاڑ کے دامن پہنچ گئے جو حلقۂ بالاکوٹ کی شمالی سمت میں واقع ہے۔ عین اُس موقع پر یہ آواز بلند ہوئی کہ گوجر سید صاحب کو لڑائی کے کھیت سے اٹھا کر باہر لے گئے لہٰذا مجاہدین کو بھی میدان سے نکل آنا چاہیے۔ اگر یہ آواز نہ سُنی جاتی تو یقیناً مجاہدین بالاکوٹ ہی میں جانیں دے دیتے اور کوئی بھی ہٹنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا، گوجروں نے یہ تدبیر بغیر السیف مجاہدین کو بچا لینے کی غرض سے اختیار کی تھی یا سکھوں کے ایماء پر ان کا مقصد یہ تھا کہ مقابلہ ختم ہو جائے اور مزید کشمکش باقی نہ رہے۔ اس حقیقت میں شبہہ نہیں کہ مجاہدین کو بالاکوٹ کے میدان سے ہٹانے کے لیے اور کوئی صورت کارگر نہ ہو سکتی تھی۔

مختلف راستے

بالاکوٹ سے شمالی سمت جانے کے مختلف راستے تھے، مثلاً ست بنے کا نالا، برنا کا نالا، ست بنے کے ٹیلے اور برنا کے ٹیلے پر چڑھنے کی پگ ڈنڈیاں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر مجاہدین نے نالوں کے راستے اختیار کیے۔ ممکن ہے بعض اصحاب پگ ڈنڈیوں کے راستے اوپر چڑھ گئے ہوں۔ اوپر پہنچ جانے کے بعد اکثر اصحاب ایک چشمے پر جمع ہوئے۔ اُس وقت مولوی خیرالدین شیرکوٹی کی،

جماعت کے بھی چند آدمی پہنچ گئے، جو اپنے ساتھیوں سے آگے آگے تیز دوڑتے چلے آ رہے تھے تاکہ جلد سے جلد جنگ میں شریک ہو جائیں۔ انھیں شکست کا علم ہوا تو دم بخود رہ گئے۔ سب کو انتہائی قلق اس بات کا تھا کہ سید صاحب کے متعلق کوئی یقینی اور قطعی خبر نہ تھی۔ راویوں نے لکھا ہے کہ آپ کے غمِ فراق میں مجاہدین اس درجہ پراگندہ خاطر اور حواس باختہ تھے، جیسے مجنون اور سودائی ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہ تھا۔

غُربت کی پہلی منزل

بالاکوٹ کے میدان میں سکھوں کی فوج پھیلی ہوئی تھی۔ پہاڑ پر ٹھہرے رہنے میں کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہاں سے اڑھائی تین کوس کے فاصلے پر انگرائی نام ایک گاؤں ہے، جو ناصر خاں بھٹ گرامی کی ملکیت تھا۔ خان موصوف کی رہنمائی میں مجاہدین نے اُسی گاؤں کا رُخ کر لیا اور مغرب تک وہ انگرائی میں پہنچ گئے۔ مولوی خیرالدین شیرکوٹی کے ہمراہی بھی آ گئے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب بہت بیمار ہیں۔ دو اڑھائی کوس پر درہ کاغان میں ایک مقام پر ٹھہر گئے ہیں۔ وہ خود چل نہیں سکتے، ساتھی انھیں چارپائی پر اٹھا کر آہستہ آہستہ لائیں گے۔

سب مجاہدین دن بھر کے بھوکے تھے۔ تن کے کپڑوں کے سوا کسی کے پاس کچھ نہ تھا۔ صرف شیخ ولی محمد کی جیب میں ایک روپیہ تھا، جس کی مکئی خریدی گئی۔ وُہی مُٹھی مُٹھی بھر مجاہدین میں تقسیم ہوئی۔ بھوک، تکان، شکست کے رنج اور سید صاحب کے غمِ فراق نے اُن پر خستگی اور افسردہ خاطری کی جو کیفیت طاری کر رکھی تھی، اس کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے؟ جہاں کسی کو جگہ ملی، بے خبرانہ لیٹ گیا، یہاں تک کہ ان میں سے کسی کو ہتھیار سنبھالنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ ناصر خاں نے اپنے آدمی حفاظت کے لیے مقرر کر دیے۔ دل برداشتگی اور حواس باختگی کی اس حالتِ زار میں بھی جرّاحوں نے اپنا فرض فراموش نہ کیا، چنانچہ جان محمد جرّاح رام پوری اور عبدالرحیم جرّاح جانسٹھی نے نمازِ عشا کے بعد تمام زخمیوں کی مرہم پٹی کی۔

گوجروں کا پیغام

رات کے وقت دو گوجر انگرائی آئے اور بتایا کہ سید صاحب

تھوڑی دُور آگے[1] پہاڑ کے درے میں زندہ سلامت موجود ہیں۔ آپ لوگ چلیں تو ہم ان کے پاس پہنچا دیں۔ یہ خوش خبری سُن کر سب لوگ بھوک اور تکان بھول گئے، لیکن ناصر خاں نے رات کے وقت جانا خلافِ مصلحت قرار دیا اور کہا:

اگر سید بادشاہ کو اللہ تعالیٰ نے زندہ رکھا ہے تو وہ کہیں ہوں، ہرگز نہیں چھُپنے کے۔ تم کل سویرے آنا، ہم سب تمھارے ساتھ چلیں گے[2]

مجاہدین کو ناصر خاں نے سمجھایا کہ اگر امیر المومنین خدا کے فضل سے زندہ ہیں تو کل یا پرسوں اُن سے ملاقات ہو جائے گی۔ آپ حضرات کے لیے لازم ہے کہ جلد سے جلد بی بی صاحبہ کے پاس پہنچ کر ان کی حفاظت کا انتظام کریں۔ اگر سکھوں نے اُس طرف پیش قدمی کی اور خدا نخواستہ بی بی صاحبہ کو گرفتار کر لیا تو یہ بڑی شرم اور قباحت کی بات ہوگی۔ یہ رائے سب کو پسند آئی اور سیدھے بی بی صاحبہ کے پاس پہنچنے کا فیصلہ ہو گیا۔

انگرائی میں صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد دو تین گھڑی دن چڑھے تک ان گوجروں کا انتظار کیا گیا، جو رات کے وقت سید صاحب کی سلامتی کا پیغام لے کر آئے تھے، لیکن ان میں سے کوئی نہ آیا۔ شیخ ولی محمّد نے یہ تجویز پیش کی کہ مقامی آدمیوں میں سے ایک دو کو بالاکوٹ بھیج دینا چاہیے تا کہ وہ امیر المومنین کے متعلق صحیح حالات دریافت کر آئیں۔ اللہ دین ساکن پھلی اور خضر خاں قندھاری یہ کام انجام دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ انھوں نے بالاکوٹ کا راستہ لیا اور باقی مجاہدین نے ننددھیاڑ کا رخ کر لیا۔

دشوار گزار سفر انگرائی سے آگے پہاڑ کی چڑھائی تھی۔ آدھی چڑھائی پر پہنچے تو ناصر خاں نے بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ رات کو گوجروں نے سید بادشاہ کے قیام کی جو جگہ بتائی تھی وہ اُس درے میں ہے۔ وہاں کوئی سراغ نہ مل سکا تو آگے بڑھے۔ انتہائی مشقت کے بعد پہاڑ کی

---

[1] مطلب یہ ہے کہ انگرائی سے آگے اس طرف جدھر مجاہدین جا رہے تھے۔

[2] "وقائع" جلد سوم صفحہ ۲۵۶۔ باقی تفصیلات بھی "وقائع" ہی کی روایات سے ماخوذ ہیں۔

چوٹی پر پہنچے، جہاں سے خطرناک اُترائی شروع ہوئی۔ مقامی لوگ تو بہ آسانی اترنے لگے لیکن مجاہدین کو بڑی مشکلات پیش آئیں، کیونکہ وہ ایسے پہاڑی سفروں کے عادی نہ تھے۔ روایت میں بتایا گیا ہے کہ مجاہدین میں سے :

> کوئی تو لاٹھی ٹیک کر اترنے لگا اور کوئی بندوق ٹیک کر۔ اس میں ایک جگہ کسی صاحب کا پاؤں پھسلا اور گرا۔ بیس پچیس آدمی اُس کے آگے تھے۔ اُس کے دھکے سے وہ سب گرے اور لوٹتے پوٹتے پہاڑ کے نیچے جا رہے۔ کسی کی تلوار ٹوٹ گئی، کسی کی خم ہوگئی اور کسی کی بندوق کا کندا ٹوٹ گیا، مگر وہ سب لوگ سلامت رہے، کوئی زخمی نہ ہوا۔[1]

نشیب میں تودہ نالم (ثعلب مصری) کے بہت سے پودے تھے۔ مجاہدین بھوک کے مارے ان کی جڑیں کھود کھود کر گاجروں کی طرح کھاتے رہے۔ وہاں برف کا ایک موٹا تختہ ملا، جو میل ڈیڑھ میل لمبا ہوگا۔ اس پر چلنے لگے تو نیچے سے پانی بہنے کی آواز آئی۔ مقامی لوگوں نے سب کو روک دیا۔ ایک جگہ سے برف گھل کر غار سا بن گیا تھا۔ جھانک کر دیکھا تو کوئی سو ڈیڑھ سو فٹ نیچے پانی نظر آیا۔ مقامی لوگ خود آگے آگے چلنے لگے تاکہ برف کی پختگی کا اندازہ کرتے جائیں، مبادا مجاہدین میں سے کوئی ناواقفی کے باعث ایسی جگہ قدم رکھ دے، جہاں برف کی تہہ زیادہ موٹی نہ ہو اور نیچے جا گرے۔ اس طرح آہستہ آہستہ نشیبی حصے سے گزرے۔

میاں کلئی | دوسری منزل میاں کلئی میں ہوئی، جو درۂ پنجول میں سیدوں کی ایک مشہور بستی ہے۔ ناصر خاں بھست گرامی نے پیغام بھیج دیا تھا کہ مجاہدین آ رہے ہیں اور ان کی مہمانی کا سامان تیار رکھا جائے۔ عصر کے وقت وہاں پہنچے۔ سیدوں نے پہلے بھنی ہوئی مکئی پیش کی۔ پھر گاؤں کے تمام لوگ اپنے گھروں سے کھانا لے آئے۔ کوئی کڑھی روٹی، کوئی دہی روٹی، کوئی دودھ روٹی اور کوئی دال روٹی۔ زخمیوں کے لیے حلوا تیار کیا گیا۔ بالاکوٹ کے بعد یہ پہلا کھانا تھا، جو راہِ حق

---

[1] "وقائع" جلد سوم ص ۲۰۵۹

کہ ان جانبازوں نے سیر ہو کر کھایا۔

بنسیر اس اثنا میں گوجروں سے معلوم ہو چکا تھا کہ بی بی صاحبہ شملئی سے بنسیر آگئی ہیں۔ دونوں مقاموں کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں۔ مجاہدین میاں کلئی سے روانہ ہو کر عصر کے وقت بنسیر پہنچے۔ وہ گاؤں حبیب اللہ خاں رئیس گڑھی کے بڑے بھائی بہرام خان کی ملکیت میں تھا۔ اس نے بڑی خاطر داری سے سب کو مختلف مکانوں میں اتارا اور مہمان داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

۲۴- ذی قعدہ کی رات انگرائی میں بسر کی تھی اور ۲۵ کی رات میاں کلئی میں۔ ۲۶ کو منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ وہیں اللہ دین اور خضر خاں بھی آ گئے۔ انھوں نے ایک رات بالاکوٹ میں بسر کرنے کے بعد جو حالات معلوم کیے، ان کا خلاصہ یہ تھا کہ جن مجاہدین کو سکھوں نے زندہ گرفتار کیا تھا ان سے کنور شیر سنگھ نے سید صاحب کی نعش تلاش کرائی۔ انھوں نے ایک بے سر نعش کے متعلق بتایا کہ پوشاک کی بنا پر یہ سید صاحب کی معلوم ہوتی ہے۔ پھر اس کا سر بھی تلاش کرایا۔ جب تصدیق ہو گئی کہ سید صاحب کی نعش یہی ہے تو اس پر دوشالہ ڈلوا دیا۔ خاصے کے دو تھان اور پچیس روپے نقد دے کر کہا کہ اسلامی دستور کے مطابق اسے دفن کر دیا جائے۔ بعد میں نہنگ اکالیوں نے اس نعش کو قبر سے نکال کر دریائے کنہار میں ڈال دیا۔

بہرحال نظر بہ ظاہر سید صاحب کی شہادت میں کوئی شک و شبہہ باقی نہ رہا تھا، تاہم بعض اصحاب کو یہ امید لگی رہی کہ سید صاحب زندہ ہیں۔ اس امید کو تقویت اس امر سے ہوئی کہ آپ کو بہ حالت شہادت دیکھنے کی کوئی یقینی اور قطعی روایت موجود نہ تھی۔

جماعت کی پریشاں حالی جنگ بالاکوٹ کے وقت مجاہدین کی بڑی جماعت سید صاحب کے ہمراہ تھی۔ اس کے علاوہ مختلف گروہ جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ مثلاً ایک جیش مولوی خیر الدین شیرکوٹی کی سرکردگی میں مظفر آباد گیا ہوا تھا۔ یہ لوگ سرگرم تگ و دو کے باوجود جنگ کے موقع پر بالاکوٹ نہ پہنچ سکے۔ تیس بتیس مجاہدین مولوی نصیر الدین منگلوری کی سالاری میں درہ بھوگڑ منگ کی حفاظت پر مامور تھے۔ ایک جماعت کو سید صاحب نے سچّوں میں بٹھا دیا تھا۔ ان میں وہ

لوگ بھی شامل ہو گئے تھے جو جنگ مظفرآباد میں زخمی ہوئے اور مولوی خیرالدین نے انھیں علاج کی غرض سے پنجتوں بھیج دیا تھا - کچھ لوگ بی بی صاحبہ اور دوسری خواتین کی حفاظت و خدمت کے لیے ان کے پاس موجود تھے - جنگ بالاکوٹ کے بعد یہ سب یک جا ہوئے تو سات سو کے قریب ہو گئے - سب پر سراسیمگی اور پریشاں حالی کی کیفیت طاری تھی، اس لیے کہ بے سردار تھے - اکثر کے پاس تن پوشی کا بھی کوئی سامان نہ تھا، کیونکہ سارا سامان بالاکوٹ میں لُٹ چکا تھا - بی بی صاحبہ کے پاس جو جاجمیں، خیمے اور قناتیں تھیں، شیخ ولی محمد نے کٹوا کر مجاہدین میں تقسیم کر دیں - انھوں نے انگرکھے، پاجامے، دوپٹے، عمامے اور بستر بنوا لیے - ممدوحہ کے پاس کل سولہ روپے تھے وہ بھی دے دیے اور ان سے غلہ خرید کر مجاہدین میں تقسیم کر دیا گیا ؏

شیخ ولی محمد کی کیفیت | اب سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ جماعتی تنظیم کیونکر بحال رکھی جائے - ہر ایک کی نگاہ بار بار شیخ ولی محمد پھلتی پر پڑتی تھی، اس لیے کہ سید صاحب کے رفقاء خاص میں سے جو لوگ زندہ رہ گئے تھے، ان میں سے شیخ صاحب ہی افضل تھے، لیکن ان کی حالت یہ تھی، جیسے کوئی دیوانہ یا حواس باختہ ہو - سید صاحب کے غم میں ہوش بجا نہ تھے - جب اُن سے کہا جاتا لوگ پریشاں حال ہیں، کوئی ایسا بندوبست کیجیے کہ بے اطمینانی دُور ہو تو وہ جواب دیتے کہ مجھ سے کچھ کام نہیں - جو چاہے رہے، جو چاہے چلا جائے - میں تو بی بی صاحبہ کا خدمت گزار ہوں - میرا پہلا کام یہ ہے کہ وہ جہاں جانا چاہیں، بحفاظت انھیں وہاں پہنچا دیا جائے - یہ حال دیکھ کر مختلف لوگوں نے واپسی کا ارادہ کر لیا اور بعض روانہ بھی ہو گئے ؏

شیخ صاحب نے بی بی صاحبہ سے پوچھا کہ آیا وہ اپنے والدین کے پاس چترال جانا چاہتی ہیں یا امیرالمومنین کی ازواج کے پاس سندھ جانے کی خواہاں ہیں - بی بی صاحبہ نے سندھ جانے کا فیصلہ کیا اور شیخ صاحب اسی سوچ بچار میں لگ گئے کہ کسی طرح انھیں محفوظ راستے سے سندھ پہنچا دیں ؏

صحیح مشورہ | اکابر مجاہدین میں سے تین بزرگ ایسے تھے جو جنگ بالاکوٹ میں شریک نہ تھے:

ایک شیخ حسن علی، دوسرے مولوی محمّد قاسم پانی پتی، تیسرے مولوی نصیر الدین منگلوری۔ بالاکوٹ کی شکست اور سیّد صاحب کے فراق کا غم انھیں بھی سب کے برابر تھا، لیکن ان پر حواس باختگی کی وہ کیفیت طاری نہ تھی، جس سے دوسرے مجاہدین بے طرح متاثر تھے۔ انھوں نے شیخ ولی محمّد کو سمجھایا کہ جماعتی نظام سے بے پروائی اور بے تعلّقی کا اظہار سراسر خلافِ مصلحت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سب لوگ گھروں کی راہ لیں گے اور ہم چند آدمی رہ جائیں گے، جن کے لیے نہ یہاں قیام کا کوئی اطمینان بخش بند وبست ہو سکے گا اور نہ بی بی صاحبہ کو سندھ پہنچانے کا انتظام کر سکیں گے۔ صحیح طریقِ کار یہ ہے کہ تمام مجاہدین کو تسلّی دیجیے اور امارت قبول کر لیجیے تاکہ جماعتی نظام قائم رہے۔ امیر المومنین کے زندہ ہونے کی خبریں مل رہی ہیں۔ آپ کی تشریف آوری تک جماعت کو انتشار سے بچائے رکھنا بہرحال لازم ہے ؎

شیخ ولی محمّد نے اس مشورے کی معقولیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ مولوی نصیر الدین امیر بن جائیں۔ وہ امارت کے اہل ہونے کے علاوہ نسباً سیّد ہیں؛ لیکن جماعت کی بہت بڑی اکثریت چونکہ شیخ صاحب پر متفق تھی، اس لیے تینوں مشیروں کے اصرار پر موصوف نے امیر بننا قبول کر لیا ؎

ایک بھولا ہوا واقعہ اس اثناء میں انھیں ایک واقعہ یاد آگیا، جس سے آخری فیصلے پر پہنچنے میں خاص مدد ملی۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ پنجتار میں نمازِ فجر کے بعد سیّد صاحب نے مولانا شاہ اسمٰعیل، مولوی ضیاء الدین پُھلتی اور شیخ ولی محمّد کو بلوایا۔ دیر تک جہاد کے فضائل بیان فرماتے رہے۔ پھر یکایک شیخ ولی محمد سے مخاطب ہو کر کہا:

> شیخ بھائی! ممکن ہے میں کبھی آپ لوگوں میں نہ رہوں، آپ کو تاکید کی جاتی ہے کہ جہاد کے کارِ خیر سے دست کش نہ ہونا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کام میں بڑی خوبیاں اور برکتیں رکھی ہیں ؎

شیخ ولی محمد نے سوچا کہ عجب نہیں، وہ ارشاد اسی وقت کے لیے ہو، ورنہ مولانا شاہ اسمٰعیل

کے ہوتے ہوئے مجھے کیوں مخاطب فرمایا ؟ جب کہ مولانا کے سامنے میں کسی گنتی اور شمار میں نہ تھا۔

بیعتِ امارت شیخ ولی محمد امارت کی گراں قدر ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے تو سرکردہ اصحاب کے مشورے اور اتفاق سے باقاعدہ بیعت کا انتظام کیا گیا۔ ان اصحاب میں سے خاص طور پر قابلِ ذکر افراد یہ ہیں : مولوی نصیر الدین منگلوری، مولوی محمد قاسم پانی پتی، ملا لعل محمد قندھاری، ملا بازار قندھاری، ملا دوست محمد قندھاری، ملا عزت قندھاری، خضر خاں قندھاری، جعفر خاں ترین ہزاروی، حسین خاں ترین ہزاروی، بابر شاہ ننگرہاری، سید اللہ نور شاہ ساکن مینئی، مولوی امام الدین ساکن ٹوپی، اخوند گل پشاوری، محمد مبین خیبری، قاضی محمد پشاوری، اخوند فیض محمد غزنوی، شیخ وزیر پھلتی، شیخ خواہش علی عظیم آبادی، پیر مبارک علی جھنجھانوی، حافظ وجیہ الدین بارغ پتی، فتح محمد آدم پوری، مولوی عبد الحکیم بڑھانوی، مستقیم خاں عیسیٰ خیلی۔

اس سلسلے میں مولوی خیر الدین شیرکوٹی کا نام روایتوں میں بالکل نہیں آیا، حالانکہ وہ مجاہدین میں ممتاز حیثیت پر فائز تھے۔ سمجھنا چاہیے کہ یا تو وہ علالت کے باعث بیعت کے وقت بنسیر پہنچے ہی نہ تھے یا شدت علالت کی وجہ سے شوریٰ اور بیعت میں بروقت شریک نہ ہو سکے۔

اہل ننددھیاڑ کی شرکت بیعت کے بعد قرار پایا کہ علاقہ ننددھیاڑ کے رؤسا و خوانین کو بھی اس انتظام میں شریک کر لینا چاہیے۔ چنانچہ اخوند گل پشاوری اور ملا فیض محمد غزنوی نے سب کو جمع کر کے شیخ ولی محمد کی امارت پر اتفاق کے حالات بتائے۔ ان لوگوں نے انتظام کی تحسین کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں شرکت میں عذر نہیں، لیکن اپنے پیر و مرشد صاحبزادہ محمد نصیر سے پوچھے بغیر کوئی قدم اٹھا نہیں سکتے۔ جماعتِ مجاہدین کی طرف سے اسی وقت صاحبزادہ موصوف کے نام ایک خط ستھانہ بھیجا گیا، جس میں شیخ ولی محمد سے بیعت کے پورے حالات درج تھے۔ آخر میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ آپ کو اس ملک میں پیشوا و مقتدا کی حیثیت حاصل ہے۔ آپ بھی للہ فی اللہ اس کارِ خیر میں شریک ہو جائیں۔ دنیا میں نیک نامی ہوگی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں سے جزا پائیں گے۔ صاحبزادے نے جواب میں لکھا کہ آپ حضرات میرے پاس ستھانہ چلے آئیں۔ انشاء اللہ میں آپ کا ساتھ دوں گا اور حتی المقدور خدمت میں کوتاہی نہ کروں گا۔

دوسرا باب

نندھیاڑ میں قیام کا انتظام

صاحبزادہ محمد نصیر صاحبزادہ محمد نصیر علاقۂ نندھیاڑ کے سب سے بڑے پیر تھے اور اس علاقے کے اکثر لوگ انھیں کے معتقد تھے۔ وہ خود ستبہار میں رہتے تھے اور ان کے دو چھوٹے بھائی محمد نذیر اور محمد بشیر کوہانہ میں مقیم تھے۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اہلِ نندھیاڑ کا تعاون صاحبزادہ محمد نصیر کی رضامندی اور اتفاق پر موقوف تھا، اسی لیے ان کی خدمت میں مکتوب بھیجا گیا تھا۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے جہاں دوسرے علما، خوانین، پیرزادوں اور عوام کو جہاد میں تعاون کے لیے دعوت دی تھی، وہاں صاحبزادہ محمد نصیر کو بھی خطوط بھیجے تھے، لیکن موصوف کی طرف سے جنگ بالاکوٹ تک تعاون کا کوئی اقدام نہ ہوا، اس وجہ سے اکثر مجاہدین کو صاحبزادے کے متعلق چنداں حسنِ ظن نہ تھا، البتہ مولوی محمد قاسم پانی پتی صاحبزادے کے سرگرم موید تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب صاحبزادہ اعانت کے لیے مستعد ہے تو کیوں اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے؟ معاملے کی صورت یہ تھی کہ علاقۂ نندھیاڑ میں مجاہدین کے قیام کا بندوبست اس وقت تک ممکن نہ تھا، جب تک صاحبزادہ اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر کھانے پینے کا سروسامان نہ کر دیتا۔ وہ اس کام کے لیے تیار ہو گیا تو جماعتِ مجاہدین کے لیے اس کی اعانت سے فائدہ اٹھانے میں تامّل کی کوئی وجہ باقی نہ رہی۔ سابق میں اس کا تعاون کے لیے آگے نہ بڑھنا موجودہ عزمِ خیر کے عدمِ قبول کی دلیل نہ بن سکتا تھا۔ چنانچہ صاحبزادے کی دعوت قبول کر لی گئی، اگرچہ یہ تعاون زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو گا۔

بنسیر سے ست بہار | چنانچہ صاحبزادے کی دعوت پر مجاہدین بنسیر سے ست بہار روانہ ہو گئے۔ پہلی منزل بھٹ گرام میں ہوئی جو ناصر خاں کا وطن تھا۔ خان موصوف سید صاحب کے مخلص معتقد تھے اور بالاکوٹ کی جنگ میں بھی شریک رہے تھے۔ انھوں نے بڑی گرم جوشی سے جماعت کا استقبال کیا۔ دو راتیں اور ایک دن پوری جماعت کی مہمان داری کی۔ شیخ ولی محمد نے صاحبزادے کی دعوت کے متعلق تمام حالات بتائے تو ناصر خاں نے کہا کہ اس علاقے میں صاحبزادہ بہت معزز و ممتاز ہے۔ اس کے تعاون سے امید ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا اجراء از سر نو ہو جائے گا ۔

ناصر خاں خود اس لیے ساتھ نہ جا سکا کہ بالاکوٹ کی جنگ میں زخمی ہو چکا تھا، تاہم اس نے یقین دلایا کہ تندرست ہوتے ہی ست بہار پہنچ جاؤں گا ۔

بھٹ گرام سے تیسرے دن روانہ ہو کر مجاہدین موضع پیماں میں ٹھہرے۔ اگلے روز بھنگول پہنچ گئے، جو اخوند محمد ارم کا وطن تھا۔ یہ بھی بہت بڑے پیرزادے اور سید صاحب کے مخلص عقیدت مند تھے۔ انھوں نے بھی مہمان داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بھنگول سے ست بہار صرف ایک کوس تھا۔ بی بی صاحبہ اور تقریباً ایک سو مجاہدین اسی روز ست بہار چلے گئے۔ باقی اصحاب بھنگول ہی میں ٹھہرے رہے ۔

صاحبزادے کے انتظامات | صاحبزادہ محمد نصیر نے ایک الگ تھلگ مکان بی بی صاحبہ اور مجاہدین کی دوسری خواتین کے لیے خالی کرا دیا۔ باقی اصحاب کے قیام کا بھی مناسب بندوبست کر دیا۔ سب کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ سید بادشاہ کی سلامتی کی خبریں مل رہی ہیں۔ خدا کرے، وہ جلد آ جائیں۔ آپ لوگوں کی طرح میری مراد بھی یہی ہے، تاہم جب تک وہ نہیں آتے، میں آپ کے ساتھ ہو کر جہاد میں پورا حصہ لوں گا اور کھانے کپڑے کا انتظام کرتا رہوں گا ۔

چند روز کے بعد صاحبزادے نے علاقے کے رؤساء و خوانین کو جمع کیا اور کہا کہ یہ

مجاہد بھائی سید بادشاہ کے ہمراہ جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے آئے تھے۔ آپ کے نہ ہونے کی وجہ سے کاروبارِ جہاد درہم برہم ہو رہا ہے۔ ان کی غمخواری و دلجوئی ہم سب پر لازم ہے۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام دو چار آدمیوں کے بس کا نہیں۔ مناسب تدبیر یہ ہے کہ تمام رؤسا و خوانین اپنی اپنی بستیوں میں عُشر کا انتظام کر دیں اور خود عُشر جمع کر کے مقررہ مقامات پر پہنچا دیا کریں۔ ان بھائیوں میں سے کوئی تحصیل کے لیے کہیں نہ جائے گا۔ حاضرین نے یہ تجویز قبول کر لی اور پختہ اقرار کے بعد وہ واپس چلے گئے۔

قیاس یہ ہے کہ انتظام ہو جانے پر وہ مجاہدین بھی ست بہار چلے آئے جو بھنگول میں مقیم تھے اگرچہ کسی روایت میں اس کی تصریح نظر سے نہیں گزری۔ اگر وہ جائے قیام کی سہولت کے پیش نظر بھنگول ہی میں مقیم رہے تو ان کے کھانے پینے کی چیزیں ست بہار سے پہنچنے لگیں۔ عید قربان (۱۰- ذی حجہ ۱۲۴۶ھ، ۲۲- مئی ۱۸۳۱ء) ست بہار ہی میں گزری۔ صاحبزادے نے قربانی کے لیے ایک بیل شیخ ولی محمد کے پاس بھیج دیا تھا جس کا گوشت مجاہدین میں تقسیم ہوا۔ اُس وقت تک سید صاحب کی شہادت پر سولہ دن گزر چکے تھے۔

جماعت کے دو حصے نندھیاڑ کی تمام بستیوں سے عُشر کا غلہ ایک مقام پر جمع کرنا بہت مشکل تھا، لہٰذا صاحبزادے نے مناسب سمجھا کہ جماعت مجاہدین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے شیخ ولی محمد امیر جماعت، مولوی نصیر الدین منگلوری اور مولوی محمد قاسم پانی پتی کو بُلا کر کہا کہ بی بی صاحبہ، دوسری خواتین اور ساٹھ ستّر مجاہدین ست بہار میں رہیں۔ ان کے گزارے کا بندوبست آس پاس کی بستیوں کے عُشر سے ہوتا رہے گا۔ باقی مجاہدین میرے بھائیوں کے ساتھ کوہانہ چلے جائیں۔ وہاں کی بستیوں کے عُشر کا انتظام میرے بھائی کر لیں گے اور چند روز بعد میں خود بھی وہاں آؤں گا تاکہ پورے علاقے کا دورہ کر کے مجاہدین کے لیے قیام کی تمام سہولتیں مہیا کر دوں۔ شیخ صاحب اور ان کے مشیروں نے صاحبزادے کی اس تجویز سے اتفاق کیا۔ چنانچہ ساٹھ ستّر مجاہدین ست بہار میں ٹھہر گئے اور باقی اصحاب کوہانہ روانہ ہو گئے۔

شیخ ولی محمد نے مولوی محمد قاسم پانی پتی کو کوہانہ والی جماعت کا امیر بنا دیا۔ یہی جماعت تھی جسے جہاد کا آغاز کرنا تھا۔ شیخ نے جو آدمی اپنے ساتھ رکھے تھے ان کا مقصد دوسرا تھا۔

شیخ ولی محمد کے ہمراہی | جو لوگ شیخ صاحب کے ساتھ ست بہارہیں رہے، ان میں بی بی صاحبہ، دس گیارہ دوسری خواتین اور بارہ تیرہ بچوں کے علاوہ صرف مندرجۂ ذیل اصحاب کے نام روایت میں مذکور ہیں: مولوی نصیر الدین منگلوری، سید حامد علی جھنجھانوی، حفیظ اللہ دیوبندی، اخوند فیض محمد غزنوی، محمد خیاط لکھنوی، اللہ بخش خیاط لکھنوی، مولوی عبدالحلیم بردوانی، خیر الدین ہزاروی، حاجی عبداللہ گورکھپوری، شیخ احمد حسین صادق پوری، محمود بنارسی، شیخ رمضانی بنارسی، ابراہیم نگرامی، عبداللہ گجراتی، عبدالاحد پھلتی، گلاب خاں (ساکن میان دوآب)، حاجی فاضل شاہ پوری، ابراہیم خاں خیرآبادی، محمد حسین سہارن پوری، کریم بخش سہارن پوری، شاہ ولی سہارن پوری، عبدالرحیم جراح جانسٹھی، کریم بخش (ہمراہی مولوی نصیر الدین)، فتح محمد آدم پوری، حسن خاں عظیم آبادی، امان اللہ گڑھ مکتیشری، امان اللہ خاں لکھنوی، اخوند زعفران قندھاری، خضر خاں قندھاری، اشرف ولایتی، عبدالحمید سندھی، گل شیر خاں کالاباغ، نور کالاباغ، شہباز کالاباغ، احمار عیسیٰ خیل، اخوند محمد عظیم (کالوخاں)، غلام مولا (چملہ)، محمد زمان (چملہ)، حسین علی بڑھانوی، رحیم بخش بنارسی، امان اللہ خاں گنج پوری، میاں عبدالقیوم داروغہ، شیخ لکھمیرا اور پیر محمد ناصر۔

دونوں گروہوں کے مقاصد | طبعاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیخ ولی محمد نے اپنے پاس کیوں تھوڑے آدمی رکھے اور بڑی جماعت کو کس غرض سے کوہانہ بھیج دیا؟ مجاہدین کا اصل کام یہ تھا کہ جلد سے جلد جہاد کا آغاز کر دیں اور اس نصب العین کے حصول کے لیے جانیں لڑا دیں جو انھیں اور سید صاحب کو وطنوں سے نکال کر سرحد لایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ صاحب سب سے پہلے بی بی صاحبہ کو سندھ پہنچا دینے کے آرزومند تھے تاکہ اُن کی حفاظت کے انتظامات سے فارغ ہو جائیں، پھر بہ اطمینان تمام جہاد کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے وہی آدمی معیت کے لیے چُنے تھے، جو بی بی صاحبہ کو سندھ پہنچانے کے کام میں مدد دے سکتے تھے۔ چونکہ یہاں سے

دونوں گروہوں کے دائرہ ہائے کار عارضی طور پر مختلف ہو گئے تھے، اس لیے ان کی سرگرمیوں کے حالات الگ الگ بیان کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ سب سے پہلے مجاہدین کی بڑی جماعت کے قیام کوہانہ کی کیفیت بیان کی جاتی ہے۔ اس کے بعد بتایا جائے گا کہ شیخ ولی محمد نے اپنے پیشِ نظر مقصد کے لیے کیا کچھ کیا۔

صاحبزادہ محمد نصیر کا دَورہ

مجاہدین کی بڑی جماعت مولوی محمد قاسم پانی پتی کی سرکردگی میں کوہانہ پہنچی۔ بعد میں مولوی خیر الدین شیرکوٹی بھی کوہانہ چلے گئے۔ بعض اصحاب کو مسجد میں اتارا گیا، بعض کے قیام کے لیے ایک احاطہ تجویز ہوا جو مسجد کے قریب واقع تھا اور اس میں صاحبزادہ محمد نصیر کے بزرگوں کی قبریں تھیں۔ عیال دار مجاہدوں کے لیے مکان خالی کرا دیے گئے۔ تین روز تک صاحبزادے کے بھائیوں کی طرف سے کھانے پینے کا انتظام ہوتا رہا۔ پھر ان کے ذخیرے سے غلہ تقسیم ہونے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد صاحبزادہ محمد نصیر آ گئے۔ انھوں نے مجاہدین کو ساتھ لے کر گرد و نواح کی بستیوں کا دَورہ کیا، جس کی اجمالی کیفیت ذیل میں درج ہے:

۱۔ کوہانہ سے بھٹ گرام گئے، جو کوس سوا کوس ہو گا۔ ناصر خاں نے سب کو دو روز اپنے پاس ٹھہرایا اور پُر تکلف دعوتیں کیں۔ خود بھی صاحبزادہ اور مجاہدین کے ساتھ ہو گیا۔

۲۔ تیسرے دن سب اصحاب حاجی میرا گئے۔ پہنچنے کے دن بھی بستی والوں نے دعوت کی۔ اگلے روز بھی کھانا کھلا کر رخصت کیا۔

۳۔ حاجی مِیرا سے گج بُوڑی گئے۔ وہاں بھی شام اور صبح کو بستی والوں کی طرف سے دعوت کا انتظام ہوا۔

۴۔ گج بُوڑی سے کوس سوا کوس سائیں خاں کی گڑھی تھی۔ وہاں بھی ایک رات قیام کیا اور دونوں وقت کا کھانا بستی والوں نے کھلایا۔

۵۔ پچیر چھپے گرام گئے، یہاں ملاّ مقام نام درویش رہتا تھا۔ وہ ناصر خاں کا پیر اور سید صاحب کا مخلص تھا۔ اس نے خان موصوف کو تاکید کی کہ یہ مجاہدین خدا کی راہ میں جہاد کے لیے آئے ہیں

اور ان کی خدمت سب پر لازم ہے۔ چھپر گرام میں دو مقام ہوئے۔

۲۔ چھپر گرام سے جسنول گئے۔ ایک روز دونوں وقت کا کھانا جسنول کے رئیس شیخا نے کھلایا، دوسرے روز بستی والوں نے دعوت کی۔

جسنول سے سب لوگ کوہانہ واپس آ گئے۔ دورے میں ہر مقام سے دو چار اکابر ساتھ ہو جاتے تھے تاکہ عُشر کے انتظام میں امداد دیں۔ کوہانہ سے میل ڈیڑھ میل پر بنگی نام ایک موضع تھا وہ عُشر کے غلّے کا مرکز قرار پایا۔ تمام مجاہدین کو وہاں سے غلّہ ملتا تھا۔ جو بستیاں کوس ڈیڑھ کوس پر تھیں، وہاں سے مجاہدین خود عُشر لے آتے تھے۔ دُور والی بستیوں سے صاحبزادہ محمد نصیر گدھے یا خچر بھیج کر منگوا لیتے تھے۔ بعض مجاہدین کو صاحبزادے نے مختلف بستیوں میں بٹھا دیا تھا[1]۔

دعوت و تبلیغ

مجاہدین کو مختلف بستیوں میں متعین کر دینے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ دینِ حق کی دعوت و تبلیغ کا اچھا انتظام ہو گیا۔ عام لوگ اہم دینی مسائل سے ناواقف تھے۔ عام ملّا یا پیر جو کچھ انھیں بتا دیتے تھے، اسی پر عمل کرتے تھے۔ اگرچہ تمام مجاہدین کو علماء کا درجہ حاصل نہ تھا، تاہم وہ ضروری مسائل سے بخوبی آگاہ تھے۔ مولوی نجم الدین شکارپوری کو موضع تمائی میں متعین کیا گیا تھا۔ ان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی ایک مسجد میں رات کے وقت کوئی نہ رہتا تھا، اس لیے کہ عام تصوّر کے مطابق اس میں جن مقیم تھا۔ وہی مسجد مولوی صاحب کے قیام کے لیے تجویز ہوئی۔ وہ بے تکلف وہاں رہنے لگے اور اس وجہ سے لوگ ان کے بہت معتقد ہو گئے کہ جن نے انھیں کوئی آزار نہ پہنچایا۔

---

[1] یہ تمام تفصیلات "وقائع" سے ماخوذ ہیں۔ یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ ہزارہ گزیٹیر اردو (مطبوعہ ۱۸۸۶ء) میں مرقوم ہے کہ بالاکوٹ کے بعد شیخ ولی محمد اور مولوی محمد قاسم براہ قندھار و کابل و شکارپور ہندوستان چلے گئے۔ ایک سال کے بعد ایک اور صاحب مولوی نصیر الدین کو لے کر شیخ ولی محمد پھر آئے اور اگرور، الئی، نندھیاڑ وغیرہ کے علاقوں میں رہے۔ صفحہ ۳۲۷۔ یہ ساری داستان سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ اغلب ہے نندھیاڑ سے سوات، بونیر و خدو خیل کے قیام کو ہندوستان جانے سے تعبیر کر لیا گیا ہو۔

ایک ملا صاحب فصل کٹنے کے وقت پکھلی سے آکر غلہ وصول کرتے تھے ۔ مولوی نجم الدین نے بات چیت کر کے انھیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ پکھلی کو چھوڑ کر آزاد علاقے میں آجائیں، اس لیے کہ پکھلی میں سکھوں کی حکومت تھی اور اس کی حیثیت دارالحرب کی ہو گئی تھی ۔ مولوی صاحب کی گفتگو سُن کر ملا کو خیال ہوا کہ وہ بہت بڑے عالم ہوں گے ، مگر یہ معلوم کر کے وہ حیران رہ گیا کہ مولوی نجم الدین نے کوئی کتاب نہ پڑھی تھی ، صرف مولانا عبدالحی اور شاہ اسمٰعیل سے مسائل سُن کر دین کے متعلق ایسی معلومات حاصل کر لی تھیں جو خاصے پڑھے لکھے مولویوں کو بھی نصیب نہ تھیں ۔ اس امر سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جماعتِ مجاہدین کی دینی فضا کی کیا کیفیت تھی ۔

تیسرا باب

نندھیاڑ کی سرگزشت

احوال وظروف کوہانہ میں مجاہدین تقریباً دس مہینے مقیم رہے، میرا اندازہ ہے کہ جون ۱۸۳۱ء سے مارچ ۱۸۳۲ء تک۔ اس مدت میں نہ وہ آرزو کے مطابق جہاد کے لیے ابتدائی تدبیریں اختیار کر سکے اور نہ انھوں نے کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں انھیں مستقل حیثیت حاصل نہ تھی۔ وہ ہر اقدام کے لیے صاحبزادہ محمد نصیر، ان کے بھائیوں اور مقامی روساء وخوانین کی امداد و رہنمائی کے محتاج تھے۔ بہ طور خود نہ کوئی محاذ قائم کر سکتے تھے، نہ سکھوں کے کسی علاقے پر حملہ و یورش کے مجاز و مختار تھے۔ ہر قدم مقامی لوگوں کے اتفاق و رضامندی سے اٹھایا جا سکتا تھا اور انھیں متفق و رضامند کر لینا صاحبزادہ محمد نصیر یا ان کے بھائیوں کی مصلحت اندیشی پر موقوف تھا۔ اگر وہ اپنی خواہش کے مطابق رزم و پیکار کا سلسلہ جاری کر دیتے تو شدید اندیشہ تھا کہ مقامی لوگ اسے ناپسندیدہ قرار دے کر بگڑ جاتے اور مجاہدین کے لیے قیام کی بھی کوئی صورت باقی نہ رہتی۔ افسوس کہ اس احتیاط اور مقامی مصلحتوں کی انتہائی نگہداشت کے باوجود نندھیاڑ کی فضا مجاہدین کے لیے متواتر ناسازگار بنتی گئی، یہاں تک کہ انجام کار انھیں وہاں سے نکل کر نے مانن کا رُخ کرنا پڑا۔

پہلا اقدام قیام کوہانہ کے زمانے میں سکھوں کے خلاف پہلے اقدام کی کیفیت یہ ہے کہ ایک روز چھپر گرام کے چند آدمی صاحبزادہ محمد بشیر اور صاحبزادہ محمد نذیر کے پاس دوڑے آئے اور بتایا کہ سکھوں کا لشکر درہ کونش میں پہنچ گیا ہے۔ مجاہدین کی ایک جماعت کو ہمارے ہمراہ بھیج دیجیے تاکہ سکھوں پر واضح ہو جائے ہم مقابلے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ مولوی محمد قاسم پانی پتی امیرِ جماعت نے

دس آدمی ان کے ساتھ کر دیے: شیر محمد خاں رام پوری، مستقیم، ابراہیم خاں، محمد یار خاں، شاہین مشوانی، نیک محمد لوہار، شہباز، امان خاں، شیخ وزیر پھلتی اور نجم الدین شکار پوری۔ ان کے بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ حالات کا پورا اندازہ ہو جائے، اس کے بعد مناسب اقدام کی تدبیر اختیار کر لی جائے۔

مجاہدین کی یہ چھوٹی سی جماعت چھپر گرام پہنچی تو اردگرد تہلکہ بپا ہو گیا کہ مجاہدین کا حملہ ہونے والا ہے۔ مجاہدین نے باہم فیصلہ کر رکھا تھا کہ سکھوں سے مقابلے کی نوبت آئے تو بندوقوں کی باڑ مارتے ہی آس پاس کے پہاڑوں پر چڑھ جائیں گے۔ پھر مناسب کمین گاہوں میں بیٹھ کر ان پر گولیاں چلاتے رہیں گے۔ دس آدمیوں کی مختصر سی جماعت کے لیے اس کے سوا لڑائی کی کوئی صورت نہ تھی، لیکن مجاہدین کی آمد کے آوازے نے سکھوں پر ایسی ہیبت طاری کر دی کہ وہ درۂ کونش سے باہر نکل گئے اور مجاہدین کو ہانہ واپس چلے گئے۔

بفہ پر شبخون بفہ میدانِ پکھلی کے شمالی حصے میں تحصیل مانسہرہ کا مشہور مقام ہے، جو سرن ندی کے دائیں کنارے واقع ہے۔ اسے پہلے بھی اہم حیثیت حاصل تھی۔ صاحبزادہ محمد بشیر اور صاحبزادہ محمد نصیر نے مقامی لوگوں سے مشورے کے بعد بفہ پر شبخون کا فیصلہ کیا، جس پر غالباً ستمبر[1] ۱۸۳۱ء میں عمل ہوا۔

صاحبزادہ محمد نصیر کے فرزند محمد حسن نے گرد و نواح کی بستیوں میں پھر کر دو سو کے قریب مقامی آدمی جمع کیے۔ پچاس ساٹھ مجاہدین ساتھ لیے۔ انھیں شبخون کی تجویز کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ محمد حسن انھیں لے کر گڑھی سائیں خاں ہوتا ہوا سعادت خاں کے بھانڈے پہنچا۔ وہاں پہنچنے کے بعد شبخون کی تجویز بتائی اور اس کے متعلق تفصیلی مشورہ کیا۔ بھانڈے سے روانہ ہوئے تو ایک بستی میں ٹھہرے۔ پھر ایک پہاڑ پر جا بیٹھے۔ آس پاس سے جو شخص بفہ کی طرف جاتا ہوا ملتا، اسے پکڑ کر

[1] روایت کے الفاظ ہیں: "اخیر موسم برسات کا تھا۔" ظاہر ہے کہ یہ ستمبر ہی کا مہینا ہو سکتا ہے۔

اپنے پاس بٹھا لیتے تاکہ شبخون کے متعلق کوئی اطلاع قصبے میں نہ پہنچ سکے۔ ہزارہ کے ایک شخص کرم خاں کو دریافتِ حالات کی غرض سے آگے بھیج دیا، اس کے پیچھے خود روانہ ہوئے۔ بفہ کے قریب پہنچے تو کرم خاں نے بتایا کہ قصبے کے تمام لوگ بالکل مطمئن بیٹھے ہیں اور کسی کو حملے کا خیال تک نہیں محمد حسن نے تمام ساتھیوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا۔ ایک گروہ کو راہِ مراجعت کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا۔ دوسرے گروہ کے ذمے یہ کام لگایا کہ جہاں لڑائی کی نوبت آئے، لڑے۔ تیسرے گروہ کو روپیہ اور مال اسباب اٹھانے کا کام سونپا۔ لڑنا مجاہدین کے ذمے تھا۔ انھوں نے قصبے میں پہنچتے ہی گلی کوچوں کی حفاظت کا بندوبست کر لیا۔ تھوڑی دیر میں مقامی لوگ بہت سا مال اسباب اٹھا کر قصبے سے باہر نکل آئے۔ تقریباً پچاس آدمیوں کو بھی گرفتار کر لائے۔ اس اثناء میں بیرکنڈ کی چھاؤنی سے سکھوں کا جیش آ پہنچا۔ لڑائی ہوئی، لیکن مجاہدین کا کوئی نقصان نہ ہوا۔ نمازِ فجر تک تمام لوگ صحیح سلامت اُس پہاڑ پر پہنچ گئے، جہاں سے شبخون کے لیے روانہ ہوئے تھے۔

نتیجہ مقامی لوگوں نے جو نقد روپیہ یا مال اسباب اٹھایا تھا، اسے اپنے اپنے گھر لے گئے۔ چند روز کے بعد بفہ کے مہاجن صاحبزادہ محمد نصیر کے پاس آئے اور بھگواڑہ پہنچ جو کوہانہ سے اڑھائی تین کوس ہے، اسیروں کی رہائی کے لیے بات چیت کی۔ بارہ یا تیرہ ہزار روپے پر فیصلہ ہوا۔ صاحبزادے نے یہ رقم اپنے آدمیوں اور مجاہدین میں تقسیم کر دی۔

قیامِ ننّدھیاڑ کا یہ آخری واقعہ ہے۔ اس کے بعد ذخیرۂ روایات میں اور کسی اقدام کا ذکر نہیں ملتا۔ سردیوں کے موسم میں پہاڑی علاقے کے اندر نقل و حرکت ویسے ہی دشوار ہو جاتی ہے۔ اغلب ہے، یہ وقت کسی پیش قدمی کے بغیر ہی گزرا ہو۔

مجاہدین کے خلاف ساز باز صاحبزادہ محمد نصیر نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر بستیوں میں عُشر جاری کر دیا تھا تاکہ مجاہدین کا گزارہ ہوتا رہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اہلِ ستھانہ کی طرح عُشر اہلِ ننّدھیاڑ کے لیے بھی ایک ناقابلِ برداشت بوجھ بن گیا، حالانکہ انھوں نے

ستہ بہار میں بہ طیب خاطر یہ ذمہ داری قبول کی تھی۔ اغلب ہے، انھوں نے آہستہ آہستہ صاحبزادہ محمد نصیر سے یہ کہنا شروع کر دیا ہو کہ اس بوجھ سے ہمیں نجات دلائی جائے۔ صاحبزادے کے لیے صاف اور واضح طریقِ عمل یہ تھا کہ وہ مجاہدین کو صورتِ حال سے آگاہ کر کے خوشی خوشی رخصت کر دیتا۔ اس کے لیے وہ تیار نہ ہوا۔ شاید اُسے خیال ہو کہ مجاہدین کی جماعت خاصی بڑی ہے اور وہ لوگ جانباز ہیں، مبادا ناراض ہو جائیں اور کشمکش کی نوبت آجائے۔ بہر حال اہلِ سندھیا میں بے اطمینانی کی یہ کھچڑی اندر ہی اندر پکتی رہی۔ مجاہدین تفصیلات سے آگاہ نہ تھے لیکن انھوں نے احتیاطاً اپنے چند آدمی صاحبزادہ کے ساتھ متعین کر دیے تھے تاکہ اہلِ سندھیاڑ اور صاحبزادہ کے باہم مشوروں سے بے خبر نہ رہیں ؎

صاحبزادہ محمد نصیر بستیوں میں دورے کے لیے نکلا اور چھپر گرام میں پہنچا تو وہاں مختلف مقامی لوگوں نے جمع ہو کر اس سے کہا کہ مجاہدین سے ہتھیار لے لیے جائیں اور انھیں رخصت کر دیا جائے یا پھر ان سے اہلِ سمہ کا سا سلوک کیا جائے، یعنی یہ کہ جہاں جہاں وہ بیٹھے ہیں، بہ یک وقت اچانک حملہ کر کے انھیں ختم کر دیا جائے ؎

افشاءِ راز خدا بخش رام پوری چھپر گرام میں مقیم تھے۔ وہاں کے چار بڑے خوانین میں سے شاہزادہ خاں، خدا بخش کا عزیز دوست تھا۔ سب سے پہلے اس نے سازش کی کیفیت خدا بخش پر یوں آشکارا کی:

> میں نے اور تم نے ساتھ کھانا کھایا ہے۔ تم میرے دوست ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے جانتے ہوئے تم کو ایذا پہنچے۔ بات یہ ہے کہ تم اپنے بھائی الٰہی بخش کو لے کر کسی طرف چلے جاؤ . . . یہاں رات کو بستی کے ملکوں نے جرگہ کیا ہے اور صاحبزادے سے کہا ہے کہ ہم لوگ تمھارے ساتھ ہو کر سکھوں سے جہاد کریں گے مگر کسی طور ان ہندوستانیوں کو ہتھیار لے کر رخصت کرو اور جو ان کا مقابلہ کرنے کا خوف ہو تو جا بجا اس ملک کے دروں پر آدمی دوڑا دو کہ رستے روک لیں

کوئی نکلنے نہ پائے۔ ستھ والوں کا سا معاملہ ان سے کرو[۱]۔

صاحبزادے سے گفتگو خدا بخش کے لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ جماعت کو معرض ہلاکت میں چھوڑ کر اپنے آپ کو اور اپنے بھائی کو بچا کر نکل جاتا؟ اس نے غور و فکر کے بعد خود صاحبزادے سے رو در رو گفتگو مناسب سمجھی اور اپنا مدعا پہلے ایک مثال کی صورت میں پیش کرتے ہوئے کہا:

"ایک شخص ایک پادشاہ عالی جاہ کا مصاحب ہے۔ اس نے واسطے خوشنودئ بادشاہ کے ایک باغ لگایا اور اس میں درخت ہر طرح کے میووں اور پھولوں کے عمدہ عمدہ ہر ایک شہر اور بستی سے لا کر لگائے کہ اس کے میووں اور پھولوں کی ڈالی بادشاہ کی نذر کرے۔ سو اس باغ کی تازگی اور بہار دیکھ کر چند مفسد حاسدوں کو رشک اور حسد آیا، یہاں تک کہ باغ کاٹ کر تباہ کر دیا اور الزام رسوائی دارین کا لیا"[۲]۔

اس مثال کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ حضرت امیرالمومنین ہر شہر اور بستی سے مجاہدین کا لشکر جمع کر کے خدا کی رضا کے لیے جہاد کی غرض سے آئے تھے۔ اہل ستھ نے انھیں امام بنایا۔ پھر نفس کی شامت اور شیطان کے اغوا سے ایسا کام کیا کہ ان کے دامن سے بدنامی کا داغ قیامت تک نہ مٹے گا۔

صاف گوئی پھر کہا کہ جنگ بالاکوٹ کے بعد مجاہدین آپ کے پاس آئے، آپ نے ان کی خدمت گزاری سے نیک نامی حاصل کی۔ اب مفسد اور حاسد اسے برداشت نہ کر سکے اور بظاہر آپ کے دوست بن کر بدخواہی کے درپے ہو گئے۔ بستی والوں نے رات آپ سے جو مشورہ کیا ہے، اس کا حال سُن چکا ہوں۔

یہ سنتے ہی صاحبزادے پر گویا سکتہ طاری ہو گیا۔ آبدیدہ ہو کر بولا کہ مشورہ ضرور ہوا، لیکن

---

[۱] "وقائع" جلد سوم ص ۲۱۸، ۲۱۹۔ [۲] "وقائع" جلد سوم ص ۲۱۹۔

مجھے بتاؤ کہ میں کیا تدبیر اختیار کروں؟ خدا بخش نے جواب دیا کہ مولوی محمد قاسم پانی پتی اور مولوی خیرالدین شیر کوٹی کو کوہانہ سے بلائیے اور مجاہدین کو خوشی خوشی رخصت کر دیجیے۔ آپ الزام سے بچ جائیں گے اور ہم لوگ اس ملک سے سلامت نکل جائیں گے۔ صاحبزادے نے اس سے اتفاق کیا۔

محمد قاسم اور خیرالدین کو پیغام خدا بخش نے معاً اپنے ایک ساتھی کو پورے حالات بتا کر مولوی محمد قاسم پانی پتی اور مولوی خیرالدین شیر کوٹی کے پاس کوہانہ بھیج دیا۔ انھوں نے حسنِ تدبیر سے کام لیتے ہوئے صاحبزادے کے بھائیوں اور بیٹے کو بلا کر کہا کہ ہم سب کو اسی وقت چھپر گرام بلایا ہے۔ شاید سکھوں پر چھاپا مارنے کا ارادہ ہے۔ چنانچہ وہ سب تیار ہو گئے۔ چھپر گرام سے باہر ایک چشمے پر صاحبزادہ محمد نصیر سے بات چیت ہوئی۔ مولوی خیرالدین نے صاف صاف کہہ دیا کہ صاحبزادہ صاحب! پہلے آپ صرف پیر تھے۔ یہ لوگ آپ کی ضیافت کر کے یا مرغا مرغی نذر دے کر پیچھا چھڑا لیتے تھے۔ اب ہماری وجہ سے آپ ان کے حاکم بن گئے ہیں اور ان پر عشر مقرر کیا ہے۔ یہ لوگ حیلہ سازی سے آپ کی حکومت ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھیے، ہمارے جانے کے بعد یہ آپ کو چھوڑ دیں گے اور عجب نہیں، بستی سے بھی نکال دیں۔

صاحبزادے کا اعتراف صاحبزادے نے پھر آبدیدہ ہو کر اعتراف کیا کہ یہ سب سچ ہے۔ میری نیت یہ تھی کہ:

سید بادشاہ کے زمانے میں مجھ سے کچھ ان کی رفاقت اور خدمت نہ ہو سکی اس بات سے میں اپنے دل میں بہت نادم ہوا۔ جب آپ لوگ بالاکوٹ سے یہاں تشریف لائے تو میں نے چاہا کہ آپ کو اپنے پاس رکھوں اور کافروں سے جہاد کروں۔ شاید اسی کام سے اللہ تعالیٰ میری عاقبت بہ خیر کرے، سو حقیقت

---

۱ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تندرست ہونے کے بعد مولوی خیرالدین بھی ست بہارے سے کوہانہ پہنچ گئے تھے۔

میں یہاں کے مفسدوں نے مجھے دھوکا دیا۔ اب وہ کسی طور میرے قابو میں نہیں رہے، جو انھیں سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لاؤں۔ آپ کو رخصت کرنے پر دل راضی نہیں ہوتا، مگر ناچار اور بے بس ہوں۔ خیر میں نے آپ کو رخصت کیا اور خدا کو سونپا۔ جہاں رہو، میرے دوست ہو اور میں آپ کا خیر خواہ ہوں[1]"

نندھیاڑ سے روانگی یوں دس مہینے کے بعد مجاہدین کو نندھیاڑ سے رخصت ہونا پڑا شیخ ولی محمد اس سے پیشتر پنجتار تشریف لے گئے تھے، جس کے حالات آئندہ بیان ہوں گے۔ کوہانہ کے مجاہدین نے بھی پنجتار ہی کا رخ کر لیا۔ وہ کوہانہ سے بھٹ گرام پہنچے، جہاں ناصر خاں نے دونوں وقت پُرتکلف کھانا کھلایا۔ دو روز دیشیوں کے علاقے میں رہے۔ پھر چار پانچ مقام بھٹکول میں کیے۔ مجاہدین کی روانگی کے بعد صاحبزادہ محمد نصیر کو حد درجہ افسوس ہوا اور اس نے انھیں روکنے کی غرض سے بھٹکول کے گھاٹ سے جالے بھی ست بہار منگوا لیے تھے۔ مولوی خیرالدین شیرکوٹی نے دوبارہ صاحبزادے سے مل کر اسے مجاہدین کے چلے جانے پر راضی کر لیا اور جالے لے کر آئے۔ مجاہدین عبورِ دریا کے بعد سنڈاکئی پہنچے۔ ایک اور بستی میں ٹھہرتے ہوئے کابل گرام گئے، جہاں فتح خاں پنجتاری کا بھائی احمد خاں پیشوائی کے لیے ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں سے کرنا، بر ڈھیری، منگل تھانہ اور دکھاڑا ہوتے ہوئے پنجتار پہنچ گئے۔

مولوی محمد قاسم پانی پتی اور مولوی خیرالدین شیرکوٹی بھٹکول ہی میں رہے۔ انھوں نے مولوی عبدالحلیم بردوانی کو مجاہدین کا امیر بنا دیا تھا۔ مولوی محمد قاسم کا عذر یہ تھا کہ پنجتار سے سید صاحب ہجرت کر کے آئے تھے۔ میں وہاں نہ جاؤں گا، نیز سید صاحب کے زندہ ہونے کی خبریں مل رہی ہیں۔ میں انھیں تلاش کروں گا۔ مولوی خیرالدین صرف سید صاحب کی تلاش کے خواہاں تھے۔ ضلع مظفر آباد کے تین نومسلم بھائی عبداللہ، عبدالکریم اور عبدالرحیم مولوی صاحب موصوف کے ساتھ رہے۔ جیسا کہ جماعت مجاہدین میں بتایا جا چکا ہے، مولوی خیرالدین بعد ازاں سرحد سے وطن چلے آئے تھے

[1] "وقائع" جلد سوم ص ۳۲۸۔

چوتھا باب

شیخ ولی محمدؒ کا سفرِ سوات و بونیر

پیشِ نظر مقصد ہم بتا چکے ہیں کہ شیخ ولی محمد مجاہدین کی بڑی جماعت کو کوہانہ بھیجنے کے بعد خود اس غرض سے ست بہار ٹھہر گئے تھے کہ بی بی صاحبہ کو سندھ پہنچانے کے لیے کوئی مناسب تدبیر اختیار کر سکیں۔ صاحبزادہ محمد نصیر انتظام عُشر کے لیے کوہانہ جانے لگے تو شیخ نے ان سے اجازت لے لی تھی کہ ہم لوگ تختہ بند (بونیر) سید میاں کے پاس جانا چاہتے ہیں اس لیے کہ انھیں کے ذریعے سے بی بی صاحبہ کو سندھ پہنچانے کا بندوبست کرایا جا سکتا ہے۔ صاحبزادے کو گئے ہوئے ایک مہینا گزرا تو شیخ ولی محمد اور مولوی نصیر الدین نے باہم مشورہ کر کے اخوند محمد ارم کو بھنکول سے بلایا اور کہا کہ تختہ بند پہنچنے کی کوئی مناسب تدبیر کر دیجیے۔ اخوند موصوف کی رائے پہلے ہی سے یہ تھی کہ صاحبزادہ محمد نصیر اور مجاہدین میں موافقت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی؛ لہٰذا بی بی صاحبہ کو یہاں سے نکال لے جانا ہی مناسب تھا، چنانچہ اخوند نے سنڈاکئی میں اپنی برادری کے لوگوں سے مشورہ کر کے ایک پروگرام بنا لیا۔ براہِ راست تختہ بند جانے میں اندیشہ تھا کہ مختلف مقامات پر رکاوٹوں سے سابقہ پڑے، لہٰذا قرار پایا کہ کوہستانی علاقے سے سوات پہنچیں اور وہاں سے پلٹ کر بونیر آئیں۔ یہ راستہ یقیناً بے حد لمبا اور دشوار گزار تھا، لیکن اسے اختیار کیے بغیر محفوظ طریق پر تختہ بند پہنچنا ممکن نہ تھا۔

مشقت خیز سفر روانگی کا فیصلہ ہو گیا تو شیخ ولی محمد نے کوہانہ میں مولوی محمد قاسم کو لکھ بھیجا کہ ہم بی بی صاحبہ کے ساتھ تختہ بند جا رہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر جو کچھ لکھیں، اس کے مطابق عمل پیرا ہونا۔ چنانچہ شیخ صاحب ست بہار سے بھنکول پہنچے۔ وہاں سے عبورِ دریا کے بعد چار پانچ

مقام سنڈاکئی میں کیے۔ اخوند محمد ارم اور ان کی برادری ہی کے لوگوں نے صوات اطلاع بھیج دی تھی، وہاں سے تین آدمی پیشوائی کے لیے سنڈاکئی آگئے۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر خُونہ کا صاحبزادہ تھا، جو صوات بالا میں درشخیلہ کے قریب ایک مشہور مقام ہے۔ سنڈاکئی سے بڑے بڑے پہاڑوں پر چڑھتے اترتے آٹھویں یا نویں روز مع الخیر خُونہ پہنچے۔ صاحبزادے نے بی بی صاحبہ اور تمام مجاہدین کو اپنے پاس ٹھہرایا اور ارد گرد کی بستیوں سے عُشر کا غلّہ لانے کا بندوبست کر دیا۔

تختہ بند اور ناواگئی میں پیغام خُونہ میں پہنچے ہوئے ایک مہینا گزر گیا تو شیخ ولی محمد اور مولوی نصیر الدین نے باہم مشورہ کرکے مندرجہ ذیل اصحاب کو سیّد میاں کے پاس تختہ بند بھیجا:

حاجی محمد فاضل پشاوری۔ ابراہیم خاں خیر آبادی۔ محمد حسین سہارن پوری، داروغہ عبد القیوم اور اخوند محمد عظیم (ساکن کالوخاں)، تاکہ سیّد موصوف سے بات چیت کرکے بی بی صاحبہ کو سندھ پہنچانے کا راستہ تجویز کرا لیں۔

یہ لوگ تختہ بند پہنچے تو سیّد میاں نے بالاکوٹ کی جنگ کے پورے حالات سُنے۔ پھر انھیں اپنے چچیرے بھائی سیّد رسول کے پاس ناواگئی (چملہ) بھیج دیا تاکہ ان کی رائے بھی لے لی جائے۔ سیّد صاحب پنجتار سے ہجرت کرکے راج دواری گئے تھے تو اپنی بہت سی فالتو چیزیں ناواگئی میں سیّد رسول کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ مثلاً مسی ظروف، دو قیمتی زرہیں، تین خیمے، دو قالین وغیرہ۔ شیخ ولی محمد نے آدمیوں سے کہہ دیا تھا کہ اس سامان کی فروخت کا بندوبست ہو سکے تو فروخت کر دینا۔ سیّد رسول نے بھی بالاکوٹ کی جنگ کی تفصیلات پوچھیں۔

شیخ ولی محمد کو بلانے کا فیصلہ پہلے قاصد تین مہینے تک واپس نہ ہوئے تو شیخ ولی محمد نے اخوند فیض محمد غزنوی کو بھیجا۔ اس اثناء میں سیّد میاں نے بونیر کے خوانین اور سیّد رسول نے چملہ کے خوانین کا جرگہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں فتح خاں پنجتاری بھی سیّد میاں اور سیّد رسول کے پاس بار بار پیغام بھیجتا رہا کہ شیخ ولی محمد اور ان کے ساتھیوں کو میرے پاس لے آئیے۔ میں سیّد صاحب کا پرانا نیازمند ہوں، ان بھائیوں کی خدمت میں کوتاہی نہ کروں گا۔ چنانچہ جرگوں اور طویل مشوروں

کے بعد پورا اطمینان کر کے سید میاں اور سید رسول نے فیصلہ کیا کہ بی بی صاحبہ، شیخ ولی محمد اور مجاہدین کو خُونہ سے اپنے پاس لے آئیں۔ پھر اُن سے بات چیت کر کے جو کچھ قرار پائے، اس کے مطابق عمل کریں۔

خُونہ سے تختہ بند اس فیصلے کے بعد تختہ بند سے سید میاں اور ناواگئی سے سید رسول کے بھائی سید حسین شیخ ولی محمد کے قاصدوں کے ہمراہ خُونہ گئے تاکہ مجاہدین کو ساتھ لے آئیں۔ کچھ معلوم نہیں کہ وہاں کیا بات چیت ہوئی۔ روایتوں میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ شیخ صاحب خُونہ سے روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ جس صاحبزادے کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے اُس نے روانگی کے وقت پُرتکلف دعوت کی۔ وہاں سے چلے تو چار باغ میں مقام کیا۔ سوات میں سید صاحب کے ایک مخلص عقیدت مند سید عبدالقیوم تھے۔ وہ مجاہدین کے ساتھ رہے۔ چار باغ کے پیرزادے بھی ہمراہ ہو گئے۔ دو روز منگورہ میں قیام کیا۔ ایک ایک دن بری کوٹ، جوڑ اور ایلئی میں ٹھہرے۔ ہر مقام کے لوگوں نے مہمانداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ تختہ بند پہنچے تو سید میاں نے بی بی صاحبہ کے لیے الگ مکان خالی کرا دیا، باقی مجاہدین کے قیام کا بھی بہت عمدہ بندوبست کر دیا۔

تختہ بند اور ناواگئی تختہ بند میں سیدوں کے چار گھر تھے۔ ایک سید میاں کا، دوسرا سید اعظم کا، تیسرا سید قاسم کا اور چوتھا سید سلیمان کا۔ ان چاروں نے ایک ایک دن مجاہدین کی دعوت کی۔ پھر باہم مشورے سے قرار پایا کہ بی بی صاحبہ تختہ بند میں ٹھہریں اور باقی مجاہدین کو شیخ ولی محمد کے ہمراہ ناواگئی بھیج دیا جائے۔ مندرجۂ ذیل اصحاب بی بی کی خدمت کے لیے مقرر کر دیے گئے:

سید حامد علی جھنجھانوی، اخوند فیض محمد غزنوی، حفیظ اللہ دیوبندی، ابراہیم خاں خیرآبادی، اللہ بخش خیاط لکھنوی، شیخ گلاب ساکن میان دوآب، شیخ لکھمیرا اور داروغہ عبدالقیوم۔

سید میاں اپنے دل میں طے کر چکے تھے کہ شیخ ولی محمد مجاہدین کے ہمراہ پنجتار چلے جائیں (تفصیلات آگے آئیں گی)، لیکن جماعت میں سے کسی کو اس بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ یہ راز ناواگئی پہنچنے پر منکشف ہوا۔

فتح خاں پنجتاری فتح خاں ان خوانین میں سے تھا جنھوں نے سیّد صاحب کے ورودِ سرحد کے ساتھ ہی آپ سے رشتۂ عقیدت استوار کیا تھا۔ اس کا وطن پنجتار کم و بیش چار سال سیّد صاحب کا مرکز رہا۔ اس اثناء میں اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوئی جو جہاد فی سبیل اللہ میں اعانت کے منافی ہوتی، البتہ جب پشاوری سرداروں اور خوانین سمہ نے سیّد صاحب اور مجاہدین کے خلاف کُشت و خون کی خوفناک سازش کی تو فتح خاں کی حیثیت مشتبہ ہو گئی۔ وہ بہ ظاہر سیّد صاحب سے عقیدت کا اظہار کر رہا تھا، لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ سازشی خوانین سے بھی اس کا دوستانہ تعلّق قائم ہے۔ اس کی یہی دورنگی پنجتار سے ہجرت کی فیصلہ کُن محرّک تھی، تاہم سیّد صاحب نے روانگی کے وقت اس کی برادری کے لوگوں کو یہ تلقین فرمائی تھی کہ فتح خاں کے فرمانبردار رہنا اور جو عُشر ہمیں دیتے رہے ہو، وہ آئندہ فتح خاں کو دینا۔

پنجتار سے سیّد صاحب کی روانگی کے ساتھ ہی فتح خاں کی سابقہ حیثیت میں خلل پیدا ہو گیا اور اس کی سرداری کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ اس کی برادری کے جتنے گاؤں تھے، ایک ایک کر کے الگ ہوتے گئے۔ وہ تنہا انھیں اپنے تابع نہ رکھ سکتا تھا۔ سیّد صاحب اور مجاہدین کی وجہ سے اسے جو ممتاز حیثیت حاصل ہوئی تھی، وہ ختم ہو گئی۔

بحالیِ اقتدار کی کوشش اس صورتِ حال پر وہ طبعاً پشیمان ہوا اور بحالیِ اقتدار کی تدبیریں سوچنے لگا۔ جب اسے اطلاع ملی کہ شیخ ولی محمّد مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ صوات پہنچ گئے ہیں اور سیّد میاں ساکن تختہ بند کے ساتھ نامہ و پیام جاری ہے تو اس نے بھی سیّد رسول ساکن ناداگئی اور سیّد میاں کے پاس پیغامات بھیجے کہ میں بھی سیّد بادشاہ کا مرید اور خلیفہ ہوں۔ ایسی تدبیر کیجیے کہ شیخ ولی محمد میرے پاس تشریف لے آئیں۔ میں ان کے کھانے پہننے کی ذمّہ داری قبول کرتا ہوں، تمام مجاہدین کی خدمت کرتا رہوں گا اور ان کے ساتھ ہو کر سکھوں سے جہاد کروں گا۔

یہ پیغامات بار بار آئے تو سیّد میاں نے بونیر کے خوانین اور سیّد رسول نے چملہ کے

خوانین کا اجتماع منعقد کیا، تمام حالات انھیں بتائے ساتھ ہی کہا کہ اگر مجاہدین کو پنجتار بھیج دیا جائے اور فتح خاں کسی موقع پر ان سے دغا کرے تو ہماری بدنامی ہوگی۔ دنیا کہے گی کہ ان سیّدوں نے مجاہدین کو خُونہ سے بُلا کر فریب کیا۔ آپ لوگ بتائیں کہ آپ اس کام میں ہمارے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہیں کہ نہیں؟ انھوں نے غور و فکر کے بعد جواب دیا کہ ہم بہر حال آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ مجاہدین کو بھیج دیجیے۔ فتح خاں کی مجال نہیں کہ آپ کو بیچ میں ڈال کر بدعہدی کرے۔ اگر خدا نخواستہ اس نے کوئی نامناسب حرکت کی تو ہم سمجھ لیں گے۔ اس دل جمعی کے بعد سیّد میاں مجاہدین کو خُونہ سے تختہ بند لائے اور انھیں ناواگئی بھیج دیا، جہاں سید رسول نے پہلی مرتبہ انھیں بتایا کہ آپ حضرات کو پنجتار بھیجنا منظور ہے۔

شیخ کا تامّل اور آخری فیصلہ شیخ ولی محمّد پر یہ حقیقت منکشف ہوئی تو انھوں نے پنجتار جانے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ فتح خاں دنیا دار آدمی ہے۔ اس کے پاس ہمارا گزارہ نہ ہوگا۔ اندیشہ ہے کہ وہ ہم سے دغا کرے۔ اس وقت سیّد رسول نے خوانین چملہ و بونیر کے جرگوں کی مفصّل کیفیت بتا دی اور کہا کہ ہم آپ کو ان خوانین کے اتّفاق سے پنجتار بھیج رہے ہیں۔ فتح خاں میں یہ جرأت نہیں کہ چملہ و بونیر کے خوانین کی متّفقہ رائے کے خلاف کوئی قدم اٹھائے۔ اس اثناء میں ہم پوری کوشش کریں گے کہ بی بی صاحبہ کو سندھ پہنچانے کا کوئی مناسب ذریعہ پیدا کر لیں۔ آپ کو یہاں ٹھہرانے کا اصل مقصد یہی ہے کہ اوّل بی بی صاحبہ کو سندھ پہنچانے کی کوئی صورت پیدا کر لیں۔ دوسرے سیّد بادشاہ کے زندہ ہونے کی خبریں مل رہی ہیں، خدا کرے کہ اس اثناء میں وہ ظاہر ہو جائیں۔ اگر پنجتار کا قیام آپ کی رائے اور مرضی کے مطابق نہ ہوگا تو واپس چلے آنا۔ ہم آپ کو بھی سندھ پہنچا دیں گے۔

تمام حالات سُن کر شیخ ولی محمّد نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔

ناواگئی سے پنجتار شیخ صاحب اور مجاہدین کو ناواگئی پہنچے ہوئے چھ سات روز گزرے تھے کہ فتح خاں کی طرف سے تین معتبر آدمی مجاہدین کو ساتھ لے جانے کے لیے ناواگئی آ گئے۔

ان میں سے ایک تو تالی کا خان تھا، جس کا نام روایتوں میں سرکاری بتایا گیا ہے۔ وہ فتح خاں کا خاص مصاحب اور رفیق تھا، دوسرا قاسم خیل کا قاضی تھا، تیسرا کوئی اور عالم۔

ناوا گئی سے پنجتار کا سیدھا اور قریبی راستہ چندلئی (چنگلئی) میں سے تھا۔ وہاں کے لوگ فتح خاں کے دشمن تھے۔ انھوں نے شیخ ولی محمد کے پاس پیغام بھیج دیا کہ اگر چندلئی میں قیام منظور ہے تو بے تکلف تشریف لائیے۔ ہم سب خادم اور فرماں بردار ہیں، لیکن اگر فتح خاں کے پاس پنجتار جانا مقصود ہے تو چندلئی ہرگز نہ آئیے اور کوئی دوسرا راستہ اختیار کیجیے۔ اس وجہ سے لمبا اور پُر پیچ راستہ اختیار کرنا پڑا۔

سید رسول نے اپنے چھوٹے بھائی سید اعظم کو جماعت مجاہدین کے ہمراہ کر دیا۔ وہ ناوا گئی سے روانہ ہو کر مخرٹنی[1] میں ٹھہرے، جہاں سید رسول کی سسرال تھی۔ سید موصوف کے خسر نواب خاں نے نصف مجاہدین کی دعوت کی باقی لوگوں کو بستی والوں نے کھانا کھلایا۔ اگلے روز منگل تھانہ پہنچے جو سید میاں کے بھائی بندوں کی بستی تھی۔ شاہ زنداں وہاں کا رئیس تھا۔ کابل اخوند زادے کا گھر بھی وہیں تھا۔ تیسرے دن دکھاٹہ ہوتے ہوئے پنجتار کا رُخ کیا۔ اہل کھاٹہ نے بہ اصرار روکنا چاہا۔ شیخ صاحب نے معذرت کی۔ پنجتار سے ایک کوس کے فاصلے پر فتح خاں پیشوائی کے لیے موجود تھا۔

یوں تقریباً ایک سال[2] کے بعد مجاہدین پھر پنجتار میں وارد ہوئے، جس کی سرزمین کا چپہ چپہ

---

[1] یہ خدو خیلوں کا گاؤں ہے، جو فتح خاں کے ہم قوم تھے۔ روایتوں میں اسے مکھڑنی لکھا گیا ہے۔ صحیح تلفظ مخرٹنی ہے۔

[2] سید صاحب نے وسط رجب ۱۲۴۶ھ میں پنجتار سے ہجرت کی تھی۔ ۲۴۔ ذی قعدہ کو بالاکوٹ کی لڑائی ہوئی۔ عید اضحیٰ تک مجاہدین ست بھارہ پہنچ چکے تھے۔ شیخ ولی محمد نے پونے دو مہینے وہاں بسر کیے۔ گویا محرم ۱۲۴۷ھ کا مہینا ست بھارہ ہی میں گزارا۔ پھر بی بی صاحبہ کے ساتھ روانہ ہو کر تقریباً پندرہ دن میں (بہ شمول قیام و سفر) خونہ پہنچے۔ ایک مہینے کے بعد قاصد تختہ بند بھیجے۔ تین مہینے مشوروں میں گزر گئے۔ پھر کچھ وقت خونہ سے تختہ بند، ناوا گئی اور پنجتار پہنچنے میں لگا، لہٰذا میرا اندازہ ہے کہ جمادی الاخریٰ یا رجب میں وہ پنجتار پہنچے ہوں گے۔ یوں ایک سال کی مدت بن گئی۔

چار سال تک ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز رہا تھا، لیکن اب ان کی حالت وہ نہ تھی، جس میں وہ پنجتار سے رخصت ہوئے تھے۔ سید صاحب، مولانا شاہ اسمٰعیل اور دوسرے بہت سے اکابر راہ حق میں شہادت پا چکے تھے۔ اگرچہ ان کے بلند مقاصد اور ان کی خاطر پہلی سی فداکاری میں کوئی فرق نہ آیا تھا، تاہم ان کی سابقہ شان باقی نہ رہی تھی۔

قیام کا انتظام یاد ہوگا کہ سید صاحب نے پنجتار میں مجاہدین کے لیے مکان بنوا کر ایک مستقل آبادی کا انتظام کر لیا تھا۔ فتح خاں نے وہ تمام مکان مجاہدین کے حوالے کر دیے اور شیخ ولی محمد امیر جماعت کو اُس بُرج میں ٹھہرایا، جس میں سید صاحب رہتے تھے۔ دو روز تک فتح خاں کے ہاں سے کھانا آتا رہا، پھر غلے کا وہ ذخیرہ ان کے لیے کھول دیا گیا جو سید صاحب کے زمانے سے محفوظ چلا آتا تھا اور معمول کے مطابق غلہ تقسیم ہونے لگا۔

مولوی محمد قاسم اور مولوی خیر الدین شیر کوٹی مجاہدین کی بڑی جماعت کے ساتھ کوہانہ ہی میں مقیم تھے۔ شیخ ولی محمد نے پنجتار پہنچتے ہی آدمی بھیج دیے کہ سرکاری اونٹ پنجتار لے آئیں، اس لیے کہ سندھ ساڑ میں سردی زیادہ تھی جو اونٹوں کے لیے سازگار نہ تھی۔ جنگ زیدہ کے بعد اونٹوں کی تعداد اسّی کے قریب پہنچ گئی تھی۔ پھر مرتے مرتے دس بارہ رہ گئے۔ مولوی محمد قاسم اور مولوی خیر الدین نے اونٹوں کے ساتھ احمد یار خاں، کریم اللہ خاں، عبدالحمید خاں، نور سندھی، اخوند خیر الدین، حاجی عبداللہ گورکھپوری اور حاجی یوسف کشمیری کو بھیج دیا۔ محمد قائم ساکن امروہہ کو ان کا امیر بنا دیا۔ یہ لوگ ستگئی پہنچے، جہاں سے دریا عبور کرنا تھا۔ چھ سات روز تک عبور کا کوئی انتظام نہ ہو سکا، اس لیے کہ کشتیوں والے ایک روپیہ فی اونٹ مانگتے تھے۔ پھر اتفاق سے وہاں سخت زلزلہ آیا۔ لوگوں نے سمجھا کہ زلزلہ سید صاحب کے اونٹ پار نہ اتارنے کی سزا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بلا اُجرت اونٹ پار اتار دیے۔ چھ سات دن میں یہ لوگ پنجتار پہنچ گئے۔ اس سے تقریباً تین مہینے بعد کوہانہ کے مجاہدین بھی پنجتار آ گئے۔ ان کی آمد کے حالات پیشتر بیان کیے جا چکے ہیں۔

پانچواں باب

مجاہدین پنجتار میں

(۱)

پریشان حالی کی وجہ ممکن ہے، آپ کے دل میں سوال پیدا ہو کہ مجاہدین کیوں ایک مقام پر جم کر نہ ٹھہر سکے اور کس وجہ سے انھیں پے در پے اپنی قیام گاہیں چھوڑنی پڑیں؟ وہ پہلے ہنڈ میں ٹھہرے تھے، لیکن ہم بتا چکے ہیں کہ دس مہینے کے بعد انھیں وہاں سے مجبوراً نکلنا پڑا۔ پنجتار میں بھی ان کے لیے مستقل قیام غیر ممکن ہو گیا، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔ اس کے بعد پائندہ خاں تنولی ان کا رفیق بن گیا، لیکن اس سے بھی نبھ نہ سکی۔ آخر انھیں ستھانہ میں اقامت اختیار کرنی پڑی۔ اس پریشان حالی کا سبب یہ ہے کہ سادات ستھانہ کے سوا سرحد کے اکثر خوانین اور پیرزادے صرف نمود و نمائش کے پرستار تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے ان کے دلوں میں کوئی مخلصانہ جذبہ موج زن نہ تھا۔ مجاہدین کی قوت و جانبازی سے دنیوی اغراض میں فائدہ اٹھانے کے لیے وہ تیار ہو جاتے تھے، لیکن نہ وہ للّٰہیت کی روح سے آشنا تھے اور نہ مجاہدین کے گزارے کا معمولی انتظام انھیں قابل برداشت معلوم ہوتا تھا۔ مجاہدین للّٰہی مقاصد کی خاطر ہر پیشکش کو قبول کر لینے پر آمادہ ہو جاتے تھے، لیکن جب حقیقی مقاصد کے لیے مخلصانہ کام میں اعانت سے کامل مایوسی ہو جاتی تھی تو انھیں اس کے سوا چارہ نہ رہتا تھا کہ کوئی دوسرا امن تلاش کریں۔ صرف ستھانہ، چملہ اور بونیر کے سادات کا دامن غرض پرستی کے لوث سے پاک رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سوا مجاہدین کی حقیقی اعانت و رفاقت کا حق کوئی ادا نہ کر سکا۔

ہری سنگھ نلوہ کا خط مجاہدین کو پنجتار پہنچے ہوئے تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ ہری سنگھ نلوہ

سرحد پہنچا اور اس نے خواص خاں خٹک رئیسِ اکوڑہ کو وکیل بنا کر تمام خوانین سمہ کے پاس بھیجا کہ خراج ادا کریں۔ ایک خط فتح خاں پنجتاری کے نام بھی آیا کہ تمھارے پاس سیّد صاحب کی توپیں محفوظ ہیں۔ وہ حوالے کر دو، ورنہ لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ فتح خاں نے اس کا جو جواب دیا، اس کا خلاصہ یہ ہے :

۱۔ مجھے سیّد بادشاہ کی توپوں کے متعلق کچھ علم نہیں۔ مجاہدین کو ان کا پتا ہو گا اور وہ میرے قابو میں نہیں۔

۲۔ اگر تم یورش کرو گے تو جب تک لڑ سکوں گا، لڑوں گا، دباؤ بڑھے گا تو اپنے لوگوں کو لے کر پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔

۳۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ تم لوگ میری بستیوں کو برباد کر ڈالو گے، لیکن تمھاری واپسی کے بعد پھر آ کر انھیں آباد کر لوں گا۔

مقابلے کی تیاری چونکہ سکھوں کی یورش کا شدید خطرہ لاحق تھا، اس لیے فتح خاں نے اپنے ہم قوموں کے علاوہ چملہ اور بونیر کے تمام خوانین و رؤسا کے پاس پیغامات بھیج دیے کہ سکھ پنجتار پر پیش قدمی کرنے والے ہیں۔ اگر چملہ و بونیر کا یہ دروازہ ان کے قبضے میں آگیا تو تم لوگوں کی آزادی بھی محفوظ نہ رہ سکے گی، لہٰذا پنجتار کو بچانے کی غرض سے جو کچھ کر سکتے ہو، اس کے لیے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں تین ہزار تین سو پچاس جانباز پنجتار میں جمع ہو گئے۔

سیّد صاحب کے زمانۂ قیام میں بھی سکھوں نے پنجتار پر حملے کی تیاری کی تھی اور سیّد صاحب کے حکم سے مناسب مقامات پر دفاعی مورچے بنا لیے تھے۔ وہ مورچے محفوظ تھے اور ان میں آدمی بٹھا دیے گئے۔ رات کے وقت فتح خاں کے سوار درے کے دہانے پر پہرہ داری کے لیے پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح پنجتار کی حفاظت ہوتی رہی۔

خواص خاں سے گفتگو اس اثنا میں ہری سنگھ کی طرف سے خواص خاں مانیری پہنچ گیا اور پیغام بھیجا کہ فتح خاں جہاں چاہے، گفتگو کر لے۔

چنانچہ سلیم خاں کا میدان گفتگو کے لیے تجویز ہوا۔ قرار پایا کہ فتح خاں اور خواص خاں بیس بیس پچیس پچیس سوار اور اتنے ہی پیادے لے کر اُس میدان پہنچ جائیں۔ مجاہدین میں سے کوئی شخص فتح خاں کے ساتھ نہ گیا، البتہ شیخ نجم الدین رام پوری بہ طور خود ساتھ ہو گئے۔

گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ خواص خاں نے سید صاحب کی توپوں کا مطالبہ کیا۔ فتح خاں نے وہی جواب دیا، جو اس سے پیشتر خط میں لکھ چکا تھا۔ خواص خاں نے کہا کہ خیر اِس معاملے کو جانے دو، مگر دوسرے خوانین کی طرح گھوڑا اور باز دے کر ہری سنگھ سے پیچھا چھڑاؤ۔ فتح خاں نے کہا کہ گھوڑے کی جگہ گدھا اور باز کی جگہ چڑیا بھی نہیں دے سکتا۔ خواص خاں اس پر ناراض ہو کر چلا گیا اور فتح خاں واپس آ گیا۔ دفاعی انتظامات بدستور قائم رہے۔ جب تیسرے چوتھے روز معلوم ہوا کہ سکھوں کی فوج دریا عبور کر کے واپس چلی گئی ہے تو فتح خاں نے اپنی برادری اور چملہ و بونیر کے لشکروں کو پنجتار سے رخصت کر دیا۔

نجم الدین کی گرفتاری | ہم بتا چکے ہیں کہ نجم الدین رام پوری بہ طور خود فتح خاں کے آدمیوں کے ساتھ چلے گئے تھے۔ سلیم خاں کے میدان میں پہنچ کر وہ سکھوں کی فوج کے مسلمانوں میں تبلیغِ حق کرتے رہے، اس بنا پر گرفتار ہو گئے۔ انھوں نے خود اس ابتلاء کے حالات یوں بیان کیے کہ میں دو دفعہ سکھوں کے لشکر میں گیا اور مسلمانوں کو وعظ و نصیحت سے راہ پر لایا۔ وہ سکھوں کی نوکری چھوڑ کر ہمارے پاس آنے کو تیار تھے۔ اس اثناء میں مجھے گرفتار کر کے لاہور بھیج دیا گیا۔ یہ خبر رنجیت سنگھ تک پہنچی تو مجھے دربار میں بُلایا گیا۔ مہاراجہ نے دیکھتے ہی میری زنجیریں اتروا دیں اور کہا کہ میں نے خلیفہ صاحب[۱] کے مجاہدوں کی بھرماری کے متعلق بہت کچھ سُنا ہے، ذرا مجھے بھی اس کا نمونہ دکھاؤ۔ چنانچہ میں نے بھرماری کے کئی فائر کیے۔ رنجیت سنگھ بہت خوش ہوا اور کہا ہماری نوکری کر لو۔ میں نے جواب دیا کہ ہم جہاد کے لیے یہاں آئے ہیں، کسی کی نوکری نہیں کر سکتے۔

---

[۱] "سیرت سید احمد شہید" میں بتایا جا چکا ہے کہ سکھ سید صاحب کو "خلیفہ صاحب" کہتے تھے۔

غرض مہاراجہ نے نجم الدین کو ایک تیلیا گھوڑا، دو بنارسی دوپٹے اور پچاس روپے نقد دے کر اپنے آدمیوں کو تاکید کر دی کہ یہ جہاں جانا چاہے، بحفاظت پہنچا دو۔ چنانچہ نجم الدین اٹک پہنچا دیا گیا۔ وہاں سے وہ پنجتار آ گئے۔ گھوڑا، دوپٹے اور روپے شیخ ولی محمد کی خدمت میں پیش کر دیے کہ یہ چیزیں خدا کا مال ہیں اور انھیں بیت المال میں داخل کر لیا جائے۔

فتح خاں اپنے اصلی رنگ میں سکھوں کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو فتح خاں نے یہ تجویز پیش کر دی کہ میری قوم کی بستیاں مجھ سے باغی ہیں۔ اب ضروری ہے کہ انھیں میری اطاعت پر مجبور کر کے عشر کا انتظام کیا جائے تاکہ مجاہدین کے گزارے کا بندوبست ہو سکے۔ میں تنہا اتنے بڑے لشکر کے خرچ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجاہدین کو پنجتار لانے میں اس کی اصل غرض یہی تھی۔ مجاہدین کی امداد کے بغیر وہ کسی بستی کو اپنے تابع نہ لا سکتا تھا۔

شیخ ولی محمد نے مجلس شوریٰ منعقد کی، جس میں مندرجۂ ذیل اصحاب شریک تھے:

مولوی نصیر الدین منگلوری، محمد سعید خاں جہان آبادی (متصل رائے بریلی)، پیر مبارک علی جھنجھانوی، ملا علی خان کٹھاہی، اخوند گل پشاوری، اللہ نور شاہ ساکن ٹوپی، بابر شاہ ننگرہاری، جعفر خاں ترین ہزاروی، منشی محی الدین کشمیری، خوش باش امازئی، ملا لعل محمد قندھاری، ملا نور محمد قندھاری، ملا لعل میر قندھاری، خضر خاں قندھاری، عبدالصمد خاں خیبری، ملا گلزار محمد خیبری۔ اس مجلس میں قندھاری اور ہندوستانی مجاہدوں کے علاوہ دوسرے اصحاب کو بھی شامل کر لیا گیا۔

مصالحت کی تجویز فتح خاں کی تجویز سنتے ہی سب بول اُٹھے کہ وہ اپنے اصل رنگ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ دنیادار آدمی ہے، اپنی سرداری اور ناموری چاہتا ہے۔ دین سے اسے کچھ غرض نہیں۔ ہم لوگ حجتِ شرعی کے بغیر مسلمانوں پر فوج کشی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ غور و مشورہ کے بعد مجاہدین نے فتح خاں سے کہہ دیا کہ تمام بستیوں کو مصالحت کا پیغام بھیجو۔ اگر قبول کر لیں تو معاملہ ختم ہو جائے گا۔ قبول نہ کریں اور مقابلے کے لیے تیار ہوں تو پھر سوچا جائے گا کہ اس سلسلے میں مناسب راہِ عمل کیا ہونی چاہیے۔

چنانچہ پنجتار کی چار بستیوں قاسم خیل، غورغشتی، سنگ بٹی اور خلی کھٹی[1] کے باشندوں نے مصالحت کا پیغام ملتے ہی کہلا بھیجا کہ ہم ہر خدمت کے لیے حاضر ہیں اور ہمارے لیے جو کچھ تجویز کیا جائے، وہ ہمیں بے تکلف منظور ہے۔ اس طرح پنجتار کے گرد و نواح کا معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا، البتہ باقی بستیاں مصالحت کے لیے تیار نہ ہوئیں اور ان کے متعلق جو تدبیریں اختیار کرنی پڑیں، وہ تفصیلاً آئندہ باب میں بیان کی جائیں گی ÷

---

[1] "وقائع" کی اس روایت سے معلوم ہوا کہ جس مقام کو آج کل پنجتار کہتے ہیں، اس کا اصل نام سیدو تھا اور ابتدا میں پانچوں بستیوں کے لیے پنجتار کا نام استعمال کیا جاتا تھا۔

چھٹا باب

مجاہدین پنجتار میں

(۲)

"جھنڈا بوکا" کا قضیہ آس پاس کی بستیوں کا فیصلہ مصالحت سے ہوگیا تو فتح خاں نے جھنڈا بوکا کے خان فیض اللہ خاں پر لشکرکشی کا ارادہ کرلیا اور شیخ ولی محمد سے اعانت کا طلب گار ہوا۔ شیخ نے جواب دیا کہ بلاشبہہ آپ ہمارے معاون ہیں، ہمیں اپنے ہاں ٹھہرنے کے لیے جگہ دی ہے، لیکن ہم صرف امیرالمومنین کے انتظار میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو غیر مسلموں سے جہاد درپیش ہو تو ہم جانیں دینے کے لیے تیار ہیں۔ مسلمانوں سے نہیں لڑ سکتے۔ ہمیں مہلت دیجیے، فیض اللہ خاں کے پاس اپنے آدمی بھیجیں گے اور مصالحت کی کوئی صورت نکالیں گے۔

فیض اللہ کے پاس پیغام چنانچہ شیخ صاحب نے شیخ فتح علی عظیم آبادی کو تقریباً بیس مجاہدین کے ساتھ فیض اللہ خاں کے پاس بھیج دیا۔ خان موصوف نے کہا میں سید بادشاہ کا مطیع و فرماں بردار رہا، اب شیخ ولی محمد کا اطاعت گزار ہوں۔ اگر وہ اپنا ایک آدمی بھیج دیں کہ جھنڈا بوکا خالی کرکے باہر چلے جاؤ تو ہرگز پس و پیش نہ کروں گا۔ فتح خاں مجھ پر زیادتی کرتا ہے۔ اس کی کوئی بات نہیں مان سکتا۔ اسے میری طرف قدم اٹھانے کا حوصلہ نہیں ہوسکتا، صرف آپ لوگوں کے بل پر چڑھائی کا ارادہ کیے بیٹھا ہے۔

شیخ فتح علی بات چیت کے بعد فیض اللہ خاں سے کہ آئے کہ اس قضیے کو ختم کرنے کی غرض سے اگر شیخ ولی محمد جھنڈا بوکا خالی کرنے کا پیغام بھیج دیں تو اسے ضرور قبول کرلینا۔ مقصود صرف یہ ہوگا کہ فتنہ بڑھنے نہ پائے اور حسن تدبیر سے امن کی صورت پیدا ہوجائے۔

چڑھائی اور مصالحت فتح خاں کو فیض اللہ خاں سے قلبی عداوت تھی، لہذا اس نے انتظار کیے بغیر چڑھائی کر دی۔ شیخ صاحب نے کوئی ایک سو کے قریب مجاہدین اس غرض سے ساتھ روانہ کیے کہ جس طور بھی ممکن ہو صورت حال کو سنبھالیں۔ ملا عزت قندھاری، بابر شاہ ننگرہاری اور سید اللہ نور شاہ ساکن ٹوپی ان مجاہدین کے افسر قرار پائے۔ فیض اللہ خاں کو الگ پیغام بھیج دیا کہ آپ مقابلہ ہرگز نہ کریں اور دو چار روز کے لیے باہر چلے جائیں۔ مال اسباب کی حفاظت کے ذمہ دار ہم ہیں۔ فتح خاں کے آدمیوں اور اپنے مجاہدوں کو تاکید کر دی کہ فیض اللہ خاں جھنڈا بوکا سے چلا جائے تو اس کے مال اسباب پر ہرگز دست اندازی نہ کی جائے۔ فیض اللہ خاں نے شیخ صاحب کے مشورے کے مطابق عمل کیا۔ اس کا مال اسباب کا ملا محفوظ رہا اور تمام لوگ ایک رات جھنڈا بوکا میں گزار کر پنجتار واپس آ گئے۔ یہ قضیہ یوں خوش اسلوبی سے ختم ہو گیا۔

باجا بام خیل کا معاملہ جھنڈا بوکا کے بعد فتح خاں نے باجا بام خیل کا معاملہ پیش کر دیا، جہاں تین بھائی سرداری کے منصب پر فائز تھے۔ ایک خانی، دوسرا محبت اللہ خاں، تیسرے کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ شیخ ولی محمد نے اس معاملے کو بھی مصالحت سے ختم کر دینے کی انتہائی کوشش کی، لیکن محبت اللہ خاں مفسد اور ضدی آدمی تھا۔ اس نے کوئی تدبیر کارگر نہ ہونے دی، بلکہ فتح خاں کو کہلا بھیجا کہ تم ہندوستانی مجاہدوں کے بل پر مجھے دبانا چاہتے ہو، میں ہرگز نہ دبوں گا۔ اپنے بھائی بندوں سے مشورہ کروں گا۔ اگر انھوں نے صلح کی رائے دی تو صلح کر لوں گا ورنہ تمھارے مقابلے پر جما رہوں گا۔

واضح رہے کہ یہ شخص مجاہدین کے خلاف اہل ستھانہ کی سازشِ قتل میں پیش پیش تھا اور مینئی کے مقام پر مجاہدین کی ایک بڑی جماعت کو شہید کرانے میں اس کی انگیخت بھی شامل تھی۔

یورش فتح خاں، محبت اللہ خاں کا پیغام سن کر یورش کے لیے تیار ہو گیا تو شیخ ولی محمد نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اپنے مجاہدین کو تیاری کا حکم دے دیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ حتی الامکان مصالحت کی صورت پیدا کریں یا کم از کم باہمی کشمکش اور خونریزی کو بڑھنے اور پھیلنے نہ دیں۔ اگرچہ وہ ان دنوں بیمار تھے، تاہم خود مجاہدین کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ نماز عشا کے بعد فتح خاں کے لشکری

اور مجاہدین پنجتار سے روانہ ہوئے۔ بام خیل سے نصف کوس پر درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ وہاں ٹھہر کر تین آدمی اس غرض سے بھیجے گئے کہ دیکھیں، صلح کا کوئی امکان ہے یا نہیں۔ جب معلوم ہوا کہ مقابلے کے لیے باقاعدہ مورچہ بندی کر لی گئی ہے تو لڑائی ناگزیر ہو گئی۔

جنگ

چنانچہ پورے لشکر کے دو حصے کر لیے گئے۔ مولوی نصیر الدین اور فتح خاں ایک حصے کو لیکر مشرقی جانب سے بستی میں داخل ہوئے۔ شیخ ولی محمد نے دوسرے حصے کے ساتھ شمالی جانب سے پیش قدمی کی۔ اس طرح مقابلہ کرنے والے دونوں لشکروں کے درمیان گھر گئے۔ بستی سے باہر نکلنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ شیخ صاحب کے ساتھ تھوڑے سے آدمی تھے، اس لیے مدمقابل نے ادھر کا رخ کیا۔ شاہباز ساکن بنوں، شیر محمد خاں رام پوری اور محمد امیر خاں قصوری نے قرابینیں چلائیں۔ بستی کے تین سرداروں میں سے دو وہیں گر گئے۔ تیسرا جس کا نام خانی تھا، گرفتار ہو گیا۔ مولوی نصیر الدین نے فوراً امن کا اعلان کر دیا۔ لڑائی روک دی اور سب کو تاکید فرما دی کہ کسی کے مال پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔

اس لڑائی میں تین مجاہد شہید ہوئے۔ ایک حبیب خاں ساکن بونیر، دوسرا خدا بخش ساکن امروہہ، تیسرا قوم کا مشوانی تھا اور اس کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ مقامی ملاؤں کو اجازت دے دی گئی کہ مقتول خوانین کو دفن کر دیں۔

خان کی رہائی

فتح خاں چاہتا تھا کہ خانی کو قتل کرا دے اور تینوں خوانین کے اہل و عیال گرفتار کر کے پنجتار لے جائے۔ شیخ ولی محمد اور مولوی نصیر الدین نے روک دیا۔ فرمایا کہ مقابلے میں جو مارا گیا، مارا گیا۔ اب کسی کی جان، مال یا آبرو پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ مقامی ملاؤں اور عالموں نے خانی کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ شیخ ولی محمد اور مولوی نصیر الدین نے یہ اقرار لے کر اسے رہا کرا دیا کہ وہ آئندہ فتنہ و فساد سے محترز رہے گا۔ فتح خاں دل سے اس امر پر راضی نہ تھا، لیکن شیخ ولی محمد اور مولوی نصیر الدین کی رائے اسے ماننی پڑی۔ باجا بام خیل سے وہ اپنا لشکر مرغز اور ٹھنڈ کوئی لے گیا۔

زیدہ کی سرداری کا مسئلہ "سیرت سید احمد شہید" میں تفصیلاً بتایا جا چکا ہے کہ زیدہ کے خان اشرف خاں کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا مقرب خاں سردار بنا تھا، اگرچہ خود اشرف خاں اپنے منجھلے بیٹے فتح خاں کو سردار بنانا چاہتا تھا۔ کچھ مدت کے بعد مقرب خاں زیدہ چھوڑ کر چلا گیا اور سید صاحب نے فتح خاں کو وہاں کا سردار بنا دیا۔ سید صاحب پنجتار سے ہجرت کر کے راج دواری چلے گئے تو سکھوں نے اس بنا پر فتح خاں اور اس کے بھائی ارسلان خان کو زیدہ سے نکال دیا کہ وہ سید صاحب کے مخلص عقیدت مند تھے اور سرداری کی مسند پر اشرف خاں کے بھائی لطف اللہ کو بٹھا دیا۔ مجاہدین دوبارہ پنجتار آگئے تو فتح خاں اور ارسلان خان نے اپنا موروثی منصب واپس دلانے کی درخواست کی۔ شیخ ولی محمد اور مولوی نصیر الدین نے لطف اللہ خاں کو ایک خط بھیجا، جس میں اسے مشورہ دیا کہ سرداری کا منصب بھتیجوں کے حوالے کر دے اور خود اسی طرح زیدہ میں رہے، جس طرح اشرف خاں کے زمانے میں رہتا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ فتح خاں سکھوں کے خوف سے زیدہ چھوڑ گیا تھا۔ میری قسمت نے یاوری کی اور سکھوں نے مجھے سردار بنا دیا۔ اب میں اس منصب کو چھوڑ نہیں سکتا۔ مجاہدین نے فتح خاں اور ارسلان خاں کی حق رسی کے لیے زیدہ کے محاصرے کی تیاری کر لی۔ عین اس موقع پر اخوند زعفران قندھاری نے یہ خبر پہنچائی کہ میں حضرت امیر المومنین کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں ان کے حکم کے بغیر تمھیں لڑنے بھڑنے کا کوئی حق نہیں۔

راوی کا بیان ہے :

یہ نہیں معلوم کہ لڑائی موقوف کرانے کو اخوند صاحب نے یہ خبر کہی یا اس میں کچھ اور مصلحت تھی۔ واللہ اعلم، مگر لوگوں نے یہ خبر سنتے ہی لڑائی موقوف کی۔[1]

---

[1] "وقائع" جلد سوم صفحہ ۳۶۰-۳۶۱۔ ہمیں بہرحال یہی سمجھنا چاہیے کہ اصل خبر بالکل بے بنیاد تھی۔ اخوند زعفران کے متعلق انتہائی حسنِ ظن کی بنا پر سمجھ سکتے ہیں کہ انھیں دھوکا لگا۔ چونکہ مجاہدین کے ایک گروہ کو اس وقت تک سید صاحب کی شہادت کا یقین نہ ہوا تھا، اس لیے انھوں نے بے تکلف خبر کو درست مان لیا، لیکن ظاہر ہے یہ خیال سراسر غلط تھا۔

رات کے وقت لشکر زیدہ سے اٹھ کر پنج پیر پہنچا اور وہاں سے پنجتار چلا گیا ۔

چندلئی پر فوج کشی

پنجتار کے شمال میں فتح خاں کے ہم قوموں کا ایک بڑا گاؤں چندلئی تھا۔ وہ لوگ بھی فتح خاں سے سرکشی اختیار کیے بیٹھے تھے۔ یاد ہوگا کہ جب شیخ ولی محمد نے پنجتار آنے کا قصد کیا تھا تو ان لوگوں نے شیخ کو پیغام بھیجا تھا کہ یہاں آکر رہنا چاہیں تو شوق سے آجائیں، ہم خدمت میں کوتاہی نہ کریں گے۔ اگر پنجتار جانا منظور ہو تو چندلئی کا راستہ ہرگز اختیار نہ کریں ۔

فتح خاں نے اب انھیں بھی زیر کر لینا چاہا اور شیخ ولی محمد سے بھی امداد مانگی۔ شیخ نے صاف کہہ دیا کہ ہندوستانی مجاہدوں میں سے ہم کسی کو نہ بھیجیں گے اور لوگ جانا چاہیں تو چلے جائیں۔ ہم خود نہ جانے کا حکم دیں گے، نہ کسی کو روکیں گے۔ فتح خاں نے چندلئی پر یورش کی۔ پہر ڈیڑھ پہر لڑائی ہوئی۔ اہل چندلئی مقابلہ نہ کر سکے اور گاؤں چھوڑ کر چمبلہ کے علاقے میں چلے گئے ۔

غرض پنجتار میں مجاہدین کے مختصر سے قیام کا نتیجہ یہ ہوا کہ فتح خاں کے تمام ہم قوم از سرِ نو اس کے مطیع و فرماں بردار بن گئے ۔

خانی کا قتل

چندلئی کی تسخیر سے بیس پچیس روز بعد کا واقعہ ہے کہ ایک دن فتح خاں کا بیٹا مقرب خاں پنجتار سے باجا بام خیل گیا۔ اس نے وہاں کے سردار خانی کو مشورے کے لیے باہر بلایا اور ایک الگ مقام پر لے گیا۔ وہاں اُس غریب کو بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ یہ خبر شیخ ولی محمد اور مولوی نصیر الدین نے سُنی تو حیران رہ گئے۔ انھوں نے فتح خاں کو بلوایا اور کہا کہ پختہ عہد و پیمان کے باوجود اس رنج افزا حرکت کے لیے کون سی وجہ جواز موجود تھی؟ اس نے جواب دیا کہ مقرب خاں نے مجھ سے پوچھے بغیر اس حرکت کا ارتکاب کیا، میں بالکل بری الذمہ ہوں۔ یہ سراسر فریب تھا۔ مقرب خاں بہ طور خود کوئی ایسا قدم نہ اٹھا سکتا تھا۔ مجاہدین اس غرض سے پنجتار آئے تھے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے مناسب تدبیریں اختیار کریں۔ ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ فتح خاں کی سرداری کو تقویت پہنچانے کے لیے مسلمانوں میں کشت و خون کا ہنگامہ بپا کردیں، خصوصاً خانی کا قتل تو سراسر

ناحق تھا۔ اس واقعۂ ہائلہ کے بعد مجاہدین کے لیے پنجتار میں قیام کی کوئی صورت باقی نہ رہی ؂

سیّد میاں اور سیّد رسول کو اطلاع | شیخ ولی محمد اور مولوی نصیرالدین نے اُسی وقت فتح خاں سے قطع تعلق کر لیا۔ سیّد رسول کو ناوائی اور سیّد میاں کو تختہ بند میں خط ارسال کر دیے کہ فتح خاں کے پاس رہنا غیر ممکن ہو گیا ہے۔ ہم آپ کے مشورے کے مطابق یہاں آئے تھے، اب فرمائیے کہ کیا کریں۔ چند روز کے بعد ان کا پیغام آ گیا کہ ناوائی چلے آئیے، ہم خدمت گزاری میں کوتاہی نہ کریں گے ؂

اس زمانے میں پائندہ خاں تنولی والیٔ امب کی طرف سے بھی ایک پیغام آیا تھا کہ میں سیّد بادشاہ کے وقت میں شامتِ نفس کے باعث خدمت گزاری کی سعادت سے محروم رہا۔ اب آپ لوگ پنجتار سے اٹھ کر امب چلے آئیں۔ شاید آپ کی خدمت گزاری کی برکت سے اللہ تعالیٰ میری سابقہ خطائیں معاف کر دے ؂

ارسالِ وفد | ناوائی روانہ ہونے سے پیشتر شیخ ولی محمد نے چار آدمیوں کا ایک وفد امب روانہ کر دیا تھا کہ وہاں کے حالات تفصیلاً معلوم کر لیں۔ پھر جو کچھ مناسب ہو، اس پر عمل کیا جائے یہ وفد محمد امیر خاں قصوری، اللہ نور شاہ ساکن ٹوپی، بابر شاہ ننگرہاری اور اللہ بخش پر مشتمل تھا۔ یہ اصحاب کم و بیش دو ہفتے پائندہ خاں کے پاس رہے۔ اس نے گڑھی کے دروازے پر ان کے لیے خیمہ نصب کرا دیا۔ اپنے ساتھ کھانا کھلاتا رہا اور رخصت کے وقت بہ اصرار کہا کہ شیخ ولی محمد اور مولوی نصیرالدین آ جائیں تو میں اگرور کا علاقہ ان کے حوالے کر دوں گا اور حبسی کوٹ کا قلعہ رہنے کے لیے دے دوں گا ؂

پائندہ خاں کا عہد نامہ | شیخ ولی محمد اور مولوی نصیرالدین مجاہدین کو لے کر ناوائی پہنچے۔ وفد امب سے واپس آیا تو پائندہ خاں نے اپنا وکیل بھیج دیا، جس نے اگرور اور حبسی کوٹ کی حوالگی کا وعدہ دہرایا۔ شیخ نے مولوی نصیرالدین کو تیس مجاہدوں کے ساتھ وکیل کے ہمراہ امب روانہ کر دیا۔ پائندہ خاں نے مولوی صاحب کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت توبہ کی اور فسق و فجور سے تائب

ہو کر اطاعت شریعت کا اقرار کیا نیز اگر ورانہ جیسی کوٹ کی حوالگی کا عہد نامہ لکھ کر دے دیا۔
پندرہ روز کے بعد مولوی صاحب یہ عہد نامہ لے کر ناواگئی پہنچے تو سیّد رسول اور سیّد میاں سے
اس کے متعلق رائے پوچھی گئی۔ انھوں نے کہا کہ شیخ صاحب فی الحال ناواگئی ہی میں رہیں، البتہ
مولوی نصیر الدین کو امب بھیج دیں۔ پھر جیسے حالات پیش آئیں، ان کے مطابق عمل کیا جائے۔
چنانچہ شیخ نے دس گیارہ مجاہد اپنے ساتھ رکھ لیے، باقی جماعت کو مولوی نصیر الدین کی سرکردگی
میں امب بھیج دیا ؏

ساتواں باب

پائندہ خاں کی دعوت اور قیام اگرور

پائندہ خاں اور مجاہدین یہاں اس امر پر بھی غور کر لینا چاہیے کہ پائندہ خاں کیوں اگرور کا علاقہ مجاہدین کے حوالے کر دینے پر آمادہ ہوا اور کیوں اس نے بہ اصرار انھیں اپنے پاس بلایا؟ کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا ادّعائے رفاقت خلوص پر مبنی تھا؟ ابتدا میں بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کی دعوت اخلاص پر مبنی ہے، لیکن آگے چل کر پتا چلا کہ اس کے نہاں خانۂ قلب میں بھی ایک خاص غرض پوشیدہ تھی۔ وہ غرض پوری ہوگئی تو مجاہدین کے متعلق اس کی روش یک قلم بدل گئی۔ یہاں تک کہ مجاہدین کے لیے اس کے پاس ٹھہرنے کی کوئی بھی صورت باقی نہ رہی۔ یہ بات تھوڑی سی تفصیل کی متقاضی ہے۔

پائندہ خاں کی ہمشیر عبدالغفور خاں رئیس اگرور سے منسوب تھی۔ پھر دونوں کے تعلقات میں اتنا تکدر پیدا ہوگیا کہ شادی توقف میں پڑ گئی۔ جب پائندہ خاں سید صاحب کے مقابلے میں شکست کھا کر بہ حالت سراسیمگی بھاگا تو مال اسباب اور اہل و عیال کو پیچھے چھوڑ گیا۔ مولانا شاہ اسمٰعیل نے عبدالغفور خاں رئیس اگرور کے بھائی کمال خاں سے کہہ دیا کہ پائندہ خاں کے متعلقین اور اس کی تمام چیزیں بہ حفاظت موصوف کے پاس پہنچا دی جائیں۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی، لیکن خان اگرور نے موقع سے فائدہ اٹھا کر منسوبہ سے بہ طور خود شادی کر لی۔ پائندہ خاں کی رضامندی اور شرکت کا انتظار نہ کیا۔ یہ حرکت عام حالات میں بھی نازیبا تھی، پریشان حالی کے خاص حالات نے اسے پائندہ خاں کے لیے حد درجہ رنج افزا بنا دیا۔ یہ داغ اس کے دل سے مدت العمر نہ مٹا۔

یوں پائندہ خاں اور خوانین اگرور کے درمیان مستقل عداوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ مجاہدین کو

جسی کوٹ میں بٹھانے اور اگرور ان کے حوالے کر دینے کی غرض یہی تھی کہ خوانین اگرور کو اپنے علاقے میں استقلال کا موقع نہ ملے۔ "ہزارہ گزٹیئر" میں تو صاف صاف مرقوم ہے کہ پائندہ خاں نے ہندوستانی مجاہدین کو آلۂ کار بنا کر خان اگرور کو اس کے علاقے سے نکلوایا[1]۔

پائندہ خاں کی دُور اندیشی اور دقیقہ سنجی قابل ستائش ہے کہ اپنے حقیقی مقصد کے متعلق مجاہدین سے کبھی کچھ نہ کہا اور اس کی تکمیل حالات کی طبعی رفتار پر چھوڑ دی۔ ابتدا میں رئیس اگرور اور اس کا بھائی مجاہدین کے معاون بنے رہے تاہم پائندہ خاں نے اس پر بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے، اسے یقین تھا کہ یہ تعاون زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے گا۔ چنانچہ خوانین اگرور کی دو رخی آشکارا ہو گئی اور مجاہدین کو ان کے خلاف آخری اقدام کے سوا چارہ نہ رہا۔ یوں پائندہ خاں کا مقصد پورا ہو گیا، ساتھ ہی اس نے ایسے طریقے اختیار کر لیے کہ مجاہدین اگرور سے اٹھ کر ستھانہ جانے پر مجبور ہو گئے۔

مجاہدین کی آمد مفصّل حالات تو آگے چل کر بیان ہوں گے۔ یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ پائندہ خاں سے اگرور میں قیام اور جسی کوٹ کی مرمت کے متعلق عہد و پیمان ہو جانے کے بعد مولوی نصیر الدین مجاہدین کو لے کر امب روانہ ہو گئے۔ سیّد میاں اور سیّد رسول کے مشورے کے مطابق شیخ ولی محمد نا واگئی ہی میں رہے۔ چملہ سے امب جانے کا راستہ بھیٹ گلی میں سے تھا جو امب کے عین سر پر مغربی جانب واقع ہے۔ پائندہ خاں نے دو سو سواروں اور پیادوں کے ساتھ بھیٹ گلی میں مولوی صاحب کا استقبال کیا اور بڑے اعزاز سے انھیں امب لایا۔ مولوی صاحب کو امب کی مسجد میں اتارا، مجاہدین کے لیے متعدد مکان خالی کرا دیے۔ کم و بیش دو ہفتے مولوی صاحب اور مجاہدین امب میں ٹھہرے رہے۔ اس اثنا میں پائندہ خاں نے بڑے اہتمام سے مہمان داری کا فرض انجام دیا۔ نظر بہ ظاہر معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی روش اور

---

[1] "ہزارہ گزٹیئر" مطبوعہ ۱۸۸۳-۸۴ء صفحہ ۲۸۔

افکار و خیالات میں نمایاں خوش گوار تغیر پیدا ہو چکا ہے۔ جبی کوٹ کی گڑھی کے جو حصے مرمت طلب تھے، ان کی درستی کا انتظام شروع ہو گیا۔ مرمت کی تکمیل کے لیے پائندہ خاں نے کچھ روپے مولوی صاحب کی خدمت میں بھی پیش کر دیے۔ صاحب موصوف مجاہدین کو لے کر نکّہ پانی اور کلکی ہوتے ہوئے جبی کوٹ پہنچ گئے جو کلکی سے دو اڑھائی میل پر تھا۔

آغازِ جہاد کی تجاویز | قیام کے لیے مناسب مقام مل گیا تو مولوی صاحب آغازِ جہاد کی تدبیریں سوچنے لگے۔ "بہیلہ داروں[1]" کی مجلس شوریٰ منعقد کی تو میاں خاں صواتی نے جبوڑی پر چھاپے کی تجویز پیش کی، جو بالاکوٹ کے قریب ہے اور وہاں سکھوں کا ایک تھانہ تھا۔ اس تجویز پر عمل درآمد کا ایک واضح فائدہ یہ تھا کہ جبوڑی تک کا پورا علاقہ، جس میں درہ کونش شامل تھا، مجاہدین کے زیر اثر آجاتا اور سکھوں کے لیے مدافعت کا کوئی موقع باقی نہ رہتا۔ اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا۔ چنانچہ مجاہدین کی مختلف جماعتوں سے تقریباً ایک سو افراد کو تیاری کا حکم دے دیا گیا۔ غلّہ پاس نہ تھا، مولوی صاحب نے دو گائیں خریدیں اور انھیں ذبح کرا کے گوشت مجاہدین میں تقسیم کر دیا کہ پکا کر ساتھ لے لیں۔ یہی دو روز کے لیے ان کا زادِ راہ تھا۔ جو مجاہدین اس چھاپے میں شریک ہوئے، ان میں سے مندرجۂ ذیل کے نام روایتوں میں آئے ہیں: شیخ وزیر پھلتی، مستقیم جہان آبادی (متصل رائے بریلی)، ابراہیم پوربی، مقیم ساکن کالا باغ، محمد عمر سندھی، عبدالحمید سندھی، نور سندھی، ملا لقمان سندھی، جعفر خاں ترین ہزاروی، کرم خاں اور ان کے دو بھائی، ملا عزت قندھاری، ملا لعل محمد قندھاری، احمد خاں کاشکاری (چترالی)، شاہین مشوانی۔

شبخون | مجاہدین کی یہ چھوٹی سی جماعت نمازِ فجر کے بعد جبی کوٹ سے روانہ ہوئی۔ جبوڑی کا عام راستہ بھی پہاڑی ہونے کے باعث خاصا دشوار گزار تھا، ان لوگوں کو بنظرِ احتیاط

---

[1] ہم "جماعتِ مجاہدین" میں بتا چکے ہیں کہ جماعت کی اصطلاح میں "بہیلہ" فوج کے اس ٹکڑے کو کہتے تھے جو بیس پچیس آدمیوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس ٹکڑے کا افسر "بہیلہ دار" کہلاتا تھا۔

عام راستے کے بجائے جنگل جنگل جانا پڑا، تاکہ منزلِ مقصود کے متعلق کسی کو علم نہ ہوا اور راز فاش ہو جانے کے باعث اصل مقصد کو نقصان نہ پہنچے، اس لیے بڑی مشقت اٹھانی پڑی۔ ظہر کے وقت ایک مقام پر پہنچ کر تھوڑی دیر کے لیے آرام کیا۔ شام کے وقت پھر روانہ ہوئے۔ رات بھر چلتے رہے، فجر کے وقت ایک جنگل میں ٹھہر گئے۔ ظہر کے وقت وہاں سے چلے تو عشا سے پہلے پہلے میاں خاں سواتی نے مجاہدین کو اس پہاڑ پر پہنچا دیا، جس کے دامن میں جبوڑی کی بستی تھی ؛

رات کے پچھلے پہر اٹھ کر جبوڑی کے تھانے کی طرف بڑھے۔ پہرہ دار سکھ نے آہٹ پا کر بندوق چلائی، گولی کسی کے نہ لگی۔ مجاہدین ایک دم ہلہ کر کے تھانے میں داخل ہو گئے۔ تھانے کے کچھ سپاہی مارے گئے، باقی بھاگ کر بستی کے گھروں میں جا چھپے۔ مجاہدین نے کچھ مال اسباب اٹھایا۔ ایک مرد اور تین عورتوں کو گرفتار کیا اور فجر کی اذان کے وقت بستی سے نکل کر پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ سکھوں نے جمع ہو کر گولیاں چلانی شروع کیں، لیکن مجاہدین کو خدا کے فضل سے کوئی نقصان نہ پہنچا۔ دوسرے روز وہ تبی کوٹ پہنچ گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جبوڑی کے مقتولوں میں ناصر خاں بھٹ گرامی کا بھتیجا بھی شامل تھا، جس نے تھانے کے سپاہیوں میں ملازمت اختیار کر رکھی تھی۔ اسیروں میں سے مرد نے بہ طیب خاطر اسلام قبول کر لیا، عورتوں کو تین سو روپے دے کر چھڑا لیا گیا ؛

چھاپے کے اثرات و نتائج جیسا کہ خیال تھا، چھاپے کے اثرات و نتائج بہت اچھے رہے۔ پورے علاقے میں مجاہدین کی دھاک بیٹھ گئی۔ بارک خاں اور محمد خاں درۂ کونش کے بڑے خان تھے۔ انھوں نے مولوی نصیر الدین کے پاس خط بھیج کر اطاعت قبول کی اور عشر دینے کا اقرار کر لیا۔ مولوی صاحب نے انھیں تسلی دی کہ آپ لوگ ہمارے بھائی ہیں۔ ہماری طرف سے کچھ اندیشہ نہ کریں۔ ہم حتی الامکان آپ کی حفاظت کرتے رہیں گے ؛

سکھوں کے لیے یہ صورتِ حال کیونکر گوارا ہو سکتی تھی ؟ انھیں یہ بھی شبہہ ہوا کہ مجاہدین کا چھاپا راستے کے مقامی لوگوں کی اعانت کے سبب کامیاب ہوا اور اس پر بھی غصہ آیا کہ

درۂ کونش کے لوگ مجاہدین کو عُشر دینے پر راضی ہو گئے ہیں، گویا سکھوں کی حکومت سے نکل کر مجاہدین کے دائرۂ اثر میں چلے گئے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک لشکر لے کر آ پہنچے۔ بارک خاں اور محمد خاں کو خوب دھمکایا کہ اگر مجاہدین کو عُشر دیا تو تمھیں تباہ کر ڈالیں گے۔

مجاہدین کا اقدام بارک خاں اور محمد خاں نے ان حالات کی اطلاع مولوی صاحب کو دے دی تو انھوں نے اپنے مشیروں کو بُلا کر پوچھا کہ کیا کرنا چاہیے؟ خود فرمایا کہ جو لوگ ہماری اعانت کا اقرار کر چکے ہیں، انھیں ضرورت کے وقت ہر ممکن مدد دینا ہم پر لازم ہے، نیز یہاں بیٹھے بیٹھے سکھوں کا انتظار کیوں کریں؟ بہتر یہ ہے کہ خود درۂ کونش میں جائیں اور دیکھیں کہ کون ہمارے معاونین کو دھمکاتا ہے؟ اس اقدام سے سکھوں پر دباؤ پڑے گا اور ہمارے معاونین کے لیے اطمینان و دل جمعی کا سامان ہوگا۔ چنانچہ جبی کوٹ سے درۂ کونش میں جانے کی تیاری کر لی۔ تھوڑے سے مجاہدین گڑھی کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیے۔

سکھوں سے چپقلش مولوی صاحب نے جبی کوٹ سے روانہ ہو کر ایک رات موضع اہل میں گزاری۔ بستی والوں نے بڑے اہتمام سے مہمان داری کا انتظام کیا۔ دوسرے روز کھانا کھا کر وہاں سے روانہ ہوئے اور بٹلوں پہنچے جو بارک خاں اور محمد خاں کا مرکز تھا۔ بٹلوں سے چار کوس پر موضع بالی منگ تھا۔ مولوی صاحب وہاں وارد ہوئے تو معلوم ہوا کہ تقریباً چار کوس پر سات سو سکھوں کا لشکر موجود ہے۔ بیچ میں پہاڑ کی گھاٹی تھی۔ سکھوں نے گھاٹی روک لی تاکہ مولوی صاحب آگے نہ بڑھ سکیں۔ پانچ چھ گھڑی فریقین میں لڑائی ہوتی رہی۔ پھر مولوی صاحب نے پُرزور حملہ کیا اور سکھ گھاٹی کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ بستوں سے انھوں نے کھانے پینے کی جنس جبراً وصول کی لیکن مجاہدین کے خوف سے وہاں ٹھہر نہ سکے اور شنکیاری چلے گئے جو درۂ بھوگڑ منگ کے دہانے پر واقع ہے اور وہاں سکھوں نے ایک مستحکم گڑھی بنا رکھی تھی۔

مولوی صاحب کی مراجعت سکھوں کے فرار کے بعد مولوی صاحب لوٹے اور کودردوں کی بستی میں ٹھہرے، جو مقامِ جنگ سے دو اڑھائی میل تھی۔ وہیں اردگرد کی بستیوں کے لوگ

عُشر لے کر آئے، جس میں غلّہ، نقد رقم، کمل وغیرہ شامل تھے۔ سکھوں کے بہت سے جانور بھی ہاتھ لگے تھے، مثلاً بھینسیں، گھوڑے، ٹٹو، خچر۔ کو دروں سے مولوی صاحب بالی منگ ہوتے ہوئے بٹلوں گئے۔ بارک خاں اور محمد خاں نے معمول کے مطابق مولوی صاحب کی دعوت کی۔ اس سے پیشتر ایک مخلص عقیدت مند نے یہ اطلاع پہنچائی کہ دونوں خان دو رخی چال چل رہے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ دعوت میں بُلا کر آپ کو نقصان نہ پہنچائیں۔ مولوی صاحب کھانا کھانے کے لیے گئے تو چھ سات قرابینچی ساتھ لے گئے۔ یہ حالت دیکھ کر بارک خاں اور محمد خاں کو مخالفانہ اقدام کا حوصلہ نہ ہُوا۔ مولوی صاحب عشر جسی کوٹ پہنچانے کی تاکید کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔

خوانین کی دُوں ہمّتی بارک خاں، محمد خاں اور دوسرے خوانین کے متعلق ابتدا میں خیال تھا کہ سکھوں کے خطرے کی روک تھام کے بعد وہ خلوص سے کاروبارِ جہاد میں معاون بن جائیں گے یا کم از کم مخالف قوتوں کو تقویت پہنچانے سے باز رہیں گے۔ افسوس کہ یہ خیال درست ثابت نہ ہُوا۔ ان لوگوں کی بے عزمی اور دُوں ہمّتی واضح طور پر آشکارا ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے سامنے کوئی بلند نصب العین نہ تھا۔ وہ صرف اپنی جائدادیں بچائے رکھنے کے لیے مضطرب تھے۔ مجاہدین کا دباؤ بڑھتا دیکھا تو بہ ظاہر ان کی خیر خواہی کا دم بھرنے لگے، لیکن خفیہ خفیہ سکھوں کو بھی اپنی اطاعت کا یقین دلاتے رہے۔ یہ صورتِ حال پیہم اور متواتر مجاہدین کے لیے گوناگوں تشویشات کا باعث بنی رہی۔ وہ رزم و پیکار کی تمام ذمّہ داریاں خود اٹھانے کے لیے تیار تھے۔ صرف اتنا چاہتے تھے کہ خوانین دو رخی سے ان کے اقدامات میں خلل نہ ڈالیں، لیکن یہ خواہش درا صل کسی بھی دور میں پوری نہ ہو سکی اور مقامی لوگوں کی بے عزمی ہر نازک ساعت میں آفات کا موجب بنتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ کسی موقع پر مستقل محاذِ جہاد قائم ہو سکا اور نہ دو رخی چالیں چلنے والے خوانین پاداش کے تازیانے کی ضرب سے محفوظ رہ سکے۔

آٹھواں باب

پائندہ خاں اور فتح خاں پنجتاری

فتح خاں کی چیرہ دستیاں | پنجتار سے ہجرت کے وقت سیّد صاحب نے فتح خاں کے ہم قوموں سے فرمایا تھا کہ جس طرح ہمیں عشر دیتے رہے ہو، اسی طرح آئندہ فتح خاں کو عشر دیتے رہنا۔ مقصد یہ تھا کہ قوم میں اجتماع و اتحاد کا جو انتظام ہو چکا تھا اُس میں خلل نہ آئے اور پہلے کی طرح تفرقہ پیدا ہو جانے سے اجتماعی قوّت کو نقصان نہ پہنچے۔ فتح خاں نے سیّد صاحب کے اس ارشاد کو اپنی سرداری اور حکمرانی کی دستاویز بنا لیا اور زور و قوت سے تمام ہم قوموں کو فرمانبردار بنائے رکھنے پر تُل گیا۔ اُس کی غلط روش کے باعث ہم قوموں کی مختلف بستیوں نے سرتابی اختیار کر لی۔ شیخ ولی محمد کو بہ منت و التجا پنجتار بُلانے میں اس کی غرض صرف یہ تھی کہ مجاہدین کی امداد سے تمام بستیوں پر اپنا تسلط از سرِ نو مستحکم کر لے۔ شیخ صاحب نے اثر و رسوخ سے کام لے کر بعض بستیوں کو مصالحت پر آمادہ کر لیا۔ صرف باجا بام خیل سے لڑائی کی نوبت آئی اور اس کا دائرہ بھی بہت محدود رہا۔ فتح خاں نے بد عہدی کر کے باجا بام خیل کے رئیس خانی کو بے دردانہ قتل کرا دیا تو شیخ صاحب نے فتح خاں سے قطع تعلق کر لیا اور وہ پنجتار کو چھوڑ کرنا والگئی چلے گئے۔

فتح خاں اس کے بعد بھی گرد و نواح کی بستیوں پر ظلم و تعدی کرتا رہا۔ آخر ٹوپی، مینئی، کھلابٹ، منارہ، چنج پیر، اور مرغز کے خوانین نے تنگ آ کر پائندہ خاں والیِ امب سے امداد کی التجا کی۔ وہ بے تامّل امداد کے لیے تیار ہو گیا۔ اس لیے کہ اس میں اور فتح خاں میں مدت سے قلبی عداوت چلی آتی تھی۔ جب پائندہ خاں نے لشکر کے ساتھ سمّہ کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا تو مولوی نصیر الدین کو بھی بُلوا لیا۔

مولوی صاحب کی طلبی | مولوی صاحب کو درۂ کونش سے واپس ہوئے بیس بائیس روز گزر

چکے تھے کہ پائندہ خاں کی طرف سے ایک خط آیا، جس میں مرقوم تھا:

ہمارا ارادہ ٹوپی، مینئی کی طرف جانے کا ہے۔ آپ بھی ہمارے لشکر کے ساتھ تشریف لے چلیں۔۔۔ آپ کے سبب سے ہمیں زیادہ قوّت ہوگی۔[1]

مولوی صاحب موصوف اس اقدام کے اصل مقصد سے ناواقف نہ تھے۔ مجاہدین سے فتح خاں کا نامناسب سلوک بھی ان کے سامنے تھا، تاہم اس خیال سے روانگی کے لیے تیار ہو گئے کہ دو مسلمان گروہوں میں رزم و پیکار کو روکنے کی کوئی صورت ہو تو اس سے فائدہ اٹھائیں اور ان میں مصالحت کرا دیں۔ انھیں کی وجہ سے لڑائی رُکی، جیساکہ آگے چل کر واضح ہوگا، ورنہ خوفناک خونریزی کے آغاز میں کوئی شبہہ باقی نہ رہا تھا۔

جبی کوٹ سے روانگی مولوی صاحب نے بتّیس مجاہدوں کو جبی کوٹ میں چھوڑا، جن کے نام یہ ہیں: محمد حسین سہارن پوری، نظام الدّین خاں شاہ جہاں پوری، نجم الدّین شکارپوری، احمد حسین صادق پوری، سیّد عبداللہ عظیم آبادی، محسن جون پوری، رمضانی کاشی پوری، حافظ واقف علی ساکن میان دوآب، دوست محمد رام پوری، محمود بنارسی، شیخ رمضان الہ آبادی، شیخ حسن علی، شیخ عبدالرحمٰن، شیخ عبدالعزیز اور شیخ عبدالقادر ساکنانِ کیما، احمد سندھی، الٰہی بخش پانی پتی، گامن خاں سندھی، ہدایت اللہ ہزاروی، حبیب الرحمٰن الہ آبادی، شیخ گلاب ساکن میانِ دوآب، نور خاں ہزاروی، محمد علی ہزاروی، دین محمد اور اللہ بخش ساکنانِ میان دوآب، اشرف خاں پشاوری، عبدالقادر ساکن امروہہ، نور محمد اور ان کے بھانجے جن کا نام معلوم نہ ہو سکا، محمد قائم ساکن امروہہ۔ آخرالذکر کو اس جماعت کا امیر بنایا۔ بارک خاں اور محمد خاں رئیسانِ کونش کو تاکیدی خط لکھ دیا کہ ہم پائندہ خاں کے بُلانے پر اب جا رہے ہیں۔ معلوم نہیں، وہاں سے کب لوٹیں۔ آپ لوگوں کے پاس عُشر کا جو غلّہ جمع ہوا اُسے جبی کوٹ پہنچا دیں۔

[1] "وقائع" جلد سوم صفحہ ۳۷۶-۳۷۷۔

تقریباً اڑھائی سو مجاہدوں کے ساتھ مولوی صاحب مکّہ پانی ٹھہرتے ہوئے امب پہنچ گئے۔

پائندہ خاں اور سادات ستھانہ کا معاملہ

آپ دو روز امب میں ٹھہر کر عشرہ چلے گئے۔ تین روز بعد پائندہ خاں تین سو سوار اور چار سو پیادے لے کر عشرہ پہنچا۔ وہاں سے خان، اس کا لشکر اور مجاہدین موضع کیا میں جا کر ٹھہرے۔ پائندہ خاں اور سادات ستھانہ کے درمیان مدت سے کشمکش چلی آتی تھی۔ کیا میں مولوی صاحب نے گرد و نواح کے خوانین کا جرگہ بلایا اور کوشش کی کہ خان اور سادات میں مصالحت ہو جائے۔ سید اکبر شاہ سادات ستھانہ کے سرخیل تھے، انھیں پیغام بھیجا گیا۔ وہ خود نہ آئے اور اپنے تین چھوٹے بھائیوں سید عمر، سید اصغر اور سید عمران کو گفتگو کے لیے بھیج دیا۔ جرگے میں فریقین کے گلے شکوے نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ باہم لڑائی کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ مولوی نصیر الدین نے بات چیت روک دی اور فرمایا: ہم تو مصالحت کے خواہاں تھے، یہاں لڑائی کا رنگ پیدا ہو گیا۔ سب باتیں چھوڑ دیجیے اور مصافحہ کر لیجیے۔ اس طرح یہ معاملہ ختم ہوا۔ کیا سے لشکر کھبل گیا، جہاں تقریباً ایک ہفتہ مقیم رہا۔ وہاں سے ایک منزل پر کھلابٹ میں فتح خاں پنجتاری لشکر لیے بیٹھا تھا۔

مصالحت کی کوشش

نظر بظاہر پائندہ خاں اور فتح خاں میں خونریز جنگ بالکل یقینی ہو گئی تھی۔ مولوی نصیر الدین صرف اس غرض سے ساتھ آئے تھے کہ دونوں فریقوں میں صلح کرا دیں۔ چنانچہ وہ اسی کوشش میں لگ گئے۔ انھوں نے پہلے پائندہ خاں اور اس کے ساتھیوں کو مصالحت پر راضی کیا۔ پھر فتح خاں کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

> اس نواح کے خوانین وغیرہ لوگوں نے آپ سے تنگ ہو کر پائندہ خاں کو بلایا ہے کہ آپ کا مقابلہ کرے۔ ہم لوگ بھی پائندہ خاں کے ہمراہ آئے ہیں، سو ہم کو مسلمانوں سے جنگ و جدال کسی صورت منظور نہیں خصوصاً آپ سے کہ ہمارے جناب امیر المومنین سید صاحب کے خلیفہ اور انصار ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ اور یہ دونوں نفسانیت اور عداوت قدیمی کو چھوڑ کر للہ فی اللہ آپس میں مل جائیں اور متفق ہو کر کچھ کام خدا کا بنائیں کہ

دنیا اور آخرت میں نیک نامی اور ثواب پائیں۔ ہم پر جو حق اخوّت اسلام کا تھا، وہ ہم نے ادا کردیا، اب آگے آپ مختار ہیں[1]۔

مولوی صاحب اور فتح خاں کی گفتگو

فتح خاں نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ آپ کا ارشاد منظور ہے، لیکن ضروری ہے کہ آپ پہلے علیحدگی میں میری باتیں سن لیں۔

یوں مصالحت کے امکانات بڑھ گئے۔ مولوی صاحب اور پائندہ خاں کھبل سے باڑا اور وہاں سے کوٹھا گئے، جہاں سے کھلابٹ صرف ڈیڑھ کوس تھا۔ فتح خاں کو خط بھیجا کہ کل آپ تشریف لائیں، میں بھی آٹھ دس مجاہدین کے ساتھ آجاؤں گا اور بات چیت ہو جائے گی۔ چنانچہ دونوں میں حسب قرارداد ملاقات ہوئی، لیکن کسی بات پر اتفاق نہ ہو سکا۔ فتح خاں کا اصرار تھا کہ گرد و نواح کے تمام خوانین میرے فرمانبردار رہیں اور مجھے عُشر دینا قبول کریں۔ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ آپ اپنے ہم قوموں یعنی خدوخیلوں کے مالک و مختار ہیں، انھیں کے تعلق میں آپ کو خلیفہ بنایا گیا تھا۔ جو لوگ آپ کے ہم قوم نہیں، ان پر کیوں جبر کرتے ہیں؛ وہ جس دستور پر پہلے سے چلے آرہے ہیں، اسی پر انھیں قائم رہنے دیں۔ فتح خاں ناراض ہو کر واپس چلا گیا۔

رفع فساد کا خداداد سامان

اِدھر پائندہ خاں مُصر تھا کہ جلد سے جلد لڑائی شروع کر دے۔ مولوی صاحب نے وعظ و نصیحت سے اسے روکے رکھا۔ کوٹھا سے دو کوس پر موضع مینئی ہے۔ ایک روز وہاں کے لوگ پائندہ خاں کو اپنے ہاں لے گئے اور پُر تکلف دعوت دی۔ دوسرے روز جھنڈا بوکا کی طرف سے دعوت آگئی۔ پنجتار جھنڈا بوکا سے صرف تین چار کوس ہے۔ فتح خاں کے دل میں وسوسہ پیدا ہو گیا کہ ممکن ہے، میں کھلابٹ میں بیٹھا رہوں اور پائندہ خاں کا لشکر پنجتار پر حملہ آور ہو جائے۔ اس وسوسے کی بنا پر وہ کھلابٹ کو چھوڑ کر پنجتار چلا گیا۔ اس طرح لڑائی کے انسداد کا خداداد سامان ہو گیا۔

---

[1] "وقائع" جلد سوم صفحہ ۳۸۰۔

ایک واقعہ ایک روز پہاڑ کی طرف سے بندوقیں چلنے کی آواز آئی جھنڈا بوکا میں شور مچ گیا کہ فتح خاں کے سوار آپہنچے۔ پائندہ خاں کی آرزو بھی یہ تھی کہ کوئی بہانہ ملے تو فتح خاں سے لڑوں۔ وہ فوراً گھوڑے پر سوار ہوا اور نیزہ ہاتھ میں لے کر اُدھر چل پڑا جدھر سے بندوقوں کی آواز آئی تھی۔ اس کے سوار بھی ساتھ دوڑ پڑے۔ دامنِ کوہ میں ہرچند تلاش کیا، لیکن بندوقیں چلانے والوں کا پتا نہ ملا*

فتح خاں سے لڑائی کا خرخشہ بالکل مٹ گیا تو پائندہ خاں اور مولوی صاحب واپس آگئے۔ مولوی صاحب دو تین روز امب میں ٹھہرے، پھر جسی کوٹ پہنچ گئے*

نواں باب

سکھوں پر یورش

پائندہ خاں اور دوسرے خوانین میں فرق

ہم بتا چکے ہیں کہ مجاہدین کو اگرور میں بٹھانے کا فیصلہ کرتے وقت پائندہ خاں کے پیش نظر ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ خوانین اگرور کے لیے اپنی ریاست میں مستقل قیام کی کوئی صورت پیدا نہ ہو، لیکن اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ سکھوں سے بھی لڑنے کا خواہاں تھا اور جب تک گرد و پیش کی مصلحتیں اس کے مخصوص تصورات حکومت میں حائل نہ ہوئیں، وہ سکھوں کے خلاف بھی وقتاً فوقتاً قدم اٹھاتا رہا۔ دوسرے خوانین مثلاً فتح خاں کی حیثیت پائندہ خاں سے مختلف تھی۔ وہ صرف اپنی سرداری کو مستحکم کرنے کے درپے تھے، حالانکہ مجاہدین بلادِ اسلامیہ کو غیر مسلموں کے تسلط سے نجات دلانے کے لیے مضطرب تھے اور ان کے نزدیک جہاد کا مقصد و مدعا محض یہ تھا۔ پائندہ خاں اپنے مقاصد کی تکمیل کے علاوہ مجاہدین کے مقاصد میں بھی تعاون کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ ستمہ سے مراجعت کے چند روز بعد وہ لشکر لے کر شیر گڑھ آگیا اور مولوی نصیر الدّین کو جھی کوٹ پیغام بھیجا کہ ہم پکھلی میں سکھوں پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، آپ بھی ہمارے ساتھ تشریف لے چلیں۔

مولوی صاحب کی روانگی

یہ پیغام ملتے ہی مولوی نصیر الدّین تخمیناً ڈیڑھ سو ہندوستانی اور ولایتی[1] مجاہدوں کے ساتھ پائندہ خاں کے پاس شیر گڑھ پہنچ گئے۔ وہاں سے دونوں نے پکھلی کی طرف کوچ کیا۔ پہلی منزل بھوج[2] درہ میں ہوئی، جو شیر گڑھ سے بہ سمت جنوب مائل بہ شرق تقریباً پانچ کوس

---

[1] روایتوں میں یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ چونکہ ہمارے زمانے میں "ولایتی" کا مفہوم کچھ اور ہو گیا، اس لیے غلط فہمی کے ازالے کی غرض سے یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ مجاہدین کی روایت میں "ولایتی" سے مقصود وہ لوگ ہیں جو قندھار، ننگرہار یا سرحد آزاد وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے۔

[2] مجاہدین کی روایتوں میں اسے "بنہ درہ" لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے، اس زمانے میں یہی تلفظ ہو۔ میں نے موجودہ تلفظ پیش نظر رکھا ہے تاکہ قارئین کو غلط فہمی نہ ہو۔

پر واقع ہے۔ چھ روز اس مقام پر ٹھہرے رہے۔ یہ وقت سکھوں کے مختلف تھانوں اور چوکیوں کے حالات کی چھان بین میں گزرا، جن کا جال پورے علاقے میں پھیلا ہوا تھا، اس لیے کہ تھانوں اور چوکیوں کے بغیر سکھ ایک دن کے لیے بھی کسی حصّے پر حکومت نہ کر سکتے تھے۔ ساتویں روز قدم آگے بڑھایا اور نیلور میں جا ٹھہرے جو بھوج درہ سے بہ سمت مشرق مائل بہ جنوب اڑھائی کوس تھا۔ اس حصّے میں سکھوں کی عمل داری کا یہ پہلا مقام تھا۔ وہاں چند سیّد بھی رہتے تھے۔ وہ پائندہ خاں اور مجاہدین کی پیش قدمی کے ساتھ ہی گھر بار چھوڑ کر نکوٹ چلے گئے، اس لیے کہ مخالفت کر نہ سکتے تھے اور غالباً کرنا بھی نہ چاہتے تھے۔ اگر ٹھہرے رہتے تو بعد ازاں سکھوں کے عتاب کا ہدف بنتے۔

بیر کھنڈ پر یورش پائندہ خاں اور مجاہدین تین دن نیلور میں ٹھہرے رہے۔ روزانہ سواروں کو آس پاس کے دیہات میں سیر و گشت کے لیے بھیج دیا جاتا۔ ان میں سے خاص طور پر قابلِ ذکر مقام کیٹیا ہے جو نیلور کے قریب عین مشرق میں واقع ہے۔ وہاں سے بہ سمتِ شمال بیر کھنڈ میں سکھوں نے ایک مضبوط قلعہ بنا رکھا تھا۔ غور و مشورہ کے بعد اس پر حملے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ خان اور مجاہدین کے سوار اور پیادے تقریباً اڑھائی ہزار تھے۔ نمازِ ظہر ادا کر کے کیٹیا سے بیر کھنڈ پر یورش کی گئی۔ سکھ مسلّح ہو کر مقابلے کے لیے نکلے۔ ان کی جمعیت چار ہزار کے قریب تھی، جن میں سوار کم تھے اور پیادے زیادہ۔ بیچ میں سرن ندی تھی۔ خان اور مجاہدین کے لشکر بے تکلف اس میں اتر گئے۔ کمر تک پانی تھا۔ اس اثناء میں سکھ پے در پے بندوقیں سر کرتے رہے، لیکن یورش کنندوں میں سے بفضلِ خدا کسی کو نقصان نہ پہنچا۔ ندی سے گزرتے ہی ایک دم سکھوں پر ہلّہ بول دیا گیا اور تلوار چلنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں سکھوں کی جمعیت پس پا ہو گئی۔ سوار قلعے میں چلے گئے۔ پیادے صفیں باندھے ہوئے بیر کھنڈ کے بائیں جانب جا ٹھہرے۔ قلعے سے گولیاں برسنے لگیں تو پائندہ خاں پورے لشکر کو گولیوں کی زد سے باہر لے گیا اور قدم جما کر کھڑا ہو گیا۔

مجاہدین کی ترکتاز اب خان نے مولوی صاحب سے کہا کہ ذرا اپنے مجاہدین کی یورش کا بھی نظارہ دکھا دیجیے۔ مولوی صاحب نے فرمایا:

خان بھائی! یہ ہمارے مجاہدین خدا کے عاجز بندے ہیں۔ ان کا لڑنا بھڑنا صرف

خدا کے واسطے ہے۔ اپنی ناموری اور بہادری جتانے کو نہیں، مگر خیر جو آپ نے اس امر کی درخواست کی تو ان کا بھی تماشا دیکھیے[1]۔

یہ فرماتے ہی مولوی صاحب مجاہدین کو لے کر سکھوں کی جانب روانہ ہوئے۔ بیر کھنڈ کے قریب پہنچے تو سکھوں کی فوج میں بگل بجا اور ان کی جو فوج بستی کے بائیں جانب ٹھہری ہوئی تھی، اس کی دو صفیں بن گئیں۔ ایک صف اپنے مقام پر جمی رہی، دوسری صف بستی کی آڑ میں جا ٹھہری اور سوار قلعے سے نکل کر اس آخری صف کی پشت پر جا کھڑے ہوئے۔ منصوبہ یہ تھا کہ مجاہدین سامنے کی صف پر حملہ کریں تو دوسری صف موقع کی مناسبت کے لحاظ سے حملہ آوروں کے عقب میں پہنچ جائے اور ان کی واپسی کا راستہ منقطع کر دے۔ سوار اس جنگی چال کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھیں۔

مولوی صاحب نے یہ صورت دیکھی تو اپنی فوج میں سے پچاس جانبازوں کو مقیم خاں ساکن کالا باغ کی سالاری میں شمالی جانب بھیج دیا کہ سکھوں کے عقب سے حملہ کریں۔ خود ملا لعل محمد قندھاری اور باقی مجاہدین کے ساتھ بستی میں سے ہو کر آگے بڑھے۔ سکھوں نے مولوی صاحب کو دیکھتے ہی بندوقیں سر کیں۔ اس اثناء میں مقیم خاں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور اپنے مجاہدین کو لے کر پُرزور حملہ کر دیا۔ ادھر سے مولوی صاحب اور ملا لعل محمد بجلی کی تیزی سے ان پر جا پڑے۔ تھوڑی ہی دیر میں سکھ میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ کچھ کانٹوں کی اس باڑ میں اٹک گئے جو قلعے کے اردگرد حفاظت کے لیے لگا رکھی تھی اور وہ وہیں مارے گئے، باقی قلعے میں داخل ہو گئے اور اندر سے بندوقیں سر کرنے لگے۔ مجاہدین باڑ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ ڈیڑھ دو گھڑی دن رہے پائندہ خاں نے اپنے دو مشہور سالاروں شاما اور مندا کو بھیج کر مولوی صاحب اور مجاہدین کو واپس بُلا لیا اور کشادہ دلی سے اعتراف کیا کہ مجاہدین کی بہادری اور جوانمردی کے متعلق جو کچھ سنا تھا اس سے زیادہ اپنی آنکھوں دیکھ لیا۔ اس لڑائی میں مجاہدین کا

[1] "وقائع" جلد سوم ص ۳۶۷۔

کوئی آدمی زخمی تک نہ ہوا اور دونوں حملوں میں سکھوں کے پچاس ساٹھ آدمی مارے گئے، زخمیوں کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ مغرب کی نماز سرن ندی کے کنارے ادا کی گئی۔ پانچ چھ گھڑی رات گئے خان اور مجاہدین کا لشکر کینیا پہنچ گیا۔

ملک پور میں لڑائی دوسرے روز مراجعت کی تیاری ہوئی۔ پائندہ خاں نے مولوی صاحب نے کہا کہ آپ بھوج درہ میں ٹھہریں، میں ملک پور سے ہوتا ہوا شام تک آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ملک پور وہاں سے دو اڑھائی کوس پر واقع تھا۔ مولوی صاحب نے چالیس پچاس مجاہدین امان اللہ خاں لکھنوی کی سرکردگی میں پائندہ خاں کے ہمراہ کر دیے۔ تھوڑی دُور چل کر پائندہ خاں نے امان اللہ خاں سے کہا کہ آپ سرن ندی کے ساتھ ساتھ سیدھے ملک پور چلیں، میں اوپر کے راستے سے موضع بیرال ہوتا ہوا آپ سے آملوں گا۔ اپنے بھی دو سو آدمی امان اللہ خاں کے ساتھ کر دیے۔

ملک پور میں دو گڑھیاں تھیں اور دونوں میں سکھوں کی طرف سے تھوڑے تھوڑے مسلمان سپاہی متعین تھے۔ امان اللہ خاں ندی کے نشیب میں سے ہوتے ہوئے دونوں گڑھیوں کے درمیان جا کھڑا ہوا۔ مسلمان سپاہیوں نے بظاہر مجاہدین کا خیر مقدم کیا۔ مکئی کے بھٹے منگوا دیے کہ بھون بھون کر کھائیں۔ چنانچہ سب نے تسلی سے ظہر کی نماز ادا کی، لیکن خفیہ خفیہ ان سپاہیوں نے چادر ہلا ہلا کر بیر کھنڈ میں سکھوں کو پیغام بھیج دیا کہ جس قدر جلد ہو سکے آؤ اور ان مجاہدوں کو ختم کر دو۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں سکھ آ گئے۔ ان کی طرف سے بندوقیں سر ہوئیں تو دونوں گڑھیوں کے مسلمان سپاہیوں نے مجاہدین پر کنکروں پتھروں اور گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ یوں وہ اچانک تین طرف سے گھر گئے۔ امان اللہ خاں نے یہ حال دیکھتے ہی نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اڑھائی سو مجاہد تلواریں لے کر سکھوں پر ٹوٹ پڑے اور انھیں بھگا دیا۔

اس کشمکش میں میاں خاں صواتی گڑھی والوں کی گولیوں سے شہید ہو گیا۔ امان اللہ خاں حملہ آور سکھوں کی پسپائی کے بعد شمشیر عَلَم کر کے گڑھیوں کے سامنے جا ٹھہرا اور کہا کہ ہم اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لیں گے اور گڑھیوں کے تمام سپاہیوں کو قتل کریں گے، اس لیے کہ انھوں نے دغابازی سے

کام لیا۔ ان لوگوں نے ایک سید کو واسطہ بنا کر خطا معاف کرائی اور کہا اگر ہم سکھوں کو اطلاع نہ دیتے تو وہ سمجھتے کہ ہم پائندہ خاں اور مجاہدین سے ملے ہوئے ہیں، اس لیے ہمیں تباہ کر ڈالتے۔ بحث و گفتگو کے بعد ان کا قصور معاف ہوا ؎

مراجعت امان اللہ خاں نے میاں خاں کی میت چارپائی پر اٹھوائی اور شام کے وقت مع لشکر نیلور پہنچ گیا۔ وہیں میاں خاں شہید کو دفن کیا۔ پائندہ خاں بھی شام تک آگیا۔ پھر وہ شبر گڑھ ہوتا ہوا امب چلا گیا اور مولوی صاحب اپنے مرکز جبی کوٹ میں تشریف لے گئے ؎

دسواں باب

مقامی گروہوں کی فتنہ انگیزیاں

سکھوں پر شبخون کی تیاری مجاہدین کے لیے اپنے مقاصد کے مطابق سعی و جہد کی فضا سازگار ہو رہی تھی اور مولوی صاحب سکھوں پر شبخون کی تیاری کر رہے تھے، جہاں دو ہزار سکھ فصل خریف کا مالیہ وصول کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے بارک خاں اور محمد خاں ساکنان بٹلوں نے عُشر بھی نہ بھیجا تھا۔ مولوی صاحب چاہتے تھے کہ ان علاقوں کے باشندوں پر سے سکھوں کا دباؤ اٹھا دیں اور ان کی حفاظت کا مکمل بندوبست کر دیں۔ اس کے بغیر ان سے عُشر وصول کرنے کا کوئی حق بھی نہ تھا چنانچہ وہ سکھوں پر شبخون کا سر و سامان کر رہے تھے۔ اس اثناء میں اچانک معلوم ہوا کہ ایک مقامی فتنے نے سر اٹھایا ہے اور ایک نئی رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے، جس کا ازالہ کیے بغیر سکھوں کے خلاف کوئی قابلِ ذکر تدبیر اختیار نہ کی جا سکتی تھی۔

دیشیوں کا لشکر نیا فتنہ یہ تھا کہ علاقہ دیشی[1] کے لوگ چار ہزار لشکر جمع کر کے مجاہدین سے جنگ کے لیے چھڑی بنگ پہنچ گئے تھے جو جبی کوٹ سے تین کوس پر ہے۔ چھڑی بنگ، نندھیاڑ اور ٹیکری کے لوگ بھی ان سے مل گئے تھے اور انھوں نے تمام درے بند کر دیے تھے۔ مجاہدین کے لیے یہ بہت بڑی آفت تھی۔ اگر وہ سکھوں کی طرف بڑھتے تو یہ لوگ بے تکلف جبی کوٹ پر قابض ہو جاتے اور مجاہدین کو اپنے مرکز سے محروم ہونا پڑتا۔ غور و مشورہ کے بعد یہی مناسب معلوم ہوا کہ پہلے اس فتنے کا انسداد کیا جائے، پھر بہ اطمینان دوسری جانب قدم اٹھایا جائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ دیشیوں کے اس اقدام کی کوئی بھی وجہ موجود نہ تھی۔ مجاہدین نے

---

[1] یہ علاقہ نندھیاڑ کے مغرب اور اگرور کے شمال میں واقع ہے۔ کوہ سیاہ (کالا ڈھاکا) کی مشرقی ڈھلانوں کا ایک حصہ اس میں شامل ہے۔

نہ ان کے کسی حق سے تعرض کیا تھا اور نہ انھیں کوئی نقصان پہنچایا تھا۔ ان کی غرض صرف یہ تھی کہ مقامی لوگ کاروبارِ جہاد میں حتی الامکان تعاون کریں۔ بہ درجۂ آخر عُشر دیتے رہیں تاکہ انھیں سکھوں کے تسلط سے نجات دلانے کا بندوبست ہو سکے، لیکن ان لوگوں کی حالت یہ تھی کہ جو مجاہدین ان کی خیر خواہی میں جانیں لڑا رہے تھے، انھیں پر جتھے بنا کر حملے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ سکھ اگرچہ ان کی جان، مال اور آبرو تینوں کے احترام سے سراسر بے پروا تھے تاہم ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ اس رنج افزا صورتِ حال پر کون سا دردمند مسلمان خون کے آنسو نہ بہائے گا۔

اقدام کا فیصلہ غرض سچوں پر شبخون کو معرضِ التوا میں ڈال کر دیشیوں کی طرف توجہ ناگزیر ہو گئی۔ مولوی صاحب نے مجاہدین کے تمام سالاروں کو جمع کر کے مشورہ کیا اور فیصلہ یہ ہوا کہ حبسی کوٹ میں حملے کا انتظار کرنے کے بجائے خود پیش قدمی کی جائے۔ اگر انتظار کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ وہ لوگ آہستہ آہستہ مزید آدمی جمع کر لیں گے۔ پھر مجاہدین کے لیے مقابلہ بالکل ناممکن ہو جائے گا۔ چنانچہ مولوی صاحب نے موضع گھنیا سے جو ایک کوس جانب شمال واقع تھا، چھ روپے کا غلّہ منگوایا اور مجاہدین میں تقسیم کر دیا تاکہ سب کھانا پکا لیں اور تیار ہو جائیں۔ معمول کے مطابق انتہائی عجز و انکسار سے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی اور مجاہدین کو لے کر اس درے کی طرف روانہ ہو گئے، جسے دیشیوں نے بند کر رکھا تھا۔ یہ حبسی کوٹ سے تقریباً دو کوس تھا۔ دیشیوں نے آس پاس کے پہاڑوں پر مورچے بنا لیے تھے اور وہ مقابلے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

دیشیوں کا فرار مولوی صاحب نے موقع کا معائنہ کر کے مجاہدین کو درے کے دونوں جانب کے پہاڑوں پر چڑھائی کا حکم دے دیا اور وہ تھوڑی ہی دیر میں دیشیوں کے مورچوں سے اوپر پہنچ گئے۔ مجاہدین نے ان پر ایک باڑ ماری۔ انھوں نے بھی جواب دیا، لیکن جلد مورچے چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ مجاہدین تعاقب کرتے ہوئے چری بنگ پہنچ گئے۔ وہاں پھر معمولی سی جھڑپ ہوئی اور دیشیوں نے دوبارہ راہِ فرار اختیار کی۔ مجاہدین آگے بڑھ کر موضع ترن میں جا ٹھہرے۔ وہاں سے ایک گولی کی زد پر شائی خاں کا قلعہ تھا۔ مولوی صاحب نے اس کے محاصرے کا حکم دے دیا۔ شام سے پہلے پہلے مجاہدین اس پر بھی قابض ہو گئے۔

یہ جھبی کوٹ سے بدرجہا زیادہ مستحکم مقام تھا، لہٰذا اسی کو مجاہدین نے اپنے بڑا مرکز قرار دے لیا۔

گجبوڑی پر شبخون | قلعہ شائی خاں میں رہتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ مہینا گزر گیا تو خبر ملی کہ دیشیوں اور تندھیاڑیوں نے گجبوڑی میں تو دس ہزار کا لشکر جمع کر لیا ہے۔ یہ مقام شائی خاں سے تقریباً دو میل تھا۔ مولوی صاحب نے پھر یہی فیصلہ کیا کہ ان کی پورش کا انتظار کرنے کے بجائے خود حملہ کیا جائے۔ چنانچہ حملے کا ساز و سامان تیار کر کے رات کے پچھلے پہر شائی خاں سے نکلے۔ مجاہدین کی تعداد دو سو کے قریب تھی۔ ایک نالے پر وضو کر کے اوّل وقت نماز فجر ادا کی۔ پھر لشکر کو تین گروہوں میں تقسیم کیا۔ ایک گروہ کو مقیم خاں کی سرکردگی میں گجبوڑی کے بائیں جانب بھیجا۔ دوسرے کو لعل محمد خاں قندھاری کی سالاری میں دائیں جانب روانہ کیا۔ خود تیسرے گروہ کو لے کر بستی کے سامنے سے حملہ آور ہوئے۔ بستی کے قریب پہنچتے ہی شور مچ گیا کہ مجاہدین آ گئے۔ دیشی اور تندھیاڑی بدحواس ہو کر بھاگے اور پاس کے پہاڑ پر جمع ہوئے۔ مجاہدین بھی تیزی سے تعاقب کرتے ہوئے قریب جا پہنچے۔ وہ لوگ دوبارہ بھاگے۔ پھر آٹھ کوس تک کہیں مقابلہ نہ کر سکے اور پراگندہ ہو گئے۔ مجاہدین کوٹلہ پہنچ گئے، جو دیشیوں کی سرحد پر واقع تھا۔

مصالحت کی درخواست | کوٹلہ میں مجاہدین کو بہت سا غلّہ، شہد اور گھی ملا۔ مولوی صاحب نے یہ تمام جنسیں اٹھوا کر سنگلی پہنچا دیں، جو کوٹلہ سے چار کوس جنوب میں واقع تھا۔ اس اثنا میں دیشیوں اور تندھیاڑیوں نے ایک وفد کے ذریعے سے مصالحت کی درخواست کی جو عبدالغفور خاں اگروری، کمال خاں اگروری، مظفر خاں بن ناصر خاں بھٹ گرامی، حبیب خاں ساکن راج دواری، سعادت خاں ساکن ٹیکری اور بعض مقامی علما، پر مشتمل تھا۔ مولوی صاحب نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ چنانچہ ان کے جتنے جانور پکڑے گئے تھے، سب واپس کر دیے۔ انھوں نے احکام شریعت مان کر عُشر دینا قبول کر لیا۔ ان میں دو نامور سردار تھے: ایک پھلول خاں، دوسرا نقیب اللہ خاں۔ مولوی صاحب نے اپنے ہاتھ سے انھیں سرداری کی دستاریں پہنائیں۔ جا بجا قاضی مقرر کر دیے تاکہ شریعت کے مطابق ان کے مقدموں کا فیصلہ کرتے رہیں اور خود قلعہ شائی خاں میں رہنے لگے۔

انتظامات کی کیفیت | اب جو علاقہ مجاہدین کے زیر اثر آ چکا تھا اور اس میں شرعی نظام جاری

ہو چکا تھا، اسے انتظامی لحاظ سے چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک درہ ٹیکری[1]، دوسرا درہ نندھیاڑ، تیسرا دیشیوں کا علاقہ، چوتھا درہ کونش۔ چند روز کے بعد مولوی صاحب نے ان علاقوں میں تحصیلِ عُشر کے لیے حسب ذیل اصحاب کو متعین کر دیا:

۱۔ نندھیاڑ	پیر مبارک علی جھنجھانوی
۲۔ کونش	اخوند زادہ فیض محمد شارکولی
۳۔ دیشیوں کا علاقہ	اخوند زادہ کاتب

چوتھے حصّے یعنی درہ ٹیکری میں خود مولوی صاحب موجود تھے۔ وہ جہاں جسے چاہتے تھے، بروقت ضرورت بھیج دیتے تھے۔ اس انتظام کے ماتحت عُشر باقاعدہ وصول ہونے لگا۔ مولوی صاحب نے تاکیدی ہدایات جاری کر دیں کہ کسی بستی کی کوئی زمین جس میں کاشت ممکن ہو، غیر مزروعہ نہ رہے۔ اس طرح ان علاقوں کی پیداوار بھی بڑھ گئی ؎

نئی رکاوٹ مجاہدین کی آرزو صرف یہ تھی کہ اپنی پوری قوتیں محاذِ جہاد کے استحکام و استواری میں صرف کر دیں، لیکن مقامی گروہوں کی فتنہ انگیزیاں قدم قدم پر ان کے ارادوں میں حائل ہو جاتی تھیں۔ دیشیوں کی جانب سے مطمئن ہو کر مولوی صاحب نے فیصلہ کیا کہ سچّوں پر شبخون ماریں، جہاں تین ہزار سکھ آ پہنچے تھے اور اپنا عمل دخل مستحکم کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ شائی خاں سے سچّوں تک دو روز کی مسافت تھی۔ مسافت کا تو چنداں خیال نہ تھا۔ تردّد کا خاص سبب یہ تھا کہ بیچ میں سرن ندی پڑتی تھی اور اس پر صرف ایک جگہ چوبی پُل بنا ہُوا تھا، جس سے گزرنا آسان نہ تھا ؎

اس مشکل کے باوجود فیصلہ کر لیا گیا کہ شبخون ضرور مارا جائے۔ چنانچہ تیّاریاں شروع ہو گئیں۔ اسی اثناء میں موضع جسُول سے ایک آدمی یہ خبر لایا کہ علاقہ

[1] وادیٔ ٹیکری نندھیاڑ اور اگرور کے درمیان واقع ہے۔ یہ تقریباً آٹھ میل لمبی اور چار میل چوڑی ہے۔ اس کی سطح ساڑھے چار ہزار فٹ بلند ہے ؎

الائی[1] کے آٹھ نو ہزار آدمی کوہانہ سے ڈیڑھ کوس پر پہاڑ کے اوپر ایک میدان میں اترے ہوئے ہیں اور قلعہ شائی خاں پر حملے کا عزم کیے بیٹھے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی سیّدوں پر شبخون کا ارادہ پھر مجبوراً ملتوی کرنا پڑا ۔

پیغام مصالحت مولوی نصیر الدین نے دیشیوں کے سردار نقیب اللہ خاں کو بلوایا اور چار پانچ ذی علم اصحاب کے ہمراہ ان لوگوں کے پاس بھیجا کہ انھیں سمجھاؤ اور یقین دلاؤ :

> ہم سے اور تم سے کسی طور کا علاقہ نہیں۔ تمھارا ملک جدا، ہمارا ملک جدا ۔ جو ہم لوگوں پر چڑھ کر آئے ہو، یہ سراسر تمھاری زیادتی ہے ۔ اس ملک میں ہمارا مقابلہ سکھوں سے ہے اور تم مسلمان بھائی ہو ۔ تم کو لازم تھا کہ ہمارے ساتھ شریک ہو کر سکھوں سے لڑتے اور جو اتنی حمیت دین کی نہ تھی تو اپنے ملک میں خاموش بیٹھے رہتے، ناحق ہم پر نہ آتے ۔ سو اب مناسب یہی ہے کہ اس طرف آگے نہ بڑھو، اپنے ملک کو چلے جاؤ ۔

نقیب اللہ خاں اور ان کے ساتھی تیسرے دن واپس آئے اور بتایا کہ وہ لوگ کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ۔ ہر چند سمجھایا، یہی جواب ملا کہ ہم کل پرسوں ضرور حملہ کریں گے اور اپنے ملک سے اس لیے نہیں آئے کہ کسی کے دھمکانے سے واپس چلے جائیں ۔ لہٰذا ضروری ہو گیا کہ پہلے اس فتنے کا انسداد کیا جائے ۔

مجاہدین کی یورش ان افسوس ناک حالات پر مولوی نصیر الدین اور مجاہدین کا دل خون ہوتا تھا، لیکن وہ مجبور تھے ۔ حملے کی روک تھام کے سوا ان کے لیے کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا ۔ مجاہدین میں سامان جنگ

---

[1] اس علاقے کے شمال و مشرق میں کوہستان ہے ۔ جنوب میں بھوگرمنگ، ننندھیاڑ اور دیشی ۔ اس کی مغربی حد دریائے سندھ ہے ۔ یہ پہاڑوں کی دو بڑی دیواروں کے درمیان واقع ہے ۔ کوہستان کی سمت کا پہاڑ پندرہ ہزار فوٹ بلند ہے ۔ ننندھیاڑ اور دیشی کی سمت کا پہاڑ بھی خاصا اونچا ہے اور تاکوٹ کے شمال میں دریائے سندھ پر ختم ہوتا ہے ۔ وادیٔ الائی تقریباً بارہ میل لمبی ہے اور اس کا رقبہ دو سو مربع میل سے کم نہ ہو گا ۔ "وقائع" جلد سوم صفحہ ۱۲۱ ۔

تقسیم ہوگیا۔ دو دو روز کی روٹیاں سب نے تیار کرلیں۔ نمازِ عصر کے بعد چار سو کے قریب مجاہدین مولوی نصیر الدین کی سرکردگی میں قلعہ شائی خاں سے روانہ ہوئے۔ مولوی صاحب نے روانگی سے پیشتر معمول کے مطابق بارگاہِ الٰہی میں دیر تک گریہ وزاری کی۔ شائی خاں سے دو اڑھائی کوس پر نمازِ مغرب پڑھی۔ وہاں سے کوس سوا کوس پر الائی والوں کا لشکر تھا۔ جب مجاہدین گولی کی زد میں پہنچے تو الائی والوں نے باڑہ ماری مجاہدین کے چھ آدمی زخمی ہوئے، جن میں ملّا لعل محمد قندھاری بھی تھے۔ ان کی کلائی پر گولی لگی تھی۔ کسی کی زبان سے بے اختیار نکل گیا کہ ملّا لعل محمد زخمی ہوگئے۔ یہ سنتے ہی ملّا صاحب نے اس کے مُنہ پر طمانچہ مارا اور فرمایا: چپ رہو، ایسی بات نہ کہو جو لوگوں میں ہراس پیدا کرے۔

غرض مجاہدین بے باکانہ آگے بڑھتے گئے۔ اگرچہ ان کی اور الائی والوں کی تعداد میں ایک اور بیس کا فرق تھا، تاہم الائی والوں پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ مال اسباب اور ہتھیار چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مولوی نصیر الدین نے تاکیدی حکم جاری کر دیا کہ کوئی بھائی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے اور بھاگنے والوں کا تعاقب جاری رکھا جائے۔

کامیاب تعاقب آگے راستہ اتنا تنگ تھا کہ صرف ایک ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ الائی والے پہاڑ کے چپے چپے سے واقف تھے۔ وہ مختلف سمتوں میں منتشر ہوگئے تاکہ مجاہدین نے تعاقب نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے، جہاں حدِ نظر تک برف جمی ہوئی تھی۔ الائی والوں کے جو گروہ دُور نظر آئے، وہ بھی مجاہدین کو دیکھتے ہی بھاگ نکلے۔ سفر اور چڑھائی میں مجاہدین کو بہت مشقت اٹھانی پڑی تھی اور بھوک کے غلبے نے پریشان کر رکھا تھا۔ ان کی روٹیاں مولوی فتح علی عظیم آبادی اور عبید اللہ پوری کے پاس تھیں جو بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ ملّا نور محمد قندھاری کے پاس مکئی کا تھوڑا سا آٹا تھا۔ مولوی نصیر الدین نے وہی چٹکی چٹکی مجاہدین میں بانٹ دیا۔ خود مولوی صاحب نے بھی ایک چٹکی آٹا پھانکا۔ چونکہ ان کے مُنہ میں دانت نہ تھے، اس لیے آٹا مُنہ کے اندر نہ جا سکا اور اڑ گیا۔

برف سے گزر کر آگے بڑھے تو جگہ جگہ گوجروں کے چند گھر ملے۔ وہ اپنی بھیڑ بکریاں لے کر بھاگ گئے تھے اور ان کے بچے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ مولوی صاحب نے حکم دے دیا کہ ان بچوں کو کوئی ہاتھ

نہ لگائے۔ دو گھڑی دن رہے، مجاہدین موضع بہاری میں پہنچ گئے۔ وہاں کے لوگ بھی بستی چھوڑ کر بھاگ چکے تھے۔ مولوی صاحب نے مجاہدین میں اعلان کرا دیا کہ کوئی بھائی کسی کے مال اسباب کو ہاتھ نہ لگائے۔ جن کے پاس کھانے کو کچھ نہ ہو، وہ ہمیں اطلاع دے دے، ہم جنس تول کر دے دیں گے تاکہ اس کا حساب رہے اور وہ لوگ واپس آئیں تو انھیں خرچ کی ہوئی جنس کی قیمت دے دی جائے۔

مصالحت کی مزید کوششیں مولوی نصیر الدّین نے یورش کے سلسلے میں انتہائی احتیاط سے کام لیا تھا۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ لڑائی طول نہ پکڑے اور جلد سے جلد مفاہمت ہو جائے۔ چنانچہ انھوں نے مقامی ملّاؤں کو دوبارہ ان لوگوں کے پاس بھیجا کہ تمھاری پیش دستی کے باعث ہمیں یورش کرنی پڑی۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ آرام و اطمینان سے بیٹھ جاؤ، فساد چھوڑ دو، اپنا مال اسباب لے کر امن سے رہو۔

یہ فہمائش بھی بے نتیجہ رہی۔ اس اثناء میں معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے پٹن اور پالس[1] سے کمک طلب کی ہے تاکہ از سرِ نو مجاہدین سے لڑیں۔ بہاری سے تین کوس پر سیّدوں کی ایک بستی تھی۔ مولوی صاحب وہاں گئے اور سیّدوں سے کہا کہ ان لوگوں کو سمجھائیے۔ ہم ان سے تعرض کے خواہاں نہیں، وہ کیوں ہم سے لڑنے کے لیے مضطرب ہیں؟

مولوی صاحب بہاری میں نو روز ٹھہرے رہے۔ وہاں سے پاؤ کوس پر نوگانواں ایک مقام ہے، وہاں الائی والوں نے نو دس ہزار کی جمعیّت فراہم کر لی۔ چار روز تک فریقین کی طرف سے بندوقیں چلتی رہیں۔ چونکہ بیچ میں ندی حائل تھی، اس لیے ایک دوسرے پر حملے اور دست بدست لڑائی کی نوبت نہ آئی۔

مجاہدین کی مراجعت اس اثناء میں ناصر خاں بھٹ گرامی کے فرزند مظفر خاں نے کمال خان اگروری کے ذریعے سے پیغام بھیجا کہ آس پاس کے تمام لوگوں نے سکھوں سے ساز باز کر لیا ہے اور خطرہ ہے کہ وہ مجاہدین کو نرغے میں لے کر ہمیں ختم کر دیں گے، لہٰذا بچاؤ کی کوئی مناسب تدبیر اختیار کر لیجیے۔

---

[1] یہ مقامات علاقہ کوہستان میں واقع ہیں۔ پٹن دریائے سندھ کے دائیں کنارے اور پالس بائیں کنارے ہے۔

مولوی صاحب نے مجروح اور معذور مجاہدوں کو شملئی بھیج دیا[1]۔ خود جنگل سے درخت کٹوانے شروع کئے اور اعلان کر دیا کہ ہم ندی عبور کرنے کے لیے پُل بنوانا چاہتے ہیں تاکہ ایک دم حملہ کر کے لڑائی کا فیصلہ کر دیں۔ یہ در اصل مخالفوں کو مرعوب کرنے کی ایک تدبیر تھی۔ پھر حکم دے دیا کہ زور شور سے بندوقیں اور شاہینیں سر کی جائیں تاکہ مخالفوں پر ظاہر ہو، مجاہدین پار اُترنے والے ہیں۔ رات ہوئی تو مجاہدین کو مراجعت کا حکم دے دیا۔ خود تیس چالیس آدمیوں کے ساتھ محاذِ جنگ پر ٹھہرے رہے۔ تھوڑی دیر بعد خود روانہ ہوئے اور ملّا لعل محمد قندھاری سے فرمایا کہ ہم دو گولی کی زد پر پہنچ جائیں تو آپ ہمارے پیچھے پیچھے آئیں۔ اگلے روز ڈیڑھ پہر دن چڑھے شملئی پہنچ گئے۔

دیہات کا دورہ شملئی سے مولوی صاحب نے دیہات کا دورہ شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں مندرجۂ ذیل دیہات کے نام آئے ہیں: بٹن بوڑی، کاکڑ سنگ، بھٹ گرام، چھتر گرام، حاجی مبرا، پھگوڑا، چوہان، دہڑیاں، بہانیاں، تیاں، ٹیکری اور پوڑا۔ جس مقام پر جاتے، پوچھتے کہ آیا لوگوں نے ہماری مخالفت میں دشمنوں سے سازباز کیا ہے؟ وہ برأت کا اظہار کرتے۔ تمام مقامات پر مجاہدین کی مہمانداری ہوئی۔ پھگوڑا کے ایک سیٹھ کی دکان پر مولوی صاحب کی ہنڈیاں آتی تھیں۔ وہ ملاقات کے لیے آیا تو نذر کے لیے شیرینی لایا۔ یوں دورہ کرتے ہوئے مولوی صاحب قلعہ شائی خاں پہنچ گئے۔ ان کی غیر حاضری میں شیخ ولی محمد بھی ناوا گئی سے شائی خاں آ گئے تھے۔ ان سے ملاقات کی خوشی میں قرابینیں اور شاہینیں سر کی گئیں۔

---

[1] روایت میں بتایا گیا ہے کہ دو قندھاری زخمی تھے۔ ان کے علاوہ لعل محمد جگیاشی، پورنی، محمد قاسم ساکن اگردالہ، گل شیر ساکن کالا باغ، شاہ ولی تنولی اور برکات مظفر آبادی تپ لرزہ میں مبتلا تھے۔ یہ شملئی چلے گئے۔

گیارھواں باب

پکھلی پر شبخون

بٹلوں پر چھاپا پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سکھوں کا خاصا بڑا لشکر شنکیاری سے اٹھ کر سچوں میں جمع ہو گیا تھا تاکہ اس پاس کے علاقوں سے خراج وصول کرے۔ مولوی نصیر الدین اسی لشکر پر چھاپا مارنے کا ارادہ کیے بیٹھے تھے، جب الائی والوں کی بے وجہ یورش اس ارادے کی تکمیل میں حائل ہو گئی۔ اس اثناء میں سکھوں نے اپنا اثر و رسوخ مستحکم کر لیا، اور بٹلوں کے رئیس بارک خاں اور محمد خاں بھی ان سے مل گئے تھے۔ الائی والوں سے فارغ ہو کر مولوی صاحب پھر سکھوں کی طرف متوجہ ہوئے اور تقریباً سوا سو مجاہدوں کو لے کر قلعہ شائی خاں سے نکلے۔ کچھ مقامی لوگ بھی ساتھ ہو گئے تھے۔

شائی خاں سے پانچ چھ کوس کے فاصلے پر چھتر نام ایک وسیع میدان ہے، جس میں دوسری بستیوں کے علاوہ سیدوں کی ایک بستی لاچھی بنگ واقع ہے۔ مولوی صاحب وہاں ٹھہر گئے اور چالیس پچاس مجاہدوں کو اس غرض سے بٹلوں بھیج دیا کہ بارک خاں کو ساتھ لے آئیں۔ غالباً مولوی صاحب کا مقصد یہ تھا کہ اس سے گفتگو کر کے سچوں پر یورش کی تدابیر اختیار کریں۔ ٹبلوں لاچھی بنگ سے صرف دو کوس بہ جانب مشرق واقع تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مجاہدین کی آمد کے متعلق عام افواہ پھیل گئی اور بارک خاں اپنے دس آدمیوں کے ساتھ بستی چھوڑ کر اس پہاڑ کی طرف بھاگا جہاں سے سکھوں کا لشکر قریب تھا۔ مجاہدین نے اس کا تعاقب کیا اور گرفتار کر کے لاچھی بنگ لے آئے۔

بارک خاں کا قتل مولوی صاحب جس مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے، وہ بستی سے ایک میل باہر تھا۔ "ولایتی" مجاہدین بارک خاں سے باتیں کرتے جا رہے تھے۔ انھوں نے کہا، خان صاحب! آپ بڑے دانا ہیں۔ خدا نے آپ کو سرداری کا منصب دیا ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ آپ

مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر سکھوں سے مل گئے ہیں۔ اُس نے جواب دیا :

سبب یہ ہے کہ سکھوں کا پایہ بھاری ہے۔ وہ صاحب ملک اور صاحب حکومت ہیں اور تم لوگوں کو میں اس قدر صاحب شوکت و سلطنت نہیں دیکھتا۔ آج یہاں ہو، کل اَور کہیں چلے جاؤ گے۔ اگر صاف صاف تمھارا شریک ہو جاؤں تو کہاں رہوں ؟

اس بیان سے ظاہر ہے کہ بارک خاں کے پیش نظر کوئی دینی یا قومی مقصد نہ تھا۔ وہ اس کا ساتھ دینا چاہتا تھا، جس سے اس کی دنیوی اغراض بہ سہولت پوری ہوتی رہیں، خواہ وہ کوئی ہو اور خواہ اس تعاون سے دینی اور قومی اغراض کو کتنا ہی نقصان پہنچے ؛

یہ بات سُنتے ہی سید میر کے ایک ہمراہی سپاہی کو اتنا غصّہ آیا کہ بے تامّل بھری ہوئی قرابین چلادی اور بارک خاں وہیں ڈھیر ہو گیا۔ سپاہی اسی وقت بھاگ گیا۔ مولوی صاحب کو یہ اطّلاع ملی تو حد درجہ ناخوش ہوئے۔ ملّا گلزار خاں جمعدار سے فرمایا کہ اپنے آدمی لے جائیے اور بارک خاں کی میّت کو لاچھی بنگ میں دفن کر دیجیے۔ چنانچہ اس ارشاد کے مطابق عمل ہُوا ؛

پیش قدمی لاچھی بنگ سے اٹھ کر مولوی صاحب رچھاڑی پہنچے جو درہ سچّوں میں واقع ہے۔ وہاں سے سچّوں دو کوس تھا۔ سکھوں کو اطّلاع مل گئی۔ رچھاڑی اور سچّوں کے درمیان سرن ندی بہتی تھی۔ دونوں لشکر ندّی کے دونوں کناروں پر کھڑے گولیاں چلاتے رہے۔ یورش اور دست بدست لڑائی کی نوبت نہ آئی ؛

تین دن اسی طرح گزر گئے۔ چوتھے دن مولوی صاحب نے مقیم خاں ساکن کالا باغ کو مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ پنجول بھیج دیا۔ راستے میں یکے بعد دیگرے دو ندّیاں پڑتی تھیں۔ مقیم خاں انھیں عبور کر کے پنجول پہنچا اور وہاں دو دن سکھوں سے لڑتا رہا۔ آخر انھیں شکست دے کر مال اسباب لے آیا۔ دونوں ندّیوں کے درمیان سکھوں نے پھر حملہ کیا اور پہر سوا پہر تک لڑائی جاری رہی۔ مجاہدین میں سے دو شہید اور دو زخمی ہوئے۔ سکھ پھر شکست کھا کر لوٹ گئے اور مقیم خاں کامیاب و بامراد مولوی صاحب کے پاس پہنچ گیا ؛

بٹلوں میں قلعے کی تجویز پھر مولوی صاحب بٹلوں پہنچ گئے اور فیصلہ کیا کہ اس مقام پر ایک قلعہ بنا کر سو پچاس مجاہدین بٹھا دینے چاہییں تاکہ سکھوں کے لیے آس پاس کے علاقے پر تسلط کا کوئی امکان باقی نہ رہے اور لوگ مطمئن ہو کر کاروبار جاری رکھ سکیں۔ ٹبلوں سے باہر ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا، اسی کو قلعے کے لیے منتخب فرمایا۔ اس اثنا میں دو ہندوستانی مجاہد ناراض ہو کر راہی وطن ہوئے۔ مولوی صاحب نے نظام الدین خاں شاہ جہان پوری، مستقیم خاں جہان آبادی، ابراہیم نگرامی اور رحیم بخش سہارن پوری کو ان کے پیچھے بھیجا کہ سمجھا بجھا کر واپس لے آئیں۔ افسوس کہ یہ فہمائش سود مند نہ ہوئی۔ مولوی صاحب کے قلبِ صافی پر اس واقعے کا ایسا ناخوش گوار اثر پڑا کہ وہ تعمیر قلعہ کی تجویز معلق چھوڑ کر شائی خاں واپس چلے گئے۔ اس معاملے میں تاخیر و توقف کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں نے ٹبلوں میں مولوی صاحب کے تجویز کردہ مقام پر قلعہ بنا لیا اور وہاں خاصی بڑی جمعیت بٹھا دی۔ اس وجہ سے مجاہدین کو جو نقصان اٹھانا پڑا، اس کی کیفیت آگے چل کر بیان ہو گی +

پکھلی پر شبخون کچھ دیر بعد مقیم خاں ساکن کالا باغ نے مولوی نصیر الدین سے عرض کیا کہ پکھلی میں سکھوں پر شبخون کی اجازت دی جائے۔ مولوی صاحب موصوف نے فرمایا کہ فاصلہ زیادہ ہے، اس لیے چست و چالاک مجاہد چن کر لے جائیے۔ چنانچہ مقیم خاں ڈیڑھ سو مجاہدوں کے ہمراہ شائی خاں سے روانہ ہوا اور پہلی منزل سنگل کوٹ میں کی جو درہ کونش میں پیر خیلوں کی بستی ہے اور سید قمر علی شاہ ان کا رئیس تھا۔ مجاہدین وہاں سے چلے تو اگل میں جا ٹھہرے۔ تین جاسوس پہلے سے مختلف سمتوں میں بھیج رکھے تھے کہ معلوم کر آئیں، کہاں کہاں سکھوں کی جمعیت ہے اور شبخون کے لیے کون کون سے مقامات موزون ہوں گے۔ خود مقیم خاں اگل سے نکلا تو کوٹلیاں میں جا ٹھہرا جو پکھلی کی سرحد پر واقع ہے۔ تین جاسوسوں میں سے دو واپس آ گئے اور اطلاع دی کہ شبخون کے لیے کوئی موزون جگہ نظر نہیں آتی، اس لیے کہ سکھوں نے جا بجا قلعے اور چوکیاں بنا رکھی ہیں، ہر جگہ خاصی فوج متعین ہے اور عام افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ مجاہدین کا حملہ ہونے والا ہے۔ اس وجہ سے سب لوگ چوکس ہیں اور انھوں نے پہرہ داری کے پورے انتظامات کر رکھے ہیں +

سکھوں سے لڑائی مقیم خاں کو شبخون کی جانب سے مایوسی ہوگئی تو فیصلہ کرلیا کہ سرن ندی کے کنارے کنارے گشت کرتے ہوئے چلیں اور درہ بھوگڑ منگ میں سے ہوتے ہوئے شائی خاں پہنچ جائیں، چنانچہ وہ روانہ ہوا۔ اچھڑیاں نام بستی میں ایک چشمے کے کنارے مجاہدین کھانا کھانے لگے شنکیاری وہاں سے دو کوس ہوگا، جہاں سکھوں کی فوج کا بڑا مرکز تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے ایک مجاہد نے اٹھ کر شنکیاری کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا، کچھ آدمی چلے آرہے ہیں۔ چنانچہ تمام مجاہدین ہتھیار سنبھال کر کھڑے ہوگئے۔ تھوڑی دیر میں سکھوں کی ایک جمعیت نمودار ہوئی۔ یہ لوگ نو سو کے قریب تھے، سوار کم، پیادے زیادہ۔ بیچ میں ندی حائل تھی۔ مجاہدین کنارے کنارے ندی کے اوپر کی طرف روانہ ہوئے تاکہ کسی موزوں مقام سے پار اتر کر لڑیں۔ سکھوں نے سمجھا کہ مجاہدین قلت تعداد کے باعث مقابلے سے پہلو تہی کر رہے ہیں۔ اس اثناء میں فریقین کی طرف سے گولیاں بھی چل رہی تھیں۔ ایک مقام پر عبدالغفار خاں جمعدار ساکن پکھلی نے مجاہدین کو پکار اکہ بھائیو! دیکھتے کیا ہو؟ آؤ ان پر دھاوا بول دیں۔ یہ کہتے ہی عبدالغفار خاں ندی میں کود پڑا۔ کمر سے اوپر پانی تھا تاہم وہ گولیوں کی بارش میں پار اتر گیا۔ باقی مجاہدین نے بھی اس کا ساتھ دیا اور تلواریں کھینچ کر بجلی کی تیزی سے سکھوں پر جا پڑے۔ بیس پچیس سکھ وہیں مارے گئے، باقی بدحواس ہوکر بھاگے۔ مجاہدین نے وہڑیال نام بستی تک ان کا تعاقب کیا، جو تقریباً اڑھائی کوس پر تھی۔ وہاں تک ستر اسی سکھ ہلاک ہوئے۔ مجاہدین میں سے کسی کے خراش تک نہ آئی۔ مقتول سکھوں کے ہتھیار لے کر مجاہدین لائی بنگ اور سنگل کوٹ میں ٹھہرتے ہوئے شائی خاں پہنچ گئے۔

بارھواں باب

دیشیوں کی خوفناک سازش

نئی سازش | مجاہدین پھر اطمینان سے اپنے اصل کام میں مصروف ہو گئے تھے کہ یکایک دیشیوں نے ان کے خلاف دوبارہ خوفناک سازش کر لی، جسے کامیاب بنانے کے لیے اتفاقاً ایک اچھا موقع پیدا ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ پائندہ خاں والی امب نے مولوی نصیر الدین کے پاس پیغام بھیجا: آپ مجاہدین کو لے کر شیر گڑھ آجائیں، وہاں سے پکھلی پہنچ کر سکھوں پر حملہ کریں گے۔ مولوی صاحب موصوف تین سو مجاہدوں کے ساتھ شیر گڑھ پہنچے۔ وہاں سے پائندہ خاں کے ہمراہ بیرکھنڈ کا رخ کر لیا اور بھوج درہ میں مقام کیا۔ شیخ ولی محمد کے پاس شائی نزاں میں صرف پچاس ساٹھ مجاہدین رہ گئے تھے۔ اس دوران میں دیشیوں نے ایکا کر کے مجاہدین کو ختم کر دینے کی ٹھان لی۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ پہلے ان مجاہدین کو شہید کریں، جو دیہات میں جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ پھر شائی خاں پر چڑھائی کر کے باقی مجاہدین کو موت کے گھاٹ اُتار دیں۔

منفرق مجاہدین پر حملے | چنانچہ مولوی صاحب کے جاتے ہی دیشیوں نے اپنے منصوبے کے مطابق عمل شروع کر دیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے:

۱۔ شیخ ولی محمد کے بھیلے کا ایک مجاہد خدا بخش بلند کوٹ میں شہید کر ڈالا گیا۔

۲۔ ملا لعل محمد قندھاری کے بھیلے کا ایک آدمی فیض محمد موضع اتھل میں متعین تھا، وہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

۳۔ شیخ لکھمیر کو بھی بلند کوٹ ہی میں متعین کیا گیا تھا اور اس نے مسجد کے حجرے میں اقامت اختیار کر رکھی تھی۔ رات کے وقت اس پر بھی حملہ ہوا لیکن وہ شمشیر زنی کے کمالات سے کام لیتے ہوئے چار آدمیوں کو زخمی کر کے بچ نکلا اور صحیح سلامت شائی خاں پہنچ گیا۔

۴۔ دیشیوں کو سب سے زیادہ دشمنی ملّا کاتب اخوندزادہ سے تھی، جو ان کے علاقے میں تحصیل کا حاکم اعلیٰ تھا۔ موصوف کو بروقت اطلاع مل گئی اور وہ رات کو ننگے بدن بھاگ کر شائی خاں پہنچ گیا۔

باقی مجاہدین کے متعلق سخت تشویش تھی، لیکن وہ سب بخیر و عافیت دوسرے یا تیسرے دن شائی خاں میں داخل ہو گئے۔ گویا دیشیوں کا یہ منصوبہ ناکام رہا، البتّہ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے دو مجاہد سراسر ناحق مارے گئے۔

دفاعی تدابیر اس اثناء میں دیشی گجبوڑی کے مقام پر جمع ہونے لگے۔ شیخ ولی محمد نے قلعے پر پہرے کا پختہ بندوبست کر لیا۔ قلعے سے ساٹھ ستّر قدم پر ایک چشمہ تھا جس سے پانی لیا جاتا تھا۔ اس پر برج بنا کر دو پہرے لگا دیے تاکہ پانی کی رسد محفوظ رہے اور مولوی نصیرالدّین کو کھوج درہ پیغام بھیج دیا کہ جلد سے جلد واپس آ جائیے۔

پائندہ خاں نے سکھوں پر پیش قدمی کی تجویز ملتوی کر دی۔ خود امب واپس چلا گیا اور اپنے دو اڑھائی سو لشکری مھندا جمعدار کی سرکردگی میں مولوی صاحب کے ساتھ شائی خاں بھیج دیے۔ یہ سب پندرہ بیس روز حملے کا انتظار کرتے رہے۔

مھندا کی تدبیر جنگ جب دیشیوں کی طرف سے کوئی اقدام نہ ہوا تو مھندا جمعدار نے شیخ صاحب اور مولوی صاحب کی اجازت سے خود لڑائی چھیڑنے کی ایک معقول تدبیر اختیار کی۔ اس نے پچاس ساٹھ تنولیوں کو حکم دیا کہ کمر کوہ پر ہوتے ہوئے دیشیوں کی طرف جائیں، انھیں دیکھتے ہی بندوقیں سر کر دیں جب وہ مقابلے پر نکلیں تو لوٹ پڑیں۔ اس تدبیر کا مقصد یہ تھا کہ دیشی قیام گاہ سے اٹھ کر شائی خاں کے قریب آ جائیں تاکہ ان سے لڑائی کا اچھا موقع نکل آئے۔

دیشیوں کی پسپائی اس تدبیر پر عمل ہوا اور دیشی تنولیوں کا تعاقب کرتے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں شائی خاں پر بڑھے۔ ادھر سے مولوی صاحب اور مھندا جمعدار ان کے مقابلے کے لیے نکلے۔ براج درّانی کا سردار بلند خاں سب سے آگے بڑھ کر تنہا ان پر حملہ آور ہوا اور تھوڑی ہی دیر میں اس نے چار پانچ دیشیوں کو زخمی کر دیا۔ پھر باقی لوگ ان پر ٹوٹ پڑے۔ دیشی بدحواس ہو کر بھاگے۔ ڈیڑھ کوس تک ان کا تعاقب

کیا گیا اور تیس چالیس آدمی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ مجاہدین میں سے دو نے شہادت پائی۔ چونکہ شام ہوگئی تھی، اس لیے سب لوگ تعاقب چھوڑ کر واپس آ گئے۔

سامانِ رسد پر چھاپا اس اثناء میں معلوم ہوا کہ سکھوں کی طرف سے گولی بارود کا بہت بڑا ذخیرہ دیشیوں کے لیے بھیجا جا رہا ہے اور صرف پچاس ساٹھ آدمی اس ذخیرے کی حفاظت پر متعین ہیں۔ عبدالغفار خاں ساکن نکھلی نے نیلی شنگ اور بھگوڑا کے درمیان ان لوگوں پر چھاپا مارا اور سارا سامان لوٹ کر لے آیا۔

اس واقعے سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ دیشیوں نے سکھوں سے ساز باز کے بعد مخالفانہ قدم اٹھایا تھا ورنہ سکھوں کی طرف سے سامانِ جنگ انھیں کیوں بھیجا جاتا؟ یقین ہے کہ اس ساز باز میں سب سے بڑا حصہ ان رئیسوں اور سرداروں نے لیا ہوگا جو اپنی جاگیروں کی حفاظت کے جنون میں اسلامی مقاصد سے بالکل بے پروا تھے اور مسلمانوں کی جانوں سے بے تکلف کھیل رہے تھے۔

بلند کوٹ پر شبخون دیشی پسپا ہو کر گجبوڑی میں جا بیٹھے تو مولوی نصیر الدین نے پچاس ساٹھ مجاہدین کی ایک جماعت کو مقیم خاں کی سرکردگی میں بلند کوٹ بھیج دیا اور فرمایا کہ تمھاری کمک کے لیے اگروڑ سے بھی آدمی آئیں گے اور نمازِ فجر کے بعد ہم بھی پہنچ جائیں گے۔ مقیم خاں اپنی جماعت کو لے کر عشا کے وقت شائی کوٹ سے روانہ ہوا۔ چرڑ بنگ میں ایک چشمے پر سب نے وضو کیا۔ وہاں سے ایک کوس پہاڑ پر بلند کوٹ تھا۔ اس پہاڑ پر پہنچے تو صبح صادق نمودار ہو رہی تھی۔ مجاہدین نے نماز پڑھی۔ اُدھر بستی میں شور مچ گیا کہ مجاہدین آ گئے اور سب لوگ بستی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ کچھ دیر بعد اگروڑ سے بھی کمک پہنچ گئی اور مولوی صاحب بھی تشریف لے آئے۔ چرڑ بنگ میں قاضی عصمت اللہ نے مجاہدین کی مہمان داری کی۔

گجبوڑی پر دھاوا مزید چار روز گزر گئے۔ پانچویں رات کو مولوی صاحب نے گجبوڑی پر دھاوے کا فیصلہ کیا اور فرمایا کہ پچاس ساٹھ مجاہدین راتوں رات اس پہاڑ پر جا چھپیں جو گجبوڑی کے اوپر واقع ہے۔ ہم صبح کو حملہ کریں گے تو اس وقت یہ مجاہدین کمین گاہ سے نکل کر گجبوڑی کی طرف چلے

آئیں۔ چنانچہ سید میر خاں کو پچاس ساٹھ مجاہدین کے ساتھ گجبوڑی کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ سب لوگ گھروں سے نکل کر پہاڑ پر جمع ہو گئے اور وہاں سے بندوقیں چلانے لگے لیکن کسی مجاہد کو گزند نہ پہنچا۔ سید میر خاں نے خود آگے بڑھ کر حملہ کر دیا۔ وہ لوگ وہاں بھی نہ ٹھہر سکے اور دوسری طرف پہاڑ کے نیچے اتر گئے۔ پہاڑ کے نشیب میں شنکلیاں اور شنکھالیاں نام دو بستیاں تھیں۔ ان کے درمیان اہل و عیال کو چھوڑ کر دو ہزار کے قریب دیشی مجاہدین کے مقابلے پر نکلے۔ ادھر سے قرابینیں سر ہوئیں تو دیشی پھر بھاگ نکلے۔ کوس سوا کوس پر موضع کوٹ گلہ تھا، وہاں تک تعاقب کیا گیا۔ اس اثناء میں مولوی نصیر الدین بھی تشریف لے آئے۔

اقرارِ اطاعت اب دیشیوں نے بے بس ہو کر اپنے ملّاؤں کو عذر داری کے لیے بھیج دیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ ہم شنکلی میں قیام کریں گے، وہیں آخری فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر دیشیوں نے اطاعت کا اقرار کر لیا۔ ان کی خطا معاف کر دی گئی۔ تمام بستیوں سے عشر کا غلہ گدھوں اور خچروں پر بار ہو ہو کر شائی خاں پہنچنے لگا۔ مولوی صاحب قلعے میں واپس چلے گئے۔ اس کے بعد مجاہدین جب تک شائی خاں میں مقیم رہے، دیشیوں نے سرکشی اور تمرد کی کوئی حرکت نہ کی۔

تیرھواں باب

مجاہدین کے چھاپے

جبڑ پر پیش قدمی دیشیوں کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو مقیم خاں ساکن کالا باغ نے مولوی نصیر الدین سے عرض کیا کہ اجازت ہو تو میں درہ پکھل میں جا کر جبڑ پر چھاپا مارنا چاہتا ہوں، جو سکھوں کی عملداری میں واقع ہے۔ مولوی صاحب نے اجازت دے دی، اور مقیم خاں دو سو مجاہدوں کے ساتھ نمازِ ظہر کے بعد شائی نال سے روانہ ہوا۔ رات ابھی بنگ کے پاس فقیروں کے تکیے میں گزاری۔ صبح یہ لوگ موضع بالی منگ میں پہنچے۔ وہاں کھانے کا انتظام تو نہ ہو سکا البتہ مقامی لوگوں نے ہر مجاہد کی خدمت میں مکئی کے آٹھ آٹھ بھٹے پیش کر دیے۔ وہاں سے پہاڑ پر چڑھائی شروع ہوگئی۔ سارا دن سفر میں گزرا۔ نمازِ مغرب کے وقت پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے ؎

وہاں سے اُترنے لگے تو گھاس میں سے گزرنا پڑا جو اتنی لمبی تھی کہ سینے تک آتی تھی۔ سوءِ اتفاق سے وہاں برکات مظفر آبادی کی تلوار میان سے نکل کر گر پڑی اور اندھیرے میں تلاش کے باوجود نہ مل سکی۔ ملا لعل محمد قندھاری نے اپنے بھیلے کا ایک آدمی برکات کے ساتھ کر دیا اور فرمایا کہ رات بھر یہاں ٹھہرے رہو۔ صبح کو اُجالا ہوگا تو تلوار ڈھونڈ لینا۔ باقی مجاہدین علی الصباح دامنِ کوہ کی ایک ویران بستی میں پہنچ گئے، جہاں سے جبڑ ایک میل ہوگا۔ وہیں صبح کی نماز ادا کی ؎

کامیاب حملہ اسی مقام سے جبڑ پر حملہ کیا۔ مجاہدین بجلی کی تیزی سے بستی میں جا پہنچے۔ جس قدر مال اسباب ہاتھ لگا، پہاڑ کے دیرے پہنچا دیا۔ جبڑ سے نصف میل پر ایک اور بستی تھی۔ کچھ مجاہدین وہاں بھی جا پہنچے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ پیچھے سے سکھوں کا لشکر مقابلے کے لیے آپہنچا ہے۔ ان کی گولیاں مجاہدین پر برسنے لگیں۔ ملا لعل محمد قندھاری اور مقیم خاں نے یہ دیکھتے ہی تلواریں سونت کر

ان پر حملہ کر دیا - پہلے ہی ہلے میں پچیس تیس سکھ مارے گئے اور باقی بھاگ گئے - مجاہدین مالِ غنیمت لے کر اطمینان سے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے اور وہاں نمازِ ظہر ادا کی - جس بستی میں رات ہوئی، وہاں کھانے کو کوئی چیز نہ مل سکی - مجبوراً صرف گوشت پر گزارہ کیا گیا - اگلے دن وہاں سے چل کر شام کو شملئی پہنچے - بعض مجاہدین نرا گوشت کھانے کے باعث بیمار ہو گئے - پھر بھٹ گرام ٹھہرتے ہوئے شاہی خاں چلے گئے ؂

چھلے پر چھاپا | چند روز بعد اطلاع ملی کہ شنکیاری کے سکھوں نے درہ بھوگڑ منگ کی ایک بستی چھلے میں بہت سامان اسباب جمع کر رکھا ہے - چنانچہ مولوی نصیر الدین نے اس مقام پر چھاپے کا فیصلہ کر لیا اور اڑھائی سو آدمی لے کر اُدھر روانہ ہوئے - رات درہ کونش کی ایک بستی ملکا نام میں گزاری - صبح کو روانہ ہوئے تو عصر کے وقت سرن ندی کے کنارے پہنچے - ندی کے دوسرے کنارے پر سکھ موجود تھے - مجاہدین کو دیکھتے ہی وہ بندوقیں چلانے لگے - ندی کو عبور کرنے کا کوئی سامان نہ تھا، لہذا مجاہدین اس کے کنارے کنارے [illegible] روانہ ہوئے [illegible] [illegible] لئے [illegible] کا مقصد یہ تھا کہ بڑا لشکر [illegible] مجاہدین کا مقابلہ کریں ؂

چھلے میں داخلہ | کوئی دو کوس کی مسافت طے کرنے کے بعد لکڑی کا ایک پل ملا جس بستی پر [illegible] چھاپا مارنا چاہتے تھے وہ پل کے [illegible] وہاں کے لوگ اُس بستی والے مجاہدین کی [illegible] حال [illegible] کریں [illegible] دوڑے - لیکن مجاہدین نے ان سے پہنچنے سے پہلے پل پر قبضہ کر لیا - ملا لعل محمد [illegible] نے [illegible] باقی مجاہدین کو لے کر بستی میں پہنچ گئے وہاں کے لوگ [illegible] پہاڑ پر چڑھ گئے تھے - انھوں نے مجاہدین پر گولیاں چلانی شروع [illegible] [illegible] ہو گئے - سکھوں نے گھی، شہد، غلہ وغیرہ بکثرت جمع کر رکھا تھا [illegible] پر قبضہ کر لیا - چھ روز [illegible] وہاں بیٹھے رہے - مولوی صاحب کے پاس شاہی خاں میں پیغام [illegible] کر دیا کہ کچھ خچر بھیج دیں تاکہ ان پر سامان بار کیا جا سکے ؂

سکھوں کی آمد | چند روز بعد خبر ملی کہ تقریباً چھ سو [illegible] شنکیاری سے آ رہے ہیں - ملا لعل محمد نے

مقیم خاں سے کہا کہ اندیشہ ہے، وہ لوگ پل پر قابض نہ ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہمارے لیے واپسی کا
کوئی راستہ باقی نہ رہے گا، لہٰذا یا تو آپ بستی میں ٹھہریں اور میں پچاس ساٹھ مجاہدین کے ساتھ پل
کی حفاظت کے لیے چلا جاتا ہوں یا آپ وہاں جائیں اور میں یہاں ٹھہرتا ہوں۔ مقیم خاں فوراً روانہ ہو گئے۔
اس اثناء میں اطلاع ملی کہ مانسہرہ سے مزید دو تین سو سکھ قریب آپہنچے ہیں۔ اتفاق یہ کہ مولوی صاحب
کی طرف سے بار برداری کا کوئی جانور نہ پہنچا اور ملا لعل محمد نے ساتویں روز مراجعت کا فیصلہ کر لیا۔
مختلف مجاہدین جتنا سامان خود اٹھا سکے، اٹھا لیا، باقی چھوڑ دیا۔ پل سے گزرتے وقت پانچ چھ سو سکھ
پاس کی ایک پہاڑی پر نمودار ہوئے۔ انھوں نے گولیاں بھی چلائیں، جن سے دو تین آدمی زخمی ہوئے
لیکن وہ آگے نہ بڑھے اور مجاہدین لاچھی بنگ ٹھہرتے ہوئے شائی خاں پہنچ گئے۔

بٹلوں میں سکھوں کا قلعہ ہم بتا چکے ہیں کہ مولوی نصیر الدین بٹلوں میں ایک قلعہ بنانا چاہتے
تھے تاکہ آس پاس کے علاقے کی حفاظت کا انتظام بہتر طریق پر ہو سکے، لیکن بعض مجاہدین کی ناراضی
کے باعث یہ تجویز التوا میں پڑ گئی۔ سکھوں کو موقع ملا تو انھوں نے بٹلوں میں ایک مضبوط قلعہ بنایا اور
اس میں تین چار ہزار جنگ جو بٹھا دیے۔ اس طرح آس پاس کے علاقے پر ان کا تسلط مستحکم ہو گیا۔
مجاہدین کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ انتظار کریں اور جب مناسب موقع پیدا ہو یورش کر کے
اس قلعے کو مسخر کر لیں۔

اس سلسلے میں یہ خطرہ بھی خاصی اہمیت اختیار کر چکا تھا کہ ممکن ہے، سکھ کسی وقت بٹلوں کے
قلعے سے اٹھ کر شائی خاں پر حملہ بول دیں، لہٰذا درمیانی علاقے میں حفظ و دفاع کے ضروری انتظامات
کر لیے گئے۔

کوٹ میں اقامت بٹلوں سے شائی خاں کی جانب دو کوس پر موضع کوٹ تھا۔ مولوی نصیر الدین
نے مقیم خاں کو حکم دیا کہ ایک سو بیس آدمی لے جاؤ اور کوٹ میں ٹھہرو۔ مقیم خاں شائی خاں سے چلا
تو سیدھا کوٹ کو نہ گیا، بلکہ شارکول ہوتے ہوئے کوٹ سے کوئی ایک میل آگے لاچھی بنگ جا پہنچا۔
وہاں مشیروں سے پوچھا کہ میں سکھوں پر شبخون مارنا چاہتا ہوں، آپ کا مشورہ کیا ہے۔

شبخون کے متعلق رائے مشیروں نے جواب دیا کہ ہم سب آپ کے ساتھ مرنے مارنے کو تیار ہیں۔ لیکن یہ سوچ لیجیے کہ سکھوں کی جمعیت ہزاروں پر مشتمل ہے اور ہم پورے سوا سو بھی نہیں ح بے شک فتح و شکست تھوڑے یا بہت آدمیوں پر موقوف نہیں، یہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مگر شبخون کے انجام پر خوب غور کر لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے، ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں اور سکھ ہمارے تعاقب میں نکل پڑیں۔ پھر نہ ہم کوٹ میں ٹھہر سکیں گے اور نہ شانی خال ہیں۔ اگر آپ شبخون ہی پر تُلے بیٹھے ہیں تو کم از کم مولوی نصیر الدین سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہ اٹھانا چاہیے۔

چوکی پہرے چار ہزار کے قلعہ نشین لشکر پر سوا سو آدمیوں کے ساتھ شبخون مارنے کا عزم مقیم خاں کے غیر معمولی جوش شجاعت کا ایک کرشمہ تھا۔ مشیروں نے جن خطرات کا اظہار کیا تھا، ان کے پیش نظر مقیم خاں کے لیے التوا کے سوا چارہ نہ رہا۔ چنانچہ وہ کوٹ میں مقیم ہو گیا اور ٹیلوں کی سمت میں تین چوکی پہروں کا انتظام کر دیا: ایک لاچھی بنگ میں، دوسرا اخلہ میں اور تیسرا اروڑی میں۔ شام کو چند مجاہدین ان مقامات پر جا بیٹھتے، رات وہاں گزارتے اور صبح کی نماز کے بعد کوٹ چلے آتے۔ ان چوکی پہروں کا مقصد یہ تھا کہ سکھوں کی طرف سے معمولی سا بھی مخالفانہ اقدام ہو تو اس کی اطلاع کوٹ کے مجاہدین کو فوراً ہو جائے۔

سکھوں کی یورش مقیم خاں کو کوٹ میں پہنچے ہوئے بارہ تیرہ دن گزرے تھے کہ ایک رات کو اروڑی کے چوکی پہرے والوں میں سے ایک نے دُور سے گیرد وال توڑے چمکتے دیکھے اور سمجھ لیا کہ سکھ چھاپا مارنے کو آ رہے ہیں۔ اس نے فوراً بندوق داغی اور ساتھی پہرے داروں کو لے کر پہاڑ پر چڑھ گیا۔ باقی چوکی پہرے والے اور کوٹ کے مجاہدین ہوشیار ہو گئے۔ صبح کی نماز پڑھ کر وہ بھی پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے۔ سکھ ان سے پچاس ساٹھ قدم نیچے رہ گئے۔ ان سکھوں میں گڑھی کا خان، حبیب اللہ خاں بھی شامل تھا جو سکھوں کو ٹیلوں میں لانے کا ذمہ دار تھا۔ مقیم خاں نے سید میر خاں جمعدار کو حکم دیا کہ چالیس مجاہدین کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر پیچھے رہو اور خود اس نے اسّی مجاہدین کو لے کر سکھوں پر حملہ کر دیا۔ اس اثناء میں سکھوں کی ایک گولی مدد خاں قندھاری کے سینے پر لگی اور وہ یہ کہتے ہوئے جان بحق ہو گیا کہ بھائیو! میرا

کام تمام ہو چکا۔ میرے پاس ٹھہرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ سب آگے بڑھ کر دشمن کو مارو۔ مقیم خاں نے پے در پے تین حملے کیے۔ ہر حملے میں پندرہ بیس سکھ مارے جاتے تھے۔ آخر سکھ پسپا ہو گئے۔ مجاہدین میں سید میر نام ایک نوجوان گوجر بھی شامل تھا۔ وہ پہاڑ کی چوٹی پر دوڑا دوڑا پھرتا تھا اور بہ آوازِ بلند کہتا تھا: "شاباش بھائیو! شاباش، دشمنوں کو خوب مارو۔ مولوی صاحب بھی کمک لے کر آ رہے ہیں۔" ایک جگہ جھاڑی میں کچھ سکھ چھپے بیٹھے تھے۔ ان کی گولی سے سید میر شہید ہو گیا۔ بالآخر سکھ ناکام واپس چلے گئے۔ مجاہدین میں سے دو شہید (مددخاں اور سید میر) اور چھ زخمی ہوئے۔ ملا الہام الدین کے گلے پر زخم آیا۔ نور محمد خاں قندھاری کی کلائی زخمی ہوئی۔ فتح خاں ولایتی کے سینے میں اور اکبر علی خاں صواتی کی ران میں گولی لگی۔ دو ولایتی مجروحوں کے نام معلوم نہ ہو سکے۔

اس واقعے کے بعد مولوی نصیر الدین نے حکم دے دیا کہ کوٹ کے پاس پہاڑ کی چوٹی پر ایک برج بنا لیا جائے، جس میں پچاس مجاہد رہ سکیں۔ ہر مہینے ان مجاہدوں کی تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔

چودھواں باب

خوانینِ اگرور کا انجام

پس منظر ہم قبل ازیں پائندہ خاں تنولی اور خوانین اگرور کی عداوت کا ذکر کر چکے ہیں۔ پائندہ خاں کی یورشوں نے عبدالغفور خاں اور کمال خاں کو اگرور سے نکال دیا تھا اور وہ وادیٔ ٹیکری کے ایک مقام چوہان میں مقیم تھے، لیکن پائندہ خاں کے مقبوضات میں وقتاً فوقتاً لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ ممکن ہے، پائندہ خاں کے سامنے دوسرے مقاصد بھی ہوں، تاہم مجاہدین کو جسی کوٹ میں ٹھہرانے کا ایک بہت بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ خوانین اگرور کی قزاقانہ دست برد کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ چنانچہ اس مقصد میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ مجاہدین کی وجہ سے خوانین اگرور کے چھاپے نہ صرف رُک گئے بلکہ وہ لوگ بہ ظاہر مجاہدین کے معاون بن گئے۔

تاہم عجیب بات یہ ہے کہ سرحدی خوانین میں سے کسی کی بھی نظریں ذاتی مقاصد سے بلند تر نہ تھیں۔ ہر شخص اُسی وقت تک مجاہدین کا ساتھ دیتا رہتا جب تک اسے کار برآری کی تھوڑی بہت امید لگی رہتی۔ اس امید کے پورا ہوتے یا ٹوٹتے ہی وہ مجاہدین سے الگ ہو جاتا بلکہ معاندانہ پیش دستی میں بھی تامّل نہ کرتا۔ خوانین اگرور بھی اس عام سطح سے بلند نہ رہ سکے اور نتیجہ ایک خونچکاں المیہ کی صورت میں ظاہر ہوا، جس کی تفصیل اس باب کا موضوع ہے۔

خوانین کی توقّعات اور دو رخی عبدالغفور خاں اور کمال خاں اس توقّع پر مجاہدین کے معاون بنے تھے کہ اگرور میں از سر نو ریاست قائم کرنے کا بندوبست ہو جائے گا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجاہدین کو عُشر دینے پر بھی آمادہ تھے، لیکن مجاہدین پائندہ خاں کے تعاون کی بنا پر جسی کوٹ پہنچے تھے۔ گرد و پیش کے خوانین میں پائندہ خاں بہ لحاظ قوّت و مردانگی سب سے بڑھا ہوا تھا

اس کا تعاون مقاصد جہاد کے لیے زیادہ سے زیادہ تقویت کا باعث ہو سکتا تھا۔ لہٰذا مجاہدین کے لیے کوئی ایسا قدم اٹھانا سراسر خلاف مصلحت تھا جو پائندہ خاں کے لیے خفگی کا باعث ہوتا۔ چنانچہ وہ عبدالغفور خاں اور کمال خاں کو اگرور میں آباد کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ البتہ جب وادی ٹیکری میں انھیں عمل دخل کا موقع ملا تو عبدالغفور خاں سے خاص مراعات کا برتاؤ کیا یعنی اُسے عشر سے مستثنیٰ رکھا اور یہ بھی کہہ دیا کہ جب آپ کے آدمی جہاد میں امداد کے لیے ہمارے پاس آئیں گے تو انھیں دوسرے مجاہدین کی طرح باقاعدہ رسد ملا کرے گی۔ عبدالغفور خاں نے بظاہر تو ان انتظامات کو خوش دلی سے قبول کر لیا، لیکن اس کا دل مجاہدین سے پھر گیا اور اسی وقت سے اُس نے خفیہ خفیہ سکھوں کے ساتھ ساز باز کے انتظامات شروع کر دیے۔

گڑھی کا خان حبیب اللہ خاں عبدالغفور خاں کا حقیقی ماموں تھا اور وہ کھلم کھلا سکھوں سے ملا ہوا تھا۔ عبدالغفور خاں اب اسے برانگیختہ کرنے لگا کہ سکھوں کا لشکر لے کر مجاہدین کو ختم کر دو تاکہ اگرور خالی ہو جائے اور میں (عبدالغفور) سکھوں ہی کی سرپرستی میں اس پر قبضہ کر لوں۔

خفیہ خط و کتابت جب سکھ بٹلوال میں قلعہ بنا کر بیٹھ گئے اور مجاہدین نے ان کے مقابلے کے لیے کوٹ کے اوپر برج بنا لیا تو عبدالغفور خاں کا ایک خط حبیب اللہ خاں کے نام پکڑا گیا جس کا مضمون یہ تھا:

> تم چار پانچ ہزار سکھوں کی جمعیت رکھتے ہو اور سو سوا سو مجاہدین تم سے دو کوس پر کوٹ میں پڑے ہیں۔ اگر ان پر شبخون لاؤ اور ان کو مار لو تو قلعہ شائی خاں تک تمھارا عمل دخل ہو جائے۔ اور جو تمھارے مقابلے سے بھاگ کر ادھر آئیں گے ان کو میں سمجھ لوں گا اور وہاں قلعہ شائی خاں میں تمھارا مقابلہ کوئی نہ کرے گا[1]۔

موضع قبولہ کا قاضی احمد مجاہدین کا خیر خواہ تھا، وہ پہلے بھی مولوی نصیر الدین کو بتا چکا تھا کہ عبدالغفور خاں کی روش ٹھیک نہیں۔ اس خط سے قاضی موصوف کے بیان کی تصدیق ہو گئی، تاہم مولوی صاحب نے

---

[1] "وقائع" ، جلد دوم، ص ۶۶۵

صبر و تحمّل سے کام لینا یہی مناسب سمجھا کہ انتظار کریں اور دیکھیں، حالات کیا صورت اختیار کرتے ہیں۔

سکھوں کے جب اچھا پے کا ذکر ہم گزشتہ باب میں کر چکے ہیں، اس سے چند روز بعد پھر کوٹ میں عبدالغفور خاں کا ایک قاصد پکڑا گیا۔ اس کے پاس سے جو خط برآمد ہوا، وہ اس امر کا مزید ثبوت تھا کہ عبدالغفور خاں معاندانہ حرکتوں میں بدستور سرگرم ہے۔ چنانچہ یہ خط لے کر ملا لعل محمد قندھاری، اخوند گل پشاوری اور قاضی احمد مولوی صاحب کے پاس گئے اور کہا، اس کا تدارک ہونا چاہیے، تساہل ہرگز مناسب نہیں۔

خیر خواہوں کا اصرار

روایت مظہر ہے:

قاضی احمد نے بہت غصّے ہو کر مولوی صاحب سے کہا، آپ اس مفسد کا تدارک نہیں کرتے بلکہ اس کے بھائی (کمال خاں) کو اپنا رفیق سمجھتے ہیں۔ یہ بات خوب نہیں۔ اگر آپ ان کے مارنے کی تدبیر نہیں کرتے تو سمجھ لیجیے، ہم سب ولایتی آپ کے دشمن جانی ہیں کیونکہ یہ مفسد ہماری بیخ کنی کے درپے ہیں اور آپ اس کو ایک سہل سا معاملہ سمجھتے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ غفور خاں تو البتہ مفسد ہے اور اس کے خطوط بھی پکڑے گئے ہیں، مگر کمال خاں نے تو آج تک کوئی فن فریب ہمارے ساتھ نہیں کیا۔ اگر باطن میں کچھ شرارت کرتا ہو تو وہ جانے، ہم کو خبر نہیں[1]۔

غرض مولوی صاحب کسی تادیبی کارروائی کے لیے تیار نہ تھے، خصوصاً کمال خاں کو وہ عبدالغفور کی طرح مجرم ماننے پر بھی آمادہ نہ تھے، لیکن مقامی خیر خواہوں اور ولایتی مجاہدوں نے حد درجہ معقول دلائل اور محکم شواہد کی بنا پر ایسی روش اختیار کر لی کہ مجاہدین کا قیام بھی معرضِ خطر میں پڑ گیا۔ چنانچہ مولوی صاحب مجبوراً خود اس معاملے سے بے تعلق ہو گئے۔ مقامی آدمیوں اور ولایتی مجاہدوں نے عبدالغفور اور کمال خاں کو ختم کرنے کی سکیم بنا لی۔

[1] "وقائع" جلد دوم ص۴۷۶۔

سکھوں کو پیچھے ہٹانے کی تدبیر بٹلوں میں قلعہ بنا لینے سے سکھوں کا خطرہ بہت بڑھ گیا تھا۔ پائندہ خاں نے اس خطرے کو ختم کرنے کی تدبیر یہ سوچی کہ بیر کھنڈ پر حملہ کر دیا جائے۔ خیال یہ تھا کہ اُدھر دباؤ پڑے گا تو سکھ بٹلوں کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ جائیں گے، چنانچہ پائندہ خاں اور مولوی صاحب شیر گڑھ سے بھوج درہ ہوتے ہوئے کینڈیا گئے جو بیر کھنڈ سے صرف دو کوس تھا۔ وہاں چھ سات دن ٹھہرے رہے، لیکن بٹلوں میں سکھوں کی جمعیت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ پائندہ خاں کا اندازہ صحیح ثابت نہ ہوا لہٰذا وہ اور مولوی صاحب کینڈیا سے مراجعت پر مجبور ہو گئے ؛

خوانین اگرور کے خلاف جرگہ خوانین اگرور کو قتل کرنے کا منصوبہ جن اصحاب نے تیار کیا اور اسے پایۂ تکمیل پر پہنچایا، ان میں سے نمایاں اور ممتاز یہ ہیں:

۱۔ قاضی احمد ساکن قبولہ۔ ۲۔ اخوند گُل پشاوری۔ ۳۔ ملّا لعل محمد قندھاری۔ ۴۔ ملّا گلزار خیبری۔ ۵۔ نور محمد خُرد جلال آبادی۔ ۶۔ مقیم خاں ساکن کالا باغ۔ ان کے علاوہ بھی متعدد لوگ شریک تھے، لیکن وہ سب مقامی یا ولایتی تھے، ہندوستانی کوئی نہ تھا ؛

عبدالغفور خاں اپنے مرکز چوہان میں مقیم تھا۔ کمال خاں پچاس ساٹھ آدمیوں کے ساتھ کوٹ آیا ہوا تھا۔ قتل کا منصوبہ یہ قرار پایا کہ کچھ آدمی چوہان جا کر عبدالغفور خاں کو موت کے گھاٹ اتاریں، دو تین بندوقچی درمیانی پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے رہیں۔ وہ چوہان میں بندوقیں چلنے کی آواز سنتے ہی خود بندوقیں سر کر دیں تاکہ کوٹ والے آگاہ ہو جائیں اور فی الفور کمال خاں پر حملہ کر کے اسے ختم کر ڈالیں۔ چنانچہ ملّا گلزار خیبری، نور محمد خُرد جلال آبادی اور اخوند گُل پشاوری پچاس ساٹھ آدمیوں کے ساتھ عبدالغفور خاں کے قتل کے لیے چوہان گئے۔ ملّا لعل محمد قندھاری اور مقیم خاں ساکن کالا باغ کمال خاں کو ٹھکانے لگانے کی غرض سے کوٹ میں رہے ؛

عبدالغفور خاں کا قتل جو لوگ چوہان گئے تھے، وہ مسجد میں جا ٹھہرے۔ وہاں سے ایک گولی کی زد پر عبدالغفور خاں کی گڑھی تھی، جس کے ارد گرد تین طرف نالا بہتا تھا۔ مسجد کی سمت ہموار میدان تھا۔ عبدالغفور خاں دو خدمت گاروں کے ساتھ مسجد میں آیا۔ معلوم ہوتا ہے، وہ حقیقتِ حال کو

بھانپ گیا تھا۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھا، پھر یہ کہتے ہوئے اٹھا کہ میں گڑھی میں جا کر آپ لوگوں کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔ نور محمد خرد قرابین لے کر ساتھ ہو گیا۔ اخوند گل پشاوری نے ساتھیوں سے کہا، دیکھتے کیا ہو، ہلّہ بولو۔ سب لوگ تلواریں کھینچ کر دوڑے۔ عبدالغفور خاں نالے کی طرف بھاگا۔ نور محمد نے قرابین ماری اور وہ نشیب میں گر کر جاں بحق ہو گیا۔

کمال خاں کا خاتمہ قرابین کی آواز سنتے ہی ان لوگوں نے بندوقیں داغ دیں جو درمیانی پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے تھے۔ اس طرح کوٹ میں عبدالغفور خاں کے مارے جانے کی خبر پہنچ گئی۔ ملّا لعل محمد اور مقیم خاں مشورے کی غرض سے کمال خاں کو چھت پر لے گئے۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی جسے دیکھنے کے بہانے ملّا لعل محمد نے لے لیا۔ مقیم خاں نے قرابین ماری۔ کمال خاں گرتے ہی ختم ہو گیا اور صرف یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے: "مقیم خاں! تم نے دغا کی"۔

انتظامات اس المیے کی اطلاع قلعہ شاہ خاں میں شیخ ولی محمد کے پاس پہنچی تو موصوف اور مجاہدین بے حد متالم ہوئے۔ اسی وقت شیخ صاحب نے حسن خاں[1] عظیم آبادی، کریم اللہ خاں[2] میواتی، کریم بخش[3] سہارن پوری اور ملّا الہام الدین[4] کو چوہان بھیج دیا کہ عبدالغفور خاں کی تجہیز و تکفین کا انتظام کریں۔ اس کے اہل و عیال اور مال و اسباب کو حفاظت میں لے لیں۔ چنانچہ یہ لوگ چوہان پہنچے۔ عبدالغفور خاں کے بیٹے کو مستورات نے اٹک کے پاس بستی میں بھیج دیا تھا۔ کمال خاں کا بیٹا جس کی عمر سات برس کی ہوگی، گڑھی سے آکر حسن خاں کی گود میں بیٹھ گیا اور بولا: میرا باپ جب کوٹ جانے لگا تو وصیت کر گیا تھا کہ بیٹا! اگر میں مارا جاؤں تو تم اپنی ماں کو لے کر قلعہ شاہ خاں میں مولوی صاحب کے پاس چلے جانا، وہ تمھاری معاش کے لیے کچھ مقرر کر دیں گے۔ یہاں تمھارا چچا، عبدالغفور خاں تمھیں روٹی نہ دے گا۔

---

[1] یہ صاحب کچھ مدت بعد ٹونک چلے آئے تھے۔ نواب وزیر الدولہ نے انھیں اسلحہ خانے کا داروغہ بنا دیا تھا۔

[2] یہ بھی ٹونک میں ملازم ہو گئے تھے۔ [3] یہ ٹونک ہوتے ہوئے مکّہ معظّمہ چلے گئے تھے۔ وہیں مقیم رہے اور وفات پائی۔

[4] یہ بھی ٹونک آ گئے تھے اور نواب وزیر الدولہ نے انھیں رسالداری کا عہدہ دے دیا تھا۔

بچّے کی یہ باتیں سُن کر حسن خاں اور ان کے ساتھی آبدیدہ ہو گئے۔ عبدالغفور خاں کو دفن کر دیا۔ گڑھی میں اس کے اہل و عیال اور دوسرے متعلقین کے لیے کھانا پکوا کر بھجوایا۔ چار وقت تک کھانے کا انتظام مجاہدین کی طرف سے ہوتا رہا۔ بعد ازاں عبدالغفور خاں اور کمال خاں کے بال بچوں کو بستی میں بھجوا دیا۔ ان کے دو بھتیجوں اللہ داد خاں اور جمعہ خاں سے بھی کہہ دیا کہ اطمینان سے رہو، تم سے کوئی تعرض نہ ہوگا۔ گڑھی میں اپنے پہرے مقرر کر دیے۔

پائندہ خاں کی آرزو یوں مدت مدید کے بعد پائندہ خاں کی آرزوئے انتقام پوری ہو گئی۔ وہ خود خوانین اگرور کو ٹھکانے نہ لگا سکا تھا۔ قدرت ہی کی جانب سے اس امر کا انتظام ہو گیا۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، پائندہ خاں کے تدبّر کا کمال یہ ہے کہ اس نے مجاہدین کو جبوڑی کوٹ میں بٹھاتے وقت اشارۃً بھی اس مقصد کا ذکر نہ کیا تھا اور اس کی تکمیل حالات کی طبعی رفتار پر چھوڑ دی تھی۔ معلوم ہوتا ہے اسے پختہ یقین تھا کہ مجاہدین کو جبوڑی کوٹ میں بٹھا دینے ہی سے اصل مقصد پورا ہو جائے گا۔ اگر یہ اندازہ نہ ہو کہ کیونکر پورا ہوگا۔ مجاہدین کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اگروریوں سے کسی نوع کی کشمکش پیدا ہوگی۔ عبدالغفور خاں کی دورنگی نے معاملات آخری منزل پر پہنچا دیے۔

دونوں بھائیوں میں سے کمال خاں کا قتل اس لیے حد درجہ دردناک ہے کہ اس سے مجاہدین کے خلاف عناد کی کوئی حرکت سرزد نہ ہوئی تھی، جیسا کہ مولوی نصیرالدّین خود اعتراف فرما چکے تھے۔ لیکن مقامی لوگوں اور ولایتیوں نے اسے غالباً اس وجہ سے قتل کیا کہ ممکن ہے، کمال خاں بعد ازاں بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے لیے ہنگامہ بپا کرے۔ بہرحال نظر بظاہر اس کے مظلوم مارے جانے سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا[1]۔

---

[1] "وقائع" کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ سیّد صاحب پنجتار سے ہجرت کر کے پکھلی کی طرف گئے تھے تو کمال خاں کی خواہش تھی، آپ کو اگرور میں دعوت دے۔ عبدالغفور خاں کی پس و پیش کے باعث اس پر عمل نہ ہو سکا۔ جلد سوم صفحہ ۲۴۶۔

پندرھواں باب

بٹلوں میں خونریز جنگ

بٹلوں پر حملے کی تیاری بٹلوں سے سکھوں کو نکالنے کے لیے پائندہ خاں اور مولوی نصیرالدین نے پیرکھنڈ کی جانب پیش قدمی کی تھی، جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، لیکن اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا لہٰذا اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ براہ راست بٹلوں پر حملہ کیا جائے۔ کوٹ میں مجاہدین نے جو مورچے بنائے تھے، ان کی غرض بھی یہی تھی چنانچہ مولوی نصیرالدین نے حملے کے لیے تیاری شروع کر دی۔

بٹلوں میں سکھوں نے دفاعی استحکامات کمال پر پہنچا رکھے تھے، مثلاً کوٹ کی طرف بٹلوں کے عین سامنے ایک نالا تھا۔ یہ بٹلوں کی حفاظت کا ایک قدرتی سامان تھا۔ خود بٹلوں ایک میدان میں واقع تھا اور اس کی پشت پر پہاڑ کے دامن میں قلعہ تھا۔ قلعے کے آگے ایک اونچی جگہ تھی، جس کے اردگرد جنگلی سیوتی اور حناب کے کانٹوں کی باڑ لگا کر مضبوط سنگر بنا لیا تھا۔ اس باڑ کے بیرونی حصے میں تختے نصب کر دیے گئے تھے۔ باڑ اتنی اونچی تھی کہ اندر آدمی کھڑا ہو جائے تو باہر سے محض سر نظر آ سکتا تھا۔ اس میں صرف ایک دروازہ تھا، جو مشرقی جانب واقع تھا گویا یہ اونچی جگہ بھی ایک مضبوط گڑھی بن گئی تھی۔ سکھوں کی جمعیت چار پانچ ہزار سے کم نہ تھی۔ اتنی بڑی جمعیت اور دفاعی استحکامات کے ہوتے ہوئے حملہ سہل نہ تھا تاہم مولوی صاحب نے ضروری سامان تیار کر لینے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ سید قطب شاہ حیدرآبادی دکنی نے بہت سے سینگ اور بھینسوں کی آنتیں بارود سے بھر لیں تاکہ حملے سے پیشتر انھیں آگ دے کر سکھوں پر پھینک سکیں۔ متعدد ٹٹیاں بھی بنا لیں تاکہ حملے کے وقت انھیں باڑ کے ساتھ لگا کر سنگر کے اندر پہنچ سکیں۔

کوٹ سے روانگی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو مولوی صاحب نے مجاہدین میں گولی بارود تقسیم کر دی

وہ سب پیادہ ہو کے الگ بھاگ تھے۔ کوٹ میں جو بھیڑ۔۔۔ اور جنسیں موجود تھیں وہ سب پیر مبارک علی جھنجھانوی اور فتح محمد سہارن پوری کے حوالے کر دیں کہ شانی خاں لے جائیں۔ گویا مولوی صاحب ایک فیصلہ کن حملے کا ارادہ کر چکے تھے جس میں اندیشہ تھا کہ ممکن ہے سکھوں کے جوابی حملے کی وجہ سے کوٹ خطرے میں پڑ جائے۔ عصر، مغرب اور عشا کی نمازوں میں سر برہنہ ہو کر دعا کی کہ جس کام کے لیے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ اسے پورا کرنے کی توفیق دے اور استقامت نصیب کرے۔ مجاہدین کو تاکید کی کہ گناہوں سے تائب ہو کر مغفرت کی دعائیں مانگو۔ عشا کے بعد کمر بندی کا حکم دیا۔ چلنے لگے تو فرمایا: بھائیو! اب کوئی فضول بات زبان سے نہ نکالو، صرف سورۂ قریش کا ورد جاری رکھو۔ خود مولوی صاحب خچر پر سوار ہوئے، مجاہدین پیادہ تھے۔

ابتدائی حملہ چلتے چلتے نالے پر پہنچے جس میں کمر تک پانی تھا۔ وہاں سے تقریباً نصف کوس سنگر تھا۔ اسے بائیں جانب چھوڑ کر پہاڑ پر چڑھنے لگے تاکہ اوپر سے اُتر کر حملہ کریں۔ جب مجاہدین چڑھتے چڑھتے سنگر کے محاذ میں پہنچ گئے تو سب نے اوّل وقت نماز ادا کی۔ آگے بڑھے تو پچاس ساٹھ سکھ نظر آئے جو سنگر سے نکل کر آ رہے تھے، مگر اندھیرے میں نہ سکھوں نے مجاہدین کو پہچانا، نہ مجاہدین نے سکھوں کو۔ ایک سکھ نے پنجابی میں پوچھا: تم کس کے ڈیرے سے آئے ہو؟ ایک ہندوستانی نے جواب دیا: تو کیا کہتا ہے؟ یہ سن کر سب سکھ "مجاہدین آ گئے، مجاہدین آ گئے" پکارتے ہوئے سنگر کی طرف بھاگے۔ مجاہدین بلند آواز سے تکبیر کہہ کر حملہ آور ہوئے۔ سنگر وہاں سے کوئی نصف میل تھا۔ سکھ بندوقیں لے کر تیار ہو گئے اور گولیاں برسانے لگے، لیکن مجاہدین ایک لمحے کے لیے بھی نہ رُکے۔ ملا لعل محمد قندھاری کے نشان بردار لال میر قندھاری نے گولیوں کی بارش میں اپنا نشان سنگر کی باڑ پر جا کر گاڑا۔ باقی چار نشان برداروں نے بھی یکے بعد دیگرے اپنے نشان وہیں پہنچا دیے۔ اس حملے میں پندرہ سولہ مجاہدین شہادت پا گئے۔

مجاہدین کی پریشانی اس موقع پر مجاہدین کو اس وجہ سے سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ وہ باڑ سے کود کر سنگر کے اندر نہ جا سکتے تھے۔ اس مقصد کے لیے مطلب شاہ حیدر آبادی نے جو سامان تیار کیا تھا

یعنی بارود سے بھرے ہوئے سینگ، بارود سے بھری ہوئی بھینسوں کی آنتیں اور ٹتیاں، وہ سب پہاڑی پر رہ گئی تھیں۔ حملہ اس طرح اچانک اور اناگوناہوا کہ عجلت میں یہ سامان ساتھ نہ لیا جا سکا۔ سکھ سنگر کے اندر بیٹھ گئے اور مجاہدین کی گولیوں سے بڑی حد تک محفوظ ہو گئے، لیکن خود مجاہدین ہر سمت سے گولیوں کا ہدف بنے ہوئے تھے اور ان کے گرد و پیش کوئی اوٹ نہ تھی۔ پہاڑ پر سے ٹتیاں یا دوسرا سامان لانا اس وقت غیر ممکن تھا۔ قطب شاہ نے بانکا[1] اٹھایا اور ایک مقام سے باڑ کاٹنے لگے، مگر ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوئی تدبیر چنداں موثر نہ ہو سکتی تھی۔ خود مولوی صاحب مجاہدین سے پیچھے پہاڑ کی اونچائی پر کھڑے لڑائی کا حال دیکھ رہے تھے۔ عبداللہ خرد اور شیخ فتح علی عظیم آبادی ان کے پاس تھے۔

ملا لعل محمد کی شہادت

مجاہدین کی خاصی بڑی تعداد شہید ہو چکی تھی۔ سکھوں کی گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ یہ حال دیکھ کر ایک جماعت سنگر سے تھوڑے فاصلے پر ٹھٹک کر رہ گئی۔ ملا لعل محمد قندھاری نے لاٹھی اٹھائی اور ان لوگوں کو سنگر پر حملے کا حکم دینے کے لیے پلٹے۔ عین اس حالت میں ان کے قلب پر گولی لگی اور شہید ہو گئے[2]۔

مولوی نصیر الدین کے ہمراہیوں میں ملا لعل محمد قندھاری کو وہی بلند درجہ حاصل تھا، جس پر سید صاحب کے رفقا میں سے مولانا شاہ اسمٰعیل فائز تھے۔ جماعت مجاہدین کے لیے یہ بہت بڑا نقصان تھا۔ ملائے موصوف نے اس زمانے میں سید صاحب کی رفاقت اختیار کی تھی، جب آپ بقصد جہاد قندھار سے کابل کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ کم و بیش سات سال جماعت مجاہدین کے روح و رواں بنے رہے۔ اکثر لڑائیوں میں انھیں سبقت کا شرف حاصل ہوا۔ بہت جوانمرد اور صالح

---

[1] بانکا بانس یا شاخیں یا باڑ کاٹنے کا چھرا ہوتا ہے، جسے روایتوں میں کتا (بکاف مفتوح) بتایا گیا ہے۔

[2] روایت مظہر ہے کہ گولی ملا لعل محمد کے جانب چپ پہلو میں لگی۔ چونکہ ان کی موت آناً فاناً واقع ہوئی، اس لیے میرا خیال ہے کہ موصوف کا قلب صافی گولی کا نشانہ بنا۔

بزرگ تھے۔ جنگ مردان کے بعد مولانا شاہ اسمٰعیل نے دو مجاہدوں کے کارناموں کو بے حد قابلِ قدر قرار دیا تھا: ایک مولوی مظہر علی عظیم آبادی کہ آغازِ جنگ ہی میں گولی کا نشانہ بنے لیکن یہ واقعہ کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ گولی کھا کر زمین پر اس انداز میں بیٹھ گئے کہ معلوم ہوتا پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہے۔ تمام رفیقوں کو پکار پکار کر فرما رہے تھے: "تم چلو، میں ابھی آتا ہوں"۔ دوسرے مجاہد ملا لعل محمد قندھاری تھے۔ مردان کے ایک برج سے برابر گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ ملا لعل محمد اس کے پاس پہنچ گئے اور ساتھیوں کو پشتو میں حکم دیا: "اندر پائی راوڑا، اندر پائی راوڑا" یعنی سیڑھی لاؤ، سیڑھی لاؤ۔ حالانکہ وہاں کوئی سیڑھی نہ تھی۔ برج والوں نے سمجھا کہ مجاہدین اوپر چڑھتے ہی ان کا خاتمہ کر دیں گے، لہٰذا انھوں نے ہتھیار نیچے پھینک دیے اور اپنے آپ کو حوالے کر دیا۔

اس کتاب کے دسویں باب میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ملا قادر داد کے لوگوں سے جنگ پیش آئی تھی، تو ملا لعل محمد کے بھی کلائی پر گولی لگی تھی۔ کسی مجاہد نے کہا کہ ملا صاحب زخمی ہو گئے تو موصوف نے اس کے تھپڑ مارتے ہوئے کہا: ایسی بات کیوں کہتا ہے جس سے رفیقوں میں ہراس پیدا ہو؟ ملائے موصوف نے سید صاحب کی رفاقت اختیار کرنے کے بعد زندگی کا ایک ایک لمحہ جہاد فی سبیل اللہ میں گزارا اور وطنِ مالوف سے ہزاروں میل دور عالمِ غربت میں شہادت پائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

قطب شاہ کی مردانگی

ملا لعل محمد کی شہادت کے ساتھ ہی قطب شاہ کے شانے پر گولہ لگا اور تلوار کا سا زخم ہو گیا۔ نیچے کا گوشت نیچے لٹک پڑا، اوپر کا گوشت اوپر چڑھ گیا۔ انھوں نے پانی مانگا۔ ملا الہام الدین جنھوں نے قطب شاہ سے قرابین کی بھر ماری سیکھی تھی، پاس کھڑے تھے، لیکن نہ پانی نزدیک تھا، نہ ساتھ کوئی برتن تھا۔ وہ گولیوں کی بارش میں نالے کی طرف دوڑے۔ اپنی چادر پانی میں بھگو لائے اور نچوڑ کر پانی قطب شاہ کے منہ میں ٹپکایا۔ دو گھونٹ حلق سے اترتے ہی قطب شاہ شدید زخم کے باوجود اٹھے اور اپنا انگا ہاتھ میں لیے مولوی نصیر الدین کے پاس پہنچ گئے۔

مولوی صاحب کا عزمِ اقدام

اس وقت تک پچاس سے اوپر مجاہدین شہادت پا چکے تھے اور کوئی ستر زخمی ہو چکے تھے۔ مولوی صاحب نے یہ نقشہ دیکھا تو شمشیر و علم لے کر چلے کہ

اب تنہا ہمارا بیڑا پار لگنا بے لطف ہے۔ جہاں ہمارے بھائی شہید ہوئے وہیں ہم بھی شہید ہو جائیں گے۔
شیخ فتح علی اور عبداللہ دونوں روکنے کے لیے ان سے لپٹ گئے، مگر مولوی صاحب نہ رکے۔ شیخ
زبردست خاں ہیلتی نے دُور سے انھیں آتے دیکھا تو قرابین کندھے پر ڈال کر دوڑے۔ مولوی صاحب کا راستہ
روک لیا اور کہا: آپ کہاں جاتے ہیں؟ آپ ہی کے دم سے یہ انتظام قائم ہے۔ ہم لوگ کتنی ہی تعداد
میں شہید ہو جائیں، کچھ حرج نہیں۔ آپ کے نہ ہونے سے جہاد کا پورا کاروبار درہم برہم ہو جائے گا۔
غرض شیخ موصوف بہ زور انھیں پھیر کر پیچھے لے گئے۔

مجاہدین کی ایک تدبیر

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سکھ گولے گولیاں پھینکتے پھینکتے تھک
چکے تھے اور ہانڈیاں، گھڑے، پتھر، لکڑیاں جو کچھ ان کے ہاتھ آتا، مجاہدین پر پھینکتے۔ مولوی صاحب
نے فرمایا کہ اب سنگر کے اندر پہنچنا مشکل ہے۔ مناسب یہ ہے کہ ہم لوگ پیچھے ہٹ جائیں۔ سکھ ہمیں پس پا
ہوتے دیکھ کر تعاقب میں نکلیں گے۔ جب وہ خاصی تعداد میں باہر آ جائیں تو ایک دم پلٹ کر ان پر حملہ
کر دیا جائے۔ اس منصوبے پر عمل ہوا۔ جب سکھ سو سوا سو قدم سنگر سے باہر آ گئے تو مولوی صاحب نے
بلند آواز سے تکبیر کہتے ہوئے حکم دیا کہ بھائیو! اب حملہ کر کے انھیں ختم کر ڈالو۔ چنانچہ مجاہدین اللہ اکبر کے
نعرے لگاتے ہوئے تلواریں سونت کر ان پر جا پڑے۔ اس حملے میں بھی بہت سے سکھ مارے گئے۔
باقی پھر بھاگ کر سنگر میں داخل ہو گئے۔ جو گڑھی کے قریب تھے، وہ گڑھی میں چلے گئے۔

مجاہدین کی مراجعت

اس آخری حملے کے بعد مولوی صاحب نے مراجعت کا حکم دے دیا۔
چنانچہ وہ بٹنوں سے چلے اور بالی منگ کے گورستان میں پہنچ کر ظہر کی نماز ادا کی۔ عصر کے وقت اپنے
مرکز کوٹلہ میں داخل ہو گئے۔ جنگ کے متعلق مفصل اطلاعات شیخ ولی محمد امیر جماعت کے پاس شانی خاں
بھیج دی تھیں۔ اگلے روز وہاں سے رسد کا سامان آ گیا۔ مولوی صاحب نے برج کی مرمت کرا دی اور پچاس
مجاہدین کی جماعت اس میں متعین کر دی۔

تیسرے روز بلوا کی طرف سے دھوئیں کے بادل اٹھتے ہوئے نظر آئے۔ مولوی صاحب نے
پیادوں کو تفتیش احوال کے لیے بھیجا تو معلوم ہوا کہ سکھوں نے منگل کو آگ لگا دی اور خود قلعہ چھوڑ کر

شنکیاری چلے گئے ؛

نقصان کی تفصیلات ابتدا میں اندازہ تھا کہ لڑائی میں کم و بیش سات سو سکھ مارے گئے بعد میں قرب و جوار کے مقامی لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ مقتولین کی تعداد چار سو سے زیادہ نہ تھی۔ عبداللہ نام ایک نو مسلم سکھ نے بھی اس تعداد کی تصدیق کی۔ وہ اسلام لانے سے پیشتر مجاہدین کے خلاف لڑتا رہا تھا۔ مسلمان ہو کر شیخ ولی محمد کے قافلے کے ساتھ سندھ پہنچا۔ سید عبدالرحمٰن (خواہر زادہ سید صاحب) نے اس کے لیے سفر حج کا انتظام کر دیا۔ باقی عمر اس نے حرمین شریفین ہی میں گزاری ؛

لڑائی کا نتیجہ ہم بتا چکے ہیں کہ مجاہد شہیدوں کی تعداد پچاس سے کچھ اوپر تھی۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کے سوا کسی کا نام معلوم نہ ہو سکا : ملا لعل محمد قندھاری، برکات مظفر آبادی، عطا محمد مظفر آبادی، عبدالستار پشاوری، شاہین خاں مشوانی ساکن علاقہ گنگر نزد تربیلہ، رحیم بخش ساکن پھلتی، میر بران علی میرٹھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سکھوں نے گڑھی اور سنگر کے درمیان ایک لمبی سی قبر کھود کر تمام شہیدوں کو اس میں دفن کرا دیا۔ سکھوں کے ہمراہی مسلمانوں نے بتایا کہ یہی مجاہدوں کا گنج شہیداں ہے ؛

ملا لعل محمد قندھاری کے پہلے میں تینتیس آدمی تھے، ان میں سے اکتیس ٹیلوں ہی میں شہید ہوئے۔ صرف لال میر خاں نشان بردار اور نور محمد کلاں کوہائی زندہ بچے۔ تقریباً ستر مجاہد زخمی ہوئے تھے۔ وہ بفضلِ خدا چند روز میں اچھے ہو گئے ؛

دابشی اور اگرور کے قیام میں مجاہدین نے جو لڑائیاں کیں، ان میں سے ٹیلوں کی لڑائی سب سے زیادہ خونریز تھی۔ مجاہدین کا مقصد یہ تھا کہ سکھ ٹیلوں سے نکل جائیں۔ لڑائی سے یہ مقصد پورا ہو گیا، اگرچہ اس سلسلے میں مجاہدین کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ سید صاحب کی ترتیبات جہاد کا موقع، محل اور وقت ایسا تھا کہ اس میں تدبیر سے کہیں زیادہ شجاعت و مردانگی ضروری تھی۔ ٹیلوں کی لڑائی میں اگرچہ تدبیر نظر انداز نہ ہوئی، تاہم یہ مجاہدین کی شجاعت ہی کا ایک قابلِ فخر کارنامہ تھی۔ اگر انھیں پائندہ خاں کی بدعہدی سے سابقہ نہ پڑتا تو یقین تھا کہ وہ بہت جلد ضلع ہزارہ میں ایک مستحکم محاذِ جہاد قائم کر لیتے

چند سال بعد رنجیت سنگھ کی وفات پر سکھوں کی حکومت میں خوفناک ابتری پیدا ہو گئی۔ اگر اُس موقع پر مجاہدین کا محاذ موجود ہوتا تو اغلب تھا، وہ پورے سرحدی علاقے کو قبضے میں لے آتے اور اس حصے کی صد سالہ سرگزشت کا اسلوب و نہج بالکل مختلف ہوتا۔ لیکن اب اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

یک، کاشکے بود کہ بہ صد جا نوشتہ ایم!

سولھواں باب

پائندہ خاں کی عہد شکنی

پائندہ خاں اور خوانینِ اگرور ہم بتا چکے ہیں کہ پائندہ خاں اور خوانین اگرور کے درمیان سخت دشمنی تھی۔ کشمکش میں خوانین اپنے وطن سے نکل کر علاقہ دیشی میں مقیم ہو گئے تھے، تاہم ان کی طرف سے پے در پے یورشوں اور چھاپوں کا شدید خطرہ تھا۔ پائندہ خاں مجاہدین کو زیادہ تر اس خیال سے جسی کوٹ لایا تھا کہ ان کے ہوتے ہوئے خوانین اگرور چھاپے نہ مار سکیں گے۔ اس مقصد میں اسے پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ عبدالغفور خاں نے اس لیے مجاہدین کا ساتھ دیا تھا کہ ان کی وساطت سے اگرور میں دوبارہ آباد ہو جانے کی امید تھی۔ مجاہدین پائندہ خاں کی شدید دشمنی کے پیشِ نظر بطورِ خود عبدالغفور خاں کو اگرور نہ لا سکتے تھے۔ اسے مایوسی ہو گئی تو خفیہ خفیہ اپنے ماموں حبیب اللہ خاں کے ذریعے سے سکھوں کے ساتھ ساز باز کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اور اس کا بھائی کمال خاں مارے گئے اور اس خطرے کا استیصال ہو گیا جو مجاہدین کو جسی کوٹ میں لانے کا موجب بنا تھا۔ ساتھ ہی پائندہ خاں کی روش بھی بدل گئی اور وہ حیلوں بہانوں سے مجاہدین کو نکالنے کی تدبیریں کرنے لگا۔

بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مقامی رئیسوں نے پائندہ خاں کو اس امر کی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم آپ کے فرماں بردار رہیں گے، باقاعدہ خراج ادا کریں گے، لیکن شرط یہ ہے کہ مجاہدین کو نکال دیجیے۔ وجوہ کچھ ہوں، پائندہ خاں اپنے عہد پر قائم نہ رہا اور مجاہدین کو مسلسل خبریں ملنے لگیں کہ وہ اپنی عادت کے مطابق پُرپیچ چالیں اختیار کرنے کے درپے ہے۔

الائی پر چھاپے اگرچہ الائی کے لوگ مجاہدین کی فرماں برداری کا اقرار کر چکے تھے، تاہم وہ سکھوں کی انگیخت اور امداد کی بنا پر مخالفانہ سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ بٹلوں کی لڑائی سے دو اڑھائی

مہینے بعد مقیم خاں نے مولوی نصیر الدین سے اجازت لے کر ان پر ایک چھاپا مارا اور بہت سے جانور پکڑ کر لے آیا۔ تقریباً دو ہفتے کے بعد معلوم ہوا کہ الائی والے سکھوں کی اعانت سے مجاہدین پر شبخون مارنا چاہتے ہیں۔ مقیم خاں چھپنیس مجاہدوں کے ساتھ دوبارہ ان کی گوشمالی کے لیے روانہ ہوا۔ ایک رات بٹن بوڑی میں گزاری۔ دوسرے روز الائی کے جنوبی پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوئی۔ موضع بھاری کے نالے پر مجاہدین نے صبح کی نماز ادا کی۔ اس مرتبہ بھی بہت سے جانور پکڑ لیے۔ لیکن الائی والوں نے بڑی تعداد میں جمع ہو کر تعاقب کیا اور تھوڑا سا چکّر کاٹ کر ایسی جگہ قدم جما کر بیٹھ گئے جہاں سے مجاہدین کو واپس جانا تھا۔ وہ چھ سات سو سے کم نہ تھے۔ بہادر مقیم خاں نے ایک جگہ پہلے تعاقب کرنے والوں پر حملہ کیا اور ان کے سات آٹھ آدمی قتل کر دیے۔ وہ پسپا ہو کر بھاگے۔ پھر ان لوگوں پر دھاوا بول دیا جنھوں نے راستہ روک رکھا تھا۔ تین چار آدمی ان کے بھی زخمی ہوئے، اور وہ راستہ چھوڑ کر آس پاس کے پہاڑوں میں منتشر ہو گئے۔

مقیم خاں کی شہادت مجاہدین دو تین میل آگے بڑھ کر ایسے مقام پر پہنچے، جہاں دو ٹیلوں کے درمیان نشیب تھا۔ دفعتہً دونوں ٹیلوں سے ان پر گولیاں برسنے لگیں۔ مقیم خاں کے پاس قرابین تھی۔ اس نے تین چار بار قرابین چلائی، مگر نہ چلی۔ اس اثنا میں ایک آدمی قریب پہنچ گیا۔ مقیم خاں نے قرابین اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری اور اس کا سر پھٹ گیا، لیکن اوپر کے ایک آدمی نے بھاری پتھر مقیم خاں کی طرف لڑھکا دیا جو موصوف کی گردن میں لگا۔ وہ بے تاب ہو کر گرا۔ دوسرے لوگوں نے تلواروں سے اسے شہید کر ڈالا۔ مقیم خاں کے علاوہ پانچ اور مجاہد شہید ہو گئے اور دو زخمی ہوئے۔ مخالفوں کے پندرہ سولہ آدمی مارے گئے۔ مجاہدین ان کے مقابلے میں بہت کم تھے، لہٰذا جانور چھوڑ کر چلے آئے اور کالا ڈھاکہ شنگ ٹھہرتے ہوئے شائی خاں پہنچ گئے۔

دوسرا بڑا نقصان ملا لعل محمد قندھاری کی شہادت کے بعد مقیم خاں کی شہادت جماعت مجاہدین کے لیے **دوسرا بڑا نقصان تھی**۔ یہ جوانمرد مجاہد کالا باغ کا اعوان تھا۔ کچھ معلوم نہیں کہ کس زمانے میں مجاہدین کے ساتھ شریک ہوا۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ سید صاحب کے عہد میں اس کا ذکر نہ سنا گیا۔ جب

مجاہدین حبسی کوٹ اور شاتیٔ خاں میں آئے تو مختلف مہموں میں مقیم خاں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ اسی بنا پر اسے ایک جماعت کا سالار بنا دیا گیا تھا۔ مجاہدین کی اصطلاح میں اسے جمعداری کا عہدہ کہا جاتا تھا۔ اس پہاڑ کے کسی حصے میں شہادت پائی، جو الائی کے علاقے کو نندھیاڑ وغیرہ سے جدا کرتا ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ اسے کہاں دفن کیا گیا۔ مولوی نصیرالدین اور شیخ ولی محمد کو مقیم خاں کی شہادت کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے بہت افسوس کیا ؏

مولوی صاحب کا عزمِ امب | پائندہ خاں نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ پختہ کرکے مولوی نصیرالدین کو امب بلایا۔ موصوف سن چکے تھے کہ خان مخالفانہ تدبیروں میں مشغول ہے، لہذا دعوت کوٹال گئے اور کوئی جواب نہ دیا۔ خان نے دوبارہ تاکیداً بلایا تو مولوی صاحب نے مجاہدین میں سے اسّی آدمی چن لیے، جن میں سے بیس پچیس قرابین دار تھے اور باقی بندوقچی۔ قلعہ شاتیٔ خاں سے روانہ ہوکر دو روز حبسی کوٹ میں رہے۔ آگے بڑھے تو ہری گاہ نالے پر شمبلی کے قاضی صاحب ملے جو پائندہ خاں کے چھوٹے بھائی مدد خاں کے قاضی تھے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ پائندہ خاں کے پاس جانا مناسب نہیں، اس لیے کہ وہ فریب کار ہے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ ہم خدا کے اعتماد پر جاتے ہیں، وہی ہماری حفاظت کرے گا ؏

ایک رات تنگہ پانی میں گزاری۔ دریائے سندھ کو عبور کرکے چھتر بائی پہنچے۔ مولوی صاحب کا دستور تھا کہ مجاہدین کے ساتھ دریا عبور کرتے تو ملاحوں کو پچاس روپے یا پچیس روپے اور ایک بیل دیتے۔ ظہر کی نماز بلوچوں کی گڑھی[1] میں ادا کی ؏

امب میں داخلہ | بلوچوں کی گڑھی سے مولوی صاحب خچر پر سوار ہوئے۔ قرابین دار آگے تھے

---

[1] اس مقام کو آج کل امب جدید کہتے ہیں۔ ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں چھتر بائی، بلوچوں کی گڑھی، امب قدیم، ستھانہ وغیرہ تمام مقامات تباہ ہوگئے تھے۔ پائندہ خاں نے نیا امب بلوچوں کی گڑھی کی جگہ تعمیر کرایا۔ یہی آج کل امب کہلاتا ہے۔ امب قدیم کے مقام پر بھی ایک چھوٹا سا موضع آباد ہے ؏

اللہ بند و قچی پیچھے۔ وہ عموماً امب کی جامع مسجد میں ٹھہرا کرتے تھے، لیکن اس موقع پر بستی کو دائیں جانب چھوڑتے ہوئے کھیتوں میں سے قلعے کی طرف بڑھے۔ راستے میں مھندا جمعدار ملا جو پائندہ خاں کا مختارِ کار تھا۔ اس نے مولوی صاحب کو دیکھا تو کہا: آج آپ اس ٹھاٹھ سے آئے ہیں کہ پہلے یہ ٹھاٹھ ہم نے کبھی دیکھا تھا۔ قلعے کے دروازے پر پائندہ خاں کا دوسرا معتمد جمعدار شاما ملا۔ مولوی صاحب نے اسے کہا: خان کو سلام پہنچاؤ اور پوچھو کہ جہاں اجازت ہو، ہم ٹھہر جائیں۔ پائندہ خاں نے جواب میں سلام اور مزاج پرسی کے بعد کہلوایا کہ جہاں آپ ہمیشہ ٹھہرا کرتے ہیں، وہیں ٹھہریں، ملاقات کے لیے آپ کو اطلاع دے دی جائے گی۔ چنانچہ مولوی صاحب جامع مسجد میں ٹھہر گئے۔

ملاقات میں تذبذب اگلے دن جمعہ تھا۔ پائندہ خاں نماز جمعہ کے لیے نہ آیا۔ عصر کے وقت دو اڑھائی سو آدمی ساتھ لے کر مسجد میں پہنچا، جن میں سے چالیس پچاس ننگی تلواریں لیے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھا۔ مولوی صاحب قبلہ رو تھے۔ پائندہ خاں ان کے مقابل تھا۔ زیادہ بات چیت نہ ہوئی اور یہ کہہ کر لوٹ گیا کہ کل آپ کو قلعے میں بلایا جائے گا۔

صبح کو پیغام بھیجا کہ مولوی صاحب پانچ چھ آدمی لے کر قلعے میں آ جائیں۔ موصوف نے ساتھیوں میں سے پانچ چھ کو حکم دے دیا کہ تیار ہو جاؤ۔ شیخ وزیر پھُلتی نے اپنے رفیقوں سے کہا: بھائیو! آپ خوب جانتے ہیں کہ پائندہ خاں بڑا فریبی اور مفسد ہے۔ اگر خدا نخواستہ مولوی صاحب کو اس نے کوئی گزند پہنچایا تو ہم سے کچھ بھی نہ بن پڑے گا۔ مناسب یہ ہے کہ ہم لوگ مولوی صاحب کے پیچھے چلیں اور ان کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ چنانچہ مولوی صاحب روانہ ہوئے تو باقی مجاہدین بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ صرف تین آدمی اسباب کی حفاظت کے لیے ڈیرے پر رہ گئے۔ قلعے کا دروازہ کھلا اور پانچ چھ آدمی جو مولوی صاحب کے ساتھ تھے، اندر داخل ہو گئے۔ دربان دروازہ بند کرنا چاہتا تھا کہ باقی مجاہدین میں سے دو چار نے دھکا لگایا اور آناً فاناً سب اندر داخل ہو گئے۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی پائندہ خاں پر ہراس طاری ہو گیا۔ معمولی مزاج پرسی کے بعد اُس نے مولوی صاحب کو بٹھایا بھی نہیں، خود کھڑا ہو گیا اور کہا کہ آپ ڈیرے پر تشریف لے چلیں۔ میں کل وہیں حاضر ہو جاؤں گا۔ چنانچہ مولوی صاحب

کی بات چیت کیے بغیر واپس ہو گئے ۔

گفت و شنید

اس کے بعد مولوی صاحب تقریباً ایک مہینا امب میں مقیم رہے ۔ لیکن نہ پائندہ خاں ملاقات کے لیے خود آیا، نہ مولوی صاحب کو اپنے پاس بلایا ۔ البتہ شاہا جمعدار کے ذریعے سے اس نے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رکھا ۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مجاہدین قلعہ شاہی خاں خالی کر دیں اور جسی کوٹ میں رہیں ۔ مولوی صاحب نے اس کا جو جواب دیا وہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے :

ہم تو پائندہ خاں کے بلانے سے اس ملک میں آئے ہیں اور انھیں کی مرضی سے رہتے ہیں ۔ اگر رہیں گے تو قلعہ شاہی خاں میں رہیں گے، ورنہ نہ وہاں رہیں گے نہ اگرور میں ۔ ہم لوگ اپنے وطنوں سے صرف خدا کی رضامندی کی خاطر یہاں آئے ہیں ۔ دنیا کمانے کو نہیں آئے ۔ اگر طالب دنیا ہوتے تو کیا ہمارے وطن میں مال دنیا کم تھا؟[1]

پائندہ خاں اپنے مطالبہ پر مصر رہا اور مولوی صاحب اپنے جواب پر قائم رہے ۔

شیخ ولی محمد کو پیغام

جب مولوی صاحب کو یقین ہو گیا کہ پائندہ خاں سے مفاہمت کی کوئی امید نہیں رہی تو شیخ ولی محمد کو پورے حالات لکھ بھیجے ۔ ساتھ ہی کہا کہ آپ اہل و عیال جسی کوٹ بھیج دیں اور خود تیار رہیں ۔ ہم جسی کوٹ پہنچ کر آپ کو اطلاع دیں گے تو قلعہ شاہی خاں پائندہ خاں کے آدمیوں کو سونپ کر جسی کوٹ آ جانا ۔ شیخ صاحب نے اپنے اہل و عیال کو عبدالقیوم اور اپنے برادر نسبتی عبداللہ کے ہمراہ ستھانہ بھیج دیا ۔ کچھ دن بعد باقی مجاہدین کے اہل و عیال بھی ستھانہ روانہ کر دیے ۔ قلعہ شاہی خاں پائندہ خاں کے حوالے ہو گیا اور شیخ صاحب جسی کوٹ پہنچ گئے، جہاں چند روز بعد مولوی صاحب بھی ان سے جا ملے ۔

سید اکبر شاہ سے نامہ و پیام

پائندہ خاں سے موافقت کا رشتہ منقطع ہو جانے کے بعد جسی کوٹ میں ٹھہرنا ممکن نہ تھا ۔ خاص طور پر اس لیے کہ جس پائندہ خاں نے بے وجہ انھیں شاہی خاں سے اٹھایا تھا، کیا وہ کچھ دیر بعد جسی کوٹ سے بھی نہ اٹھا دیتا؟ یہ بھی ظاہر ہے کہ تذبذب کی حالت میں مجاہدین اپنے اصل مقصد کے لیے کوئی قابل ذکر کوشش نہ کر سکتے تھے ۔ لہٰذا ان حالات کے متعلق

---

[1] وقائع ، جلد سوم صفحہ ۵۰۴-۵۰۵ ۔

سید اکبر شاہ ستھانوی ہوا داری میں پیش پیش تھے۔ اس لیے کہ اس حصۂ سرحد میں صرف وہی ایک شخصیت تھی، جس کے اخلاص اور مستقل اعانت پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ سید ممدوح نے جواب میں کہلا بھیجا:

> آپ یہاں ستھانہ چلے آئیں۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ جب تک چاہیں، رہیں۔ جو کچھ ہم سے ہو سکے گا، خدمت گزاری میں حتی المقدور قصور نہ کریں گے[1]

ستھانہ کی جانب روانگی

شاہ صاحب اور مولوی صاحب آگے پیچھے جسی کوٹ سے روانہ ہوئے۔ امب سے باہر آم کا ایک تناور پیڑ تھا، وہاں ٹھہر کر سید مبارک علی جھنجھانوی کو پائندہ خاں کے پاس بھیجا کہ جی چاہے تو ہم سے آخری ملاقات کر لی جائے۔ خان موصوف نے کہلا بھیجا کہ آپ عشرہ[2] چل کر ٹھہریں، میں وہیں ملاقات کے لیے آؤں گا۔ مجاہدین عشرہ میں ٹھہرے رہے۔ پائندہ خاں گھوڑے پر سوار ہو کر امب سے نکلا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد قلعے میں پلٹ گیا۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ نہ آئے گا تو شاہ صاحب اور مولوی صاحب مجاہدین کو لے کر ستھانہ کی طرف روانہ ہوئے۔ سید اکبر شاہ بستی سے میل ڈیڑھ میل باہر استقبال کے لیے موجود تھے۔ انھوں نے عیال دار مجاہدین کے لیے ستھانہ میں مکان خالی کرا رکھے تھے۔ باقی مجاہدین میں سے بعض کے لیے ستھانہ میں اور بعض کے لیے منگل تھنہ[3] میں قیام کا انتظام کر دیا۔

---

[1] "وقائع" جلد سوم ص ۱۱۵۔

[2] امب سے تقریباً تین میل بجانب ستھانہ واقع ہے۔

[3] ستھانہ سے پاؤ میل پر اسی سے متعلق ایک بستی ہے۔

سترھواں باب
قیامِ ستھانہ کے حالات

پائندہ خاں کی پریشاں حالی میرا اندازہ ہے کہ مجاہدین ۱۸۳۴ء یا ۱۸۳۵ء تک جبی کوٹ اور شائی خاں میں رہے[1]۔ پائندہ خاں نے انھیں اس خیال سے اٹھایا تھا کہ اب کوئی خرخشہ باقی نہیں رہا۔ نہ صرف اگرور بلکہ دیشی، ٹیکری، نندھیاڑ، کونش اور الائی کے علاقے بھی فرماں بردار رہیں گے۔ لیکن وہ سب لوگ سکھوں سے ملے ہوئے تھے جو پائندہ خاں کے سخت دشمن تھے۔ اس سیل کے مقابلے میں صرف مجاہدین ایک مستحکم بند کا کام دے رہے تھے۔ وہ اٹھے تو دیشیوں نے جمع ہو کر قلعہ شائی خاں پر حملہ کر دیا اور پائندہ خاں کے لوگوں کو وہاں سے نکال دیا بلکہ ایک ضرب توپ بھی چھین لی۔ ۱۸۳۶ء میں سکھوں نے اگرور پر حملہ کر دیا اور یہ علاقہ بھی پائندہ خاں سے چھن گیا۔ اس کے بعد دریا کے بائیں کنارے پر دُور دُور تک سکھوں کا عمل دخل ہو گیا۔ پائندہ خاں کے قبضے میں دریا کے دائیں کنارے پر تھوڑا سا علاقہ رہ گیا۔ جس وسیع ریاست کے وہ خواب دیکھ رہا تھا، مجاہدین کے نکلتے ہی وہ درہم برہم ہو گئی، تاہم وہ سکھوں سے لڑتا رہا اور ۱۸۴۱ء میں اس نے وفات پائی۔ یقین ہے کہ زندگی کے آخری دور میں اسے اپنی غلط اندیشی پر پشیمانی ہوئی ہوگی، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور پشیمانی اس کے بگڑے ہوئے کارخانے کو درست نہ کر سکتی تھی۔

شیخ ولی محمد کا سفرِ تختہ بند ستھانہ میں اطمینان سے ٹھہرنے کا بندوبست ہو گیا تو شیخ ولی محمد بیس بائیس مجاہدوں کے ساتھ اس غرض سے تختہ بند چلے گئے کہ بی بی صاحبہ کو ستھانہ لے آئیں

[1] ہزارہ گزٹیئر اردو میں تین برس کی مدت بتائی گئی ہے (ص ۲۳۳)۔

اور سندھ پہنچانے کا کوئی انتظام کریں۔ ان کے ہمراہیوں میں سے مندرجۂ ذیل اصحاب کے نام روایات میں مذکور ہیں: شیخ وزیر پھلتی، سیّد قطب شاہ حیدر آبادی، شیر محمد خاں رام پوری، مستقیم جہاں آبادی، ابراہیم خاں نگرامی، امان خاں گنج پوری، محمد یار خاں کشمیری اور عبدالقیوم خادم سیّد صاحب۔

شیخ صاحب نے ایک مقام موضع گبائی میں مولوی محتشم کے مکان پر کیا، دوسرے روز موضع ملکا میں ٹھہرے، تیسرا مقام موضع مخرطنئی میں کیا۔ چوتھی منزل ناواگئی میں ہوئی، جہاں سیّد رسول نے انھیں تین دن ٹھہرائے رکھا۔ تمام مقامات میں مہمان داری کا پُرتکلف انتظام ہوا۔ ناواگئی سے شیخ صاحب تختہ بند چلے گئے۔

خوانین و شرفا کا جرگہ سید میاں رئیسِ تختہ بند نے دو ہفتے شیخ صاحب کو اپنے پاس رکھا۔ اس اثنا میں گرد و نواح کے خوانین و شرفا کو بلایا اور کہا کہ شیخ صاحب بی بی صاحبہ کو لینے آئے ہیں، آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ ان سب نے بالاتفاق کہا کہ ہم آپ کے بھی خادم ہیں، بی بی صاحبہ کے بھی فرماں بردار ہیں۔ اگر ممدوحہ کو یہاں رہنے میں کوئی تکلیف ہو تو ہمیں فرمائیں۔ کھانے پہننے اور ضروری خرچ کا انتظام ابھی کیے دیتے ہیں۔ شیخ ولی محمد نے کہا:

> بھائیو! یہ سب آپ کا سلوک اور احسان ہے۔ بی بی صاحبہ کو یہاں رہنے میں سوائے آرام کے کوئی تکلیف نہیں . . . ہم چاہتے ہیں کہ جہاں حضرت امیرالمومنین علیہ الرحمۃ کی اور دو بیبیاں ملک سندھ میں ہیں، وہیں ان بی بی صاحبہ کو پہنچا دیں۔ پھر ہم سب بے فکر اور فارغ البال ہو کر جہاد فی سبیل اللہ میں جو کچھ ہو سکے، کوشش کریں[1]۔

اہلِ جرگہ نے جواب دیا کہ اس صورت میں آپ کو اختیار ہے۔ ہمیں جس خدمت کے لیے ارشاد ہوگا اسے بسر و چشم انجام دیں گے، خواہ آپ یہاں فرمائیں یا ستھانہ پہنچ کر۔

---

[1] "وقائع" جلد سوم صفحہ ۱۵۱۵۔

بی بی صاحبہ کی تشریف آوری غرض شیخ صاحب، سید میاں اور خوانین و شرفائے بونیر کی رضامندی سے بی بی صاحبہ کو لے کر روانہ ہوئے۔ دو روز ناواگئی میں سید رسول کے پاس ٹھہرے تیسرا مقام منگل تھانہ میں اور چوتھا چنئی میں کیا۔ وہاں سے ستھانہ پیغام بھیج دیا تھا۔ سید اکبر شاہ اور مولوی نصیر الدّین مجاہدین کے ہمراہ استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سید اکبر شاہ نے بی بی صاحبہ کے لیے ایک محفوظ مکان خالی کرا رکھا تھا۔ وہاں انھیں اتارا اور دو وقت اپنے ہاں سے کھانا پیش کیا ؛

شیخ صاحب، مولوی صاحب اور سید اکبر شاہ بی بی صاحبہ کو سندھ پہنچانے کی مختلف تجویزیں سوچتے رہے، لیکن تقریباً ایک سال تک کوئی مناسب اور محفوظ تدبیر بروئے کار نہ آسکی ؛

مولوی نصیر الدّین دہلوی کا مکتوب اس اثنا میں مولوی نصیر الدّین دہلوی مجاہدین کا ایک قافلہ لے کر سندھ پہنچ چکے تھے۔ ان کے حالات تفصیلاً آئندہ ابواب میں بیان ہوں گے۔ انھوں نے اسمٰعیل اور احمد اللہ نام دو قاصدوں کے ہاتھ ایک خط ستھانہ میں بھیجا۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ ہم تین سو ہندوستانیوں کے ہمراہ سندھ میں آگئے ہیں اور بھیلچی کے ٹیسوں بجار خاں اور مداری خاں کے پاس مقیم ہیں۔ آپ لوگوں کے متعلق معلوم ہوا کہ پائندہ خاں سے ان بن ہوگئی ہے اور آپ قلعہ شائی خاں سے ستھانہ آگئے ہیں۔ اگر یہاں تشریف لے آئیں تو ہم سب مل کر جہاد فی سبیل اللہ کا بندوبست کریں۔ شاید اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے کامیابی عطا فرمائے ؛

مولوی صاحب اور شیخ صاحب کا جواب شیخ ولی محمد اور مولوی نصیر الدّین نے غور و مشورہ کے بعد لکھا کہ آپ کے سندھ پہنچنے کی خبر سُن کر دل کو خوشی اور تقویت حاصل ہوئی۔ باقی رہی آپ کی دعوت تو ہماری رائے یہ ہے :

ظاہراً آپ کے ہاں اس کام کے اجرا کی کوئی معقول صورت نظر نہیں آتی کیونکہ وہ ملک میدانی ہے اور یہاں پر جو ہم لوگ پڑے ہیں، سبب اس کا یہ ہے کہ اوّل اس کام کے واسطے حضرت امیر المومنین علیہ الرحمۃ نے یہی ملک کوہستان کا پسند اور لوگوں کو

متفق کرنے میں بہت کوشش اور جانفشانی کی۔ جو خلوصِ دل سے ملے، ان کا بھی حال ظاہر ہو گیا اور جو منافقانہ ملے، ان کا بھی حال کھل گیا۔ دوسرے یہ کہ ابھی ہم لوگ اپنی جگہ قائم ہیں۔ ایک جگہ نہ ہوئی، دوسری جگہ سہی۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ یہاں ٹھہرنے میں شاید کوئی صورت فلاحیت کی نکل آوے۔ سو اگر آپ بھی سب آدمیوں کو لے کر یہاں تشریف لے آویں تو بہت مناسب ہے تاکہ ہم اور آپ مل کر اس کارِ خیر میں کوشش کریں[1]۔

ستھانہ میں جرگہ

مجاہدین کچھ مدت تک اپنے وسائل کی بنا پر وقت گزارتے رہے۔ پھر سید اکبر شاہ نے مناسب سمجھا کہ معاش کا مستقل انتظام ہو جائے۔ چنانچہ اس غرض سے منڈی، کیا، کھبل، برگ، گیارہ باڑا وغیرہ گرد و نواح کی بستیوں کے خانوں اور ملکوں کا جرگہ منعقد کیا اور ان لوگوں کو بتایا کہ یہ مجاہدین جو ہمارے ہاں اترے ہیں، اللہ کی رضا کے طالب ہیں۔ ملک و مالِ دنیا سے انھیں

---

[1] "وقائع" جلد سوم ص ۵۱۸-۵۲۰۔ عجیب امر یہ ہے کہ خود مولوی سید نصیر الدین دہلوی کے مکتوب سے اس جواب کی تصدیق نہیں ہوتی۔ سید نصیر الدین صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے سندھ پہنچنے کے بعد دو آدمی ان مجاہدوں کی طرف بھیج دیے تھے جو حضرت امیر المومنین کے رفیقوں میں سے باقی تھے۔ شیخ ولی محمد اور مولوی نصیر الدین ان کے سردار تھے:

در اوائل ذی قعدہ فرستادگان اخلاص نشان مع جواب خط واپس آمدند چوں برادران غازیاں ارادۂ روانگیٔ خود در اوائلِ شوال و درخواست رہبرے کہ واقف راہ راست باشد و طلب خرچ نوشتہ بودند، بہ سرعت تمام دو کس از واقف کارانِ راہ مع خرچ مطلوب روانہ کردہ ام۔ انشاء اللہ تعالیٰ در کالا باغ حسب نوشتۂ برادرانِ غازیان منتظر خواہند نشست۔

اوائل ذی قعدہ میں میرے بھیجے ہوئے آدمی خط کا جواب لے کر آ گئے۔ غازی بھائیوں نے اوائل شوال میں روانگی کا ارادہ ظاہر کیا تھا، نیز لکھا تھا کہ ایک رہبر بھیج دیا جائے جو سیدھے راستے سے واقف ہو، نیز خرچ ارسال کیا جائے۔ میں نے ان کی تحریر کے مطابق دو آدمیوں کو جلد سے جلد خرچ دے کر بھیج دیا۔ وہ راستے سے واقف ہیں اور غازی بھائیوں کے ارشاد کے مطابق کالا باغ میں انتظار کریں گے۔

ممکن ہے یہ پہلے نہیں، دوسرے خط کا جواب ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ مدت بعد شیخ ولی محمد نے بی بی صاحبہ کو لے کر جانے کا فیصلہ کر لیا ہو اور اس سلسلے میں رہبر وغیرہ کے لیے لکھا ہو۔

کوئی غرض نہیں۔ ان کے سبب سے ہم سب کو اطمینان حاصل ہے۔ ہم سکھوں کے شر و فساد سے امن میں ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ ان کے کھانے پینے کا بندوبست کر دیا جائے۔ ان لوگوں نے بالاتّفاق کہا کہ ہم اپنی پیداوار سے بیسواں حصّہ انھیں بالالتزام پہنچاتے رہیں گے۔ اس طرح مجاہدین کے لیے گزارے کا اطمینان بخش انتظام ہوگیا ؂

سکھوں کا پیغام | انھیں دنوں ہزارہ کے سکھ گورنر ہری سنگھ نلوہ نے سیّد حسن شاہ کو اپنی طرف سے وکیل بنا کر شیخ ولی محمد اور مولوی نصیر الدّین کے پاس بھیجا۔ اس نے بتایا کہ ہری سنگھ پندرہ ہزار روپے سالانہ کی تحصیل کا علاقہ مجاہدین کو ہزارہ میں دینے کے لیے تیّار ہے۔ پندرہ ہزار روپے نقد پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کہتا ہے کہ مجاہدین دریائے سندھ کی دائیں جانب جتنا پہاڑی علاقہ اپنے قبضے میں لے لیں گے، وہ انھیں کی ملکیت سمجھا جائے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اُدھر سے پائندہ خاں پر فوج کشی کریں۔ اِدھر سے ہم چڑھائی کریں گے تاکہ اسے ختم کر دیا جائے، وہ بڑا بدعہد اور مکّار ہے اور اس نے مجاہدین سے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا ؂

شیخ صاحب اور مولوی صاحب نے بالاتّفاق جواب دیا کہ ہم سکھوں کی حمایت میں کسی مسلمان پر فوج کشی نہیں کر سکتے، خواہ وہ کیسا ہی مکّار و غدّار ہو۔ ہری سنگھ کو ہم سے ایسی امّید ہرگز نہ رکھنی چاہیئے، خواہ وہ کتنی ہی جاگیریں اور نقد روپیہ پیش کرے۔ سیّد حسن شاہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ آئندہ ہمارے پاس اس قسم کا کوئی پیغام نہ لانا ؂

اٹھارھواں باب

مولوی نصیرالدّین منگلوری کی شہادت

ضروری گزارش سیّد صاحب کی شہادت کے بعد جماعت کے حالات و مجاہدات کی جو کیفیت اب تک بیان ہوئی، وہ "وقائع" کے ذخیرۂ روایات پر مبنی تھی۔ ستھانہ پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد روایات کا یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ "وقائع" کا جو نسخہ میرے پاس ہے، اُس میں بعد کے متعلق صرف ایک ورق موجود ہے، جس سے مولوی نصیرالدّین کے مقامِ شہادت کا پتا چلتا ہے۔ میں نے اس ذخیرۂ روایات کے جتنے نسخے دیکھے، وہ ناقص تھے اور اکثر نسخوں میں روایات اس سے پیشتر ہی ختم ہوچکی تھیں۔ ممکن ہے "وقائع" کا کوئی مکمّل تر نسخہ بھی کہیں موجود ہو۔ مجھے اس کا علم نہ ہوسکا، لہٰذا اس کے سوا چارہ نہیں کہ دوسرے ذرائع سے جو معلومات حاصل کی جاسکیں، انھیں پیش نظر رکھ کر قرائن کی بنا پر حالات کا نقشہ تیار کیا جائے۔ میں اپنی تحقیق و کاوش کے مطابق خاکہ مرتّب کر رہا ہوں۔ اگر کسی خوش نصیب کو "وقائع" کا کوئی زیادہ مکمّل نسخہ مل سکے تو اغلب ہے زیادہ مفصّل و مستند نقشہ سامنے آجائے۔

ستھانہ میں مدّتِ قیام ڈاکٹر بیلیو کے بیان کے مطابق مجاہدین تین سال تک بہ اطمینان ستھانے میں مقیم رہے[1]۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تقریباً ۱۸۳۸ء تک مجاہدین کی سالاری عامہ کا منصب مولوی نصیرالدّین منگلوری کو حاصل رہا۔ مجاہدین کے امیر شیخ ولی محمد پھلتی تھے، لیکن وہ مجاہدات میں زیادہ سرگرم حصّہ نہ لے سکے، جیسا کہ گزشتہ واقعات سے آشکارا ہے۔ ان کی تمام تر توجہ بی بی صاحبہ کو سندھ پہنچانے پر جمی ہوئی تھی۔ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کس ذریعے اور کس راستے سے سندھ پہنچے۔ نہ یہ بتایا جاسکتا ہے

---

[1] اے جنرل رپورٹ اون دی یوسف زئی A GENERAL REPORT ON THE USUF ZAI by H. W. BELLEW مطبوعہ گورنمنٹ پریس لاہور ۱۸۶۴ء صفحہ ۹۵۔

کہ اُن کے ساتھ کون کون سے مجاہدین سندھ آئے یا یہ سفر بالتعیین کس زمانے میں ہوا۔ میرا اندازہ کہ یہ ۱۸۳۶ء یا ۱۸۳۷ء کا واقعہ ہوگا، اس لیے کہ مولوی سید نصیر الدین دہلوی کی طرف سے ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) میں جو اعلامات جا بجا بھیجے گئے، ان پر دوسرے اصحاب کے علاوہ شیخ ولی محمد کے بھی دستخط ہیں۔ یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ ۱۲۵۴ھ سے پیشتر شیخ موصوف بی بی صاحبہ کو لے کر سندھ پہنچ گئے تھے اور مجاہدین ستھانہ کی امارت و سالاری کا بارگراں مولوی نصیر الدین منگلوری کے دوش ہمت پر رہا[۱]۔

ماحول کی سرسری کیفیت

اب ہمیں اس ماحول کی سرسری کیفیت سامنے رکھ لینی چاہیے، جس میں مجاہدین ستھانہ کام کرتے رہے۔ ستھانہ کے مغرب میں تھوڑے فاصلے پر خدوخیل کا علاقہ واقع تھا، جہاں فتح خاں پنجتاری ایک مستقل ریاست کی تاسیس میں لگا ہوا تھا۔ وہ اُن خوانین میں سے تھا، جنھوں نے سرحد میں سید صاحب کی دعوتِ جہاد پر سب سے پہلے لبیک کہی تھی۔ اس کا مقام، پنجتار کم و بیش چار سال تک سید صاحب کا مرکز بنا رہا۔ اہل سمہ کی سازش کے وقت فتح خاں کا اخلاص معرضِ اشتباہ میں آیا اور سید صاحب کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ پنجتار کو چھوڑ کر کسی دوسرے مرکز میں ڈیرے ڈالیں۔ مجاہدین تندھیاڑ سے واپس ہوئے تھے تو فتح خاں نے سید میاں ساکن تختہ بند (بونیر) اور سید رسول ساکن ناواگئی (چملہ) کی وساطت سے انھیں پنجتار آنے کی دعوت دی اور ہر ممکن ذریعے سے مخلصانہ خدمت گزاری کا یقین دلایا۔ دس مہینے کے بعد آشکارا ہوگیا کہ اس کے پیش نظر ذاتی اغراض کے سوا کچھ نہیں اور وہ مقاصد جہاد میں معاون نہیں بن سکتا، لہٰذا مجاہدین کو دوبارہ پنجتار چھوڑنا پڑا۔

---

[۱] مولوی سید نصیر الدین دہلوی کے ایک مکتوب میں بتایا گیا ہے کہ شیخ ولی محمد ۲۹۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۵۳ھ (۳۰۔ اکتوبر ۱۸۳۷ء) کو بی بی صاحبہ کے ساتھ مولوی سید نصیر الدین کے پاس بلوچستان پہنچے تھے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ بی بی صاحبہ اور شیخ صاحب کے رفقاء مرد اور عورتیں کوئی دو سو ہوں گے اور ان کے ساتھ تین شاہینیں تھیں۔ ۵ رجب (۵۔ اکتوبر) کو شیخ صاحب پچاس سواروں کے ساتھ بی بی صاحبہ کو پیر کوٹ پہنچانے کے لیے روانہ ہوئے۔ سید محمد اسمٰعیل (برادر زادہ سید احمد شہید) اور قاضی محمد شکارپوری نے شکارپور سے آگے نکل کر ان کا استقبال کیا۔ (مکتوبات کا مخطوطہ صفحہ ۴۰)۔

اس کے بعد پائندہ خاں تنولی والیِ امب سرگرم دعاویِ اخلاص کے ساتھ مجاہدین کو اگرور لے گیا،
جہاں وہ تقریباً تین سال رہے، لیکن خوانینِ اگرور کے خاتمے کے بعد وہ بھی عہدِ موافقت پر ثابت قدم نہ رہا
اور مجاہدین کو اس سے بھی کنارہ کشی کے سوا چارہ نظر نہ آیا۔

سمہ یعنی میدانی علاقہ کے لوگ ۱۸۳۰ء کی خوفناک سازش کے وقت سے مجاہدین کے مخالف چلے
آتے تھے اور مجاہدین کی جانب سے عفو و درگزر کے باوجود ان لوگوں کے دل مطمئن نہ ہو سکتے تھے۔ اگرور،
دیشی، ٹیکری، الائی وغیرہ کے لوگ بھی مجاہدین کی خیر خواہی دم نہ بھر سکتے تھے۔ سکھوں کی مخالفت مجاہدین
کا نصب العین تھی اور ان کی طرف سے مصالحت کی بہ ظاہر ایک خوش گوار تجویز کو شیخ ولی محمد اور مولوی
نصیر الدین نفرت سے ٹھکرا چکے تھے۔ گویا سرحد کے پورے علاقے میں سادات ستھانہ، سادات ناوا گئی
اور سادات تختہ بند یا ان سادات کے بعض متفرق گھرانوں کے سوا مجاہدین کو بے غرض اور پُر اخلاص
تعاون کی امید کسی سے نہ ہو سکتی تھی۔ بونیر اور چملہ کے خوانین کا حسنِ سلوک تختہ بند اور ناوا گئی کے سادات
کی رفاقت کا نتیجہ تھا۔ نواحِ ستھانہ کی بستیوں نے مجاہدین کے لیے گزارے کا جو انتظام کر دیا تھا، وہ سید
اکبر شاہ ستھانوی کے اثر و رسوخ کا کرشمہ تھا۔ بلاشبہ مجاہدین مدتِ مدید تک ستھانہ میں بہ اطمینان مقیم رہے
لیکن ان کے گرد و پیش ہر جانب دشمنی کی آگ سلگ رہی تھی اور مخالفانہ ہوا کا خفیف سا بھی جھونکا اسے
کسی وقت مشتعل کر سکتا تھا۔

مجاہدین پر ظلم و تعدی

معلوم ہوتا ہے کہ فتح خاں پنجتاری مجاہدین کی مخالفت میں سب پر سبقت
لے جانا چاہتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کے نزدیک مجاہدین کو ختم کیے بغیر ریاست کی بنیادیں استوار
نہ کی جا سکتی تھیں یا وہ اس ذریعے سے اہلِ سمہ میں ہر دلعزیزی حاصل کر لینے کا خواہاں تھا۔ غرض اس نے
گرد و پیش کی بستیوں میں ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ مجاہدین میں سے جہاں کسی کو کوئی آتا جاتا مل جاتا،
اُسے لُوٹ لینے اور بدسلوکی کا ہدف بنانے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا جاتا۔ مجاہدین کی چھوٹی چھوٹی
ٹولیاں درویشوں کے بھیس میں ہندوستان سے ستھانہ پہنچتی رہتی تھیں۔ فتح خاں کے زیرِ اثر بستیوں میں
ان سے پے در پے بدسلوکیاں ہوتی رہیں۔ اس رنج افزا سلسلے کا ایک اہم واقعہ منارہ میں پیش آیا جو

ان پر گولیوں کی بارش ہوتی رہی اور جو قریب آتے گئے، وہ تلواروں سے موت کے گھاٹ اترتے رہے۔ اس اثناء میں مولوی نصیرالدین کے سینے پر ایک گولی لگی۔ وہ ڈھال تلوار لیے ہوئے بیٹھ گئے۔ لڑائی بدستور جاری رہی۔ پھر ایک اور گولی لگی، جس سے مولوی صاحب موصوف شہادت پا گئے۔[1]

شدید نقصان اس جنگ میں مجاہدین کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ مولوی صاحب کے علاوہ جماعت کے بہت سے اصحاب شہید ہوئے، جن میں سے صرف مندرجۂ ذیل ممتاز حضرات کے نام معلوم ہو سکے: شیخ وزیر پھلتی، نظام الدین خاں شاہ جہان پوری، عبداللہ بنارسی، کریم بخش سہارن پوری، شیر محمد عظیم آبادی، شمس الدین ہریانوی، الٰہی بخش ہریانوی، قادر بخش ساکن امروہہ، مستقیم ساکن گونتی، ابراہیم پوربی اور حاجی فاضل ساکن جیبی کوٹ۔ مجروحین کی تعداد بھی خاصی بڑی تھی۔ مثلاً:

۱۔ شیخ ولی محمد کے برادر نسبتی شیخ عبداللہ کے جسم پر تلوار کے گیارہ زخم تھے۔

۲۔ حاجی امان اللہ کے بائیں بازو میں گولی لگی۔

۳۔ شیر محمد خاں رام پوری کا دایاں کندھا زخمی ہوا۔

۴۔ جلال الدین گوجر کے سر، کندھے اور پیٹ پر تلوار کے زخم آئے۔

ان کے علاوہ ملا نور محمد گوجر کا بھانجا، عبداللہ مظفر آبادی، ملا الٰہام الدین، ان کے ساڑھو نادر اور اسمٰعیل سہارن پوری گولیوں سے زخمی ہوئے۔ باقی مجروحین کے نام معلوم نہ ہو سکے۔

---

[1] ہزارہ گزیٹیر میں بعض امور خلاف تاریخ پیش کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مولوی نصیرالدین ارسلان خاں زیدے والے کی امداد کے لیے ٹوپی آئے تھے جو سکھوں کا معاون تھا اور فتح خاں پنجتاری کا مخالف۔ نہ مولوی صاحب سکھوں کے کسی طرف دار کی امداد کے لیے تیار ہو سکتے تھے اور نہ ٹوپی جانے کی غرض وہ تھی جو بیان کی گئی۔ ٹوپی پر حملے کی اصل وجہ یہی تھی کہ وہاں کے لوگ خواہ مخواہ مجاہدین کو ایذا دیتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ فتح خاں نے عین چھاپے کے موقع پر دھاوا بولا اور مجاہدین کو نرغے میں لے لیا لیکن ہزارہ گزیٹیر کا یہ بیان صحیح نہیں کہ فتح خاں پنجتاری نے مولوی صاحب کے علاوہ تمام مجاہدین کو شہید کر ڈالا۔ (۲۳۳)

دریائے سندھ کے کنارے واقع تھا اور ۱۸۴۱ء کی طغیانی میں بے نشان ہو گیا۔ بیلیو لکھتا ہے کہ نو وارد مجاہدین کی ایک چھوٹی سی جماعت ہندوستان سے آ رہی تھی۔ وہ لوگ منارہ پہنچے تو وہاں کے باشندوں نے ان کا سارا سامان لوٹ لیا اور اُن سے انتہائی بدسلوکیاں کیں[1]۔

تادیبی اقدام پے در پے پیش دستیوں کے بعد مجاہدین کے لیے زبردست تادیبی اقدام کے سوا چارہ نہ رہا۔ چنانچہ مولوی نصیر الدین منگلوری نے مجاہدین کی ایک جماعت لے کر منارہ پر شبخون مارا۔ بیلیو کے بیان کے مطابق اس شبخون میں گاؤں کے بہت سے آدمی مارے گئے اور گھروں کو لُوٹا گیا[2]:

> فتح خاں پنجتاری اُس وقت سے مجاہدین کو اپنے دشمن سمجھنے لگا تھا۔ جب سے وہ سادات ستھانہ کے پاس مقیم ہوئے تھے۔ وہ اب مخالفت میں بہت سرگرم ہو گیا۔ اس نے بہت جلد ایک لشکر جمع کر لیا۔ مجاہدین کو اپنے ہاں کی پہاڑیوں سے باہر نکال دیا اور ان کے امیر نصیر الدین کو قتل کر ڈالا[3]۔

جنگ ٹوپی بیلیو کے بیان سے لڑائی کی صحیح کیفیت واضح نہیں ہوتی۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ منارہ پر شبخون کے بعد مجاہدین نے ٹوپی پر حملہ کیا، اس لیے کہ وہاں کے لوگ بھی مجاہدین کی مخالفت میں بہت پیش پیش تھے۔ مجاہدین ٹوپی ہی میں تھے کہ وہاں کے باشندوں نے چھتوں پر سے چادریں ہلا ہلا کر فتح خاں پنجتاری کے لشکر کو اندر بُلا لیا۔ اس طرح مجاہدین بستی میں محصور ہو گئے۔ مولوی نصیر الدین نے یہ حالت دیکھی تو ساتھیوں سے فرمایا کہ بستی کے پاس جو پہاڑ ہے، اس پر چڑھ کر مقابلہ کرنا چاہیے، لیکن اُدھر جانے کا راستہ نہ مل سکا۔ مجبور ہو کر حکم دے دیا کہ مجاہدین جہاں جہاں موجود ہیں، وہیں مورچے قائم کر کے بہادرانہ جنگ کریں۔ مخالفین میں سے جو ذرا فاصلے پر تھے،

---

[1] اے جنرل رپورٹ اون یوسف زئی (انگریزی) صہ ۹۴۔
[2] ایضاً ایضاً۔
[3] ایضاً ایضاً صہ ۹۵۔

مولوی نصیرالدین شہید | مولوی نصیرالدین کی شہادت سے علاقۂ سرحد میں مجاہدین کا کاروبارِ جہاد عملاً درہم برہم ہوگیا۔ اگرچہ جماعت اس کے بعد بھی باقی رہی، لیکن اس کی مجاہدانہ سرگرمیاں بڑی حد تک افسردہ ہوگئیں۔ مولوی صاحب موصوف منگلور ضلع سہارن پور کے باشندے تھے۔ بالکل ابتدائی دور سے سید صاحب کے ساتھ رہے اور آپ کی شہادت کے بعد جماعت کی مجاہدانہ سرگرمیوں کو اعلیٰ پیمانے پر قائم رکھنے کا سہرا انھیں کے سر تھا۔ موصوف شاہ اسمٰعیل، مولوی خیرالدین شیخ بلند بخت وغیرہ کی طرح شجاعت اور حسنِ تدبیر کا پیکر تھے۔ عمر کا کوئی صحیح اندازہ نہ ہوسکا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ خاصے سن رسیدہ تھے، اس لیے کہ ایک روایت میں بتایا گیا ہے، منہ میں کوئی دانت نہ تھا۔ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سید صاحب کے دستِ مبارک پر بیعت کرتے وقت جو عہد و پیمان کیا تھا، اُس پر زندگی کے آخری سانس تک چٹان کی طرح قائم رہے اور انجام کار خونِ شہادت سے اس پر تصدیق کی آخری مُہر ثبت کردی۔ انسانیت کے ان گراں مایہ گوہروں میں سے تھے، جن کا وجود قوموں اور ملکوں کے لیے انتہائی فخر و عزت کا باعث ہوتا ہے۔ وہ سید صاحب کی تربیت اور مردم گری کا ایک نہایت عمدہ نمونہ تھے۔ للّٰہیت کی شان ملاحظہ ہو کہ اگرچہ علم و فضل، قیادتِ عساکر اور انتظام و سیاست کے یگانہ جوہروں سے مزین تھے اور کسی بھی ریاست و مملکت میں بلند ترین عہدوں کے فرائض بطریقِ احسن انجام دے سکتے تھے، تاہم کسی دنیوی غرض سے ان کے فکر و خیال کا دامن کبھی آلودہ نہ ہوا اور اہلِ ملک و ملّت کی تحسین و صلہ سے بالکل بے نیاز ہو کر اپنی بیش بہا زندگی بے دریغ راہِ حق میں قربان کردی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ

جماعت کی کیفیت | یہاں پہنچ کر جماعت مجاہدین کی سرگزشت کا پہلا دور ختم ہوگیا۔ جو لوگ باقی بچے، وہ بدستور ستھانہ میں مقیم رہے۔ میر اولاد علی کو انھوں نے امیر بنالیا۔ مولوی محمد قاسم پانی پتی نہ پنجتار گئے، نہ شیخ ولی محمد اور مولوی نصیرالدین کے ساتھ دیشی یا اگرور میں رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کوائی (درہ کاغان) میں اقامت اختیار کرلی تھی۔ موقع پر ان کا ذکر آئے گا۔

سرگزشت کا دوسرا دور مولوی سید نصیرالدین دہلوی کی اقامتِ جہاد سے شروع ہوتا ہے، جن کے حالات آئندہ ابواب میں بیان ہوں گے، لیکن یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ مولوی نصیرالدین کی شہادت کے بعد کم و بیش آٹھ نو سال تک سرحد میں کوئی قابلِ ذکر سلسلۂ جہاد شروع نہ ہوسکا، اگرچہ سید صاحب کی جاری کردہ تحریک کا چراغ بدستور روشن رہا۔

محمد امیر خاں قصوری

مسلمانوں کا جوشِ حمیّت | سیّد صاحب کی تحریکِ جہاد نے مسلمانوں میں اسلامی حمیّت کی یکایک غیر معمولی حرارت پیدا کر دی تھی جس کا ایک نہایت اچھا نمونہ محمد امیر خاں قصوری تھے۔ ان کا نام "سیرت سیّد احمد شہید" اور "سرگزشت مجاہدین" میں بارہا آ چکا ہے۔ یہ عنفوانِ شباب ہی میں سیّد صاحب کے پاس پہنچ گئے تھے۔ ایک مرتبہ خود سیّد صاحب کے استفسار پر انھوں نے اپنے حالات بتائے، جن کا خلاصہ ذیل میں درج ہے:

یہ قصور کا باشندہ تھا۔ اغلب ہے، پٹھان ہو۔ اس کا والد ریاست نابھہ میں ملازم تھا اور املوہ کے قلعے کی محافظت اس کے سپرد تھی۔ ساتھ ساتھ پیری مریدی کا سلسلہ بھی جاری تھا اور جگہ جگہ اس کے مرید موجود تھے۔ محمد امیر خاں کے چچا کی عمر سیّاحی میں گزری۔ دہلی، کلکتہ، بمبئی، حیدر آباد سندھ ہندوستان کے بعض دوسرے مشہور مقامات کے علاوہ عراق کی سیر بھی کر چکا تھا اور حج و زیارت سے بھی مشرف ہو چکا تھا۔ چونکہ بغداد میں دیر تک مقیم رہا تھا، اس لیے عام لوگوں میں بغدادی مشہور تھا۔ اس نے دہلی میں سیّد صاحب کو دیکھا تھا جب نواب امیر خاں سے الگ ہو کر سیّد موصوف نے اجرائے جہاد کے لیے مستقل تیاریوں کا آغاز کیا تھا۔ محمد امیر خاں کا چچا اکثر کہا کرتا تھا کہ ایسا صاحبِ اخلاق، عالی ہمت، بلند ارادہ اور صاحبِ تاثیر بزرگ میں نے زندگی بھر میں نہیں دیکھا۔ جب سیّد صاحب، حج سے واپس آ کر بمبئی میں ٹھہرے تو محمد امیر خاں کے چچا نے بھی ان سے بیعت کی اور خلافت کا منصب پایا۔ وہ اکثر محمد امیر خاں سے ذکر کرتا رہتا تھا کہ سیّد صاحب جہاد کے لیے نکلیں گے تو میں بھی ان کی معیّت، اختیار کروں گا اور تمھیں بھی ساتھ لے جاؤں گا، لیکن سیّد صاحب کی روانگی سے پیشتر اس کا انتقال ہو گیا۔

بچّے کا عزمِ جہاد | محمد امیر خاں کی عمر اس وقت گیارہ بارہ برس سے زیادہ نہ تھی، لیکن چچا کے

کے ارشادات دل میں اس طرح پیوست ہو گئے تھے کہ اسی دور میں جہاد کے لیے سیّد صاحب کے پاس پہنچنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ چودہ پندرہ برس کی عمر ہوئی تو رائے بریلی کا ایک برہمن املوہ میں ملا، جس نے سیّد صاحب کے پاس سرحد پہنچنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ پٹیالہ کا ایک مسلمان راجپوت بھی اس کے ساتھ ہو گیا۔ ان دو شخصوں کا عزم محمد امیر خاں کے سمند شوق کے لیے تازیانہ بن گیا۔ والد سے گھر جانے کی اجازت مانگی۔ اس نے کچھ روپوں کے علاوہ سواری کے لیے ایک یابو دے دیا۔ یوں محمد امیر خاں، برہمن اور راجپوت کی معیّت میں بہ ظاہر وطن کی طرف اور حقیقتاً سیّد صاحب کی جانب روانہ ہوا۔ املوہ سے چوتھے دن یہ لوگ امرت سر پہنچے۔ وہاں دسہرے کی تقریب میں بھاری اجتماع تھا محمد امیر خاں اور اس کے ساتھی دسہرہ دیکھنے کے لیے ٹھہر گئے۔ اس اثنا میں محمد امیر خاں کی ملاقات کپتان سلطان محمود سے ہو گئی جو اس کے والد کا مرید تھا۔ اس نے پوچھا کیسے آئے؟ محمد امیر خاں نے ظاہر کیا کہ والد کے ساتھ آیا ہوں، لیکن تھوڑی ہی دیر میں راز فاش ہو گیا اور پتہ چل گیا کہ والد سے اجازت لیے بغیر بھاگ آیا ہے۔ اس کے بعد کپتان سلطان محمود آگے جانے کی اجازت نہ دے سکتا تھا۔

کپتان کی معیّت میں محمد امیر خاں کو ایک مرتبہ رنجیت سنگھ کے دربار میں جانے کا بھی موقع ملا۔ اس موقع پر حکیم عزیز الدین انصاری نے سیّد صاحب کا آیا ہوا ایک مکتوب سنایا، جس کا مضمون یہ تھا کہ "ہم لوگ نہ تیرے ملک و مال کے طالب ہیں، نہ تیری جان اور عزّت کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، نہ لڑنے کے خواہاں ہیں۔ صرف یہ چاہتے کہ ہمارا ساتھ دے اور ہمارا رفیق بن جا۔ دشمنوں کے خلاف جہاد کر کے ہم ملک تیرے حوالے کر دیں گے۔ اگر یہ دعوت منظور نہ کی تو لڑائی کے سوا چارہ نہ رہے گا۔" یہ خط سن کر رنجیت سنگھ نے کہا کہ ایسا صاحب ارادہ اور صاحب ہمّت و جرأت ہم نے اپنے زمانے میں نہ کسی کو دیکھا، نہ سنا۔

محمد امیر خاں کا فرار اس اثنا میں کپتان سلطان محمود کو کہیں جانے کا حکم ہوا۔ محمد امیر خاں نے اس مہلت سے فائدہ اٹھایا۔ چوکیدار سے سیر کی اجازت لی۔ سواری اسی کے پاس چھوڑ دی اور اپنے ساتھیوں کو لے کر لاہور کی طرف نکل پڑا۔ پہلے دن پندرہ کوس کا فاصلہ طے کر کے یہ لوگ ایک مندر میں اُترے۔ پھر منزل بہ منزل لاہور اور راولپنڈی ہوتے ہوئے حضرو کے قریب ایک

بستی میں پہنچے، جہاں کے حاکم نے پوچھا کہاں جارہے ہو؟ محمد امیر خاں نے کہا کہ میرا بھائی اٹک میں ملازم ہے، اس سے ملنے جارہا ہوں۔ اس بیان کی غلطی بھی بہت جلد واضح ہوگئی، لیکن جب حاکم کو معلوم ہوا کہ محمد امیر خاں سید صاحب کے پاس جارہا ہے تو اس نے امداد میں تامل نہ کیا۔ محمد امیر خاں کے کانوں میں چھوٹی چھوٹی سنہری بالیاں تھیں۔ انھیں چالیس روپے میں بیچا۔ کچھ کپڑے بنوا دیے۔ دو روپے بھنا کر خرچ کے لیے دے دیے۔ باقی نقد حوالے کر دیے۔ پھر ایک آدمی ساتھ دے کر محمد امیر خاں کو دریا کے کنارے کی ایک بستی میں پہنچا دیا۔ وہاں کے خان کو تاکید کر دی کہ اس نوجوان کو بہ حفاظت دریا کے پار پہنچا دیا جائے۔ اس طرح محمد امیر خاں سید صاحب کی خدمت میں پہنچا۔

سرحدی زندگی محمد امیر خاں نے کچھ مدت پنجتار میں سید صاحب کے ساتھ گزاری۔ انھیں کے ساتھ نندھیاڑ پہنچا۔ بالاکوٹ کی جنگ میں شریک تھا۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد شیخ ولی محمد اور مولانا نصیر الدین منگلوری کے ساتھ صاحبزادہ محمد نصیر کے پاس رہا۔ پھر مجاہدین فتح خاں کی دعوت پر پنجتار آئے تو محمد امیر خاں بھی ان میں شامل تھا۔ جب فتح خاں سے تعلقات کا انقطاع ہوا تو یہ مجاہدین کے ساتھ قلعہ شائی خاں میں چلا گیا اور مولوی نصیر الدین منگلوری کی مختلف مہموں میں شریک رہا۔ پھر مولوی صاحب سے اجازت لے کر امان اللہ خاں لکھنوی اور ابراہیم خاں خیرآبادی کے ہمراہ وطن چلا آیا۔

بعد کی زندگی اس کا اپنا بیان ہے کہ ہم لوگ سرحد سے روانہ ہو کر امیر المومنین کی ازواج کے پاس پیرکوٹ (سندھ) پہنچے۔ امان اللہ خاں اور ابراہیم خاں تو وہیں ٹھہر گئے، میں نے چند روز کے بعد رخصت چاہی۔ بڑی بی بی صاحبہ نے مجھے راستے کے لیے معقول خرچ دیا اور اجمیر تک کرایے کے ایک اونٹ کا انتظام فرما دیا۔ چنانچہ میں اجمیر میں مولوی سراج الدین کے مکان پر اترا جو حضرت امیر المومنین کے مخلص مرید اور خلیفہ تھے۔ موصوف نے بڑی عزت و توقیر سے میری مہمان داری کی۔ وہیں معلوم ہوا کہ نواب امیر الدولہ بہادر والیِ ٹونک نے وفات پائی اور نواب وزیر الدولہ بہادر جانشین ہوئے۔

چنانچہ محمد امیر خاں ایک گاڑی کرایے پر لے کر ٹونک پہنچا۔ نوّاب وزیر الدّولہ نے تین مہینے اپنے پاس ٹھہرائے رکھا۔ دونوں وقت اپنے ساتھ کھانا کھلاتے تھے۔ پھر معقول زادِ راہ دے کر رخصت فرمایا۔ محمد امیر خاں وطن پہنچا تو اس کے جو اقربا ریاست میں ملازم تھے، انھوں نے اس کی ملازمت کا بھی انتظام کرا دیا۔ اس کے پانچ گھوڑے بھی نوکر تھے۔ ہر چھٹے مہینے تین سَو من غلّہ اور ڈیڑھ سو روپے نقد محمد امیر خاں کو ملتے تھے اور تین سَو من غلّہ، سو روپے نقد گھوڑوں کے لیے مقرر تھے۔ کم و بیش دس سال یہ سلسلۂ ملازمت جاری رہا[1]۔

دورانِ ملازمت میں ایک مرتبہ والیٔ نابھہ رنجیت سنگھ کی مزاج پُرسی کے لیے لاہور آیا تو محمد امیر خاں بھی ساتھ تھا۔ قلعۂ لاہور کے سمن برج کے قریب ایک باغ تھا، جہاں والیِ نابھہ اور اس کے لشکریوں کو اتارا گیا تھا۔ بعد کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

---

[1] یہ حالات "وقائعِ احمدی" سے ماخوذ ہیں۔ نوّاب امیر الدّولہ کا انتقال ۱۸۳۴ء میں ہوا، لہٰذا سمجھنا چاہیے کہ محمد امیر خاں اسی سال سرحد سے واپس آیا۔ املوہ لکھنؤ کے پاس ایک معروف مقام ہے۔

دوسرا حصّہ

(سیّد نصیر الدّین دہلوی)

پہلا باب

مولوی سیّد نصیر الدّین دہلوی

تمہید ہم بتا چکے ہیں کہ ستھانہ پہنچنے کے بعد مجاہدین کی حالت خاصی کمزور ہوگئی تھی۔ ان کی کارکردگی کا دائرہ بہت محدود ہو چکا تھا۔ وہ اس عظیم الشّان جماعت کا محض ایک نشان رہ گئے تھے، جو سیّد صاحب کی سرکردگی میں ہندوستان کی تطہیر کے لیے اٹھی تھی اور جس کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے چار سال تک پنجاب کی طاقت ور سکھ حکومت کو سراسیمگی کا ہدف بنائے رکھا تھا۔ اگرچہ جان نثارانِ حق کے چھوٹے چھوٹے گروہ وقتاً فوقتاً سرحد پہنچتے رہتے تھے، تاہم عام مسلمانوں کے جوشِ جہاد میں افسردگی پیدا ہو رہی تھی، اس لیے کہ سرحد میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام پانے کا موقع باقی نہ رہا تھا۔ لہٰذا سیّد صاحب کی تحریکِ جہاد کے کارفرماؤں کو ضرورت محسوس ہوئی کہ دوبارہ ایک بڑی جماعت تیار کر کے آزاد علاقے میں بھیج دی جائے، جس سے سیّد صاحب کے شروع کیے ہوئے کام میں جوش و خروش کی نئی روح پیدا ہو جائے۔ اس اہم فرض کی بجا آوری کا شرف روزِ ازل سے مولوی سیّد نصیر الدّین دہلوی کے لیے مقدّر ہو چکا تھا، جنھوں نے سیّد صاحب کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ملک کے مختلف حصّوں کا دورہ کیا، دعوتِ جہاد سے ایک جماعت تیّار کی اور سیّد صاحب کی طرح وطنِ مالوف سے ہجرت کر کے کاروبارِ جہاد کی تجدید کا انتظام فرمایا۔

مولوی صاحب کے حالات مولوی سیّد نصیر الدّین دہلوی حضرت سیّد ناصر الدّین تھانیسری[۱]

---

[۱] بعض اصحاب نے انھیں سونی پتی لکھا ہے۔ دونوں مقاموں میں فصل خاصا ہے۔ اغلب ہے وہ پہلے تھانیسر میں رہتے ہوں، بعد ازاں سونی پت میں توطن اختیار کر لیا ہو۔

کی اولاد میں سے تھے اور شاہ رفیع الدّین محدّث دہلوی کے نواسے تھے[1]۔ ننھیالی رشتے کی وجہ سے دہلی ہی میں تربیت پائی۔ لیکن ابتدا میں تحصیل علم طرف چنداں توجہ نہ تھی۔ خود فرماتے ہیں کہ شاہ اسحٰق[2] کی صاحبزادی سے نکاح کے لیے والدہ نے درخواست کی مگر علم سے بے اتفاقی کے باعث درخواست منظور نہ ہوئی۔ اس واقعے نے مولوی سیّد نصیر الدّین کے دل میں خاص جوش پیدا کر دیا اور اس ذوق و شوق سے پڑھنے لگے کہ تھوڑی ہی مدت میں ممتاز عالم بن گئے۔ شاہ اسحٰق نے یہ دیکھتے ہی صاحبزادی کا نکاح ان سے کر دیا۔ مولوی صاحب نے تکمیل علوم کے لیے پورب کا سفر کیا اور کلکتہ میں بھی خاصی دیر ٹھہرے رہے۔ جس زمانے میں سیّد صاحب ایک بڑے قافلے کے ساتھ بہ قصد حج کلکتہ پہنچے تھے، مولوی سیّد نصیر الدّین وہیں مقیم تھے۔ ۱۲۴۰ھ میں شاہ اسحٰق وعظ فرماتے تھے تو مولوی نصیر الدّین مدرسے کے دروازے پر فراہمیٔ زر اعانت میں مصروف رہتے تھے۔ آخر آپ نے خود جہاد کا عزم کر لیا۔

دعوت و تبلیغ

حاجی سیّد عبد الرحیم سورتی، مولوی بہاء الدّین چینا پٹی[3]، احمد سادہ کار، امام الدّین سوزن ساز وغیرہ رفیقانِ خاص سے مشورہ کیا اور کہا کہ اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنا لو۔ سب رفیقوں نے خود مولوی صاحب ہی کی امارت پر اتفاق کیا۔ اس کے بعد آپ نے ٹونک، اجمیر، میرٹھ، امروہہ، رام پور اور اطراف دہلی میں دعوت و تبلیغ کی غرض سے دورے کیے تاکہ مجاہدین کی ایک جماعت فراہم ہو جائے۔ اس سلسلے میں احیاء دین اور ردِّ بدعات کا کام بھی انجام دیتے رہے۔ چھوٹے چھوٹے معاملات کے متعلق اختلافات مٹانے اور مسلمانوں کو اصول و اساسات دین پر متحد کرنے کا خاص اہتمام تھا۔ ایک موقع پر کسی نے کہا کہ مذہبی معاملات میں اختلاف نیا نہیں، یہ صحابہؓ کے زمانے میں بھی موجود تھا۔ مولوی سیّد نصیر الدّین نے فرمایا کہ ہم اکابر کی لغزشوں کے اتباع پر مامور نہیں۔ بے شک صحابہؓ میں باقتضاء بشریّت اختلاف کی مثالیں بھی ملتی ہیں، لیکن ہمیں ان کے مکارم کی پیروی کرنی چاہیے۔

[1] شاہ رفیع الدّین کے پانچ بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ بیٹی کا نام امۃ اللہ تھا۔ مولوی سیّد نصیر الدّین اسی کے بطن سے تھے۔

[2] شاہ اسحٰق، شاہ محمد افضل کے فرزند اور شاہ عبد العزیز محدّث (برادر شاہ رفیع الدّین) کے نواسے تھے۔

[3] چینا پٹن مدراس کا پرانا نام ہے۔

دوست محمد خاں سے نامہ و پیام کی تجویز مولوی سیّد نصیرالدین کے مقاصد نہایت بلند، نظر دُور رس اور طبیعت بہت سلجھی ہوئی تھی۔ وہ پرانے جھگڑوں میں اُلجھ کر وقت کے احوال و ظروف سے چشم پوشی نہ کر سکتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ سیّد صاحب کے زمانے میں پشاور کے بارک زئی سرداروں کی پے در پے معاندت کے باعث ایک افسوس ناک کشمکش پیدا ہو گئی تھی، جو حد درجہ رنج افزا نتائج کا سرچشمہ بن گئی اور اس وجہ سے دوست محمد خاں والیِ کابل بھی جماعت مجاہدین کا حامی یا خیر خواہ نہ رہا، تاہم خود مولوی صاحب موصوف کے زمانے میں دوست محمد خاں ایک طرف سکھوں سے مصروفِ پیکار تھا، دوسری طرف انگریزوں کے اقدامات کی روک تھام میں قابلِ ستایش استقامت دکھا رہا تھا، لہٰذا انھیں دوست محمد خاں سے حلیفانہ تعلقات پیدا کرنے میں ایک لمحے کے لیے بھی تامّل نہ ہوا۔ وہ زیادہ تر وقت دہلی کی اکبرآبادی مسجد میں گزارتے تھے، جہاں شاہ عبدالقادر محدّث اور شاہ رفیع الدّین محدّث یکے بعد دیگرے درس دیتے رہے تھے اور خود سیّد صاحب نے بھی تنظیم جہاد کا کاروبار اسی مسجد میں بیٹھ کر شروع کیا تھا:

آسماں سجدہ کند بر سر خاکے کہ برو
یک دو تن یک دو نفس بہرِ خدا بنشینند

چنانچہ مولوی سیّد نصیرالدّین نے اسی مسجد میں رفیقوں سے مشورے کے بعد دوست محمد خاں کے پاس سفارت بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے انتظامات بھی مکمل کر لیے۔ ابو احمد علی اور سیّد ابراہیم سورتی اس سفارت کے لیے تجویز ہوئے، لیکن اچانک سیّد عبدالرّحیم سورتی اور سیّد عبداللہ رحیم بنگالی کے درمیان کسی معمولی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بنگالی نے سورتی کا ہاتھ دانتوں سے دبا لیا۔ سورتی نے ہاتھ زور سے کھینچا تو بنگالی کا ایک دانت اکھڑ گیا اور بہت خون نکلا۔[1]

---

[1] یہ حالات ابو احمد علی کے اس رسالے سے ماخوذ ہیں، جو انھوں نے مولوی سیّد نصیرالدّین کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے متعلق مرتب کیا تھا اور جس کا صرف ایک ناقص نسخہ مجھے مل سکا۔

اس ناخوش گوار واقعے کی وجہ سے ارسال سفارت کی تجویز معرضِ التوا میں پڑ گئی، تاہم مولوی سیّد نصیرالدّین میدانِ جہاد میں اُتر آنے کے بعد امیر دوست محمد خاں کی جانب سے دفاعی کوششوں میں برابر معاون و مددگار رہے، جیساکہ آگے چل کر واضح ہوگا۔

عزمِ ہجرت بہرحال مولوی صاحب جہاد کی نیّت سے ہجرت کے لیے تیار ہوگئے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ہجرت سے بیشتر ملک کے مختلف حصّوں میں دورہ کریں اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو معیّت کے لیے تیار کرلیں۔ سیّد صاحب کے مقرّر فرمائے ہوئے نقیب جا بجا دعوت و تبلیغ میں مصروف تھے۔ مثلاً مولانا ولایت علی عظیم آبادی پہلے حیدرآباد میں کام کر رہے تھے، سیّد صاحب کی شہادت کے بعد اپنے وطن پہنچ گئے۔ ان کے بھائی مولانا عنایت علی مشرقی بنگال میں سرگرم عمل تھے۔ مولانا سیّد محمد علی رام پوری مدراس میں وعظ و نصیحت کے مراکز قائم کرنے کے بعد ملک کے دوسرے حصّوں میں مشغول تھے۔ مولانا سیّد اولاد حسن قنوجی اپنے گرد و پیش یہی کام انجام دے رہے تھے۔ مولوی سیّد نصیرالدّین غالباً چاہتے تھے کہ دعوت و تبلیغ کی ان مساعی میں تنظیم پیدا کرکے اندازہ فرمالیں، کُل کتنی جمعیّت کا انتظام ہوسکے گا اور آئندہ کے لیے مجاہدین کی آمد کا سلسلہ کس پیمانے پر جاری رہ سکے گا۔ نیز ان کی خواہش تھی کہ جن حصّوں میں منظّم دعوت و تبلیغ کا انتظام نہیں ہوا، ان میں بھی گھوم پھر کر اجراءِ کار کا بندوبست کردیں۔ جب سوچا کہ اس طرح آغازِ جہاد میں بہت تاخیر ہوجائے گی تو یہی فیصلہ کیا کہ زیادہ تاخیر نہ روا رکھی جائے اور ظاہر ہے کہ جوانمردانہ میدانِ جہاد میں اتر آنا بجائے خود دعوت و تبلیغ کا ایک موثّر پیغام تھا۔ اس سلسلے میں جو کچھ پہلے سے ہوچکا تھا اور ہو رہا تھا، اس میں لازماً زیادہ جوش و سرگرمی پیدا ہوجانے کے قوی امکانات موجود تھے۔

والدہ سے اجازت مولوی صاحب کی والدۂ ماجدہ زندہ تھیں۔ اُن سے اجازت لینے کا مرحلہ طے نہ ہوا تھا۔ والدہ کی ایک تمنّا یہ تھی کہ ماہِ رمضان کے اندر جامع شاہ جہانی میں نماز ادا کریں۔ مولوی صاحب نے رمضان ۱۲۵۰ھ (جنوری ۱۸۳۵ء) میں ایک رات نمازِ تراویح کے بعد والدہ کی یہ تمنّا پوری کردی۔ اپنے ساتھ مسجد میں لے گئے اور انھوں نے بہ اطمینان جتنی دیر تک نماز پڑھنی چاہی، پڑھتی رہیں۔

اس خدمت سے وہ بہت خوش ہوئیں۔ اُس وقت مولوی صاحب نے عرض کیا، قرآن مجید کا ارشاد ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ تم ہرگز حقیقی نیکی کو نہ پہنچو گے جب تک ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو، جن سے تم کو پیار ہے۔

یہ آیت پڑھ کر کہا کہ آپ کو مجھ سے بہت محبت ہے۔ میں خدا کی راہ میں جہاد کا آرزومند ہوں۔ آپ اس کارِ خیر کے لیے مجھے اجازت دیں اور مفارقت پر صبر و شکیب سے کام لیں۔ یہ سنتے ہی والدہ نے بہ خوشی اجازت دے دی۔ اس طرح مولوی صاحب کے راستے کی آخری رکاوٹ بھی دور ہو گئی اور وہ پورے اطمینان سے ہجرت کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

سامانِ سفر مولوی صاحب نے بہت تھوڑی مدت میں سفر کا سامان تیار کر لیا، جس کی تفصیل ہمیں معلوم نہیں۔ صرف اتنا جانتے ہیں کہ موصوف کی اہلیہ نے فرش اور ظروف کے علاوہ اپنے کپڑوں کی ایک جوڑی پیش کی، نیز مندرجۂ ذیل کتابیں ساتھ لیں: قرآن مجید، تفسیر جلالین، مشکوٰۃ، سنن ابی داؤد، حبل المتین، حجۃ اللہ البالغہ میں سے کتاب الاحسان۔ بعض رفیقوں نے عرض کیا کہ تفسیر بیضاوی بھی ساتھ لے لیجیے۔ فرمایا: ہم جس مقصد کے لیے یہ سفر اختیار کر رہے ہیں، اس میں کتابوں کے مطالعے کی نوبت نہ آئے گی۔ ۳۔ ذی حجہ سنہ ۱۲۵۰ھ (۲۔ اپریل ۱۸۳۵ء) کو گھر بار، اہل و عیال اور اعزہ و احباب سے مفارقت اختیار کر کے عرب سرائے میں جا ٹھہرے، جو دہلی سے تقریباً چار میل پر ہے۔ مجاہدین کی مختصر سی جماعت ساتھ تھی۔

ہمارے ہاں لوگ عیدین کے موقع پر باہر سے گھروں میں آتے ہیں تاکہ شادمانی کی یہ تقریبیں عزیزوں اور دوستوں میں ادا کریں، لیکن جو حق پرست بزرگ اپنی زندگیاں اہم دینی کاموں کے لیے وقف کر چکے ہوں، انھیں صرف ان کاموں سے پیار ہوتا ہے اور دنیا کی کوئی خوشی انھیں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔ مولوی سید نصیر الدین مزید چند روز کے لیے توقف فرما کر عید کی نماز وطن میں ادا کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے جس اہم فرض کی بجا آوری میں اپنی جان تک دے دینے کا

عزم فرما لیا تھا' ان کے نزدیک زندگی کی ہر خوشی صرف اسی کی تکمیل پر موقوف رہ گئی تھی۔ چنانچہ وہ بے تکلف اٹھے اور قربِ عید چند روز کے لیے بھی ان کا عناں گیر نہ ہو سکا۔ راہِ رضا سہل نہیں، بہت کٹھن ہے، لیکن مردانِ حق نے مشکلات کو یک قلم نظر انداز کرتے ہوئے ہمیشہ اسے بے پروایانہ طے کیا ہے اور جب تک دنیا باقی ہے، مردانِ حق کے اس شیوے میں فرق نہیں آ سکتا۔ ان کے سازِ وجود کا ہر تار اس ترانے کے لیے وقف تھا:

زندانیِ غم باش کہ در شرعِ محبّت
صیدے کہ نہ شد کشتہ دریں بند حرام است

دوسرا باب

سفرِ ہجرت

راستے کا مسئلہ ابو احمد علی کا بیان ہے کہ مولوی سیّد نصیر الدین لدھیانہ کے راستے سرحد پہنچنا چاہتے تھے، جہاں سیّد صاحب کے بقیۃ السّیف رفقاء موجود تھے۔ گویا وہ دہلی سے پانی پت، کرنال، انبالہ، لدھیانہ، بہاول پور اور ڈیرہ غازی خاں کا راستہ اختیار کرنا چاہتے تھے[1]، لیکن تبلیغی دورے کے سلسلے میں ٹونک گئے تھے تو نوّاب وزیر الدّولہ نے مولوی صاحب سے عہد لے لیا تھا کہ سرحد جاتے ہوئے ٹونک سے ہو کر جائیں گے، لہٰذا مجوّزہ راستہ چھوڑ کر ٹونک، اجمیر اور راجپوتانہ کا راستہ اختیار کیا گیا ۔

ہجرت جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، مولوی صاحب ۳۔ ذی حجہ ۱۲۵۰ھ کو گھر سے نکل کر عرب سرائے میں ٹھہر گئے تھے، جو ان کے سفرِ ہجرت کی پہلی منزل تھی اور وہاں تین دن مقیم رہے۔ یقینی طور پر معلوم نہیں کہ ان کے ساتھ کتنے اربابِ عزیمت تیار ہوئے، لیکن خیال ہے کہ ان کی تعداد زیادہ نہ ہوگی ہمیں صرف مندرجۂ ذیل اصحاب کے نام معلوم ہو سکے: شیخ محمد تقی الٰہ آبادی، حاجی سیّد عبدالرحیم سورتی، شیخ عبدالکریم شاہ جہان آبادی (مؤذنِ جماعت)، سیّد عبدالرحیم بنگالی، شیخ رمضانی، شیخ عبدالکریم غازی پوری، شیخ عبداللہ گورکھ پوری، شیخ عبداللہ خُرد، انبا زخاں ناگ پوری، شیخ اللہ بخش الٰہ آبادی، شیخ کرم علی، شیخ واحد علی، سیّد واحد حسین، شیخ رجب علی، شیخ کریم بخش، سیّد وزیر علی

---

[1] رسالے میں مذکور ہے کہ مولوی سیّد نصیر الدین لدھیانہ اور لاہور کا راستہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ یہ راستہ اسی صورت میں اختیار کیا جا سکتا تھا کہ جماعت چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ جاتی اور تمام لوگ درویشوں کے لباس میں سکھوں کی حکومت سے گزرتے۔ بصورتِ دیگر وہی راستہ اختیار کیا جا سکتا تھا، جس کا ذکر میں نے متن میں کیا ۔

(یہ چھ اصحاب حوالیٔ عظیم آباد کے باشندے تھے)، شیخ امجد علی بنگالی، رستم خاں شاہ جہان آبادی، شیخ قادر بخش صباغ شاہ جہان پوری، سید محمد علی شاہ افغانستانی، سید افضل شاہ کاشمیری، محمد اسمٰعیل بھٹی، نور محمد پنجابی، مولوی ابراہیم اورنگ آبادی، کریم خاں بریلوی (یہ دونوں بزرگ بہت بوڑھے تھے)، شریعت اللہ سہارن پوری، محمد بنگالی، سید نوازش علی (از اولاد شیخ آدم بنوری) میرزا احمد بیگ دکنی، شیخ عبدالحی نومسلم، شیخ حبیب اللہ پنجابی، شہباز خاں ساکن حوالیٔ دہلی، شمس الدین قصاب، سید ابواحمد علی، سید محمد اسحٰق (برادر کلاں ابواحمد علی)، میرزا شہاب الدین فرزند میرزا محمد حسن تیموری۔ مؤخرالذکر شہزادگان دہلی میں سے تھے اور انھوں نے چند آدمی اپنے ساتھ لے لیے تھے۔

نماز عید اضحیٰ ۶۔ ذی حجہ کو مولوی صاحب عرب سرائے سے روانہ ہوئے اور قطب صاحب میں حوض شمسی[1] کے کنارے مسجد اولیاء کے متصل قیام کیا۔ ۷۔ ذی حجہ کو چلے تو اُسی دن یا ایک دن راستے میں قیام کرتے ہوئے ریواڑی پہنچ گئے، جہاں ایک باغ میں ٹھہرے۔ عید اضحیٰ کی نماز اسی مقام پر ادا کی۔

ہم بتا چکے ہیں کہ بعض اوقات راہِ حق میں قدم رکھتے ہی شدید امتحانوں سے سابقہ پڑ جاتا ہے۔ اہلِ حق کے لیے یہ امتحان ازدیادِ ایمان و استقامت کا باعث ہوتے ہیں۔ گویا قدرت خود ایسا انتظام کر دیتی ہے کہ وہ لوگ سخت تر مشکلات کو صبر و سکون سے برداشت کر لینے کے اہل بن جائیں۔ مولوی صاحب

[1] یہ حوض قطب صاحب کے قریب تھا اور سلطان شمس الدین التمش نے بنوایا تھا۔ اب اس کا صرف نشان باقی ہے۔ ابن بطوطہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو میل چوڑا اور ایک میل لمبا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس حوض سے قطب صاحب کے جھرنے میں پانی جاتا تھا اور تغلقوں کے زمانے میں اس کا پانی تغلق آباد کی خندق میں پہنچتا تھا۔ مسجد اولیاء اس حوض کے مشرقی کنارے پر تھی، نشان اب بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور بعض دوسرے بزرگوں نے خود ٹوکریاں ڈھو ڈھو کر یہ مسجد بنائی تھی، نیز خواجہ صاحب اور حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے اس میں چلہ کشی کی تھی۔ اس وجہ سے مسجد اولیاء یا اولیاء مسجد کے نام سے مشہور ہو گئی۔

کو بھی ابتدائی منازل ہی میں شدید امتحان سے دوچار ہونا پڑا، یعنی راستے کے خرچ کے لیے جو رقم ایک تھیلی میں محفوظ کر رکھی تھی، وہ گم ہوگئی۔

جے پور ریواڑی سے ۱۵- ذی حجہ کو روانہ ہوئے۔ گرمی کا موسم شروع ہوچکا تھا۔ پھر راجپوتانہ کا سفر، بڑی تکلیفیں پیش آئیں۔ جے پور پہنچ کر حکیم واصل خاں کے باغ میں ٹھہرے۔ رفیقوں میں سے سیّد ابواحمد علی کے بھائی سیّد محمد اسحٰق خاصے کمزور تھے اور کئی مزمن بیماریوں میں مبتلا چلے آتے تھے۔ ریگ زار میں پیدل چلنے سے کمزوری بڑھ گئی۔ اس اثنا میں لو لگی۔ میرزا شہاب الدّین کے ساتھ گاڑی تھی۔ انھوں نے اپنے پاس بٹھا لیا، لیکن جے پور پہنچنے کے دن سیّد صاحب فوت ہوگئے۔ جہاد کی نیت سے ہجرت اختیار کی تھی۔ اگرچہ میدانِ جہاد میں نہ پہنچ سکے، لیکن ہجرت اور جہاد دونوں کے ثواب سے شرف یاب ہوئے۔

جے پور میں باہر سے میّت لانا ممنوع تھا۔ میرزا شہاب الدّین حسنِ تدبیر سے ان کی میّت واصل خاں کے باغ میں لے گئے۔ وہاں مرحوم کی تجہیز و تکفین ہوئی۔ مولوی سیّد نصیر الدّین نے اس موقع پر نہایت پُرتاثیر خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ سیّد اسحٰق نے خدا سے جو عہد کیا تھا، اسے پورا کر دکھایا۔ دعا ہے کہ ہم سب کو اپنے عہد پورے کرنے کی توفیق ارزانی ہو۔ سیّد ابواحمد علی نے اپنے بھائی سیّد امیر الدّین اور دوسرے احباب و اعزّہ کو جو خط بھیجا، اس میں لکھا:

بعد از سلام مسنون محبّت مقرون واضح	محبّت بھرے سلام مسنون کے بعد
آں کہ بعد از ہجرت ازاں دار الحرب پُر از کرب	واضح ہو کہ میں تکلیفوں سے لبریز دار الحرب
در جے پور رسیدہ و در آنجا واقعۂ ناگزیر اخی الاعظم	کو ترک کر کے جے پور پہنچا اور وہاں بڑے بھائی
مغفور و مرحوم پیش آمد۔ انا للہ و انا الیہ راجعون[1]	مغفور و مرحوم کی وفات کا واقعہ پیش آیا۔ تحقیق
	ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اُسی کی طرف
	لوٹنے والے ہیں۔

[1] "اخبار مولوی سیّد نصیر الدّین" خلیفۂ سیّد احمد صاحب مخطوطہ صفحہ ۲۔

ٹونک جے پور سے آگے صرف ایک منزل کا نام معلوم ہے، یعنی نوائی جو ٹونک کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ مولوی سیّد نصیر الدّین، سیّد وزیر علی، سیّد واحد حسین اور شیخ شریعت اللہ جے پور ہی میں بیمار ہو گئے تھے۔ سیّد ابو احمد علی ان سب کی تیمارداری کرتے رہے۔ غالباً بیماری ہی کے باعث وہاں ایک ہفتہ ٹھہرے رہے۔ نوّاب وزیر الدّولہ کو پیغام بھیج دیا تھا۔ مولوی صاحب کی بیماری کا سُن کر نوّاب ممدوح نے آپ کے لیے میانہ ارسال کر دیا اور راستے میں جگہ جگہ آدمی مقرّر فرما دیے، جو مولوی صاحب کے متعلق پے در پے خبریں ٹونک پہنچاتے رہے۔ خود بناس ندی پر مولوی صاحب کا استقبال کیا۔ مصافحہ و معانقہ کے بعد زین پوش بچھا کر دعائے صحت کی۔ مولوی سیّد نصیر الدّین کی طرح نوّاب وزیر الدّولہ بھی کثیر الدّعا اور کثیر البکا تھے۔ ان کا مقررہ دستور یہ تھا کہ ہر کام کے آغاز اور انجام پر دعا کرتے۔ بعض اوقات دربار میں بیٹھے بیٹھے کلاہ سر سے اتار کر دعا کے لیے قبلہ رُخ کھڑے ہو جاتے۔ درباریوں کو تاکید فرما رکھی تھی کہ ایسے موقع پر با اطمینان بیٹھے رہیں اور اعزاز کی غرض سے ہرگز کھڑے نہ ہوں۔ خاص طور پر قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ زندگی میں کبھی دشمن کے لیے بھی دعائے بد نہ کی۔

مولوی صاحب نے پہلے روز عید گاہ کے باغ میں قیام کیا، دوسرے دن ان کے لیے منّو خاں کا بنگلا اور احاطہ تجویز ہوا، جہاں نوّاب ممدوح کے بھائی صاحبزادہ حافظ محمد جمال رہتے تھے۔

مہمان داری اور تحائف نوّاب وزیر الدّولہ نے مولوی سیّد نصیر الدّین اور ان کے رفیقوں کی مہمان داری بڑے اعلیٰ پیمانے پر کی۔ ایک روز نظر باغ میں دعوت کا انتظام کیا، جس میں تمام صاحبزادے، اکابرِ ریاست، سیّد حمید الدّین رائے بریلوی اور دوسرے اصحاب شریک تھے۔ سب نے دو صفیں باندھ لیں اور مولوی سیّد نصیر الدّین سے باقاعدہ بیعت کی۔ اس موقع پر نوّاب وزیر الدّولہ نے فرمایا کہ حضرت امیر المومنین ٹونک تشریف لائے تھے تو میں تحصیل علوم سے فارغ نہ ہوا تھا۔ آپ تشریف لے گئے۔ مجھے ہوش آیا تو اپنی محرومی پر حد درجہ افسوس ہوا۔ میں نے بہت سے درویشوں کو دیکھا۔ جو فیض سیّد صاحب سے پایا، وہ کسی دوسری جگہ سے حاصل نہ ہوا۔ مولوی سیّد نصیر الدّین میں اسی فیض کا پرتو نظر آتا ہے۔

نواب صاحب نے اسلحہ مثلاً تلواروں، بندوقوں کے علاوہ اونٹ اور گھوڑے مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کیے۔ ایک گھوڑا اتنا عمدہ تھا کہ ویسا کسی رئیس کے پاس نہ تھا۔ ایک گھوڑے کا نام "خوش خرام" تھا۔ تیسرا گھوڑا کمیت تھا جس کا نام "پری" تھا۔ دو گھوڑے سرنگ تھے۔ ایک سُرخ، ایک مشکی اور ایک سبزہ رنگ۔ نواب کے رفیقوں میں سے محمد اکبر خاں نے ایک گھوڑا دیا۔ صالح محمد خاں نے دعوت کی تو ایک گھوڑا، ایک اونٹ، ایک یابو اور ایک تلوار پیش کی۔ ان کے ایک خدمت گار غلام جیلانی نے ایک یابو نذر کیا، نیز فرش، خیمے، بڑی جانمازیں، گھڑیال، ایک بڑی دیگ اور دوسرا سامان توشہ خانۂ ریاست سے ملا۔ نواب نے تمام مجاہدوں کے لیے دستاروں، انگرکھوں، پاجاموں، کمربندوں اور پاپوشوں کا انتظام کر دیا، نیز کھانڈ اور املی کی بڑی مقدار ساتھ کر دی کہ کسی کو صفراوی بخار ہو تو دورانِ سفر میں اس کا علاج کیا جا سکے۔

یہ تفصیلات سید ابو احمد علی کے رسالے سے ماخوذ ہیں۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

نواب معلّی القاب دین پرور، نیکو سیر، حامیٔ دینِ متینِ محمدیؐ، محیِ صراط مستقیمِ احمدیؐ نصراللہ تعالیٰ بہ انواع تائیدات و تکریمات جماعۂ مہاجرین متکفل شد و با سلاح و چار پایان سواری و بار برداری بروجہ نیکو دلجوئی و خدمت گزاری ایں جماعت باکرامت کردند[1]	بلند لقب والے نواب نے جو دین کے خدمت گزار، نیک سیرت، دین محمدیؐ کے حامی، صراط مستقیم احمدیؐ کے زندہ کرنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کا ناصر ہو، مختلف طریقوں سے جماعت مہاجرین کی تائید و تکریم فرمائی۔ ہتھیار دیے، سواری اور بار برداری کے لیے جانور مہیا کیے اور اس جماعت کی خدمت گزاری و دل جوئی احسن طریق پر فرمائی۔

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ صہ۲۰

اوکنلے کا بیان اوکنلے کا ذریعہ معلومات خدا جانے کیا تھا۔ وہ اپنے مقالے "وہابی ہندوستان میں" لکھتا ہے کہ مولوی نصیر الدین دہلی سے روانہ ہوئے تھے تو ان کے ساتھ تھوڑے سے آدمی تھے۔ ٹونک میں انھیں مجاہدین کی بڑی تعداد مل گئی۔ وہاں سے روپیہ بھی بہت ملا اور ہتھیار بھی۔ پھر وہ شکارپور چلے گئے۔ ان کا فیصلہ یہ تھا کہ مجاہدین خاصی تعداد میں جمع ہو جائیں تو سکھوں سے لڑیں۔[1]

یہ صحیح نہیں کہ مولوی سیّد نصیر الدین ابتدا ہی میں شکارپور چلے گئے تھے۔ اس مقالے میں بعض اور بھی غلط باتیں درج ہیں، تاہم اس میں شبہہ نہیں کہ دہلی سے ان کی روانگی اور ٹونک سے امداد کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ فی الجملہ درست معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] کلکتہ ریویو، بابت جولائی سنہ ۱۸۷۰ء صفحہ ۱۸۸۔

تیسرا باب

مقامِ جہاد کا فیصلہ

مولوی صاحب کا عزم | مولوی سیّد نصیر الدین نے راہِ ہجرت میں قدم رکھا تھا تو اُن کی خواہش یہ تھی کہ سیّد صاحب کے اُن بقیۃ السیف رفقاء سے تعلّق پیدا کریں جو سرحدِ آزاد میں مقیم تھے۔ اس سلسلے میں وہ امیر دوست محمد خاں کی حکومت کا تعاون بھی چاہتے تھے۔ اُس وقت متعدّد مقامات مختلف حیثیتوں سے موزوں نظر آتے تھے۔ مثلاً :

۱۔ مزاری اور لغاری بلوچوں کا وطن، جو سکھوں سے لڑ رہے تھے ۔

۲۔ امیر دوست محمد خاں کا دائرۂ حکمرانی جو ایک طرف سکھوں سے اور دوسری طرف انگریزوں سے برسرِ پیکار تھا ۔

۳۔ سندھ جہاں کے امیر اگرچہ انگریزوں سے معاہدہ کر چکے تھے، تاہم امکان تھا کہ انھیں تقویت پہنچا کر حقیقی دینی مقاصد پورے کرانے کا انتظام کیا جائے ۔

لیکن ان مقامات پر معاملۂ جہاد منحصر نہ تھا۔ مولوی صاحب کا فیصلہ یہ تھا کہ جہاں بھی ٹھہرنے کا بندوبست ہو جائے، وہ اپنی زندگی کلمۂ حق کی سربلندی میں قربان کر دیں۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں :

ہر چند مصمّم و مضمر آں بود کہ از راہِ	اگرچہ ارادہ یہ تھا کہ بہاول پور کے راستے
بہاول پور اوّلاً بہ جلال آباد و کابل متوجہ شود۔	جلال آباد اور کابل جاؤں۔ اگر وہاں مہاجرین
اگر در آنجا مقرے و مستقرے برائے مہاجرین	کے قیام کا انتظام ہو جائے تو یہی ہماری
بدست آید فہذا ما کنّا نبغ والّا الم تکن ارض اللہ	خواہش ہے، ورنہ "کیا خدا کی زمین وسیع

واسعۂ مطمحِ نظر ساختہ بہ محروسۂ از محروسات
مسلمانان، بخارا باشد یا سمرقند، غزنی باشد
یا نہاوند، کوہستان مزاریاں بود خواہ دیار
پنجتاریاں، جبال سندھیاں باشد یا کوہ ہائے
لغاریاں، رسیدہ و مقرے برائے جماعت
مہاجرین بدست آوردہ بہ توفیقات الٰہی و
تائیدات لامتناہی تاجاں در تن و سر بر بدن
باقیست، بہ ہمگی ہمت و جملگی نہمت مصروف
و مبذول اعلاء کلمۃ اللہ العلیا شود۔[1]

نہیں؟" کو نصب العین بنا کر مسلمانوں کی
کسی حکومت میں پہنچ جاؤں، بخارا ہو یا
سمرقند غزنی ہو یا نہاوند، مزاریوں کا کوہستان
ہو یا پنجتاریوں کا علاقہ، سندھیوں کے پہاڑ
ہوں یا لغاریوں کے، مہاجرین کے لیے جگہ کا
بندوبست کر لوں۔ پھر خدا کی توفیق اور
اس کی بے انتہا تائید سے جب تک تن میں
جان اور بدن پر سر ہے، پوری ہمت اور
کامل ارادے سے کلمۃ اللہ کی سربلندی میں
مشغول رہوں ۔

ٹونک میں مشورے | مولوی صاحب موصوف ٹونک پہنچے اور جائے قیام کے متعلق مشورے شروع ہوئے تو نواب وزیر الدولہ، سید حمید الدین (خواہر زادۂ سید صاحب) اور بعض دوسرے اکابر نے یہ رائے دی کہ سندھ کو مرکز جہاد بنانا چاہیے۔ سید حمید الدین سفر ہجرت میں سید صاحب کے ساتھ رہے تھے اور انھیں سندھ، بلوچستان، افغانستان اور سرحد کے حالات سے براہِ راست آگاہی حاصل ہو چکی تھی۔ انھوں نے یقیناً معاملے کے تمام پہلوؤں کا موازنہ کرتے ہوئے سندھ کے انتخاب پر زور دیا ہوگا اور ان کے دلائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے مولوی سید نصیر الدین نے یہی فیصلہ کیا کہ سندھ میں قیام کیا جائے۔ پھر غور و فکر کے بعد جہاں سے مناسب ہو، جہاد شروع کر دیا جائے ۔

مولوی صاحب کا بیان | چنانچہ مولوی صاحب اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :

بعد ردّ و بدل بسیار و تامّل و تدبّرِ
بے شمار چناں مقرر شد کہ دیارِ سندھ منزلِ مقصود

خاصے ردّ و بدل اور غور و فکر کے بعد
فیصلہ ہوا کہ ولایتِ سندھ کو مہاجرین کی

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ ص ۱۱ ۔

مہاجرین ثبت اللہ اقدامہم گردد و بعد رسیدن آنجا اگر اہلِ آں دیار وادِ انصاریت دادند . . . . وجائے برائے ثبات اقدام ایں جماعتِ فقرا مقرر کردند فہو المراد و الا ملکِ خدا تنگ نیست و پائے شما لنگ نیست[1]۔

منزلِ مقصود قرار دیا جائے ۔ اللہ تعالیٰ ان کے قدموں کو ثبات بخشے ۔ وہاں پہنچنے کے بعد اگر اہلِ ملک نے تائید و نصرت کا حق ادا کیا اور فقیروں کی اس جماعت کے لیے کوئی جگہ مقرر کر دی تو یہی ہماری مراد ہے، ورنہ خدا کا ملک تنگ نہیں اور چلنے والا لنگڑا نہیں۔

سندھ کی ترجیح کے وجوہ مشیروں نے سندھ کی ترجیح کے کئی پہلو پیش کیے ۔ مثلاً یہ کہ وہاں پہنچنا آسان ہے ۔ وہاں کے لوگ قول و قرار کے سچے ہیں ۔ انھیں سید احمد شہید کے رفیقوں اور نیازمندوں سے محبت ہے ۔ مولوی صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں ترجیح کی پانچ وجہیں بیان کی ہیں ۔ فرماتے ہیں :

آنچہ در ترجیح و ایثار ایں دیار بر کابل و جلال آباد و جبالِ یوسف زئیاں و مقام مہاجرین سابقین بیان کردند، از آں جملہ اوّل آسانی راہ است و رسیدن قوافل ہندوستان بہ راحت و آرام، دوم درست پیمانیٔ اہل آں دیار، سوم محبت و اخلاص مسلمانانِ آنجا بر اہل اللہ خصوصاً بہ منتسبان حضرت رئیس المسلمین، امام المجاہدین حضرت سید احمد صاحب . . . ' چہارم مخالفت و عدم ملایمت پنجتاریاں و یوسف زئیاں

کابل، جلال آباد، یوسف زئیوں کے پہاڑی علاقوں اور پہلے مہاجرین کے مقام پر سندھ کی ترجیح کے جو پہلو بیان کیے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ راستہ آسان ہے اور ہندوستان کے قافلے راحت و آرام سے یہاں پہنچ سکتے ہیں ۔ دوم یہ کہ سندھ کے باشندے عہد و پیمان کے سچے ہیں، سوم یہ کہ یہاں کے مسلمانوں کو اللہ والوں سے محبت و اخلاص ہے، خصوصاً مسلمانوں کے سردار اور مجاہدوں کے امام حضرت سید احمد کے ساتھ

---

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ صـ۲۸ ۔

و برادرانِ امیر دوست محمد خان غازی و اتباعِ ایشاں با حضرت ایشاں، اگرچہ امیرِ ممدوح فی نفسہٖ و بہ ذاتِ خود از مخلصین و محبّین است۔ پنجم صعوبتِ راہ و شدائد گزرگاہِ کابل و جلال آباد و جبالِ افاغنہ بہ سبب کریوہ و مغاک و راہزنیٔ دزداں بے باک و عمل داریٔ سکھانِ ناپاک[1]۔

تعلق رکھنے والوں سے۔ چہارم پنجتاری، یوسف زئی، امیر دوست محمد خاں کے بھائی اور ان کے ساتھی سیّد صاحب کے مخالف ہیں، اگرچہ خود امیر موصوف بڑے مخلص اور محبت ہیں۔ پنجم کابل، جلال آباد اور افغانی کوہستان کے راستے ٹیلوں اور غاروں کے سبب سے بہت دشوار گزار ہیں۔ ان راستوں میں ڈاکوؤں کا بھی خطرہ ہے اور سکھوں کی عمل داری کے باعث ان سے گزرنا خالی از خوف نہیں۔

زراعت و تجارت کے امکانات مولوی صاحب نے مختلف خطوں میں سندھ کی ترجیح کے چند اور پہلو بھی بیان کیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ سندھ کی زمین کھیتی باڑی کے لیے بہت موزون ہے اور بہت زیادہ ہے، اس کے مقابلے میں آبادی بہت کم ہے نیز یہاں تجارت کے لیے بڑی گنجایش ہے اور اہل سندھ کو تجارت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سندھ کے باشندے نرم طبیعت کے ہیں اور ان کے مزاج میں درشتی بالکل نہیں۔ چنانچہ ایک خط میں فرماتے ہیں:

ایں ملکِ مسلماناں برائے ہجرت خوب است، خصوصاً کسانے کہ شوقِ زراعت دارند۔ زیراکہ زمینِ ایں ملک ریگستان است، نہ سنگستان و زمین بسیار است و مردماں کم۔

مسلمانوں کا یہ ملک ہجرت کے لیے بہت موزون ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے لیے جنھیں کھیتی باڑی کا شوق ہو، کیونکہ اس ملک کی سطح ریتلی ہے، پتھریلی نہیں۔ زمین بہت ہے

---

[1] اخبار مولوی سیّد نصیر الدین مخطوطہ صفحہ ۱۲۔

بہ خلاف ہندوستان کہ جائے تنگ است ومردماں بسیار[1]

اور آبادی کم۔ اس کے خلاف ہندوستان میں جگہ تنگ ہے اور آدمی بہت زیادہ ؛

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

براے ہجرت ایں ملک خوب است، خصوصاً براے اہلِ زراعت، زیرا کہ زمین ارزاں بہ دست می آید و آبیاریِ آں از دریا می شود۔ بہ بارش چنداں حاجت ندارد[2]

یہ ملک ہجرت کے لیے بہت موزون ہے خصوصاً کھیتی باڑی کرنے والوں کے لیے کیونکہ زمین سستی مل جاتی ہے۔ اس کی آبیاری دریا سے ہوتی ہے۔ بارش کی چنداں حاجت نہیں ؛

ایک اور خط مظہر ہے :

براے مہاجرت بھائی یعقوب صاحب ملک سندھ بسیار خوب است و دریں جا در مہاجرت ہر کہ و مہ را بسیار فوائد است، اگر خدا تعالیٰ استقامت عطا فرماید و مردمانِ سندھ امر تجارت نمی دانند و در محنت کشی بسیار چست اند[3]

یہ ملک بھائی یعقوب کی ہجرت کے لیے بہت اچھا ہے۔ یہاں چھوٹا بڑا جو بھی ہجرت کرکے آئے گا، بہت فائدے حاصل کرے گا۔ خدا تعالیٰ استقامت عطا کرے۔ سندھ کے لوگ تجارت کرنا نہیں جانتے، ویسے بڑے محنتی ہیں ؛

ایک مکتوب میں اہلِ سندھ کے متعلق لکھتے ہیں :

مسلمانانِ سندھ لین الطبع و مبرا از خشونت مزاجی اند[4]

سندھ کے مسلمان طبیعت کے نرم ہیں اور ان کے مزاج درشتی سے بالکل پاک ہیں ؛

---

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ ص ۲۲ ؛ [2] ایضاً ایضاً ص ۲۰ ؛
[3] ایضاً ایضاً ص ۱۳ ؛ [4] ایضاً ایضاً ص ۲۴ ؛

سندھ میں قیام کے لیے کشش کا ایک باعث یہ بھی ہوا کہ اُس زمانے میں ڈیرہ غازی خاں کے مزاری بلوچ سکھوں کے علاقوں پر یورشیں کر رہے تھے اور مولوی نصیرالدین کو اجمیر و جودھ پور میں یہ خبر مل گئی تھی۔ چنانچہ اسی وقت سے وہ مزاریوں کی طرف راغب ہو گئے[1]۔

فیصلے کی حیثیت مولوی صاحب نے واقفِ حال مشیروں کی پیش کردہ معلومات کے مطابق جو فیصلہ کیا، اس کی درستی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، لیکن معلومات جس زمانے میں حاصل کی گئی تھیں، وہ اور تھا اور مولوی نصیرالدین جس وقت سندھ پہنچے، صورتِ حال میں بہت بڑی تبدیلی ہو چکی تھی مثلاً:

۱۔ والیانِ سندھ بڑی حد تک انگریزوں کے دست نگر ہو گئے تھے۔ رنجیت سنگھ سندھ کی جانب پیش قدمی کر رہا تھا اور والیانِ سندھ کو امید نہ رہی تھی کہ انگریزوں کے سوا کوئی انھیں سکھوں کی دست بُرد سے بچا سکتا ہے۔

۲۔ اہلِ سندھ یقیناً اللہ والوں کے معتقد تھے، لیکن جن پیروں کو وہ اہل اللہ مانے بیٹھے تھے، ان میں سے کوئی بھی کسی بڑے مجاہدانہ اقدام کے لیے تیار نہ تھا، اِلّا ماشاء اللہ۔

۳۔ مزاری بلوچ بلاشبہ سکھوں سے برسرِ پیکار تھے، لیکن اُن کی تنظیم بہت ناقص تھی اور تھوڑی ہی مدت میں وہ مقابلہ چھوڑ کر سکھوں سے جا ملے، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو گا۔

۴۔ سندھ میں زمین حاصل کر کے کھیتی باڑی یا تجارت بے شک شروع کی جا سکتی تھی لیکن اس طرح سندھ کو اُس تصرف کے خطرے سے محفوظ نہ کیا جا سکتا تھا، جس میں یہ کم نصیب ملک مبتلا ہو چکا تھا۔

مولوی سیّد نصیرالدین نے خاصی مدت جد و جہد میں بسر کی، لیکن انھیں کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے کا موقع نہ مل سکا۔ تفصیلات کے لیے آئندہ ابواب ملاحظہ فرمائیں۔

---

[1] اخبار مولوی سیّد نصیرالدین مخطوطہ ص ۲۹۔

چوتھا باب

ٹونک سے سندھ

اجمیر و جودھ پور ٹونک سے روانہ ہو کر مولوی صاحب نے اجمیر میں قیام کیا۔ وہاں سیّد احمد شہید کے نیاز مند موجود تھے۔ انھوں نے قافلۂ مجاہدین کی خاطر داری میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا ہوگا، لیکن حالات کا جو قلمی ذخیرہ ہمارے سامنے ہے، اس میں قیام اجمیر کی تفصیلات موجود نہیں صرف یہ مرقوم ہے کہ ٹونک سے :

بہ صورت رسالہ از رسالہ جات سواراں	سواروں کے رسالے کی صورت
روانہ بہ دار الخیر اجمیر شد ؂	میں دار الخیر اجمیر کی طرف روانہ ہوا ؂

جودھ پور میں مشکلات اجمیر میں چند روز ٹھہرنے کے بعد خیر پور سندھ کا قصد کر لیا۔ سیدھا راستہ جودھ پور سے ہو کر جاتا تھا، لہٰذا اس مقام پر بھی ٹھہرے۔ وہاں ابتدائے قیام میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ مثلاً :

۱۔ راجا نے دروازہ ہائے شہر کے پاسبانوں کو حکم دے دیا تھا کہ مجاہدین کے قافلے کا کوئی آدمی اندر نہ آنے پائے ؂

۲۔ اس حکم کا نتیجہ محض یہی نہ نکلا کہ اہل قافلہ شہر میں داخلے سے محروم ہو گئے، بلکہ شہر کے مخلص مسلمان بھی اس خیال سے ملنے کے لیے نہ آسکے کہ یہ امر راجا کی ناراضی کا باعث ہوگا ؂

۳۔ تیسری اور سب سے بڑی مصیبت یہ پیش آئی کہ بعض ساتھیوں نے ہتھیار اور سامان لے کر بھاگ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مولوی سیّد نصیر الدّین نے معمول کے مطابق دو رکعت نماز ادا کر کے عجز و زاری سے بارگاہِ باری تعالیٰ میں دعا کی کہ میرا تو بھروسا صرف تجھ پر ہے۔ تیرے فضل کے یقین پر، تیری رضا

کے لیے گھر بار چھوڑا ہے کہ دین کی نصرت کا کام انجام پائے - میں گنہگار ہوں - میرے گناہوں سے درگزر - اپنی رحمت پر نظر رکھ - تیرے سوا کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں؟

اس دعا کے بعد مخالفین کا فتنہ دب گیا اور وہ لوگ قافلے کو چھوڑ کر چلے گئے۔

اطمینان کی صورت معلوم ہوتا ہے کہ چند روز کے بعد یہ مشکلات ختم ہو گئیں - اس سلسلے میں خواجہ الماس نام ایک شخص کی اعانت بہت مؤثر ثابت ہوئی - اسے دربار جودھ پور میں خاصا رسوخ حاصل تھا - مولوی سید نصیر الدین اسے "مرد سعادت مند" و "صلح دوست" بتاتے ہیں - اس نے شہر میں داخلے کی بندش کا حکم منسوخ کرا دیا - بعد ازآں اہل شہر سے میل جول کی صورت بھی پیدا ہو گئی۔ خود خواجہ الماس نے دو بیش قیمت، خوش شکل اور تیز رفتار اونٹ مولوی صاحب کی خدمت میں بطور نذر پیش کیے، نیز ایک قیمتی تلوار، بہت بڑی ڈھال اور دو سو روپے گزرانے - اُمید ہے کہ دوسرے مسلمانوں نے بھی حسبِ استطاعت نذریں پیش کی ہوں گی۔

جیسلمیر جودھ پور کے بعد جیسلمیر میں قیام کا ذکر ہے، جہاں قافلہ دس روز کے قریب ٹھہرا رہا۔ وہاں کا راجا حسنِ سلوک سے پیش آیا - اُس نے شہر کے اندر دو بڑی حویلیاں قافلے کے لیے خالی کرا دیں اور مہمان داری کے سامان میں بڑی سرگرمی دکھائی - مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ جیسلمیر میں چار مسجدیں تھیں - ان میں سے صرف ایک مسجد میں اذان کہنے کی اجازت تھی، جو قندھاریوں کے محلے میں واقع تھی - باقی کسی مسجد میں اذان نہ ہوتی تھی، لیکن:

مردمانِ جماعت ہر جا کہ می خواستند، اذان می دادند و نماز می خواندند حتّٰی کہ یک تالاب کلاں در جیسلمیر است کہ گردِ آں بُت خانہ ہائے سنگین تعمیر شدہ یک مکانِ سنگیں درمیانِ تالاب واقع است ۔ مردمانِ جماعت بر آں اذان دادہ نماز می خواندند	ہماری جماعت کے آدمی جس جگہ چاہتے، اذان دیتے اور نماز ادا کرتے - جیسلمیر میں ایک بڑا تالاب ہے، جس کے اردگرد پتھر کے بُت خانے بنے ہوئے ہیں - پتھر کا ایک مکان تالاب کے عین درمیان واقع ہے - ہماری جماعت کے لوگ اُس میں بھی

"تمام کافراں را بسیار شاق معلوم می شد،	اذان دے کر نماز پڑھتے۔ غیر مسلموں کو
لیکن از ہیبتے دم نمی زدند بلکہ روزے راجا	یہ امر بہت شاق گزرتا لیکن ہیبتِ حق کے
برائے سیرِ تالاب در معبدِ خود رفتہ رو برو	باعث دم نہ مارتے۔ ایک روز راجا تالاب
او مردمانِ ایں جماعت اذان دادہ نماز	کی سیر کے لیے اپنے عبادت خانے میں آیا۔
خواندند۔ بسیار دید لیکن ہیچ نہ گفت"[1]	اُس کے روبرو بھی ہماری جماعت کے
	لوگوں نے اذان دے کر نماز پڑھی۔ وہ دیکھتا
	رہا اور کچھ نہ کہا ۔

ایک اَور خط میں ان تمام باتوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ ہماری جماعت کے آدمی فجر سے عشا تک اُن بُت خانوں میں رہتے اور سوتے جو تالاب کے اردگرد بنے ہوئے تھے۔ نماز کے وقت بلند آواز سے اذان کہتے تو بُت خانوں میں گھنٹے بجنے لگتے۔ غیر مسلموں میں سے چند لوگ چند مجاہدوں کو لے کر اُن بُت خانوں کے بڑے برہمن کے پاس پہنچے۔ مجاہدوں نے کلماتِ اذان کے معنی بیان کیے تو اُس نے کہا کہ یہ خدا سے بزرگ کی تعظیم کے کلمے ہیں۔ ان کے اوقات میں گھنٹے نہ بجانے چاہییں[2] ۔

منشی امام علی اُس زمانے میں منشی امام علی نام ایک صاحب حکومت انگلشیہ کی جانب سے جیسلمیر میں اخبار نویسی پر مامور تھے۔ انھوں نے مجاہدوں کی خاطرداری کا خاص اہتمام کیا۔ راجے کے دل میں بھی منشی صاحب کی بڑی قدر و منزلت تھی اور شہر کے لوگ بھی اُن سے بہت ڈرتے تھے۔ مجاہدین کو جیسلمیر میں جو سہولت و آسائش نصیب ہوئی، اس میں منشی صاحب کے اثر و رسوخ کو خاص دخل ہے ۔

مولوی صاحب نے جیسلمیر سے روانگی کا قصد کیا تو کرایے کے اونٹ ملنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ انھیں خیال تھا کہ منشی صاحب کی سعی سے اونٹ میسر آجائیں گے، لیکن یہ سعی بے نتیجہ رہی۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں:

---

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ ص ۶۹ ۔ [2] ایضاً ایضاً ص ۲۱ ۔

چونکہ ایں چنیں خیال از طرف غیر خدا	منشی صاحب نے کرایے کے اونٹ
کردہ بودم، ہر چند منشی موصوف در کرایہ کردن	حاصل کرنے میں بہت کوشش کی اور
شتراں بسیار سعی کرد و ایں جانب دُونہ	میں دُگنا کرایہ دینے کے لیے تیار ہو گیا،
کرایہ دادن قصد کرد لیکن شتران کرایہ میسّر	لیکن میرا یہ خیال چونکہ غیر خدا کی طرف تھا، لہٰذا
نہ شدند[1] ؏	کرایے کے اونٹ میسّر نہ آئے ؏

بار برداری کی دقّت مجبور ہو کر اپنے ہی اونٹوں پر سامان لاد لیا۔ پھر ایک اونٹ والا خود بخود آگیا۔ جتنا کرایہ میں اسے پہلے دیتا تھا، اس سے نصف لے کر راضی ہو گیا۔ اِس طرح جماعتِ مجاہدین نے جیسلمیر سے خیرپور کی طرف بیس کوس کا راستہ تین روز میں بہ ہزار خرابی طے کیا۔ بوجھ کی زیادتی کے باعث اونٹ زخمی ہو گئے۔ وہاں ایک شخص ملا، جو سیّد احمد شہید کے عقیدت مندوں میں سے تھا۔ اُس نے کہا کہ میں خدمت کے لیے تیّار ہوں اور کرایے کے پانچ اونٹوں کا بندوبست کر بھی دیا۔ پانچ روپے بیعانہ بھی لے گیا، لیکن روانگی کے وقت اونٹوں والوں نے انکار کر دیا اور بیعانہ واپس کر گئے ؏

خدا ساز سامان آخر مولوی صاحب نے خود اونٹ فراہم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ وہ چند آدمیوں کو ساتھ لے کر گھوڑے پر سوار ہوئے اور ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ آدمیوں کو تاکید کر دی کہ خبردار کوئی کسی سے کرایے کے اونٹوں کی بات نہ کرے۔ اُس گاؤں کا چودھری بیمار تھا۔ لوگوں نے دودھ، چھاچھ اور پراٹھوں سے مولوی صاحب اور ان کے ساتھیوں کی تواضع کی اور بیمار کے لیے تعویذ مانگا۔ مولوی صاحب نے قلم دوات لے کر تعویذ لکھ دیا اور بیمار کے بھتیجے کو ایک طرف لے جا کر کہا کہ شافیِ مطلق بیمار کو شفا دے دے تو ہمیں کیا ملے گا؟ اُس نے کہا، جو فرمائیں، حاضر کر دوں گا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میری دو شرطیں ہیں: ایک یہ کہ ایک تیز رفتار اونٹ مجھے دیا جائے۔ دوسری یہ کہ ہمیں فی الحال بار برداری کے لیے اونٹ درکار ہیں، جو کرایہ مناسب ہو، لے لیں اور اونٹوں کا انتظام کر دیں۔ خدا نے اپنی رحمت سے

[1] اخبار مولوی سیّد نصیر الدّین مخطوطہ صلا ؏

مریض کو شفا دی۔ اس طرح اونٹوں کے انتظام کی صورت بنی ؞

سرحد سندھ سفر کرتے ہوئے مولوی صاحب سرحد سندھ پر اُس جگہ پہنچے، جہاں کنھارو کا قلعہ واقع تھا۔ اہلِ قلعہ نے انھیں قزّاقوں کی جماعت سمجھ لیا اور گولیاں چلانے لگے۔ جب انھیں حقیقتِ حال بتائی گئی تو بولے، پہلے اونٹوں اور گھوڑوں کا محصول دو، پھر داخلے کی اجازت دی جائے گی اور اُسی وقت پانی کنوئیں سے نکالنے کا حق حاصل ہوگا۔ آگے خیر پور تک چوبیس کوس کی منزل تھی، جہاں کہیں پانی نہ ملتا تھا۔ محصول کا حساب پوچھا گیا تو انھوں نے بتایا کہ چالیس روپے سے کم نہ ہوگا ؞

مولوی صاحب نے کہا کہ ہم تین آدمیوں کو میر رستم فرماں روائے خیر پور کے پاس معافیِ راہ کا پروانہ حاصل کرنے کی غرض سے بھیج چکے ہیں۔ ہم سے محصول نہ لیجیے، البتہ ایک بندوق آپ کے پاس بطورِ امانت چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر میر صاحب کی طرف سے معافی کا پروانہ آگیا تو ہماری بندوق واپس بھیج دیجیے، ورنہ ہم رقم ادا کرکے بندوق لے جائیں گے۔ چنانچہ حاجی عبدالرحیم کو ایک بندوق دے کر قلعے میں بھیج دیا گیا۔ جماعت میں سے وہی سندھی زبان جانتے تھے۔ پھر قلعہ دار نے خود مولوی صاحب کو بُلا لیا۔ بڑی عزت سے پیش آیا۔ بندوق واپس کر دی اور اپنے بیل لگا کر کنوئیں سے پانی نکلوایا۔ رخصت کے وقت مولوی صاحب کے جوتے سیدھے کیے۔ اس طرح مولوی صاحب منزل بہ منزل خیر پور ہوتے ہوئے پیر کوٹ پہنچ گئے، جہاں سیّد احمد شہید کے اہل و عیال مقیم تھے۔ اس وقت سیّد عبدالرحمٰن (خواہر زادۂ سیّد صاحب) حیدر آباد گئے ہوئے تھے۔ مردوں میں سے صرف سیّد اسماعیل (برادر زادہ سیّد صاحب) موجود تھے ؞

جماعت اور اس کا سر و سامان مولوی صاحب نے پیر کوٹ پہنچنے کے بعد جماعت اور سر و سامان کی کیفیت ان لفظوں میں بیان کی ہے :

فی الحال دہ راس اسپانِ کلاں کہ	اِس وقت ہمارے پاس دس
چہار ازآں بیش قیمت و کم یاب است	بڑے گھوڑے ہیں، جن میں سے چار بہت

و دو راس یابو ٹانگھن صورت و دو راس	قیمتی اور کم یاب ہیں۔ دو چھوٹے قد کے
یابو متوسّط الحال و یک مادیاں و سیزدہ	ٹٹو، دو درمیانے قد کے ٹٹو، ایک گھوڑی
راس اشتران و یک ناقہ نزد ایں جماعت	تیرہ اونٹ اور ایک سانڈنی ہے۔ اڑتالیس
موجود اند و دو کم پنجاہ تن از مہاجرین ہمدم	مہاجرین ساتھی اور رفیق ۔

و ہم قدم[1] ۔

ظاہر ہے کہ جو عظیم الشّان کام مولوی صاحب کے پیشِ نظر تھا، اسے انجام دینے کے لیے یہ سروسامان اور یہ رفیق کچھ حیثیت نہ رکھتے تھے، لیکن اس سلسلے میں دو حقیقتیں ہر لحظہ سامنے رہنی چاہییں: اوّل یہ محض ہراول دستہ تھا۔ مولوی صاحب کو امّید تھی کہ ہندوستان سے بھی لوگ کثیر تعداد میں پہنچیں گے اور سندھ سے بھی ہزاروں جانباز ساتھ ہو جائیں گے۔ دوم اصل معاملہ احساس ادائے فرض پر موقوف تھا۔ اگر باقی مسلمان اس احساس سے بہرہ مند نہ ہو سکے یا بہرہ مندی کا کوئی عملی ثبوت انھوں نے پیش نہ کیا تو نہ اس بنا پر مولوی صاحب یا اُن کے رفیقوں کے لیے خاموش بیٹھے رہنا مناسب تھا اور نہ ادائے فرض کی یہ صورت تھی کہ جب تک بہت بڑا لشکر تیار نہ ہو جاتا، مولوی صاحب یا اُن کے رفیق گھروں میں بیٹھے رہتے۔ اس پہلو پر "سیّد احمد شہید" میں مفصّل بحث ہو چکی ہے، جس کے اعادے کی ضرورت نہیں ۔

---

[1] اخبار مولوی سیّد نصیر الدین مخطوطہ صد ۲۲ ۔

پانچواں باب

سندھ میں سرگرمیاں

پیر کوٹ پیر کوٹ جس کا سندھی نام "پیر جوگوٹھ" تھا۔ سادات کے اُس خاندان کا مرکز چلا آتا ہے جو "پیر پگاڑو" کے لقب سے شہرت پذیر ہوا۔ یہ روہڑی سے پندرہ سولہ میل جنوب میں اور خیر پور سے کوئی آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہم "سید احمد شہید" میں بتا چکے ہیں کہ اصل پیر کوٹ دریا کی دستبرد میں آگیا۔ اس نام کا موجودہ مقام پہلے مقام سے تقریباً پانچ میل مشرق میں آباد کیا گیا ؁

سید صاحب کے زمانے میں پیر صبغت اللہ شاہ مسند نشین ارشاد و ہدایت تھے۔ انھوں نے سید صاحب سے کامل تعاون کا عہد کیا تھا اور اس کے ایفاء میں برابر سرگرم رہے۔ سید صاحب کی شہادت سے چند سال بعد وفات پائی ؁

حُروں کا نظام پیر صبغت اللہ شاہ ہی نے اپنے مریدوں میں جہاد کی تحریک جاری کی تھی۔ پیر صاحب گدی پر بیٹھے تو ان کے بعض بھائیوں نے مخالفانہ سرگرمیاں شروع کر دیں اور اس سلسلے میں پیر صاحب پر قاتلانہ حملے بھی ہوئے۔ لہٰذا ان کے مریدوں نے حفاظت کے لیے ایک جماعت بنالی، جو حُروں کے نام سے مشہور ہوئی۔ پیر صاحب نے ارادہ کر لیا کہ اس نظام کو وسعت دے کر سندھ کو اجنبیوں اور غیروں کی دست بُرد سے بچایا جائے اور ممکن ہو تو اس نظام سے وسیع تر دائرے میں کام لیا جائے۔ اس موقع پر سید صاحب بہ عزم جہاد سرحد جاتے ہوئے سندھ پہنچے تو پیر صبغت اللہ شاہ نے اشتراکِ مقاصد کی بنا پر سید صاحب سے تعاون کا فیصلہ کر لیا۔ حُروں کا نظام برابر قائم رہا اور اب تک قائم ہے۔ موجودہ پیر صاحب کے والدِ ماجد پیر صبغت اللہ شاہ ثانی نے بھی اس جماعت سے سیاسی کام لینے کی تیاریاں کی تھیں، لیکن ایسے حالات پیش آگئے کہ حکومت انگلشیہ نے انھیں

گرفتار کر لیا۔ اُن پر مقدّمہ چلایا اور موت کی سزا دے دی۔ پیر صاحب کے مرکز کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور مسند ہی کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ پاکستان بن جانے کے بعد مسند بحال ہوئی اور پیر صبغت اللہ شاہ ثانی کے فرزند ارجمند پیر سکندر شاہ، شاہ مردان ثانی کے لقب سے زینت آرائے مسند ہوئے۔

سیّد احمد شہید کے اہل و عیال سیّد احمد شہید پیر صبغت اللہ شاہ اول کے جذبۂ اسلامیّت سے اس درجہ متاثر ہوئے تھے کہ اپنے اہل و عیال کے قیام کے لیے پیر کوٹ ہی کا مقام تجویز کیا، حالانکہ نواب امیر خاں والیِ ٹونک اور امیرانِ سندھ بھی ان کے قیام کے لیے مناسب بندوبست کر دینے پر ہمہ تن آمادہ تھے اور بظاہر پیر صبغت اللہ شاہ کے مقابلے میں ان والیانِ ریاست کے وسائل بہت زیادہ تھے، لیکن سیّد صاحب نے جذبۂ اسلامیّت کو فراوانی وسائل پر ترجیح دی۔ چنانچہ آپ کے اہل و عیال واقعۂ بالاکوٹ کے بعد بھی کئی سال تک پیر کوٹ ہی میں مقیم رہے۔ مولوی سیّد نصیر الدّین نے اسی تعلّق کی بنا پر سندھ میں پیر کوٹ کو اپنی پہلی منزل قرار دیا تھا۔

پیر علی گوہر شاہ مولوی صاحب پیر کوٹ پہنچے تھے تو پیر صبغت اللہ شاہ اوّل کے فرزند پیر علی گوہر شاہ مسند نشین تھے، لیکن وہ اُس زمانے میں کچھ کی طرف دورے پر گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب ابتدائی خطوں میں سے ایک میں لکھتے ہیں کہ "پیر صاحب بہ طرف کچھ برائے دور و سیر رفتہ اند"[1]۔ دوسرے میں فرماتے ہیں کہ وہ سورت و احمد آباد کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ سندھ کے سب سے بڑے پیر یہی تھے۔ مولوی صاحب کو اُمّید تھی کہ ان کے مریدوں میں سے جانبازوں کی بہت بڑی تعداد جہاد میں ہمراہی کے لیے تیار ہو جائے گی۔

نادر الوجود کتب خانہ پیر کوٹ کا کتب خانہ ہر لحاظ سے نادر سمجھا جاتا تھا۔ خصوصاً مخطوطات کے ایسے بیش بہا ذخیرے کی مثالیں بہت کم ملتی ہے۔ افسوس کہ یہ پیر صبغت اللہ شاہ ثانی کی گرفتاری کے بعد

---

[1] اخبار مولوی سیّد نصیر الدّین مخطوطہ ص ۱۲۔

حکومت انگلشیہ کے ہاتھوں تباہ ہؤا۔ مولوی صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتب خانے میں قرآن مجید کا ایک ایسا مترجم نسخہ موجود تھا، جس کے حاشیے پر چار تفسیریں تمام و کمال درج تھیں: اوّل تفسیر نیشاپوری، دوم بیضاوی، سوم مدارک، چہارم کشاف۔ ان کے علاوہ تفسیر کشاف، تفسیر کبیر، تفسیر نیشاپوری، تفسیر مقدسی، تفسیر قرطبی، تفسیر قشیری، دُرِّ منثور وغیرہ بہت سی تفسیریں الگ الگ موجود تھیں۔ حدیث میں صحاح ستّہ کے علاوہ مشکوٰۃ، روضۃ الصالحین، سُنَنِ بیہقی؛ حدیث کی شرحوں میں عینی، فتح الباری، قسطلانی اور کرمانی۔ فقہ میں زیلعی تمام و کمال، بحر رائق، فتح القدیر، حموی شرح اشباہ و نظائر۔ یہ صرف بعض مذہبی کتابوں کا ذکر ہے، لیکن معلوم ہے کہ اس کُتب خانے میں شعر و ادب اور تاریخ کی کتابیں بھی بے شمار تھیں۔ بارہ چودہ سال پیشتر سیّد حمید الدّین (خواہر زادۂ سیّد صاحب) نے یہ کتب خانہ دیکھا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ صرف مشہور کتابوں کی پندرہ ہزار جلدیں اس میں ہیں۔ ان میں فارسی دیوانوں کے تقریباً ایک سو مطلّا نسخے تھے اور پینسٹھ جلدیں تفسیروں کی تھیں۔ "شاہنامہ" کے پانچ نسخے نہایت عمدہ تصویروں سے مزین تھے۔ احیاء العلوم اور فتوحات مکیہ کے کئی کئی نسخے موجود تھے۔

مولوی صاحب کی سرگرمیاں مولوی صاحب نے سندھ پہنچتے ہی پیش نظر مقاصد کے لیے جد و جہد شروع کر دی۔ انھیں بعض اکابر کے حالات سیّد حمید الدّین سے ٹونک میں معلوم ہو چکے تھے۔ بعض کے حالات انھوں نے سندھ پہنچ کر معلوم کر لیے اور یکے بعد دیگرے ان سب سے ملاقاتیں شروع کر دیں تاکہ آغازِ جہاد کے متعلق اپنی سوچی سمجھی ہوئی سکیم ان کے سامنے پیش کریں اور ان کی معلومات سے فائدہ اٹھا کر آخری اقدام کے باب میں فیصلہ کر لیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی مطلوب تھا کہ دریافت کریں، ان اکابر سے کس قدر مالی یا جانی امداد کی توقع ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے سیّد صاحب کے برادر زادے سیّد اسمٰعیل کو ساتھ لے کر مختلف مقامات کے دورے شروع کر دیے۔

مخدوم عبد الخالق مخدوم عبد الخالق ساکن کھڑہ کو خاص شہرت حاصل تھی۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں:

در اتباعِ شریعت و حمیّتِ اسلام
مشہور بودہ اند . . . . در حکومت میر رستم
فتواے ایشاں جاریست و سیّد حمید الدّین
براے ملاقات شاں در ٹونک وصیّت
کردہ بودند و از آوازۂ دین داریٔ شاں
ایں نیاز مند درگاہِ الٰہی بسیار براے
ملاقات شاں مشتاق بودؔ۔

شریعت کی پابندی اور اسلامی
حمیّت میں بہت مشہور ہیں۔ میر رستم
والیٔ خیرپور کی حکومت میں انھیں کا فتویٰ
جاری ہے۔ سیّد حمید الدّین نے ٹونک میں
ان سے ملاقات کے لیے تاکید فرمائی تھی
اور مخدوم کی دین داری کے شہرے کی وجہ
سے میں ملاقات کا بے حد شایق تھا۔

کھڑہ پیر کوٹ سے دس بارہ کوس تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب سیّد اسمٰعیل کے ساتھ وہاں گئے۔ مخدوم صاحب بڑی خاطر داری سے پیش آئے۔ جہاد میں شرکت کا اقرار کیا۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ ابتداءً ان سے عربی میں باتیں ہوئیں، بعد ازاں فارسی میں۔ وہیں ان کے برادر نسبتی مولوی محمد شفیع مل گئے، جو کئی حج کر چکے تھے اور شیخ عبداللہ سراج کے تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ وہ جہاد کے لیے مخدوم صاحب سے بھی زیادہ سرگرم معلوم ہوتے تھے۔ ابتدائی ملاقات ہی میں اس درجہ گھل مل گئے، گویا مدّتِ مدید سے محبّت و اخلاص کے تعلّقات جاری تھے۔

مخدوم صاحب کی ملاقات سے مولوی سیّد نصیر الدّین نے یہ اثر قبول کیا کہ جہاد شروع ہوتے ہی موصوف اپنے ہزاروں مریدوں کو ساتھ لے کر شریک ہو جائیں گے۔

سیّد ابراہیم شاہ کھڑہ سے تقریباً ایک کوس گمبٹ میں سیّد ابراہیم شاہ رہتے تھے، جو حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے۔ انھیں بھی بہت شہرت حاصل تھی۔ چنانچہ مولوی صاحب گمبٹ بھی پہنچے، لیکن دقّت یہ پیش آئی کہ سیّد ابراہیم شاہ نہ فارسی جانتے تھے نہ ہندی اور نہ

ل اخبار مولوی سیّد نصیر الدّین مخطوطہ صفحہ ۱ ۔ مخدوم عبدالخالق ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۷ء) میں سجادہ نشین ہوئے اور ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں وفات پائی۔ یہ مخدوم محمد عاقل کے صاحبزادے تھے۔ ان کے بعد خاندان میں دستور مقرر ہو گیا کہ ایک سجادہ نشین کا نام محمد عاقل ہوگا تو دوسرے کا عبدالخالق۔

عربی، صرف سندھی میں بات چیت کر سکتے تھے اور سندھی سے مولوی صاحب ناواقف تھے۔ سیّد اسمٰعیل کو سندھی میں ایسی مہارت حاصل نہ تھی کہ پیشِ نظر مسائل کے سلسلے میں ترجمانی کا حق ادا کر سکتے۔ حُسنِ اتّفاق سے ایک مقامی عالم قاضی عبدالجلیل مل گئے، جنھیں مولوی صاحب اپنے مطالب فارسی میں بتاتے اور وہ سندھی میں سیّد ابراہیم شاہ کو سمجھا دیتے۔ سیّد موصوف نے آخر میں فرمایا کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں، اس کی بجا آوری میں تامّل نہ ہو گا اور دو روپے بہ طورِ نذر مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کیے[1]۔

امر بالمعروف مولوی سیّد نصیر الدّین کی اس خصوصیّت کا ذکر ضروری ہے کہ وہ جہاں کوئی بات خلافِ سُنّت پاتے، بے توقّف دلائل کی بنا پر اس کی اصلاح میں کوشاں ہو جاتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

۱۔ میں مخدوم عبدالخالق کے پاس پہنچا تو اہلِ سندھ کی عادت کے مطابق، نیز شغل و ذکر میں انہماک کے باعث نماز میں تاخیر کرتے تھے۔ میں نے ان کے سامنے "مشکوٰۃ" کی احادیث اور "دُرِّ مختار" کی روایات پیش کیں۔ مخدوم صاحب نے میری بات مان لی اور نماز میں تاخیر ترک کر دی۔

۲۔ سیّد ابراہیم شاہ ختمِ قادریہ میں ایک تسبیح "یا شیخ عبدالقادرؒ شیئاً لِلّٰہ" کی بھی پڑھتے تھے۔ میں نے ان کے خلیفوں کو جو خاصے عالم تھے، ایسے طریق پر سمجھا دیا کہ انھوں نے اس کے ممنوع ہونے کا اقرار کر لیا۔ انھیں بھی نماز اوّل وقت میں ادا کرنے کی نصیحت کی۔

---

[1] سیّد ابراہیم شاہ کے متعلق معلوم ہوا کہ بغداد سے دو بھائی پیر سیّد محمد شاہ اور پیر سیّد احمد شاہ، میاں غلام شاہ کلھوڑا کے عہدِ حکومت میں سندھ پہنچے تھے۔ خدا جانے کس بنا پر شبہہ پیدا ہوا کہ وہ سلطنتِ عثمانیہ کے جاسوس ہیں، لہٰذا انھیں سندھ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ ملی۔ میاں غلام شاہ کی وفات کے بعد یہ دوبارہ سندھ آئے۔ مخدوم صاحب کھڑہ نے ایک بھائی کو گمبٹ میں اور دوسرے کو رانی پور میں ٹھہرایا۔ پیر محمد شاہ کے صرف ایک بیٹا تھا، عبدالرزّاق جو لاولد تھا۔ پیر احمد شاہ کے بڑے بیٹے پیر محمد صالح شاہ رانی پور شریف میں سجادہ نشین ہوئے اور دوسرے بیٹے پیر سیّد ابراہیم شاہ کو گمبٹ کی مسند ملی۔ موصوف کی وفات پر ان کے فرزند پیر شمس الدین گمبٹ میں سجادہ نشین ہوئے اور رانی پور شریف میں پیر محمد صالح شاہ کے فرزند پیر غلام محی الدین تھے۔ یہ دونوں گدّیاں آج تک قائم ہیں۔

امر بالمعروف میں اس کامیابی کے پیش نظر مولوی صاحب لکھتے ہیں :

مردمانِ اینجا بسیار سلیم الطبع اند و	یہاں کے لوگ بہت سلیم الطبع ہیں
ہرگز ہرگز مقابلۂ شریعت نمی کنند، گو کسے	اور وہ شریعت کی مخالفت قطعاً نہیں کرتے،
مخالف طبیعت ایشاں بگوید، مگر مرد انِ	اگرچہ کوئی شخص ان کی مرضی کے خلاف بات
حق گو اینجا نیستند و پیرانِ اینجا را جز اہتمام	کہے، البتہ یہاں حق گو آدمی نہیں۔ یہاں کے
گرفتنِ بیعت مطلبے دیگر نیست۔ بعضے از	پیروں کو بیعت لینے کے سوا کوئی غرض نہیں
پیراں حمیتِ اسلامی ہم دارند، مگر اہتمام در	بے شک بعض پیروں میں حمیتِ اسلامی بھی ہے،
امر بالمعروف نمی کنند[1]۔	مگر وہ امر بالمعروف کا اہتمام نہیں کرتے۔

سیّد جعفر علی اور میاں عثمان اُس وقت خیرپور کے سادات میں ایک سیّد جعفر علی تھے، جنھیں مولوی نصیر الدین نے "سعادت دستگاہ"، "ذی وجاہت" اور "ذی دیانت" بتایا ہے۔ وہ مولوی صاحب کے عزم کا حال سُن کر خیرپور سے پیرکوٹ پہنچے۔ اور بات چیت کے بعد خود جہاد میں شرکت و رفاقت پر آمادگی ظاہر کی[2]۔

ایک صاحب میاں عثمان سندھی تھے، جن کی سکونت نوشہرہ میں تھی۔ کھڑہ میں مولوی محمد شفیع نے ان کا ذکر کیا تھا۔ مولوی صاحب ان سے مدینۂ منورہ میں مل چکے تھے۔ اُن سے بھی ملاقات کی، جس کا ذکر سفرِ حیدرآباد کے سلسلے میں آئے گا اور اسی سفر میں سندھ کے دوسرے اکابر سے بھی ملاقاتوں کی تفصیل بیان ہوگی۔

ساداتِ شاہ کوٹ مولوی صاحب کے ایک مکتوب میں سادات و مشائخ شاہ کوٹ کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ بہت بڑے پیروں میں سے ہیں۔ سیّد حسن شاہ، سیّد محمد عطا شاہ، سیّد یٰسین شاہ اور دوسرے بزرگوں نے اپنی مُہریں میرے جاری کردہ دعوت نامۂ جہاد پر ثبت فرمادیں۔ یقیناً اُن کے سینوں میں دینِ احمدیؐ کی حمیت موجزن ہے اور وہ ملّتِ اسلامیہ کی ترقی کے آرزومند ہیں۔

---

[1] اخبار مولوی سیّد نصیر الدین مخطوطہ صلا۔ [2] ایضاً ایضاً ص۲۶ و ۳۰۔

ان کے علاوہ کوہستانی علاقے کے مشہور پیروں میں سے سید مومن شاہ اور سید امیر شاہ کا ذکر مولوی صاحب نے بہ طور خاص فرمایا ہے۔ حاجی شکر اللہ کو اعلام نامہ دے کر اس غرض سے حیدرآباد اور مدراس کی طرف بھیج دیا گیا کہ وہ ان علاقوں میں دعوتِ جہاد کا انتظام کر دیں۔ ان کا خط بھی آ گیا کہ جلد ہزاروں مسلمان جہاد کی غرض سے میدان میں پہنچ جائیں گے[1]۔ تفصیلات جداگانہ باب میں بیان ہوں گی۔

وقت کے اکابر حاکمانِ حیدرآباد کے بلند پایہ عہدہ داروں میں سے احمد خاں لغاری اور یوسف خاں کا ذکر آگے آئے گا۔ مولوی سید نصیر الدین نے ریاست خیرپور کے وزیر فتح محمد خاں غوری کی بہت تعریف فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:

ریاست پناہ، رفعت جایگہ معدنِ حمیّتِ
اسلامیّہ مخزنِ غیرتِ ایمانیہ سردار فتح محمد غوری کہ
مختار رتق و فتق و نظام ملکداری و لشکرکشیٔ میر
صاحبانِ خیرپور بہ قبضۂ اقتدار آں دین دار است،
بکمالِ اخلاص دلی و خلوصِ قلبی دم نصرت می زند۔
چوں در بعض معاملات کہ بہ آں دین دار اتفاق افتاده
مخلصانہ پیش آمد غالب کہ دم او با قدم باشد[2]۔

سردار فتح محمد غوری اسلامی حمیّت کی کان اور ایمانی غیرت کا خزانہ ہیں۔ وہی ریاست خیرپور کے انتظامات کے مختار ہیں۔ لشکرکشی بھی انھیں کے حکم سے ہوتی ہے۔ وہ دلی خلوص سے میری حمایت کا دم بھر رہے ہیں۔ بعض معاملات میں سابقہ پڑا تو انھوں نے اخلاص کا ثبوت دیا۔ اغلب ہے، وہ اپنے وعدۂ امداد کا عملی ثبوت پیش کریں۔

اُس زمانے میں حکومتِ قلات کی وزارت پر مختار الدولہ میر محمد حسن[3] مامور تھے۔ مولوی صاحب نے اُن سے بھی خط و کتابت شروع کر دی تھی۔ اُن کے بھی دو خط اُس مجموعے میں موجود ہیں، جس کے حوالے بار بار دیے جا رہے ہیں۔ اُن سے واضح ہوتا ہے کہ وزیر موصوف بھی جہاد میں ہر ممکن اعانت کے لیے تیار تھے اور انھوں نے میر محراب خاں والیٔ قلات کے مشورے سے یہ خط لکھے تھے۔

---

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ ص۱۴۴۔ [2] ایضاً ایضاً ص۹۴۔ [3] یہ محمد حسن اخوند فتح محمد کا بیٹا تھا، جو سید صاحب کے سفرِ ہجرت کے وقت قلات کا وزیر اعظم تھا۔ ایک سو بیس برس کی عمر ہو چکی تھی، لیکن قوا ضعف و انحطاط سے محفوظ تھے۔ سید حمید الدین خواہر زادۂ سید صاحب نے اخوند کے متعلق لکھا تھا کہ عمر و اقبال اور دیانت و تقویٰ کی یاوری کے ایسے نمونے بہت کم دیکھے گئے، جیسا کہ اخوند فتح محمد تھا۔

چھٹا باب

حیدر آباد کا سفر

سید عبدالرحمٰن کا مکتوب ہم بتا چکے ہیں کہ مولوی سید نصیر الدین بیر کوٹ پہنچے تھے تو سید عبدالرحمٰن (خواہرزادہ سید صاحب) حیدر آباد گئے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نے خیر پور سے ایک خط اُن کے نام ارسال کر دیا تھا۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ حیدر آباد میں دو نیک دل سردار ہیں، ایک احمد خاں لغاری دوسرا یوسف خاں۔ اُن سے بات چیت ہوئی تو جواب دیا کہ مولوی صاحب بیر کوٹ میں ٹھہرے رہیں ہم مناسب موقع پر حاکمانِ سندھ کے سامنے یہ معاملہ پیش کریں گے تاکہ موصوف کو بہ طریق احسن حیدر آباد بُلایا جائے۔ سید عبدالرحمٰن نے یہ بھی لکھا تھا کہ جب بُلایا جائے تو دس مسلّح سوار لے کر خشکی کے راستے آئیں۔ مولوی صاحب یہ خط پہنچنے سے قبل کشتی کے ذریعے سے حیدر آباد جانے کا انتظام کر چکے تھے اور کشتی والے کو بیعانہ بھی دے چکے تھے[1]۔

قیامِ حیدر آباد اور ملاقات افسوس کہ مولوی صاحب کے حیدر آباد جانے اور حاکمانِ سندھ سے ملاقات کرنے کی تفصیل اس مکتوب ذخیرے میں نہ مل سکی جو اب تک دست یاب ہو سکا، لیکن قرائن یہی ہیں کہ وہ کشتی کے ذریعے سے حیدر آباد گئے۔ وہاں کچھ مدّت مقیم رہے۔ اغلب ہے، حاکمانِ سندھ نے کچھ تحائف اور روپے پیش کیے ہوں، تاہم جہاد میں سرگرم اعانت کی امید پوری نہ ہوئی۔ اگر وہ لوگ اعانت کے لیے تیار ہو جاتے تو یقیناً اس کا کوئی عملی ثبوت سامنے آ جاتا۔ ایک خط میں صرف اتنا مرقوم ہے:

الحال کہ از ملاقاتِ میر صاحبانِ حیدر آباد	اب سندھ کے میروں سے ملاقات ہو چکی

---

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ صفحہ ۱۲۔

فراغ دست دادہ۔ اگر فضل الٰہی سبحانہٗ	میں خدا کے فضل سے کل یا پرسوں خشکی کے
شاملِ حال است، فردا یا پس فردا از	راستے حیدرآباد سے روانہ ہو کر پیر کوٹ
حیدرآباد براہِ خشکی بطرفِ پیرکوٹ روانہ	پہنچ جاؤں گا ٭
خواہم شد[1]	

جس زمانے میں سید صاحب حیدرآباد سے گزرے تھے، حاکمانِ سندھ کے لیے حالات بدرجہا سازگار تھے، لیکن وہ اُس زمانے میں بھی ہمت و عزیمت کا تقاضا پورا نہ کر سکے۔ آٹھ دس سال گزر جانے کے بعد حالات خاصے ناسازگار ہو چکے تھے۔ اُس وقت اُن سے جانبازی کے کسی کارنامے کی کیا توقع ہو سکتی تھی؛ انگریزوں نے اُنھیں معاہدوں کی زنجیروں میں بے طرح جکڑ لیا تھا۔ رنجیت سنگھ آہستہ آہستہ سندھ کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اگر حاکمانِ سندھ جنگ کے لیے تیار ہو جاتے تو یقین تھا کہ سندھ کے پیر بھی اُن کا ساتھ دیتے اور مجاہدین کی اعانت سے کم از کم سکھوں کو شکست دینا مشکل نہ تھا۔ اس کے بعد انگریزی اقتدار کی زنجیریں بھی ڈھیلی ہو جاتیں، لیکن یہ جانبازی اور جانفشانی کا کام تھا اور حاکمانِ سندھ عزت مندانہ زندگی کے اس جوہر سے بالکل بے حس تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مزید چند سال میں اُن کی حکومت کا نقش حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا اور ہندوستان کے مسلمان حاکموں کی بے عزمی کے باعث اسلامی اقتدار کی شکست و ریخت کا جو ماتم نامہ تیار ہو رہا تھا، اس میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا ٭

غرض ملاقات کی تفصیلات تو پیشِ نظر نہیں، لیکن مولوی صاحب نے حیدرآباد سے واپسی کے سفر کی مختصر سی سرگزشت ایک مکتوب میں بیان فرما دی ہے۔ اُسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

حیدرآباد سے مٹاری مولوی صاحب حیدرآباد سے چلے تو پہلی منزل مٹاری میں ہوئی، جو سندھ میں سادات کی ایک مشہور مسندِ ہدایت و ارشاد ہے۔ مولوی سید عبدالکریم مسند پر فائز تھے جنھیں تمام سادات خاص عزت و تکریم کا مستحق سمجھتے تھے۔ مولوی سید نصیرالدین نے جمعہ کی نماز مسجد میں ادا کی۔ وہیں میاں لطف اللہ سندھی سے ملاقات ہو گئی، جو مدینہ منورہ کے راستے میں مولوی صاحب سے

[1] اخبار مولوی سید نصیرالدین مخطوط صفحہ ٭

مل چکے تھے۔ انھوں نے فوراً میٹھے چاول تیار کرا لیے۔ مولوی صاحب اور ان کے بارہ ساتھیوں نے میاں لطف اللہ ہی کے ہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ شام کی دعوت مولوی سیّد عبدالکریم کے ہاں تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر اصل مقصد کے متعلق بات چیت کی۔ مولوی سیّد عبدالکریم اور میاں لطف اللہ دونوں نے کہا کہ مزاریوں کے علاقے میں بیٹھنا بہت مناسب ہے:

اگر امسال جمعیت گردِ شما شد، ایں جانباں	اگر اس سال آپ کے پاس معقول
مع اتباعِ خویش حاضر خواہیم شد۔ سالِ آئندہ	جمعیت فراہم ہو گئی تو ہم بھی اپنے مریدوں
ارادۂ مدینۂ منورہ داریم[1]۔	کو لے کر حاضر ہو جائیں گے۔ اگلے سال ہم
	مدینۂ منورہ جانے کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں۔

ہالہ مٹاری سے روانہ ہو کر مولوی صاحب ہالہ پہنچے، جو مخدوم نوح کی درگاہ کے باعث سندھ میں بہت مقدس مقام مانا جاتا تھا۔ مولوی سیّد نصیر الدین نے درگاہ کے متولی مخدوم سے بھی ملاقات کی اور کہا کہ آپ کو بھی جہاد میں شریک ہونا چاہیے۔ انھوں نے فرمایا:

اگر پیرانِ سندھ ہمراہِ شما خواہند رفت،	اگر سندھ کے پیر آپ کا ساتھ دینے کے
ما نیز حاضر ہستیم[2]۔	لیے تیار ہو گئے تو ہمیں بھی حاضری میں تامل نہ ہو گا۔

مرقعِ عبرت دیکھیے، عزت کی زندگی کے متعلق مسلمانوں کی بے پروائی بلکہ بے حسی کس درجہ افسوس ناک صورت اختیار کر چکی تھی۔ یہ لوگ بڑی بڑی گدیوں کے مالک تھے اور وہ گدیاں صرف خدمتِ حق کی برکت سے بنی تھیں۔ خدمتِ حق ہی ان کا اصل وظیفہ تھا، تاہم یہ لوگ بھی فریضۂ جہاد کو اُسی صورت میں ادا کرنے پر آمادہ تھے کہ دوسرے آمادہ ہو جائیں۔ مولوی سیّد عبدالکریم اور میاں لطف اللہ نے بھی اپنی حاضری کو معقول جماعت کی فراہمی سے مشروط کیا۔ یہی شرط مخدوم ہالہ نے پیش کی۔ گویا جمعیت کی فراہمی تنہا مولوی سیّد نصیر الدین کے ذمے تھی اور ان لوگوں کا کام صرف یہ تھا کہ ہزاروں آدمی میدانِ جنگ میں کھڑے دیکھیں

---

[1] اخبار مولوی سیّد نصیر الدین مخطوطہ صفحہ ۳۵۔

[2] ایضاً۔

تو یہ بھی جا کھڑے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان سبقت و عزیمت کی روح سے محروم ہو چکے تھے۔ یہی اُن کے زوال کا پیش خیمہ تھا۔ افسوس کہ اس عبرت انگیز صورتِ حال پر آنسو بہانے والی آنکھیں بھی بہت ہی کم تھیں۔ متاعِ عزّت کا لُٹنا یقیناً رنج افزا تھا، لیکن اس سے بدرجہا زیادہ رنج یہ تھا کہ لُٹنے والوں کے دل سے نقصان کا احساس زائل ہو گیا۔ اقبال کیا خوب کہہ گئے ہیں، رحمہ اللہ تعالیٰ:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

کوٹ تاج محمد اور نوشہرو | مولوی صاحب نے ہالہ کے بعد کوٹ تاج محمد اور نوشہرو کا ذکر کیا ہے۔ بیچ میں یقیناً بعض منزلیں چھوڑ دیں، غالباً اس لیے کہ وہاں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ کوٹ تاج محمد میں مولوی جان محمد احمد نے رفاقت کا عہد کیا۔ نوشہرو میں وہ پیر شہاب الدین کی گدّی کے سجّادہ نشین صاحب سے ملے، جن کا نام عبدالحی اور لقب امیر عمر تھا۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ صاحب بڑے عابد، زاہد اور عالم ہیں۔ میری آمد کا سُن کر استقبال کے لیے ایک کوس باہر نکل آئے، لیکن ہم دوسرے راستے سے اُن کے مکان پر جا پہنچا۔ انھوں نے ہمارے ٹھہرانے کا انتظام بہ خوبی کر رکھا تھا۔ بڑے حُسنِ اخلاق سے پیش آئے ۔

سُوءِ اتّفاق سے مولوی صاحب کے چند ساتھی سفر کی تکان اور اختلافِ آب و ہوا کے باعث بیمار ہو گئے۔ ابو احمد علی اونٹ سے گر گئے تھے اور ران کا شانہ اُتر گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے درست کر کے لکڑ لگا دی گئی، لیکن پھر اُتر گیا۔ اس وجہ سے انھیں بخار آ گیا اور جوڑوں میں درد ہونے لگا۔ مولوی صاحب تین روز نوشہرو میں ٹھہرے۔ دو بیمار قدرے روبہ صحت ہوئے تو میاں عبدالحی سجّادہ نشین نے ان کی سواری کے لیے کجاوے والے اونٹ کا بندوبست کر دیا۔ میاں ابو احمد علی اور میاں عبدالرحیم کو تا صحت نوشہرو ہی میں چھوڑنا پڑا۔ میر نوازش علی کو ان کی تیمارداری کے لیے مقرّر کر دیا گیا ۔

مزید ملاقاتیں | مولوی صاحب نوشہرو سے روانہ ہوئے تو میاں عثمان سندھی سے جا ملے۔ انھوں نے ایک صاحب سیّد محمد نواز کا پتا دیا اور کہا کہ اُن سے ضرور ملنا چاہیے۔ چنانچہ میاں عثمان کو ساتھ لے کر

مولوی صاحب آٹھ کوس کا چکر کاٹتے ہوئے سیّد محمد نواز سے ملے۔ پھر منگور جہ پہنچے اور سیّد ناصر علی سے ملاقات کی جو سندھ کے بلند پایہ مشائخ میں سے تھے۔ وہیں پیرزادہ درازہ والا سے ملاقات ہوئی اور کھڑہ میں مخدوم عبدالخالق کے پاس جا ٹھہرے۔ سیّد محمد نواز، سیّد ناصر علی اور پیرزادہ درازہ والا کی ملاقاتوں کا مفصّل حال مرقوم نہیں۔ مولوی صاحب نے صرف اتنا لکھا ہے:

حاصل آنکہ زبانی ہمہ مشائخ و علماء اقرارِ شمول در امرِ معلوم کردند[1]

غرض سندھ کے تمام علماء اور مشائخ نے امرِ معلوم یعنی جہاد میں شامل ہونے کا زبانی اقرار کیا۔

خوش گوار توقعات اس سفر میں منگور جہ پہنچ کر مولوی صاحب خود بھی بیمار ہو گئے۔ پیر کوٹ پہنچے تو بیماری بڑھ گئی۔ ناچار مسہل لینا پڑا۔

اپنے کچھ ساتھیوں کو گھوڑے اور اونٹ دے کر شکار پور بھیج دیا تھا، غالباً اس لیے کہ وہاں جانوروں کی چرائی کا انتظام اچھا تھا۔

ایک مکتوب میں اپنی سرگرم کوششوں کے نتائج کا خلاصہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

بفضلِ ایزدی جمیع علماء و مشائخ ملک سندھ در امر ما نحن فیہ شریکِ فقیر اند و عہد ہا کردہ و اقرار نامہ ہا نوشتہ دادہ اند۔ عوام و خواصِ ایں ملک چہ علماء و مشائخ و چہ دیگراں قبول و تسلیم بسیار می دانند۔ انشاء اللہ تعالیٰ دریں چند روز ہمہ تابعِ حکمِ غازیاں خواہند شد و سلسلہ تحصیلِ صدقات ہم از دستِ ایشاں دریں ملک کنانیدہ می شود و وعظ و نصائح و دعوتِ ہجرت و جہاد بہ زبانِ سندھی از ایشاں حتی الامکان کنانیدہ می شود۔ آئندہ باید دید کہ تقدیرِ ایزدی چہ ظہور مے فرماید[2]

سندھ کے عالم اور پیر جہاد کے باب میں میرے شریک ہیں انھوں نے اقرار نامے لکھ کر دے دیے ہیں۔ ملک کے عوام و خواص علما، و مشائخ ہوں خواہ دوسرے لوگ قبولِ دعوت کا اظہار بڑی سرگرمی سے کر رہے ہیں۔ خدا نے چاہا تو چند روز میں وہ سب غازیوں کے ساتھ ہو جائیں گے۔ اس ملک میں صدقات وصول کرنے کا کام بھی انھیں کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔ سندھی زبان میں وعظ و نصیحت اور دعوتِ ہجرت و جہاد کا انتظام بھی جس حد تک ممکن ہے وہی کر رہے ہیں۔ آئندہ دیکھیے، خدا کی تقدیر کس رنگ میں ظاہر ہوتی ہے۔

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ ص ۴۸۔ [2] ایضاً ص ۱۴۰، ۱۴۷۔

ساتواں باب

دعوتِ عام کا اہتمام

سید صاحب کے اکابر رفقاء مولوی سید نصیر الدین ایک طرف سندھ میں بیٹھے ہوئے مختلف اصحاب کو اعانت کے لیے تیار کر رہے تھے، دوسری طرف ہندوستان میں پے در پے دعوتِ جہاد کے لیے اعلام نامے بھیج رہے تھے۔ سید صاحب نے اپنی زندگی میں جا بجا دعوتِ عام کا جو انتظام فرما دیا تھا، وہ بھی بدستور جاری تھا۔ خصوصاً مولانا سید محمد علی رامپوری اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی ادائے فرائض میں بڑی سرگرمی دکھا رہے تھے۔ یقین ہے کہ یہی کیفیت سید صاحب کے مقرر فرمائے ہوئے دوسرے داعیوں کی ہوگی، اگرچہ ان کی سرگرمیوں کے تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے اور مولوی سید نصیر الدین نے اپنے خطوں میں صرف مولانا سید محمد علی اور مولانا ولایت علی کا ذکر کیا ہے:

مجاہدین کے قافلے ایک خط میں فرماتے ہیں: سید الفت حسین، مولانا محمد علی اور مولانا ولایت علی سے رخصت ہو کر کلکتہ سے آخر ذی قعدہ میں یہاں پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ تقریباً بیس آدمی ہیں۔ وہ ہتھیار اور گھوڑے بھی ساتھ لائے ہیں[1]۔

ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں:

مولوی عبدالرحمٰن صاحب با پنجاہ کس	مولوی عبدالرحمٰن صاحب پچاس
مجاہدین و نقدی و سلاح بموجب ارشاد	مجاہدوں کے ساتھ نقدی اور ہتھیار لے کر
مولوی ولایت علی صاحب از بنگالہ وارد شدند	مولوی ولایت علی کے ارشاد کے مطابق بنگال
... و مولوی محمود علی صاحب نیز بجماعۂ کثیر	سے آ گئے اور مولوی محمود علی صاحب بھی بڑی جماعت

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ ص ۹۴۔

شامل لشکر گردیدند - علیٰ ہذاالقیاس قوافلِ	کے ساتھ لشکر میں شامل ہو گئے - اسی طرح
بسیار بہ موجب ارشاد مولوی سیّد محمد علی صاحب	مولوی سیّد محمد علی کے ارشاد کے مطابق بہت سے
حاضر حضور مجاہداں می شوند[1]	قافلے مجاہدین کے پاس پہنچ رہے ہیں ۔

ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی عبدالرحمٰن اور مولوی محمود علی کے علاوہ ایک صاحب مولوی عبداللہ بھی مجاہدین میں شریک تھے۔ شاہ اسحٰق نے اطلاع دی کہ مولوی سیّد احمد شاہ کرنال و سہارن پور سے پچاس مجاہدین کو لے کر دہلی پہنچے تھے اور سندھ روانہ ہو گئے[2] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی کے ایک مقالے سے واضح ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے پاس زیادہ تر مجاہدین بنگال اور ہندوستان یعنی بہار اور یو پی سے پہنچے[3]

قابلِ توجّہ نکتہ سیّد صاحب کی جاری کی ہوئی تحریک کے سلسلے میں یہ نکتہ خاص طور پر قابلِ توجّہ ہے کہ اُس وقت ہندوستان کی وسیع سرزمین میں احیاءِ اسلام و اسلامیّت کے لیے جانبازی و جانفشانی صرف اُسی گروہ میں محدود رہ گئی تھی، جو سیّد صاحب کی آغوشِ فیض میں تربیت پا چکا تھا۔ ہندوستان میں اُس وقت بھی کروڑوں مسلمان موجود تھے۔ ملکوں اور ریاستوں کے والی بھی، بڑے بڑے امیر اور جاگیر دار بھی، علماء اور مشائخ بھی، لیکن اسلامی حمیّت کے سلسلے میں ایثار و قربانی کی تڑپ صرف سیّد صاحب کے رفقا میں موجزن تھی۔ وہ جہاں بھی تھے اور جس حال میں بھی تھے، صرف اس نصب العین کے حصول کو تقویت پہنچانے کے لیے وقف تھے، جس کا علم سیّد صاحب نے بلند کیا تھا۔ سوال یہ نہیں کہ اُن اصحاب کی قربانیوں کا نتیجہ حسبِ مراد نکلا یا نہ نکلا، سوال صرف یہ ہے کہ جس مقصد کو وہ حق سمجھتے تھے، جو نصب العین اُن کے نزدیک اسلامیّت کی روح اور غیرتِ ایمانی کی جان تھا، اُس کے لیے جو کچھ اُن کے امکان میں تھا، وہ انھوں نے کیا یا نہ کیا۔ تاریخ کی شہادت اس بارے میں ایک اور صرف ایک ہے۔ وہ سخت سے سخت اور نازک سے نازک حالات میں بھی پے در پے احیاءِ اسلامیّت کے لیے قربانیاں کرتے رہے اور اس امر سے کوئی سروکار نہ رکھا کہ کسی اسلامی

---

[1] اخبار مولوی رشید نصیر الدین مخطوطہ صفحہ ۱۲۴ ۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۴۵ ۔ [3] جلد چہاردہم صفحہ ۳۵۵ ۔

حلقے کی زبان پر تحسین کا کوئی کلمہ جاری ہوتا ہے یا نہیں، کیونکہ وہ اپنی ان قربانیوں کے لیے صرف خدائے بزرگ و برتر سے اجر کے آرزومند تھے۔ ان کے سازِ وجود کا ترانہ صرف ایک تھا یعنی اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ۔ ہماری اسلامیت کا شیوہ ان کے تعلق میں کیا رہا؟ یہ کہ کبھی اُن پر فسادِ عقائد کے الزامات عائد کر دیے اور کبھی اُن کے اسلام ہی کو محلِّ نظر قرار دے دیا۔ ہم گزشتہ سو سال میں جن بدبختیوں کا شکار رہے، کیا وہ ہمارے انھیں افسوس ناک اعمال کا طبعی نتیجہ نہ تھیں؟

مولوی صاحب کے مخاطب مولوی صاحب نے جو اعلام نامے بھیجے، وہ تمام مسلمانوں کے نام تھے، لیکن ایک مکتوب میں انھوں نے اپنے خاص مخاطبین کے نام بھی درج کر دیے ہیں، جو اس غرض سے یہاں پیش کیے جاتے ہیں کہ اوّل مولوی صاحب کے دائرۂ دعوت کی وسعت کا اندازہ ہو جائے، دوسرے یہ معلوم ہو جائے کہ اُس تاریک دور میں کون کون سے اصحاب دعوتِ حق کے خیر مقدم میں پیش پیش تھے:

۱۔ مولوی محمد سراج الدین اور دوسرے مخلص دیندار ساکنانِ اجمیر

۲۔ مولوی خلیل الرحمٰن، ان کے فرزند اور بھائی، مولوی بہادر علی، سیّد حمید الدین (خواہر زادہ سیّد صاحب)، سیّد محمد یعقوب (برادر زادہ سیّد صاحب)، سیّد زین العابدین، سیّد ابو القاسم (ابنا سیّد احمد علی خواہر زادۂ سیّد صاحب) اور دوسرے دین دار ساکنانِ ٹونک

۳۔ مولانا شاہ اسحٰق، مولانا شاہ یعقوب، مولوی کرامت علی، مولوی محبوب علی[1]، مولوی نصیر الدین[2]، مولوی مظفر حسین، مولوی شیخ محمد، حاجی محمد، حاجی مزمّل، مولوی حافظ محمد حسین، مولوی کرم اللہ، مولوی الٰہی بخش، مولوی جمال الدین، حافظ عبدالرحمٰن، مولوی محمد وزیر علی، منشی ایزد بخش، امیر الدین، امین الدین، حافظ عبدالرزّاق، مولوی عبداللہ، مولوی علی محمد، مولوی بہاء الدین، مولوی عبدالخالق، مولوی امام علی، حافظ اکرام الدین، مولوی شاہ علی، مولوی عبداللہ خاں

---

[1] یہ وہی مولوی محبوب علی ہیں جو سیّد صاحب کے زمانے میں سرحد پہنچ کر بعض وساوس کی بنا پر واپس آ گئے تھے۔

[2] ان کے نام شاہ اسماعیل شہید کا ایک طویل مکتوب موجود ہے جس میں مسئلہ امامت کے مختلف پہلو واضح کیے گئے ہیں۔

علویؒ[۱]، بشارت خاں، مولوی عبدالمجید، قاری احمد زماں، حافظ چھجو بیگ، حافظ احمد خاں، عظیم اللہ خاں، میرزا ایوب بیگ، میاں احمد، میاں نجابت علی، قاضی عبدالرحمٰن عرب سرائے والے، میاں غلام محی الدین، حافظ ولی محمد، میاں رکن الدین، میاں الٰہی بخش آئینہ ساز، مولوی امداد علی، مولوی نذیر حسین[۲] نیز دوسرے علماء، طلبہ اور صلحا ساکنانِ دہلی و نواح ٭

۴ - مولوی بزرگ علی[۳]، مولوی عنایت احمد[۴]، مولوی محمد متقی اور دوسرے علماء و صلحا ساکنانِ علی گڑھ ٭

۵ - قاضی حیات بخش[۵]، مولوی مردان علی، شیخ محمد تقی، داروغہ راحم ساکنانِ میرٹھ ٭

۶ - مولوی وحید الدین، مولوی خدا بخش، مولوی تہوّر علی، مولوی خیر الدین[۶]، مولوی منیر الدین ساکنانِ پھلت نگینہ وغیرہ ٭

۷ - مولوی رمضان علی، مولوی امانت علی، مولوی کریم اللہ، شیخ رحمان بخش، صوفی صاحب، شاہ غلام علی، میر ہدٰی اور دوسرے اکابر ساکنانِ امروہہ ٭

---

[۱] دہلی کے آخری دور کے مشہور عالم، طبیب اور شاعر۔ اصل وطن غالباً خورجہ تھا۔ زندگی کا بڑا حصّہ دہلی میں گزارا۔ پھر شمس آباد میں ایک رئیس کے پاس ملازم ہو گئے تھے۔ وہیں ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں فوت ہوئے ٭

[۲] شیخ الکل میاں سیّد نذیر حسین مرحوم محدّث دہلوی ٭

[۳] علی گڑھ کی جامع مسجد کے مدرسے کے استاد، معقول و منقول کے بہت بڑے عالم تھے ٭

[۴] مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی جنھوں نے شاہ اسحاق سے حدیث کی سند لی پھر مولوی بزرگ علی سے فیض حاصل کیا اور اور انھیں کے مدرسے میں ملازم ہو گئے تھے۔ آخر کار آگرہ میں صدر اعلیٰ بن گئے تھے۔ غدر کے سلسلے میں ان پر مقدمہ چلا اور حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ملی۔ وہیں انھوں نے تاریخ حبیب الٰہ لکھی تھی۔ قید سے رہا ہو کر آئے اور حج کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں جہاز چٹان سے ٹکرا کر غرق ہو گیا اور مولانا سمندر کی نذر ہوئے۔ تاریخ وفات ۷، اشوال ۱۲۷۹ھ (۷- اپریل ۱۸۶۳ء) ہے ٭

[۵] قاضی احمد اللہ میرٹھی شہید بالاکوٹ کے والد ٭

[۶] ان سے غالباً خیر الدین شیرکوٹی مراد ہیں ٭

۸ - حافظ عبدالرحیم، میاں عثمان، میاں جی خلیفہ ساکنانِ مرادآباد ۔

۹ - حاجی صبغت اللہ، شیخ محمد حسین اور دوسرے دین دار ساکنانِ گڑھ مکتیشر ۔

۱۰ - مولوی حیدر علی، مولوی نورالاسلام، اخوند زعفران، اکبر علی خاں، شاہ دل خاں، حافظ احمد علی، مرتضیٰ خاں، اخوند امام الدین، قاری صاحب اور دوسرے اصحاب ساکنانِ رام پور ۔

۱۱ - میرزا احسن علی[1]، مولوی خرم علی[2]، مولوی محمود علی، مولوی الٰہی بخش، سید اولاد حسن[3]، مولوی مکارم خاں، مولوی سخاوت علی[4]، مولوی کرامت علی[5] ساکنانِ کان پور، فرخ آباد، باندہ، بریلی، قنوج، جون پور وغیرہ ۔

۱۲ - مولوی احمد اللہ، مولوی رحمت اللہ، حافظ صدیق اور دوسرے علما و صلحا ساکنانِ بنارس ۔

۱۳ - شیخ فرزند علی، مولوی محمد نبیح اور دوسرے علما ساکنانِ غازی پور، سہسرام، آرہ و منیر ۔

۱۴ - شاہ محمد حسین، مولوی ولایت علی، مولوی الٰہی بخش اور دوسرے خلفاء سید صاحب ساکنانِ عظیم آباد، مظفر پور، چھپرہ، مونگیر وغیرہ ۔

۱۵ - مولوی محمد علی، مولوی امام الدین، مولوی مراد، قاضی عبدالباری، صوفی نور محمد، منشی غلام رحمٰن، مولوی حراست اللہ، مولوی عبداللہ، مستری حبیب علی اور دوسرے علماء و صلحا، کلکتہ و نواح ۔

یہ کل ایک سو چھ اصحاب ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سید صاحب کے زمانے سے دعوت کا کتنا عمدہ انتظام ہو گیا تھا ۔

سید صاحب کی اہلیہ کا جذبہ ایثار | سیدہ ام اسمٰعیل (اہلیۂ سید صاحب) سید صاحب کے زمانے میں بھی جماعتِ مجاہدین کی ہر ممکن خدمت انجام دیتی رہیں۔ ایک موقع پر انھوں نے دس ہزار سید صاحب کے پاس بھیج دی تھی، حالانکہ خود ان کے گزارے کا کوئی مستقل انتظام نہ تھا۔ مولوی سید نصیر الدین لکھتے ہیں کہ ہم لوگ پیر کوٹ پہنچے تو سیدۂ محترمہ نے ہماری خبر گیری میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا۔

---

[1] میرزا احسن علی محدث ۔ [2] مولوی خرم علی بلہوری ۔ [3] سید اولاد حسن قنوجی (نواب صدیق حسن خاں کے والد) ۔

[4] مولوی سخاوت علی جون پوری ۔ [5] مولوی کرامت علی جون پوری ۔

ایک موقع پر مولوی صاحب سے فرمایا :

آنچہ از ماست، برائے ایں کار است و خجستہ اطوار سعادت آثار محمد اسمٰعیل معاضد و مساعد تست و تمامی اتباعِ خود را رو بروے ایں نیاز مند درگاہِ الٰہی سبحانہٗ کردند کہ ایں جماعۂ مخلصین کہ محض حسبۃً للہ از وقت امام ہمام بر رفاقت و اطاعتِ ما بودہ اند و از رفقاء اصفیاء تواند۔ بہر چہ گوئی بسمیع اند ، بہر چہ فرمائی ، مطیع[1]۔

ہمارے پاس جو کچھ ہے، جہاد کے کارِ خیر کے لیے وقف ہے۔ محمد اسمٰعیل (سیدہ کا فرزند ارجمند) آپ کا حامی اور مددگار ہوگا۔ پھر اپنے تمام خادموں کو میرے سامنے بُلا کر فرمایا : یہ مخلص لوگ سیّد صاحب کے زمانے سے محض خدا کے لیے ہمارے ساتھ چلے آتے ہیں۔ یہ سب آپ کے ساتھی ہیں۔ جو کچھ فرمائیں گے، اُسے سُنیں گے، جو حکم دیں گے، اس کی تعمیل کریں گے۔

اعلام نامہ پھر سیّدہ نے عام مسلمانوں کے لیے ایک مفصّل اعلام نامہ مرتّب کیا، جس کا مضمون یہ تھا کہ واقعۂ بالاکوٹ کے بعد کاروبارِ جہاد پہلی صورت میں قائم نہ رہا۔ مولوی سیّد نصیر الدّین نے عالی ہمتی سے کام لے کر پھر اس کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ میں عورت ذات ہوں اور یہ کام انجام نہیں دے سکتی۔ میرا بچہ محمد اسمٰعیل کم سن ہے اور اِس بارِ گراں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ہم لوگ صرف دعا کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ میدانِ عمل میں آئیں۔ جن کے پاس زادِ راہ، سواری اور ضرورت کی دوسری چیزیں موجود ہوں، وہ جلد پہنچیں۔ جو خود نہ آسکیں، وہ دوسروں کی امداد کریں۔ افسوس کہ مسلمان تن آسانی کے باعث اپنی عمریں اُس سرزمین میں ضائع کر رہے ہیں، جس پر غیر مسلم مسلّط ہیں اور باہم اتّحاد و اتّفاق سے وہ قدم نہیں اُٹھاتے، جس پر مسلمانوں کی شوکت کا انحصار ہے :

اگر ایمان دارانِ ہندوستان توفیق یافتہ بہ قدر طاقت و استطاعتِ خود از یک

اگر ہندوستان کے ایمان داروں کو خدا توفیق دے اور وہ استطاعت کے مطابق ایک

[1] اخبار مولوی سیّد نصیر الدّین مخطوطہ صہ ۷۹۔

فلوس تا لک روپیہ امدادِ غازیان کنند بعید از اخلاص ہندی و حمیّتِ اسلامیِ ایشان نہ خواہد بود و بہ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ کار فرمودہ غریب بہ امیر و غنی بہ فقیر و زن بہ شوہر و شوہر بہ زن و ہمسایہ بہ ہمسایہ و دوست بہ دوست ترغیب ایں امداد و نصرتِ دین کنند از غیرتِ ایمانیِ ایشاں دُور نہ خواہد بود[1]

پیسے سے ایک لاکھ تک ان غازیوں کی امداد کریں تو یہ امر اُن کے اخلاص اور اسلامی حمیّت سے بعید نہ ہوگا۔ خدا فرماتا ہے: ایمان دار لوگ وہ ہیں، جنھوں نے اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو راستی اور صبر کی تاکید کی۔ اس فرمان کے مطابق غریب امیر کو، غنی فقیر کو، بیوی شوہر کو، شوہر بیوی کو، پڑوسی پڑوسی کو، دوست دوست کو اس امداد کی ترغیب دے، اور دین کی نصرت کرے تو یہ امر ایمانی غیرت سے دُور نہ ہوگا +

حالات کی سازگاری

اُس وقت علاقۂ سرحد میں سکھوں کی حکومت کے خلاف خاصا ہنگامہ برپا تھا۔ ایک طرف امیر دوست محمد خاں پشاور کی بازیافت کے لیے سرگرم کوششیں کر رہا تھا، دوسری طرف خوانینِ سرحد میں سے مختلف اصحاب امیرِ موصوف کی ہر ممکن امداد کے لیے میدان میں آچکے تھے، ان میں سے فتح خاں پنجتاری بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ سیدہ اُمِّ اسمٰعیل اپنے اعلام نامے میں ان واقعات کا ذکر کر کے فرماتی ہیں:

کفّار سکھ بہ آں سُو مشغول و مصروف اگر خواستۂ حضرت قادر توانا جلّ جلالہٗ است دریں وقت کارے خواہد شد[2]

سکھ پشاور کی طرف مشغول و مصروف ہیں (دوسری طرف بھاری لشکر نہیں لا سکتے) اگر خدائے قادر و توانا کا فضل شاملِ حال ہو تو اِس موقع پر کچھ کام ہو سکے گا +

[1] اخبار مولوی سیّد نصیر الدین مخطوطہ صفحہ ۹۸-۱۰۷ + [2] ایضاً ایضاً صفحہ ۱۰۷ +

سیّد عبدالرحمٰن اور دوسرے اصحاب | سیّد عبدالرحمٰن کاروبارِ جہاد میں ہمہ تن شریک تھے متعدد اعلام ناموں پر اُن کے اور سیّد اسمٰعیل کے دستخط ثبت ہیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ شیخ ولی محمد پھلتی بھی سیّد صاحب کی چترالی اہلیہ کو لے کر سندھ پہنچ گئے تھے۔ وہ بھی تمام سرگرمیوں میں شریک رہے۔ بعض دعوت ناموں اور خطوں پر وہ بھی دستخط فرماتے رہے۔

غرض ان خدامست اصحاب نے جہاد کو کامیاب بنانے کے لیے سعی و کوشش کا کوئی پہلو اٹھا نہ رکھا اور جو کچھ ان کی استطاعت میں تھا، اسے دلی خلوص اور تڑپ سے پورا کر دیا۔

آٹھواں باب

دکن میں دعوت و تبلیغ

سید محمد علی اور مولوی ولایت علی ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سید صاحب نے ابتدا میں سید محمد علی رام پوری کو دعوت و تبلیغ کی غرض سے حیدر آباد بھیجا تھا۔ پھر مولوی ولایت علی وہاں متعین ہو گئے اور مولوی محمد علی کو مدراس جانے کا حکم مل گیا۔ مولوی ولایت علی حیدر آباد سے روانہ ہوئے تو دس ہزار کے قریب مسلمان اُن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو چکے تھے۔ ان میں بہت سے اکابر بھی شامل تھے۔ مثلاً:

۱۔ مولوی محمد آصف جو مولوی محمد رفیع الدین مغفور کے داماد تھے۔ ان کی کوششوں سے بعد ازاں ایک لاکھ کے قریب مسلمان داخلِ بیعت ہوئے۔ ان میں امیر کبیر نواب شمس الامراء بھی شامل تھے۔

۲۔ سید محمد عباس۔ یہ مولوی محمد آصف کے بھانجے اور ناصر الدولہ نظام کے بھائی مبارز الدولہ کے استاد رہے تھے۔

۳۔ میر فضل اللہ جو خود ناصر الدولہ کے استاد تھے۔

ان کے علاوہ مولوی سید محمد مغربی، مولوی محمد عباس، مولوی پیر محمد اور مولوی سید قاسم کے نام بھی مذکور ہیں۔

دعوت کے خاص مرکز حلقۂ ارادت کی توسیع کے ساتھ جا بجا مرکز قائم ہو گئے تھے، جن کا انتظام مختلف بزرگوں نے سنبھال لیا تھا۔ مثلاً:

۱۔ مولوی محمد ولی الدین۔ یہ صاحب مسٹر پامر انگریز تاجر کے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ ان کا مکان عیسیٰ میاں کے بازار میں تھا۔

۲۔ مولوی محمد سلیم جو مبارز الدولہ کی سرکار میں ملازم تھے۔ ان کا مکان کوٹلہ عالی جاہ میں تھا۔

۳۔ مولوی محمد کرامت علی: یہ راجا چندو لعل کی سرکار میں ملازم تھے اور ان کا مکان صفدر نواز جنگ کی مسجد کے قریب شکر گنج میں تھا۔

۴۔ مولوی محمد عماد الدین: یہ مولوی محمد آصف کے فرزند تھے۔ مبارز الدولہ کی سرکار میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ان کا مکان بازار سلیمان جاہ میں تھا۔

۵۔ مولوی محمد فرید الدین: یہ بھی مبارز الدولہ کی سرکار میں ملازم تھے اور ان کا مکان کوٹلہ عالی جاہ میں سید محمد عباس کے مکان سے متصل تھا۔

۶۔ مولوی عبدالہادی ملازم سرکار مبارز الدولہ، ان کا مکان کوٹلہ عالی جاہ میں تھا۔

۷۔ مولوی محمد جعفر ملازم سرکار نواب شمس الدولہ، ان کا مکان بازار سلیمان جاہ میں تھا۔

۸۔ سید عبدالواحد عرف واحد علی، یہ سید قاسم کے چھوٹے بھائی اور دولت آصفیہ میں ملازم تھے۔ ان کا مکان مولوی محمد جعفر کے مکان سے قریب تھا۔

۹۔ مولوی حسن محمد ملازم سرکار شمس الامراء۔ ان کا مکان فتح دروازہ کے پاس تھا۔

۱۰۔ حافظ عبدالسمیع ملازم سرکار مبارز الدولہ، ان کا مکان بیگم بازار میں تھا۔

۱۱۔ میاں محمد شرف الدین ملازم سرکار مبارز الدولہ، ان کا مکان مسجد نصیحت المسلمین کے پاس تھا۔

۱۲۔ حافظ حسن خاں رام پوری ملازم سرکار مبارز الدولہ، ان کا مکان مولوی محمد جعفر کے مکان کے پاس بازار سلیمان جاہ میں تھا۔

۱۳۔ مولوی عبدالرزاق، ان کا مکان کوٹلہ عالی جاہ میں تھا۔

۱۴۔ سید جلال الدین، یہ سنگا ریڈی پیٹ رہتے تھے اور وعظ فرمایا کرتے تھے۔ سید عبداللہ ان کے معاون و رفیق تھے۔

قیام گاہوں کی تفصیل بیان کرنے کا مدعا یہ ہے کہ یہ مقامات تعلیم و تدریس، وعظ و نصیحت اور اصلاح و درستی کے خاص مرکز تھے۔ گرد و پیش کے مسلمان انھیں مقامات پر وقتاً فوقتاً جمع ہو جاتے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سید صاحب کے رفقاء و خلفاء احیاء اسلامیت اور اصلاح عقائد و اعمال

کا کام کس اہتمام و تنظیم سے انجام دیتے تھے۔ یہ صرف ایک مقام کی سرسری تفصیلات ہیں۔ یقین ہے کہ انھوں نے ہر مقام پر اسی قسم کے انتظامات کر رکھے ہوں گے ؛

مبارز الدولہ کی عزیمت ناصر الدولہ کے بھائی نواب مبارز الدولہ نے اس تحریکِ اصلاح میں سبقت کا مقام حاصل کر لیا۔ انھوں نے سید صاحب کی کتاب "صراطِ مستقیم" اور شاہ اسمٰعیل کی کتاب "تقویت الایمان" پڑھیں تو شرک و بدعت اور منہیات کے تمام مراسم ترک کر دیے۔ وقت کے امراء کی طرح ان کے حرم میں بھی بہت سی عورتیں داخل تھیں۔ مبارز الدولہ نے صرف چار عورتیں رکھیں باقی سب کو اجازت دے دی کہ نکاح ثانی کر لیں اور ہر ایک کو اُس کی حیثیت کے مطابق روپیہ اور ضرورت کی دوسری چیزیں دے دیں۔ اُن کے دربار میں آداب تسلیمات کے بجائے سلام مسنون جاری ہو گیا۔ غرض اُن کے گھر، دربار اور جاگیر میں شریعت کے مطابق عمل ہونے لگا۔ بعض لوگوں نے مخالفت کا شور اٹھایا، لیکن مبارز الدولہ طریقِ حق پر عزم و جزم سے قائم ہو چکے تھے لہٰذا اُن پر کوئی اثر نہ پڑا ؛

مولوی نصیر الدین کا اعلام نامہ مولوی نصیر الدین کا اعلام نامہ نواب مبارز الدولہ کے ملاحظے میں پیش ہُوا تو نواب موصوف نے مولوی محمد آصف، مولوی سید عباس، مولوی سید قاسم، حافظ سید محمود اور مولوی پیر محمد کو بُلا کر حکم دیا کہ آپ حضرات پچاس مجاہدین ساتھ لے کر سندھ چلے جائیں تمام حالات خود ملاحظہ کریں۔ یہ دیکھیں کہ حاکمانِ سندھ کس حد تک حمایت کے لیے تیار ہیں۔ مجاہدین کی قیام گاہ کیسی ہے اور وہاں اخراجات و مصارف کا کیا حال ہے۔ یہ سب کچھ دریافت کر کے:

وکیل معتمد را نزد ما فرستادہ اطلاع دہید، ما حتی الامکان بہ تائید مجاہداں خواہیم پرداخت و مال و اسباب کثیر و مردم بسیار روانہ خواہیم نمود[1] ؛	قابلِ اعتماد وکیل ہمارے پاس بھیج کر اطلاع دیجیے۔ ہم حتی الامکان مجاہدین کی تائید کریں گے۔ بہت سا مال اسباب اور بہت سے آدمی بھیجیں گے ؛

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ ص ۱۲۱ ؛

حیدر آباد دکن سے حیدر آباد سندھ

یہ تمام حضرات سیّد محمد علی رام پوری اور مولوی ولایت علی عظیم آبادی کے معتقد تھے۔ ان سے استصواب کی خاطر کلکتہ خطوط بھیجے۔ جب وہاں سے جواب باصواب آگیا تو ۱۴۔ شعبان ۱۲۵۳ھ (۱۳۔ نومبر ۱۸۳۷ء) کو حیدر آباد سے روانہ ہوئے۔ شولاپور اور پونہ ہوتے ہوئے بمبئی۔ سے جہاز کی سواری میں کراچی پہنچے۔ وہاں سے ایک ہفتے میں حیدر آباد چلے گئے۔ سیّد عبدالرحمٰن (خواہرزادۂ سیّد صاحب) نے ان کا خیر مقدم کیا۔ عزت سے ٹھہرایا اور پورے حالات ان کے گوش گزار کردیے۔ وہاں سے اواخر ذی قعدہ میں یہ لوگ کشتی پر سوار ہوکر مولوی سیّد نصیر الدین کے پاس گئے، جو اُس وقت شکار پور میں تھے اور جو معلومات حاصل کرنے کی غرض سے وہ آئے تھے، ایک مفصّل مکتوب کی صورت میں دو قاصدوں کے ذریعے سے حیدر آباد بھیج دیں ؂

مبارز الدّولہ کا انجام

افسوس کہ مبارز الدّولہ کا یہ مبارک اقدام ان کے بھائیوں اور دوسرے امراء میں گوناگوں غلط فہمیوں کا باعث بن گیا۔ ناصر الدّولہ نے یہ سمجھا کہ اس طرح مبارز الدّولہ دولتِ آصفیہ کی حکومت حاصل کرنے کے خواہاں ہیں۔ جن مستورات کو حرم سے نکالا گیا تھا انھوں نے شور مچایا تو مبارز الدّولہ کے بھائیوں نے اس روش کو آبا و اجداد کی رسم کے خلاف قرار دیتے ہوئے بدنامی کا باعث تصوّر کیا۔ چنانچہ اس نیک دل نوّاب کو حیدر آباد سے نکال کر گولکنڈہ کے قلعے میں نظر بند کردیا گیا۔ کچھ مدّت بعد انھوں نے وفات پائی۔ پھر ناصر الدّولہ، اُن کے بھائیوں، دوسرے امیروں نیز پرانی وضع کے عالموں اور پیروں نے اُن تمام اصحاب کو گوناگوں مصیبتوں کا ہدف بنادیا جو تحریکِ اصلاحِ جہاد سے وابستہ تھے اس طرح منظّم اصلاحی تحریک کا شیرازہ درہم برہم ہوگیا ؂

نواں باب

آغازِ جہاد کا پس منظر

مزاریوں کی سرگزشت مولوی سیّد نصیر الدّین نے تمام معاملات پر غور و فکر کے بعد مزاریوں کے علاقے میں اقامت اختیار کر لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ علاقہ خیرپور کے حدود سے متصل موجودہ ضلع ڈیرہ غازی خاں کے جنوبی حصے پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلات کا رشتۂ بیان سنبھالنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اوّل خود مزاریوں کی سرسری سرگزشت پیش کر دی جائے۔ دوم گرد و پیش کے سیاسی ماحول کی مجمل کیفیت بتا دی جائے۔

مزاری[1] بلوچوں کی ایک بہت بڑی قوم ہے، جو غالباً سترھویں صدی عیسوی کے اواخر یا اٹھارھویں کے اوائل میں اپنے پہلے مقام سے اُٹھ کر نئی چراگاہوں کی تلاش میں نکلی۔ اس زمانے میں ناہر قوم دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر قابض تھی۔ وہ دو فریقوں میں بٹی ہوئی تھی، جو آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ ایک کا صدر مقام کَن تھا، دوسرے کا بھاگسر۔ ایک لڑائی میں مزاریوں نے ناہر قوم کے ایک فریق کی مدد کر کے وہ علاقہ صلے میں لے لیا، جو ضلع ڈیرہ غازی خاں میں روجھان اور دریائے سندھ کے مابین

---

[1] مولوی سیّد نصیر الدّین اور سیّد صاحب کے تمام ارادت مند شرک و بدعت کے رسوم سے سخت بیزار تھے۔ مزاری کے نام سے ہندوستان کے اہلِ حق کو شبہہ ہو سکتا تھا کہ یہ لوگ غالباً مزار پرست ہیں، لہٰذا مولوی صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں تصریحاً لکھا کہ یہ قوم کا نام ہے۔ مزار پرستی سے اسے کوئی تعلق نہیں البتہ وجہ تسمیہ کا پتا نہیں چل سکا۔ یہ بالکل درست ہے۔ مزاریوں کی وجہ تسمیہ میں دو روایتیں ہیں: ایک یہ کہ ان کے بڑے کا نام مزار تھا۔ دوسری یہ کہ یہ قوم ابتدا میں ایک ندی پر آباد تھی، جس کا نام مزار تھا۔ اس لیے قوم کا نام مزاری مشہور ہو گیا۔

واقع تھا اور وہ اس علاقے میں مستقل طور پر آباد ہو گئے ۔

احمد شاہ ابدالی کو عروج حاصل ہؤا تو اُس نے داجل اور رہرنڈہ کے علاقے قلات کے بروہی حکمران کو دے دیے، جو مزاریوں کے وطن سے شمال میں واقع تھے ۔ انھوں نے کشمور میں قلعہ بناکر مزاریوں سے لڑائیاں شروع کر دیں ۔ ایک لڑائی میں مزاریوں کا سردار گُل شیر خاں مارا گیا ۔ اُس کے بیٹے شاہ علی خاں نے کشمور پر حملہ کر کے بروہیوں کو وہاں سے نکال دیا ۔ شاہ علی خاں کے بعد اُس کا بھائی دوست علی خاں اور بھتیجا حمل خاں یکے بعد دیگرے قوم کے رئیس بنے ۔ آخر الذکر نے میر رستم خاں والیِ خیرپور سے تعلقات پیدا کر لیے ۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں وہ فوت ہؤا تو اُس کا بیٹا میر بہرام خاں مزاری قوم کا سردار بن گیا ۔ یہی شخص ہے جس کی سرداری کے زمانے میں مولوی سید نصیر الدین مزاری علاقے میں پہنچے اور انھوں نے جہاد کا آغاز کیا ۔

انگریز اب سب سے پہلے سیاسی ماحول کا سرسری نقشہ سامنے رکھ لیجیے، ہم ایک ایک طاقت کا حال الگ الگ بیان کریں گے ۔

ہندوستان پر انگریز قابض ہو چکے تھے اور وہ اپنا دائرہ اقتدار آہستہ آہستہ بڑھا رہے تھے ۔ حاکمانِ سندھ سے اُن کا تعلق تجارت کے سلسلے میں ہؤا اور ایک معاہدے کے ذریعے سے انھوں نے دریائے سندھ میں تجارت کی غرض سے کشتی رانی کا ٹھیکہ لے لیا ۔ ساتھ ساتھ وہ حاکمانِ سندھ کی حفاظت کے بھی ذمہ دار بن گئے ۔ اُس زمانے میں انگریزوں کو ہندوستان کی طرف روسی پیش قدمی کا بہت خطرہ تھا، لہٰذا افغانستان پر بھی ان کی نظریں جمی ہوئی تھیں، جو روسیوں کے مقابلے میں ہندوستان کا پہلا مورچہ تھا ۔ انھوں نے افغانستان کے دو حکمرانوں کو بھی اسی خیال سے اپنے ہاں پناہ دے دی تھی کہ جب ضرورت پڑے گی، اُن سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے لیں گے ۔ ایک زمان شاہ دُرّانی، جسے اس کے بھائی محمود نے اندھا کر دیا تھا[1] دوسرا شاہ شجاع ۔

---

[1] زمان شاہ کو اسیری کے زمانے میں انگریزوں کی طرف سے دو ہزار روپے ماہوار بطور وظیفہ ملتے رہے ۔ غالباً ۱۸۴۴ء میں شاہ موصوف نے وفات پائی ۔

رنجیت سنگھ | رنجیت سنگھ نے ۱۸۰۹ء میں انگریزوں سے معاہدہ کرکے دریائے ستلج کو اپنی عمل داری کی جنوبی حد بنالیا تھا اور وہ مسلسل شمالی و مغربی جانب پیش قدمی کرتا رہا۔ چنانچہ اُس نے ہزارہ کے علاوہ پشاور تک سرحدی علاقہ لے لیا، نیز شکارپور کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ انگریز اور سندھی اس پیش قدمی کو روکنے کے خواہاں تھے۔ رنجیت سنگھ کا دعویٰ یہ تھا کہ مٹھن کوٹ سے نیچے جو دریا ہے، اُسے بھی دریائے ستلج سمجھنا چاہیے جو سکھوں اور انگریزوں کے درمیان حدِ فاصل قرار پاچکا تھا۔ گویا وہ اس دریا کے پار کی سرزمین کو ان علاقوں میں شمار کرتا تھا جن میں ۱۸۰۹ء کے معاہدے کے مطابق وہ حسبِ دلخواہ پیش قدمی کا مجاز تھا اور انگریز اسے روکنے یا پیش قدمی میں مداخلت کرنے کے حقدار نہ تھے۔ انگریز کہتے تھے کہ ۱۸۰۹ء کے معاہدے کی حد مٹھن کوٹ پر ختم ہوجاتی ہے۔ اس لیے کہ دریائے ستلج وہاں ختم ہوجاتا ہے۔ اس سے آگے دریائے سندھ ہے، جسے معاہدے سے کوئی علاقہ نہیں۔

رنجیت سنگھ نے میاں عبدالنبی کلھوڑہ کو بھی اپنی عمل داری میں راجن پور کے مقام پر ایک جاگیر دے دی تھی۔ اِسی سے ٹالپروں نے سندھ کی حکومت چھینی تھی۔ رنجیت سنگھ کا مقصد یہ تھا کہ ضرورت پیش آئے گی تو میاں عبدالنبی کو سندھ پر قبضے کے لیے ٹالپروں کے خلاف آلۂ کار کے طور پر استعمال کرے گا۔ یہ وہی پالیسی تھی جس پر انگریز افغانستان کے تعلق میں کاربند تھے۔

حاکمانِ سندھ | حاکمانِ سندھ کی پوزیشن عجیب و غریب تھی۔ وہ انگریزوں سے بھی ہراساں تھے، رنجیت سنگھ سے بھی اور والیانِ افغانستان سے بھی۔ کبھی ایک کی پناہ لینے پر آمادہ ہوجاتے، کبھی دوسرے سے معاملے کی گفتگو شروع کردیتے، کبھی تیسرے کی طرف مائل ہوجاتے۔ شکارپور درّانیوں کی حکومت کے زمانے میں سلطنت افغانستان کا جزو بن چکا تھا۔ ٹالپروں نے جب اس کا انتظام سنبھالا تو حکومت افغانستان کو خاص رقم بطور خراج دینے کا عہد کیا تھا۔ افغانستان میں درّانیوں اور بارک زئیوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی تو حاکمانِ سندھ نے خراج روک لیا، لیکن انھیں ہروقت خطرہ لگا رہتا تھا کہ خدا جانے کب کوئی حکمران شکارپور پر قبضہ کرلے۔

افغانستان | افغانستان پہلے سدّوزئیوں کے قبضے میں تھا۔ اُن میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو

پہلے زمان شاہ معزول ہوا، پھر شاہ شجاع باہر نکلا۔ آخر میں شاہ محمود کی حکومت زائل ہوئی اور بارکزئی افغانستان کے مختلف حصّوں پر قابض ہو گئے۔ صرف ہرات سدّوزئیوں کے قبضے میں رہ گیا۔ زمان شاہ اور شاہ شجاع لدھیانہ میں مقیم ہو گئے اور انگریزوں نے اُن کے لیے وظیفے مقرّر کر دیے۔ شاہ شجاع کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کرنے کی سعی میں برابر لگا رہا۔ ایک موقع پر اس نے شکارپور اور پشاور دونوں رنجیت سنگھ کے حوالے کرکے مدد لینی چاہی، لیکن فیصلہ نہ ہو سکا۔ ۱۸۳۳ء میں وہ خود افغانستان کو فتح کرنے کے لیے نکلا۔ حاکمانِ سندھ نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے گزر جانے دیں اور کوئی مزاحمت نہ کریں، مگر شاہ شجاع نے شکارپور پہنچ کر حاکمانِ سندھ سے بقایا خراج کا مطالبہ پیش کر دیا۔ بڑی مشکل سے اسے پانچ لاکھ روپے دے کر راضی کیا گیا۔ آگے بڑھا تو اُس نے شکست کھائی۔ وہ لوٹا تو اندیشہ پیدا ہو گیا کہ ممکن ہے، پھر شکارپور میں قدم جما کر بیٹھ جائے۔ اس خوف سے حاکمانِ سندھ شکارپور کو رنجیت سنگھ کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئے تاکہ شاہ شجاع کی دست بُرد سے بچے رہیں ◆

عمومی کیفیت غرض مولوی سیّد نصیر الدّین کے سندھ پہنچنے پر عمومی کیفیت یہ تھی:

۱۔ رنجیت سنگھ شکارپور کی جانب بڑھ رہا تھا اور سندھ کے لیے خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ شکارپور سندھ کا حصّہ نہیں بلکہ سلطنت افغانستان کا حصّہ ہے اور اس پر قبضے سے مجھے روکا نہیں جا سکتا ◆

۲۔ انگریز اپنی مصلحتوں کے پیشِ نظر سندھ کو رنجیت سنگھ کی دست بُرد سے محفوظ رکھنے کے لیے کوشاں تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی چاہتے تھے کہ رنجیت سنگھ کے ساتھ دوستانہ تعلّقات میں فرق نہ آئے ◆

۳۔ حاکمانِ سندھ کی دلی خواہش یہ تھی کہ جو گروہ رنجیت سنگھ کا مقابلہ کریں، انھیں ہر ممکن ذریعے سے خفیہ خفیہ مدد دیں، لیکن اس مدد کی ذمّہ داری اُن پر عائد نہ ہونے پائے ◆

۴۔ مختلف گروہوں میں سے مزاری بلوچ سکھوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے، لہٰذا سندھ کے تمام عناصر کی خواہش یہی تھی کہ انھیں تقویت پہنچائی جائے ◆

مزاریوں اور سکھوں کی کشمکش مزاری اپنے دستور کے مطابق سکھ علاقوں میں تاخت و تاراج

کرتے رہتے تھے، اس وجہ سے سکھوں اور سندھیوں کے درمیان کشمکش شروع ہو جانے کا خطرہ موجود تھا۔ کننگھم لکھتا ہے کہ ۱۸۳۳ء میں دیوان ساون مل نے، جو سکھوں کی طرف سے ملتان کا ناظم تھا، مزاریوں کی شدید گوشمالی کی اور روجھان کے قلعے میں اپنی فوج بٹھا دینے کا ارادہ کر لیا، لیکن رنجیت سنگھ نے اجازت نہ دی۔ اُسے یقیناً یہ خیال ہوگا کہ ممکن ہے، انگریزی حکومت حاکمانِ سندھ کی حمایت میں اس پر معترض ہو اور اُس سے تعلقات بگڑ جائیں۔ ۱۸۳۵ء میں یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ مزاری والیِ خیرپور کی انگیخت پر سکھوں کی چوکیوں کے خلاف ترکتازیاں کر رہے ہیں۔ اس پر انگریزوں نے حاکمانِ سندھ کو متنبہ کیا کہ انگیخت کا یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے اور مزاریوں کو ترکتازیوں سے روکنا ضروری ہے تاکہ رنجیت سنگھ کو مداخلت کا بہانہ نہ مل سکے، لیکن مزاریوں کے حملے جاری رہے، یہاں تک کہ اگست ۱۸۳۶ء میں دیوان ساون مل نے روجھان پر قبضہ کر کے وہاں اپنی فوج بٹھا دی[1]۔

سید محمد لطیف فرماتے ہیں:

اگست ۱۸۳۶ء میں دیوان ساون مل ناظمِ ملتان نے مہاراجا کے پاس عرضداشت بھیجی کہ مزاری بلوچ سکھوں کی چوکیوں پر مسلسل حملے کرتے رہتے تھے، لہٰذا میں نے روجھان پر قبضہ کر لیا ہے۔ آئندہ اکتوبر میں پھر مزاریوں اور سکھوں کے درمیان لڑائی ہوئی۔ مزاری بھاری نقصان اٹھا کر شکست کھا گئے اور فتح مند سکھوں نے ان کے قلعہ کن پر قبضہ کر لیا۔ اس اثناء میں کنور کھڑک سنگھ اور کنور نونہال سنگھ بہت بڑی فوجوں کے ساتھ دریائے سندھ کے کنارے پر موجود تھے[2]۔

یہ حالات تھے، جب مولوی سید نصیر الدین اور مزاریوں کے درمیان عہد و پیمان ہوا اور جماعتِ مجاہدین کو آغازِ جہاد کا موقع ملا۔

---

[1] کننگھم کی تاریخ سکھاں (انگریزی) طبعِ اول ص ۲۱۶۔ [2] سید لطیف کی تاریخ پنجاب (انگریزی) مطبوعہ ۱۸۹۱ء ص ۴۷۴۔

میر بہرام خاں موہن لال دہلوی نے مارچ ۱۸۳۶ء میں سرکار انگلشیہ کے ملازم کی حیثیت میں ان علاقوں کا دورہ کیا تھا اور اس سفر میں وہ میر بہرام خاں سے بھی ملا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ اردگرد کے بلوچوں میں دانشمندی اور فہم و فراست کے لحاظ سے بہرام خاں کو خاص شہرت حاصل ہے :

وہ دبلا پتلا آدمی ہے، قد درمیانہ، دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی شخص گہرے خیالات میں ڈوبا ہوا ہو۔ اس کی طبیعت میں وہ شرارت اور دنائت بھی نظر نہیں آتی، جو عام طور پر اس سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے تین بیٹے ہیں اور چار بیٹیاں۔ وہ سرداروں کا سا لباس نہیں پہنتا، اگرچہ میں نے سُنا ہے کہ اس کے پاس بہت روپیہ ہے[1]۔

موہن لال نے یہ بھی لکھا ہے کہ سکھوں نے میر بہرام کی خوش دامن، جنت بی بی کو گرفتار کر لیا تھا اور اسے ملتان لے آئے تھے، جہاں میں نے بھی اس سے ملاقات کی تھی۔ میر بہرام خاں نے اس کے فدیے میں بیس اونٹوں کی پیش کش کی تھی لیکن سکھوں نے مزید پچیس اونٹوں کا مطالبہ پیش کر دیا تھا[2]۔

---

[1] موہن لال کا سفرنامہ (انگریزی) ص ۴۲۵-۴۲۶۔

[2] ایضاً ایضاً ص ۳۸۸-۳۸۹۔

دسواں باب

روجھان اور کن کی لڑائیاں

مزاریوں میں قیام کی تجویز سندھ پہنچنے کے بعد مولوی سید نصیر الدین کو تقریباً ہر ذمہ دار آدمی نے یہی مشورہ دیا کہ مزاریوں کے علاقے میں قیام کرنا چاہیے۔ چنانچہ مولوی صاحب پیر کوٹ پہنچے تو سید عبدالرحمن (خواہر زادہ سید صاحب) نے پہلے سے موصوف کے لیے یہی تجویز طے کر رکھی تھی۔ سید جعفر علی ساکن خیرپور سے اس بارے میں گفتگو ہوئی تو انھوں نے بھی اس تجویز پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔

میرا خیال ہے، یہ مشورہ اس بنا پر دیا گیا کہ اُس زمانے میں مزاری بلوچ سکھوں کے خلاف لڑ رہے تھے، لیکن اِس معاملے کے مختلف پہلوؤں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ کیا گیا۔ مثلاً مزاریوں کا مقام ایسا تھا کہ وہاں زیادہ دیر تک جنگ جاری نہ رکھی جا سکتی تھی۔ اگر حاکمانِ خیرپور و حیدر آباد پر انگریزوں اور سکھوں کا دباؤ پڑتا تو وہ یقیناً الگ ہو جاتے بلکہ مزاریوں کو بھی مجاہدین کی اعانت سے روک دیتے۔ پھر وہ جانبازانِ راہِ حق اس علاقے کو چھوڑنے پہ مجبور ہو جاتے اور جہاد کے تمام انتظامات بے سود رہ جاتے۔ خاص طور پہ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ مزاریوں کی نفری اگرچہ خاصی تھی، لیکن ان میں کوئی تنظیم نہ تھی۔ یاغستانی پٹھانوں کی طرح وہ لُوٹ مار میں خاصی سرگرمی دکھا سکتے تھے، تاہم مدّتِ مدید کی تربیت کے بغیر وہ منظّم جنگ کے لیے زیادہ کارآمد نہ ہو سکتے تھے۔

مولوی صاحب کے تاثرات مولوی صاحب نے غالباً اِس بنا پر یہ مشورہ بے تامّل قبول کر لیا کہ گرد و پیش اور کوئی موزوں مقام نہ تھا، جہاں سے جہاد کا فوری آغاز ہو سکتا۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ پہلے سے ان کے دل پر مزاریوں کے متعلق اچھا اثر پیدا ہو چکا تھا، اگرچہ یہ تاثر

محض شنید پر مبنی تھا، خود مولوی صاحب کو تجربے کی بنا پر اس کی توثیق کا موقع نہ ملا تھا - چنانچہ وہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

مزاریاں بہ شجاعت و شہامت ضرب المثل اند و نیز در اجمیر و جودھ پور بذریعۂ اخبار انگریزی معلوم شدہ بود کہ دریں ولا قوم مذکور بر بعض محروسہ و مقبوضۂ سکھ اغارہ کردند و چارپایے ہا بسیار بہ غارت بُردند - بہ طرفِ ایں قوم رغبتے می یافتم[1]

مزاری بہادری میں ضرب المثل ہیں۔ علاوہ بریں اجمیر اور جودھ پور میں انگریزوں کی بہم پہنچائی ہوئی خبروں سے معلوم ہو چکا تھا کہ اُس زمانے میں مزاریوں نے سکھوں کے بعض علاقوں پر ترکتاز کی اور بہت سے مویشی لُوٹ لیے گئے، لہذا اس قوم کی طرف میرے دل میں اک گونہ رغبت پیدا ہو گئی تھی۔

پھر فرماتے ہیں :

چوں میرانِ خیر پور زیر دستانِ فرنگیاں و آشتی داران سکھاں اند، قرار خود در محروسۂ ایشاں مقرونِ صلاح نمی بینم - اگرچہ متوقع چناں است کہ بفضلہٖ سبحانہٗ مسلمانانِ ایں دیار بسیارے از بسیار ہمراہ خواہند شد - بہ خلاف قوم مزاری کہ نہ از سکھاں خوفے دارند نہ از فرنگیاں[2]

والیانِ خیر پور چونکہ فرنگیوں کے زیر اثر ہیں اور سکھوں سے انھوں نے صلح کر رکھی ہے، لہذا اُن کے علاقے میں قیام میرے نزدیک خلافِ مصلحت ہے - بایں ہمہ امّید کی جاتی ہے کہ اِس ملک کے مسلمان بہت زیادہ تعداد میں میرا ساتھ دیں گے - والیانِ خیر پور کے خلاف مزاری نہ سکھوں سے ڈرتے ہیں، نہ فرنگیوں سے ؎

---

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ ص ۲۹ ؎

[2] ایضاً ایضاً ص ۳۰، ۳۱ ؎

قابلِ غور نکتہ آخری اقتباس سے واضح ہے کہ مولوی سیّد نصیر الدین نے دو وجہ سے خیر پور میں بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ اوّل ریاست کا فرنگیوں کے زیرِ اثر ہونا، دوم سکھوں سے مصالحانہ تعلّقات رکھنا۔ مولوی صاحب موصوف سیّد صاحب کی میراث کے حامل تھے۔ اگر انگریزوں کے متعلق سیّد صاحب کی رائے وہی ہوتی جو مولوی محمد جعفر تھانیسری کی تحریر کے مطابق بعض حضرات نے ایک صدی تک قبول کیے رکھی، تو مولوی صاحب انگریزی اثر کو کیوں موجب قدح قرار دیتے؟ حقیقت یہی ہے کہ سیّد صاحب اور ان کے تمام رفقاء و خلفاء ہندوستان کو ہر اُس تسلّط سے پاک کرنا چاہتے تھے، جو مسلمان حکمرانوں کی نااہلی کے باعث یہاں قدم جما چکا تھا۔ سکھ تھوڑے سے حصّے پر قابض تھے۔ مُلک کا بڑا حصّہ انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ پھر یہ بزرگ کس بنا پر انگریزی تسلّط کو بہ اطمینانِ خاطر قبول کر سکتے تھے؟ آگے چل کر مولوی صاحب نے انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کی اور معاملے کو وضاحت کی آخری منزل پر پہنچا دیا۔

مزاریوں سے عہد و پیمان قطعی فیصلے کے ساتھ ہی مزاریوں سے باقاعدہ گفت و شنید شروع ہو گئی تاکہ طریقِ کار کے متعلق سب کچھ طے ہو جائے۔ مزاریوں میں سے مولوی صاحب نے زیادہ تر تین آدمیوں کا ذکر کیا ہے، ایک حاجی خاں، دوسرا فتح خاں اور تیسرا اکرم خاں[1]۔ ایک مقام پر بہرام خاں مزاری، کرم خاں مزاری، بیبرک خاں بگٹی اور بجار خاں ڈومکی کا ذکر فرمایا ہے[2]۔ اوّل الذکر تینوں سردار میر رستم کے پاس خیر پور آئے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنے رفیقِ خاص ابو احمد علی کو ان کے پاس بھیج دیا کہ گفتگو ہو جائے[3]۔

ایک خط میں لکھتے ہیں کہ کرم خاں مزاری نے اقرار نامہ لکھ کر دے دیا ہے۔ ان بلوچوں کی کیفیت یہ ہے:

ہر کہ در خانۂ ایشاں برود تا جاں در تنِ ایشاں ہست، رفاقت او می کنند و	جو شخص اُن کے گھر چلا جائے، جب تک جان بدن میں رہے اُس کا ساتھ

---

[1] مثلاً ملاحظہ ہو اخبار مولوی سیّد نصیر الدین مخطوط ص ۱۸، ۲۵۔
[2] ایضاً ایضاً ص ۸۲۔
[3] ایضاً ایضاً ص ۲۶، ۲۹۔

راسخ العہد وصادق المیثاق بودن ایشاں مشہور است۔ چنانچہ بعضے اقوام ایشاں درمیانِ خود دشمنی دارند وجنگ درمیانِ خود می کنند۔ ہرگاہ کہ وعدہ کنند کہ دو سال صلح ہست، ہرگز درمیانِ خود غدر نمی کنند[1]۔

دیتے ہیں اور ان کا وعدے پر قائم رہنا اور باوفا ہونا مشہور ہے۔ چنانچہ اُن کے مختلف گروہوں میں دشمنی کی بنا پر لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، مگر جب وعدہ کر لیتے ہیں کہ مثلاً دو سال کے لیے صلح ہے تو اُس کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔

روجھان کا محاصرہ ہم بتا چکے ہیں کہ روجھان پر سکھوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ مولوی صاحب مزاریوں سے عہد و پیمان کے بعد پہلے بہنچی میں ٹھہرے رہے۔ شعبان ۱۲۵۳ھ کے آخری عشرے (نومبر ۱۸۳۷ء) میں روجھان پر پیش قدمی کی اور ۲۵۔ شعبان کو قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ مجاہدین کے پاس چار شاہینیں تھیں جنھیں مختلف مورچوں میں نصب کر لیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔ اہلِ قلعہ نے دروازے بند کر لیے اور توپ لگا کر مجاہدین پر گولہ باری کرنے لگے۔ دو روز محاصرہ جاری رہا۔ آخر محصورین نے تنگ آ کر دست بدست لڑائی کی ٹھانی۔ وہ دو چار مرتبہ قلعے سے باہر نکلے، جا بجا مورچے قائم کیے، لیکن مجاہدین کے مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور قلعے میں جا بیٹھے۔ دو روز میں تقریباً بیس محصورین مارے گئے اور تین مجاہدوں نے شہادت پائی۔

مہا سنگھ روجھان کا قلعہ دار تھا [illegible] اُس نے اپنی امداد کے لیے مٹھن کوٹ، عمرکوٹ[2] اور ڈیرہ غازی خاں کے قلعہ داروں کو بھی بلا لیا تھا۔

مزاریوں کی مراجعت مزاریوں میں سے ایک سردار سکھوں کے ہمراہ تھا۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں:

---

[1] مثلاً ملاحظہ ہو اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ صہ ۴۰۔

[2] واضح رہے کہ یہ عمرکوٹ ضلع ڈیرہ غازی خاں میں روجھان اور راجن پور کے درمیان واقع ہے۔

دوست علی خاں پسر کلان سردار بہرام خاں مزاری و جمال خاں و لشکر خاں پسرانِ کرم خاں مزاری با تمن ہائے خود . . . از منتسبان آں بلوچ کہ در حکومتِ سکھاں می زیست، کشتند و گلّہ ہائے گاواں وغیرہ بہ غارت بردند[1]

بہرام خاں مزاری کے بڑے بیٹے دوست علی خاں نیز کرم خاں کے بیٹوں جمال خاں اور لشکر خاں نے اس بلوچ سردار کے سواروں اور پیادوں کو قتل کر دیا، جو سکھوں کی حکومت میں رہتا تھا اور مویشی وغیرہ کے بہت سے گلّے قبضے میں لے لیے۔

اُس بلوچ سردار نے سوچا کہ اگر روجھان فتح ہو گیا تو بہرام خاں اور کرم خاں کے بیٹے مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ چنانچہ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے یہ تدبیر اختیار کی کہ ایک بلوچ کو قرآن دے کر ان مزاریوں کے پاس بھیجا، جس نے بتایا کہ دیوان ساون مل ناظمِ ملتان بھاری لشکر لے کر قریب آ پہنچا ہے۔ قرآن بہ طور حلف بھیجا گیا تھا کہ اس خبر کی صحت کے متعلّق کوئی وسوسہ باقی نہ رہے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، مزاری منظّم جنگ کے اہل نہ تھے۔ یہ خبر سُنتے ہی اُن پر خوف طاری ہو گیا۔ وہ لُوٹے ہوئے ریوڑ لے کر مولوی صاحب کو اطّلاع دیے بغیر روجھان سے چلے گئے اور چلتے وقت کہہ گئے کہ ہم جانوروں کے لیے چارہ لے کر واپس آ جائیں گے۔

مجاہدین کی پریشانی مجاہدین کی تعداد بھی زیادہ نہ تھی اور اُن کے پاس رسد کا بھی کوئی ذخیرہ نہ تھا۔ سب کے لیے رسد کشمور سے جاتی تھی، جو روجھان سے دو منزل پر واقع تھا۔ اس بنا پر محاصرہ جاری رکھنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ اگر سکھوں کی بڑی فوج روجھان پہنچ جاتی تو مجاہدین اس کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکتے تھے اور دو منزل سے روزانہ رسد منگوانے کا انتظام بہت مشکل تھا، لہٰذا مولوی صاحب نے فیصلہ کیا کہ فی الحال محاصرہ چھوڑ دیا جائے اور نئے سرے سے فوج مرتّب کر کے دوبارہ اقدام کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے روجھان کے مورچے چھوڑ کر نماز عشا کے بعد کشمور کا راستہ لیا[2]۔

---

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ ص ۷۴۔

[2] یہ تمام تفصیلات اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۹۵ تا ۱۰۸۔

کن میں لڑائی روجھان سے تقریباً چار کوس جنوب میں کن واقع ہے، جہاں سکھوں نے ایک فوجی چوکی قائم کر رکھی تھی۔ روجھان کے سکھوں کو جب معلوم ہؤا کہ مجاہدین محاصرہ چھوڑ گئے ہیں تو وہ سب اُن کے تعاقب میں نکل پڑے۔ کن کے قریب انھوں نے نقارے بجا کہ مجاہدین پر حملہ کر دیا۔ مجاہدین نے اللہ اکبر کے نعروں سے اُن کا مقابلہ کیا اور ایک ہی حملے میں سکھوں کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا، لیکن اندیشہ تھا کہ وہ پلٹ کر حملہ کریں گے۔ لہٰذا مجاہدین دوپہر تک اُسی جگہ انتظار میں بیٹھے رہے۔ چنانچہ سکھ دوبارہ نمودار ہوئے اور دوبارہ جنگ شروع ہو گئی۔ اتّفاق سے مٹھن کوٹ کا قلعہ دار کرم سنگھ اور اُس کا ایک ساتھی مجاہدین کے نرغے میں آ گئے۔ محمد شاہ، عبدالعظیم خاں، مہر خاں، عظیم اللہ خاں اور نور محمد نے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا اور دونوں کے سر کاٹ کر قلعہ کن کے دروازے پر لٹکا دیے۔ سکھ دوبارہ بھاگ نکلے۔ اُن کے دس سوار کھیت رہے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ دوسرے روز مجاہدین کن سے روانہ ہو کر کشمور پہنچ گئے[1]۔

"باغ و بہار" کا بیان ان لڑائیوں کے حالات کسی کتاب میں درج نہیں ہوئے۔ ہتو رام نے "باغ و بہار" کے نام سے ضلع ڈیرہ غازی خاں کی تاریخ ۱۸۷۱ء میں شائع کی تھی جو اب بہت کم یاب ہے۔ صرف اس میں روجھان پر سکھوں کے قبضے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

> تھوڑا عرصہ بعد مولوی نصیر الدین غازی ہندوستانی علاقۂ قندھار سے پھرتا ہؤا بہ جمعیت ایک ہزار سوار و پیادہ وارد علاقۂ سندھ ہؤا۔ تمن دار مزاری نے مولوی مذکور کو حامیِ خود بنا کر علاقۂ روجھان کو تاخت و تاراج کرنا شروع کیا، مگر کاردار متعینۂ قلعۂ روجھان بسبب پناہ اُس قلعے کے بچ گیا۔ مردانِ مزاری علاقہ روجھان کو مار تباہ کر کے واپس چلے گئے[2]۔

مولوی صاحب کے متعلق یہ کہنا کہ وہ علاقۂ قندھار سے سندھ آئے، غلط فہمی پر مبنی ہے، تاہم یہ بیان فی الجملہ مولوی صاحب کے تحریر کردہ واقعات کا مصدّق ہے۔

---

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ ص ۴۷ تا ۵۰۔ [2] "باغ و بہار" طبع اوّل ص ۱۷۵۔

گیارھواں باب

نئی قیام گاہ اور نئی تدبیریں

کشمور اور بھمک مجاہدین چند روز کشمور میں مقیم رہے۔ یہ مقام سکھوں کی عملداری سے بہت قریب تھا اور ہر لحظہ کشمکش کا اندیشہ لگا رہتا تھا۔ اتنی فرصت نہ ملتی تھی کہ مولوی صاحب مختلف مقامات کا دورہ کر کے لوگوں کو جہاد کے لیے تیار کر سکیں۔ اِس سے بھی بڑی مصیبت یہ پیش آئی کہ کشمور کا حاکم خفیہ خفیہ ساون مل ناظم ملتان سے ساز باز رکھتا تھا، وہ مجاہدین کے لیے رسد کی بہم رسانی میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگا۔ لہٰذا یہی مناسب معلوم ہوا کہ کشمور کے بجائے کسی دوسرے مقام کو مرکز بنایا جائے۔ چنانچہ مولوی صاحب مجاہدین کو لے کر ایک اور مقام پر جا ٹھہرے، جو روجھان سے آٹھ نو کوس دور تھا[1]۔

سکھوں پر شبخون ایک روز خبر ملی کہ سکھ سواروں اور پیادوں کی ایک جماعت ایک بستی میں پہنچی ہوئی ہے، جو مجاہدین کی قیام گاہ سے تقریباً چار کوس تھی۔ یہ بھی سُنا گیا کہ وہ لوگ دریا عبور کر کے مجاہدین پر حملہ کرنے والے ہیں۔ مولوی صاحب نے خود اُن پر شبخون مارنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ۲۷۔ رمضان ۱۲۵۳ھ (۲۵۔ دسمبر ۱۸۳۷ء) کو دو سو جانباز منتخب کر کے بھیج دیے، جنھوں نے کشتیوں پر دریا عبور کیا لیکن بستی میں پہنچے تو معلوم ہوا، وہاں کوئی نہیں۔

ساون مل اُس مقام سے تھوڑے فاصلے پر فوج لیے بیٹھا تھا اُس نے اپنے آدمیوں کو شبخون کے لیے تیار کرنا چاہا تو جواب ملا:

---

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ صفحہ۔ اس مقام کا صحیح نام معلوم نہ ہو سکا۔ بظاہر یہ بھمک یا تھمک معلوم ہوتا ہے، لیکن مجھے ایسے کسی مقام کا پتہ نہ چل سکا۔ آغا بدر الدین رئیس یاسین گڑھی نے بھی چھان بین کرائی۔

تو پیش ما می روی، ما ہم ہمراہ تو می رویم	تُو ہمارے آگے چل۔ ہم تیرے ساتھ
والّا مجال نداریم کہ بر غازیاں شبخون زنیم[1]	جانے کے لیے تیار ہیں، ورنہ ہمیں یہ حوصلہ نہیں کہ غازیوں پر شبخوں ماریں ۔

ساون مل نے اُن مزاریوں کو شبخون پر ابھارنے کی کوشش کی جو اپنے ہم قوموں کا ساتھ چھوڑ کر سکھوں سے ملے ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ساون مل وہاں سے ہٹ کر ملتان کی طرف چلا گیا اور روجھان کا نظم و نسق اُس نے مزاریوں کے حوالے کر دیا۔ مولوی صاحب مجاہدین کو اُس کے تعاقب میں بھیجنا چاہتے تھے لیکن خرچ کی کمی کے باعث یہ تدبیر بروے کار نہ آسکی[2]۔

مالی مشکلات اگرچہ مختلف مقامات خصوصاً ٹونک سے وقتاً فوقتاً روپیہ آرہا تھا اور مجاہدین کے مختلف جیش بھی اپنے ساتھ رقمیں لاتے رہتے تھے، تاہم اُس زمانے میں مالی مشکلات کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھیں۔ مولوی صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں:

دریں ولا عسرت و تنگی خرچ کہ مطابق مستهم البأساء از امتحانات جہادیہ است تنخواہِ نوکراں بہ حدِ نہایت رسیدہ۔ بااین کہ زیورات اہل خانہ میاں ولی محمد صاحب و دیگر مستورات مجاہدین و جنابِ عصمت قباب بی بی صاحبہ مکرمہ معظمہ فروختہ بہ صرف مجاہدین و تنخواہ نوکراں در آمد، تاہم کفایت نہ کرد و نوبت فاقہ یک دو روز ہم رسیدہ[3]۔	ان دنوں مستهم البأساء (انھیں سختی نے آپکڑا) کے مطابق خرچ کی تنگی پیش آئی۔ یہ بھی جہاد کے امتحانات میں سے ہے۔ نوکروں کی تنخواہ بھی نہیں دی جا سکتی۔ میاں ولی محمد صاحب کے اہل خانہ، دوسرے مجاہدوں کی خواتین اور خود سید صاحب کی بی بی صاحبہ نے بھی اپنے زیور بیچ کر رقمیں مجاہدین کے گزارے اور نوکروں کی تنخواہوں کے لیے دے دیں، جب بھی ضرورت پوری نہ ہوئی اور ایک دو دن فاقے کی نوبت بھی آگئی۔

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ صفحہ ۱۰۹۔
[2] " " " صفحہ ۱۱۱۔
[3] " " " صفحہ ۱۰۹۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں :

مخفی و محتجب مباد کہ دریں ولا دین دار ان	واضح رہے کہ ان دنوں اس علاقے کے
ایں دیار و مسلمانان ہدایت شعار بہ قدر طاقت	دین دار اور ہدایت یافتہ مسلمان اپنی استطاعت
خود از مال وغیرہ تائید و اعانت مجاہدین	کے مطابق مجاہدین کی مالی امداد کرتے رہے۔
نمودہ اند و اکثرے از برادران مجاہدین مثل	مجاہد بھائیوں میں سے اکثر مثلاً شیخ ولی محمد،
میاں ولی محمد صاحب و دیگر ہمراہیان ایشاں	اُن کے ساتھیوں اور سید اسمٰعیل نے مستورات
و میاں سید اسمٰعیل زیورات مستورات خودہا	کے زیور بیچ کر سروسامان کا انتظام کیا ۔
فروختہ تجہیز ساز و سامان نمودہ اند[1] ۔	

نواب بہاول خاں کی سراسیمگی مجاہدین جس مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے، وہ اگرچہ حاکمانِ سندھ کی عمل داری میں واقع تھا، تاہم ریاست بہاول پور کی سرحد سے قریب تھا۔ اس وجہ سے نواب بہاول خاں کے دل میں خواہ مخواہ سراسیمگی پیدا ہوگئی۔ اُس نے سمجھا کہ ممکن ہے، مجاہدین خود اس کے علاقے میں دست اندازی شروع کر دیں حالانکہ مجاہدین کو اس سے کوئی کاوش نہ تھی۔ غرض وہ فوج کے ساتھ مجاہدین کی قیام گاہ سے دو تین کوس پر آبیٹھا اور اپنا وکیل حاکمانِ سندھ کے پاس بھیج دیا کہ مجاہدین کو وہاں سے ہٹا لیا جائے[2] ۔

نئی قیام گاہ کی تجویز حاکمانِ سندھ نے مولوی صاحب کو پیغام بھیج دیا کہ :

آں صاحب لشکرِ خود را برداشتہ در	آپ اپنے لشکر کو ہٹا کر ہمارے ملک کے
ملکِ مایاں بر مقام روپا کہ نام ضلعیست یا	ضلع روپا میں آجائیں، جو دریائے سندھ
جاے دیگر بہ آں لب دریائے اباسین یعنی	کے اس طرف یعنی شکارپور کی جانب ہے یا
بطرف شکارپور ہر جاے کہ پسندِ خاطر افتد،	کسی اور مقام پر ٹھہر جائیں جو آپ کو

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ ص ۱۳۰، ۱۳۱ ۔

[2] ایضاً ایضاً ص ۱۴۱ و ۱۴۲ ۔

چھاؤنیِ لشکر خود انداز ند[1] پسند ہو ۔

چنانچہ مولوی صاحب نے لشکر اُس بستی سے ہٹا لیا اور مہرو میں مقیم ہوگئے جو شکارپور سے ایک منزل پر واقع تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ جگہ بڑی دلکشا اور راحت افزا ہے۔ یہاں پانی، غلّے، گھاس اور لکڑی کی کمی نہیں۔ گھوڑوں اور اونٹوں کے لیے اچھی چراگاہیں موجود ہیں[2]

اہلِ سندھ اور حاکمانِ سندھ مہرو میں قیام کے حالات بتاتے ہوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں:

امیرانِ سندھ درصورتِ اقامتِ ایاں	سندھ کے امیر مجاہدین کے قیام،
دریں ملک وجنگ کردن باکفار سکھاں و	سکھوں سے جنگ اور لڑنے والے مسلمانوں
فراہم آوردن مسلماناں بہ ہیچ وجہ مانع ومزاحم	کی فراہمی میں قطعاً مزاحمت نہیں کرتے۔
نیستند واز سکونتِ لشکرِ اسلام خواہ از	ہمارے لوگ یہاں رہ کر تجارت کریں یا کھیتی
روے تجارت وزراعت باشد یا کسب دیگر،	باڑی یا کوئی اور پیشہ اختیار کرلیں، کسی کو بُرا
کسے ناخوش نیست زیرا کہ زمین سندھ صدہا	نہیں لگتا۔ کیونکہ سندھ میں سیکڑوں کوس
کروہ ویران وغیر آباد افتادہ است۔ ہر قدر	زمین ویران اور غیر آباد پڑی ہے۔ یہاں جتنی
آبادی بہ عمل آید، خوشنودیٔ رئیسانِ ایں نواح	آبادی ہوگی، رئیسوں کے نزدیک خوشنودی کا
است[3]	باعث سمجھی جائے گی ۔

بلوچستان سے تعلقات کچھ معلوم نہیں کہ مولوی صاحب کب تک مہرو میں مقیم رہے، لیکن جیساکہ

---

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ صہ ۱۴۳۔ آغا بدر الدین بدر عالم رئیس اعظم گڑھی یاسین نے بتایا کہ شکارپور کے شمالی حصّے اور جیکب آباد کے تھوڑے سے جنوبی حصّے کو زمانہ قدیم سے روپاہ کہتے تھے؛ اگرچہ آج کل سرکاری نام یہ نہیں، لیکن عوام میں یہ خطہ آج بھی روپاہ ہی کے نام سے موسوم ہے۔ مولوی صاحب کے خط میں مقام کا نام مہرہ بتایا گیا میری تحقیق کے مطابق صحیح نام مہرو ہے جو شکارپور سے سولہ میل مشرق میں دریاے سندھ کے دائیں کنارے واقع ہے اس سے متصل سندھ نام ایک نہر نکلتی ہے۔ اس کا پورا نام مہرو ماڑی ہے ۔

[2] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ صہ ۱۴۳ ۔

پہلے بتایا جا چکا ہے، وہ قلات کے وزیر اعظم مختار الدولہ محمد حسن سے بھی خط و کتابت شروع کر چکے تھے اور ان کی خواہش یہ تھی کہ موقع ملے تو بلوچستان چلے جائیں۔

مختار الدولہ محمد حسن ظاہراً مولوی صاحب کے خیر مقدم کے لیے ہمہ تن تیار تھا، جیسا کہ اُس کے خطوط سے واضح ہوتا ہے۔ مثلاً ایک خط میں لکھتا ہے:

ایں فدوی خدا می داند کہ خود را غائبانہ	خدا گواہ ہے کہ میں اپنے آپ کو آپ کے
یکے از غلامان و دامن گرفتگان خادمان عالی	غلاموں اور متوسّلوں میں شمار کرتا
می داند[1]	ہوں۔

دوسرے میں لکھتا ہے:

اصلا خود را از مؤیّدات ایں امر شریف	میں دینِ نبویؐ کے اس اہم حکم یعنی جہاد
دینِ نبویؐ حتی الامکان دریغ نہ خواہد داشت[2]	کی تائید و حمایت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔

تاہم محمد حسن عام تاریخی معلومات کے مطابق چالاک اور زمانہ ساز آدمی تھا[3]۔ وہ جو کچھ کہتا رہا، اُس پر توقع اور امید کے مطابق یقیناً عمل نہ کیا ہوگا، لیکن ہمیں مولوی صاحب کے حالات کے متعلق جو مکتوب ذخیرہ مل سکا، اُس میں قیامِ مہرو کے بعد کی کوئی سرگزشت موجود نہیں۔ نہ اس خلا کو پورا کرنے کا اور کوئی ذریعہ میسر آ سکا۔

---

[1] اخبار مولوی سید نصیر الدین مخطوطہ ص ۱۳۴۔

[2] ایضاً ایضاً ص ۱۳۸۔

[3] جب انگریزوں نے شاہ شجاع کی حمایت میں افغانستان پر فوج کشی کی تھی تو محمد حسن ہی قلات کا وزیر اعظم تھا۔ انگریزوں نے ایک رنگ میں خط و کتابت کی۔ محراب خاں والیِ قلات کو دوسرے رنگ میں مشورے دیے۔ یہاں تک کہ انگریزوں کے دل میں والیِ قلات کے متعلق شدید غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں اور وہ بے چارا ناحق مارا گیا۔

سکھوں اور مزاریوں کی مصالحت مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ دیوان ساون مل مجاہدین سے مرعوب ہو کر روجھان مزاریوں کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ مستند تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان مذکور مزاریوں کی یورشوں سے بہت پریشان ہو گیا تھا، جو مجاہدین کی اعانت کے باعث خاص خطرناک صورت اختیار کر گئی تھیں۔ لہٰذا یہی مناسب معلوم ہوا کہ ان سے مصالحت کی کوئی صورت پیدا کر کے کشمکش ختم کر دی جائے۔ چنانچہ رحیم خاں لغاری کے ذریعے سے گفت و شنید ہوئی۔ مزاریوں کے تمام سابقہ حقوق بحال کر دیے گئے اور انھوں نے یہ منظور کر لیا کہ اپنے آپ کو سکھوں کی رعایا سمجھیں گے۔ میر بہرام خاں مزاری کو پہلے ملتان بلایا گیا اور دیوان ساون مل نے اسے ایک ہزار روپے کا خلعت دیا۔ پھر اُسے رنجیت سنگھ نے لاہور بلایا۔ میر بہرام خاں کو طلائی کڑوں کی ایک جوڑی، ایک ہزار روپیہ نقد اور خلعت نیز اس کے ساتھ جو پچاس مزاری سوار تھے، انھیں ریشمی کپڑے دیے[1]۔

---

[1] "باغ وبہار" صفحہ ۱۷۱۔

بارھواں باب

انگریزوں سے جنگ اور قیام ستھانہ

معلومات کا فقدان جنگ روجھان کے بعد مولوی سیّد نصیر الدین کی سرگرمیوں کے متعلق مفصل معلومات حاصل کرنے کا کوئی بھی ذریعہ میسّر نہ آسکا۔ اب تک جو کچھ لکھا گیا، وہ دو کتابوں سے ماخوذ تھا: ایک رسالہ جو موصوف کے حالات میں سیّد ابو احمد علی نے مرتب کیا تھا، دوسرا مجموعۂ مکاتیب جس کے حوالے "اخبارِ مولوی سیّد نصیر الدین" کے نام سے جا بجا دیے جا چکے ہیں۔ مکاتیب جنگِ روجھان پر پہنچ کر ختم ہو گئے۔ رسالے کا جو نسخہ مل سکا، وہ سراسر ناقص تھا۔ اُس کے مقدمے سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ روجھان کے بعد مولوی سیّد نصیر الدین سندھ سے ہجرت کر کے بلوچستان چلے گئے۔ وہ سبّی، ڈھاڈر، تھل چیتالی وغیرہ میں رہے اور اس سلسلے میں شادوزئی، غلزئی، کاکڑ، استرانی، بزدار وغیرہ قوموں کے درمیان سکونت کا ذکر بھی آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مولوی صاحب سندھ سے کچھی گئے۔ پھر سبّی، لورالائی، ژوب اور کوئٹہ کے کوہستانی علاقوں میں مقیم رہے۔ اس کے بعد حافظ محمد ناصر اور ان کے رفیقوں کو شہادت کی منزل پیش آئی، مجاہدین کی جماعت بکھر گئی اور مولوی صاحب تنہا ہندوستان کے مختلف شہروں میں پھرتے پھراتے ستھانہ پہنچے۔ وہاں جماعتِ مجاہدین کی فراہمی کا انتظام کیا اور جہاد کی دعوت شروع کر دی۔ وہیں وفات پائی۔

ان اشاروں سے مولوی صاحب کی سرگرمیوں کا ایک سرسری نقشہ تو سامنے آجاتا ہے، لیکن تفصیلات اس وقت تک بیان نہیں کی جا سکتیں، جب تک رسالے کا مکمل نسخہ ہاتھ نہ آجائے۔

سندھ یا بہاول پور میں جہاد کا انتظام ممکن نہ تھا، اس لیے کہ ان علاقوں کے حاکم انگریزوں سے وابستہ تھے۔ مزاری بلوچ سکھوں سے صلح کر چکے تھے۔ اُن سے بھی اعانت کی کوئی امید نہ ہو سکتی تھی۔ لہٰذا مولوی صاحب

کو بلوچستان کی طرف جانا پڑا۔ اچانک گرد و پیش کے سیاسی حالات میں ایسا تغیّر پیدا ہو گیا کہ انگریز افغانستان کی آزادی سلب کر لینے پر تُل گئے۔ امیر دوست محمد خاں نے مقابلے کی ٹھانی۔ اس سلسلے میں مولوی صاحب نے بھی امیر موصوف کی اعانت میں مجاہدانہ شان سے قدم آگے بڑھایا۔ سب سے پہلے اس تغیّر کی مختصر سی کیفیت سُن لیجیے:

افغانستان میں خانہ جنگی افغانستان میں تباہ کن خانہ جنگی کا آغاز تیمور شاہ (ابن احمد شاہ ابدالی) کے فرزندوں سے ہوا۔ ان میں سے زمان شاہ زیادہ قابل سمجھا جاتا تھا۔ وہی تیمور شاہ کے بعد تخت نشین ہوا، لیکن اُس نے اپنے بعض خود غرض مشیروں کے اُکسانے سے پائندہ خاں بارک زئی کو ناحق قتل کرا دیا، جو افغان سرداروں میں سب سے زیادہ مدبّر اور با اثر تھا۔ پائندہ خاں کے بیٹے زمان شاہ کے بھائی شاہ محمود کے حامی بن گئے۔ زمان شاہ فوج لے کر ہندوستان آیا۔ شاہ محمود نے تخت گاہ پر قبضے کے لیے قدم بڑھایا۔ زمان شاہ یہ خبر سُن کر واپس ہوا، لیکن اس کے پہنچنے سے پیشتر کابل چھن چکا تھا۔ شاہ محمود نے بھائی کو گرفتار کر کے اس کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی۔ پھر زمان شاہ کے ماں جائے بھائی شاہ شجاع اور محمود شاہ میں خاصی دیر تک کشمکش جاری رہی۔ آخر شاہ شجاع کو بھی افغانستان سے نکل کر رنجیت سنگھ کے پاس پناہ لینی پڑی۔ وہ اپنے اکثر جواہرات، جن میں "کوہِ نور" بھی شامل تھا، رنجیت سنگھ کو دے کر لاہور سے بھاگا اور انگریزوں کے پاس پہنچ گیا، جسے انھوں نے لدھیانہ میں ٹھہرایا اور وظیفہ مقرر کر دیا۔

محمود شاہ کو سلطنت پائندہ خاں کے فرزندوں کی بدولت ملی تھی، جن میں سے فتح خاں سب سے بڑا تھا۔ وہی وزیر اور مختارِ کل بن گیا۔ محمود شاہ کے بیٹے کامران نے کچھ مدّت بعد اُسے قتل کرا دیا۔ اُس کے بھائیوں نے محمود شاہ کی سلطنت کا چراغ گل کر کے افغانستان کے مختلف حصّوں میں اپنے دیے روشن کر لیے اور محمود شاہ کے قبضے میں صرف ہرات کا صوبہ رہ گیا۔

پائندہ خاں کے بیٹوں میں سے دوست محمد خاں نے کابل میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ وہی احمد شاہ ابدالی کی سلطنت کا وارث بن گیا۔ شاہ شجاع نے ایک مرتبہ سلطنت واپس لینے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا اور مستقل طور پر لدھیانہ میں بیٹھ گیا، جہاں زمان شاہ بھی آ گیا تھا۔

روسی مداخلت کا اضطراب ہندوستان پر قابض ہو جانے کے بعد انگریزوں کو باہر سے بحری حملے کے متعلق تو کوئی تشویش نہ رہی تھی، اس لیے کہ کسی یورپی طاقت کے پاس ایسا جنگی بیڑا نہ تھا جو انگریزی بیڑے کو شکست دے کر بڑی فوج ہندوستان پہنچا سکتا، البتہ خشکی کے راستے حملے کا خطرہ موجود تھا۔ اسی بنا پر وہ افغانستان اور ایران سے گہرے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ ظاہر ہے کہ خشکی کے راستے جو فوج آتی، وہ انھیں دو ملکوں میں سے ہو کر آتی۔ یورپی تاجداروں میں سے نپولین نے روس کو ساتھ ملا کر ہندوستان پر حملے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ نپولین شکست کھا کر قید ہو گیا تو انگریز اطمینان سے بیٹھ گئے۔ پھر روس نے وسط ایشیا میں پیش قدمی شروع کی تو انگریزوں کو از سر نو سراسیمگی پیدا ہوئی۔ چنانچہ دونوں نے افغانستان اور ایران کے درباروں میں اپنے اپنے مقاصد کے لیے جوڑ توڑ شروع کر دیے +

دوست محمد خاں کا موقف امیر دوست محمد خاں انگریزوں سے خوش گوار تعلقات قائم رکھنے کے لیے تیار تھا اور اس امر کا بھی ذمہ لیتا تھا کہ وہ روس یا کسی دوسری اجنبی طاقت کی فوجوں کو افغانستان میں سے ہندوستان کی جانب پیش قدمی کرنے کی اجازت نہ دے گا، لیکن کہتا تھا کہ پشاور افغانستان کی ملکیت ہے، اسے سکھوں سے واپس دلاؤ یا واپس دلانے میں پوری امداد کرو۔ انگریزوں کی پوزیشن حد درجہ مضحکہ خیز تھی۔ وہ ایک طرف یہ چاہتے تھے کہ امیر دوست محمد خاں روس کے خلاف ان کا دفاعی مورچہ بنا رہے، دوسری طرف اس کے جائز حقوق کی بازیافت کے لیے کوئی مدد دینے پر آمادہ نہ تھے۔ گویا سکھوں سے بھی دوستانہ تعلقات بحال رکھنا چاہتے تھے۔ محض یہی نہیں بلکہ امیر دوست محمد خاں سے یہ مطالبہ بھی کر رہے تھے کہ محمود شاہ کے بیٹے کامران کی حکومت ہرات میں بھی کوئی مداخلت نہ کی جائے۔ اس کے برعکس روس امیر دوست محمد خاں کو پشاور کی بازیافت کے لیے ہر ممکن امداد دینے پر آمادہ تھا، لہٰذا امیر انگریزوں کو روسیوں پر ترجیح نہ دے سکتا تھا۔ انگریزوں نے جوشِ غیظ میں یہ فیصلہ کر لیا کہ امیر دوست محمد خاں کو تخت سے اُتار کر شاہ شجاع کو افغانستان کا بادشاہ بنایا جائے، جو تخت کی خاطر ہر شرط قبول کر لینے پر راضی تھا، خواہ وہ اس کے لیے یا افغانستان

کے لیے کتنی ہی مصیبتوں اور پریشانیوں کا باعث ہوتی ۔

سہ گانہ معاہدہ چنانچہ انگریزوں نے ایک معاہدہ کیا، جسے اس وجہ سے "سہ گانہ معاہدہ" کہا جاتا ہے کہ اس میں تین فریق شریک تھے: اوّل انگریز، دوم شاہ شجاع، سوم سکھ۔ شاہ شجاع نے اس معاہدے کے مطابق اقرار کر لیا کہ اسے پشاور یا سکھوں کے دوسرے مقبوضہ افغانی علاقوں سے کوئی سروکار نہ ہوگا، نیز جہاں سکھوں اور افغانوں کی فوجیں یک جا ہوں گی، وہاں افغان گائیں ذبح کرنے سے محترز رہیں گے۔ دوسری طرف انگریزوں سے اقرار کیا کہ وہ افغانستان پر قبضہ دلانے کے سلسلے میں شکارپور پر تمام حقوق سے دست بردار ہوتا ہے۔ اس معاہدے کے بعد انگریزوں نے شاہ شجاع کی حمایت کے لیے دو فوجیں تیار کیں۔ ایک سندھ اور بلوچستان کے راستے قندھار کی طرف، دوسری درۂ خیبر کے راستے جلال آباد کی طرف بڑھی ۔

مولوی صاحب کی اولوالعزمی غرض شاہ شجاع کی عاقبت نااندیشی یا خود غرضی کے باعث افغانستان کی آزادی سکھوں اور انگریزوں کی وجہ سے خطرے میں پڑ گئی تو مولوی سیّد نصیر الدّین بے تکلّف اس آزادی کے تحفّظ کی خاطر سرگرمِ عمل ہو گئے۔ کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں کہاں لڑے۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ جہاں جہاں انھیں موقع ملا، اپنے محدود وسائل کے باوجود انگریزوں کا مقابلہ کرتے رہے ۔

غزنی کی لڑائی درۂ بولان کے راستے پیش قدمی کرنے والی فوج بہت بڑی تھی اور اس کے ساتھ ہر قسم کا سامانِ جنگ موجود تھا۔ اس فوج نے قندھار پہنچ کر شاہ شجاع کی تخت نشینی کا جشن منایا۔ پھر وہ کابل کی جانب حرکت میں آئی تو غزنی میں اسے شدید مقابلے سے سابقہ پڑا۔ جو معلومات ہمارے سامنے ہیں، اُن میں بتایا گیا ہے کہ مولوی صاحب اور اُن کے مجاہدین غزنی میں بڑی جانفشانی سے لڑے۔ انگریزوں کے لیے آگے بڑھنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس اثناء میں امیر دوست محمد خاں کا ایک عزیز[1] انگریزوں سے مل گیا اور اُس نے قلعۂ غزنی کے تمام اندرونی حالات انھیں بتا دیئے۔ انگریزوں نے رات کی تاریکی میں ایک دروازے پر بارود کے تھیلے رکھے۔ انھیں آگ لگا دی تو خوفناک دھماکا ہوا۔

[1] اس کا نام عبدالرشید خاں بتایا گیا ہے جو انگریزوں کے ملازم موہن لال کشمیری کا دوست تھا۔ (ملاحظہ ہو "رجال و روئیدادہائے تاریخی" بزبان فارسی شائع کردہ انجمن تاریخ افغانستان ص ۹۰)۔

دروازہ اُڑ گیا اور انگریزی فوج قلعے میں داخل ہوگئی۔ مولوی سیّد نصیر الدّین کے اکثر ساتھیوں نے دست بدست لڑائی میں شہادت پائی - یہ ۲۱ - جولائی ۱۸۳۹ء کا واقعہ ہے ؛

ولیم ہنٹر کا بیان ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے مجاہدین اور مرکز ستھانہ کے حالات بیان کرتے ہوئے بہت سی غلط بیانیاں دانستہ یا نادانستہ کی ہیں، تاہم موصوف کا یہ دعویٰ بہ طورِ خاص مستحق توجہ ہے کہ مجاہدوں میں اونچے درجے کے آدمی بھی شامل تھے، جو اس لیے ترکِ وطن کرکے ستھانہ پہنچ جاتے تھے کہ عیسائی حکومت کے ماتحت امن و آسائش سے زندگی گزارنا ان کے نزدیک مذہباً نادرست تھا۔ وہ سکھوں کے دیہات پر بھی چھاپے مارتے رہتے تھے اور انگریزوں پر ضرب لگانے کا کوئی موقع ہاتھ آتا تو اس کا بھی تہ دل سے خیر مقدم کرتے :

> انھوں نے جنگِ کابل میں ہمارے دشمنوں کی امداد کے لیے بڑی فوج بھیجی اور اس میں سے ایک ہزار نے ہمارے خلاف استقامت سے جنگ کرتے ہوئے جانیں قربان کیں۔ صرف تسخیرِ غزنی کے دوران میں تین سو مجاہدوں نے انگریزی سنگینوں سے شہادت کی سعادت حاصل کی [1]

ہنٹر نے یہ تو بتا دیا کہ تین سو مجاہد غزنی میں شہید ہوئے تھے، لیکن یہ نہ بتایا کہ ایک ہزار نے کہاں شہادت پائی۔ یہ حقیقت بھی واضح کر دینی چاہیے کہ یہ مجاہدین ستھانہ سے نہ گئے تھے بلکہ وہی تھے جو مولوی سیّد نصیر الدّین کے ساتھ کئی سال سندھ، روجھان اور بلوچستان میں گزار چکے تھے ۔

اوکنلے کا بیان اوکنلے نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ مولوی نصیر الدّین نے پہاڑی علاقوں میں جہاد کا ارادہ ترک کر دیا اور شکار پور میں بیٹھے رہے۔ رفتہ رفتہ ان کے آدمیوں میں اضافہ ہوا۔ ہندوستان سے روپیہ اور مجاہدین آنے لگے۔ جب لارڈ آک لینڈ نے شاہ شجاع کو افغانستان پر مسلط کرنا چاہا تو مولوی نصیر الدّین نے دوست محمد خاں کی امداد کا فیصلہ کر لیا۔ بعض اصحاب اس پر تیار نہ تھے اور وہ لوٹ آئے۔ خود مولوی صاحب ایک ہزار آدمی لے کر کابل کی طرف بڑھے۔ ڈھاڈر سے انھوں نے تین سو مجاہدوں

---

[1] "ہندوستانی مسلمان" (انگریزی)، مرتبہ ولیم ہنٹر طبع سوم ص ۱۳ ۔

کی جمعیت دوست محمد خاں کی امداد کے لیے بھیج دی۔ یہ لوگ غزنی کی حفاظت پر متعین ہوئے تھے اور وہیں جاں بحق ہوئے[1]۔

یہ بیان اگرچہ غلطیوں سے پاک نہیں، تاہم اس سے مولوی نصیر الدین کے متعلق بیان کردہ حالات کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔

مولوی صاحب ستھانہ میں | بیان کیا جاتا ہے کہ مولوی صاحب اور اُن کے جو چند ساتھی بچے اور وہ ہولناک مصیبتوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے ستھانہ پہنچ گئے، جہاں مولوی نصیر الدین منگلوری کے زمانے سے مجاہدین نے مرکز قائم کر رکھا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی مجاہدین نے انھیں اپنا امیر بنا لیا۔ ستھانہ پہنچنے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ قیاس ہے کہ یہ واقعہ ۱۸۳۹ء کے اواخر یا ۱۸۴۰ء کے اوائل میں رونما ہوا ہوگا۔

انگریزی اقدام کا انجام | انگریزوں نے غزنی کی تسخیر کے بعد کابل پہنچ کر شاہ شجاع کو حکمران بنا دیا اور شرفائے افغانستان پر بڑی زیادتیاں کیں۔ لوگ شاہ شجاع سے پہلے بھی خوش نہ تھے۔ انگریزوں کی دراز دستیوں نے پوری قوم میں غیظ و غضب کی آگ لگا دی۔ شاہ شجاع، انگریزی سفیر اور انگریزی وکیل مارے گئے۔ انگریزی فوج جلال آباد کے راستے واپس ہوئی، لیکن قدم قدم پر افغانوں کی گولیوں کا ہدف بنتی رہی۔ پوری فوج میں سے صرف ایک شخص ڈاکٹر ڈرائیڈن زندہ سلامت جلال آباد پہنچا اور بیرونی دنیا اس الم نامے کی تفصیلات سے آگاہ ہوئی۔ انگریزوں نے دوبارہ زبردست فوجیں تیار کیں، مگر انجام کار افغانستان کو امیر دوست محمد خاں کے حوالے کیے بغیر کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔

ایک اور روایت | ہزارہ گزٹیئر اُردو میں بتایا گیا ہے کہ مولوی سید نصیر الدین دہلوی بہت نرم طبع تھے، اس لیے عوام میں بہت ہر دلعزیز ہو گئے۔ انھوں نے پائندہ خاں تنولی والیِ امب کو لکھا کہ ہمارا ساتھ دو اور ہر ممکن مدد کرو۔ پائندہ خاں نے انھیں امب بلا لیا۔ وہاں کئی روز مہمان رہے۔ مشہور ہے کہ پائندہ خاں نے انھیں زہر دلوا دیا تھا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ وہ امب ہی میں بیمار ہوئے اور بیماری ہی کی حالت میں ستھانہ آئے جہاں چند روز بعد وفات پائی[2]۔

---

[1] اوکنلے کا مقالہ انگریزی میں بعنوان "وہابی ہندوستان میں" مندرجہ کلکتہ ریویو ۱۸۷۰ء نیز جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی جلد چہارم ص ۳۵۶۔

[2] ہزارہ گزٹیئر ص ۳۶۳، لیکن یہ بالکل غلط ہے کہ پائندہ خاں نے مولوی صاحب کو زہر دلوا دیا۔ مجاہدین کے مختلف حلقوں کی طرف سے جتنی روایتیں مجھے مل سکیں ان میں سے کسی میں اس کے متعلق اشارہ تک موجود نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ مولوی صاحب امب ہی میں بیمار ہوئے ہوں اور اسی بیماری میں ستھانہ پہنچ کر وفات پائی ہو۔

تیرھواں باب

مولوی نصیر الدّین کی شخصیت

وفات مولوی نصیر الدّین منگلوری کی شہادت کے بعد صرف ستّر اسّی مجاہدین باقی رہ گئے تھے، جن کا انتظام میر اولاد علی عظیم آبادی نے سنبھال رکّھا تھا۔ مولوی سیّد نصیر الدّین ستھانہ پہنچے تو وہ امیر بن گئے، لیکن ابھی وہاں کوئی کارنامہ انجام نہ دینے پائے تھے کہ خدا کی طرف سے بُلاوا آگیا۔ صحیح تاریخ معلوم نہیں لیکن یہ یقینی ہے کہ اُن کی وفات ۱۸۴۰ء میں ہوئی۔ وہ ستھانہ میں دفن ہوئے[1] اور اُن کی قبر ۱۸۴۱ء کی طغیانیٔ دریائے سندھ میں بہ گئی[2]۔

آخری وقت کی حالت نوّاب وزیر الدّولہ نے لکّھا ہے کہ جب اُن پر نزع کی حالت طاری ہوئی تو خدا کی قدرت کا عجیب نقشہ نظر آیا۔ اس حالت میں انسان کے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں، لیکن:

حضرت مولانا . . . یکایک از بستر و
حالت اضطجاع برخاستہ قائم نشستند
و باوجود کمال ضعف و ناطاقتی کہ لاحق جسم
ہدایت مجسّم بود، چشم فیض حشم کشادہ و انگشت
سعادت سرنوشت سبابہ بر داشتہ

حضرت مولانا لیٹے لیٹے یکایک
اٹھے اور بہ اطمینان بیٹھ گئے۔ اگرچہ ان کا جسم
انتہائی ضُعف و بے طاقتی کا شکار ہو چکا تھا،
لیکن آنکھیں کھولیں۔ انگشتِ شہادت
اٹھائی اور بلند آواز سے عربی و ہندی میں

---

[1] ہزارہ گزٹیئر اردو میں خدا جانے کس سند کی بنا پر لکھا گیا ہے کہ مولوی نصیر الدّین منگلوری کے بعد مولوی محمد حسن امیر بنے۔ وہ ایک سال بعد بیت المال کا روپیہ لےکر اپنے بھائی حافظ جی کے ساتھ بھیرہ خوشاب کی طرف چلے گئے۔ پھر دوسرے مولوی نصیر الدّین پہلے دو آدمیوں کے ساتھ ستھانہ آگئے۔ ایک سال بعد شکارپور، غزنی، کابل وغیرہ کے راستے ستھانہ پہنچے اور تقریباً پانسو آدمی جمع کر لیے (۱۸۳۴ء)

[2] وزیر الدّولہ کے وصایا جلد اوّل ص۵۵۔

بہ بانگِ بلند و آوازارجمند بہ بیان فصیح و ایمان واسلام کے متعلق نہایت عمدہ باتیں
الفاظ صحیح کلمات ایمانی وایقانی وملفوظات بہت اچھے انداز میں بیان فرماتے رہے ،
اسلامی سرلبسر خوش کامی درزبان عربی و
محاوری ہندی ادا فرمودند[1]

ممتاز تریں کارنامہ مولوی سیّد نصیرالدّین کا ممتاز تریں کارنامہ یہ ہے کہ جب سیّد صاحب اور اُن کے دوسرے بلند منزلت رفقاء کی شہادت کے بعد جہاد کی گرم جوشیوں پر افسردگی طاری ہوگئی تو مولوی صاحب موصوف نے عزم وہمت سے کام لے کر اس کاروبار کو تازہ رونق بخشی۔ ہندوستان کے طول وعرض میں مسلمان بے حسی کا شکار ہو چکے تھے۔ اجنبیوں نے ملک کی حکومت اُن سے چھین لی تھی اور نظم ونسق کو اپنی مصلحتوں کے مطابق چلانے لگے تھے۔ گویا عام اسلامی فضا کی جگہ سراسر غیر اسلامی فضا پیدا ہو رہی تھی۔ سیّد صاحب اُٹھے، مسلمانوں کا جمود توڑا اور اُن کے سامنے یہ نصب العین پیش کیا کہ جانفشانی وجانبازی سے کام لے کر کھوئی ہوئی عزت وعظمت دوبارہ حاصل کی جاسکتی ہے اور اسلامیت کا وقار از سرِ نو قائم کیا جا سکتا ہے۔ مولوی سیّد نصیرالدّین نے جب دیکھا کہ تحریک کا جوش و خروش ختم ہو رہا ہے تو جوانمردانہ میدان میں آگئے اور اپنی ذات کو بے تامّل قربانی کے لیے پیش کر دیا۔ نوّاب وزیرالدّولہ بالکل بجا فرماتے ہیں کہ سیّد صاحب کی شہادت کے بعد خلق خدا کی ہدایت، شریعت کے احیاء اور جہاد کا کاروبار بے آب وتاب ہو رہا تھا۔ خدا کی رحمت سے مولوی سیّد نصیرالدّین کی بدولت اس کاروبار میں بے اندازہ رونق اور جلا پیدا ہوگئی[2]

نمایاں تریں خصوصیت ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مولوی سیّد نصیرالدّین کثیرالدّعا تھے اور ان کی دعا میں بڑی تاثیر تھی۔ نوّاب وزیرالدّولہ لکھتے ہیں کہ جب وہ کسی مجمع میں دعا کرتے تھے تو سب پر خاص ایمانی حالت طاری ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ سندھ میں انھوں نے مجمعِ کثیر کے درمیان

---

[1] وزیرالدّولہ کے وصایا جلد اوّل صـ۷ ؎
[2] ایضاً ایضاً صـ۵۴ ؎

دعا کی، جس کی تاثیر سے تمام لوگ زار زار رونے لگے۔ اکثر پر بیہوشی کی حالت طاری ہو گئی۔ بعض لوگ مجذوبیت کے عالم میں کپڑے پھاڑ کر صحرا کی طرف چلے گئے[1]۔

اسی طرح مولانا کی دعوت میں بڑی تاثیر تھی۔ یہ اُن کی حق پرستی، عشقِ کتاب و سنت اور اخلاص کا روشن ثبوت تھا۔

اہل و عیال مولوی صاحب کی شادی شاہ اسحٰق کی صاحبزادی سے ہوئی تھی اور اُن کے دو فرزند تھے۔ ایک کا نام عبداللہ تھا اور دوسرے کا عبدالحکیم۔ مولوی صاحب جہاد کے لیے نکلے تھے تو ان کے دونوں فرزند تعلیم پا رہے تھے۔ چنانچہ بعض مکاتیب میں ان کی تعلیم کے لیے تاکید فرمائی ہے۔ ایک مکتوب میں اپنی اہلیہ کو لکھتے ہیں:

امید از مالک خود قوی دارند کہ او	خدا سے قوی امید رکھیے کہ وہ ہم اور
جل جلالہٗ ما و شما را در دارِ دنیا بمراد ملاقی	آپ کو اس دنیا میں حسب مراد ملائے گا۔
کناند و در ہر امر توکل بر خدا باید کرد و استقامت	ہر کام میں خدا پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ فرض
بر نماز مفروضہ و تلاوت قرآن باید نمود و	نماز اور تلاوتِ قرآن پر استقامت ضروری
غفلت در زکوٰۃ نہ باید کرد و در تعلیم عبداللہ	ہے۔ ادائے زکوٰۃ میں غفلت نہ ہو۔ عبداللہ
و عبدالحکیم باید کوشید و دل را باہر دو فرزندان	اور عبدالحکیم کی تعلیم کے لیے کوشش کیجیے۔
باید سپارید و در وقت نشست و برخاست	دل دونوں بیٹوں میں لگائیے۔ اٹھتے بیٹھتے
و قیام و قعود نام خدا باید گرفت[2]۔	خدا کا نام لیتے رہیے۔

سیّد صاحب کی طرح مولوی نصیر الدین کو بھی اس دنیا میں بیوی اور بال بچوں سے ملاقات کی نوبت نہ آئی۔ اغلب ہے مولوی صاحب کی اہلیہ اور بیٹے شاہ اسحاق کے ساتھ ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے ہوں۔ مولانا سیّد عبدالحی رائے بریلوی نے لکھا ہے کہ مولانا سیّد نصیر الدین کے اولاد نہ چلی البتہ ان کے

---

[1] وزیر الدولہ کے وصایا جلد اوّل ص۲۷۳ و ۲۷۴۔

[2] اخبار مولوی سیّد نصیر الدین مخطوطہ ص۱۵۔

بھائی سید ناصر الدین کے ایک فرزند سید معز الدین تھے اور سید معز الدین کے فرزند سید ظہیر الدین احمد جن سے مولانا سید عبد الحی نے ۱۸۹۵ء میں ملاقات کی تھی۔ انھیں سید ظہیر الدین احمد نے ولی اللہی خاندان کی بیشتر تصنیفات چھپوائی تھیں، بلکہ اس غرض سے ایک مطبع قائم کر لیا تھا۔[1]

ایک نظم مولوی صاحب شعر بھی کہتے تھے، لیکن ان کی شعر گوئی بھی انھیں دینی مقاصد کے لیے وقف تھی، جن میں اُن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف ہؤا۔ یہاں تک کہ جان بھی انھیں مقاصد کے لیے دے دی۔ اُن کی ایک نظم مولوی ابو احمد علی نے اپنے رسالے میں نقل کی ہے، جس کے شعر شاعری کے معیار پر پورے اُترتے ہوں یا نہ، لیکن اُن کا مضمون بے شبہہ مستحقِ تحسین ہے۔ فرماتے ہیں:

اے مرے پروردگار کر دے کرم کی نظر — راہ نبیؐ اپنے کی مجھ پہ تُو کر جلوہ گر
پہنچوں اسی راہ سے خدمتِ عالی میں مَیں — مانع نہ ہو راہ کا کوئی بھی جنّ و بشر
کر دے مسلمان سے شرک کی باتوں کو دُور — شوق ہو توحید کا، عمر ہو اُس میں بسر
بدعت و کفر و نفاق ان کو تُو جلدی سے کھو — اوج ہو اسلام کا، شرع ہو با زیب و فر
پھوٹ مسلمانوں سے اے مرے رب دُور کر — اور انھیں ایسا بنا، جیسے ہوں شیر و شکر
جو کہ کرے غیر کو ساجھی خدا کا ذرا — ہے وہی عالم کے بیچ مشرک و کافر بتر
جو رکھے ولیوں سے بس دشمنی و کین و کد — لڑنے کو حق سے ہے صاف باندھ لی اس نے کمر

ہر کہ و مہ سے یہ عرض کرتا ہے عاجز نصیرؔ
رکھیے دُعاؤں میں آپ اس کو بھی مدِّ نظر

سید عبد الرحیم کی امارت بتایا جاتا ہے کہ مولوی سید نصیر الدین کی وفات کے بعد حاجی سید عبد الرحیم جماعتِ مجاہدین کے امیر بنے۔ پھر دریائے سندھ میں خوفناک طغیانی آئی، جس میں ستھانہ برباد ہو گیا۔ اُس بستی میں زندوں کے مکانات یا مُردوں کی قبروں کا کوئی نشان باقی نہ رہا اور مجاہدین

[1] "ارمغانِ احباب" بواسطہ معارف بابت فروری ۱۹۳۹ء۔

کی جماعت بکھر گئی۔ افسوس کہ سید عبدالرحیم کے متعلق مفصل معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ مولانا مشتاق احمد صاحب انبیٹھوی نے ایک سید عبدالرحیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا اصلی وطن افغانستان تھا۔ وہ پہلے شاہ رحم علی صاحب ساکن پنجلاسہ ضلع انبالہ سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہوئے۔ پھر امروہہ میں شاہ عبدالباری سے نسبت چشتیہ حاصل کی۔ آخر میں سید احمد شہید بریلوی سے بیعت کی۔ انھیں کے ساتھ جہاد کے لیے چلے گئے اور شہادت پائی[1]۔

ممکن ہے یہی سید عبدالرحیم ولایتی ہوں، جو مولوی سید نصیرالدین کی وفات پر مجاہدین کے امیر بنے۔ میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

یوں جون ۱۸۴۲ء میں جماعت مجاہدین کا دوسرا دَور ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور ان کے بھائی مولانا عنایت علی نے پھر سے مرکز مجاہدین کا انتظام کیا۔ ان کے حالات کتاب کے تیسرے حصے میں بیان ہوں گے۔

ایک غیر معلوم شخصیت اس سلسلے میں ایک غیر معلوم شخص کا ذکر ضروری ہے جو میدان جنگ سے ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں واپس آ گیا۔ مومن خاں مرحوم کے فارسی دیوان میں ایک قطعہ اس کے متعلق موجود ہے اور اس کا عنوان ہے: "تاریخ باز آمدن از جہاد"۔ مومن نے اس کا نام زین خاں بتایا ہے۔ وہ کون تھا؟ کہاں سے واپس آیا؟ دہلی پہنچ کر کیا کچھ کہتا رہا؟ میں انتہائی کاوش کے باوجود کچھ معلوم نہ کر سکا۔ قطعہ بطور یادگار ذیل میں درج ہے:

مولوی زین خاں کہ با ہمہ علم	حالش از سگ خراب تر باشد
از شیاطیں بود بہ خبث نہاں	گر بہ صورت ہمہ بشر باشد
رفت و چندے بہ فوج دیں جا کرد	تا ز صدقش بہ دل اثر باشد
آخرِ کار فتنہ ہا انگیخت	آخریں فتنہ ایں قدر باشد

[1] "انوار العاشقین" صہ ۸۲۔ بعض لوگ انھیں شہید بالاکوٹ بتاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ صحیح نہیں۔

تہمتے بست بر امیر کریم | باشد ایں عیبہا ہنر باشد
دشمنِ دوستانِ حق گردید | کینِ او مصطفیٰ سقر باشد
پوست برکندہ گفت طبعے کہ ہست | راز دانے کہ پردہ در باشد
بر حسد آب آدمیت ریخت | چہ کند ہر کہ بدگہر باشد
خرِ عیسیش خواندم و خجلم | کہ ز دجال ہم بتر باشد
کشفِ سعدی یقیں توانی کرد | گر ز اہل دلت خبر باشد

سالِ تاریخِ بازگشتنِ او
چہ بباید ہنوز خر باشد[1]

مولوی محمد قاسم | مولوی محمد قاسم پانی پتی کے متعلق بھی چند سطریں لکھ دینا ضروری ہے، جن کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کاغانی پہاڑوں کے ایک غار میں سید صاحب اور ان کے دو رفیقوں کے ڈھانچے بنا کر کھڑے کر دیے تھے اور لوگوں کو ان ڈھانچوں کی زیارت کرا کے یقین دلایا جاتا تھا کہ سید صاحب زندہ ہیں اور وہ وقت موعود پر ظاہر ہوں گے۔ انگریزی بیانات میں بتایا گیا ہے کہ مولوی زین العابدین نے اس فریب کا پردہ چاک کیا۔ ان کے ایک خط میں مولوی محمد قاسم کو "قاسم کذّاب" قرار دیا گیا ہے۔ مقدمہ انبالہ کی شہادتوں میں بھی اس امر کا ذکر آیا تھا۔

اوکنلے کے ایک بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ مولوی محمد قاسم غالباً شیخ ولی محمد پھلتی اور سید صاحب کی اہلیہ کے ہمراہ سندھ پہنچ گئے تھے۔ پھر مولوی سید نصیر الدین دہلوی کے ہمراہ جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔

"ہزارہ گزٹیئر" (اردو) میں بتایا گیا کہ مولوی صاحب جنگ دُب کے بعد چون[2] آدمی لے کر

---

[1] یہ قطعہ ان اشعار میں سے ہے جو برادرم امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتاب خانہ رام پور نے مومن کے فارسی دیوان سے نقل کرا کے ارسال فرمائے ہیں۔

[2] ہزارہ گزٹیئر صفحہ ۲۳۵-۲۳۶۔

کرڑال قوم میں حسن علی خاں کے پاس آگئے تھے۔ ایبٹ صاحب نے حکم دیا کہ وہ موضع عالم میں رہیں۔ چنانچہ وہ وہیں فوت ہوئے۔[1] ایک اور بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے انھیں گرفتار کیا اور سیالکوٹ میں قید کر دیا۔ وہیں انھوں نے وفات پائی۔

میری تحقیق کے مطابق مولوی محمد قاسم بڑے ہی مخلص مجاہد تھے۔ اغلب ہے وہ بھی مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی اور بعض دوسرے اصحاب خصوصاً اصحاب صادق پور کی طرح سیّد صاحب کی حیات و رجعت کے معتقد ہوں لیکن یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ انھوں نے اپنے اس عقیدے کو تقویت پہنچانے کی غرض سے کوئی چال چلی ہوگی۔

---

[1] کلکتہ ریویو بابت جولائی ۱۸۷۰ء صفحہ ۱۸۹۔

چودھواں باب

فرائضی تحریک اور تیتو میاں

اندرونِ ملک کی کیفیت اب تک ہماری توجہ جماعتِ مجاہدین کے اُس حصے کی سرگرمیوں پر جمی رہی، جو ہندوستان کی شمالی و مغربی سرحدوں میں مصروفِ کار تھا۔ ملک کے اندر جو اصلاحی کام ہوتا رہا، اُس کی کیفیت بھی اختصاراً بیان کر دینا ضروری ہے تاکہ تحریک یا اس سے متعلقہ یا مشابہ احوال کا ہر ضروری پہلو سامنے آجائے۔

سیّد صاحب کے خلفا خصوصاً مولانا سیّد محمد علی رام پوری، مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور مولانا عنایت علی بڑے اہتمام سے دعوت و تبلیغ میں مشغول تھے۔ وہ پہلے سیّد صاحب کے لیے روپے اور مجاہدین کا انتظام کرتے رہے۔ بعد ازاں مولوی سیّد نصیر الدّین کو ہر ممکن امداد دیتے رہے۔ ملک میں اصلاحِ عقائد و اعمال کا کام بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام پا رہا تھا۔ اس باب میں جو کچھ ہمیں معلوم ہو سکا، وہ تو آگے چل کر پیش کریں گے۔ یہاں دو تحریکوں کا سرسری ذکر ضروری ہے۔ ان میں سے فرائضی تحریک کو سیّد صاحب کی تحریک سے یقیناً کوئی علاقہ نہ تھا، لیکن اس کی بنیاد و اساس بھی مذہبی تھی اور وہ لمبی مدت تک ایک محدود دائرے میں بہت موثر رہی، لہٰذا اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری تحریک میر نثار علی عُرف تیتو میاں کی تھی جو سیّد صاحب کا مرید اور خلیفہ تھا۔

مولوی شریعت اللہ فرائضی تحریک کے بانی مولوی شریعت اللہ تھے، جو ضلع فرید پور (بنگال) کے ایک گاؤں بہادر پور میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں حج کے لیے چلے گئے۔ کم و بیش بیس برس مکّۂ معظمہ میں دینی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۸۰۲ء کے قریب وطن واپس آئے۔

وہ اپنے ساتھ بیش قیمت کتابیں بھی لائے تھے اور بیس برس کی تعلیم میں انھوں نے بہت سی تحقیقی

یادداشتیں مرتب کر لی تھیں۔ راستے میں اُن پر ڈاکا پڑا اور سب کچھ لُٹ گیا۔ مولوی صاحب نے خالی ہاتھ لوٹنا بے سود سمجھا اور ڈاکوؤں ہی کی معیت اختیار کر لی۔ اپنے زہد و اتقا سے تھوڑی ہی مدت میں ڈاکوؤں کو پرہیزگار اور عبادت گزار مسلمانوں کی جماعت بنا دیا۔

اصلاح کا آغاز ان رفیقوں کے ساتھ وطن پہنچے تو مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کا کام شروع کر دیا۔ گرد و پیش کے علما نے سخت مخالفت کی، لیکن مولوی شریعت اللہ اطمینان و دل جمعی سے اپنے کام میں لگے رہے اور تھوڑی ہی مدت میں اُن کا اثر دُور دُور تک پھیل گیا۔ غریب، مزدور اور کسان اُن کی تحریکِ اصلاح سے حد درجہ متاثر ہوئے اور سب مولوی صاحب پر جانیں چھڑکنے لگے۔

ودود میاں مولوی صاحب نے غالباً ۱۸۳۰ء میں وفات پائی پھر اُن کے فرزند ارجمند مولوی محمد محسن عرف ودود میاں نے تحریک کی باگ ڈور سنبھالی۔ وہ بڑے پُرجوش سرگرم آدمی تھے۔ انھوں نے گرد و پیش کے تمام کسانوں کو سچے مسلمان بنا کر منظم کر دیا۔ اُن کی اپنی پنچائتیں قائم کر دیں، جو ہر قسم کے تنازعات کا فیصلہ کرتیں۔ اِس طرح اپنے تمام مریدوں اور معتقدوں کو ایک مستقل نظام سے وابستہ کر دیا۔

الارض للہ آخر ودود میاں نے "الارض للہ" کا نعرہ لگایا اور اعلان کر دیا کہ زمین خدا کی ملکیت ہے اور کسی کو حق نہیں کہ بہ طور وراثت اس پر قابض ہو۔ جو لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں، وہی اس کے مالک ہیں۔ حکومت اپنے واجبات ان سے لے سکتی ہے۔ نام نہاد مالکانِ اراضی اُن سے کوئی لگان وصول کرنے کے حق دار نہیں۔ اس اعلان پر بڑے بڑے زمیندار ودود میاں کے جانی دشمن بن گئے۔ ان کے خلاف ڈکیتی اور مداخلتِ بے جا کے کئی مقدّمے قائم کرائے گئے، لیکن گواہ نہ مل سکنے کے باعث سب کے سب ناکام رہے۔ ۱۸۶۰ء میں انھوں نے وفات پائی[ـه]۔

فرائضی تحریک تحریک کا نام فرائضی اس لیے پڑا کہ اس میں شرعی فرائض کی بجا آوری پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ ودود میاں نے تنظیم کمال پر پہنچا دی تھی۔ اُن کے کارکن جگہ جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ ہر چھوٹی بڑی خبر انھیں بروقت مل جاتی تھی۔ بے خوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ مشرقی بنگال کے بڑے حصّے میں انھوں نے ایک نوع کی متوازی حکومت قائم کر دی تھی اور اُن کی جماعت کے لوگوں کو حکومت

ـه فضلی صاحب سیکرٹری حکومت پاکستان نے بتایا کہ ودود میاں کو زہر دلایا گیا تھا۔ ان کے فرزند کی سرپرستی خود حکومت نے اپنی خاص مصلحتوں کی بنا پر کی۔ بادشاہ میاں جو مشہور قومی کارکن ہیں، ودود میاں کے پوتے ہیں۔

سے اس کے سوا کوئی واسطہ نہ رہا تھا کہ وہ زمین کا مالیہ باقاعدہ ادا کرتے تھے۔ کسانوں کی تنظیم اور زیادہ سے زیادہ لاتعاون کی یہ پہلی کامیاب تحریک تھی، جو مشرقی بنگال میں جاری ہوئی۔ افسوس کہ ودود میاں کی وفات کے بعد اس کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہ رہا۔

میر نثار علی عرف تیتو میاں میر نثار علی عرف تیتو میاں سیّد صاحب کا مرید تھا۔ وہ چاند پور کے ایک خوشحال زمیندار گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور شادی بھی ایک امیر گھرانے میں ہوئی تھی[1]۔ ابتدا میں پہلوانی کرتا تھا، پھر ندیا میں ملازمت کر لی۔ اُس زمانے میں بھی مظلوموں کی حمایت کے لیے پیش پیش رہتا تھا۔ اتفاق سے ایک زمیندار کے ساتھ اس کا جھگڑا ہو گیا۔ اُس نے مقدمہ دائر کر دیا، جس میں تیتو میاں کو قید کی سزا ہوئی۔ قید سے رہا ہوتے ہی وہ دہلی کے ایک شہزادے کے ساتھ حج کو چلا گیا۔ مکہ معظمہ ہی میں سیّد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہیں بیعت کی۔ پھر اس کی پوری زندگی بدل گئی اور ایک ایک لمحہ دین کی خدمت میں بسر ہونے لگا۔ ۱۸۲۷ء میں وطن واپس آیا جب سیّد صاحب ہندوستان سے ہجرت کر کے سرحد میں جہاد فی سبیل اللہ کا آغاز کر چکے تھے۔

تحریکِ اصلاح تیتو میاں نے مسلمانوں میں اصلاحِ عقائد و اعمال کی تحریک جاری کر دی۔ اوکنلے نے لکھا ہے کہ کم و بیش اٹھارہ میل لمبے اور بارہ میل چوڑے علاقے میں ان کا اثر و رسوخ پھیل گیا تھا اس علاقے کا مرکزی مقام نرکل بریا تھا۔ سیّد جعفر علی نقوی "منظورۃ السعداء" میں فرماتے ہیں کہ پورنا کے ایک زمیندار کشن رائے کے علاقے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے، جن کے باشندے سیّد صاحب کے مرید تھے۔ تہمد کے سوا ان کے بدن پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ نماز روزے کے سوا کوئی عبادت نہ جانتے تھے۔ تیتو میاں وہاں پہنچے تو ان لوگوں کو دینی مسائل کی تعلیم دی۔ مرکزی مقام میں نماز جمعہ کا انتظام کیا اور وہاں کثرت سے مسلمان جمع ہونے لگے۔ تیتو میاں غیر شرعی رسموں سے روکتا تھا۔ مثلاً قبروں کی پوجا، نذر نیاز وغیرہ۔ تاکید کرتا تھا کہ مسلمان ڈاڑھیاں رکھیں۔ غیر مسلموں کے رسوم و رواج چھوڑ دیں اور ایسا

---

[1] اوکنلے نے تیتو میاں کے خسر کا نام منشی امیر بتایا ہے۔ (ملاحظہ ہو "کلکتہ ریویو" بابت جولائی ۱۸۷۰ء)

دینی اس ہیئت میں جس میں وہ غیر مسلموں سے ممتاز معلوم ہوں۔

جمعہ کا اجتماع کشن رائے کے بیٹے کو بے وجہ ناگوار معلوم ہوا اور اُس نے اس اجتماع کا تمسخر اُڑانا شروع کیا۔ تیتومیاں نے بڑے تحمل سے اُسے سمجھایا کہ کسی کے دین کا تمسخر اڑانا بہت نازیبا ہے۔ تمھیں یہ اجتماع بُرا معلوم ہوتا ہے۔ ذرا اپنے دین کی حالت پر نظر ڈالو۔ تمھارے ہاں عبادت کے وقت سنکھ بجتا ہے، جس کی آواز گدھے کی آواز کے مشابہ ہوتی ہے۔ کشن رائے کا بیٹا یہ سنتے ہی ایک دم غصے میں آگیا اور بولا کہ پھر ایسا اجتماع ہوا تو تمھیں مزہ چکھاؤں گا۔

بہرحال اُس نے اپنے آدمیوں کو حکم دے دیا کہ جب مسلمان جمعہ کی نماز کے لیے جمع ہوں تو اُن کے اردگرد خوب سنکھ بجاؤ۔ اس پر عمل ہوا۔ تاہم تیتومیاں نے مسلمانوں کو اشتعال سے باز رکھا۔ البتہ جماعت کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔

کشن رائے کی دراز دستیاں

اوپر جو کچھ بیان ہوا، یہ مولوی سید جعفر علی نقوی کی تحریر سے ماخوذ ہے، جن کی تمام معلومات شنید پر مبنی تھیں، اگرچہ یقین ہے کہ انھوں نے واقعات کی خوب چھان بین کرلی ہوگی۔ بعض انگریزوں نے ذاتی تحقیقات کی بنا پر جو کچھ لکھا، اُس کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ مسلمانوں میں دین داری کے فروغ پر کشن رائے سخت ناراض ہوگیا، یہاں تک کہ اُس نے اپنے مسلمان کسانوں پر اڑھائی روپے فی کس کے حساب سے ڈاڑھیوں کا ٹیکس لگا دیا اور خود اپنے حلقے کا دورہ شروع کر دیا۔[۲] جہاں جاتا، مسلمانوں سے یہ ٹیکس وصول کرتا۔ پورنا سے ٹیکس کی رقم جمع کرکے وہ سرفراز پور پہنچا تو وہاں تیتومیاں کے ساتھی موجود تھے۔ انھیں زمیندار کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا اور اُس کے پیادے کو پکڑ کر خوب پیٹا۔ کشن رائے کو یہ خبر ملی تو اس نے دو تین سو آدمی لے کر حملہ کر دیا۔ بعض گھروں کو لُوٹا اور ایک مسجد جلادی۔

---

[۱] "منظورہ" کے الفاظ ہیں: خواہید دید آنچہ دیدنی است۔ [۲] ہنٹر نے لکھا ہے کہ کشن رائے جو اچھامتی ندی کے کنارے کا بہت بڑا زمیندار تھا، پانچ شلنگ کا ٹیکس ہر اس کسان پر لگا دیا تھا جو تیتومیاں کی اصلاحی تحریک میں شامل ہوتا تھا۔ ایک اور زمیندار نے ایک تعزیہ توڑ دینے پر ایک شخص کو اپنے جیل خانے میں قید کر دیا (ہمارے ہندی مسلمان حاشیہ ص۳۲) یہ بھی لکھا ہے کہ تحریک تین ضلعوں چوبیس پرگنہ، ندیا اور فرید پور میں پھیل گئی تھی۔

اس طرح حالات نزاکت کی آخری منزل پر پہنچ گئے ۔

زمیندار اور مسلمانوں دونوں نے پاس کے تھانے میں رپورٹیں لکھوا دیں۔ مسلمانوں کی رپورٹ یہ تھی کہ زمیندار لوٹ مار اور آتش زنی کا مرتکب ہؤا، زمیندار کی شکایت کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمان کسانوں نے اس کے آدمیوں کو حبس بے جا میں رکھا۔ تھانے کا محرّر تحقیق کے لیے موقع پر پہنچا تو زمیندار روپوش ہو گیا اور اُس نے ۷۔ جولائی ۱۸۳۱ء کو بسرت کے مجسٹریٹ کی عدالت میں حاضر ہو کر بیان دے دیا کہ جو الزام مجھ پر لگایا گیا ہے۔ میں اُس سے بالکل بری ہوں اور مجھے سرے سے کسی واقعے کی اطّلاع ہی نہیں۔ تھانیدار ہندو تھا۔ اس نے تفتیش اپنے ہاتھ میں لی تو زمیندار کے ہندو کارکنوں سے مل کر یہ داستان وضع کر لی کہ مسلمانوں نے خود مسجد اور گھروں کو آگ لگا کر زمیندار کو ملزم گردا ننے کی کوشش کی۔ یہ سُن کر تیتومیاں کے ساتھی روپوش ہو گئے اور تھانیدار نے بہ اطمینانِ خاطر رپورٹ کر دی کہ موقع پر ان کی غیر حاضری سے ثابت ہو گیا، اصل فعل انھیں کا تھا ۔

پیچیدگی میں اضافہ تیتومیاں کے ساتھی مجسٹریٹ کی عدالت میں پہنچے، پولیس پر رشوت لے لینے کا الزام لگایا اور اس کے ثبوت میں دو گواہ پیش کرنے پر آمادہ تھے، لیکن مجسٹریٹ نے ان کے بیان پر کوئی توجہ نہ کی ۔

اصل جھگڑا طے نہ ہؤا تھا کہ کشن رائے نے مختلف مسلمان کسانوں پر بقایا کے جھوٹے دعوے دائر کر کے ڈگریاں حاصل کر لیں اور ان ڈگریوں کے اجراء کے لیے پولیس کی مدد لے لی۔ غرض ہر ممکن ذریعے سے مسلمانوں کو ظلم و جبر کا نشانہ بنا دیا۔ پولیس ان کی دشمنی پر تُلی بیٹھی تھی۔ مجسٹریٹ زمیندار کے زیرِ اثر تھا اور مسلمانوں کی کسی شکایت پر کان نہ دھرتا تھا۔ مجبور ہو کر وہ اپیل کے لیے کلکتہ پہنچے۔ وہاں کا مجسٹریٹ دورے پر باقر گنج گیا ہؤا تھا۔ لہٰذا وہ ناکام واپس آئے۔ جب حق رسی کا کوئی بھی ذریعہ باقی نہ رہا تو انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ ظلم کے خلاف لڑ کر جانیں دے دینی چاہئیں ۔

واضح رہے کہ حاکموں اور اُن کے کارندوں کی روش حق و انصاف کے تمام تقاضوں کے خلاف تھی اور بنگال صدیوں تک اسلامی حکومت کے ماتحت رہ چکا تھا۔ انگریزوں نے ابتدا میں صرف

دیوانی یعنی عام نظم و نسق کے حقوق اجارے پر بادشاہ دہلی سے لیے تھے، بعد ازاں آہستہ آہستہ اس کے مالک و مختار بن گئے تھے۔ مسلمانوں نے اگر یہ سمجھا کہ اُن سے حکومت لے کر خود انھیں کو ہدف ظلم و جبر بنایا جارہا ہے تو اس کے لیے معقول وجوہ موجود تھے ؎

حق و انصاف کے لیے جنگ بعد ازاں جو واقعات پیش آئے۔ اُن کے متعلق بیانات میں کس قدر اختلاف ہے۔ اوکنلے نے لکھا ہے کہ پنجاب کے ایک درویش مسکین شاہ نے تیتو میاں اور ان کے ساتھیوں کو جہاد پر آمادہ کیا تھا اور مسکین شاہ ہی آخری دم تک اس تحریک کی روح رواں بنا رہا۔ جہاد شروع کرنے سے پیشتر رسد اور روپیہ فراہم کیا گیا۔ چاول کی بہت بڑی مقدار نرکل بریا میں معز الدین بسواس کے پاس جمع کر دی گئی۔ ۲۳۔ اکتوبر ۱۸۳۱ء کو تیتو میاں نے گرد و نواح کے مسلمانوں کو دعوت دے کر جمع کیا۔ سب نے نرکل بریا کے ارد گرد بانس کی مضبوط فصیل بنا لی۔ ان دفاعی انتظامات میں کئی دن صرف ہو گئے۔ کشن رائے کو مسلمانوں کے اجتماع کا علم ہوا تو اس نے درخواستیں دیں کہ حکومت کو اس حرکت کے خلاف قدم اٹھانا چاہیے۔ درخواستوں کا نتیجہ نکلنے سے پہلے پانسو مسلمانوں نے ۶۔ نومبر کو پورنا پر حملہ کر دیا۔ اس کا ہدف صرف غیر مسلم نہ تھے بلکہ وہ مسلمان بھی تھے، جو تیتو میاں اور ان کے ساتھیوں سے اختلاف رائے رکھتے تھے۔ پھر اعلان کر دیا گیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہو گئی۔ انگریزوں نے بے انصافی سے بنگال پر قبضہ کر کے اسلامی حکومت ختم کی تھی، اب مسلمان اس بے انصافی کی تلافی کرائیں گے ؎

مجاہدین کی سالاری کا منصب غلام معصوم نے سنبھال لیا[1]۔ پھر ندیا، لوگھاٹا، جسور، رام چند نگر اور ہگلی پر حملے ہوئے۔ ۱۴۔ نومبر کو شیر پور کے ایک مسلمان زمیندار کی گوشمالی کی گئی۔ اوکنلے کا بیان ہے کہ غلام معصوم نے اس زمیندار کی صاحبزادی سے جبراً نکاح کر لیا ؎

ناکام انسدادی اقدامات جس حصے میں یہ واقعات پیش آ رہے تھے، وہ نیل کے کارخانوں کا

---

[1] ہنٹر نے مجاہدین کی تعداد تین چار ہزار بتائی ہے ؎

مرکز تھا۔ ایک کارخانے کے نائب مہتمم مسٹر پیرون نے تمام حالات اپنے کارخانے کے مالک مسٹر سٹارم کو کلکتہ لکھ بھیجے۔ ان میں کشن رائے کی تمام دراز دستیوں کو کھول کر بیان کر دیا۔ آخر میں یہ بھی بتا دیا کہ اگر جلد انسدادی قدم نہ اٹھایا گیا تو ہنگامہ سخت خطرناک صورت اختیار کرلے گا۔ مسٹر سٹارم نے برست اور ندیا کے مجسٹریٹوں کو اطلاع دے دی۔ برست کے مجسٹریٹ کی رپورٹ پر کلکتہ سے ۱۴۔ نومبر ۱۸۳۱ء کو بلسٹیا کی ایک جمعیت بھیجی گئی، جس کے سرعسکر کا نام الیگزانڈر تھا۔ مجاہدین نے غلام معصوم کی سرکردگی میں اس جمعیت کو شکست فاش دی۔ دس سپاہی اور تین برقنداز مارے گئے، بہت سے زخمی ہوئے۔ الیگزانڈر بہ مشکل جان بچا کر بھاگا۔ اسی طرح ایک انگریز زمیندار نے جو نیل کی کاشت کراتا تھا، تین سو سپاہیوں کے ساتھ حملہ کیا لیکن اس نے بھی شکست کھائی۔ ۱۷۔ نومبر کو بعض انگریز ہاتھیوں پر سوار ہو کر نرکل بریا پہنچے، ان کے ساتھ بھی جمعیت تھی۔ وہ بھی پسپائی پر مجبور ہو گئے۔ ندیا کی عدالت فوجداری کا ناظر اور دو برقنداز مارے گئے۔ غرض اس حصے میں نظم و نسق بالکل معطل ہو گیا ؛

شہادت زار آخر کلکتہ سے ایک بڑی فوج بھیجی گئی، جس میں سوار بھی تھے اور پیادے بھی۔ اس کے ساتھ دو توپیں تھیں۔ تیتو میاں نے چھ سو آدمی ہمراہ لے کر سخت مقابلہ کیا۔ ان کے بہت سے ساتھی شہید ہوئے۔ خود تیتو میاں نے شہادت پائی۔ غلام معصوم اور ساڑھے تین سو کے قریب مجاہدین زندہ گرفتار کر لیے گئے۔ اڈکنلے نے لکھا ہے کہ فوج کے ابتدائی حملے میں ساٹھ ستر شہید ہوئے۔ باقی لوگ بانس کی فصیل کے پیچھے چلے گئے اور مقابلہ کرتے رہے۔ آخر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے ؛

سید جعفر علی نقوی فرماتے ہیں: تیتو میاں نے فوج کو دیکھتے ہی ساتھیوں سے کہہ دیا تھا کہ بسرِ استقامت سے شہادت قبول کرنے کا درجہ بہت بلند ہے۔ ہتھیار پھینک دو، صفیں باندھ کر قبلہ رو ہو جاؤ اور نماز پڑھو۔ اکثر مجاہدین نے ایسا ہی کیا۔ بعض ایک مکان میں جا بیٹھے۔ بعض درختوں پر چڑھ گئے۔ تیتو میاں نے سب سے پہلے شہادت پائی۔ اس کے ساتھی بھی یکے بعد دیگرے شہید ہوتے گئے۔ فوج نے اس مکان کو آگ لگا دی، جس میں مجاہدین نے پناہ لی تھی۔ کچھ اندر جل گئے۔ جو باہر نکلے، وہ شہید ہوئے یا گرفتار کر لیے گئے ؛

مقدمہ اور سزائیں علی پور جیل میں گرفتار شدہ مجاہدین پر مقدمہ چلا۔ مجسٹریٹ کی رائے یہ تھی کہ مسلمان واقعی مظلوم تھے۔ کسی نے ان کی داد رسی نہ کی اور بہت برا کیا، لیکن انھیں حاکموں کا مقابلہ نہ کرنا چاہیے تھا۔ غلام معصوم کو مقدمے میں موت کی سزا دی گئی۔ باقی اسیروں میں سے ایک سو چالیس کو مختلف المیعاد قید کا حکم سنایا گیا۔ کشن رائے کے تمام نوکر چاکر بھی پکڑے گئے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انھیں کیا کیا سزائیں ملیں ؛

اس پورے معاملے کے متعلق کسی کی رائے خواہ کچھ ہو، لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ حق رسی کے تمام جائز وسائل سے مایوس ہو جانے کے بعد غیرت و حمیت کا تقاضا اس کے سوا کچھ نہ تھا جانی قربانی پیش کی جائے۔ تیتو میاں کے دل میں یہ جذبہ سید صاحب کی تربیت سے پیدا ہوا تھا۔ یہ قومی زندگی کا روشن نشان تھا۔ جن گروہوں کو عزت کی زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آئے، وہ اگر عزت سے جانیں دے دینے کے لیے تیار نہ ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ زندہ رہنے کا استحقاق کھو چکے ہیں۔ ہنٹر نے اپنی کتاب میں صرف تیتو میاں کی مجاہدانہ سرگرمیوں کو ابھارا، ان اسباب کے متعلق بالکل سکوت اختیار کیے رکھا جو افسوسناک صورت حال پیدا کرنے کے موجب بنے ؛

(مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی)

پہلا باب

مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی

تمہید ۱۸۳۱ء کی طغیانیِ سندھ کے بعد مجاہدین کا وہ مرکز بھی تباہ ہو چکا تھا، جسے مولوی سید نصیر الدین نے تازہ رونق بخشی تھی۔ جو تھوڑے سے مجاہدین باقی رہ گئے تھے انھوں نے میر ولایت علی کو اپنا امیر بنا لیا تھا، جو ایک متبع مولوی نصیر الدین منگلوری کی شہادت کے بعد بھی تھوڑی دیر کے لیے منصبِ امارت پر فائز رہے تھے۔ مجاہدین کی تعداد بہ ظاہر بہت کم تھی اور ساز و سامان بھی بہ قدرِ ضرورت موجود نہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے جہاد فی سبیل اللہ کا چراغ تو روشن رکھا، لیکن کوئی قابلِ ذکر اقدام نہ کر سکے۔

اِس اثناء میں سید صاحب کے مقرّر فرمائے ہوے داعی ہندوستان کے مختلف حصّوں میں دعوت و تبلیغ کر رہے تھے۔ ان میں ممتاز ترین حیثیت مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور ان کے بھائی مولانا عنایت علی کو حاصل ہوئی۔ سید صاحب کے ارادت مندوں کی نظریں انھیں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ خود از سرِ نو ایک پائدار و استوار مرکز قائم کرنے کے لیے بیتاب تھے، تاہم حسنِ تدبیر کا تقاضا یہ تھا کہ احوالِ سرحد کا جائزہ لیا جاتا اور اس کے بعد کوئی مناسب قدم اٹھایا جاتا۔ سرحد کے اکابر سے ان کا نامہ و پیام جاری تھا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ سازگار ماحول پیدا ہو چکا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانے میں تامّل نہ کیا۔ اُن کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا تذکرہ شروع کرنے سے پیشتر ابتدائی حالات بیان کر دینے ضروری ہیں۔

مولانا ولایت علی مولانا ولایت علی ابن مولوی فتح علی ایک ممتاز زبیری گھرانے کے چشم و چراغ تھے، جسے عظیم آباد میں امارت و ریاست کا درجہ حاصل تھا۔ ۱۲۰۵ھ (۹۱-۱۷۹۰ء) میں پیدا ہوے۔ "سید احمد شہید" میں بتایا جا چکا ہے کہ لکھنؤ میں تعلیم پا رہے تھے، جب سید صاحب سے ملاقات ہوئی اور پہلی ہی صحبت میں نقدِ دل ہار بیٹھے۔ چونکہ دولت مند گھرانے کے فرد تھے۔ اس لیے زندگی کا

عام اسلوب خاصا امیرانہ تھا۔ سیّد صاحب سے تعلّق پیدا ہوتے ہی مولانا کی کیفیت بالکل بدل گئی۔ چنانچہ وہ تعلیم چھوڑ کر سیّد صاحب کے ساتھ رائے بریلی چلے گئے اور غالباً مولانا شاہ اسمٰعیل کی جماعت میں اُنھیں شامل کر دیا گیا۔ شاہ صاحب سے کچھ کتابیں بھی پڑھتے رہے۔ اوقاتِ عبادت و تعلیم کے بعد پورا وقت اپنے ساتھیوں کی خدمت میں گزارتے تھے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے۔ غرض کوئی معمولی سے معمولی کام کرنے میں بھی انھیں عار نہ تھی۔

شانِ للّٰہیت "تذکرۂ صادقہ" میں بتایا گیا ہے کہ مولانا ولایت علی کے والد ماجد کو ان کے رائے بریلی پہنچنے کا علم ہوا تو اپنے ایک ملازم کو چار سو روپے اور ملبوسات دے کر بھیجا۔ اُس زمانے میں سیّد صاحب مہمانوں کے لیے ایک مکان تعمیر کرا رہے تھے۔ تمام ارادت مند اور خود سیّد صاحب تعمیر کے سلسلے میں مختلف کام انجام دیتے تھے۔ مولانا ولایت علی اُس گروہ میں شریک تھے، جو گارا تیار کرتا تھا۔ ملازم رائے بریلی پہنچا تو مولانا نے ایک موٹا سیاہ تہمد باندھ رکھّا تھا اور گارے میں لتھڑے ہوئے کام کر رہے تھے۔ صورت اِس درجہ متغیّر ہو چکی تھی کہ ملازم ہم کلامی کے باوجود آپ کو پہچان نہ سکا۔ آپ کا پتا خود آپ سے پوچھا۔ جب مولانا نے جواب دیا "ولایت علی میں ہی ہوں" تو ملازم نے اسے مذاق سمجھا اور بہت ناراض ہوا۔ آپ نے کہا: بھائی! آپ کو یقین نہیں آتا تو جائیے قافلے میں تفتیش کر لیجیے۔ جب لوگوں نے اُسے یقین دلایا کہ عظیم آباد کے رئیس زادے ولایت علی یہی ہیں تو وہ بہت نادم ہوا۔ آپ کو گلے سے لگا لیا۔ معافی مانگی اور آپ کی حالت دیکھ کر زار زار رونے لگا۔ رقم اور ملبوسات آپ کی خدمت میں پیش کر دیے۔ آپ نے انھیں دیکھا تک نہیں اور دونوں چیزیں بند کی بند سیّد صاحب کے حضور میں رکھ کر واپس چلے آئے[1]۔

وعظ و تبلیغ مولانا رائے بریلی میں تربیت پا کر وطن گئے تو زندگی کا ایک ایک لمحہ وعظ و تبلیغ کے لیے وقف کر دیا۔ انھیں کی کوشش سے اُن کا خاندان اور دوسرے اعزہ و اقربا سیّد صاحب سے وابستہ

---

[1] "الدر المنثور معروف بہ تذکرۂ صادقہ" ص ۱۱۲۔

ہوئے۔ مثلاً مولانا کے والد مولوی فتح علی، اُن کے بھائی مولانا عنایت علی، مولانا طالب علی اور مولانا فرحت حسین،
ان کے اقربا میں سے مولانا شاہ محمد حسین، مولوی الٰہی بخش، مولانا احمد اللہ، مولانا یحییٰ علی، مولانا فیّاض علی،
مولوی قمر الدین، مولوی باقر علی۔ غرض ان سے تعلق رکھنے والوں میں ایک بھی فرد ایسا باقی نہ رہا، جس نے
سیّد صاحب کی ارادت کا حلقہ اپنی گردن میں نہ ڈال لیا اور ان حضرات کی قربانیاں تاریخ مجاہدین
کا نہایت شاندار اور درخشاں باب ہیں۔

دینی خدمات مولانا ولایت علی سیّد صاحب کے ساتھ ہجرت کر کے بہ غرضِ جہاد گئے تھے، لیکن
جیسا کہ "سیّد احمد شہید" اور "جماعتِ مجاہدین" میں بتایا جا چکا ہے، انھیں سیّد صاحب نے دعوت و
تبلیغ کی غرض سے حیدر آباد (دکن) بھیج دیا تھا[1]، جہاں وہ کم و بیش چار سال یہ خدمت انجام دیتے رہے۔
حیدر آباد میں انھوں نے جو کارنامے انجام دیے وہ "جماعتِ مجاہدین" میں بھی بیان ہو چکے ہیں اور زیرِ مطالعہ
کتاب کے ابتدائی ابواب میں بھی ان کی سرسری کیفیت عرض کی جا چکی ہے، لہٰذا اعادے کی ضرورت
نہیں۔ بالاکوٹ میں سیّد صاحب کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور اسی اثناء میں مولانا کے والد ماجد کا انتقال
ہو گیا تو مولانا حیدر آباد سے برہان پور، سیونی، نرسنگھ پور اور جبل پور ہوتے ہوئے عظیم آباد پہنچے اور اصلاحِ
عقائد و جہاد کا مقصد پیشِ نظر رکھتے ہوئے بہار، بنگال، اڑیسہ اور الٰہ آباد میں دعوت و تبلیغ کا منظم سلسلہ

---

[1] تواریخ عجیبہ (سوانح احمدی) میں مرقوم ہے کہ سیّد صاحب نے پہلے انھیں سفیر بنا کر زمان شاہ والیِ کابل اور اس کے
وزیر دوست محمد خاں کے پاس بھیجا تھا۔ یہ صحیح نہیں۔ زمان شاہ سیّد صاحب کے سرحد جانے سے ربع صدی پیشتر معزول
اور بینائی سے محروم ہو چکا تھا۔ وہ پہلے ایران میں رہا پھر ہندوستان آگیا۔ انگریزوں نے اس کے لیے دو ہزار ماہوار وظیفہ
مقرر کر دیا۔ اس نے لدھیانہ میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں ۱۸۴۵ء میں وفات پائی۔ دوست محمد خاں کبھی زمان شاہ کا وزیر نہ ہوا۔
سدوزئیوں کی حکومت میں افراتفری پیدا ہوئی تو پایندہ خاں بارک زئی کے بیٹے افغانستان کے مختلف صوبوں (بہ استثناء ہرات)
پر قابض ہو گئے تھے۔ دوست محمد خاں نے کابل کی حکومت سنبھال لی تھی۔ غرض مولانا ولایت علی کو سفیر بنا کر کابل بھیجنے
کا واقعہ غلط ہے۔

قائم کردیا، جس کی اجمالی کیفیت یہ ہے:

داعی	علاقہ
شاہ محمد حسین امام جامع نمو ہیہ	چھپرہ، مظفرپور، ترہٹ اور اطراف پٹنہ
مولانا عنایت علی	بنگال
مولوی زین العابدین حیدرآبادی	الٰہ آباد
مولوی محمد عباس حیدرآبادی	اڑیسہ [1]

طریق تبلیغ یہ تھا کہ مولانا خود اور ان کے مقرّر کیے ہوئے داعی ایک ایک قریے اور ایک ایک موضع میں جاتے، مسلمانوں کو پابند شریعت بناتے، مسجدیں آباد کرتے اور ارشاد و ہدایت کا مستقل سلسلہ جاری کر دیتے۔

مولانا کی کیفیت خود مولانا کی کیفیت "تذکرۂ صادقہ" میں یوں مرقوم ہے:

اشاعتِ دین میں آپ کی ان تھک کوشش غرب و شرق، شمال و جنوب، کُل کو محیط تھی۔ مجمعوں اور میلوں (مثلاً بہار کا چراغاں) میں بھی بہ غرضِ تبلیغ و پند پہنچتے اور نور بافوں کو کرگہ میں جا کر اور کسانوں کو ان کے کھیتوں پر پہنچ کر اللہ کی اطاعت و بندگی کی ترغیب دیتے اور ان کی بدزبانی اور غصّوں کو شربت کی طرح نوش کر جاتے۔ آپ اپنے دَور و سَیر میں قریہ بہ قریہ فروکش ہوتے جاتے اور اللہ کی باتیں پہنچاتے جاتے، اس لیے اپنے مخصوص مقامات تک پہنچنے میں مہینوں اور برسوں کی آپ کو دیر لگتی [2]۔

تعلیم اور اشاعتِ کتب جب وطن میں مقیم ہوتے تو ظہر سے عصر تک قرآن و حدیث کا درس دیتے۔ "تذکرۂ صادقہ" مظہر ہے:

---

[1] مولوی زین العابدین اور مولوی عباس مبارز الدولہ کی نظر بندی کے بعد چلے آئے تھے۔ مولانا نے انھیں اپنے پاس ٹھہرایا۔ پھر دعوت و تبلیغ کا کام سونپ دیا۔ [2] "تذکرہ صادقہ" ص ۱۶۔

مولوی عبداللہ آپ کے خلف اکبر قاری ہوتے۔ دوسرے علما ایک ایک تفسیر ہاتھ میں لے بیٹھتے۔ علماء کے علاوہ مریدوں کی بڑی بھاری صف ہوتی۔ قرآن مجید اور "بلوغ المرام" کا لفظی ترجمہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو پڑھواتے تاکہ لوگ اللہ کی مرضی اور غیر مرضی (امر و نہی) سے آگاہ ہوجائیں۔ اَن پڑھ بھی نمازوں میں اپنے پڑھنے کی سورتوں اور دعاؤں کے معانی اور مطالب سے خوب آگاہ ہوتے[1]۔

ضروری اور مفید دینی کتابوں کی اشاعت کا بھی خاص اہتمام تھا۔ چنانچہ شاہ محمد اسحٰق سے شاہ عبدالقادر کا ترجمۂ قرآن اور شاہ اسمٰعیل شہید کے رسائل منگوائے اور انھیں مطبع حسینی لکھنؤ میں چھپوانے کی کوشش کی۔ وہاں یہ چھپ نہ سکیں تو اپنے خلیفہ مولوی بدیع الزّمان بردوانی کو اس کام کے لیے تیار کیا۔ چنانچہ مولوی صاحب موصوف نے دس ہزار میں ٹائپ کا پریس خریدا اور اکثر دینی کتابیں اس میں چھاپ چھاپ کر شائع کرتے رہے[2]۔

خدا داد تاثیر قیام وطن کے زمانے میں ہر ہفتے منگل کے دن بعد نماز مغرب اپنے مکان میں وعظ کرتے۔ ایک جانب پانچ چھ سو عورتیں جمع ہوتیں، دوسری جانب پانچ چھ ہزار مرد۔ وعظ میں خداداد تاثیر تھی۔ جو سُنتا اُس کی حالت دگرگوں ہوجاتی[3]۔

نوّاب صدّیق حسن خاں لکھتے ہیں:

مولوی ولایت علی قنّوج میں تشریف لائے۔ میرے مکان پر آئے۔ اپنے اہل بیت کو واسطے ملاقات والدۂ مرحومہ کے بھیجا۔ جامع مسجد قنّوج میں چند جمعہ تک وعظ کہا۔ مجھ سے کہہ گئے کہ تم کتاب "بلوغ المرام" ضرور پڑھنا۔ میں اُس وقت بارہ تیرہ برس کا ہوں گا۔۔۔ جو اثر سریع میں نے وعظ مولوی ولایت علی مرحوم میں پایا، کسی کے وعظ میں دیکھا نہ سُنا۔ اُن کے پاس بیٹھنے سے دل دنیا سے بالکل سرد ہوجاتا

---

[1] "تذکرۂ صادقہ" ص ۱۶۔
[2] ایضاً ایضاً۔
[3] ایضاً ایضاً۔

تھا اور دین کا جوش تہِ دل سے اٹھتا تھا[1]۔

مولانا ولایت علی نے گرد و پیش سنت کا احیاء کر دیا اور بدعتیں بالکل محو کر ڈالیں۔ مثلاً تمام لوگ کتاب و سنت کے پابند ہو گئے۔ بُری رسمیں مٹ گئیں۔ نکاح بیوگاں کا اجراء ہوا۔ اپنے دو بیٹوں کا نکاح دو بھتیجیوں سے اس سادگی کے ساتھ کر دیا کہ کسی کے لیے کوئی نیا جوڑا تیار نہ کرایا۔ سب نے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے، جن میں پیوند لگے ہوئے تھے۔

سفرِ حج

اسی زمانے میں آپ نے حج کیا۔ پہلے خود بہ سلسلۂ تبلیغ بنگال کا دورہ فرمایا اور عادت کے مطابق قریہ بہ قریہ سفر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ مولوی بدیع الزمان بردوانی کو مصری گنج کی مسجد کا امام مقرر کیا۔ اسی دورے میں سورج گڑھ بھی گئے، جہاں مولانا سید نذیر حسین مرحوم آپ کے وعظ و نصیحت سے متاثر ہوئے اور اپنی زندگی خدمتِ دین کے لیے وقف کی۔ پھر اہل و عیال کے ساتھ بہ قصدِ حج کلکتہ سے جہاز پر سوار ہوئے۔ بمبئی پہنچے تو دو ماہ تک وہاں قیام رہا۔ پھر عرب تشریف لے گئے۔ حج کیا۔ شیخ عبداللہ سراج محدث سے حدیث کی سند حاصل کی۔ شیخ فرماتے تھے، مولانا نے حدیث کے لفظوں کی سند مجھ سے لی اور معانی کی سند میں نے مولانا سے حاصل کی۔ حرمین کے علاوہ آپ نے نجد، عسیر اور یمن کی بھی سیر کی اور غالباً صنعاء میں قاضی محمد بن علی شوکانی سے بھی سند حدیث حاصل کی۔ مولوی محمد جعفر نے حضر موت، مخا، حدیدہ، مسقط اور سواکن (سوڈان) جانے کا بھی ذکر کیا ہے[2]۔ پھر جہاز پر سوار ہو کر کلکتہ پہنچے اور معمول کے مطابق دورہ و سیر کرتے ہوئے وطن آئے[3]۔

---

[1] "ابقاء المنن" ص ۱۲۔ واضح رہے کہ نواب صدیق حسن کی تاریخ پیدائش ۱۹۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۸ھ (۱۴۔ اکتوبر ۱۸۳۲ء) ہے۔ مولانا ولایت علی شوال ۱۲۶۵ھ میں عظیم آباد سے روانہ ہوئے تھے اور رمضان ۱۲۶۶ھ سے تقریباً دو ماہ قبل دہلی پہنچے۔ قنوج میں ان کا ورود جمادی الاولیٰ یا جمادی الاخریٰ ۱۲۶۶ھ میں ہونا چاہیے۔ اُس وقت نواب صاحب کی عمر کم و بیش اٹھارہ برس کی ہو گی۔ اگر قنوج میں مولانا کے ورود کو پیشتر کے سفر سرحد یعنی ۱۲۶۲ھ کا واقعہ سمجھا جائے تو اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سفر میں نہ تو اہل و عیال مولانا کے ساتھ تھے اور نہ وہ ہر مقام پر زیادہ توقف فرماتے رہے۔ قرینہ یہی ہے کہ اس بیان میں نواب صاحب کو اپنی عمر کے اندازے میں غلطی لگی۔

[2] "سوانح احمدی" طبع اول ص ۲۱۳۔

[3] تذکرہ صادقہ ص ۱۲۲۔

مولانا عنایت علی مولانا عنایت علی اپنے بھائی مولانا ولایت علی سے دو یا تین برس چھوٹے تھے۔ سیّد صاحب سے بیعت کے بعد ان کی حالت بھی بالکل بدل گئی۔ وہ بھی سیّد صاحب کے ساتھ جہاد کے لیے گئے تھے اور وہاں سے بنگال میں دعوت و تبلیغ پر مامور ہوئے۔ ضلع جیسور میں موضع حاکم پور کو آپ نے مرکز بنا لیا تھا؛ جہاں کے حاجی مفید الدین خاں اور مدن خاں آپ کے خاص ارادت مند تھے۔ جیسور، ندیا، فرید پور، راج شاہی، مالدہ اور بوگرا آپ کی تبلیغی سرگرمیوں کے خاص مرکز تھے۔ سیّد صاحب کی شہادت کے بعد آپ اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علی کے زیرِ ہدایت کام کرتے رہے۔ آپ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ جس مقام پر پہنچتے اگر وہاں مسجد موجود ہوتی تو کسی موزوں شخص کو امام مقرر کر دیتے، مسجد نہ ہوتی تو تعمیر کرا دیتے۔ خاص طور پر قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ امام محض نماز پڑھانے اور ضروری دینی کتابیں سکھانے ہی کا ذمہ دار نہ ہوتا بلکہ اپنے علاقے کے تمام جھگڑوں کا فیصلہ بھی وہی کرتا۔ سیّد صاحب کے ارادت مندوں کا پختہ عقیدہ تھا کہ انگریزی عدالتوں کی طرف رجوع کرنے میں دل تاریک ہو جاتے ہیں اور ایمان کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس طرح مولانا نے ایک حد تک نظم و نسق کا متوازی نظام قائم کر دیا۔

یہ حالات ہم نے اختصاراً اس لیے بیان کر دیے کہ یہ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کے مجاہدانہ کارناموں کی ایک ضروری تمہید تھے۔

دوسرا باب

ہزارہ میں جہادِ آزادی

سکھوں کی حکومت میں ابتری مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی پوری سرگرمی سے دعوت و تبلیغ میں مصروف تھے اور ان کی نگاہیں اس امر پر جمی ہوئی تھیں کہ وقت اور ماحول کے سازگار ہوتے ہی موزوں مقام سے جہاد کا آغاز کر دیں۔ یہاں تک کہ سکھوں کی حکومت میں ابتری پیدا ہوئی اور میدانِ عمل میں قدم رکھنے کا سازگار موقع پیدا ہو گیا۔

سکھوں کی حکومت دراصل کوئی باقاعدہ اور منظم حکومت نہ تھی بلکہ اسے ایک نوع کا عارضی فوجی غلبہ کہنا زیادہ موزوں ہے۔ انھیں اس وجہ سے پنجاب پر چھا جانے کا موقع مل گیا کہ یہاں کسی بھی جگہ کوئی قابلِ ذکر نظام موجود نہ تھا جو اصلح اور عوام دوست عناصر کو متحد کر سکتا۔ رنجیت سنگھ کی خواہش ممکن ہے یہ رہی ہو کہ عارضی فوجی غلبے کو منظم حکومت کی شکل دے دے، لیکن اس کی پوری زندگی دائرۂ اقتدار کی توسیع میں بسر ہو گئی اور توسیع کی آرزو اسی صورت میں پوری ہو سکتی تھی کہ عسکریت کو زیادہ سے زیادہ بے لگام رکھا جاتا۔ چنانچہ وہ ۱۸۳۹ء میں فوت ہوا تو اس کے قائم کردہ نظام کا کھوکھلا پن کسی کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہا۔ اس نے چالیس برس میں جو گھروندا بنایا تھا، جانشینوں نے چار پانچ ہی برس میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی۔

فساد در فساد رنجیت سنگھ کے بعد اس کا بیٹا کھڑک سنگھ حکمران بنا۔ وہ بالکل کمزور اور بے عزم آدمی تھا۔ جس روز وہ مرا اُسی روز اُس کا بیٹا نونہال سنگھ ایک حادثے کی نذر ہو گیا، جو رنجیت سنگھ کے خاندان میں سب سے قابل مانا جاتا تھا۔ پھر رنجیت سنگھ کے دوسرے بیٹے شیر سنگھ نے مسندِ حکومت سنبھالی۔ وہ اور اس کا نوعمر بیٹا ۱۸۴۳ء میں مارے گئے اور سکھوں کے مختلف فریق بے دریغ ایک دوسرے

کا خون بہانے لگے۔ آخر رنجیت سنگھ کے سب سے چھوٹے بیٹے دلیپ سنگھ کو گدی پر بٹھایا گیا۔ وہ کم سن تھا اور انتظام کے لیے ایک کونسل بنا دی گئی۔ تاہم سکھ امراء کی باہمی رزم و پیکار نہ رُکی - پھر بعض دُور اندیش لوگوں نے اُن کی توجہ خانہ جنگی سے ہٹانے کی تدبیر یہ سوچی کہ انگریزوں سے لڑائی چھیڑ دی جائے۔ سکھ عموماً دنیا کے حالات سے بے خبر تھے۔ اپنی قوت و طاقت پر انھیں اتنا گھمنڈ تھا کہ کسی کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے - چنانچہ انھوں نے جوشِ غیظ میں انگریزی علاقے پر دھاوا بول دیا۔ پے در پے شکستیں کھائیں اور آخر صلح پر مجبور ہو گئے۔ دوآبہ بست جالندھر کے علاوہ شمال مشرق کے تمام پہاڑی علاقے انگریزوں کے حوالے کیے اور تاوان بھی دیا۔ انگریزوں نے کشمیر اور بالائی ہزارہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا، جو جنگ سے الگ تھلگ رہا تھا اور انگریزوں کا خیر خواہ سمجھا جاتا تھا۔ کچھ مدت بعد دوسری جنگ ہوئی، جس میں سکھوں کی عمل داری کا نقش صفحۂ ہستی سے محو گیا۔

سرحدی علاقوں میں ہنگامے مرکزی حکومت کی بدنظمی اور ابتری کا اثر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اُن علاقوں پر پڑا، جو دُور افتادہ تھے اور جہاں حکومت کی بنیادیں پوری طرح استوار نہ ہوئی تھیں۔ اس سلسلے میں ہمارے موضوع کے لحاظ سے ہزارہ اور کاغان بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں[1] جہاں کے رؤسا اور عوام سکھوں کے جبر و ظلم اور قزاقانہ تحصیلات سے سخت تنگ آئے ہوئے تھے۔ ہزارہ میں ہری سنگھ دس بارہ سال صوبہ دار رہا۔ اُس کا پورا دور قتل و غارت اور خونریزی و شقاوت سے لبریز ہے۔ اس نے بعض رؤساء کو موت کی سزا دے دی اور اکثر کو جلا وطنی پر مجبور کر دیا۔ مالیہ وصول کرنے کا

[1] اس سلسلے میں محمد خاں ترین کا واقعہ بڑا ہی عبرت ناک ہے۔ رنجیت سنگھ نے اس غریب کو لاہور میں مقید رکھا تھا۔ ہری سنگھ نے قیامِ امن کی غرض سے اسے ہزارہ لے جانا چاہا۔ رنجیت سنگھ نے کہا کہ پچپن ہزار روپے دو تو اسے تمہارے حوالے کروں گا۔ ہری سنگھ نے رقم دے دی۔ محمد خاں کو زہر دلا دیا اور ہزارہ کے دیہات سے اڑھائی روپے فی خانہ تاوان وصول کر کے پچپن ہزار کی رقم پوری کر لی۔ شاید ہی کسی منظم حکومت میں ایسے واقعات کا نشان مل سکے۔

طریقہ یہ تھا کہ مختلف علاقوں کی نیلامی بولی جاتی، جو زیادہ رقم دیتا، علاقہ اُس کے حوالے کر دیا جاتا۔ پھر وہ اپنے انتظام کے دوران میں جس طرح چاہتا، رقم وصول کرتا[1]۔

ہزارہ اور کاغان کے رئیسوں نے سکھوں کو خانہ جنگی میں مبتلا دیکھا تو وہ آزادی حاصل کرنے میں سرگرم کار ہو گئے۔ اس سلسلے میں راجا حیدر بخش خاں گکھڑ رئیس خان پور، نواب خاں پلال تنولی رئیس شنگڑی، میر ملان خاں طاہر خیلی رئیس کھلابٹ، غلام خاں ترین، ان کے علاوہ جدون، کڑرال، دلازک نیز کاغان کے سید خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ زیریں ہزارہ کے رؤسا نے سکھوں کی جمعیتوں کو شکست دے کر ہری پور پر قبضہ کر لیا اور وہاں کا گورنر مول راج دلوالیہ حسن ابدال بھاگ آیا[2]۔

کشمیر کی جانب سے دیوان ابراہیم نے کاغان پر حملہ کیا۔ وہاں کے سیدوں نے ضامن شاہ ساکن کوائی کی سرکردگی میں دیوان پر خوفناک چھاپا مارا، جس میں وہ خود اور اس کی پوری فوج موت کے گھاٹ اتر گئی۔ یہ مقام آج تک دیوان بیلیہ کے نام سے موسوم ہے۔ یعنی وہ مقام جہاں دیوان ابراہیم کا صفایا ہوا تھا۔

لُنڈی مسلمانی زیریں ہزارہ کے رؤسا نے بالاتفاق سید اکبر شاہ ستھانوی کو آزاد شدہ علاقے کا سردار و رئیس منتخب کیا۔ چنانچہ سید موصوف کی ابتدائی دستار بندی ناڑہ کے مقام پر کی گئی، جسے اس وجہ سے خاص شہرت حاصل ہے کہ قبائلی لشکروں نے ۱۸۲۴ء میں ہری سنگھ نلوہ کو وہاں فیصلہ کن شکست

---

[1] بالائی ہزارہ کا علاقہ پہلے گلاب سنگھ ڈوگرے کے قبضے میں تھا۔ پھر اُس نے اس علاقے کے معاوضے میں جموں کے قریب ایک علاقہ لے لیا۔ میجر ایبٹ نے بالائی ہزارہ کا چارج سنبھالا تو رپورٹ میں لکھا کہ ۱۸۴۷ء سے پیشتر تین لاکھ پچاسی ہزار پانسو ستر روپے صرف بطور مالیہ وصول ہوتے تھے، لیکن سرکاری خزانے میں دو لاکھ انتالیس ہزار نو سو پینتیس روپے جمع کیے جاتے تھے۔ خود میجر ایبٹ نے منصفانہ تشخیص کی تو مالیے کی کل رقم ایک لاکھ ستاسی ہزار آٹھ سو ناسی روپے بنی۔ اس سے سکھوں کی جابرانہ تحصیلات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ (ملاحظہ ہو انتظامی رپورٹ بابت ۱۸۴۹ء و ۱۸۵۰ء مطبوعہ ۱۸۵۴ء صفحہ ۸۴)

[2] "ہزارہ گزٹیر" طبع ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۳۳، ۱۳۴۔

دی تھی اور وہ محض حُسنِ اتفاق سے قتل ہوتے ہوتے بچا۔ بعد ازاں ہری پور کے قلعے میں دستار بندی ہوئی۔ سید اکبر شاہ کو بادشاہ کا لقب دیا گیا۔ نواب خاں رئیس شنگڑی اور غلام خاں ترین وزیر مقرر ہوئے۔ سیف اللہ خاں رسالدار کو میر منشی کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ یہ انتظام چونکہ بہت تھوڑی دیر قائم رہا، اس لیے مقامی لوگوں میں یہ دور "لُنڈی مسلمانی" کے نام سے مشہور ہے، یعنی وہ اسلامی حکومت بہت تھوڑی دیر قائم رہی[1]۔

طلبِ امداد صحیح تاریخ معلوم نہیں ہو سکی لیکن افراتفری کا یہی زمانہ ہے، جس میں سید ضامن شاہ کاغانی نے مولانا ولایت علی کو دعوت بھیجی کہ آپ تشریف لائیں اور یہاں آغازِ جہاد کے لیے جو سازگار فضا پیدا ہو چکی ہے، اُس سے فائدہ اٹھا کر اسلامی حکومت کے استحکام و استواری کا بندوبست کریں۔ مولانا نے اپنے بھائی مولانا عنایت علی کو بھیجنے کی تجویز کی۔ وہ اُس وقت بنگال میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ انھیں سرحد جانے کا پیغام ملا تو دو ہزار مجاہدین ساتھ لے کر عظیم آباد پہنچے، جس سے انگریزی حکومت کے کارکنوں میں تشویش پھیل گئی۔ مولانا ولایت علی نے مصلحت و دُوراندیشی سے کام لیتے ہوئے جمعیت منتشر کر دی اور فیصلہ کیا کہ تمام لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر یکے بعد دیگرے جائیں اور سکھوں کے علاقے سے گزرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ جمادی الاخریٰ ۱۲۵۹ھ (جولائی ۱۸۴۳ء) سے چار چار، پانچ پانچ چھ چھ آدمیوں کی ٹولیاں روانہ ہونے لگیں اور غالباً چار پانچ مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان ٹولیوں کے رئیسوں میں جن اصحاب کے اسمائے گرامی مذکور ہیں اُن میں مولانا عنایت علی کے علاوہ مولانا عبداللہ (فرزند مولانا ولایت علی)، میر اولاد علی سورج گڑھی جو غالباً انتظامِ مُلک کے لیے سرحد سے آگئے تھے، مولوی مقصود علی، مولوی کرم علی اور مولوی زین العابدین قابلِ ذکر ہیں[2]۔

---

[1] تفصیلات سید عبدالجبار شاہ کی "کتاب العبرۃ" میں مل سکیں گی جس کا ذکر اس سلسلے کی کتابوں میں بار ہا آ چکا ہے۔ (قلمی نسخہ ص ۲۷۹، ۲۸۰ بعنوان ہزارہ گزیٹیئر ص ۱۳۴)

[2] اس سلسلے میں زیادہ تر حالات ایک مجمل تحریر سے معلوم ہوئے، جو مجاہدین مرکز اسمست میں میری نظر سے گزری۔ نیز ملاحظہ ہو تذکرہ صادقہ ص ۱۲۲ و ۱۲۳۔ تحریر سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ جمادی الاخریٰ ۱۲۵۹ھ کو عبدالغفور کلاں، مولانا عبداللہ اور تین اور صاحبان روانہ ہوئے تھے۔ ۱۱۔ رمضان ۱۲۵۹ھ کو مولانا عنایت علی کے فرزند حافظ عبدالمجید کا نکاح ہوا۔ پھر مولانا روانہ ہوئے۔ ذی قعدہ ۱۲۵۹ھ (نومبر ۱۸۴۳ء) میں وہ ٹونک میں تھے۔ اواخر ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں سرحد پہنچے اور ۱۲۶۴ھ تک کاغان و متعلقات پر قابض رہے یعنی ۱۸۴۷ء تک اسی موقع پر نواب وزیر الدولہ نے سات ہزار روپے دیے تھے۔

ڈاکٹر بیلیو کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، وہ لکھتا ہے کہ فتح خاں پنجتاری نے مولوی نصیر الدین منگلوری کی شہادت کے بعد بھی مجاہدین کے خلاف دشمنی کا سلسلہ جاری رکھا یہاں تک کہ مولوی میر اولاد علی کے پاس صرف ستّر اسّی آدمی رہ گئے۔ ان حالات کی اطلاع ہندوستان پہنچی تو عظیم آباد سے مولانا عنایت علی کو اور بہار سے میر مقصود علی کو بھیجا گیا۔ اُن کے پاس روپیہ بھی خاصی مقدار میں تھا اور جنگجوؤں کی جماعت بھی کم نہ تھی:

پوری جماعت تین سو افراد پر مشتمل تھی۔ وہ پانچ پانچ چھ چھ آدمیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں پکھلی واقع ہزارہ پہنچے، جو پہلے سے منزلِ مقصود مقرر ہو چکی تھی۔ یہاں میر اولاد علی اور ان کی چھوٹی سی جماعت بھی ان (مجاہدین) میں شامل ہو گئی۔[1]

اوکنلے کا بیان ہے کہ مولوی محمد قاسم سندھ سے کوائی پہنچے۔ سیّد ضامن شاہ اور اس کا بھائی نوبت شاہ مولوی صاحب کے مرید ہوئے اور صاحب موصوف نے سیّد صاحب کے نام پر آپ کے خلفاء کو ہندوستان میں خطوط بھیجے کہ سیّد صاحب دوبارہ ظاہر ہونے والے ہیں اور سب کو سرحد پہنچ جانا چاہیے۔ مولوی عنایت علی نے فوراً سرحد پہنچ کر سکھوں کو بالاکوٹ سے نکال کر باہر کیا۔ پھر نجف خاں کھوڑی والے نے ان سے امداد طلب کی۔ زین العابدین حیدرآبادی بھی مولوی ولایت علی کی ہدایت کے مطابق ان (مولوی عنایت علی) سے آملے۔ سکھوں کے خلاف نجف خاں کی امداد کے لیے مولوی زین العابدین ہی کو چُنا گیا تھا، لیکن انھوں نے شکست کھائی اور کمان داری سے دست بردار ہو گئے۔[2]

مجاہدین کے کارنامے قطعی طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ اس طرح مولانا عنایت علی کتنے مجاہدین اپنے ساتھ لے جا سکے تھے اور کن کن مقامات سے گزرتے ہوئے کاغان پہنچے۔ "ہزارہ گزیٹیر" مرقوم ہے:

ہندوستانی مجاہدوں کا بقیۃ السیف گروہ یہ اعلان کرتے ہوئے کوائی (کاغان) میں

---

[1] یوسف زئیوں کے متعلق عام رپورٹ A General Report on the Usufzais

[2] کلکتہ ریویو بابت جولائی ۱۸۷۱ء صفحہ ۱۰۹۔

جمع ہؤا کہ خلیفہ سیّد احمد شہید نہیں ہوئے، بلکہ بہت جلد ظاہر ہونے والے ہیں۔ شمالی ہزارہ کے لوگ اُن کے ساتھ ہوگئے۔ انھوں نے شنکیاری، بیرکھنڈ، گڑھی حبیب اللہ خاں اور اگرور کے قلعوں پر حملہ کر کے محافظ دستوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا[1]۔

ایک مکتوب سے جو ذی قعدہ ۱۲۶۲ھ (اکتوبر ۱۸۴۶ء) کا مرقومہ ہے۔ واضح ہوتا ہے کہ مولانا عنایت علی سادات کاغان اور دوسرے مقامی لوگوں کی امداد سے ذی حجہ ۱۲۶۱ھ (دسمبر ۱۸۴۵ء) میں بالاکوٹ پر قابض ہو چکے تھے۔ وہیں انھیں باقاعدہ امیر جہاد تسلیم کیا گیا۔ سیّد ضامن شاہ کاغانی نے بھی ان کی اطاعت قبول کر لی اور آس پاس کے علاقوں کو سکھوں کے قبضے سے آزاد کرانے کے لیے زبردست جہاد شروع ہو گیا، جس کی تفصیلات آئندہ باب میں پیش کی جائیں گی۔

گلاب سنگھ ڈوگرہ مبادا اُوپر کے بیانات سے سمجھا جائے کہ ظلم و جبر صرف سکھوں سے مخصوص تھا، گلاب سنگھ ڈوگرہ جس کے نام بالائی ہزارہ منتقل ہؤا تھا اور وہ کاغان پر بھی قبضے کے لیے کوشاں تھا، کم جابر نہ تھا۔ اس کے متعلق خود انگریزوں کے بیانات سُن لیجیے:

> دراصل ہمارے لیے اپنے نامزد کردہ (گلاب سنگھ) پر فخر کی کوئی وجہ نہ تھی۔ جان لارنس کہتا ہے کہ گلاب سنگھ جالندھر اور لاہور میں عموماً متعارف تھا، لیکن اس کے لیے ابھی تک ایک بھی شخص کی زبان سے کلمۂ خیر نہیں سُنا۔ ہربرٹ ایڈورڈز کو روزانہ گلاب سنگھ سے بات چیت کا موقع ملتا تھا۔ اس کا بیان ہے: مجھے اب تک جتنے دیسی آدمی ملے، گلاب سنگھ ان میں سے بدترین تھا۔ بہت بُرا حکمران، بخیل اور جھوٹا۔ تیسرا گواہ جسے گلاب سنگھ کے متعلق اندازے کے بہترین موقعے ملے، کہتا ہے کہ وہ طبعاً حریص اور سنگ دل ہے۔ وہ جان بُوجھ کر اس غرض سے نہایت خوفناک ظلم و ستم کا مرتکب ہوتا ہے کہ اس کا نام دہشت کا مترادف بن جائے اور کسی کو اس کے اقتدار میں مزاحمت کا خیال تک نہ آ سکے۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے

[1] "ہزارہ گزٹیئر" صفحہ ۱۳۲، ۱۳۳۔

کہ ایسے آدمی کو سکھوں کی فوج کے بل پر سکھوں کی خواہشات کے خلاف اور اس سے بھی بڑھ کر بدنصیب رعایا کی خواہشات کے خلاف ہم دنیا کے حسین ترین ملک (کشمیر و بالائی ہزارہ) کی مسندِ حکومت پر بٹھانے والے تھے[1]۔

یہ شخص تھا، جس سے مجاہدین کو جہاد کا سابقہ پڑا۔

---

[1] "لائف آف لارڈ لارنس" انگریزی مصنفہ باسورتھ سمتھ جلد اوّل صفحہ ۱۹۵۔

تیسرا باب

مولانا عنایت علی کے مجاہدانہ کارنامے

ماخذ اس باب میں جو حالات بیان ہوں گے، ان کا کوئی ذکر کسی مطبوعہ یا قلمی تاریخ میں موجود نہیں صرف سرسری حالات بعض کتابوں میں مذکور ہیں مثلاً "ہزارہ گزیٹیر"، "تذکرہ صادقہ"، ڈاکٹر بیلیو کی رپورٹ یوسف زئی کے متعلق اور ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب "ہندوستانی مسلمان"۔ مجھے حُسنِ اتفاق سے ایک طویل مکتوب مل گیا جو ۹- ذی قعدہ ۱۲۶۲ھ (۲۹- اکتوبر ۱۸۴۶ء) کا مرقومہ تھا۔ اس میں پورے جہاد کی کیفیت تو مذکور نہیں، البتہ محرم ۱۲۶۲ھ (دسمبر ۱۸۴۵ء) سے شوال ۱۲۶۲ھ (اکتوبر ۱۸۴۶ء) تک کے حالات قلمبند کر دیے گئے تھے۔ یہ مکتوب سرحد آزاد سے ہندوستان کے مختلف مرکزوں میں پہنچا ہوگا۔ مجھے اس کی نقل مولانا مسعود عالم مرحوم و مغفور سے ملی اور انھوں نے یہ حیدر آباد (دکن) کے کتب خانۂ آصفیہ سے حاصل کی تھی۔ افسوس کہ وہ پورے حالات سے واقف نہ تھے، لہٰذا اپنی کتاب "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" کی ترتیب میں اس مکتوب سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ میرے علم کے مطابق یہ پہلا موقع ہے کہ اس مکتوب کے مندرجات ضروری تفصیلات کے ساتھ منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ یقیناً ایسے اور بھی مکتوب ہندوستان آتے رہے ہوں گے اور ان کا سب سے بڑا ذخیرہ علمائے صادق پور (عظیم آباد) کے پاس ہونا چاہیے تھا، لیکن ان پر انگریزی دور میں ابتلا و مصائب کی جو بجلیاں گرائی گئیں اُن میں سب کچھ تباہ ہو گیا۔ کسی دوسری جگہ اب تک اُن کا سُراغ نہیں مل سکا۔ کاش یہ پورا ذخیرہ کہیں سے دستیاب ہو سکے اور مجاہدین کی جانبازیوں کا یہ باب ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے۔

گڑھی پر حملہ اور فتوحات بالاکوٹ پر قبضے کے بعد مولانا عنایت علی کو امیرِ جہاد مان لیا گیا تو انھوں نے فوج کا باقاعدہ انتظام کر کے محرم ۱۲۶۲ء میں گڑھی حبیب اللہ خاں کو مسخر کر لیا۔ اس کے بعد

فتح گڑھ پر دھاوا بولا جو سکھوں کا ایک مستحکم قلعہ تھا۔ اوائل ربیع الاوّل میں اُس پر بھی قبضہ کر لیا۔ جب تک سکھوں کا تسلّط قائم تھا اور ان کے خلاف آزادی کی کوئی تحریک جاری نہ ہوئی تھی، مقامی لوگ مجاہدین کے مطالبۂ عُشر کو ٹھکرا رہے تھے، جب سکھوں کے اقتدار میں پے در پے رخنے پیدا ہونے لگے اور وہ قلعوں کو خالی کرنے لگے تو مقامی لوگوں نے مجاہدین کے نام دعوت نامے بھیج بھیج کر قلعے ان کے حوالے کر دیے۔ مذکورۂ بالا مکتوب مظہر ہے:

بعد فتح قلعۂ مذکور (قلعہ فتح گڑھ) اہل دیگر قلعہ جات بہ طور دعوت طلب نمودند۔ یکے می گفت کہ اوّل در قلعۂ ما آمدہ محاسبۂ ذخیرہ و اسباب گیرند و مرا بہ امن رخصت کنند۔ غرض بہ عرصہ ہفتہ عشرہ بست و دو قلعہ ملک پکھلی و دمتوڑ و اورش و تنول تا ملک ہزارہ خالی شد و توپ و شاہین و اسپ و خچر و بارود و سرب و سلاح و دیگر اسباب بسیار بدست غازیاں درآمد . . . قبل ازیں اگر مجاہدین از زمینداران ملک پکھلی عشر طلب می کردند، بہ جواب می گفتند کہ اوّل فوج بادشاہی را بکشید بعدہٗ عشر خواہیم داد و قبل از آں یک خرمہرہ نہ خواہیم داد۔

قلعہ فتح گڑھ کی تسخیر کے بعد دوسرے قلعوں کے ذمّہ دار دعوت دے دے کر بُلانے لگے۔ ایک کہتا، پہلے ہمارے قلعے میں آئیے ذخیرے اور اسباب کا حساب لے لیجیے اور مجھے بہ امن و اماں رخصت کر دیجیے۔ غرض ہفتے عشرے میں بائیس قلعوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ پکھلی، دمتوڑ، اورش اور تنول کا علاقہ ہزارہ تک زیرِ نگیں آ گیا۔ توپیں، شاہینیں، گھوڑے، خچر، بارود، سیسہ، ہتھیار اور بہت سا دوسرا سامان مجاہدین کے ہاتھ آیا۔ اس سے پہلے مجاہدین پکھلی کے زمینداروں سے عُشر مانگتے تو وہ کہتے کہ پہلے سکھوں کی فوج کو نکالو، اس کے بعد ہم عشر دیں گے۔ ورنہ کوڑی بھی نہ دیں گے۔

مظفر آباد پر یورش جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ مرکزی حکومت میں ابتری کے باعث سکھوں کا شکنجۂ اقتدار ڈھیلا پڑ چکا تھا اور مسلمان سردار حوصلہ پا کر مقابلے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ مولانا عنایت علی

نے حتّی الامکان اُن سب کے لیے اعانت کا بندوبست کردیا، جو ان کے خطوط اقدام سے قریب تھے۔ چنانچہ ایک فوج مولوی مقصود علی کی قیادت میں سلطان حسین خاں بمبا کی امداد کے لیے مظفرآباد بھیج دی گئی۔ اس میں دو سو مقامی سپاہی شامل تھے اور تھوڑی سی تعداد مجاہدین کی تھی۔ یہ معلوم نہیں کہ خاص مظفرآباد میں جنگ ہوئی یا اس کے آس پاس کسی خاص مقام پر، لیکن خدا نے مجاہدین کو فتح و کامرانی سے سرفرازی بخشی۔

فتح گڑھ میں مقابلہ فتح گڑھ میں مقابلے کی کیفیت مکتوب میں یوں بیان کی گئی ہے:

لشکرِ منافقان چپ و راست دامانِ کوہ گرفتہ و مجاہدین در میدان مقابل نُہ صد سواران کفار بودند۔ در عقبِ سواران پنج ہزار لشکر پیادہ بود و ملکیاں کہ بہ ظاہر دمِ موافقت می زدند نیز دہ دوازدہ ہزار بودند و با منافقان ہم صلاح بودند کہ ہرگاہ مجاہدین را شکست شود، ہمہ منافقان و کفار متفق شدہ یک یک مجاہد را پارہ پارہ کنند و بیخ از بُنِ مجاہدین بر آرند و لشکر روہیلہ ازیں طرف پیش بود و مجاہدین بر پشتِ آں۔ حتّٰی کہ وقت نمازِ ظہر رسید۔ مجاہدین نمازِ ظہر خواندہ مقابلہ با کفار شروع کردند۔

جو دو ولے لوگ سکھوں کے ہمراہ تھے، ان کا لشکر پہاڑ کے دامن میں دائیں بائیں کھڑا ہوگیا۔ مجاہدین سامنے میدان میں تھے۔ اُن کے مقابل سکھوں کے نو سو سوار استادہ تھے۔ ان سواروں کے پیچھے پانچ ہزار پیادہ سکھوں کے پرے پھیلے ہوئے تھے۔ جو ملکی بظاہر طرف داری کا دم بھر رہے تھے، اُن کی تعداد بھی دس بارہ ہزار سے کم نہ تھی۔ انھوں نے سکھوں کے حامیوں سے مشورہ کر رکھا تھا کہ مجاہدین کو شکست ہوتے ہی مل جل کر اُن پر ہلّہ بول دیا جائے اور ایک ایک مجاہد کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا جائے حتّٰی کہ ان کا نشان تک باقی نہ رہے۔ مجاہدین کی طرف سے روہیلوں کا لشکر آگے تھا اور مجاہدین اس کے پیچھے اس اثنا میں ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا

اور مجاہدین نے ادائے نماز کے بعد جنگ
شروع کی ؂

جنگ کی کیفیت | سکھ تعداد میں بھی زیادہ تھے اور ان کے پاس سامانِ جنگ بھی بہت زیادہ تھا۔ اُن کی شاہینوں اور بندوقوں کی گولیاں اولوں کی طرح مجاہدین پر برسنے لگیں :

چنانچہ دو گولی بر دست محمد عمر نشانچی رسید۔
یک گولی دست اورا زخمی نمود، امّا نقصانِ استخوان
نہ شد۔ گولی دیگر کہ بر دست رسید از آں
زخم کاری نہ شد، امّا نشان از دست نشانچیِ
مذکور بر زمین اُفتاد۔ ملکیاں دانستند کہ شکست
مجاہدین گردید، لیکن محمد عمر نشان را جلد برداشت
و تمامی مجاہدین و روہیلہ یک بارگی حملہ بر سواراں
نمودند و نعرۂ اللہ اکبر زدند۔ بہ مجرّدِ ہلّہ کردنِ
ایشاں حق تعالیٰ بر سواراں رعب انداخت
یک بارگی پشت دادہ بگریختند و دُور رفتہ
ایستادند و دل ہائے خود را خوب مضبوط
نمودہ باز ہلّہ بر مجاہدین نمودند۔ چوں مجاہدین
ہم ہلّہ کردند کفّار بے استقامت شدہ پسپا
شدند۔ بار چہارم تاب مقاومت نیاوردہ
ایں قدر ہراساں شدند کہ ڈیرۂ خود را گذاشتہ
دُور تر رفتند ؂

محمد عمر نشان بردار کے ہاتھ پر دو گولیاں
لگیں۔ ایک گولی سے ہاتھ زخمی ہو گیا، لیکن
ہڈّی کو ضرر نہ پہنچا۔ دوسری گولی کا زخم اگرچہ
کاری نہ تھا، لیکن نشان محمد عمر کے ہاتھ سے
زمین پر گر گیا۔ مقامی لوگوں نے سمجھا کہ مجاہدین
کو شکست ہو گئی۔ مگر محمد عمر نے جلد نشان زمین
پر سے اٹھا لیا۔ پھر مجاہدوں اور روہیلوں
نے ایک دم سواروں پر حملہ کر دیا اور اللہ اکبر
کا نعرہ لگایا۔ ہلّہ ہوتے ہی خدا نے سواروں پر
ایسا رعب ڈال دیا کہ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے
اور دُور جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں سے دوبارہ
جی کڑا کے حملہ کیا۔ ادھر سے مجاہدین بھی بڑھے
تو سکھ بے اوسان ہو کر پسپا ہو گئے۔ اسی طرح
تین مرتبہ حملہ کیا اور پسپا ہوئے۔ چوتھی مرتبہ
مقابلے کی تاب نہ لا کر اس قدر حواس باختہ
ہوئے کہ ڈیرہ چھوڑ کر بہت پیچھے چلے گئے ؂

فرار اور قتل | سکھوں کا خیال یہ تھا کہ مجاہدین مالِ غنیمت سنبھالنے میں لگ جائیں گے، اُس وقت حملہ

آسان ہوگا، لیکن مجاہدین نے مالِ غنیمت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور آگے بڑھ کر اُس ٹیکری پر چڑھ گئے جو سکھوں کی فوج کے سامنے تھی اور وہاں اپنا نشان گاڑ دیا۔ سکھوں کو جب معلوم ہُوا کہ مجاہدین سر پر آ پہنچے تو:

ہمّت بالکل باختہ بگریختند و باز سوئے پُشت نہ دیدند و لشکر ملکیاں کہ ہر دو جانب کوہ تماشا گر بود۔ فتحِ مجاہدین دیدہ بر ڈیرۂ کفار افتادند و غارت گری مال شروع نمودند و مال زائد از یک لک روپیہ بہ غارت رفت در کمر یک سوار شصت اشرفی و مال ہزار روپیہ بود و ہمیں قسم مالِ فراواں بہ غارت بردند۔ موسم برشکال بود و جا بجا کشت شالی در پیش۔ اسپاں و پیادۂ کفّار از رفتن ماندہ شدند ۔	بالکل حوصلہ ہار کر بھاگ گئے اور پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا۔ مقامی لوگوں کا جو گروہ دامنِ کوہ میں دونوں جانب کھڑا لڑائی کا نظارہ کر رہا تھا۔ مجاہدین کو کامیاب دیکھا تو سکھوں کے ڈیرے پر ٹوٹ پڑا اور مال لوٹنے لگا۔ ایک لاکھ سے زیادہ کا مال لُٹ گیا۔ ایک سوار کی کمر میں ساٹھ اشرفیاں اور ایک ہزار کا مال بندھا ہُوا تھا۔ اسی طرح بہت سا مال لُوٹا گیا۔ برسات کا موسم تھا۔ ہر طرف دھان کے کھیت تھے۔ سکھوں کے سوار اور پیادے چلتے چلتے تھک کر چُور ہو گئے ۔

عورتوں اور مردوں نے سکھوں کی یہ سراسیمگی دیکھی تو اسباب اور ہتھیار چھیننے کے لیے نکل پڑے۔ کوئی ڈنڈے سے کسی کو مار ڈالتا، کوئی پتھّر مار کر گرا دیتا۔ ایک گوجر نے جو کھیتی باڑی کر رہا تھا، اتنے سکھ مارے کہ شام کے وقت ان سے چھینی ہوئی بندوقوں کا گٹھا سر پر اُٹھا کر گھر لایا:

تا دہ کروہ بجز لاش دیگہ نظر نمی آمد ۔ مجاہدین تا شام تعاقب آنہا کردند۔ بعد از آں بہ موضع سلہڈ مقام کردند ۔	دس کوس تک مقتولوں کی لاشوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ مجاہدین نے شام تک ان کا پیچھا کیا۔ پھر موضع سلہڈ میں ٹھہر گئے ۔

کچھ سکھ مکئی کے کھیتوں میں چھپ گئے تھے۔ مقامی لوگ تین روز تک انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مارتے

رہے۔ سکھ عموماً قوی ہیکل تھے، لوگوں کو حیرت ہوتی تھی، ان سے کیوں کچھ بن نہ آیا۔ اس جنگ کی معین تاریخ نہیں بتائی گئی، لیکن موسم چونکہ برسات کا تھا۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ یہ جمادی الاخریٰ سے شعبان ۱۲۶۲ھ (مئی سے جولائی ۱۸۴۶ء) تک کا واقعہ ہے۔

اوکنلے کا بیان اوکنلے کا بیان ہے کہ مجاہدین مظفر آباد پر پہلے حملے میں شکست کھا چکے تھے اور دوسرے حملے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس وقت ان کے تین بڑے لیڈر تھے۔ ولایت علی، عنایت علی اور مقصود علی۔ دوسرے حملے میں سکھوں نے شکست کھائی اور وہ جنوب کی طرف پسپا ہوئے۔ مجاہدین نے شدت و سرگرمی سے تعاقب کیا۔ ان کی فتح کا حال سُن کر پٹھانوں کی بھی ایک جماعت ساتھ ہو گئی تھی۔ سکھوں نے مانسہرہ میں قدم جمانے کی کوشش کی، لیکن دوبارہ شکست کھائی۔ غرض مجاہدین نے تھوڑے ہی وقت میں خاصے بڑے علاقے پر قبضہ جما لیا جو دریائے سندھ کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ ہری پور سے کاغان تک اور ستھانہ سے کشمیر تک پھیلا ہوا تھا۔[1]

مقامی رؤسا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس باب کو ختم کرنے سے پیشتر بعض ممتاز مقامی رؤسا و خوانین کی کیفیت اختصاراً بیان کر دی جائے، جو بہ طیبِ خاطر مجاہدین کی حمایت پر آمادہ ہوئے یا جنھیں حالات نے حمایت پر مجبور کر دیا:

۱۔ سلطان محمد حسین خاں بمبا رئیس بوئی و مظفر آباد۔ شجرۂ نسب یہ ہے:

سلطان محمد حسین خاں بن مظفر خاں ثانی (برادر سلطان زبردست خاں) بن سلطان حسن علی خاں بن سلطان محمود خاں بن سلطان میرزا شہید بن سلطان ہیبت خاں ثانی بن سلطان مظفر خاں اوّل، جس نے ۱۶۵۲ء میں مظفر آباد کی بنیاد رکھی تھی۔ سلطان نجف خاں کھوڑی والا بھی اسی خاندان سے تھا۔ یعنی وہ سلطان حسن علی خاں بن سلطان محمود خاں کے بھائی سلطان اکبر علی خاں کا فرزند تھا۔ اس خاندان کے افراد نے جا بجا چھوٹی چھوٹی سرداریاں قائم کر لی تھیں۔ سلطان محمد حسین خاں جو مجاہدین کا حد درجہ مخلص رفیق تھا،

---

[1] کلکتہ ریویو بابت اکتوبر ۱۸۷۰ء صفحہ ۳۸۲۔

۱۸۵۹ء میں بمقام پشاور فوت ہؤا اور اس کا بھتیجا سلطان محمد برکات خاں علاقہ بوئی کا وارث بنا ۔ یہ جاگیر اب تک قائم ہے ۔

۲۔ سردار محمد امین خاں خان خیل رئیس گڑھی حبیب اللہ خاں: یہ سردار حبیب اللہ خاں کا بیٹا تھا، جس کے نام سے گڑھی موسوم ہوئی ۔ اس نے بھی بڑے خلوص سے مجاہدین کی اعانت کی ۔ ۱۸۶۸ء میں وفات پائی ۔

۳۔ نواب خاں پلال تنولی: یہ سربلند خاں کا فرزند تھا اور رئیس شنگری کے لقب سے مشہور ہے سید صاحب کے ساتھ رہا اور مجاہدین کا بھی ساتھ دیا ۔ "ہزارہ گزیٹیر" میں بتایا گیا ہے کہ اس نے مجاہدین کو ساتھ لے کر دوڑ ندی کو عبور کر کے مانک رائے پر قبضہ کر لیا تھا[۱]۔ یہ بھی بتایا گیا ہے، ہزارہ کے حاکم مول راج نے نواب خاں کو ایلچی بنا کر صواتیوں کے پاس بھیجا تھا کہ وہ سرکشی اختیار نہ کریں، لیکن نواب خاں نے حالات سکھوں کے لیے ناسازگار پائے تو قلعہ شروان پر قبضہ کر لیا[۲]۔ قلمی مکتوب سے واضح ہوتا ہے کہ جو مقامی سردار سکھوں کے لشکر کو علاقہ جدون میں لانے کے ذمہ دار تھے، ان میں نواب خاں بھی شامل تھا۔ مجاہدین کی کامیابی کے بعد اسے گرفتار کر لیا گیا، لیکن محمد امین خاں خان خیل اور بعض دوسرے مخلص رفیقوں کی سفارش پر اس کا قصور معاف ہو گیا ۔

۴۔ مدد خاں ہندوال تنولی: یہ سردار پائندہ خاں والیِ امب کا چھوٹا بھائی تھا۔ سید صاحب کا معین و رفیق رہا۔ قلمی مکتوب میں بتایا گیا ہے کہ یہ بھی ابتدا میں مجاہدین کا مخالف تھا اور گرفتار ہؤا، لیکن مخلص سرداروں کی سفارش پر اسے بھی چھوڑ دیا گیا۔ پائندہ خاں نے اس کے لیے پھلڑہ کی جاگیر مقرر کر دی تھی۔ ۱۸۶۷ء میں فوت ہؤا ۔

۵۔ سید ضامن شاہ رئیس کوائی (کاغان): اس کا شجرۂ نسب یہ ہے:

ضامن شاہ بن حسن علی شاہ بن سید احمد بن عارب شاہ بن شاہ زماں بن سید جلال ترمذی ۔

---

[۱] گزیٹیر مطبوعہ ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۳۳ ۔ [۲] گزیٹیر مطبوعہ ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۳۳ ۔

برابر مجاہدین کے ساتھ رہا۔ اسی نے مولانا عنایت علی کو دعوت دے کر بلایا تھا۔ اسی کی امداد سے بالاکوٹ فتح ہوا اور مجاہدین کو بالائی ہزارہ میں حکومت قائم کرنے کا موقع ملا۔ اسی نے گلاب سنگھ والیِ کشمیر کے دیوان ابراہیم شاہ اور اس کی فوج کو بیلہ میں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ بعد از آں ضامن شاہ نے کاغان میں انگریزی مداخلت کی مخالفت کی۔ اس وجہ سے ایک فوج بھیجی گئی جس نے سادات کو گرفتار کر کے بفہ میں نظر بند کر دیا۔ ضامن شاہ نے غالباً ۱۸۶۱ء میں وفات پائی۔ اس کا بھائی نوبت شاہ بھی تمام مجاہدانہ سرگرمیوں میں شریک رہا۔ وہ غالباً ۱۸۶۷ء میں فوت ہوا۔

۶۔ ان کے علاوہ راجا حیدر بخش خاں رئیس خان پور، غلام خاں ترین، خان زمان خاں طاہر خیلی، حسن خاں کرڑال، راجا روح اللہ خاں، راجا سرباز خاں ڈھونڈ، پیر خاں اور بہت سے دوسرے اصحاب کا ذکر آیا ہے، لیکن ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ ان میں سے بعض نے سیّد اکبر شاہ ستھانوی کے ماتحت آزاد حکومت کی تاسیس کے لیے کوشش کی، بعض نے مجاہدین کو مدد دی۔ جب حالات بالکل ناسازگار ہو گئے اور انگریزوں نے انتظامات کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی تو مختلف رئیس یکے بعد دیگرے انگریزوں کی اطاعت قبول کرتے رہے[1]۔

---

[1] اس سلسلے میں سیّد غلام حسن شاہ صاحب کاظمی زیارت شریف ٹھنگر سے بھی خاصی معلومات حاصل ہوئیں۔

چوتھا باب

اسلامی حکومت کی تاسیس

مقبوضات کی کیفیت قلمی مکتوب مظہر ہے، فتح گڑھ کی جنگ کے بعد سکھوں پر اتنی ہیبت طاری ہوئی کہ انھوں نے پکھلی میں دوبارہ قدم رکھنے سے توبہ کرلی۔ نواں شہر میں ان پر ایسی ضربیں لگیں کہ علاقۂ جدون سے بھی کاملاً دست بردار ہو گئے اور اسلامی مملکت کی سرحد نواں شہر سے سکندر پور کے قریب تک پہنچ گئی:

توپ وشاہین وشتر واسپ وڈیرہ	سکھوں سے جو توپیں، شاہینیں،
وخیمہ ومال ہائے فراواں ودیگر از جنس اسباب کے	اونٹ، گھوڑے، ڈیرے، خیمے بہت سا
کلاں در غنیمت مومنین آمد و اسباب خرد	مال اور قیمتی چیزیں ملیں مومنوں کے قبضے میں آئیں
بہ ملکیاں واگذاشت نمودہ شد ۔	باقی سامان ملکیوں کے حوالے کر دیا گیا ۔

اس واقعے کے بعد علاقۂ جدون، علاقۂ تنول، وادی بھوگر منگ، وادیِ کونش، پکھلی بالا، پکھلی زیریں، کانڈھی، دھمتوڑ، درہ کتھار وغیرہ علاقے پر راضی ہو گئے اور خدا کے فضل سے محاصل باقاعدہ جمع ہونے لگے۔ بعض اصحاب کو جاگیریں اور معافیاں ملیں، بعض کو انعامات دیے گئے۔

سپاہ کا انتظام قبل ازیں فوجی خدمات کے لیے تین صورتیں جاری تھیں: بعض لوگوں کو اس شرط پر زمینیں دے دی جاتی تھیں کہ وہ جنگ کے موقع پر ساز و سامان لے کر حسبِ حکم جمع ہو جائیں۔ جن سرداروں کو بڑی بڑی جاگیریں حاصل تھیں، وہ جنگ کے وقت اپنی جاگیر میں سے فی گھر ایک ایک اسلحہ بند بُلا لیتے تھے۔ بعض لوگوں کو حکمران باقاعدہ ملازم رکھ لیتے تھے۔ یہ تینوں صورتیں مجاہدین کے ابتدائی زمانے میں بھی جاری رہیں۔ قلمی مکتوب سے واضح ہوتا ہے کہ دس ہزار کے قریب افراد جاگیرداروں کے

ذریعے سے میدان میں لائے جا سکتے تھے۔ ایک ہزار روہیلے براہِ راست ملازم تھے:

بہ ایں حساب سوائے نوکراں بہ حکمِ خدا	اس حساب سے نوکروں کے علاوہ
سی ہزار لشکر موجود است۔ اما لشکرِ جرّار	بہ فضلِ خدا تیس ہزار جنگ جُو موجود ہیں لیکن
و اعتمادی ہمان است کہ نوکر است ٭	حقیقی اور قابلِ اعتماد لشکر وہی ہے، جو براہِ راست ملازم ہے ٭

نظم و نسق کی تفصیل | مجاہدین نے تمام قلعوں میں حسبِ ضرورت فوج مقرّر کر رکھی تھی اور ہر قلعے کی متعلقہ آبادی کا انتظام قلعہ دار کے ہاتھ میں تھا۔ نیز ہر مقام پر تحصیل دار مقرّر تھے، جنھیں "داروغۂ محاصل" کہا جاتا تھا۔ اسی طرح ہر جگہ خزانے، اسلحہ خانے اور اصطبل کے انتظام کے لیے مختلف اصحاب مامور تھے۔ بعض لوگوں کا کام یہ تھا کہ سپاہیوں کو باقاعدہ قواعد کراتے رہے۔ قلمی مکتوب سے بعض افراد کی عہدہ داریوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً:

نام	عُہدہ
داروغہ ریاست اللہ	قلعہ دار مانسہرہ
حاجی گدائی رام پور بولیاں والا	داروغۂ محاصل
منشی شجاع الدین	تھانہ دار برج مانگلی (علاقہ جیدعلن)
رمضان خاں ساکن دھنکی (عظیم آباد)	قلعہ دار بالاکوٹ
منشی غلام علی بنیہ والا	منشی قلعہ مانسہرہ
حاجی نجو عظیم آبادی	داروغۂ محصول بالاکوٹ
میاں محمد علی عظیم آبادی	جمعدار سپاہیان دروازۂ کلاں فتح گڑھ
حاجی شمشیر خاں ساکن صاحب گنج	جمعدار سپاہیان خاص
بہادر خاں " "	محصّلِ مال
میاں عبداللہ عظیم آبادی	معلّم قواعد سپاہیاں

عہدہ	نام
داروغۂ سلاح خانہ و اصطبل	سراج الدین
ناظم حضوری و داروغۂ قید خانہ	ناظر ریحان الدین[1]
ناظم خزانہ	میاں بدر الدین بوڑھن والا
ناظم تقسیم سپاہ	اکبر میاں رام پور بولیاں والا
سپہ سالار لشکر	مولوی مقصود علی
ناظم توشہ خانہ	صوفی معز الدین فرید پوری
ناظم مودی خانہ	ناظم فرید پوری

یہ صرف چند خدمتیں ہیں، جن کی کیفیت معلوم ہو سکی۔ تمام مقامات پر اسی طرح کے انتظامات موجود تھے ؂

احتساب و حدود احتساب اور انسدادِ جرائم کا سلسلہ بھی شریعت کے مطابق جاری کر دیا گیا تھا مثلاً ہر شخص کے لیے لازم تھا کہ نماز با جماعت ادا کرے۔ جو شخص شرعی عذر کے بغیر کوتاہی کا مرتکب ہوتا تھا اس سے جرمانہ لیا جاتا تھا، عوام سے پانچ سیر غلہ اور امیروں سے ایک روپیہ فی کس۔ جمعہ کی نماز میں کوتاہی کے لیے بھی یہی سزائیں مقرر تھیں۔ ڈاکوؤں کو قتل کی سزا دی جاتی تھی۔ جو لوگ شادی اور غمی میں غیر شرعی حرکات کے مرتکب ہوتے تھے، ان سے بھی جرمانہ لیا جاتا تھا۔ جا بجا مفتی مقرر کر دیے گئے تھے۔ مثلاً بالاکوٹ میں خدمتِ افتاء پر مولوی یحییٰ علی عظیم آبادی مامور تھے۔ درۂ کنہار میں ملا میر اسد اخوند زادہ کو افتاء اور احتساب کا کام سونپا گیا تھا۔ ان کے ماتحت بہت سے علماء مقرر تھے، جو دیہات میں دورہ کرتے رہتے۔ بے نمازوں کو نماز کی تسلیم دیتے۔ محمد حی اخوند زادہ علاقہ درۂ کنہار کا قاضی تھا۔ محمد حسین اخوند زادہ کو پکھلی میں

---

[1] یہ غالباً وہی بزرگ ہیں، جن کا ذکر مقدمہ انبالہ میں بار ہا آیا۔ یہ ہندوستان میں سرکاری ملازمت اختیار کر لینے کے باوجود فراہمی زر اور فراہمی مجاہدین کا کام برابر کرتے رہے، لیکن معلوم ہوتا ہے انھیں دارو گیر کا علم ہو چکا تھا اس لیے گرفتاری سے پیشتر سرحد پہنچ گئے۔ یہ ظاہر وہیں فوت ہوئے ؂

وعظ و نصیحت کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔

مرکز کی کیفیت خود مولانا عنایت علی کا مرکز فتح گڑھ تھا، جس کا نام بدل کر اسلام گڑھ رکھ دیا گیا تھا۔ سات قرابینچی ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ سرداروں اور خوانین سے جہاد کے متعلق مشورے کیے جاتے تھے۔ رسالداروں یا سالارانِ جیش میں سے کسی کو بلایا جاتا تو وہ ایک سپاہی کے ساتھ مولانا کے پاس آتا۔ کابل اور کشمیر کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ شیخ امام الدّین سکھوں کی طرف سے کشمیر کا گورنر تھا۔ اگرچہ انگریزوں نے سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد کشمیر کو گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا، لیکن شیخ امام الدّین نے ابتدا میں گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ دے دینے سے انکار کر دیا تھا اور مولانا عنایت علی سے نامہ و پیام شروع کر دیا تھا۔ قلمی مکتوب مظہر ہے:

صوبہ دار کشمیر شیخ امام الدّین بہ کمال تمنّا	کشمیر کے صوبہ دار شیخ امام الدّین نے
راہِ موافقت بپیمودہ برائے ارسالِ خطوط	دلی خواہش سے موافقت کا راستہ پیدا کیا
جوڑی ہرکارہ مقرر نمودہ۔ چنانچہ در ہر ماہ	اور ارسالِ خطوط کے لیے ہرکاروں کی جوڑی
دو سہ خط شیخ موصوف متضمن کلام محبّت	مقرر کر دی۔ چنانچہ ہر مہینے اس کی طرف سے
و دوستی می رسند۔	دوستی اور محبّت کے دو تین خط آ جاتے ہیں۔

اسی طرح امیر دوست محمد خاں فرماں روائے کابل اور اس کے فرزندِ ارجمند محمد اکبر خاں غازی سے تعلقات پیدا ہو چکے تھے، بلکہ قلمی مکتوب کے مطابق انھوں نے رفاقت و امداد کے عہد نامے لکھ بھیجے تھے۔

نواں شہر کا قلعہ فتح ہوا تو اس پر سلامی کی توپیں سر کی گئیں۔ شیخ امام الدّین کے پاس یہ خبر بھیجی گئی تو اس نے قاصد کو بہت سا انعام دیا۔ حکومت کا پورا کاروبار کتاب و سنّت کے مطابق انجام پاتا تھا۔

خراج کی تفصیلات خراج کے پورے حالات تو معلوم نہیں، لیکن بعض علاقوں کی رقموں کا ذکر قلمی مکتوب میں آیا ہے۔ مثلاً:

درۂ کنہار	سولہ ہزار
درہ بھوگڑا منگ	پانچ ہزار
کانڈھی	سات ہزار
پکھلی	چھبّیس ہزار
علاقۂ جدون سالاران	تیس ہزار
علاقۂ جدون حسن زئی و منصور	تیس ہزار
مظفر آباد	چالیس ہزار
کرنا	دس ہزار
تندھیاٹر	بیس ہزار
الائی	بیس ہزار

اس خراج میں جاگیریں شامل نہ تھیں ؞

پانچواں باب

مولانا ولایت علی کی تشریف آوری

مولانا ولایت علی کی آمد یہ حالات تھے، جب اچانک ۱۷۔ شوال ۱۲۶۲ھ (۹۔ اکتوبر ۱۸۴۶ء) کو مولانا ولایت علی علاقۂ مجاہدین میں پہنچ گئے۔ قلمی مکتوب مظہر ہے :

جناب حضرت مولانا ابالفضل ادلانا مظہر کرامات لم یزلی محرم اسرار خفی و جلی مرشدنا وامیرنا مولوی ولایت علی صاحب ادام اللہ برکاتہٗ وانوارہٗ مع تمام اہل قافلہ و آلات واسباب وخیل و دواب محض از فضل رب الارباب از میانِ ہجوم اعدا بہ عافیت تمام بہ حکومتِ اہلِ اسلام جلوہ افروز شدہ موجب حیرتِ خویش و بیگانہ و ظہور آیۂ حافظ یگانہ گشتند ؀

خدا کی کرامتوں کے مظہر، چھپے اور کھلے بھیدوں کے جاننے والے ہمارے مرشد اور ہمارے امیر مولوی ولایت علی (خدا ان کے برکات و انوار کو دوام بخشے)، اہلِ قافلہ، ہتھیاروں، اسباب، گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ اہلِ اسلام کے دائرۂ حکومت میں جلوہ افروز ہوئے۔ یہ خدا کا خاص فضل تھا۔ کہ وہ دشمنوں کے ہجوم سے سلامت گزر آئے۔ اس پہ اپنے اور بیگانے ہر ایک کو حیرت ہوئی اور اس واقعے کو حافظ حقیقی کے نشان کا ظہور سمجھا گیا ؀

واقعات کی صحیح کیفیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ مولانا عنایت علی نے ہزارہ میں مجاہدین کی رفتارِ کامیابی کا اندازہ کرتے ہوئے مولانا ولایت علی کے پاس سازگار حالات کی مفصّل اطلاعات بھیج دی ہوں گی اور عرض کیا ہوگا کہ آپ تشریف لے آئیں۔ چنانچہ مولانا بظاہر پنجاب ہی میں سے گزر کر ہزارہ پہنچے، البتہ یہ

معلوم نہ ہو سکا کہ انھوں نے بہ خیریت گزر جانے اور باز پرس سے محفوظ رہنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کیں۔[۲]

رفقاء اور مال اسباب قلمی مکتوب کی عبارت سے ظاہر ہے کہ مولانا کے ساتھ اسلحہ بھی تھے اور سواریاں بھی، البتہ "اہلِ قافلہ" کی تفصیل نہیں بتائی گئی۔ "تذکرۂ صادقہ" کا بیان ہے کہ مولانا عنایت علی کے جانے سے:

> دو سال بعد آپ بہ معیّت مولوی فیّاض علی و مولوی یحییٰ علی و مولوی اکبر علی و صاحبزادۂ کلاں، مولوی عبداللہ بہ ارادۂ تائید و نصرت ضامن شاہ بالاکوٹ کی طرف روانہ ہوئے اور اپنے چھوٹے بھائی فرحت حسین کو یہاں پٹنہ میں اپنا جانشین مقرر کر گئے اور اپنے سب عیال و اطفال کو یہیں چھوڑ گئے۔[۱]

تھوڑے سے آدمیوں کی رفاقت عین قرینِ قیاس ہے۔ اس صورت میں سکھوں کے علاقے سے ان کا مسافرانہ گزر جانا مشکل نہ تھا، لیکن قلمی مکتوب کی عبارت سے دل پر یہ اثر پڑتا ہے، گویا مولانا کے ساتھ خاصا بڑا لاؤ لشکر تھا۔ ممکن ہے مکتوب نگار نے لکھتے وقت احتیاط سے کام نہ لیا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا ولایت علی نے ہمراہیوں کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم کر کے سکھوں کے مقبوضات سے گزار دیا ہو اور سرحد پہنچ کر وہ لوگ مولانا سے مل گئے ہوں۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا کس راستے سے ہزارہ میں داخل ہوئے؟ چونکہ ان کا استقبال مانگلی میں ہوا، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس لیے سمجھنا چاہیے کہ وہ حسن ابدال سے ہری پور اور حویلیاں ہوتے ہوئے آئے۔ حویلیاں سے ایک سیدھا راستہ بھی مانگلی کی طرف جاتا ہے، دوسرا راستہ رجوعیہ، دھمتوڑ، نواں شہر، کاکول سے ہے۔ مانگلی کا عام قدیم راستہ یہی تھا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے مولانا نے کون سا راستہ اختیار کیا۔

مانسہرہ میں ورود تشریف آوری کی اطلاع پہلے سے مل گئی تھی، لہٰذا سپاہیوں کی ایک جماعت

---

[۱] "تذکرۂ صادقہ" صفحہ ۱۲۳۔ "سوانح احمدی" کی تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ مولانا عنایت علی سے تین برس بعد مولانا ولایت علی گئے تھے، طبع اول صفحہ ۲۱۵۔

[۲] نیز اوپر ایک روایت کی بنا پر عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا عبداللہ اٹک روانہ ہوئے تھے۔

استقبال کے لیے مانگلی بھیج دی گئی، جسے قلمی مکتوب میں اہل اسلام کی سرحد بتایا گیا ہے، یعنی مجاہدین کا مقبوضہ علاقہ وہاں سے شروع ہوتا تھا:

سپاہیان در آنجا رسیدہ بندوق ہا
سر کردند و نذرہا پیش نظر آوردند ۔

سپاہیوں نے مولانا کے نمودار ہوتے ہی
بندوقیں چلائیں اور نذریں پیش کیں ۔

مولانا مانسہرہ پہنچے تو وہاں بھی پُرجوش استقبال ہوا۔ قلمی مکتوب مظہر ہے:

داروغہ ریاست اللہ صاحب کارپرداز
قلعہ (مانسہرہ) مع سپاہیان برائے استقبال
بیروں از قلعہ آمدہ بہ تفنگ ہا سلامی نمودند
و نذرہا پیشکش آوردند۔ برادر حضرت مولوی
مقصود علی را مع لشکر فراواں از پیادہ و سوار
و شترنال و نشاں بہ استقبال روانہ فرمودند۔
مولوی صاحب موصوف ہم بیرون قلعہ مانسہرہ
رسیدہ بہ سلامی از سپاہیان تفنگ و
قرابین و شترنال شلک کنانیدند و ازیں
طرف نیز بہ حکم سپاہیان از بالائے قلعہ
قرابین ہا و بندوق ہا سر نمودند ۔

قلعہ مانسہرہ کے کارپرداز داروغہ
ریاست اللہ نے باہر نکل کر بندوقوں سے
سلامی دی، اور نذریں پیش کیں۔ مولانا عنایت علی
نے مولوی مقصود علی کو سواروں اور پیادوں کے
بڑے لشکر، چھوٹی توپوں اور نشان کے ساتھ
استقبال کے لیے بھیج دیا تھا۔ مولوی صاحب
موصوف نے بھی قلعہ مانسہرہ سے باہر سلامی
میں بندوقیں، قرابینیں اور چھوٹی توپیں
سر کرائیں، نیز نذریں پیش کیں۔ جو سپاہی
قلعے میں تھے، انھوں نے بھی حکم کے مطابق
قرابینیں اور بندوقیں چلائیں ۔

بھائیوں کی ملاقات

غالباً ہفتے کا دن مولانا نے مانسہرہ میں گزارا۔ اتوار کی صبح کو روانہ ہوئے۔ مولانا عنایت علی نے سید ضامن شاہ ساکن کوائی (کاغان) اور محمد امین خاں خان خیل رئیس گڑھی کو دو سو سواروں اور پیادوں کے ساتھ راستے میں استقبال کے لیے بھیج دیا تھا۔ مولانا ولایت علی لبرکوٹ پہنچے تو ان سرداروں سے ملاقات ہوئی۔ وہاں بھی بندوقیں چلیں اور نذریں گزرانی گئیں۔ خود مولانا عنایت علی ہندوستانی مجاہدوں اور روہیلہ سپاہیوں کے ساتھ اترشیشہ[1] میں پہنچے ہوئے تھے۔ وہیں میدان میں

[1] اترشیشہ مانسہرہ سے تقریباً نو میل گڑھی حبیب اللہ خاں کی جانب ہے۔ لبرکوٹ مانسہرہ اور اترشیشہ کے درمیان ہے۔

دونوں بھائیوں کی ملاقات ہوئی :

در آں وقت عجب جلوۂ نور و بارشِ برکات از حضور ربّ غفور بود - از آوازِ تفنگ و قرابین سپاہیاں و مجاہدین از ہر دو جانب کہ ہزارہا بودند، گوش زمینیاں کر گشتہ - از ہجوم مردماں، ملاقات ہر دو برادر باخود ہا دشوار گردیدہ - آخر بہ جد و جہد تمام مردماں را جدا کردہ ملاقات باخود ہا میسّر آمد - ہر دو برادر بعد از فراغ معانقہ و مصافحہ باخود درمیانِ ہمیں میدان سر بہ زمیں نہادہ تا دیر وظیفۂ شکر و سپاس ربّ العالمین بجا آوردند و تمامی لشکر بہ سجود رفت و حمد و ثنائے آں واہب العطیّات بسیار از بسیار گفتند - بعد ازاں صدہا و ہزارہا مردماں بہ قدرِ لیاقت خود روبروئے حضرت کلاں نذر گزرانیدند ؏

اُس وقت ربّ غفور کی جانب سے عجیب نور جلوہ گر تھا اور برکتوں کی بارش ہو رہی تھی - دونوں جانب ہزاروں سپاہی اور مجاہد موجود تھے - ان کی بندوقوں اور قرابینوں کی آواز سے زمین والوں کے کان بہرے ہو گئے - لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ دونوں بھائیوں کی ملاقات دشوار ہو گئی - آخر بڑی کوشش سے لوگوں کو الگ کیا گیا اور بھائیوں میں ملاقات کی صورت پیدا ہوئی - مصافحے اور معانقے کے بعد دونوں بھائی اسی میدان میں پیشانی زمین پر رکھ کر دیر تک جہانوں کے پروردگار کا فریضۂ شکر ادا کرتے رہے - لشکر بھی سجدے میں گر گیا اور سب دیر تک خدا کی حمد و ثنا کرتے رہے - پھر سیکڑوں ہزاروں آدمیوں نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق مولانا ولایت علی کی خدمت میں نذریں پیش کیں ؏

اسلام گڑھ میں جلوہ افروزی جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، حکومت کا مرکز فتح گڑھ تھا، جس کا نام بدل کر اسلام گڑھ رکھ دیا تھا - اتر شیشہ میں دوپہر کا کھانا کھایا - پھر دونوں بھائی سوار ہوئے اور اتوار کو شام کے وقت اسلام گڑھ پہنچ گئے - شوال ۱۲۶۲ھ کی انیسویں اور اکتوبر ۱۸۴۶ء کی گیارھویں

تاریخ تھی۔ قلعے کے داروغہ امام خاں کے حکم سے سات سات مرتبہ توپیں چلائی گئیں۔ پانچ پانچ مرتبہ شاہینیں اور زنبورکیں، ایک ایک مرتبہ قرابینیں اور بندوقیں۔ اس کے بعد علماء، رؤسا، خوانین اور جاگیرداروں نے مولانا ولایت علی کی خدمت میں نذریں گزرانیں ؂

۲۴۔ شوال ۱۲۶۲ھ (۱۶۔ اکتوبر ۱۸۴۶ء) کو جمعے کے دن مولانا عنایت علی نے امارت کا پورا کاروبار مولانا ولایت علی کے حوالے کر دیا۔ مولانائے موصوف کو چھوٹے بھائی کی مشقت و جانفشانی، ملک داری اور فوج کے حسنِ انتظام کا پورا اندازہ ہو چکا تھا، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا:

در مجلس جمعہ بعد از گرفتنِ بیعت امارت	جمعے کی مجلس میں بیعت کے بعد بآواز
بآواز بلند فرمودند کہ برادرِ خُرد را از طرفِ خود	بلند فرمایا کہ میں اپنی طرف سے چھوٹے بھائی کو
رئیس جملہ مجاہدین نمودم و انتظام کاروبار	تمام مجاہدین کا سالار بناتا ہوں اور تمام انتظامات
بدستور قدیم سپرد برادرِ خرد ساختم ؂	سابقہ دستور کے مطابق ان کے حوالے کرتا ہوں ؂

"تذکرہ صادقہ" کا بیان ہے:

بالاکوٹ پہنچ کر معلوم ہوا کہ اب تک مولوی عنایت علی صاحب کارزار میں مصروف ہیں۔ غرض مولانا (ولایت علی کے وہاں پہنچتے ہی کُل کارخانہ مولوی عنایت علی صاحب نے آپ کے سپرد کر دیا اور جملہ مجاہدین نے مولانا کے ہاتھ پر بیعتِ امارت کر لی [۱]

ضروری گزارش مولانا ولایت علی کے استقبال میں جا بجا جو خاص اہتمام کیا گیا، اُس میں بادشاہوں اور حکمرانوں کی شان زیادہ نمایاں ہے، حالانکہ مجاہدین کا سارا کاروبار درویشانہ و فقیرانہ تھا۔ ممکن ہے یہ امر بعض قلوب میں خلش کا باعث ہو، لہٰذا واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ اہتمام نظر بظاہر امیری کی شان بلند کرنے کے لیے مناسب سمجھا گیا اور اُس زمانے کے آدمیوں کی ذہنیت اِس قسم کی تھی کہ نمائشِ شکوہ کے بغیر امیری کی حقیقی حیثیت ان کے دل نشین نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے سوا اہتمام کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ خود سید احمد شہید نے ایسی کوئی نمائش اپنے لیے کبھی پسند نہ فرمائی، نیز مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کی پہلی یا بعد کی زندگیوں میں بھی اس نوع کے ہنگاموں کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ممکن ہے مولانا کی تشریف آوری کے موقع پر اہتمام خصوصی کسی وقتی اور مقامی مصلحت کی بنا پر ناگزیر سمجھا گیا ہو ؂

[۱] "تذکرہ صادقہ" صد ۱۲۳ ؂

چھٹا باب

درۂ ڈُبّ کی جنگ

صورتِ حال مولانا ولایت علی کو سرحد پہنچے ہوئے پورے تین مہینے بھی نہ ہوئے تھے کہ درۂ ڈُبّ کی جنگ پیش آگئی، جس نے مجاہدین کے لیے قیام کی کوئی جگہ باقی نہ چھوڑی اور کئی سال کی محنت سے جہاد کے لیے جو مرکز بنایا گیا تھا، وہ چھن گیا۔ جنگ کی تفصیل بیان کرنے سے پیشتر ضروری ہے کہ تمہید کے طور پر وقت کی صورتِ حال واضح کر دی جائے، جس کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ کامیابی کیوں دفعتہً ناکامی سے بدلی اور ہزارہ میں اسلامی حکومت کی جو بنیاد پڑ چکی تھی، وہ کس وجہ سے معرض انہدام میں آئی؟

حکومت انگلشیہ نے سکھوں سے پہلی جنگ کے بعد دوآبہ بست جالندھر لے لیا تھا نیز سکھوں کی حکومت پر ڈیڑھ کروڑ روپیہ تاوان عائد کیا تھا۔ چونکہ لاہور کے خزانے میں روپیہ موجود نہ تھا، اس لیے قرار پایا کہ دریائے بیاس اور دریائے سندھ کے درمیان تمام کوہستانی علاقے بشمول کشمیر و بالائی ہزارہ ایک کروڑ روپے کے معاوضے میں انگریزوں کے حوالے کر دیے جائیں۔ باقی پچاس لاکھ روپے عہدنامے کی توثیق سے پہلے یا توثیق کے وقت نقد دے دیے جائیں۔ اس علاقے میں سے جو خطے دریائے راوی کے مغرب اور دریائے سندھ کے مشرق میں واقع تھے، وہ پچھتر لاکھ روپے کے معاوضے میں گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیے گئے۔ ان میں جموں اور کشمیر کے علاوہ بالائی ہزارہ بھی شامل تھا۔ سکھوں کی مرکزی حکومت میں افراتفری اور جنگ کے دوران میں ہزارہ کے اندر آزادی کی دو تحریکیں جاری ہوئیں، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں: ایک زیریں ہزارہ میں، جس کے نظم ونسق کے لیے سیّد اکبر شاہ ستھانوی کو بادشاہ تسلیم کیا گیا، دوسری بالائی ہزارہ میں جس کے سرخیل مولانا عنایت علی تھے اور جس کی حدیں مانگلی سے مشرق میں مظفرآباد اور شمال میں کاغان تک پہنچی ہوئی تھیں۔

زرّیں موقع آزادی کی ان تحریکوں کو مستحکم و نتیجہ خیز بنانے کے لیے قدرت نے زرّیں موقع پیدا کر دیا تھا۔ زیریں ہزارہ پر سکھوں کے لیے قبضہ بحال رکھنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔ تمام رؤسا و خوانین کو یقین ہو چکا تھا کہ سکھ حکومت کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا ہے۔ بالائی ہزارہ میں گلاب سنگھ ڈوگرہ اسی وقت پہنچ سکتا تھا کہ کشمیر پر اُس کا قبضہ ہو جاتا۔ وہاں کے گورنر نوّاب شیخ امام الدّین نے دربار لاہور کی خفیہ ہدایات کے مطابق کشمیر کو گلاب سنگھ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ گویا بالائی ہزارہ سکھوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور گلاب سنگھ کشمیر پر قبضہ کیے بغیر وہاں پہنچ نہیں سکتا تھا ۔

صلح کے بعد انگریزوں نے ملکی انتظامات کی بحالی کے لیے سرگرم کوششیں شروع کر دیں۔ ایک طرف ایبٹ صاحب کو ہزارہ بھیج دیا گیا کہ وہ نظم و نسق کی بنیادیں از سرِ نو استوار کرائے۔ دوسری طرف ہنری لارنس، جسے دربار لاہور میں ریزیڈنٹ کا عہدہ دیا گیا تھا، خود فوج لے کر جموں پہنچا اور وہاں سے ہربرٹ ایڈورڈز کو نوّاب شیخ امام الدّین سے تصفیے کے لیے کشمیر بھیج دیا۔ ہربرٹ ایڈورڈز نے ملک فتح خاں ٹوانہ کو ساتھ لے لیا جو نوّاب امام الدّین کا جگری دوست تھا۔ ملک ہی کی کوششوں سے امام الدّین نے وہ تمام خطوط انگریزوں کے حوالے کر دیے، جن میں دربار لاہور نے ہدایت کی تھی کہ کشمیر کو گلاب سنگھ کے حوالے نہ کیا جائے۔ ان تمام کارروائیوں کا ذمہ دار لال سنگھ وزیر تھا۔ غرض ہربرٹ ایڈورڈز اور ملک فتح خاں ٹوانہ کی کوششوں سے کشمیر گلاب سنگھ کے قبضے میں آیا۔ لال سنگھ کے خلاف لاہور میں مقدمہ چلا اور اسے وزارت سے علیٰحدہ کر کے جلا وطن کر دیا گیا ۔

انقلابِ احوال یوں گلاب سنگھ کو کشمیر کے قبضے سے فارغ ہو کر بالائی ہزارہ پر توجہ کی فرصت مل گئی۔ اِدھر سے ایبٹ صاحب نے مختلف خوانین کو سمجھا بجھا کر ہموار کر لیا اور زیریں ہزارہ میں ان کے لیے جاگیروں کا بندوبست کر کے سکھوں کی حکومت بحال کر دی۔ اس کیفیت سے ظاہر ہے کہ حالات تحریکِ آزادی کے لیے جس تیزی سے سازگار ہوئے تھے، اسی تیزی سے ناسازگار ہو گئے۔ اسی سلسلے میں درۂ دُبّ کی جنگ پیش آئی۔ انگریزوں کے زیرِ اثر گلاب سنگھ اور سکھوں کا رسوخ بحال ہو چکا تھا۔ خوانین و رؤسا انگریزوں ہی کی تدبیر آرائیوں کے باعث اُن کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میدانِ جنگ میں اُن سے جس

سرگرم اعانت کی امید تھی، وہ پوری نہ ہوئی اور مجاہدین کو شکست سے سابقہ پڑا ؏

درۂ دُبّ

درۂ دُبّ کی جنگ کے پورے حالات کہیں سے نہ مل سکے۔ مختلف ذریعوں سے جو کچھ معلوم ہو سکا وہ ذیل میں درج ہے، لیکن اصل جنگ سے پیشتر درۂ دُبّ کا جغرافیائی موقع واضح کر دینا ضروری ہے[1]۔

دُبّ گڑھی حبیب اللہ خاں اور مظفّر آباد کے درمیان ایک مشہور درہ ہے، جس کی بلندی تقریباً پانچ ہزار فٹ ہے۔ اس کے مشرق میں تھوڑے فاصلے پر پیر چناسی پہاڑ ہے، جو دُبّ سے بلند تر ہے۔ اسی پہاڑ کے جنوبی و مغربی دامن میں دریائے کشن گنگا کے کنارے مظفّر آباد واقع ہے، جو آج کل آزاد کشمیر کا مرکز ہے۔ دُبّ کے شمال میں کوہ سری کوٹ ہے، جو سات ہزار فٹ سے بھی زیادہ اونچا ہے۔ پھر بالاکوٹ کے سامنے تک پہاڑی سلسلہ چلا گیا ہے، مثلاً سری کوٹ کے شمال میں گلی گلوٹی، اس کے آگے پیر جبلیہ، مزید شمال میں نورگلی اور اس سے متصل مکڑا پہاڑ جو بالاکوٹ کے مشرق میں ہے اور اس کی بلندی بارہ ہزار سات سو باون فٹ بتائی جاتی ہے۔ دُبّ کے مغرب میں گڑھی حبیب اللہ خاں دریائے کنہار کے بائیں کنارے سے ذرا ہٹ کر آباد ہے۔ دریا کے کنارۂ مقابل پر بٹراسی کا پہاڑ ہے اور گڑھی سے شمال مغرب میں ڈمگلہ اور جابہ واقع ہیں۔ دُبّ سے جنوب کی طرف آئیں تو لوہار گلی پہنچ جاتے ہیں، جہاں سے قدیم شاہی راستہ مظفّر آباد کو جاتا تھا۔ لوہار گلی سے تھوڑے فاصلے پر جنوب میں دُمشی ہے، جہاں دریائے کنہار، جس کا دوسرا نام دریائے نین سکھ ہے، دریائے جہلم میں ملا ہے ؏

آج کل دُبّ ضلع ہزارہ اور ضلع مظفّر آباد کی درمیانی حد پر واقع ہے۔ اس درے سے گڑھی تقریباً تین میل ہو گی اور مظفّر آباد پانچ میل۔ گویا یہ ایک ایسا درہ ہے، جس کا مغربی دروازہ گڑھی حبیب اللہ خاں کی طرف واقع ہے اور دروازۂ مقابل پر پہنچ کر جنوب کی طرف منہ کریں تو مظفّر آباد نظر آتا ہے۔ فی الحال دُبّ جس گاؤں کی حدبست میں واقع ہے، اس کا نام ڈونگ ہے۔ پاس ہی موضع ٹھنگر ہے جو مولانا

---

[1] اس بیان کی زیادہ تر تفصیلات کے لیے میں اپنے عزیز دوست سیّد غلام حسن شاہ صاحب کاظمی کا ممنون ہوں، جو درّہ دُبّ کے پڑوس میں بمقام زیارت شریف ٹھنگر رہتے ہیں اور اپنے ذوقِ تحقیق کے باعث بیشتر مقامی تاریخی حالات فراہم کرتے رہے ہیں ؏

سید سمندر شاہ چشتیؒ کی خانقاہ کے باعث قرب وجوار کی مشہور زیارت ہے۔ اس زیارت کے متولی میرے عزیز دوست سید غلام حسن شاہ صاحب کاظمی ہیں۔ جب مظفرآباد ڈوگرہ راج میں شامل تھا تو دُبّ پر کسٹم کی چوکی بنی ہوئی تھی۔ اب یہ چوکی باقی نہیں رہی۔ یہ مقام پُرانے زمانے میں جنگی نقطۂ نگاہ سے بڑا اہم تھا۔ چونکہ کشمیر کی شاہراہ پر واقع تھا، اس لیے یہاں سے سلاطین، مشائخ، علماء، سادات، اُمراء اور خواص و عوام برابر آتے جاتے رہے اور اسے خاصی شہرت حاصل ہوگئی ؎

ہزارہ گزٹیئر کا بیان درۂ دُبّ کی جنگ کے متعلق "ہزارہ گزیٹیر" کا بیان یہ ہے کہ نوّاب شیخ امام الدین کو حوالگیِ کشمیر پر مجبور کر دینے کے بعد سکھوں کی ایک فوج، جو دس رجمنٹوں پر مشتمل تھی، سری نگر سے مظفرآباد کے راستے بالائی ہزارہ پہنچی تاکہ اس علاقے کو بھی مسخر کر لے:

دیوان کرم چند اس فوج کا کماندار تھا۔ ریزیڈنٹ لاہور کے دو مددگار مسٹر وینس اگینیو[1] اور لفٹنٹ لمسڈن[2] اس فوج کے ساتھ تھے۔ ۶۔ جنوری ۱۸۴۷ء کو صواتیوں اور ہندوستانیوں نے گڑھی حبیب اللہ سے اوپر درۂ دُبّ میں اس فوج کی ناکام مزاحمت کی۔ جنگ کے بعد صواتیوں نے گورنر کشمیر کی اطاعت قبول کر لی۔ ہندوستانی (مجاہدین) علاقہ چھوڑ کر نکل گئے۔ بعدازاں سکھوں کی فوج ہزارہ کی وادیوں میں پھر نکلی اور مہاراجا (گلاب سنگھ) کا قبضہ مستحکم کر دیا[3] ؎

اوکنلے کا بیان اوکنلے کا بیان ہے کہ سکھوں کی پہلی جنگ میں خالصہ فوج تباہ ہوگئی اور حکومت برطانیہ کی سرپرستی میں سکھوں کی ایک نئی طاقت کا ظہور ہوا۔ اس کی موجودگی میں مجاہدین کے لیے مقبوضہ علاقوں پر تصرف قائم رکھنا غیر ممکن ہوگیا:

۱۸۴۷ء میں مجاہدین کی پوری فوج نے ہری پور میں مسٹر اگینیو کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ صرف میر اولاد علی مستثنیٰ رہے، جو تھوڑے سے مجاہدین کے ہمراہ ستھانہ چلے گئے۔

---

[1] Vans Agnew [2] Lumsden [3] "ہزارہ گزیٹیر" مطبوعہ ۱۹۰۸ء، صفحہ ۱۳۵ ؎

مولوی ولایت علی اور مولوی عنایت علی کو سرکاری نگرانی میں ان کے وطن عظیم آباد بھیج دیا گیا اور وہاں ان سے دس دس ہزار روپے کے مچلکے لے لیے گئے کہ وہ چار سال تک شہر سے باہر نہ جائیں گے[1]۔

بیلیو کا بیان ڈاکٹر بیلیو نے لکھا ہے کہ مجاہدین کی تمام تدبیریں ناکام ہوگئیں:

سکھوں کی ایک فوج نے لفٹنٹ ایگنیو کی قیادت میں مجاہدین کو منتشر کر دیا۔ میر مقصود علی گرفتار ہو گئے اور انھیں قید کر کے لاہور بھیج دیا گیا۔ عنایت علی جہاد کی زندگی کا یہ پہلا مزہ چکھ چکنے کے بعد دل شکستہ ہو گئے اور بھاگ کر عظیم آباد پہنچ گئے۔ بہت سے دوسرے مجاہدین نے بھی انھیں کی پیروی کی اور اولاد علی اعتمادی دوستوں کے ایک چھوٹے سے جیش کے ساتھ اپنے سابقہ رفیقوں سادات ستھانہ کے پاس پہنچ گئے[2]۔

بعض پرانے سرکاری کاغذات کے مطابق جنرل کاہن سنگھ مان نے ۶۔ جنوری ۱۸۴۷ء کو لاہور اطلاع بھیجی تھی کہ لفٹنٹ لمسڈن کی فوج مظفر آباد سے گڑھی حبیب اللہ خاں کی طرف روانہ ہو گئی ہے[3]۔ بتاریخ ۱۰۔ مارچ ۱۸۴۷ء ہنری لارنس ریزیڈنٹ نے جنرل کاہن سنگھ کو کشمیر اور مظفر آباد کی خدمات کے صلے میں ایک تلوار دی[4]۔

مقامی روایات جنگ کے متعلق مقامی روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ سکھوں کے درمیان باہمی رزم و پیکار اور انگریزوں سے پہلی جنگ کے سلسلے میں جو افراتفری اور بدامنی پیدا ہوئی تھی، وہ انگریزوں کی سرپرستی کے بعد ختم ہو گئی اور خود انگریز افسر جا بجا قیام امن کے لیے پہنچ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو خوانین ورؤسا مجاہدین کا ساتھ دے رہے تھے، وہ پہلے تذبذب میں پڑے، پھر جاگیروں کے لالچ میں انگریزوں سے

---

[1] "کلکتہ ریویو" بابت اکتوبر ۱۸۶۰ء ص ۳۸۱۔ [2] یوسف زئیوں کے متعلق رپورٹ (انگریزی) ص ۹۵ و ۹۶۔

[3] ریزیڈنٹ لاہور کے سیاسی روزنامچے (Political Diaries) از یکم جنوری ۱۸۴۷ء تا ۴۔ مارچ ۱۸۴۸ء ص ۲۔

[4] ایضاً ایضاً ص ۵۷۔

ہل گئے۔ جب مجاہدین نے مظفرآباد سے آنے والی فوج کا مقابلہ شروع کیا تو خوانین کی خفیہ سازباز کے باعث دریائے کنہار کی دائیں جانب کے مختلف مقامات سے قرابینیں اور زنبورکیں چھوڑی گئیں۔ مقصود یہ تھا کہ مجاہدین کو معلوم ہو جائے، حملہ صرف مظفرآباد کی جانب سے نہیں، پکھلی کی جانب سے بھی سکھوں کی فوج آ رہی ہے۔ صواتی اور دوسرے مقامی لوگ یہ دیکھتے ہی ادھر اُدھر منتشر ہو گئے اور مجاہدین تنہا میدانِ جنگ میں رہ گئے۔ وہ دس رجمنٹوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکتے تھے اور شکست کھا گئے۔

سید غلام حسن شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ڈُبّ کے شمال میں ایک فرلانگ پر "بازمار" نام ایک مقام ہے اور جنوب مغرب میں بھی ایک مقام "چڑک مار" کہلاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مقاموں پر مجاہدین کے مورچے تھے۔ ڈُبّ کے مشرق میں زیارت شریف ٹھنگر کے حدود کے اندر ایک قبرستان ہے، جسے مقامی طور پر "کالیاں قبراں" کہتے ہیں، اس لیے کہ وہاں کی مٹی قدرتی طور پر سیاہ ہے۔ غالباً یہ انھیں مجاہدین کی قبریں ہیں، جو جنگِ ڈُبّ میں شہید ہوئے تھے۔

لمسڈن کا بیان اُوپر بتایا جا چکا ہے کہ سکھوں کی فوج کے ساتھ دو انگریز افسر بھی تھے: وینس اگنیو اور لفٹنٹ لمسڈن۔ حسنِ اتفاق سے ہمیں جنگ ڈُبّ کے متعلق لمسڈن کا ایک خط مل گیا ہے، جو اس نے ۶۔ فروری ۱۸۴۷ء کو راولپنڈی سے اپنے والد کے نام انگلستان بھیجا تھا اور اس میں اپنے نقطۂ نگاہ سے جنگ کی پوری کیفیت بیان کی تھی۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ جب گلاب سنگھ کو کشمیر کا قبضہ دلایا جا چکا تو سر ہنری لارنس ریذیڈنٹ کو مناسب معلوم ہوا کہ اگنیو اور لمسڈن فوج لے کر ہزارہ کے راستے لاہور جائیں تاکہ اس طرف بھی گلاب سنگھ اور سکھوں کے مقبوضات میں امن قائم ہو جائے۔

بارہ مولہ پہنچ کر ان انگریز افسروں نے اگلے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ ایک ہفتہ گاڑیوں کے انتظام میں گزر گیا اور وہ تین ہزار فوج نیز چھ توپیں لے کر مظفرآباد کی طرف چل پڑے۔ مظفرآباد پہنچ کر معلوم ہوا کہ دریائے کشن گنگا کو عبور کرنے کے بعد قدم قدم پر لڑائی ہو گی، اس لیے کہ سات ہزار کوہستانی سامنے کے پہاڑوں میں مورچے قائم کیے بیٹھے تھے۔ وہ خوب مسلّح تھے اگرچہ ان کے پاس توپیں نہ

تھیں۔ خود انگریز افسروں کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ اوّل سکھ فوج کے پاس گولی بارود بہت کم تھی اگرچہ توپوں کے گولے بہت زیادہ تھے۔ دوسرے افیون ختم ہو چکی تھی اور سکھ سپاہی افیون کھائے بغیر لڑ نہ سکتے تھے۔ لمسڈن لکھتا ہے کہ مشکلات کے باوجود ہم نے پیش قدمی کا فیصلہ کر لیا اور ہر کشن گڑھ (موجودہ ہری پور) میں گلاب سنگھ اٹاری والے کو لکھا کہ وہ جتنی فوج فراہم کر سکے، لے کر جلد سے جلد موقع پر پہنچ جائے۔ گویا مخالفوں کو دونوں جانب سے نرغے میں لے لینے کی تجویز سوچی گئی تھی۔ ہنری لارنس کو بھی پورے حالات سے آگاہ کر دیا گیا۔

اس زمانے میں دریائے کشن گنگا کو تین گھاٹوں سے عبور کیا جاتا تھا۔ ایک گھاٹ قصبہ مظفر آباد کے شمال میں قلعہ[1] کے پاس تھا، دوسرا گھاٹ قصبہ کے سامنے اور تیسرا قصبے کے جنوب میں سرائے اکبری[2] سے متصل تھا۔ غالباً اسی گھاٹ کے سامنے آزاد کشمیر کی موجودہ سکرٹیریٹ تعمیر ہوئی ہے۔

کیفیت عبور و جنگ اب لمسڈن کے بیان کا خلاصہ ضروری تصریحات کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ اس نے ظاہر یہ کیا کہ شمالی گھاٹ سے دریا کو عبور کرے گا۔ فوج کا ایک حصہ بھی اس گھاٹ پر بھیج دیا۔ اس کے سامنے کا رقبہ میدانی تھا اور عام لوگ اسی گھاٹ سے آتے جاتے تھے۔ گھاٹ سے تھوڑے فاصلے پر ملاحوں کے مکان تھے اور عموماً کشتیاں اس گھاٹ پر رہتی تھیں، لیکن دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ جنوبی گھاٹ سے، جو سرائے اکبری کے عین سامنے تھا، دریا کو عبور کرے گا۔

۲۔ اگرچہ جنوبی گھاٹ پر صرف ایک کشتی تھی، لیکن لمسڈن نے مستعدی سے کام لے کر ۱۲۔ دسمبر ۱۸۴۶ء کی شب میں سات سو آدمی دریا کے دائیں کنارے پر پہنچا دیے اور انھوں نے سرائے میں قدم

---

[1] یہاں پہلے بھی ایک قلعہ تھا۔ موجودہ قلعہ رنبیر سنگھ والی کشمیر نے بنوایا اور اسی کے نام سے یہ منسوب ہے۔ اس کی سیڑھیاں دریا میں اتر گئی ہیں۔ تعمیر کا سارا کام بیگار پر ہوا تھا۔ آج کل اس میں پاکستانی فوج کا ایک جیش رہتا ہے۔

[2] یہ شش گوشہ سرائے اکبر نے تعمیر کرائی تھی۔ اس کا دروازہ دریا کی طرف ہے۔ جنوبی گوشے میں شاہی نشست گاہ تھی، جس کے دروازے پر یہ سنگین کتبہ نصب ہے: لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ۔ غالباً مغل اسی گھاٹ سے آتے جاتے تھے۔

جا کر حفظ و دفاع کے تمام ضروری انتظامات مکمل کر لیے۔ پھر ۲۴۔ دسمبر تک پوری فوج کشن گنگا سے گزار لی گئی ؛

۳۔ جنگی مصلحتوں کا تقاضا یہ تھا کہ جس فوج نے کوہستان دُبّ میں مورچے قائم کر رکھے تھے، اسے گڑھی حبیب اللہ خاں کی طرف سے کوئی کمک نہ پہنچتی۔ لمسڈن نے رئیس مظفر آباد کے ایک بھائی[1] کو حکم دیا کہ پانسو ہم قوموں کو ساتھ لے اور چھپ چھپا کر گڑھی حبیب اللہ خاں کے آس پاس کی کٹی پھٹی زمین میں جا بیٹھے اگر گڑھی کی فوج کمک کے لیے حرکت میں آئے تو اس کا مقابلہ کرے اور اسے روکے ؛

۴۔ صورت حال کے متعلق سکھ افسروں سے مشورہ کیا گیا تو وہ سب پیش قدمی کے حامی تھے۔ ۲۶۔ دسمبر کی صبح کو کاہن سنگھ کی فوج کے دو کالم بنا کر انھیں آگے بڑھنے کا حکم دے دیا گیا۔ تین توپیں ان کے ساتھ کر دی گئیں۔ یہ فوج تین گھنٹے کی جد و جہد کے بعد پہلے ٹیلے پر قابض ہو گئی۔ غنیم چوکیاں چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا ؛

۵۔ خیال تھا کہ آگے کوئی دقت پیش نہ آئے گی، لیکن تین میل کا فاصلہ طے کر چکنے کے بعد پھر آٹھ سو گز کی چڑھائی آ گئی۔ غنیم کی طرف سے شدید آتش باری ہو رہی تھی اور سیل آتش سے گزر کر آٹھ سو گز کی چڑھائی طے کرنا بہت دشوار تھا، لہٰذا نصف کالم کو آگے بڑھنے کا حکم دیا گیا اور نصف کالم کو روک لیا گیا، لیکن جن سکھوں کو روکا گیا تھا وہ بھی تھوڑی دیر کے بعد بے صبر ہو کر "واہے گرو"، "واہے گرو" کے نعرے لگاتے ہوئے حملہ آور ہو گئے۔ غنیم کی طرف سے باڑ پر باڑ آ رہی تھی۔ سکھوں کی جانب سے توپیں چلنے لگیں۔ سارا دن کشمکش میں گزر گیا۔ سکھ نہ پیچھے ہٹنے پر آمادہ تھے اور نہ ان کے لیے آگے بڑھنے کی کوئی صورت تھی ؛

۶۔ رات کی تاریکی میں غنیم مورچے خالی کر گیا۔ ۲۷۔ دسمبر کو سکھ فوج آگے بڑھی تو غنیم دور سے آتش باری کرتا رہا، لیکن اس نے قریب آکر مقابلہ نہ کیا۔ اس اثنا میں اطلاع ملی کہ گڑھی حبیب اللہ خاں کا بھی تخلیہ ہو گیا۔ وہاں دربار لاہور کے کارندے موجود تھے۔ انھوں نے لمسڈن یا ایگنیو سے مشورہ کیے بغیر کاغانی سیّدوں سے صلح کر لی۔ صرف یہ اقرار لیا کہ سیّد آئندہ چلن اچھا رکھیں گے اور خراج ادا کرتے رہیں گے۔ لمسڈن نے انھیں "احمقانہ شرائط" قرار دیا ہے ؛

---

[1] لمسڈن نے اس شخص کا نام نہیں لکھا، کچھ نہیں کہا جا سکتا یہ کون تھا ؛

نین سُکھ کا راستہ - فروری ۱۸۴۷ء
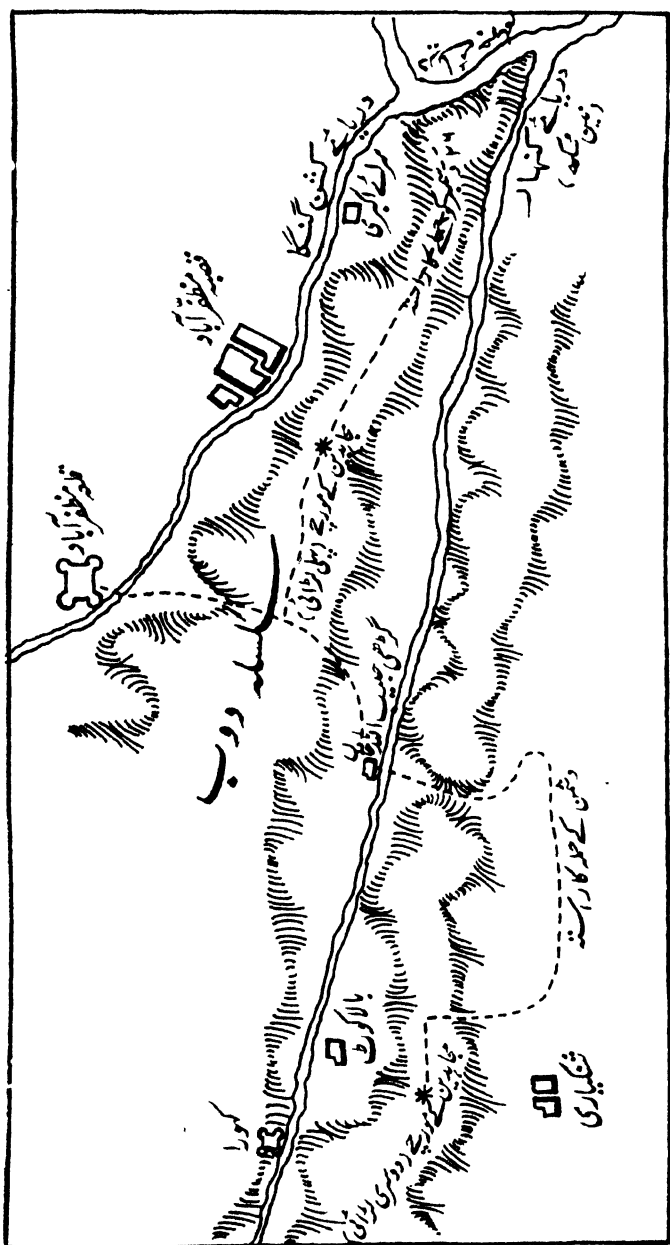
۷- سکھ فوج کئی روز دریائے کنہار کے کنارے ٹھہری رہی - اس اثنا میں مجاہدین اور کوہستانی لوگ شنکیاری کی سمت میں ایک ڈھلوان پہاڑ پر جمع ہو گئے - اس پر چڑھنے اور مقابلہ کرنے کی کوئی صورت نہ تھی - آخر ایک مخبر نے بتایا کہ وہ لوگ کھانا پکانے کے لیے نیچے ایک چشمے پر آتے ہیں - لمسڈن نے چند گوجروں کو رشوت دے کر ساتھ ملایا - اپنے ایک آدمی کو گوجروں کا لباس پہنا کر ان کے ساتھ پہاڑ پر بھیجا اور ان کے ذریعے سے بارود کے چند پیپے پہاڑ پر رکھوا دیے - پھر انھیں یکے بعد دیگرے آگ دے دی گئی - بارود اُڑی تو غنیم نے سمجھا کہ حملہ ہو گیا - چنانچہ اس نے یہ پہاڑ بھی چھوڑ دیا[1]۔

"تذکرہ صادقہ" کی روایات

"تذکرہ صادقہ" یا "سوانح احمدی" میں اس جنگ اور اس سے پیشتر مولانا ولایت علی کی سرگرمیوں کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے[2] میرے نزدیک وہ تمام تر غلط ہے۔ مثلاً:

۱- یہ صحیح نہیں کہ مولانا ولایت علی ڈیڑھ دو برس گلاب سنگھ ڈوگرہ سے برسرِ پیکار رہے۔ مولانا کے سرحد پہنچنے سے تین مہینے کے اندر اندر جنگِ دب پیش آئی، جس میں مجاہدین نے شکست کھائی۔

۲- یہ امر ہرگز قرینِ قیاس نہیں کہ مولانا نے گلاب سنگھ کے سامنے یہ شرط پیش کی ہو کہ اسے سرکار انگریزی کی طرح مسلمان رعایا کو شعارِ اسلامی کے مطابق اذان، ذبیحۂ گاؤ وغیرہ کی آزادی دے دینی چاہیے - یہ وہی غلط فہمی ہے، جو سیّد صاحب کے متعلق مولوی محمد جعفر تھانیسری مرحوم یا میرزا حیرت مرحوم نے پیدا کی۔

۳- مجاہدین کے عمّال کے قتلِ عام کی بھی کوئی مستند شہادت اب تک نہیں مل سکی۔

۴- سیّد ضامن شاہ کاغانی کی بے وفائی کا قصّہ بھی غلط فہمی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، البتّہ یہ ظاہر ہے کہ مجاہدین کی شکست کے بعد ضامن شاہ کاغان چلا گیا ہوگا، تاہم جب تک انگریزی فوج کاغان نہ پہنچی، اس نے اطاعت قبول نہ کی۔

---

[1] یہ تمام حالات لمسڈن آف دی گائڈز (انگریزی) Lumsden of the Guides سے ماخوذ ہیں۔ صفحہ ۲۹-۳۴۔ یہ لفٹننٹ لمسڈن کی سوانح عمری ہے جو اس کے بھائی سر پیٹر لمسڈن اور جارج ایلمی نے مرتب کی۔ ۱۸۹۹ء میں چھپی تھی۔ اب بہت کمیاب ہے۔ لمسڈن نے جنگ کا ایک نقشہ بھی دیا تھا جسے میں نے اپنی کتاب میں شامل کر دیا ہے تاکہ اس کے بیانات کو سمجھنے میں سہولت رہے۔

[2] "تذکرہ صادقہ" صفحہ ۱۲۳، ۱۲۴ - سوانح احمدی طبع اوّل صفحہ ۲۱۵-۲۱۶۔

۵ - یہ بھی غلط ہے کہ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی سید اکبر شاہ کے پاس صوات جانا چاہتے تھے۔ راستے میں انگریزی عمل داری پڑتی تھی۔ فوجی انگریز افسروں نے گذرنے کی اجازت دے دی، بعد میں محاصرہ کر لیا گیا۔ عذر یہ پیش کیا کہ فوجی افسروں کی اجازت حکومت کی منظوری سے نہ ہوئی تھی ؏

واقعہ یہ ہے کہ اُس وقت تک سید اکبر شاہ صوات کے بادشاہ نہ بنے تھے، نیز ۱۸۴۷ء میں ہزارہ اور دوسرے علاقے انگریزی عمل داری میں شامل نہ ہوئے تھے ؏

۶ - یہ بیان بھی قرینِ قیاس نہیں کہ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی تو مجاہدین، لشکر، توپ خانے اور سامانِ جنگ کے ساتھ انگریزی نگرانی میں لاہور پہنچے، مگر اثنائے راہ میں مجاہدین کی کثیر تعداد خفیہ طور پر فرار ہو گئی اور انھوں نے میر اولاد علی کو امیر بنا لیا۔ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ میر اولاد علی پہلے ہی بچ کر نکل گئے تھے ؏

مولانا صاحبان کی مراجعت

جنگ ذب کے بعد مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی لاہور ہوتے ہوئے عظیم آباد چلے گئے۔ "تذکرۂ صادقہ" کا یہ بیان تعجب انگیز ہے کہ جان لارنس چیف کمشنر پنجاب نے لاہور سے دو منزل آگے جا کر ان کا استقبال کیا، دادِ شجاعت دی، ضامن شاہ کی بے وفائی پر نفرت کا اظہار کیا اور کہا کہ اسلحہ مع توپ خانہ حکومت کے ہاتھ فروخت کر کے روہیلوں کی تنخواہ ادا کر دی جائے[1]

حقیقت یہ ہے کہ نہ اُس زمانے میں جان لارنس پنجاب کا چیف کمشنر تھا، نہ یہ علاقہ براہِ راست انگریزوں کے قبضے میں آیا تھا اور نہ وہ اقوال قرینِ یقین ہیں جو اس سے منسوب کیے گئے۔ یہ ممکن ہے کہ ریزیڈنٹ نے مولانا صاحبان کی دعوت کی ہو یا جیسا کہ درست مانا جاتا ہے، مولوی سید رجب علی میر منشی نے ان کے اعزاز میں کھانا دیا ہو ؏

ریزیڈنٹ کے سیاسی روزنامچوں میں ۲۲۔ مارچ کا ایک اندراج یہ ہے :

راولپنڈی کے کاغذات ظاہر ہیں کہ ہزارہ سے ایک مولوی دو سو سپاہیوں کی حراست میں پہنچا۔ یہی شخص ہے جو ہزارہ کی سابقہ بغاوت کا قائد تھا۔ مسٹر ایگنیو نے اسے سلامت ہندوستان جانے کا

---

[1] "تذکرۂ صادقہ" صفحہ ۳۲، سوانح احمدی صفحہ ۲۱۰ ؏

پروانہ دے دیا ہے[1]۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ اطلاع مولانا ولایت علی ہی کے متعلق ہے۔

" تذکرۂ صادقہ " میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عظیم آباد میں دونوں بھائیوں سے دو سال کے لیے دو دو سو روپے کے مچلکے لیے گئے تھے۔ اوکنلے نے مچلکوں کی مقدار دس دس ہزار روپے بتائی ہے، لیکن مدت چار چار سال کی بیان کی گئی ہے۔ میری تحقیقات کے مطابق صحیح یہ ہے کہ مچلکے دس دس ہزار کے تھے، البتہ ان کی میعاد دو سال سے زیادہ نہ تھی، اس لیے کہ ستمبر ۱۸۴۹ء تک مولانا آزاد ہو چکے تھے اور انھوں نے علی الاعلان ہجرت کی۔

بالائی ہزارہ کا تبادلہ گلاب سنگھ ڈوگرہ اگرچہ بالائی ہزارہ پر قابض ہو چکا تھا، تاہم تھوڑے ہی دنوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ قبضہ قائم رکھنا اُس کے بس کا روگ نہیں۔ چنانچہ اس نے مارچ ۱۸۴۷ء میں درخواست کی کہ بالائی ہزارہ اُس سے لے لیا جائے اور معاوضے میں جموّں کے پاس کا علاقہ دے دیا جائے۔ سکھ دربار نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ بدامنی گلاب سنگھ کی غلط پالیسی کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ مذہبی اوقاف اور جاگیریں چھوڑ دے تو لوگ مطمئن ہو جائیں، لیکن ہنری لارنس ریزیڈنٹ کی سفارش پر تبادلہ منظور کر لیا گیا۔ چنانچہ بالائی ہزارہ کے مالیے کی صحیح تشخیص کی گئی اور اس سے نصف مالیے کا علاقہ جموں کے پاس گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا گیا۔

---

[1] سیاسی روزنامچے (انگریزی) از یکم جنوری ۱۸۴۷ء تا ۴- مارچ ۱۸۴۸ء صفحہ ۲۔

ساتواں باب

پابندی کی زندگی اور ہجرت

پابندی کی زندگی اگر مچلکے کا مقصد یہ تھا کہ مولانا ولایت علی یا مولانا عنایت علی عظیم آباد سے باہر نہ جائیں یا مختلف علاقوں میں دورو سیر سے محترز رہیں اور وعظ و نصیحت بھی نہ کریں تو کم از کم مولانا صاحبان نے اس کا یہ مطلب نہ سمجھا۔ اغلب ہے مچلکے کا مقصد محض یہ ہو کہ وہ سرحد نہ جائیں اور سکھوں سے رزم و پیکار کا سلسلہ دوبارہ شروع نہ کریں۔

اگر مچلکے میں مولانا صاحبان کو کاملاً پابند کرایا گیا تھا تو پھر سمجھنا چاہیے کہ کار پردازانِ حکومت نے اس پابندی پر عمل کرانے کا کوئی خیال نہ کیا۔ اوکنلے کی رائے ہے کہ واقعی مچلکے کی شرطیں پوری کرانے کے لیے کوئی تدبیر اختیار نہ کی گئی[1]۔

اس عہد کی زندگی کا جو نقشہ "تذکرہ صادقہ" میں پیش کیا گیا ہے، وہ درج ذیل ہے:

اس دو سال کے عرصے میں (مولانا ولایت علی) بدستور سابق وعظ و نصائح اور مراقبہ و مشاہدہ میں مصروف ہو گئے اور صوبجات میں واسطے ہدایت کے دورو سیر کرنے لگے اور مبلّغین کو مختلف اضلاع و صوبجات میں روانہ فرمایا ہے۔ چنانچہ چند ماہ کے بعد مولانا عنایت علی کو پھر ملک بنگالہ میں روانہ کیا، مگر جناب کو ہندوستان میں واپسی کا نہایت رنج و ملال تھا۔ اکثر دوپہروں اور راتوں کو زیر آسمان کھڑے ہو کر اور کبھی سجدے میں سر رکھ کر نہایت بے قراری و اضطراب کے ساتھ اس ملک سے نکلنے کی دعا کرتے رہتے[2]۔

---

[1] کلکتہ ریویو بابت اکتوبر ۱۸۷۰ء صفحہ ۳۸۱۔ [2] "تذکرہ صادقہ" صفحہ ۱۲۵۔

اوکنلے نے لکھا ہے کہ مولانا صاحبان نے میر اولاد علی سے خط و کتابت شروع کر دی تھی جو ستھانہ میں مقیم تھے اور پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ شمال مغرب میں اپنی چھنی ہوئی طاقت کی بحالی کے لیے کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھیں گے[۱]۔

مولانا عنایت علی کا کام اوکنلے کے مقالے سے مترشح ہوتا ہے کہ مولانا عنایت علی نے پہلے کی طرح بنگال کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ راج شاہی کے مجسٹریٹ نے انھیں اس بنا پر ضلع سے باہر نکل جانے کا حکم دے دیا تھا کہ وہ بغاوت کے شعلے بھڑکاتے ہیں۔ ۱۸۵۰ء کے آغاز میں مجسٹریٹ کو پھر اطلاع ملی کہ مولانا عنایت علی ضلع میں مجاہدین کی بھرتی کر رہے ہیں۔ اس نے تفتیش کا حکم دیا تو مولانا پٹنہ چلے گئے۔ تاہم ضلع میں ان کا اثر و رسوخ بدستور باقی رہا۔ حالات معلوم کرنے کے بعد مجسٹریٹ کو بھی یقین ہو گیا کہ وہ بے ضرر سے آدمی ہیں اور ان کی گرفتاری بالکل غیر ضروری ہے۔ اس حکم کی ایک نقل پٹنہ کے مجسٹریٹ کو بھیج دی گئی۔ اسے مولانا عنایت علی کے حالات کا بہتر علم تھا۔ چنانچہ اس نے مولانا سے ایک ہزار روپے کی ضمانت لے لی کہ پٹنہ سے باہر نہ جائیں، لیکن مولانا موقع پا کر سرحد بھاگ گئے[۲]۔

"تذکرۂ صادقہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ اوائل ستمبر ۱۸۴۹ء تک مولانا عنایت علی بنگال ہی میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ مولانا ولایت علی سرحد روانہ ہوئے تو مولانا عنایت علی کو بھی لکھ بھیجا کہ گھر ٹھہرتے ہوئے سرحد چلے آئیں[۳]۔

مستقل ہجرت مولانا صاحبان کے مچلکوں کی میعاد غالباً جولائی یا اگست ۱۸۴۹ء میں پوری ہوئی۔ "تذکرۂ صادقہ" میں مرقوم ہے کہ اس میعاد کے پورا ہونے میں چند ماہ باقی تھے، مولانا ولایت علی نے:

اپنے دولت خانے کو فرش و فروش، جھاڑ فانوس و دیگر اشیائے زینت سے خوب آراستہ و پیراستہ کیا اور اصطبل میں عمدہ عمدہ گھوڑے خرید کر باندھے اور عمدہ عمدہ رنگین

---

۱ "کلکتہ ریویو" بابت اکتوبر ۱۸۷۰ء صفحہ ۳۴۲

۲ ایضاً ایضاً - اگر اس بیان کو درست بھی مان لیا جائے تو ۱۸۵۰ء کی تاریخ یقیناً غلط ہے۔ ۳ "تذکرۂ صادقہ" ص ۱۲۵۔

کبوتروں سے کبوتر خانہ سجوا دیا تاکہ لوگوں کو یقین ہو جائے، آپ دنیا میں خوب پھنس گئے اور اب ترک آرائش و وطن نہ کر سکیں گے، مگر میعاد پوری ہوتے ہی اپنے چند احباب مخلصین اور مولوی یحییٰ علی کو ساتھ لے کر بہ ارادۂ ہجرت ملک سوات روانہ ہو گئے[1]

یہ روایت مولانا عبدالرحیم کی ہے، جو مولانا ولایت علی کے حقیقی بھتیجے تھے اور اس کے مستند ہونے میں کلام کی گنجایش نہیں۔ "سوانح احمدی" میں بھی یہی مرقوم ہے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ دنیاداری کے اس اہتمام سے لوگوں کو یقین دلانے کی کیا ضرورت تھی کہ اب ترکِ وطن نہ کر سکیں گے؛ حالانکہ ترکِ وطن علی الاعلان کیا۔

بہر حال مولانا نے ۱۳۔ شوال ۱۲۶۵ھ (یکم ستمبر ۱۸۴۹ء) کو گھر بار چھوڑا اور مستقل ہجرت کے راستے میں قدم رکھا۔ مولانا یحییٰ علی (ابن مولانا الٰہی بخش) اور چند احباب مولانا کے ساتھ روانہ ہوئے۔ چلتے وقت اپنے خلف اکبر مولانا عبداللہ اور مولانا فیّاض علی (ابن مولانا الٰہی بخش) سے فرما گئے کہ سفر کا سامان مکمل کر کے اہل و عیال کے ساتھ ایک ہفتے کے اندر موضع گڈھانہ میں آ کر ملو۔ پورے قافلے کے افراد کا تخمینہ دو اڑھائی سو سے کم نہ ہوگا۔ پیچھے مکان پر صرف پانچ مرد رہ گئے اور دو عورتیں[2]

مولانا ولایت علی اُس گھرانے کے فرزند تھے جو بہار کے رؤساء میں شمار ہوتا تھا۔ بہت بڑی جائداد کے مالک تھے اور ان کے تمام اقرباء بھی رؤساہی میں محسوب تھے، لیکن دیکھیے، عشقِ حق اور خدمتِ دین کے جذبۂ صادقہ نے کس طرح اُن سے سب کچھ چھُڑا دیا اور اُس زندگی کی تڑپ دل میں پیدا کر دی، جس میں تکلیفوں، اذیتوں اور پریشانیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ کارنامے صرف اربابِ عزیمت انجام دے سکتے ہیں۔ مولانا ولایت علی اور ان کے اکثر اقربا سیّد صاحب کے فیضِ تربیت سے یقیناً اربابِ عزیمت کا درجہ

---

[1] "تذکرۂ صادقہ" ص ۱۲۵۔ سوات سے مراد پورا سرحدی علاقہ ہے، نہ کہ وہ علاقہ جسے آج کل سوات کہتے ہیں۔

[2] ایضاً ایضاً ص ۱۲۵۔ اوکلے کا یہ بیان صحیح نہیں کہ مولانا ولایت علی نے ۱۸۵۰ء کے اواخر میں ترکِ وطن کیا، نیز اس نے لکھا ہے کہ اہل و عیال کے علاوہ تقریباً اسّی افراد ساتھ تھے (کلکتہ ریویو بابت اکتوبر ۱۸۷۰ء ص ۳۸۲)۔

حاصل کر چکے تھے۔

منازلِ سفر منازلِ سفر کی پوری کیفیت معلوم نہیں۔ "تذکرۂ صادقہ" اور سوانح احمدی میں بتایا گیا ہے کہ پہلے گڈھانہ میں ٹھہرے جو عظیم آباد سے سات کوس جانبِ مغرب واقع ہے۔ آگے گئے تو کوٹلور (دانا پور اور ڈمراؤں کے درمیان) کے رئیس حاجی امام علی نے بڑے اہتمام سے دعوت کی تیاری کی۔ مولانا نے روک دیا اور فرمایا کہ ہم صرف وہ ستو کھائیں گے جو آپ کے مزارعین کھاتے ہیں۔ آرہ میں چودھری ہدایت بشیر رئیسِ اعظم نے پُر تکلف دعوت کرنی چاہی، اُسے بھی روک دیا اور صرف کھچڑی پکوائی۔ اس کے بعد غازی پور میں مولوی محمد فصیح کے ہاں قیام کا ذکر ہے۔ اوکنلے نے لکھا ہے کہ وہ ہر بڑے شہر میں دعوت و تبلیغ کی غرض سے خاصا وقت ٹھہرے رہتے تھے۔ اس کی تصدیق نواب صدیق حسن خاں کے بیان سے بھی ہوتی ہے، جو "ابقاء المنن" کے حوالے سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ اسی موقع پر نواب صاحب نے یہ مصرع مولانا کی زبان مبارک سے سُن کر یاد کر لیا تھا:

ہم طرزِ جنوں اور ہی ایجاد کریں گے[1]

قیامِ دہلی قنوج کے بعد دہلی میں مولانا کے قیام کا ذکر ملتا ہے۔ اوکنلے کا بیان ہے کہ دہلی میں مولانا کے وعظ بڑے شوق سے سُنے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بادشاہ کے سامنے جہاد کا وعظ کہا، جس پر اُس نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔[2]

"تذکرہ صادقہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں مولانا تقریباً دو مہینے ٹھہرے رہے۔ مسجد فتح پوری کے قریب ایک عالی شان مکان میں قیام کیا، جو عام شہرت کے مطابق جنات کے زیرِ اثر خالی پڑا تھا۔ نواب زینت محل بیگم کے اُستاد مولوی امام علی اور مشہور شاعر حکیم مومن خاں بھی آپ کے وعظ میں موجود ہوتے۔ مولوی امام علی نے آپ سے بیعت بھی کی تھی۔ انھیں کی وجہ سے مولانا کا ذکر بیگم اور بادشاہ تک پہنچا اور انھیں دعوت نامہ بھیج کر قلعۂ معلّیٰ میں بُلایا گیا۔ مولانا پچیس آدمیوں کے ساتھ قلعے میں پہنچے۔ بادشاہ نے

---

[1] "ابقاء المنن" ص۱۲۱۔ [2] "کلکتہ ریویو" بابت اکتوبر ۱۸۷۰ء ص ۳۸۲۔

تخت سے اُتر کر لبِ فرش تک آپ کا استقبال کیا۔ مصافحہ و معانقہ کے بعد اپنے ساتھ بٹھایا۔ عطر اور پان سے تواضع کی۔ مولانا نے وعظ شروع کرتے وقت یہ آیت تلاوت کی : اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَھْوٌ وَّ زِیْنَۃٌ وَّ تَفَاخُرٌ . . . . الآیہ۔ وزیر اعظم نے آپ کے کان میں کہا کہ بادشاہ سلامت کے سامنے عذاب کے بیان کرنے کا دستور نہیں، لیکن مولانا بے تکلف :

عذابِ قبر، ہنگامۂ حشر اور دوزخ کا بیان نہایت شدّ و مد سے اور دیگر طریقے پر بیان کرتے رہے، جس سے بادشاہ، شہزادگاں، زینت محل اور جملہ حضّارِ مجلس غایت متاثر ہو کر زار و زار رونے لگے۔ بعد وعظ ظفر شاہ نے فرمایا کہ میں نے بھی در باب ترکِ دنیا کچھ اشعار کہے ہیں۔ آپ نے ان کے سننے کا اشتیاق ظاہر فرمایا . . . . وہاں سے رخصت ہوئے۔ ریزیڈنٹ نے بہ ایمائے ظفر شاہ جملہ مکانات شاہی و موتی مسجد وغیرہ کی سیر کرائی۔ اس کے بعد جب آپ قیام گاہ پر پہنچے تو پچاس خوان کھانوں کے مطبخ شاہی سے مولوی امام علی صاحب اور مولوی مومن خاں صاحب معروف شاعر کی معرفت پہنچے [1]

مولانا استھانہ میں رمضان کا مہینہ قریب آگیا تھا اور بادشاہ کی خواہش تھی کہ مولانا رمضان قلعۂ معلیٰ

---

[1] " تذکرۂ صادقہ"، ص ۱۲۶-۱۲۷۔ مولانا سید عبدالجبار شاہ ستھانوی "کتاب العبرت" میں فرماتے ہیں: ۱۹۱۲ء میں مجھ سے خود مولانا عبدالکریم (فرزند مولانا ولایت علی) نے فرمایا، جو اس وقت والد کے ساتھ تھے کہ بادشاہ نے خود تخت سے اُتر کر استقبال کیا اور مولانا کے علاوہ آپ کے تمام ساتھیوں سے ہاتھ ملایا (کتاب العبرت قلمی ص ۲۶۹) مولانا عبدالکریم ۱۲۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ بادشاہ سے ملاقات کے وقت ان کی عمر آٹھ نو سال کی ہوگی۔ "تذکرۂ صادقہ" میں مرقوم ہے کہ بادشاہ سے ملاقات کے وقت مولانا کے سب سے چھوٹے فرزند مولوی محمد حسن ذبیح ساتھ تھے، جن کی عمر پانچ برس کی تھی۔ انھیں بادشاہ نے گود میں بٹھا لیا اور پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ صاحبزادے نے کہا قرآن شریف۔ پھر بادشاہ کی فرمائش پر سورۂ بقرہ کا ایک رکوع سنایا اور اس کا ترجمہ بھی کیا۔ بادشاہ کو نہایت تعجب ہوا (ص ۱۵۸)

" سوانح احمدی" میں مرقوم ہے کہ بادشاہ نے اشعار سنانے چاہے تو مولانا نے یہ آیت پڑھی: اِذَا قُرِیَٔ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (جب قرآن پڑھا جائے تو اسے سنو اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔)

میں گزاریں تاکہ قلعے کے لوگ ان کے ساتھ نماز تراویح ادا کریں اور وعظ سنیں، لیکن ریذیڈنٹ نے مولانا کے متعلق ایسے انداز میں پرسش شروع کردی، حتی کہ "رکاوٹ" کا اندیشہ لاحق ہوگیا تھا، لہٰذا زیادہ ٹھہرنا قرینِ مصلحت نہ سمجھا گیا اور مولانا معذرت کرکے روانہ ہوگئے۔ جمنا پار پہنچے تو رمضان کا چاند دیکھا[1]۔

بعد کے منازل کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔ روایتوں میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ کھتہ میں کچھ دن مولانا عنایت علی کا انتظار کرتے رہے۔ جو ۸۔ شعبان سنہ ۱۲۶۶ھ (۱۹۔ جون سنہ ۱۸۵۰ء) کو وطن سے روانہ ہوئے تھے، یعنی مولانا ولایت علی سے کم و بیش دس مہینے بعد۔ غالباً ۷۔ محرم سنہ ۱۲۶۷ھ (۱۲۔ نومبر سنہ ۱۸۵۰ء) کو کھتہ یا لدھیانہ میں دونوں بھائیوں کی ملاقات ہوئی۔ بعد کا سفر اکٹھے طے کیا۔ "تذکرۂ صادقہ" میں یہ بھی مرقوم ہے کہ مولانا ولایت علی اپنے فرزند مولانا عبداللہ سے فرما گئے تھے، خود مع اہل و عیال جلد جلد منزلیں طے کرکے پہنچنا اور ہمراہیوں کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں روانہ کرنا۔

اوکنلے کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی ستھانہ پہنچ گئے اور ان کے بعض ساتھیوں کو کھبل[2] میں روکا گیا۔ آدمی نکل گئے، لیکن اونٹ روک لیے گئے، جن پر مال اسباب لدا تھا اور انھیں ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے پاس پیش کردیا گیا۔ اس نے حکم دے دیا کہ انھیں بحفاظت مالکوں کو لوٹا دیا جائے[3]۔ ستھانہ پہنچنے کی تاریخ ۸۔ ربیع الآخر سنہ ۱۲۶۷ھ (۱۰۔ فروری سنہ ۱۸۵۱ء) ہے، آپ کے اہل و عیال آٹھ روز بعد ۱۶۔ ربیع الآخر (۱۸۔ فروری) کو پہنچے۔

---

[1] یہ "تذکرۂ صادقہ" کا بیان ہے (صفحہ ۱۲۷)۔ یہ سنہ ۱۲۶۶ھ کا رمضان ہونا چاہیے، اس لیے کہ مولانا شوال سنہ ۱۲۶۵ھ میں عظیم آباد سے روانہ ہوئے تھے۔ اگر دو مہینے دہلی میں قیام کیا تو وہ رجب کے اوائل میں وہاں پہنچے ہوں گے، یعنی مئی سنہ ۱۸۵۰ء میں۔

[2] کھبل تربیلہ کے سامنے دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ ستھانہ سے اس کا فاصلہ پانچ چھ میل ہوگا۔

[3] "کلکتہ ریویو" بابت اکتوبر سنہ ۱۸۷۱ء صفحہ ۳۸۲۔

آٹھواں باب

مولانا ولایت علی کی وفات

سرحدی زندگی آخری مرتبہ سرحد پہنچنے کے بعد مولانا ولایت علی کو صرف تین مہینے زندگی کی مہلت ملی اور ابھی وہ ابتدائی انتظامات ہی میں مصروف تھے کہ رحمت الٰہی کی آغوش میں پہنچ گئے۔ اس مدت کی سرگرمیوں کے مفصل حالات کہیں سے نہ مل سکے۔ بعض سوانح نگاروں نے دو چار سطروں سے زیادہ کچھ نہ لکھا۔ بعض نے کچھ لکھنا چاہا تو ایسا انداز اختیار کیا جسے مولانا ولایت علی کے حقیقی مقصد و نصب العین سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ جس طرح بعض مخلص سوانح نگاروں نے بلاوجہ سید صاحب کے نصب العین کو غلط رنگ میں پیش کیا تھا، اسی قسم کی حالت سے مولانا ولایت علی کو واسطہ پڑا۔ "تذکرۂ صادقہ" کا بیان ہے:

> آپ (مولانا) لوگوں کی ہدایت میں مصروف رہے اور درس قرآن و احادیث قائم کیا۔ بعد ظہر درس دیتے اور فجر کو مراقبہ و مشاہدہ میں لوگوں کو توجہ دلاتے۔ چونکہ وہ ملک خود سر ہے بغیر سپاہ گری کے وہاں رہنا دشوار ہے، اس لیے ایک وقت فن سپاہ گری کی تعلیم اور قواعد ہوا کرتی تھی[1]

مقصود و نصب العین ظاہر ہے کہ مولانا ولایت علی جہاد فی سبیل اللہ کا مقصد پیش نظر رکھتے ہوئے سرحد گئے تھے اور اس میں حسب استطاعت جہاد بالسیف بھی شامل تھا۔ گویا فن حرب کی تعلیم اور جنگی قواعد بھی درس و وعظ، دعوت و تبلیغ اور اصلاح عقائد و اعمال کی طرح اہم مقاصد میں داخل تھی۔ اسے یہ رنگ دینا سراسر تعجب انگیز ہے کہ مقامی حالات کی مجبوری اور باشندوں کی خودسری کے باعث سپاہ گری پر توجہ لازمی ہو گئی۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا مولانا کے لیے درس و وعظ اور دعوت و تبلیغ

[1] "تذکرۂ صادقہ" ص ۱۲ ۔

کی کافی وسیع فضا وطن میں موجود نہ تھی کہ اطمینان و فارغ البالی کی زندگی چھوڑ کر وہ ایک ایسی سرزمین میں گئے جو ان کے لیے سراسر اجنبی تھی اور جہاں کے لوگوں کی خودسری کے باعث سپہ گری میں وقت صرف کرنے کی مجبوری پیش آ گئی؟ یہ حقیقی اغراض و مقاصد سے اعراض ہی نہیں بلکہ ان کی تحریف ہے۔ اگر گردوپیش کے حالات ایک بنیادی بات صاف صاف کہنے کے لیے سازگار نہ ہوں تو اس کے متعلق سکوت اختیار کر لینا چاہیے لیکن اسے غیر واقعی انداز میں پیش کرنا ہرگز مناسب نہیں۔ یہ ان داعیانِ حق اور مجاہدانِ راہِ حریت کے حقیقی نصب العین کا اخفا ہے جنھوں نے زندگی کی ہر متاعِ عزیز صرف اس لیے قربان کر ڈالی کہ اس نصب العین کا چراغ ہر فضا کی تاریکی میں روشن ہو جائے۔ انھوں نے جس مقصد کے لیے سب کچھ کھو دیا تھا، اس کی آبرو قائم رکھے بغیر ان کی سیرتوں کے خاکے مرتب کرنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟

بھائیوں میں اختلاف اس دور کا ایک نہایت افسوس ناک واقعہ یہ ہے کہ طریق کار کے متعلق مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی میں اختلاف پیدا ہوا اور اس نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی کہ مولانا عنایت علی بھائی سے الگ ہو کر منگل تھانہ چلے گئے۔ یہ اختلاف بھی بعض اصحاب کے نزدیک غلط فہمی کا باعث بنا اور سمجھا گیا کہ مولانا ولایت علی تو حکومت انگلشیہ سے لڑنا نہ چاہتے تھے البتہ مولانا عنایت علی تیز طبعی اور گرم مزاجی کے باعث انگریزوں کے خلاف جنگ پر اصرار کر رہے تھے، حالانکہ مولانا ولایت علی انگریزی حکومت کے دائرے سے ہجرت کر کے سرحد پہنچے تھے۔ اگر ان کے نزدیک حکومت انگلشیہ کے ماتحت رہنے میں شرعاً کوئی قباحت نہ ہوتی تو وہ وطن کی امیرانہ زندگی چھوڑ کر ایسی جگہ کیوں توطن اختیار کرتے جہاں ان کے لیے بظاہر گزران کا بھی کوئی سامان نہ تھا۔ زرخیزی اور سیر حاصلی کے نقطۂ نگاہ سے اُس سرزمین کو مولانا کے وطنِ مالوف سے کوئی بھی مناسبت نہ تھی۔

وجہِ اختلاف وجہِ اختلاف کا تعلق اصل مقصد سے نہ تھا بلکہ صرف طریق کار سے تھا۔ مولانا ولایت علی چاہتے تھے کہ خاصی جمعیت فراہم کر لیں اور مناسب تیاری کے بعد آزادی کے لیے جنگ کا آغاز کریں۔ مولانا عنایت علی کی خواہش یہ تھی کہ بے توقف اصل کام شروع کر دیا جائے۔ وہ نیک نیتی سے سمجھتے

تھے کہ آغاز جنگ کے ساتھ ہی تیاری کے لیے بہتر اسباب مہیا ہوتے جائیں گے اور باحمیت مسلمان خود بخود مجاہدین کی معیت و رفاقت اختیار کرنے لگیں گے +

امب ستھانہ کے شمال میں صرف چند میل پر واقع تھا، جس کے والی نواب جہاں داد خاں کی ریاست دریا کے دونوں جانب پھیلی ہوئی تھی۔ دوسرے رؤساء و خوانین کی طرح نواب جہاں داد خاں بھی انگریزوں سے وابستگی قبول کر چکا تھا اور جیسے حالات اُس وقت درپیش تھے، ان میں وابستگی کے سوا چارہ نہ تھا۔ مولانا عنایت علی اس تعلق کو بے تکلف مسلم دشمنی قرار دے رہے تھے۔ اغلب ہے نواب نے انگریزی دباؤ کے ماتحت مجاہدین کی نقل و حرکت میں بھی روک ٹوک کا انتظام کر دیا ہو۔ مولانا عنایت علی اس پر مزید بگڑ گئے اور اصرار شروع کیا کہ نواب جہاں داد خاں کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔ مولانا ولایت علی کے پیشِ نظر یہ مصلحت تھی کہ نواب جہاں داد خاں کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا گیا تو مجاہدین کی مشکلات بڑھ جائیں گی، اور تنظیم جس طرح ان کی متقاضی ہے، اس کا بھی کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ ممکن ہے اس سلسلے میں یہ امر بھی مولانا ولایت علی کے پیشِ نظر ہو کہ جن سادات ستھانہ نے انھیں اپنے پاس ٹھہرایا ہے، وہ نواب جہاں داد خاں کے قریبی رشتہ دار ہیں اور اس وجہ سے پیچیدگیاں بڑھنے ہی کا اندیشہ ہو سکتا تھا +

نازک صورت حالات حافظ عبدالمجید (ابن مولانا عنایت علی) نے بعض واقعات اختصاراً لکھ لیے تھے، ان کی تحریرات کے متفرق اجزا میں نے اسمست میں دیکھے۔ ان میں ایک اندراج یہ ہے کہ ۱۲- محرم ۱۲۶۸ھ کو ٹیکری میں مولوی نادر علی نے وفات پائی۔ اُس روز سے بھائیوں (مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی) میں اختلاف پیدا ہوا اور یہ برابر بڑھتا گیا۔ مجھے اب تک معلوم نہ ہو سکا کہ مولوی نادر علی کون تھے اور ان کی وفات کس سبب سے اختلاف کا باعث بنی؟

ایک روایت میں دیکھا کہ بھائیوں کے اختلاف نے مجاہدین کو بھی دو ٹکڑیوں میں منقسم کر دیا تھا بنگال کے زیادہ تر مجاہدین مولانا عنایت علی کے ہم نوا تھے اور باقی اصحاب، جن میں صادق پور کے تمام اکابر (مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کے اقربا) بھی شامل تھے، مولانا ولایت علی کے مسلک کو درست سمجھتے تھے۔ اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک موقع پر پڑے کے وقت دونوں گروہوں میں لڑائی

کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ مولانا ولایت علی نے یہ حالت دیکھی تو دونوں کے درمیان کھڑے ہوکر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور پکار کر کہا کہ سب خدا کی بارگاہ میں صلح و امن کے لیے دعا کریں۔ اس طرح خطرہ ٹل گیا اور اسی وقت مولانا عنایت علی مجاہدین کے مرکز سے اٹھ کر منگل تھانہ چلے گئے۔ پھر غالباً زندگی میں دونوں بھائیوں کی ملاقات نہ ہوئی۔ یہ ۲۷۔ شعبان ۱۲۶۸ھ (۱۶۔ جون ۱۸۵۲ء) کا واقعہ ہے۔ اس سے کچھ کم پانچ ماہ بعد مولانا ولایت علی نے وفات پائی ؎

اوکنلے کا بیان اوکنلے نے لکھا ہے کہ مولانا ولایت علی کے دل میں حکومت برطانیہ کے خلاف کینہ و عناد کے وہ جذبات موجزن نہ تھے، جن سے ان کے بھائی کا سینہ لبریز تھا۔ اوّل الذکر کا مذہبی جوش و خروش ایسا نہ تھا جو انسان کو بے قابو کر دیتا ہے اور دنیوی احتیاط کو ضعفِ ایمان کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ مولانائے موصوف وسطی ہند، دکن، بمبئی اور سندھ میں پھر چکے تھے۔ حکومتِ برطانیہ کی طاقت و قوّت کا بہتر اندازہ کر چکے تھے، جو مرہٹوں، مسلمان پنڈاروں، امیرانِ سندھ اور سکھوں کو تباہ کر چکی تھی۔ وہ سید احمد کے ظہورِ ثانی تک امن سے رہنا چاہتے تھے اور بار بار کہتے تھے کہ مجاہدین کی جو چھوٹی سی جماعت جمع ہوگئی ہے، اس سے ہندوستان کو فتح کر لینا غیر ممکن ہے:

> اگر قبل از وقت کوئی قدم اٹھالیا گیا تو حکومت برطانیہ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ ہماری کارروائیوں کی حقیقی حیثیت کا اُسے ایک مرتبہ پورا احساس ہوگیا تو وہ روپے کی آمد روک دے گی اور اپنی رعایا کو جہاد کی حمایت سے منع کر دے گی[۱]

اوکنلے نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۸۵۲ء کے آغاز میں مجاہدین کا قافلہ ستھانہ آتا ہوا امب کے علاقے میں لوٹا گیا۔ اس پر مولانا عنایت علی سخت برافروختہ ہوئے اور انھوں نے اخوند صوات نیز سادات ستھانہ سے امب کے خلاف امداد طلب کی[۲]

مجاہدین کا مرکز عموماً سمجھا جاتا ہے کہ مجاہدین ستھانہ یا منڈی میں مقیم تھے۔ بلاشبہہ انھوں نے جو مرکز

[۱] "کلکتہ ریویو" بابت اکتوبر ۱۸۷۰ء صفحہ ۳۸۳ ؎

[۲] ایضاً ایضاً صفحہ ۳۹۵ ؎

بنایا تھا، وہ ستھانہ اور منڈی ہی کی زمین میں تھا لیکن ان دونوں سے الگ تھا۔ مجھے مولانا نصیر الدین منگلوری اور مولانا سید نصیر الدین دہلوی کے مرکز کا علم نہ ہو سکا، جو ۱۸۴۱ء کی طغیانیِ سندھ میں بہ گیا تھا، بلکہ ستھانہ، منڈی اور مجاہدین کے مرکز کی زمین بھی دس دس بارہ بارہ گز کی گہرائی تک دریا بُرد ہو گئی تھی۔ اس کے بعد جو مرکز قائم ہوا، وہ پہلے مقام کے خلاف کنارۂ دریا سے ہٹا ہوا تھا۔ اس سے تقریباً نصف فرلانگ شمال میں منڈی کی آبادی قائم ہوئی۔ منڈی کے شمال میں تقریباً ایک فرلانگ پر مجاہدین کا مرکز تھا۔

طغیانی کے بعد اس حصے کی زمین پر چھوٹے چھوٹے گول پتھروں کا فرش سا بچھ گیا تھا، جس میں کھیتی باڑی نہ ہو سکتی تھی۔ مجاہدین نے اپنا قلعہ تعمیر کر لیا تو وہ دُور دُور سے مٹی جھولیوں میں بھر بھر کر لاتے اور پتھریلے فرش پر بچھاتے رہتے۔ اس طرح انھوں نے محنت و مشقت سے زمین کا خاصا رقبہ کھیتی باڑی کے لیے موزون بنا لیا تھا۔ مولانا ولایت علی اسی قلعے میں مقیم ہوئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ۱۸۵۸ء تک مجاہدین اسی قلعے میں رہے۔ جب انگریزوں نے ستھانہ، منڈی اور مجاہدین کے مرکز کو توپیں لگا کر برباد کر دیا تو پھر اس مقام پر کوئی آبادی نہ ہو سکی اور آج کل یہ زمین ستھانہ کی حد بست میں شامل ہے۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ مجاہدین کا گزارا عموماً ان رقوں پر تھا، جو ہندوستان سے مسلسل اُن کے پاس پہنچتی رہتی تھیں۔ جب ان میں عارضی انقطاع یا التوا ہو جاتا تھا تو سادات ستھانہ ان کے لیے غلّے کا مناسب انتظام کر دیتے تھے۔ ایک موقع پر سید اکبر شاہ صاحب ستھانوی نے دو جندر (پن چکیاں) مجاہدین کے لیے وقف کر دیے تھے۔

ستھانہ کے عقب میں جو بلند پہاڑ ہے، اس میں سے خاص ستھانہ کی زمین میں دو درے یا نالے آئے ہیں۔ ایک ستھانہ کی آبادی کے شمال میں ہے جسے عموماً منڈی یا ستھانہ والا نالہ کہتے ہیں۔ اس پر پن چکیاں بھی نصب ہیں۔ دوسرا نالہ ستھانہ گاؤں کے جنوب میں ہے جس کا نام برگ کا درہ یا نالہ ہے (برگ بروزن ٹک) مرکز مجاہدین ستھانہ یا منڈی والے نالے کے قریب تھا۔ مجاہدین کا قبرستان اس نالے کی جنوبی سمت میں ہے۔ اسی قبرستان میں مولانا ولایت علی کا مدفن ہے، لیکن اس کا متعین نشان اب کسی کو معلوم نہیں۔

مولانا کی وفات | مولانا ولایت علی ابھی کوئی مجاہدانہ قدم اٹھانے نہ پائے تھے کہ ۲۲۔ محرم ۱۲۶۹ھ

(۵ - نومبر ۱۸۵۲ء کو بہ عارضۂ خناق انتقال کیا اور اپنے مرکز کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ "تذکرۂ صادقہ" کے بیان کے مطابق چھیاسٹھ سال کی عمر پائی۔ وفات کی دو تاریخیں میرے علم میں آئیں، ایک فارسی کی اور دوسری عربی کی، جو ذیل میں درج ہیں:

ولایت علی رہبر دین حق | بہ ماہِ محرّم چو شد زیرِ خاک
بگو از سرِ آہ سالِ وفات | شدہ جائے سیرش بہ فردوسِ پاک

آخری مصرع کے حساب میں جائے کی "ے" شامل نہیں کی گئی۔ اس طرح ۱۲۶۸ بنے۔ سرِ آہ یعنی الف کا ایک شامل کیا تو ۱۲۶۹ ہوئے۔ عربی تاریخ یہ ہے:

ولایت علی العالم المتورع | توفی بالهجرة للدّین ناصر
وهذا الذی قد طاب حیاة و میتا | فارح قلبی طاب غازمهاجر[۱]

۶۹ ھ ۱۲

حلیہ | "تذکرۂ صادقہ" میں حلیہ یوں مرقوم ہے:

میانہ قامت مائل بہ طول، رنگ سانولا، جسم بلغمی اور پرگوشت، ابرو پیوستہ، ڈاڑھی اوسط درجے کی۔[۲]

مولانا سید عبدالجبار شاہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ جب سوات کی سلطنت چھن گئی اور میں ستھانہ واپس آیا تو ایک صاحب ملنے کے لیے آئے، جنھیں کشفِ قبور میں مہارت حاصل تھی۔ میں انھیں مجاہدین کے قبرستان میں لے گیا اور مولانا ولایت علی کی قبر کے پاس بٹھا کر کہا کہ فرمائیے، یہ کون صاحب ہیں اور ان کا حلیہ کیا ہے۔ وہ تقریباً آدھا گھنٹہ مراقب رہے۔ پھر اٹھے تو مجھ سے کہا کہ آؤ چلیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ صاحب قبر نے ان کے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ راستے میں مجھے بتایا کہ یہ بزرگ سرحد کے نہیں، ہندوستان کے ہیں اور

۱؎ ڈاکٹر بیلیو کا یہ بیان غلط ہے کہ مولانا کا انتقال بہ عارضہ بخار ۱۸۵۵ء میں ہوا (یوسف زئیوں کی رپورٹ انگریزی ص ۹۶)۔

۲؎ "تذکرۂ صادقہ" ص ۱۲۸۔

۳؎ ایضاً ص ۱۴۰۔

ان کا درجہ بہت اونچا ہے۔ میں نے حلیہ پوچھا تو کہا کہ رنگ سانولا ہے اور ڈاڑھی کے بال رخساروں پر کم ہیں، ٹھوڑی پر زیادہ۔ غرض جو حلیہ بتایا، وہ مولانا کے فرزندانِ ارجمند مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالکریم سے خاصا مشابہ تھا، لہٰذا یقین ہو گیا کہ صاحبِ کشف کا بیان درست ہے ؛

اہل و عیال | مولانا کی پہلی شادی سید مقصود علی (ساکن لبنہ ٹیکھولی ضلع آرہ) کی صاحبزادی مسمات امیرن سے ہوئی تھی۔ یہ خاتون لاولد فوت ہوئیں۔ دوسرا نکاح حیدرآباد دکن کے ایک رئیس مرزا واحد بیگ کی صاحبزادی مرادالنسا بیگم سے کیا۔ اس سے مولانا کے پانچ فرزند ہوئے۔ تیسرا نکاح مولوی الٰہی بخش کی بیوہ صاحبزادی جمیلۃ النسا سے کیا۔ ان سے بھی چار بچے ہوئے۔ اولاد کی تفصیل ذیل میں درج ہے :

۱۔ مولانا عبداللہ، جو چالیس سال تک مجاہدین کے امیر رہے۔ ان کے حالات آیندہ بیان ہوں گے ؛

۲۔ رحمت اللہ، حالتِ طفلی میں وفات پائی ؛

۳۔ ہدایت اللہ، پینتالیس برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ایک فرزند یادگار چھوڑا : ڈاکٹر آیت اللہ جنھیں مولوی محمد حسن ذبیح نے ولایت میں تعلیم دلوائی ؛

۴۔ عبدالرحمٰن، یہ لاولد فوت ہوئے ؛

۵۔ مولوی عبدالکریم، اپنے بڑے بھائی مولانا عبداللہ کے بعد یہ مجاہدین کے امیر بنے۔ ان کے حالات بھی آیندہ بیان ہوں گے ؛

۶۔ مولوی محمد حسن ذبیح، ان کے حالات بھی موقع پر لکھے جائیں گے ؛

۷۔ شاکرہ، ان کی شادی مولوی عبدالحکیم بن مولانا احمد اللہ سے ہوئی ؛

۸۔ زینب، بچپن میں وفات پائی ؛

۹۔ محمد حسین " " ؛

تصانیف | مولانا ولایت علی کی زندگی کے بیشتر اوقات وعظ و تبلیغ اور تنظیماتِ جہاد میں گزرے۔

ظاہر ہے کہ ان مشاغل کے ہجوم میں تصانیف کے لیے وقت نہ مل سکتا تھا، تاہم انھوں نے مختلف اوقات میں اُردو، فارسی اور عربی کے چند رسالے بھی لکھے، جنھیں اُن کے بھتیجے مولانا عبدالرحیم نے مجموعۂ رسائلِ تسعہ میں شائع کر دیا تھا۔ مثلاً رسالۂ ردِّ شرک (فارسی)، رسالہ عمل بالحدیث (فارسی)، رسالہ اربعین فی المہدیین (عربی)، رسالۂ دعوت (اردو)، رسالہ تیسیر الصلوٰۃ (اردو)، رسالہ شجرۂ باثمرہ (اردو)، رسالہ تبیان الشرک (اردو)۔

ان کا عقیدہ یہ تھا کہ سیّد صاحب نے شہادت نہیں پائی بلکہ غائب ہو گئے اور ضرورت کے موقع پر دوبارہ ظاہر ہوں گے۔ رسالۂ دعوت میں یہ عقیدہ تفصیل سے بیان کیا ہے، لیکن جیسا کہ میں "سیّد احمد شہید" میں کہہ چکا ہوں، یہ عقیدہ صحیح نہ تھا اور ہمیں اکابر کے محاسن ہی پر متوجّہ رہنا چاہیے، لغزشوں میں ان کی پیروی نہ کرنی چاہیے۔ مولانا ہی کی وجہ سے سیّد صاحب کی غیبوبت کا عقیدہ علمائے صادق پور میں شائع ہوا، لیکن اس بنا پر مولانا یا ان کے اقربا و رفقاء کی عظمت و برتری میں کوئی فرق نہیں آتا، اس لیے کہ یہ عظمت و برتری عقیدۂ غیبوبت پر نہیں بلکہ ان کے مجاہدانہ اسلامی کارناموں پر مبنی ہے۔

نواں باب

مولانا عنایت علی کا عہدِ امارت

ابتدائی حالات اور امارت مولانا عنایت علی کے ابتدائی حالات اختصاراً پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ سیّد صاحب نے انھیں سرحد سے بہ غرض دعوت و تبلیغ بنگال بھیج دیا تھا۔ واقعۂ بالاکوٹ کے بعد بھی وہ دعوت و تبلیغ ہی میں مصروف رہے۔ جب مولانا سیّد نصیرالدّین دہلوی کے انتقال کی وجہ سے مجاہدین کی تنظیم کا سلسلہ بگڑ گیا اور سیّد ضامن شاہ کاغانی نیز بالائی ہزارہ کے خوانین کو اجراءِ جہاد کے لیے حالات سازگار نظر آئے تو مولانا ولایت علی نے انھیں (مولانا عنایت علی کو) سرحد بھیج دیا۔ وہاں جو کارنامے انجام دیے، وہ بھی تفصیلاً پہلے بیان ہو چکے ہیں ؂

ان کی شان عزیمت کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ اپنے بڑے بھائی کی معیّت میں ہندوستان سے مستقل ہجرت کا ارادہ کیا تو آپ کی والدۂ ماجدہ نے موضع دوآب پورا رہٹ ضلع گیا کا وثیقہ آپ کے حوالے کر دیا تھا۔ آپ نے یہ موضع بیس بائیس ہزار روپے میں میر محبوب علی ساکن کیوانی کے ہاتھ بیچ دیا اور دوسرے مواضعات سے دست برداری کی ایک تحریر لکھ دی[۱]۔ اندازہ فرمائیے کہ خوش حالی اور فارغ البالی کے کتنے مہتم بالشان سامان انھیں میسّر تھے، لیکن ان میں سے کوئی چیز انھیں راہِ حق میں مجاہدانہ اقدام سے نہ روک سکی ؂

یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ طریقِ کار کے متعلق مولانا ولایت علی سے اختلاف کی بنا پر یہ منگل تھانہ چلے گئے تھے۔ مولانا کے انتقال پر مجاہدین کے مرکز میں آئے اور سب نے بالاتفاق انھیں امیر تسلیم کر لیا۔ تقریباً دو ہفتے بعد ۴۔ صفر ۱۲۶۹ھ (۱۷۔ نومبر ۱۸۵۲ء) کو باورچی خانہ میں آگ لگی جس میں سب کچھ جل گیا۔ اسی زمانے

---

[۱] "تذکرۂ صادقہ" صفحہ ۱۳۷ ؂

میں ایک واقعہ پیش آیا، جس کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف لڑائیاں شروع ہوگئیں اور مولانا کی زندگی کے بقیہ اوقات کا ایک ایک لمحہ لڑنے بھڑنے یا لڑائی بھڑائی کا اہتمام کرنے ہی میں تمام ہوا ۔

انگریز پنجاب و سرحد میں اپریل ۱۸۴۸ء میں دیوان مول راج ناظم ملتان نے دو انگریزوں کے قتل سے ہنگامہ بپا کیا۔ جگہ جگہ سکھ فوجیں بغاوت پر آمادہ ہوگئیں اور سکھوں سے انگریزوں کی دوسری جنگ کا آغاز ہوا، جس کی تفصیلات ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ سکھوں نے اس جنگ میں بھی پے در پے شکستیں کھائیں اور پنجاب کو انگریزوں نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا ۔

اُس زمانے میں ایبٹ ہزارہ کا ڈپٹی کمشنر مقرر ہوا۔ کاغان کے سیّد انگریزی تسلّط کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کے گوجر مزارعین نے ایبٹ کے پاس شکایتیں کیں اور وہ ان شکایتوں کو درست مان کر سیّدوں کا مخالف ہوگیا۔ اُسی کی تجویز سے کاغان پر انگریزی فوج کا حملہ ہوا اور تین فوجیں تینوں سمتوں سے بڑھیں: ایک بالاکوٹ کی سمت سے، دوسری کشمیر کی سمت سے، تیسری بھوگڑمنگ کی سمت سے۔ سیّد اس فوج کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اُن سب کو گرفتار کر کے بفہ میں نظربند کر دیا گیا۔ اس طرح کاغان انگریزوں کے زیر اثر آیا ۔

دو انگریزوں کا قتل سکھوں کے عہد میں ملکی انتظام ایسا نہ تھا کہ کارکنوں کو جزئیات پر توجّہ ہوتی۔ انگریزوں نے ہر چھوٹے بڑے امر کو قاعدے اور ضابطے کے ماتحت لانے کی کوشش کی۔ ابتدا میں انگریزوں نے انتظامات کی نگرانی کے لیے ایک بورڈ بنا دیا تھا، جس کے ماتحت مختلف محکمے کام کر رہے تھے۔ ایک محکمہ نمک کا بھی تھا، جس کا ایک وظیفہ یہ تھا کہ اٹک پار کے نمک کو حدودِ پنجاب میں داخل نہ ہونے دے۔ کچھ مدت بعد شکایتیں سُنی گئیں کہ باہر کا نمک والیِ امب کے اٹک پار علاقوں میں سے ہو کر پنجاب پہنچتا ہے، چنانچہ راستوں کی دیکھ بھال اور درآمد کے انسداد کی غرض سے محکمۂ نمک کے دو افسر مسٹر کارن[۱] اور مسٹر ٹیپ[۲] والیِ امب کے علاقے میں داخل ہوئے، جس کی حد آزاد حسن زئی قبیلے کے علاقے سے ملتی تھی۔ ان افسروں کا یہ اقدام انتظامی بورڈ کی رائے کے خلاف تھا اور مسٹر ایبٹ ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے

---

۱ Carne ۲ Tapp

بھی انھیں یہی مشورہ دیا تھا کہ چھان بین کے لیے زیادہ آگے نہ جائیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ والیِ امب کے حدود ہی میں رہے یا حسن زئیوں کے علاقے میں چلے گئے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ حسن زئیوں نے موقع پا کر انھیں قتل کر دیا۔

ڈپٹی کمشنر ہزارہ کا ابتدائی تاثر یہ تھا کہ اس قتل میں والیِ امب اور اس کا وزیر بھی شامل ہیں، لیکن جب والیِ امب سے مطالبہ کیا گیا کہ جو حسن زئی اس کے علاقے میں رہتے ہیں، انھیں حکومت انگلشیہ کے حوالے کر دیا جائے تاکہ حکومتِ مذکورہ حسن زئی قبیلے پر تلافی کے لیے زور ڈال سکے تو والیِ امب نے یہ مطالبہ پورا کر دیا۔ گویا اپنے خلوص اور پاک دامنی کا روشن ثبوت مہیا کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسن زئیوں نے امب کے سرحدی دیہات تباہ کر ڈالے اور دو قلعوں (چمبیری اور شنگلئی) پر قبضہ کر لیا[1]۔ اس سے کوہ سیاہ کی پہلی مہم کا آغاز ہوا۔

کوہ سیاہ کی پہلی مہم سرحد آزاد میں کوہِ سیاہ (مقامی نام "کالا ڈھاکا") کو خاص اہمیت حاصل ہے، جس کے خلاف انگریزوں کو اپنے عہدِ حکومت میں کئی مرتبہ مہمیں بھیجنی پڑیں۔ اس کے جنوب میں تنولیوں کا علاقہ ہے۔ مشرق میں اگرور، پریاری، ٹیکری، نندھیاڑ اور دیشی، شمال میں دریائے سندھ اور تاکوٹ، مغرب میں دریائے سندھ۔ اس پہاڑ کی ڈھلانوں پر یوسف زئی پٹھان آباد ہیں، جن میں سے تین قبیلے قابلِ ذکر ہیں: حسن زئی، اکازئی اور جعفر زئی۔ حسن زئی عیسیٰ زئیوں کی ایک شاخ ہیں۔ خود اُن کا قبیلہ دس چھوٹی شاخوں میں بٹا ہوا ہے۔

انگریزی حکومت کے سامنے اب یہ سوال آیا کہ آیا والیِ امب کو امداد دینی چاہیے یا خاموش بیٹھے رہنا چاہیے۔ امداد دی جاتی تو آزاد پہاڑی علاقے میں فوج بھیجے بغیر چارہ نہ تھا اور کچھ معلوم نہ تھا کہ کون کون سے قبیلے حسن زئیوں کی امداد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ "ہزارہ گزٹیئر" کے بیان کے مطابق لارڈ ڈلہوزی ان

---

[1] واقعے کی تفصیلات میں جزوی اختلافات ہیں۔ اس کا ذکر مندرجۂ ذیل کتابوں میں آیا ہے۔ "کوہ سیاہ سے وزیرستان تک" از وائلی (انگریزی) ص ۳۲ تا ۳۶۔ "سرحد شمالی و غربی کی مہمیں" از نیویل (انگریزی) ص ۲۲-۲۵۔ "ہزارہ گزٹیئر" (انگریزی) مطبوعہ ۱۹۰۸ء، ص ۱۶۶-۱۶۷۔

قبائل کے خلاف فوج کشی میں متامل تھا، جنھیں مستقل طور پر قبضے میں رکھنا مشکل نظر آتا تھا، لیکن اگر والیِ امب کی امداد میں کوئی مؤثر قدم نہ اٹھایا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ تمام سرحدی رؤسا و خوانین انگریزی مصلحتوں کی نگہداشت کے بجائے آزاد قبیلوں سے اپنے تعلقات خوش گوار رکھتے اور پورے سرحدی علاقے میں بدامنی کے جراثیم پرورش پانے لگتے۔ غور و فکر کے بعد دسمبر ۱۸۵۲ء میں تادیبی مہم بھیجنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ کرنل میکیسن[1] کمشنر پشاور اس مہم کا سالار مقرر ہؤا۔

جنگ اس مہم میں لیویز اور پولیس کے دستوں کے علاوہ سکھوں اور ڈوگروں کی رجمنٹیں بھی شامل تھیں اور ان کے ساتھ پہاڑی توپیں بھی تھیں۔ والیِ امب کا مشہور مقام شیر گڑھ فوج کا مرکز قرار پایا، جہاں سے اسے تین حصوں میں تقسیم کرکے مختلف اطراف سے حسن زئیوں پر یورش کی گئی۔ ان کے متعدد گاؤں جلا دیے گئے۔ جنوری ۱۸۵۳ء میں فوج واپس آگئی۔ فریقین کا جانی نقصان زیادہ نہ ہؤا، لیکن حسن زئیوں کے دیہات کو بہت نقصان پہنچا اور ان کے غلے کے ذخائر تباہ ہوگئے۔ اگرچہ وہ حوالگی پر آمادہ نہ ہوئے، تاہم سمجھ لیا گیا کہ انھیں خاصی سزا مل چکی ہے، لہٰذا جو بیرغمال انگریزی حکومت کے قبضے میں تھے، انھیں رہا کر دیا گیا۔[2]

مجاہدین کے اقدامات مولانا عنایت علی پہلے ہی سے والیِ امب کے خلاف اقدامات کا فیصلہ کیے بیٹھے تھے۔ حسن زئیوں کے ہنگامے سے اس فیصلے کو جامۂ عمل پہنانے کا اچھا موقع پیدا ہوگیا۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ حسن زئیوں کی امداد سے آزاد قبائل میں مجاہدین کے لیے دلی ہمدردی کی فضا پیدا ہو جانے کی امید تھی اور ان سے آئندہ مجاہدانہ اقدامات میں امداد لینے کے امکانات قوی ہوتے تھے۔ چنانچہ مولانا نے مجاہدین کو اقدام کا حکم دے دیا اور ایک جیش نے مرکز سے پیش قدمی کرتے ہوئے عشرہ و کوٹلہ پر قبضہ کرلیا جو ستھانہ اور امب کے درمیان والیِ امب کے نہایت مشہور و مستحکم قلعے تھے۔ گویا امب کے خلاف ایک نئی سمت سے

---

[1] Mackeson یہ میکیسن پشاور کے کمشنر کی حیثیت میں ۱۰ ستمبر ۱۸۵۳ء کو برآمدے میں کام کر رہا تھا جب کنڑ کے ایک پٹھان عبداللہ نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا۔ چار روز بعد میکیسن نے وفات پائی۔ [2] یہ بیان "ہزارہ گزیٹیر" سے ماخوذ ہے۔ صفحہ ۱۶۷۔ مزید تفصیلات مطلوب ہوں تو ملاحظہ فرمائیے وائلی کی کتاب صفحہ ۳۲ تا ۳۶ اور نیویل کی کتاب صفحہ ۲۲ تا ۲۴۔

یورش شروع ہو گئی ٭

انگریزی فوج کوہِ سیاہ کی مہم سے فارغ ہوئی تو والیٔ امب کو مجاہدین کی ترکتازوں سے بھی بچانا ضروری ہو گیا۔ حسن زئیوں کے خلاف اقدام کی جو وجہ تھی، وہی وجہ مجاہدین کے خلاف بھی اقدام کا موجب بنی۔ چنانچہ ۵۔ جنوری ۱۸۵۳ء کو والیِ امب کی ایک فوج نے شمالی سمت سے پہاڑ پر چڑھ کر عشرہ و کوٹلہ کے شمال اور مغرب میں مورچے قائم کر لیے۔ ۶۔ جنوری کو ایک انگریزی فوج مسٹر ایبٹ کی سرکردگی میں کرپلیاں سے کشتیوں پر سوار ہوئی اور دریا پار پہنچ کر اُس درے کی طرف بڑھی، جو عشرہ و کوٹلہ اور مرکز مجاہدین کے درمیان آمدورفت کا راستہ تھا۔ ایک انگریزی جیش دریا کے بائیں کنارے پر ستھانہ کے عین سامنے مورچے لگا کر بیٹھ گیا تاکہ وہاں سے مجاہدین کے لیے کمک بھیجی جا سکے۔ جب انگریزی فوج نے توپوں کے ساتھ پہاڑ پر چڑھائی شروع کی تو مجاہدین جن کی تعداد دوسو اور تین سو کے درمیان تھی، قلعہ چھوڑ گئے۔ والیِ امب کے لشکر نے تعاقب کیا اور تیس سے زیادہ مجاہدین نے شہادت پائی[1]۔ "ہزارہ گزٹیئر" کا بیان ہے کہ مجاہدین نے نہ محض عشرہ و کوٹلہ کو خالی کیا بلکہ اپنے مرکز (واقع ستھانہ) سے بھی نکل گئے[2] ٭

اوکنلے نے لکھا ہے کہ جہاں دادخاں والیٔ امب نے مجاہدین سے مرعوب ہو کر بہ ظاہر اطاعت قبول کر لی تھی اور مولانا عنایت علی سے کہا تھا کہ عشرہ اور امب اپنی طرف سے مجھے عطا فرما دیں۔ اس اثناء میں اس نے انگریزوں سے بھی ساز باز کا سلسلہ جاری رکھا۔ انگریزی فوج نے عبور دریا کے بعد عشرہ اور ستھانہ کے درمیانی درے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ جہاں دادخاں نے شمالی سمت میں مجاہدین کے بچ نکلنے کا راستہ روک دیا۔ یہ حالت دیکھ کر مولانا عنایت علی مجاہدین کے بڑے حصے کو ساتھ لے کر ستھانہ پہنچ گئے، لیکن ان کا چنداول یعنی عقبی جیش مولانا کرم علی داناپوری کی سالاری میں پورے کا پورا خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوا[3] ٭

حافظ عبدالمجید کا بیان اب تک جو کچھ لکھا گیا، وہ انگریزی بیانات پر مبنی تھا۔ خود جماعت مجاہدین

---

[1] نیویل کی کتاب ص ۲۶۔ وائلی کی کتاب میں تفصیل درج نہیں، لیکن اصل واقعے کا ذکر ص ۲۷ پر موجود ہے ٭

[2] "ہزارہ گزٹیئر" ص ۱۶۷ ٭ [3] "کلکتہ ریویو" بابت ۱۸۷۰ء ص ۳۹۶، ۳۹۵ ٭

کی طرف سے ان حالات کے متعلق کوئی تفصیل نہ مل سکی۔ مولانا عنایت علی کے صاحبزادے حافظ عبدالمجید کی جن یادداشتوں کا ذکر پہلے آ چکا ہے، ان سے جو کچھ معلوم ہوا، اُس کی کیفیت ذیل میں درج ہے :

۱۔ مجاہدین نے ۲۰۔صفر ۱۲۶۹ھ (۳۔ دسمبر ۱۸۵۲ء) کو یعنی مولانا ولایت علی کی وفات سے ایک ماہ تین دن بعد علاقۂ امب پر ایک شبخون مارا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسی شبخون کے سلسلے میں عشرہ و کوٹلہ پر قبضہ کیا گیا۔

۲۔ ۲۴۔ دسمبر کو دوبارہ ایک شبخون مارا گیا۔ مجاہدین کی جماعت پچیس جانبازوں پر مشتمل تھی اور طرّہ باز خاں ان کا سالار تھا۔

۳۔ عشرہ اور کوٹلہ میں بخار نے وبائی شکل اختیار کر لی تھی۔ اکثر مجاہدین بیمار ہو گئے اور لڑائی کے قابل نہ رہے۔ صرف پچاس نے جنگ کی اور شہادت پائی۔ ان میں مولانا اکرم علیؒ[1] داناپوری اور شبیر خاں تنولی بھی شامل تھے۔

۴۔ مولانا عنایت علی اس واقعے کے بعد ناواگئی (علاقہ چملہ) چلے گئے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ صوات پہنچ کر سید اکبر شاہ ستھانوی اور ملّا عبدالغفور اخوند صوات سے آئندہ اقدامات کے متعلق مشورے کریں۔ سید اکبر شاہ کو صوات کے باشندوں نے ۱۸۴۷ء میں اپنا بادشاہ بنا لیا تھا۔ پنجاب ریکارڈز آفس کی بعض تحریرات سے مترشح ہوتا ہے کہ جنوری ۱۸۵۴ء میں حکومت انگلشیہ کو شاہ صوات کی طرف سے حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اغلب ہے حملہ ہو جاتا لیکن اخوند صاحب صوات عموماً ایسے اقدامات کی مخالفت کرتے رہے۔

مولانا کی سرگرمیاں حافظ عبدالمجید ہی کی یادداشتوں سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا عنایت علی نے

---

[1] مولانا اکرم علی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ مجاہدین میں شامل ہونے سے قبل وہ درزی کا کام کرتے تھے۔ دیکھیے تحریکِ جہاد نے انھیں معمولی حیثیت سے اٹھا کر کس اونچی منزل پر پہنچا دیا کہ اس جماعتِ مجاہدین کی سالاری کا منصب عطا ہوا، جس نے ایک نازک موقع پر ناموسِ حق کی حفاظت میں بے تکلف جانیں قربان کیں۔

خاصی لمبی مدّت چملہ، بنیر اور سوات میں گزاری اور وہ ۱۶۔ رجب ۱۲۷۰ھ (۱۴۔ اپریل ۱۸۵۴ء) کو اس سفر سے واپس آئے۔ میرا خیال ہے کہ اخوند صاحب سوات نے مولانا کی امداد و اعانت میں کسی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا۔ سیّد اکبر شاہ اگرچہ بادشاہی کے منصب پر فائز تھے، لیکن سوات کی صورتِ حالات ایسی تھی، جس کے پیشِ نظر وہ اخوند صاحب کی رضامندی اور اتفاق کے بغیر کوئی اقدام نہ کر سکتے تھے۔

ستھانہ کے مرکز میں بیٹھ کر مولانا کے لیے وسیع پیمانے پر مجاہدانہ سرگرمیاں جاری رکھنے کا کوئی امکان نہ رہا تھا، اس لیے وہ کسی ایسے مرکز کی تلاش میں تھے، جہاں سے مجاہدین کی جمعیّت بڑھانے اور اُن سے زیادہ وسیع حلقے میں مؤثر کام لینے کا انتظام ہو سکے۔ غالباً اسی خیال سے مولانا نے سیّد عبّاس رئیس منگل تھانہ کے ساتھ ازسرِ نو عہد و پیمان کر لیے اور اسی کے مقام کو مستقل مرکز بنا لینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ستھانہ کے مرکز میں مولانا یحییٰ علی (ابن مولوی الٰہی بخش عظیم آبادی) کو مختار بنایا اور خود اہل و عیال کے ساتھ منگل تھانہ میں منتقل ہو گئے، جو خدّو خیل کے علاقے کا ایک مشہور و مستحکم مقام تھا۔ کچھ دیر بعد مولانا ولایت علی کے اہل و عیال کو بھی منگل تھانہ ہی میں بُلا لیا[1]۔

دعوت و تنظیم منگل تھانہ پہنچنے کے بعد مولانا نے گرد و پیش جہاد کی دعوت اور مجاہدین کی تنظیم شروع کر دی۔ فتح خاں رئیس پنجتار فوت ہو چکا تھا اور اس کے بیٹے مقرب خاں نے خاندانی سرداری کا منصب سنبھال لیا تھا۔ وہ خود رائے آدمی تھا، اس وجہ سے قبیلے کے مختلف گروہ اس سے الگ ہو گئے۔

---

[1] "تذکرۂ صادقہ" میں مرقوم ہے کہ سیّد عمر شاہ، سیّد عمران شاہ، سیّد شاہ مدار اور سیّد مبارک شاہ نے مجاہدین سے بے وفائی کی۔ ص ۱۳۷۔ یہ بیان سراسر غلط ہے۔ سادات ستھانہ نے ابتدا سے آخر تک مجاہدین کی اعانت برابر جاری رکھی اور اس سلسلے میں اپنا سب کچھ تباہ کر لیا۔ ہو سکتا ہے انھیں مولانا عنایت علی کی سرگرمیوں سے کاملاً اتّفاق نہ ہو، جیسا کہ خود مولانا ولایت علی کو بھی اتفاق نہ تھا۔ بایں ہمہ سادات نے نہ مجاہدین کی اعانت و رفاقت میں کبھی تامّل کیا اور نہ انھیں مرکز ستھانہ سے اٹھایا بلکہ مجاہدین ہی کی وجہ سے انگریزوں نے ۱۸۵۸ء میں ستھانہ کو برباد کر ڈالا تو سادات مہابن پہاڑ میں بمقام ملکا جا بیٹھے اور مجاہدین کو بھی ساتھ لے گئے۔ جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو گا۔ ان پر بے وفائی کا الزام سخت رنج افزا ہے۔

مقرّب خاں نے بالجبر انھیں اطاعت پر مجبور کرنا چاہا تو اختلاف نے شدید عداوت کی صورت اختیار کر لی۔ مولانا نے انتہائی کوشش کی کہ مقرّب خاں اور اس کے قبیلے کے درمیان صلح ہو جائے۔ خدّوخیل کے دہانے پر موضع تو تالی واقع تھا، جہاں کے لوگ مقرّب خاں کے ہم قبیلہ تھے۔ انھیں کی ہمّت و مردانگی پر خدّوخیل کی حفاظت موقوف تھی۔ مقرّب خاں نے انھیں سب سے بڑھ کر دشمن بنا لیا تھا۔

مولانا نے ۲۰۔ شوّال ۱۲۷۱ھ (۶۔ جولائی ۱۸۵۵ء) کو بمقام کن گلئی خود مقرّب خاں سے ملاقات کی۔ افسوس کہ یہ مخلصانہ مساعیِ مصالحت بار آور نہ ہو سکیں۔ تعجّب خیز امر یہ ہے، تو تالی کے باشندے اس شرط پر صلح کے لیے تیار ہوتے تھے کہ مقرّب خاں، مولانا اور مجاہدین سے کوئی سروکار نہ رکھے۔ بر ایں ہمہ مولانا نے مصالحت میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا۔

ایک مصیبت یہ پیش آئی کہ خود منگل تھانہ میں سادات کے دو گھرانوں کے مابین کشمکش جاری تھی۔ ایک گھرانے کا رئیس سیّد عبّاس تھا اور دوسرے کا سیّد یوسف عُرف میاں گُل۔ ان کے درمیان بھی وقتاً فوقتاً لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ مولانا نے ان کا اختلاف مٹانے کی بھی پوری کوشش کی۔ یہی زمانہ ہے، جس میں خود مولانا کے اقربا ان سے ناراض ہو گئے اور وہ منگل تھانہ سے ہندوستان چلے آئے۔ مولانا فرحت حسین (مولانا ولایت علی کے چھوٹے بھائی) نے مولانا کے اہل و عیال کو بھی ہندوستان بُلا لیا۔ صرف مولانا فیاض علی (ابن مولوی الٰہی بخش) وہاں رہے اور وہیں وفات پائی۔

نیا مرکز اور نیا دائرۂ عمل جب تک مجاہدین کا مرکز ستھانہ کی سرزمین میں تھا، ان کی یورشیں ضلع ہزارہ پر ہوتی تھیں۔ منگل تھانہ پہنچنے کے بعد مولانا عنایت علی نے مجاہدین کو جس علاقے پر یورشوں کے لیے تیار کیا، وہ سمہ کا علاقہ تھا، یعنی ضلع پشاور اور ضلع مردان کا میدانی علاقہ۔ او کنلے نے لکھا ہے کہ مولانا عنایت علی نے:

> اپنے ہمراہیوں کے دل میں انگریز کافروں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مجاہدین روزانہ قواعد کرتے بلکہ بعض اوقات دن میں دو مرتبہ۔

قواعد میں فضائلِ جہاد کے متعلق نظمیں پڑھی جائیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد بہشت کی شادمانیوں کے بارے میں وعظ کیے جاتے اور انھیں تلقین کی جاتی کہ صبر و استقامت سے اُس وقت کا انتظار کرو، جب برطانوی ہند کی تسخیر کی موعودہ ساعت آپہنچے گی[1]

حافظ عبدالمجید کی یادداشتوں میں بتایا گیا ہے کہ ۱۶۔ ربیع الآخر ۱۲۷۲ھ (۲۶۔ دسمبر ۱۸۵۵ء) کو مبارک خیلوں نے مولانا کی اطاعت کا اعتراف کیا۔ کچھ روز بعد وزیرالدین قاصد رقم لے کر پٹنہ سے سرحد پہنچا۔ اواخر رمضان ۱۲۷۲ھ (اوائل جون ۱۸۵۶ء) میں مقرب خاں نے اطاعت نامہ مولانا کے پاس بھیجا۔ ۱۳۔ شوال ۱۲۷۲ھ (۱۷۔ جون ۱۸۵۶ء) کو مولانا مبارک خیلوں کی طلب پر ننگرئی گئے۔ پھر چیروڑئی پہنچے، جہاں چالیس روز تک سخت بارش ہوتی رہی۔ آخر قاسم خیل (علاقہ خدو خیل) میں آئے۔ باشندگان تونالی نے اب کے بھی مصالحت کا پیغام مسترد کر دیا، اس وجہ سے اُن پر شبخون مارا گیا۔

انگریزوں کی دعوت مصالحت غالباً ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے ایک مکتوب مجاہدین کے نام بھیجا تھا جس کا مضمون یہ تھا کہ جو شخص امن سے رہنا چاہے، پشاور، ہزارہ، یوسف زئی یا راولپنڈی کے انگریز افسروں کے پاس پہنچ جائے۔ اسے ہندوستان جانے کا پروانہ مل جائے گا نیز زادِ راہ کے لیے روپے دیے جائیں گے۔ خط پہنچنے سے ایک مہینا بعد تک بھی جو شخص اس کے مطابق عمل نہ کرے گا اور وہ برطانوی رعایا ہوگا تو اُسے مفسد سمجھا جائے گا اور کم سے کم تین سال کے لیے بیڑیاں پہنائی جائیں گی، لیکن اہلِ حق میں سے کون اس پر عمل کر سکتا تھا؟ کون ناواقف تھا کہ حکومتِ انگلشیہ کے خلاف جنگ کی سزا کیا ہوگی؟ انھوں نے انتہائی غور و فکر کے بعد یہ راستہ اختیار کیا تھا جسے وہ ایمان کا راستہ سمجھتے تھے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی تکلیفیں اٹھانے پر ہمہ تن آمادہ تھے۔

---

[1] "کلکتہ ریویو" بابت ۱۸۷۰ء ص ۳۹۶۔ اوکنلے نے نظموں کے سلسلے میں اس جہادیہ کا بھی حوالہ دیا ہے جو "سید احمد شہید" میں نقل ہو چکا ہے۔ ملاحظہ ہو جلد دوم ص ۳۵۸-۲۶۰۔

دسواں باب

۱۸۵۷ کا ہنگامۂ آزادی

انگریزی فوجوں میں دعوتِ جہاد

مولانا عنایت علی نے انگریزی فوجوں میں بھی دعوتِ جہاد کا انتظام کر دیا تھا، جس کی تفصیلات تو معلوم نہ ہو سکیں، لیکن اس انتظام کی جھلکیاں مختلف سرکاری رپورٹوں میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً ریون شا[1] کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۱۸۵۲ء میں کارفرمایانِ پنجاب کو باغیانہ خط و کتابت کا سراغ ملا اور معلوم ہوا کہ دیسی پیادہ فوج کی چوتھی رجمنٹ مقیم راولپنڈی کو راہِ وفا سے منحرف کرنے کی کوشش کی گئی۔ تحقیقات پر پتا چلا کہ تخریبِ بغاوت کا مرکز عظیم آباد کا محلہ صادق پور تھا، جو مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی اور ان کے اقربا کا وطن تھا۔ لارڈ ڈلہوزی نے یہ رپورٹ دیکھ کر تاکید کی کہ اہلِ صادق پور کی سرگرمیوں کو بہ طورِ خاص زیرِ نگرانی رکھا جائے۔ کچھ مدت بعد مذکورہ بالا رجمنٹ کے منشی محمد ولی پر مقدمہ چلا۔ ۱۲۔ مئی ۱۸۵۳ء کو جرم ثابت ہو گیا، لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ منشی صاحب موصوف کو کیا سزا دی گئی۔

پنجاب کے پرانے ریکارڈز میں بھی مجاہدین کی خط و کتابت کے حوالے ملتے ہیں، اگرچہ ان کی مفصل کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ

۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے اُس ہنگامے کا آغاز ہوا، جسے انگریزوں نے "غدر" قرار دیا اور اہلِ ملک "آزادی کی جنگ" قرار دیتے ہیں۔ اس ہنگامے نے جا بجا انگریزوں

---

[1] Ravenshaw ہنٹر نے لکھا ہے کہ اگر اسی وقت مجاہدین کے خلاف اقدام ہوتا تو عالباً پیادہ فوج سب سے پہلے میدانِ جنگ میں بھیجی جاتی۔ جو خط و کتابت ہاتھ آئی اس سے ثابت ہو گیا تھا کہ ارسال مجاہدین کے لیے ایک باقاعدہ نظام استوار ہو چکا تھا (ہمارے ہندی مسلمان ص۱۴)

کے لیے سخت نازک حالات پیدا کر دیے تھے۔ مجاہدین کے لیے اقدامات کا یہ بڑا ہی اچھا موقع تھا، لیکن اتفاق کی بات ہے کہ حالات نظر بظاہر جتنے سازگار تھے، بعض ناگہانی حوادث و وقائع کے باعث اتنے ہی ناسازگار ہوگئے۔ مثلاً مجاہدین کو اس موقع پر سیّد اکبر شاہ بادشاہ صوات سے گراں قدر امداد مل سکتی تھی اور سیّد موصوف کی قیادت میں پورا سرحدی علاقہ حصولِ آزادی کے لیے قدم آگے بڑھا سکتا تھا، لیکن اس سے کچھ مدت پہلے صوات میں والیِ دیر کی سازشوں کے باعث سیّد اکبر شاہ کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی تھی، جس میں اُن کے بھائی سیّد شاہ مدار نے شہادت پائی[1]۔ پھر ۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء کو یعنی ہندوستان میں جنگِ آزادی شروع ہونے کے دن سیّد اکبر شاہ نے انتقال کیا اور معاملات کی باگ ڈور ملّا عبدالغفور اخوند صوات کے ہاتھ میں آگئی، جنھیں بوجوہِ غیر معلوم آزادی کی مساعی سے چنداں دلچسپی نہ تھی اور جو سیّد اکبر شاہ کے فرزند سیّد مبارک شاہ کی جانشینی سے بھی اختلاف رکھتے تھے۔

غرض جب تک حالات سازگار نہ تھے، مجاہدانہ اقدام کے لیے اسباب مہیا نظر آتے تھے، جب حالات سازگار ہوئے تو اسباب کا شیرازہ بکھر گیا، لیکن مولانا عنایت علی نے جانبازی کی منزل میں قدم رکھا تھا تو اسے ایک اہم دینی و اسلامی فرض سمجھا تھا جو بہرحال ادا ہونا چاہیے تھا۔ اسباب اور ماحول کی سازگاری و ناسازگاری اس فرض پر اثر انداز نہ ہوسکتی تھی۔ مولانا کا نقطۂ نگاہ زندگی کے آخری سانس تک یہی رہا اور میرے نزدیک صحیح اسلامی نقطۂ نگاہ یہی ہے۔ سامان کی فراہمی یقیناً ضروری ہے اور اس کے لیے برابر سعی جاری رکھنی چاہیے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پورا سامان مہیا ہونے تک انسان ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھا رہے۔ اس حقیقت میں بھی شبہہ نہیں کہ بعض اوقات صرف جوشِ عمل اور مظاہرۂ ایثار ہی سامان کی فراہمی میں معاون بن جاتے ہیں۔

۵۵ پیادہ فوج ۵۵ پیادہ فوج (نیٹو انفنٹری) مردان میں مقیم تھی اور اس کا ایک حصہ نوشہرہ چھاؤنی میں متعیّن تھا۔ ۲۱۔ مئی ۱۸۵۷ء کو نوشہرہ والا حصہ سرکشی پر آمادہ ہوگیا۔ آدھی رات کو یہ اطلاع

---

[1] سیّد شاہ مدار اوائل ربیع الاوّل ۱۲۷۱ھ میں ایک لڑائی کے اندر سخت زخمی ہوئے اور گیارہ روز بعد وفات پائی۔

پشاور پہنچی، جہاں مشہور انگریز افسر ہربرٹ ایڈورڈز اور جان نکلسن موجود تھے۔ انھیں اندیشہ لاحق ہُوا کہ یہ خبر مردان پہنچتے ہی ۵۵ پوری کی پوری سرکشی اختیار کرلے گی اور ۱۰ رسالے سے بھی بہ اطمینان بیٹھے رہنے کی امید نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ انھوں نے صبح ہوتے ہی پشاور کی فوج سے ہتھیار لے لیے اور ۲۳ مئی کو رات کے وقت کرنل چیوٹ[1] ایک فوج کے ساتھ مردان روانہ ہوگیا۔ جان نکلسن سیاسی مشیر کی حیثیت میں ساتھ گیا۔

۵۵ کو پشاور سے فوج کی آمد کا علم ہوچکا تھا۔ وہ لوگ مقابلے کے لیے تیار ہوگئے۔ سخت جنگ ہوئی جس میں ۵۵ کے ایک سو بیس افراد مارے گئے، ڈیڑھ سو کے قریب زخمی ہوئے، باقی آزاد علاقے میں پہنچ گئے۔ ان میں زخمی بھی شامل تھے۔

اخوند صوات کا سلوک یہ لوگ اس غرض سے صوات پہنچے کہ وہاں سے کمک لے کر انگریزوں پر یورش کریں اور خود انگریز مورخوں نے اعتراف کیا ہے کہ اگر یہ مزید قوت فراہم کرکے واپس آجاتے تو پنجاب کے لیے سخت خطرہ ثابت ہوتے[2]، لیکن سید اکبر شاہ فوت ہوچکے تھے۔ ان کی جانشینی کا معاملہ ضغطے میں پڑا ہُوا تھا اور صوات کے انتظامات کی باگ ڈور عملاً حضرت اخوند صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ ہومز نے لکھا ہے:

> اگر اخوند صاحب ان کی ہم نوائی اختیار کرلیتے، انھیں ساتھ لے کر وادئ پشاور پر ترکتاز کردیتے اور کافروں کے خلاف جہاد کا اعلان فرمادیتے تو پوری آبادی میں مذہبی جوش و حمیت کے شعلے اس پیمانے پر بھڑک اٹھتے کہ شاید برطانوی سلطنت کا ڈھانچا ان میں جل کر خاک ہوجاتا۔ خوش قسمتی سے اخوند صاحب نے ایسا نہ کیا اور انھیں اپنے علاقے سے باہر نکال دیا، البتہ ایسے رہبروں کا انتظام کردیا، جو اُنھیں دریائے سندھ کے پار پہنچادیں[3]۔

---

[1] Chute

[2] بغاوت ہند (انگریزی) مصنفہ ہومز ص ۳۱۸۔ باسورتھ سمتھ نے جان لارنس کے سوانح حیات میں لکھا ہے کہ اگر ۵۵ کی سرکشی کے انسداد میں ذرا بھی تاخیر ہوجاتی تو نتیجہ خدا جانے کیا ہوتا۔ مشہور ڈاکو اجون خاں ہماری سرحد پر پہنچ گیا تھا، اخوند صاحب صوات اس کے حامی تھے اور وہ ۵۵ کے سپاہیوں سے سازباز کے بعد قلعے میں پہنچنے والا تھا۔ (جلد اوّل ص ۵۲۷)

[3] بغاوت ہند (انگریزی) مصنفہ ہومز ص ۳۱۸۔

ان لوگوں نے اس خیال سے کشمیر کا رُخ کیا کہ اپنے ہندوستانی بھائیوں سے ربط ضبط پیدا کرنے کا موزوں ترین مقام وہی تھا۔ ضلع ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر میجر بیچر[1] نے گرد و نواح کے تمام زمینداروں اور مُلکوں کو تاکید کر دی تھی کہ ان لوگوں کو سلامت نہ گزرنے دیں۔ اُن کے پاس نہ کھانے کو کچھ نہ تھا، نہ پہننے کو۔ پہاڑی علاقے میں سردی بہت زیادہ تھی۔ اسی طرح تکلیفیں اُٹھاتے اور مصیبتیں جھیلتے وہ کاغان پہنچ گئے۔

سادات کاغان کی بدعہدی معلوم ہوتا ہے کہ ہر قدم پر وہ لوگ نقصان پہنچاتے رہے، جنھیں میجر بیچر نے مختلف قسم کے لالچ دے کر تیار کر رکھا تھا۔ جو باقی بچے انھوں نے کاغان پہنچ کر ہتھیار ڈال دیے، لیکن سادات نے انھیں انگریزوں کے حوالے کر دیا اور وہاں وہ اُس نالے پر بیدردی سے شہید کر دیے گئے، جس کا نام اُس وقت سے "شہید کتہ" مشہور ہوا۔ ہزارہ کی زبان میں ایک گیت مشہور ہے جس کے دو بند سیّد عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی نے "کتاب العبرت" میں درج کیے ہیں۔ اس گیت میں، جو درج ذیل ہے، ۵۵ء کے افراد کو "کالے" کہا گیا ہے، یعنی کالی فوج کے سپاہی:

کالے آ لتھے کاگان سیداں چا کیتے قرآن
کالے کوڑے راہ تو پھلّے سچّے دین تے چلّے
کالے آ لتھے بیچ کستیاں اُہناں سیّداں جاگاں دسیاں
کالے کوڑے راہ تو پھلّے سچّے دین تے چلّے

یعنی کالی فوج کے سپاہی کاغان میں اُترے۔ سیّدوں نے قرآن پر حلف اٹھا کر اُن سے حفاظت کے وعدے کیے۔ وہ مجاہد بے دینی کا جھوٹا راستہ ترک کر کے سچّے دین کا راستہ اختیار کر چکے تھے۔ کالی فوج کے سپاہی وادیوں میں اُتر پڑے تھے، جہاں سے کسی کو ان کا سُراغ نہ مل سکتا تھا۔ کاغانی سیّدوں نے انگریزی فوج کو ان کے چھپنے کی جگہیں بتا دیں۔ کالے بے دینی کا راستہ ترک کر کے دین کا سچا راستہ اختیار کر چکے تھے[2]۔

---

[1] Becher [2] سید عبدالجبار شاہ کی "کتاب العبرت" قلمی نسخہ صفحہ ۳۱۴، ۳۱۵۔ سید صاحب فرماتے ہیں کہ بعض روایات کے مطابق جنرل بخت خاں بھی انھیں لوگوں میں شامل تھا جنھیں صوات سے نکالا گیا تھا۔ انھیں درۂ کاناغور بند کے راستے دریائے سندھ پر پہنچا دیا گیا۔ عبورِ دریا کے بعد یہ کاغان پہنچے تو سادات نے انگریزوں کو اطلاع دے کر انھیں قتل کرا دیا۔ دو تین سو گرفتار ہوئے، انھیں ہری پور میں گولیوں سے اڑا دیا گیا۔

مزید ہندوستانی مجاہد | سرحد آزاد میں ہندوستانی مجاہدوں کا ورود محض ۵۵ پیادہ فوج کے بقیۃ السیف افراد تک محدود نہ تھا بلکہ اس سے پیشتر سید اکبر شاہ نے بھی ہندوستانیوں کی ایک فوج بھرتی کر رکھی تھی، جسے سید عبدالجبار شاہ کے قول کے مطابق "کالی پلٹن" کہا جاتا تھا۔ سید موصوف لکھتے ہیں کہ اخوند صاحب سوات نے بہ اصرار اس فوج کو منتشر کرا دیا تھا اور اعلان کر دیا تھا کہ اگر یہ لوگ سوات سے رخصت نہ کیے گئے تو میں خود ہجرت کر جاؤں گا۔ چنانچہ یہ بھی الگ کر دیے گئے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگ انگریزوں کی کامیابی کے بعد بھاگ کر آزاد علاقے میں پناہ گزیں ہوئے تھے، جنھیں مولانا عنایت علی نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ افسوس کہ سب مولانا کے پاس نہ پہنچ سکے۔

حافظ عبدالمجید کی یادداشتوں سے واضح ہوتا ہے کہ جب مولانا عنایت علی کو مردان میں فوج کی سرکشی کا علم ہوا اور بتایا گیا کہ وہ لوگ بھاگ کر سوات چلے گئے ہیں تو مولانا نے اوّل گلاب خاں کو شب قدر کی طرف بھیجا کہ جتنے افراد مل سکیں، انھیں ہمارے پاس لے آو۔ پھر میاں حسن علی کو ان کے پیچھے سوات جانے کا حکم دیا بلکہ اگرور اور الئی بھی اپنے آدمی بھیج دیے کہ وہاں جتنے آدمی مل سکیں، انھیں ساتھ لے آئیں۔ انگریزوں کے بیانات میں بھی بتایا گیا ہے کہ نارنجی کی جنگ یا دوسری چپقلشوں میں جو مجاہدین شہید ہوئے، ان میں ۵۵ پیادہ فوج کے آدمی بھی تھے۔ تفصیل جنگ مذکورہ یا دوسرے واقعات کے سلسلے میں پیش کی جائے گی۔

گیارھواں باب

نارنجی کی جنگ

ستھانہ پر شبخون سرحدی خوانین کی حالت حد درجہ عجیب و غریب اور خاصی حوصلہ فرسا تھی۔ وہ جب دیکھتے کہ کوئی خاص خطرہ درپیش نہیں تو مولانا کے ساتھ ہو جاتے اور جب ان پر انگریزوں کا دباؤ پڑتا تو مخالفت پر اُتر آتے۔ مولانا نے اس اثناء میں میدانی علاقے کے قریبی مقامات پر چھاپوں کا سلسلہ شروع کر دیا اور نارنجی کو مرکز بنا لیا، جو پہاڑ کی چوٹی پر بڑا مستحکم مقام تھا[1]۔ ہمیں تمام چھاپوں کا علم نہیں۔ ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ ۲۰۔ جولائی ۱۸۵۷ء کو شبخون مارا گیا، جس میں دشمن کو بہت نقصان پہنچا۔ اس میں چھ مجاہدین شہید ہوئے یعنی مجیب الرحمٰن، حافظ پیر محمد، منشی محسن اللہ، قاضی خان محمد، نور خاں اور حاجی عبدالرحمٰن۔ ایک شبخون شیخ جانا اور شیوہ پر مارا گیا، جس میں چالیس پوربیے ہندو اور مسلمان شامل تھے۔ شفیع محمدان کا سالار تھا۔ یہ بہت سے گھوڑے، گائیں اور اسلحہ لوٹ کر لے گئے۔

اوکنلے نے لکھا ہے کہ نوا کلئی کے باشندے بڑے متعصب اور جوشیلے تھے۔ مولانا نے دو سو مجاہدین اور ایک سو بیس سوار مرزا محمد رسالدار آفریدی کی قیادت میں وہاں بھیج دیے۔ جب انگریزی فوج نے نوا کلئی اور شیخ جانا پر پیش قدمی کی تو سالار پکڑا گیا اور اسے پھانسی دے دی گئی[2]۔

انگریزوں کے اقدامات انگریزوں نے غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ اس حصے میں مؤثر فوجی اقدامات کرنے چاہئیں، چنانچہ میجر جے ایل واگھن[3] کو فوج دے کر بھیجا گیا۔ وہ مردان سے شیخ جانا پہنچا اور گاؤں کو

---

[1] نارنجی رستم سے براہ چمبی و پر مولئی تقریباً سولہ میل ہے۔ تنگ گلیوں کے راستے میر ساہ اور لالو باندا جاتے ہیں۔ وہاں سے وادی چملہ میں اُتر کر کوگا پہنچتے ہیں۔ کوگا سے نارنجی تقریباً بارہ میل ہوگا۔

[2] "کلکتہ ریویو" بابت جولائی ۱۸۷۰ء صفحہ ۳۹۸-۳۹۹۔

[3] Vaughan

جلا کر واپس چلا آیا۔ اس کے بعد خود مجاہدین کے مرکز یعنی نارنجی پر یورش کا فیصلہ کیا گیا۔ اس غرض سے موضع سلیم خاں میں فوج جمع ہوئی۔ رات کے وقت واگھن اس فوج کے ساتھ سلیم خاں سے روانہ ہو کر ۲۱۔جولائی کی صبح کو نارنجی کے سامنے نمودار ہوا۔ نارنجی دو گاؤں تھے، ایک نیچے اور دوسرا اس سے ذرا بلندی پر۔ واگھن نے نچلے گاؤں کے گرد گھیرا ڈال لیا اور اسے تباہ کر ڈالا، لیکن فوج ساری رات کوچ میں رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ مجاہدین بڑی قوت سے اس پر حملہ نہ کر دیں، لہٰذا واگھن واپس آ گیا۔ اس کے بیان کے مطابق تقریباً پچاس مجاہدین شہید ہوئے، جن میں زیادہ تر ہندوستانی تھے[1]۔

وائلی کا بیان ہے کہ مولانا عنایت علی نے علم جہاد بلند کیا تو نارنجی میں ساڑھے چھ سو مجاہدین جمع تھے:

> یہ نہایت مستحکم مقام تھا۔ سکھوں کے عہد حکومت میں اس پر ایک سے زیادہ مرتبہ ناکام حملے ہو چکے تھے، لیکن ہماری پہاڑی توپوں کی آتش باری کے بل پر گاؤں بڑی تیزی سے مسخر کر کے تباہ کر ڈالا گیا . . . اس مہم کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مولوی صاحب کو گرفتار کر لیا جائے۔ یہ مقصد حاصل نہ ہوا۔ برطانوی علاقے سے مویشی برابر لوٹے جا رہے تھے اور دشمن کے پاس بونیر، چملہ اور سوات سے روزانہ کمک پہنچ رہی تھی[2]۔

دوسرا حملہ تقریباً دو ہفتے کے بعد انگریزوں نے نارنجی پر دوسرے حملے کی تیاری کر لی۔ اس مرتبہ مختلف فوجوں سے سوا چودہ سو سپاہی فراہم کیے گئے۔ ان کے ساتھ توپیں اور ہاتھی بھی تھے۔ اب شیوہ کو مرکز اجتماع بنایا گیا۔ یکم اگست ۱۸۵۷ء کو صبح کے وقت میجر واگھن اس فوج کے ساتھ نارنجی پہنچا۔ گاؤں کی شمالی سمت جو نالہ بہتا ہے، اس کے کنارے پر توپیں لگا کر گولہ باری شروع کر دی گئی۔ پھر تین سو آدمیوں کی ایک جمعیت کو ہدایت کر دی گئی کہ مغربی سمت سے ہو کر گاؤں کے جنوب میں پہنچ جائے۔ دوسری فوج کو مشرقی سمت سے پیش قدمی کا حکم ملا۔ خود میجر واگھن نچلے گاؤں کی جگہ مورچے لگائے بیٹھا تھا۔ بڑا سخت مقابلہ ہوا، لیکن بالائی نارنجی پر قبضہ کر لیا گیا۔ مولانا عنایت علی اس سے پیشتر نارنجی سے نکل کر ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے تھے:

---

[1] نیویل کی کتاب ص ۳۹، ۴۰۔ [2] وائلی کی کتاب ص ۴۳، ۴۴۔

ایک بھی مکان سلامت نہ چھوڑا گیا۔ بہت سے مکانوں کی دیواریں بھی ہاتھیوں سے مسمار کرادی گئیں[1]

تین آدمی گرفتار ہوئے۔ ان میں سے ایک بریلی کا مولوی تھا، دوسرا چملہ کا نشان بردار اور تیسرا چرونڈا کا باشندہ تھا۔ نام کسی کا بھی معلوم نہ ہوسکا۔ بعد ازاں تینوں کو موت کی سزا دے دی گئی[2]

وائلی نے بھی جنگ کی کیفیت اسی طرح بیان کی ہے۔ اضافہ یہ کیا ہے کہ مجاہدین میں سے بہت سے آدمی مارے گئے۔ مقتولوں میں ۵۵ پیادہ فوج کے آدمی بھی تھے، جس نے مردان میں سرکشی اختیار کی تھی[3]

حافظ عبدالمجید کی یادداشتوں سے واضح ہوتا ہے: عرفہ کے دن (۳۰۔ جولائی ۱۸۵۷ء) معلوم ہوچکا تھا کہ انگریزی فوج حملے کے لیے تیار ہورہی ہے۔ ۳۱۔ جولائی کو نماز عید کے بعد مولانا نے جہاد کے لیے دعوتِ عام کا انتظام کیا اور قریہ بہ قریہ اطلاعات بھیج دیں۔ پھر مشیروں کے اصرار پر مولانا چھپاگئی چلے گئے، جو نارنجی سے اوپر ہے۔

بیلیو کا بیان ڈاکٹر بیلیو رقم طراز ہے کہ جب ہندوستان میں "غدر" شروع ہوا تو مولانا عنایت علی گشتی اعلانات کے ذریعے سے یوسف زئی کے تمام قبیلوں کو دعوتِ جہاد دینے میں سرگرم ہوگئے، لیکن یہ دعوت چنداں کامیاب نہ ہوسکی۔ مئی میں سید اکبر شاہ بادشاہِ سوات نے وفات پائی اور اس کا بیٹا مبارک شاہ جانشین ہوا، لیکن اسے چند ہی ہفتے بعد معزول کرکے ملک سے نکال دیا گیا۔ مبارک شاہ ستھانہ پہنچا۔ پھر خدو خیل میں مولانا عنایت علی سے جا ملا۔ وہاں انھوں نے قلعۂ مردان پر قبضہ کرلینے کا منصوبہ تیار کیا، لیکن ہمارے فوجی اور انتظامی افسروں کی ہوشیاری و مستعدی کے باعث اس منصوبے پر عمل نہ ہوسکا۔ مولانا عنایت علی نے نارنجی پہنچ کر قاصدوں کے ذریعے سے خفیہ خفیہ یوسف زئیوں کو بغاوت پر آمادہ کرنا چاہا۔ اس معاملے میں اہل نارنجی کی روش کے سبب انگریزی فوج نے انھیں سخت سزا دی۔ مولانا عنایت علی اور ان کے ساتھیوں کو پہاڑی علاقے میں چلے جانے کے سوا چارہ نہ رہا[4]

---

[1] "شمالی و مغربی سرحدی قبائل کے خلاف مہموں کی دستاویزیں"۔ مرتبہ پیجٹ اور میسن (انگریزی) صفحہ ۸۹

[2] نیویل کی کتاب صفحہ ۱۰ [3] وائلی کی کتاب صفحہ ۷۵ [4] "یوسف زئیوں کے متعلق عام رپورٹ" (انگریزی) صفحہ ۹۶، ۹۷

مولانا عنایت علی کی سرگزشت اوپر بتایا جا چکا ہے کہ مولانا عنایت علی نارنجی پر یورش سے پہلے چھپاگئی چلے گئے تھے۔ کچھ معلوم نہیں کہ وہاں سے کہاں کہاں گئے۔ بعض روایتوں سے خیال ہوتا ہے کہ وہ پہلے وادیِ چملہ میں کن گلئی پہنچ گئے تھے۔ وہاں سے غالباً اس لیے خدوخیل کے شمالی مقام چنگلئی گئے کہ نئے سرے سے انگریزی علاقے پر یورشوں کا انتظام کریں۔ وہاں باغ میں مولانا کا ڈیرا تھا۔ غالباً اسی زمانے میں موضع خلیل پر شبخون مارا گیا۔ جب خدوخیل پر انگریزوں کے قصدِ یورش کا حال معلوم ہوا تو مولانا چنگلئی سے دوکھاٹرہ چلے گئے، جو پنجتار اور منگل تھانہ کے درمیان واقع ہے۔ شاید ان کا ارادہ یہ تھا کہ منگل تھانہ کے قلعے میں جا بیٹھیں جب معلوم ہوا کہ یہ مقام بھی انگریزوں کی یورش سے محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا تو چینئی کا رخ کر لیا، جو ستھانہ سے اوپر پہاڑی علاقے میں آستانہ داروں کے پرگنے کا ایک مشہور مقام ہے۔

سرحدی رؤساء کی منافقت و عداوت میرا خیال ہے کہ واقعۂ نارنجی کے بعد بعض سرحدی خوانین و رؤساء کی نیتوں میں فتور آ گیا تھا۔ ان میں سے اکثر کا شیوہ ہی یہ تھا کہ جس فریق کو کامیاب دیکھتے، اس کے طرفدار ہو جاتے۔ خود اپنا کوئی مستقل ارادہ اور نصب العین نہ تھا۔ جب دنیا پرستی انسانی گروہوں کی فکر و نظر کا مرکز بن جاتی ہے اور اخلاقی یا دینی مقاصد کے چراغ سینوں میں گُل ہو جاتے ہیں تو یہی حالت پیش آ جاتی ہے۔ سرحدی رئیس خدا جانے کب سے اس حالت میں مبتلا چلے آتے تھے۔ بعض روایتوں میں مذکور ہے کہ انھوں نے اِکّا دُکّا مجاہدین بھی شہید کر ڈالے، غالباً اس خیال سے کہ انگریزوں کو خوش کر کے انعام حاصل کریں۔ چنانچہ حافظ عبدالمجید کی یادداشتوں میں بتایا گیا ہے کہ ربیع الآخر ۱۲۷۴ھ (اواخر نومبر ۱۸۵۷ء) میں سید یوسف میاں گُل نے تین مجاہدوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا جو منڈی سے منگل تھانہ آ رہے تھے اور ان کی لاشیں ۱۳۔ ربیع الآخر (یکم دسمبر ۱۸۵۷ء) کو چنگلئی پہنچیں۔ بعد ازاں اسی قسم کا ایک واقعہ سید عباس رئیس منگل تھانہ کے متعلق بھی بیان کیا گیا ہے۔

مالی مشکلات کا ہجوم مولانا اور مجاہدین کے لیے زیادہ تر رقمیں ہندوستان سے بھیجی جاتی تھیں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوتے ہی انگریزوں نے دریائے سندھ کے تمام گھاٹوں اور کوہستانی علاقے کے راستوں کی نگرانی کا نہایت سخت انتظام کر لیا تھا، جس کے بعد کسی قاصد کے لیے کوئی رقم سرحد پہنچانا

ممکن نہ رہا تھا۔ چنانچہ مختلف روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ ایک قاصد، عطرے کا بھائی امیرا رقم لے کر پہنچ گیا، لیکن ایک اور قاصد جمالا زبیدہ میں گرفتار ہو گیا اور اس کے پاس چھ سو روپے کی رقم تھی۔ بعد از آں میاں عبدالحی، عطاءاللہ اور حسن علی گرفتار کر لیے گئے اور انھیں پابہ زنجیر سیالکوٹ بھیج دیا گیا، جن میں سے صرف حسن علی کی رہائی کا ذکر روایت میں آیا ہے۔ کچھ معلوم نہیں، دوسرے قیدیوں سے کیا سلوک ہؤا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ گرفتاریاں مولانا عنایت علی کی زندگی میں پیش آئیں یا ان کی وفات کے بعد، تاہم ان سے واضح ہے کہ مئی ۱۸۵۷ء سے کسی رقم کا مولانا کے پاس پہنچنا بے حد مشکل ہو گیا تھا۔ اغلب ہے، ہنگامے کے دوران میں رقمیں بھیجنے کی کوئی صورت ہی نہ رہی ہو، اس لیے کہ صادق پور (پٹنہ) کے مرکز پر پہرے بٹھا دیے گئے تھے، نیز مولانا احمد اللہ، شاہ محمد حسین اور مولوی واعظ الحق کو نظر بند کر دیا گیا تھا۔ یہی حضرات رقمیں جمع کرنے اور بھیجنے کے مختار و ذمّہ دار تھے۔

"تذکرۂ صادقہ" میں مرقوم ہے کہ غدر کی وجہ سے راستے پُرخطر تھے۔ شہر سے باہر نکلنا دشوار تھا۔ املاک تہلکے میں تھے۔ جانوں کو امن نہ تھا۔ پھر کیونکہ ممکن تھا کہ سرحد کے فاقہ کشوں کے لیے کوئی سامان کیا جا سکتا[1]۔

غرض جنگ نارنجی کے بعد مولانا عنایت علی کی مالی حالت بے حد خراب ہو گئی۔ کچھ مدّت تک وہ ساہوکاروں سے قرض لے کر گزارہ کرتے رہے۔ اس اثنا میں لشکریوں کو تنخواہ بھی نہ دی جا سکی۔ اب ایک طرف بعض افراد نے مجبور ہو کر تنخواہ کا مطالبہ کیا، دوسری طرف ساہوکاروں نے اپنی رقموں کے لیے تقاضا شروع کر دیا۔

ادائے واجبات مولانا کے لیے یہ بڑا ہی نازک وقت تھا۔ انھوں نے اپنی تمام قابل فروخت چیزیں بے تکلّف بیچ ڈالیں اور سب سے پہلے ساہوکاروں کا قرضہ اُتارا۔ جو رقم باقی رہ گئی، اسے ادا کرنے کے لیے سیّد نجیب بنگالی نے ضمانت دے دی۔ مجاہدین میں سے کچھ لوگ خورونوش کی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ادھر اُدھر بکھر گئے۔ قادر بخش جمعدار، اللہ بخش اور بعض دوسرے مجاہدین کو شہزادہ مبارک شاہ

[1] "تذکرہ صادقہ" ص ۱۳۸۔

اپنے ستھانہ لے گیا۔ شمشیر خاں نے لاہور کی طرف جانے کی اجازت لے لی۔ منشی عبدالحق آروی بھی مولانا کے حکم کے مطابق صوات چلے گئے۔ صرف ناصر محمد، شریعت اللہ، عبدالغفور کلاں اور عبدالغفور خُرد مولانا کے پاس رہ گئے ؛

مولانا کے پاس ایک قیمتی مُشکی گھوڑا تھا، انھوں نے مقرب خان رئیس پنجتار کو پیغام بھیجا کہ گھوڑا خرید لے تاکہ اس کی قیمت سے واجبات ادا کیے جا سکیں۔ اس نے کچھ توجہ نہ کی۔ ملّا صاحب کوٹھا کو یہ کیفیت معلوم ہوئی تو انھیں بڑا افسوس ہوا اور خود گھوڑا خرید لینا چاہا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ ملّا صاحب کی اس خواہش کا نتیجہ کیا نکلا ؛

مصیبت در مصیبت اس اثنا میں مولانا کی بیماری بہت بڑھ گئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان کا اکلوتا صاحبزادہ حافظ عبدالمجید بھی بیمار ہو گیا اور اس کی بیٹی شہربانو کی صحت بھی بگڑ گئی۔ اس زمانے میں برہان الدین، منشی شمس الدین کے بھیجے ہوئے کچھ روپے لایا۔ اُدھر حسن زئیوں نے چروڑئی میں جرگہ منعقد کیا، جس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ مولانا کے لیے کمک کا انتظام کریں، لیکن مولانا بیماری کی شدّت کے باعث جرگے میں شریک نہ ہو سکے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۲۔ رجب ۱۲۷۴ھ (۲۶۔ فروری ۱۸۵۸ء) سے مولانا نے فاقہ شروع کر دیا تھا۔ یہ سلسلہ دس دن جاری رہا ؛

"تذکرۂ صادقہ" میں مرقوم ہے کہ مسلسل فاقہ کشی نے حالت تباہ کر دی۔ درختوں کی کونپلوں اور پتّیوں پر اصحابِ صفّہ کی سنّت ادا ہونے لگی۔ چند ماہ مسلسل غلّے پر نظر تک نہ پڑی۔ اجابتیں خون آلود ہونے لگیں [۱] ؛

---

[۱] "تذکرۂ صادقہ" ص ۱۳۸ ؛

بارھواں باب

مولانا کی وفات اور مرکزوں کی تباہی

اللہ سے عہد کا ایفاء حافظ عبدالمجید کی یادداشتوں میں بتایا گیا ہے کہ مولانا پر بخار کا ایسا شدید حملہ ہؤا، جس میں بے ہوشی طاری رہنے لگی۔ اُس وقت تک وہ غالباً پرگنہ منصور جدون کے مقام نور وبانڈہ میں تھے۔ وہاں سے ان کی چارپائی اٹھاکر چنئی کی جانب روانہ ہوے۔ اثناء راہ میں شرف اللہ ملا، جو پشاور سے آیا تھا۔ کوہ چنئی کی چڑھائی پر بخار بہت تیز ہوگیا اور مولانا نے کاغذ اور قلم دوات طلب کی۔ شاید کچھ لکھنے کا ارادہ تھا۔ عین اسی حالت میں سکرات موت کا عالم طاری ہوگیا اور کمزوری اتنی بڑھ گئی کہ لکھنے کی سکت نہ رہی۔ حافظ عبدالمجید نے پوچھا کہ ہمیں کس پر چھوڑے جاتے ہیں اور آپ کے بعد امیر کون ہو؟ کچھ نہ فرمایا اور جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ "تذکرۂ صادقہ" میں بتایا گیا ہے کہ بعارضۂ بخار وضیق النفس سجن المومن سے جنتِ نعیم کو رحلت کی[1]۔ سورت احزاب میں ہے:

من المومنین رجال صدقوا	ایمان والوں میں سے کتنے مرد ہیں جنھوں نے
ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضیٰ	سچ کر دکھایا جو عہد کیا تھا اللہ سے اور ان میں
نحبہٗ۔	سے کوئی تو پورا کر چکے اپنا ذمہ ۔

مولانا عنایت علی نے یقیناً اپنا ذمہ بہترین طریق پر پورا کیا۔ صحیح تاریخ وفات کسی نے نہیں بتائی، لیکن اتنا معلوم ہے کہ ۶۔ شعبان ۱۲۷۴ھ (۲۲۔ مارچ ۱۸۵۸ء) تک وہ زندہ تھے۔ غالباً اس سے ایک دو روز بعد انتقال کیا۔ بہرحال پنجتار، چنگلئی، منگل تھانہ اور ستھانہ پر انگریزی یورش سے یہ پیشتر کا واقعہ ہے۔

---

[1] صفحہ ۱۳۸۔

مولانا کی شخصیت مولانا کے جوشِ حمیت اور گرمیِ طبیعت کے متعلق بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، لیکن انھوں نے اللہ کی راہ میں عزیمت و استقامت کا جو عظیم القدر نمونہ پیش کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جس وقت سے سیّد صاحب کے ساتھ ان کا تعلق پیدا ہوا، اپنی پوری زندگی دینی کاموں کے لیے وقف کر دی۔ بنگال میں جس اعلیٰ پیمانے پر انھوں نے دین کی تبلیغ فرمائی، اس کی کیفیت تفصیلاً پہلے پیش کی جاچکی ہے۔ پھر وہ ساداتِ کاغان اور اہل ہزارہ کو لے کر جس مردانگی سے سکھوں کے خلاف جہاد آرا ہوئے، وہ بھی اعادے کی محتاج نہیں۔ آخری دور میں مولانا نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ خدا کی راہ میں جہاد پھولوں کی سیج نہیں۔ وہ اپنا سب کچھ خدا کے لیے قربان کر چکے تھے، لیکن دیکھیے آخری دور میں انھیں کس درجہ روح فرسا آلام ومصائب سے سابقہ پڑا۔ پیسہ پلّے نہ تھا۔ جو سامان پاس تھا، بیچ ڈالا۔ اکلوتا فرزند صاحب فراش۔ اس کی بچّی بیمار، اپنی حالت حد درجہ نازک، ہر سمت دشمنوں کا ہجوم۔ امتحانوں اور آزمایشوں کے اس سَیل میں قدم استوار رکھنا صرف انھیں ارباب ہمّت کا کام ہے، جن کے سامنے فرض بہ طور فرض موجود ہو۔ دنیوی راحتوں اور آسایشوں سے انھیں کسی نوع کا سروکار نہ ہو اور صرف رضائے باری تعالیٰ پر نظر ہو۔ یہ منزل بڑی کٹھن ہے، لیکن مولانا عنایت علی نے جس شانِ فداکاری سے اسے طے کیا، اس کی مثالیں ہر جگہ نہیں مل سکتیں۔ اُن کے سامنے صحابۂ کرامؓ کا اسوۂ حسنہ تھا، جنھوں نے دینِ حق کی اشاعت میں اپنی جانیں بے دریغ قربان کر دیں۔ یہی اُسوہ قوموں کے لیے دنیا اور آخرت میں سرخروئی کا واحد ذریعہ ہے۔

مولانا کی ایک تصنیف کچھ معلوم نہیں، مولانا نے تبلیغ واشاعتِ دین کے سلسلے میں کتنی کتابیں یا رسالے لکھے۔ ہمیں صرف ایک رسالے "بُت شکن" کا علم ہے، جس میں تعزیہ داری کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ یہ اُس مجموعۂ رسائل میں چھپا تھا، جو "رسائلِ تسعہ" کے نام سے مولانا عبدالرحیم نے شائع کیا تھا۔ تقریباً دس گیارہ صفحے کا ہے اور اس کی زبان بہت سادہ ہے۔ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی اسے بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت اور اہل بیت کے مصائب بڑے پُرتاثیر انداز میں بیان کیے گئے ہیں، لیکن فرماتے ہیں کہ ان کے اصل اُسوہ کی پیروی کرنی چاہیے، نہ کہ غیر شرعی اور غیر مناسب رسوم کو مدارِکار بنایا جائے۔ مولانا سے موصوف نے فارسی میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی، جس کے صرف پانچ نسخے انگریزوں نے

چھپوائے۔ مولوی محمد یوسف صاحب رنجور جعفری (ابن مولانا یحییٰ علی) کلکتہ میں بورڈ آف ایگزامینرس کے صدر تھے۔ انھوں نے مثنوی کے پروف دیکھے۔ وہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے عزیز دوست تھے۔ مولانا نے کئی مرتبہ فرمایا کہ کچھ پروف میری نظر سے بھی گزرے تھے۔ ایک شعر اب تک یاد ہے:

کہ ایں جنگِ ما با فرنگی بود   نہ با مودہ راز ان بنگی بود

اس مثنوی کا ایک نسخہ غالباً انڈیا آفس کے کتب خانے میں بھی ہے۔

صورت حال مولانا کے سامنے صورت حال کا جو نقشہ تھا اس کا کسی قدر اندازہ ان کے ایک اعلامیہ سے ہو سکتا ہے جس کا مضمون یہ تھا:

۱۔ جس ملک پر کفار مسلط ہو جائیں، وہاں کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ متحد ہو کر کفار سے لڑیں۔

۲۔ جو لڑ نہ سکیں وہ ہجرت کر کے کسی آزاد اسلامی ملک میں پہنچ جائیں۔

۳۔ ہجرت موجودہ حالات میں فرض ہے اور جو لوگ ہجرت سے باز رکھنے کی کوشش کریں، وہ منافقت کی زد میں آتے ہیں۔

۴۔ جو لوگ ہجرت بھی نہ کر سکیں وہ حکومت سے علیحدگی پر عمل پیرا ہوں مثلاً کسی کام میں حکومت کی مدد نہ کریں، اس کی عدالتوں میں نہ جائیں، اپنے جھگڑوں کے فیصلے کے لیے پنچایتیں بنائیں وغیرہ۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس قسم کے کتنے اعلامیے مولانا نے وقتاً فوقتاً ہندوستان بھیجے[1]۔

ازواج واولاد مولانا کی پہلی شادی سید محمد مسافر کی صاحبزادی سیدہ آمنہ سے ہوئی تھی۔ بہار میں یہ پہلی شادی تھی جو انتہائی سادگی سے شریعت کے مطابق انجام پائی۔ اس خاتون سے حافظ عبدالمجید پیدا ہوئے۔ کچھ مدت بعد اس اہلیہ کا انتقال ہو گیا تو ان کا نکاح ثانی شاہ محمد حسین کی بیوہ صاحبزادی سے ہوا۔ ان سے صرف ایک لڑکی پیدا ہوئی، جس کا نام ہاجرہ تھا۔

حافظ عبدالمجید نے اپنے چچا مولانا فرحت حسین سے تعلیم پائی۔ پھر یہ اپنے والد کے ساتھ سرحد چلے گئے،

---

[1] خود مولانا بنگال میں دعوت و تبلیغ کا کام کر رہے تھے تو وہ ہر مقام پر مسجدوں کو آباد کرتے اور فصلِ خصومات کے لیے پنچایتیں بنا دیتے تھے۔

وہیں فوت ہوئے۔ ان کے دو صاحبزادے تھے اور ایک صاحبزادی۔

انتظامِ امارت ڈاکٹر بیلیو نے لکھا ہے کہ مولانا عنایت علی نے جنبٹی میں بہ عارضۂ بخار وفات پائی۔ ان کے فرزند حافظ عبدالمجید کے بجائے تین آدمیوں کو مشترکہ امیر بنا دیا گیا، ایک مولانا نصراللہ، دوسرے شاہ اکرام اللہ اور تیسرے میر تقی۔ حافظ عبدالمجید کو اس لیے امیر نہ بنایا گیا کہ ان کی زبان میں لکنت تھی۔ مشترکہ امارت میں مولانا نصراللہ کو دوسروں پر تقدم حاصل تھا، گویا وہ اس بورڈ کے صدر تھے۔ انھوں نے ضلع پشاور کے مسلمانوں کو حکومت انگلشیہ کے خلاف برانگیختہ کرنے کی بڑی کوششیں کیں، لیکن حکومت نے ان کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔[۱]

شاہ اکرام اللہ چند ہی روز بعد ستھانہ چلے گئے اور شاہ نور لڑی کی جنگ میں وہی مجاہدین کے سالار تھے۔ مولانا نصراللہ سے مراد غالباً مولانا نوراللہ ہیں، جنھیں منصب امارت میں شریک کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر بیلیو نے غلط فہمی سے انھیں نصراللہ لکھ دیا۔

ایک اور شبخون نارنجی کی جنگ میں انگریزوں کی کامیابی وائلی کے بیان کے مطابق مجاہدین کے جوش و ہمت پر اثر انداز نہ ہو سکی اور تین مہینے سے کم مدت کے اندر اندر انھوں نے ایک اور شبخون مارا۔ یوسف زئی کا انگریز اسسٹنٹ کمشنر (مسٹر ہارن[۲]) دورہ کرتا ہوا شیخ جانا میں خیمہ زن تھا۔ مجاہدین نے خدو خیل، نارنجی اور شیخ جانا کے باشندوں کی مدد سے اکتوبر ۱۸۵۷ء میں سخت شبخون مارا۔ ڈاکٹر بیلیو کے بیان کے مطابق مولوی شریعت اللہ شبخون مارنے والے جیش کے سالار تھے۔ اسسٹنٹ کمشنر بصد مشکل جان بچا کر بھاگا۔ اس کے ساتھیوں میں سے پانچ مارے گئے اور پورا سامان مجاہدین کے ہاتھ آیا۔ اس بنا پر انگریزوں نے ایک زبردست تادیبی مہم کی تیاری کی، جس کا مدعا یہ تھا کہ مجاہدین کے تمام مرکزوں کو تباہ کر ڈالا جائے۔ چنانچہ تقریباً پانچ ہزار[۳] کا لشکر تیار کیا گیا۔ میجر جنرل سر سڈنی کاٹن[۴] کو اس فوج کا سالار بنایا گیا۔

---

[۱] "یوسف زئیوں کے متعلق عام رپورٹ (انگریزی)"۔ [۲] Horne

[۳] وائلی کے بیان کے مطابق صحیح تعداد چار ہزار آٹھ سو ستر تھی۔ [۴] Sydney Cotton

پنجتار اور چنگلئی کی تباہی ۲۵- اپریل کو یہ فوج موضع سلیم خاں میں جمع ہوئی۔ توتالی کے باشندوں اور مقرب خاں رئیس پنجتار کی عداوت کا حال ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ توتالی والوں نے جب دیکھا کہ انگریزی فوج مقرّب خاں کے خلاف اقدام کے لیے قریب آ پہنچی ہے تو انھوں نے ۲۵- اپریل کو بہ طورِ خود پنجتار پر ہلّہ بول دیا۔ مقرّب خاں تو ان کے ہاتھ نہ آیا، لیکن انھوں نے پنجتار کو آگ لگا دی ؛

سڈنی کاٹن نے فوج کے تین حصّے کیے۔ ایک کو سلیم خاں میں محفوظ جیش کے طور پر ٹھہرائے رکھا، دوسرے کو براہِ راست پنجتار پر پیش قدمی کا حکم دیا، تیسرے کو خود ساتھ لے کر درہ درہند کے راستے چنگلئی پہنچا اور اسے تباہ کر کے پنجتار کے پاس سے جہانگیر درے کے راستے سلیم خاں واپس آ گیا۔ پنجتار پہلے ہی جل چکا تھا۔ انگریزی دستے نے وہاں پہنچ کر جگہ جگہ توپیں لگائیں اور پنجتار کی دیواروں کو مسمار کر دیا۔[1] یہ مقام ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۰ء تک سیّد صاحب کا مرکز رہا تھا۔ اس کے بعد بھی مجاہدین نے کچھ مدّت وہاں گزاری تھی۔ ۲۷- اپریل ۱۸۵۸ء کو یہ ملبے کا ایک ڈھیر رہ گیا۔ اس کے تمام درخت بھی کاٹ ڈالے گئے یا جلا دیے گئے ؛

عبدالحق آروی کا بیان مجاہدین میں ایک صاحب مولوی عبدالحق آروی تھے، جو ہندوستان پر انگریزی تسلّط کے بعد ترکِ وطن کر کے سندھ میں مقیم ہو گئے تھے۔ ۱۸۴۳ء میں انگریز سندھ پر بھی قابض ہو گئے تو مولوی صاحب نے رختِ سفر باندھا اور آزاد کوہستانی علاقے میں طرحِ اقامت ڈال دی۔ وہ سیّد اکبر شاہ بادشاہِ سوات کے میرمنشی بھی رہ چکے تھے۔ انھوں نے "غزوۂ بونیر" کے نام سے ۱۸۶۳ء کی جنگ امبیلہ کے حالات شاہنامے کی بحر میں لکھے ہیں۔ تمہیدات میں پنجتار، منگل تھانہ اور ستھانہ کی بربادی کا ذکر بھی کیا ہے۔ چونکہ یہ ایک چشم دید شاہد کا بیان ہے، اس لیے اسے بہ طورِ خاص پیشِ نظر رکھنا چاہیے ؛

مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ انگریزی فوج پنجتار کی طرف روانہ ہوئی تو بہت سے ملکی خوانین اُس کے ساتھ تھے۔ مثلاً تورو کا خان قادر خاں، ہوتی کا خان سربلند خاں، اسمٰعیلہ کا خان خوئداد خاں، ہنڈ کا خان شاہ داد خاں، زیدے کا خان ابراہیم خاں۔ ان کے علاوہ ستھم کے دو خان، عجب خاں اور

[1] وائلی کی کتاب ص ۷۵ تا ۷۸ ؛

عزیز خاں بھی شامل تھے[1]۔ مقرّب خاں کو انگریزوں کی یورش کا علم ہؤا تو اس نے اہل و عیال کو پنجتار سے نکال کر چملہ بھیج دیا۔ وہ خاصا عقل مند تھا، لیکن بدبختی آتی ہے تو عقل کے دفتر کا شیرازہ بھی بکھر جاتا ہے۔ ہم قوموں سے اس کی دشمنی ہوگئی۔ یہی بے اتفاقی تباہی کا باعث ہوئی۔ فرنگیوں نے پنجتار کو تباہ کر ڈالا :

نہ بگزاشت تارے ازاں پنجتار — کہ بر ہر سر تار انداخت نار
جدا کرد پیوند ہارا ز دوخت — سراسر ہمہ تار ہا را بسوخت[2]

مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ مقرّب خاں کہتا تھا، میرے ہم قوم خدّو خیلوں نے یہ کیا کیا؟ فرنگی کے ہاتھ سے مجھے کیوں برباد کرایا؟ جو کچھ انھیں کرنا تھا، بہتر ہوتا، خود کرتے۔

منگل تھانہ کی بربادی

پنجتار اور چنگلئی سے فارغ ہوکر سڈنی کاٹن نے منگل تھانہ کا رُخ کیا۔ اس سلسلے میں بھی فوج کے تین حصّے کیے گئے۔ ایک کو سلیم خاں میں برمدِ محفوظ ٹھہرایا۔ دوسرے کو تادیبی کارروائی کے اختتام تک پنجتار میں ٹھہرنے کا حکم دیا، جو منگل تھانہ سے قریب تھا۔ مقصود یہ تھا کہ کمک کی ضرورت پڑے تو جلد موقع پر پہنچ جائے۔ تیسرا حصّہ براہِ راست منگل تھانہ کی طرف بڑھا۔ راستہ بڑا دشوار گزار تھا۔ اس جیش کے نصف حصّے کو دوکھاڑہ میں ٹھہرایا

---

[1] خوانین ملکی بہمراہِ او — ہمہ کارکن حسب دلخواہِ او
یکے خانِ تورو بلند احتشام — میانِ جہاں بود قادر بنام
یکے خان ہوتی صداقت پسند — مسمّٰی بہ مخلوق باسر بلند
یکے خان اسماعلہ خوند بود — یکے ہنڈوی بود خود شاہ داد
یکے خان زیدہ سخاوت نظام — بہ عالم ابراہمش بود نام
مجب خاں یکے بود و دیگر عزیز — خوانین ملکی دگر جملہ نیز
قلمی نسخہ صـ۲۵ ۔

[2] ایضاً صـ۲۶ ۔ پہلے شعر میں تار سے غالباً گاؤں مراد ہے۔ پنجتار نام اس بنا پر رکھا گیا ہے کہ اسے پانچ گاؤں میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یعنی ظلی کلئی، سنگ بٹئی، غورغشتی، قاسم خیل، پنجتار ۔

گیا۔ منگل تھانہ کے دونوں گاؤں بالکل خالی تھے۔ کوئی مزاحمت پیش نہ آئی۔ انگریزی لشکر نے گاؤں اور قلعہ بندیوں کو حسب دلخواہ برباد کیا۔ رات وہاں گزاری اور ۳۰۔ اپریل کو یہ دستہ سلیم خاں واپس آیا[1]۔

مولوی عبدالحق فرماتے ہیں کہ منگل تھانہ میں سید عباس کا قلعہ بہت مستحکم تھا۔ بلندی میں وہ آسمان کا ہمسر تھا:

زعباسیاں خان و ناموس رفت — ز افرنگیاں نام تا روس رفت
زعباسیاں ہرچہ آباد بود — بحکم کمشنر خرابش نمود
کہ خوفے نہ بود از چپ و راستش — وز آنجا نمود آنچہ دل خواستش[2]

---

[1] وائلی کی کتاب صفحہ ۷۹ اور نیویل کی کتاب صفحہ ۲۱۔

[2] غزائے بشیر قلمی نسخہ صفحہ ۲۸۔

تیرھواں باب

ستھانہ کی بربادی

ساداتِ ستھانہ پنجتار اور منگل تھانہ کے بعد مجاہدین کا صرف وہ مرکز باقی رہ گیا جو مولانا ولایت علی کے وقت سے بھی پیشتر ستھانہ میں قائم تھا۔ اب انگریزی فوج اُس طرف متوجہ ہوئی، لیکن یورش کی کیفیت بیان کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سادات ستھانہ کے حالات اختصاراً پیش کر دیے جائیں۔

سادات ستھانہ سیّد علی ترمذی غوث بونیری کی اولاد میں سے تھے، جس کی شاخیں کنڑ سے سرحد کشمیر تک پورے آزاد کوہستانی علاقے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ستھانہ اٹھارھویں صدی میں سیّد ضامن شاہ نے آباد کیا تھا، جو سیّد علی ترمذی کی آٹھویں پشت میں تھے اور دربارِ مغلیہ کی طرف سے انھیں پکھلی میں خاصی بڑی جاگیر دے دی گئی تھی۔ سیّد ضامن شاہ کے بعد اُن کے فرزند سیّد شاہ گُل عرف شاہ جی ستھانہ کے رئیس بنے۔ ان کے چھ بیٹے تھے، جن میں سے تین لاولد فوت ہوئے: سیّد اعظم شاہ، جو سب سے بڑے تھے، سیّد اصغر، جن کی عمر درویشی میں گزری اور کوٹھا میں وفات پائی، سیّد شاہ مدار، جن کی شہادت صوات میں سیّد اکبر شاہ کی وفات سے کچھ مدت پیشتر ہوئی۔ باقی تین بھائیوں میں سے سیّد اکبر شاہ کو تمام قبائل نے ۱۸۴۶ء میں زیریں ہزارہ کا بادشاہ منتخب کیا تھا۔ یہ بادشاہی انگریزی اقدامات کی وجہ سے ختم ہوگئی تو اہلِ صوات نے بالاتفاق انھیں بادشاہ بنا لیا۔ وہیں ۱۸۵۷ء میں وہ فوت ہوئے۔ سیّد عمر سیّد اکبر شاہ کی غیر حاضری میں ستھانہ کی امارت پر فائز ہوئے۔ سیّد عمران نے سیاسی کاموں میں نمایاں حصہ نہ لیا۔

یہ سادات سیّد احمد شہید کے زمانے میں مجاہدین سے وابستہ ہوئے تھے اور اس وابستگی میں

کبھی کوئی خلل پیدا نہ ہؤا۔اس سرگزشت کے ابتدائی ابواب میں بتایا جا چکا ہے کہ مجاہدین ہر دورِ ابتلا میں سادات ہی کو اپنی آخری پناہ گاہ سمجھتے رہے۔ پائندہ خاں سے آخری مرتبہ اختلاف ہؤا تھا تو مجاہدین ستھانہ ہی میں آ گئے تھے۔ مولانا ولایت علی نے بھی اسی جگہ قیام پسند کیا تھا۔اب مجاہدین سے وابستگی ہی کے باعث ان کا وطن بھی بربادی کی زد میں آیا ۔

اتمان زئیوں سے تعلقات ستھانہ سے بالکل قریب اتمان زئیوں کے چار گاؤں ہیں: کیّا زیریں، کیا بالا۔ کھبّل زیریں، کھبّل بالا۔ ان لوگوں سے سادات کے تعلّقات عموماً خوش گوار رہے، بلکہ رشتہ داریاں بھی تھیں۔ سیّد عمر شاہ کی امارت ستھانہ کے دوران میں اتمان زئیوں کو شبہہ ہؤا کہ ستھانہ کی طرف سے اُن پر عُشر عائد کرنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ یہ شبہہ سراسر بے بنیاد تھا۔ چونکہ ایک مرتبہ سیّد اکبر شاہ اتمان زئیوں کی رضامندی سے مجاہدین کے لیے گزارے کا انتظام کرا چکے تھے، جو کم و بیش بیس سال پیشتر کا واقعہ تھا، اس لیے شبہے نے یقین کی صورت اختیار کر لی۔ایک موقع پر سیّد عمر شاہ سپاہیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ کسی کام کے سلسلے میں کھبّل گئے ہوئے تھے کہ مخالفین نے اُن پر حملے کی تیاری کر لی۔ سیّد عمر شاہ کو یہ کیفیت معلوم ہوئی تو حیران رہ گئے۔ موقع ایسا تھا کہ وہ کوشش بھی کرتے تو سب کو شبہے کے بے بنیاد ہونے کا یقین نہ دلا سکتے۔ ویسے بھی سرحدِ آزاد کی زندگی کا ماحول اس امر کا روادار نہ تھا کہ کسی مخالف گروہ کے مظاہرۂ قوّت کے وقت مقابلے میں پس و پیش کی جائے اور اپنی طرف سے صفائی یا عذر خواہی کو مدارِ کار بنایا جائے۔ سیّد عمر نے رفقاء کی قلّت کے باوجود مقابلے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے تمام ساتھی بھرماری کے ماہر تھے۔ انھوں نے تھوڑی ہی دیر میں اتمان زئیوں کو شکست دے کر اطاعت پر مجبور کر دیا اور وہ ادائے مالیہ کے اقرار نامے لکھنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ غالباً ۱۸۵۱ء کا واقعہ ہے۔ شکست برابر اتمان زئیوں کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی اور وہ اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ کوئی اچھا موقع پیدا ہو تو سادات کی حکومت کا جؤا کندھوں سے اتار پھینکیں ۔

اتمان زئیوں کی سرکشی انگریزوں نے پنجتار اور منگل تھانہ کی بربادی کے بعد گرد و نواح کے تمام قبیلوں سے اقرار نامے لینے شروع کیے کہ وہ سادات ستھانہ کا ساتھ نہ دیں گے۔ اتمان زئی

پہلے سے ایسے ہی کسی موقع کے منتظر تھے۔ چنانچہ انھوں نے بھی خفیہ خفیہ انگریزوں سے معاملہ طے کر لیا۔
اس اثنا میں انگریزوں کی یورش سے دو تین روز قبل اچانک ایک واقعہ پیش آگیا جو ستھانہ پر
اتمان زئیوں کی یورش کا باعث بن گیا۔
۱۸۵۱ء کی جنگ میں دو بھائی، سرگند خاں اور جمال خاں ستید عمر شاہ کے حامی رہے تھے۔
جمال خاں کے ہاتھ سے کھبل کے ملک محبّ اللہ خاں کا ایک بیٹا مارا گیا تھا۔ افغانی دستور کے مطابق
باقاعدہ جنگ میں قتل ہونے والے آدمیوں کا قصاص نہ لیا جاتا تھا، البتہ جنگ کے بغیر جو لوگ قتل ہوتے
تھے، ان کے وارث پشتوں تک قاتلوں سے انتقام لینے کے درپے رہتے تھے۔ محبّ اللہ خاں کے
بیٹوں نے اس افغانی دستور کے خلاف جمال خاں کو اپنے مقتول بھائی کے انتقام میں کیا اور کھبل کے
درمیان قتل کر دیا۔ ستید عمر شاہ حاکمِ علاقہ ہونے کے لحاظ سے اس خونِ ناحق کا قصاص لینے کے مجاز
تھے۔ محبّ اللہ خاں نے یہ چالاکی کی کہ چپ چاپ اٹھا اور ستھانہ پہنچ کر والدۂ ستید عمر شاہ کی ڈیوڑھی
میں التجائے رحم کے لیے جا بیٹھا۔ ستیدہ نے اسے پناہ دے دی اور اپنے فرزند ارجمند کو محبّ اللہ خاں
اور اس کے بیٹوں کی حفاظت کے اقرار پر مجبور کر دیا۔ ستید عمر والدہ کا کہنا ٹال نہ سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سرگند خاں
ان کا دشمن بن گیا۔ جب کیا اور کھبل میں کوئی بھی گروہ ستید عمر شاہ کی حمایت کے لیے باقی نہ رہا تو اتمان زئی
لشکر تیار کر کے سادات پر چڑھ دوڑے۔ ستھانہ کے سامنے کوئی نصف میل کے فاصلے پر بال ڈھیری
نام ایک پہاڑی ہے، جو تقریباً چھ سو فٹ بلند ہوگی۔ اس پر دشمن مورچے بنالے تو ستھانہ پر تباہی خیز
گولہ باری کر سکتا ہے۔ اتمان زئیوں نے اس پہاڑی پر مورچے لگا لیے اور گولیاں برسانے لگے۔

ستید عمر کی شہادت

ستید عمر شاہ نے یہ حالات دیکھے تو اپنے سواروں اور پیادوں کی ایک
جمعیت دریا کے قریب سے کیا پر یورش کے لیے بھیج دی۔ خود ان کا بیٹا ستید محمود شاہ اور ستید اکبر شاہ
مرحوم کا فرزند ستید مبارک شاہ بھی اسی فوج کے ساتھ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ کیا پر حملہ ہوتے ہی اتمان زئی
بال ڈھیری کے مورچے چھوڑ کر اپنی حفاظت پر مجبور ہو جائیں گے۔ ٹھہرے رہیں گے تو عقب سے ان پر
کامیاب حملہ ہو سکے گا۔ یہ تجویز جنگی نقطۂ نگاہ سے بڑی مؤثر تھی، لیکن اپنی فوج کیا بھیج کر ستید عمر شاہ کو

خدا جانے کیا خیال آیا کہ جوشِ تہور میں پندرہ بیس سواروں کو ساتھ لے کر انھوں نے بال ڈھیری کے مورچوں پر ہلّہ بول دیا۔ حملہ ایسا سخت تھا کہ پہلا مورچہ فتح ہو گیا اور دوسرے مورچے کے جنگ جُو بھی جگہ چھوڑ کر منتشر ہونے لگے۔ اس اثناء میں ایک گولی سیّد عمر شاہ کے سینے میں لگی اور پُشت کی طرف سے نکل گئی۔ زخم کاری تھا، سیّد عمر شاہ اپنے بھائی سیّد عمران شاہ کے سہارے بہ مشکل تمام ستھانہ کی مسجد میں پہنچے۔ رمضان ۱۲۷۴ھ کی چودھویں یا پندرھویں تاریخ تھی (۳۰۔ اپریل ۱۸۵۸ء)۔ دوا پلانے کی کوشش کی گئی۔ سیّد عمر شاہ نے انکار کر دیا اور کہا: میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں روزہ دار ہی جانا پسند کرتا ہوں۔ اسی حالت میں جاں بحق ہوئے۔ یہ انگریزی حملے سے چار روز پیشتر کا واقعہ ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انگریزوں کی یورش سے قبل ہی وہ شخصیت ختم ہو چکی تھی، جو مقابلے اور مزاحمت کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ گویا قدرت نے انگریزوں کے لیے پہلے ہی کامیابی کا انتظام کر دیا تھا۔ خدّو خیل میں وہ اس وجہ سے کامیاب ہوئے کہ مقرب خاں کی قوم اس کے خلاف تھی، ستھانہ میں اس وجہ سے کامیاب ہوئے کہ سیّد عمر شاہ چار روز پیشتر شہید ہو چکے تھے۔

عبدالحق آروی کا بیان مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ سیّد مبارک شاہ کے پاؤں میں گولی لگ چکی تھی۔ سیّد عمر شاہ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دے دیا کہ تمام زئیوں پر گولیاں نہ چلائی جائیں اور صرف تلواروں سے ان پر حملہ کیا جائے۔ اسی حالت میں ان کے گولی لگی اور ستھانہ پہنچ کر وہ فوت ہو گئے:

پس از جنگ بازی بہ پرداختند — بہ تکفین و تدفینِ او ساختند
چو تاریخ ترحیلِ آں خواستم — بہ کنجِ تفکّر بپرداختم
بہ من گفت ہاتف بس از زود تر — تفنگِ اجل برد عقدِ عمر[1]

۱۲ ھ ۷۴

انگریزی یورش انگریزی فوج ۴۔ مئی ۱۸۵۸ء (۲۰۔ رمضان ۱۲۷۴ھ) کو ستھانہ کے خلاف بڑھی۔ کیا اور کھبّل کے تمام تمن نیز دوسرے خوانین ساتھ تھے۔ ایک ہزار پچاس آدمیوں کا ایک جیش پانچ توپوں کے ساتھ دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر جا ٹھہرا۔ فوج کا بڑا حصہ جنوبی سمت سے حملہ آور ہوا۔ والیِ امب کی فوج نے شمالی سمت

[1] "عزلت نشیں" قلمی نسخہ ص ۲۲، ۲۳۔

کی پہاڑیوں پر مورچے قائم کر لیے۔ اس سے پیشتر سادات بال بچّوں کے ساتھ ستھانہ سے ملکا چلے گئے تھے، جو مہابن کے اوپر ان کے وطن سے تقریباً پینتیس میل کے فاصلے پر ہے۔ تھوڑے سے ہندوستانی مجاہدین وہاں رہ گئے تھے اور ان کے ساتھ جدون قبیلے کے بہادروں کا ایک چھوٹا سا دستہ تھا۔ لڑائی ستھانہ کے اُوپر اُس پہاڑ میں ہوئی جسے "شاہ نور لڑی" کہتے ہیں۔ ہیجیٹ اور میسن کا بیان ہے کہ ہر مجاہد یا شہید ہُوا یا گرفتار کر لیا گیا۔ انھوں نے جوشِ حمیّت کا غیر معمولی مظاہرہ کیا۔ وہ بہادرانہ پیش قدمی کرتے رہے۔ سب نے نہایت عمدہ لباس پہن رکھّے تھے۔ نہ کسی کے قدم میں لرزش ہوئی، نہ کسی کی زبان سے نعرہ بلند ہُوا۔ چُپ چاپ جانیں دیتے رہے[1]۔

سیّد عبدالجبار شاہ ستھانوی اور ڈاکٹر بیلیو کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ نور لڑی کی لڑائی عصر کے وقت ہوئی اور وہاں کُل ساٹھ مجاہد تھے۔ شاہ اکرام اللہ ان کے سالار تھے۔ وہ مولانا عنایت علی کے بعد مجاہدین کے ان تین سالاروں میں سے تھے، جنھیں انتظامِ امارت کا ذمّہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ مجاہدین کا دستور تھا کہ جب مقابلے کے لیے مورچے قائم کر لیتے تو پھر پیٹھ پھیرنا ان کے نزدیک قرآن کے رو سے جائز نہ تھا۔ وہ شوقِ شہادت لے کر وطن سے آئے تھے اور ان کا کام یہ ہوتا کہ دشمن پر جتنی ضربیں لگا سکیں لگاتے جائیں، یہاں تک کہ جان جاں آفرین کے سپرد کر دیں۔ ان مجاہدین کی قبریں اب تک شاہ نور لڑی کی چوٹی پر موجود ہیں[2]۔ حافظ عبدالحمید کی یادداشتوں میں بتایا گیا ہے کہ اس لڑائی میں شاہ اکرام اللہ کے علاوہ جمعدار اللہ بخش، نعمت اللہ اور تقریباً تیس مجاہدین شہید ہوئے۔

ستھانہ کی تباہی انگریزوں نے ستھانہ کو بے دردی سے تباہ کیا۔ توپیں لگا کر گاؤں مسمار کر ڈالا۔ ہاتھیوں سے مجاہدین کا قلعہ تڑوایا۔ ستھانہ، منڈی اور مرکزِ مجاہدین کا نشان تک باقی نہ چھوڑا۔ سیّد عبدالجبار شاہ کے بیان کے مطابق ستھانہ کی دو آبادیاں تھیں: ایک زیریں ستھانہ، جس میں عام لوگ رہتے تھے، دوسرا

---

[1] نیویل کی کتاب ص۴۱، واٹلی کی کتاب ص۳۰۔

[2] "کتاب العبرۃ" قلمی نسخہ ص۳۲۹، یوسف زئیوں کے متعلق عام رپورٹ (انگریزی) ص۹۸۔ ڈاکٹر بیلیو نے مجاہدین کی تعداد چالیس لکھی ہے۔ یہ ہندوستانیوں کی تعداد ہے۔ جدون ان میں شامل نہیں۔

بالائی ستھانہ، جہاں سید عمر شاہ مقیم تھے۔ بالائی ستھانہ کو بارود سے اُڑا دیا گیا۔ سایہ دار درختوں کو بھی کاٹ ڈالا گیا۔ جو کٹ نہ سکے، ان کی چھال ایک ایک فٹ اتار دی گئی تاکہ خشک ہو جائیں۔ مولوی عبدالحق آروی نے اس آبادی کے متعلق لکھا ہے:

ستھانہ ہماں جا بہ حد کیا ست ستھانہ مگو بلکہ شہرِ حیاست
درآں سیداں جملہ مہماں پرست دہند و خورند آنچہ آید بدست
ہماں سیداں تاجِ سادات اند چو سادات با چار عادات اند
وجیہ و سخی و شجاعت نشاں چہارم دیانت ازاں جملہ داں

صرف ستھانہ کی بربادی پر قناعت نہ کی بلکہ اتمان زئیوں سے عہد لیا کہ پھر اس مقام پر سادات کو آباد نہ ہونے دیں گے۔ اندیشہ تھا کہ ممکن ہے، بالائی جدون یعنی سالار اور منصور انگریزی فوج کی مراجعت پر اتمان زئیوں کو دبائیں اور سادات کی آبادی کا انتظام کرا دیں، لہٰذا ان کے خلاف بھی تادیبی اقدامات کیے گئے اور انھوں نے بھی اقرار کر لیا کہ سادات اور ہندوستانیوں کو آباد نہ ہونے دیں گے اور جو قبیلہ انھیں آباد کرنے کی کوشش کرے گا، اس کے مقابلے میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھیں گے۔[1]

آخر میں یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ سادات ستھانہ پر یہ مصیبت صرف مجاہدین کی سرگرم اعانت ہی کے باعث ٹوٹی تھی اور انھیں جتنی مالی یا جانی قربانیاں کرنی پڑیں ان کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ ہر دور میں مجاہدین کے رفیق و معاون رہے۔

---

[1] وائلی کی کتاب ص۸۱۔

چوتھا حِصّہ

مولانا عبداللہ

(از ابتدائے امارت تا جنگ امبیلہ)

پہلا باب

ملکا اور ساداتِ ستھانہ

مرکز ملکا ستھانہ سے تقریباً پینتیس میل کے فاصلے پر مہابن کے مغربی حصے میں ملکا نام ایک مقام تھا، جو مدت سے ساداتِ ستھانہ کی ملکیت چلا آتا تھا، لیکن یہ مقام ایک زمانے میں اخوند خیلوں کے پاس کسی وجہ سے رہن کر دیا گیا تھا۔ سید اکبر شاہ نے اپنی بادشاہی کے زمانے میں رہن کا روپیہ ادا کر کے اسے فک کرا لیا تھا۔[1] ستھانہ کی تباہی کے بعد سادات، ملکا میں رہنے لگے اور مجاہدین کو بھی ساتھ لے گئے۔ چنانچہ ستھانہ کے بعد ملکا مجاہدین کا مرکز رہا اور جنگ امبیلہ تک وہ اسی جگہ مقیم رہے۔

مولوی عبدالحق آروی نے "غزوۂ بنیر" میں لکھا ہے کہ ملکا میں مہاجروں کی آمد بہت بڑھ گئی تھی۔ تھوڑی ہی مدت میں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان اس قدر جمع ہو گئے کہ ان کا شمار مشکل تھا۔ جب پہلی آبادی میں سب کے لیے گنجایش نظر نہ آئی تو ایک نئی آبادی قائم کی گئی جو پہلی سے متصل تھی:

بہ کم مدتے شہر آباد شد	بہ فضلِ خدا نیک بنیاد شد
شد آں شہر را بس عمارت بلند	در آمد بہ چشمِ کساں خوش پسند
ز پائے مہاجر شرف یافتہ	ز ہر گوشہ اش نور بر تافتہ
بہ ہر چار سو کوہ بودش حصار	چو آباد گردید شد استوار[2]

[1] حافظ عبدالمجید کی یادداشتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک موقع پر نواب وزیرالدولہ والیِ ٹونک نے سات ہزار روپے کی رقم مجاہدین کو دی تھی، جس میں سے ایک ہزار روپے ملکا کے لیے تھے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آیا یہ رقم ملکا میں مجاہدین کے لیے دی گئی تھی یا مقصود یہ تھا کہ وہ اس پاس کا کوئی گاؤں خرید لیں۔ [2] "غزوۂ بنیر" ص ۲۳ و ۲۴۔

ملکا کی وسعتِ آبادی کی تصدیق رینل ٹیلر کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ ٹیلر انگریزوں کی اس پارٹی کا سرخیل تھا جسے جنگ امبیلہ کے بعد ملکا کو آگ لگانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس بیان میں بتایا گیا ہے کہ آبادی خاصی وسیع تھی۔ پہاڑی عمارتوں کے انداز پر ایسی بارکیں بنائی گئی تھیں جن میں تقریباً تین ہزار مجاہدین سما سکتے تھے۔ پاس ہی بارود کا ایک کارخانہ تھا، نیز چند دکانیں اور دوسری عمارتیں تھیں۔ جگہ بہت محفوظ تھی۔ آبادی کے اردگرد مہابن کے اونچے ٹیلوں کی فصیل کھڑی تھی[1]۔

بدنظمی کا دور مولانا عنایت علی کی وفات کے بعد بلکہ ان کی زندگی کے آخری دور ہی میں مجاہدین کے نظم کا شیرازہ بکھر چکا تھا، تاہم وہ جہاں جہاں تھے، اپنے اصل مقاصد کے لیے امکانی جدوجہد میں مشغول رہے۔ بعض اصحاب مولانا کی زندگی ہی میں واپس چلے گئے تھے۔ مثلاً مولانا یحییٰ علی یا اس خاندان کے بعض دوسرے افراد، نیز مولانا مقصود علی دانا پوری جو خاصی مدت تک راولپنڈی کے گردونواح میں دورے کرتے رہے، مولانا فیاض علی (برادر مولانا احمد اللہ و یحییٰ علی) کو بھی مولانا عنایت علی سے اختلاف ہوا تھا، لیکن وہ واپس نہ ہوئے اور سرحد ہی میں وفات پائی۔ تین امیروں میں سے شاہ اکرام اللہ شاہ تو رلڑی کی جنگ میں شہید ہو چکے تھے۔ مولانا نور اللہ، جنھیں ڈاکٹر بیلیو نے نصر اللہ لکھا ہے، کابل جاتے ہوئے ملا سر (وادی چملہ) پہنچے تو بیمار ہو کر فوت ہوئے اور ملاسر ہی کی زمین میں محو آرام ہیں۔ اس اثنا میں مولانا مقصود علی آ پہنچے۔ یہ غالباً میرٹھ میں گرفتار بھی ہوئے تھے اور ان کے پاس سے جو کاغذات برآمد ہوئے تھے، ان میں مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کے بعض اعلانات بھی تھے۔ پھر یہ رہا کر دیے گئے۔ غرض مجاہدین نے انھیں امیر بنا لیا۔ حافظ عبدالمجید کی یادداشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوائل جمادی الاخریٰ ۱۲۷۵ھ (اواخر جنوری ۱۸۵۹ء) میں پٹنہ سے روانہ ہوئے تھے اور ۱۸۶۰ء میں سرحد پہنچے ہوں گے کچھ مدت بعد انھوں نے بھی بہ عارضۂ بواسیر وفات پائی[2]۔

مولانا ولایت علی کے فرزند ارجمند مولانا عبداللہ اس لیے پٹنہ میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ ان کے

---

[1] رینل ٹیلر کے سوانح حیات انگریزی صفحہ ۲۹۰۔

[2] ڈاکٹر بیلیو نے لکھا ہے کہ مولانا مقصود علی ۱۸۶۲ء کے موسم بہار یعنی شعبان یا رمضان ۱۲۷۸ھ میں فوت ہوئے۔ صفحہ ۹۹۔

چچا مولانا فرحت حسین بیمار تھے۔ وہ ۱۲۷۴ھ میں فوت ہو گئے۔ جب مولانا عبداللہ کو معلوم ہوا کہ مرکز مجاہدین کے حالات چنداں دلخواہ نہیں رہے تو ۲۳۔ ربیع الآخر ۱۲۷۶ھ (۱۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء) کو وہ مع اہل و عیال پٹنہ سے روانہ ہوئے اور سرحد پہنچ گئے۔ مولانا مقصود علی کی وفات پر ان کے فرزند مولانا اسحٰق اور مولانا عبداللہ دونوں منصب امارت کے اہل سمجھے جاتے تھے اور دونوں کے حامی موجود تھے خصوصاً مولانا اسحاق کو تمام بنگالیوں کی امداد حاصل تھی۔ چونکہ مولانا عبداللہ کو جنگی امور کا وسیع تجربہ حاصل تھا، اس لیے انھیں کے نام قرعۂ انتخاب پڑا۔ ان کا عہد امارت کم و بیش چالیس سال پر پھیلا ہوا ہے اور مجاہدین کی سرگزشت کا یہ سب سے زیادہ شاندار باب ہے، جس کے حالات تفصیلاً آیندہ ابواب میں بیان ہوں گے۔

ساداتِ ستھانہ کی سرگزشت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ساداتِ ستھانہ کی سرگزشت بھی اجمالاً بیان کر دی جائے، جو آیندہ مجاہدات میں جماعت مجاہدین کے سرگرم ترین رفیق و معاون رہے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ سادات چھ بھائی تھے، جن میں سید اعظم کے صرف ایک لڑکی تھی۔ سید اصغر اور سید شاہ مدار لاولد تھے۔ باقی تین بھائیوں کے نرینہ اولاد تھی اور وہی پورے املاک کے وارث قرار پائے۔ سید اعظم کی صاحبزادی کی شادی شہزادہ مبارک شاہ (ابن سید اکبر شاہ) سے ہوئی تھی۔ سید عمر شاہ کے چار فرزند تھے۔ سید محمود شاہ بڑے، سید شاہ حسین، سید شبیر حسین اور سید شاہ میر حسین چھوٹے۔ سید عمران شاہ کے فرزند سید عطر شاہ، سید عبداللطیف اور سید قلندر شاہ تھے۔ ستھانہ کی تباہی کے بعد سید مبارک شاہ اور سید عمران شاہ ملکا میں مقیم ہو گئے، لیکن سید عمر شاہ کے فرزندوں نے استانہ داروں کے علاقے میں گبائی کو اپنی اقامت کے لیے پسند کیا[1]۔

سید محمود شاہ کی ملازمت سید عمر شاہ کے ساتھ نواب جہانداد خاں والیِ امب کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ انھیں خیال آیا کہ سید شہید کی اولاد کے گزارے کا کوئی معقول بندوبست نہیں رہا۔

---

[1] یہ تمام حالات سید عبدالجبار شاہ ستھانوی کی "کتاب العبرت" سے ماخوذ ہیں۔ گبائی کے انتخاب کی ایک وجہ یہ بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ علاقہ ملکا کے رہن کا روپیہ مولانا عبدالجبار شاہ کے قول کے مطابق سید عمر شاہ نے ادا کیا تھا، لہٰذا ان کے فرزندوں کو وہاں جانا پسندیدہ معلوم نہ ہوا۔

چنانچہ انھوں نے اپنے زیر اہتمام سید محمود شاہ کو گھوڑوں کے ساتھ بے قاعدہ سرکاری رسالے میں بھجوا دیا[1]۔ اس سلسلے میں شہزادہ مبارک شاہ اور سید عمران کے کچھ گھوڑے بھی شامل کر لیے گئے۔ سید محمود شاہ خاصی مدت تک انگریزی علاقے میں رہے۔ انھیں اپنی اور گھوڑوں کی تنخواہ ڈیڑھ دو ہزار ماہوار مل جاتی تھی۔ شہزادہ مبارک شاہ اور سید عمران شاہ کے گھوڑوں کی رقم انھیں بھیج دی جاتی تھی۔ جب انگریزوں نے یہ بے قاعدہ رسالہ توڑا تو سید محمود شاہ کو براہِ راست رسالداری کا عہدہ پیش کیا، لیکن انھوں نے ملازمت منظور نہ کی اور اپنے گھوڑے فروخت کر کے واپس چلے گئے۔ شہزادہ مبارک شاہ کا آدمی گھوڑے لے کر بظاہر برائے فروخت کہیں چلا گیا، لیکن رقم شہزادے کو نہ ملی[2]۔ سید محمود شاہ نے ایسا انتظام کر لیا تھا کہ ان کے خاندان کو ستھانہ میں اقامت کی اجازت مل جائے اور خاندانی املاک ان کے قبضے میں آ جائیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے حکومت پنجاب کے پاس ایک درخواست بھی دے دی تھی۔ اس اثناء میں شہزادہ مبارک شاہ نے بہ طورِ خود دوسری تدبیر اختیار کر لی، جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

شہزادے کی تدبیر

شہزادے نے خود ایک موقع پر بیان کیا کہ میں دو سال تک آبادیِ ستھانہ کی مختلف تدبیریں کرتا رہا، لیکن کوئی بھی کارگر نہ ہوئی۔ آخر ایک روز ملکا سے روانہ ہوا اور رات کے وقت ستھانہ پہنچا۔ اپنے خاندانی قبرستان میں جا کر ساری رات دعائیں کرتا رہا کہ کامیابی کی کوئی صورت نکل آئے۔ طلوعِ سحر سے پہلے واپس چلا گیا۔ دل پر اک گونہ تسکین و اطمینان کی کیفیت طاری تھی۔ جاتے ہی جدونوں کے سرداروں سے ملا۔ وہ مجھے دیکھ کر شرما گئے اور انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ خواہ

---

[1] اس زمانے میں وقت کے عام حاکموں اور رئیسوں کی طرح انگریزی حکومت باقاعدہ اور مستقل رسالے کے علاوہ بے قاعدہ رسالے بھی بھرتی کر لیتی تھی۔ یہ لوگ مستقل ملازم نہ سمجھے جاتے تھے۔ جتنی مدت تک ان سے کام لینے کی ضرورت ہوتی، گھوڑوں اور آدمیوں کی تنخواہ دے کر لیا جاتا۔ جب ضرورت نہ رہتی تو انھیں جواب دے دیا جاتا۔ بعض لوگ محض گھوڑے ملازم رکھوا دیتے اور کسی نگران کے ذریعے سے ان کی تنخواہیں لیتے رہتے۔

[2] شہزادے کو بتایا گیا کہ جو رقم ملی تھی، وہ انگریزوں نے اس بناء پر ضبط کر لی کہ یہ اس شخص کی ہے جو انگریزوں کا دشمن ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کوئی صورت پیش آئے، وہ انگریزوں اور اتمان زئیوں کی مخالفت سے بے پروا ہو کر میری امداد کریں گے۔ اس انتظام کے بعد میرے دماغ میں ایک ایسا نقشۂ عمل آیا جس پر کاربند ہو کر اصل مقصد کے لیے مؤثر طریق پر جدّ وجہد کی جاسکتی تھی۔ نقشہ یہ تھا کہ ستھانہ کے قریب پہاڑوں میں ایک مضبوط مورچہ قائم کرکے ارد گرد دہشت پھیلادی جائے۔

سری میں برج ستھانہ کے شمال میں جو نالہ منڈی یا ستھانہ کا نالہ کہلاتا ہے، اس کے اندر ایک نہایت محفوظ مقام ہے، جسے "سری" کہتے ہیں۔ شہزادے نے وہاں ایک مستحکم برج بنالیا اور اس میں اپنے تھوڑے سے بہادر و جانباز ملازموں کو متعیّن کردیا۔ کچھ مجاہدین بھی ان میں شامل ہوگئے۔

ستھانہ برباد ہو چکا تھا، اس کی اراضی میں کیا اور کھبّل کے اتمان زئی کھیتی باڑی کرتے تھے۔ برج کے مجاہدوں نے ایک روز اچانک ان پر یورش کردی اور ایک ہی ہلّے میں سات آدمی کیا کے اور بارہ آدمی کھبّل کے قتل کر ڈالے۔ اس کے بعد مار دھاڑ کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ اتمان زئیوں کے لیے نہ صرف ستھانہ بلکہ اس سے متصل کیا اور کھبّل کی اراضی میں بھی کھیتی باڑی کی کوئی صورت نہ رہی اور عام لوگ گھاس، لکڑی وغیرہ بھی لانے سے محروم ہوگئے۔ آخر انھوں نے خفیہ خفیہ شہزادے کو پیغام بھیج دیا کہ ہم ستھانہ کے املاک سے دست بردار ہوتے ہیں، آپ اپنے مزارعوں سے کاشت کرائیں اور پیداوار اپنی مرضی کے مطابق حاصل کرتے رہیں۔ اس طرح ستھانہ کی کُل اراضی واگزار ہوگئی، البتہ وہاں آبادی کا انتظام فوراً نہ ہوسکتا تھا۔ شہزادے نے آبادی کو حالات کی مزید سازگاری پر موقوف رکھا۔

ہزارہ پر ترکتاز ستھانہ جب آباد تھا تو اس کے علاقے میں سے گزرنے والے سوداگر سادات کو محصول دیا کرتے تھے۔ شہزادہ مبارک شاہ نے اپنی برادری کے تمام افراد سے وصول محصول کا حق لے لیا۔ اس طرح جو رقم ملتی تھی، وہ برجِ "سری" کے سپاہیوں اور مجاہدوں کے گزارے میں صرف کی جاتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں پوٹھوہار اور شمالی اضلاع پنجاب کے بڑے بڑے ڈاکو اور مفرور مجرم اس برج میں پناہ لینے لگے۔ وہ موقع پاکر نکلتے اور دریا عبور کرکے انگریزوں کے کیمپوں، چھاؤنیوں اور مراکزِ رسد پر چھاپے مارتے۔ سامان کے علاوہ گھوڑے، خچّر تک لوٹ لے جاتے۔

اتمان زئیوں نے اس ڈر سے اپنے مقتولین کی اطلاع بھی انگریزوں کو نہ دی تھی کہ شاید شہزادے سے خفیہ مصالحت کا راز فاش ہو جائے۔ اب انگریزوں نے خود باز پُرس شروع کی تو اتمان زئیوں نے جدونوں کو ملزم ٹھہرایا۔ انگریزوں نے جدونوں کی ناکا بندی کر کے جرمانہ بھی وصول کیا اور یہ عہد بھی لیا کہ وہ "سری" کے بُرج کو مسمار کر دیں گے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۶۱ء میں جدونوں نے بُرج مسمار کر دیا، تاہم ستھانہ کی اراضی سے شہزادہ بدستور متمتع ہوتا رہا[۱]۔

سرگند خاں کا قتل یاد ہوگا کہ ستھانہ پر انگریزوں کے حملے سے چند روز پیشتر اتمان زئیوں نے چڑھائی کی تھی، جس میں سید عمر شاہ شہید ہوئے تھے۔ اس چڑھائی میں سرگند خاں پیش پیش تھا بلکہ فخر یہ کہا کرتا تھا کہ سید عمر میری گولی سے مارا گیا۔ شہزادہ مبارک شاہ کے دل میں یہ بات کھٹک رہی تھی۔ اگرچہ سرگند خاں شہزادے کی والدہ کے قبیلے سے تھا اور شہزادہ اسے ماموں کہتا تھا، تاہم اس نے چچا کے قصاص میں اپنے آدمیوں کو بھیج کر سرگند خاں کو قتل کرا دیا۔ ساتھ ہی کیا کا ایک پٹھان مارا گیا۔ اب خود اتمان زئی دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ چاہتا تھا کہ شہزادے سے دوستانہ تعلقات استوار رکھے، دوسرے کی خواہش تھی کہ انگریزوں سے کہہ کر شہزادے پر یورش کرائی جائے۔ اس اختلاف کا طبعی نتیجہ یہ ہوا کہ حامیوں نے شہزادے کو لشکر کشی کی دعوت دے دی۔

شہزادہ مبارک اور سید محمود یہ صورت حال تھی جب سید محمود شاہ ملازمت سے دست کش ہو کر وطن پہنچے اور انھوں نے آبادیِ ستھانہ کے لیے جو درخواست دی تھی، اس کا ذکر شہزادہ مبارک شاہ سے کیا۔ شہزادے نے جواب دیا کہ ہم اپنے آزاد علاقے کے لیے انگریزوں سے امداد یا اجازت کے

---

[۱] کیا اور کھبل کے اتمان زئیوں نیز مسالار اور منصور جدونوں سے انگریزوں نے جو عہد لیا تھا، اس میں جہاں یہ ذکر تھا کہ سادات ستھانہ اور جماعت مجاہدین کو ستھانہ اور متعلقہ اراضی میں آباد نہ ہونے دیں گے، وہاں یہ ذکر بھی تھا کہ کسی ایسے شخص یا اشخاص کو اپنے علاقوں میں سے گزرنے نہ دیں گے، جو مجاہدین کے لیے روپیہ یا ہتھیار یا گولی بارود یا کوئی اور چیز لے کر جائیں گے۔ (مجموعۂ معاہدات و سندات مرتبہ ایچیسن جلد ۹ صفحہ ۷۴-۷۵ و صفحہ ۸۶-۸۷)

روادار نہیں ہو سکتے اور ہمیں قوّتِ بازو ہی سے اپنے معاملات کی روبراہی کے لیے کوشاں ہونا چاہیئے نیز میں نے اپنے چچا کے قصاص میں سرگند خاں کو مارا۔ اس وجہ سے اوتمان زئیوں میں تفرقہ پیدا ہؤا اور ایک گروہ ہماری کمک کا طلب گار ہے۔ اگر ہم اسے مدد دے کر اپنی سیادت بحال کر سکتے ہیں تو اس کے لیے انگریزوں کے پاس کیوں جائیں؟ نہ ستھانہ انگریزی علاقہ ہے، نہ کیّا اور کھبّل۔ غیروں کو اپنے معاملات میں حکم بنا کر ہم کب تک اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے ہیں؟

سیّد محمود شاہ کے لیے یہ صورتِ حال سراسر تعجب انگیز اور غیر متوقع تھی۔ چونکہ موجودہ منازعت کا آغاز ان کے والدِ ماجد کے قصاص سے ہؤا تھا، لہٰذا پسند ناپسند کا سوال بھی باقی نہ رہا تھا۔ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ بھتیجا، چچا کا قصاص لے اور بیٹا اس کے خلاف انگریزوں کے پاس آبادیٔ ستھانہ کی درخواستیں کرتا پھرے؟ چنانچہ سیّد محمود شاہ نے بھی اسی تجویز سے اتّفاق کر لیا اور اوتمان زئیوں پر لشکرکشی کا فیصلہ ہو گیا[1]۔

ملکا کی کیفیت یہ سب کچھ ہمیں اس غرض سے اختصاراً لکھ دینا پڑا کہ آیندہ واقعات سے سادات ستھانہ کا گہرا تعلّق ہے اور یہ حالات پیشِ نظر نہ ہوں تو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ انگریز کس وجہ سے مجاہدین و سادات کے مرکز ملکا کی تباہی کے لیے تیار ہوئے اور جنگِ امبیلہ کیوں پیش آئی؟ ورنہ ہمارا اصل موضوع سادات ستھانہ کی تاریخ نہیں بلکہ جماعت مجاہدین کی سرگزشت ہے۔

ملکا کی آبادی کا تھوڑا سا حال اس باب کے آغاز میں عرض کیا جا چکا تھا۔ مولوی عبد الحق آروی فرماتے ہیں کہ بادشاہوں کے ہاں دن میں پانچ مرتبہ نوبت بجائی جاتی ہے۔ ملکا میں نوبتیں نہ تھیں۔ مولانا عبد اللہ مجاہدین کے امیر بنے تو وہاں ہر گھر میں خدا کا ذکر ہوتا تھا اور اسی ذکر سے پوری آبادی معمور تھی:

چو اسلام را بر نگارد دبیر — بود پنج حرف، ایں سخن یاد گیر
مرکّب شد اسلام با پنج حرف — بنا آمدش پنج، اے نیک ظرف

---

[1] سادات کے متعلق زیادہ تر حالات سیّد عبد الجبار شاہ کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

خود آنجا ہماں پنج موجود بود ره ورسم راباب مسدود بود

یعنی اسلام پانچ حرفوں سے مرکّب ہے، اس دینِ حق کے ارکان بھی پانچ ہیں۔ بس یہی ارکان مدارِ عمل تھے۔ ان کی خوب پابندی ہوتی تھی۔ غلط اور غیر مشروع رسموں کا دروازہ بند تھا۔ پھر وہاں ہر قسم کا سامانِ جنگ مہیّا کیا جارہا تھا مثلاً بارود، گولے، گولیاں، توپیں، بندوقیں، بھالے، کمان، تیر، قرابینیں، تلواریں، گنڈاسے، ڈھالیں۔ اسلحہ خانہ جدا تھا، بزازی کا انبار جدا تھا، غلّے کا گودام الگ تھا۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو" غزائے بنیر" صہ ۳۴-۳۵ ۔

دوسرا باب

آبادیِ ستھانہ

جنگ امبیلہ کے اسباب اب ہم جنگ امبیلہ کے بالکل قریب آپہنچے ہیں۔ ضروری ہے کہ اب ان اسباب و احوال پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے، جنھیں انگریزوں نے اس جنگ کے موجبات قرار دیا، حالانکہ حق و انصاف کی بنا پر انھیں موجبات قرار دینے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

ہم بتا چکے ہیں کہ انگریزوں نے "سری" کا بُرج جدونوں کے ذریعے سے مسمار کرا دیا تھا، تاہم شہزادہ مبارک شاہ کو ستھانہ کی اراضی پر عملاً قبضہ مل چکا تھا اور بُرج جس مقصد کے لیے بنایا گیا تھا، وہ پُورا ہو چکا تھا۔ اب شہزادے کی توجہ دو باتوں پر مبذول تھی۔ اوّل یہ کہ سیّد عمر شاہ کے عہد کی طرح اتمان زئیوں سے مالیہ لے، دوم یہ کہ ستھانہ میں قلعہ بنائے اور آبادی کا انتظام کرے۔ اس نے اتمان زئیوں کی اطاعت کو ستھانہ کی آبادی پر مقدّم رکھا اور تدبّر کا تقاضا یہی تھا کہ پہلے ان لوگوں کو معین و رفیق بناتا، جن کی مخالفت کے باعث ستھانہ پر یورش کا راستہ صاف ہوا تھا، نیز جنھیں انگریزوں نے ستھانہ کو بے آباد رکھنے کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔

اتمان زئیوں سے خط و کتابت اُوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اتفاق سے اتمان زئیوں میں دو فریق ہو گئے تھے، جن میں سے ایک شہزادے کا سرگرم مؤیّد تھا۔ یہ صورتِ حال شہزادے کی تدبیروں کے لیے بڑی سازگار تھی۔ اس نے اپنے مشیروں کو جمع کیا۔ تمام حالات ان کے روبرو پیش کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ غور و فکر کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ اتمان زئیوں کے نام ایک مصالحانہ خط لکھا جائے۔ اگر اُس کی بنا پر معاملات کی رو براہی کا موقع پیدا ہو جائے، تو اچھا ہے ورنہ لشکرکشی کی تدبیر کی جائے۔ چنانچہ شہزادے نے اتمان زئیوں کے تمام اکابر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا کہ آپ لوگوں نے

مخالفت کا فتنہ کیوں اٹھایا؟ کیا آپ کو یاد نہیں کہ میرے والد نے بادشاہیِ سوات کے زمانے میں آپ کے لیے جاگیریں اور وظیفے مقرر کیے تھے؟ پھر میرے چچا سید عمر شاہ امارت ستھانہ کے زمانے میں آپ سے حسنِ سلوک کرتے رہے۔ میں نے بھی تمھارا کوئی نقصان نہیں کیا۔ بہتر ہے کہ میری نصیحت سنو اور پہلے کی طرح رفاقت اختیار کر لو۔ اگر اس پر راضی ہو جاؤ تو بہت اچھا ہے، ورنہ میرے لیے جنگ کے سوا چارہ نہ رہے گا۔

اتمان زئیوں نے اس کے جواب میں شہزادے کی بڑی تعریف کی۔ لکھا کہ آپ مومنوں کے سرتاج ہیں۔ مسلمانوں کے لیے آپ کی ذات تکیہ گاہ ہے۔ آپ کا عمل نیک ہے۔ دین کے خدمت گزار ہیں۔ یقیناً آپ ہی سرداری کے مستحق ہیں۔ ہماری غلطیاں معاف کیجیے اور ہمیں اپنے خدمت گزار تصور فرمائیے۔ برابر عُشر ادا کرتے رہیں گے[1]۔

کیا، کھبل پر پیش قدمی یہ جواب ان لوگوں کی طرف سے تھا، جو شہزادے کے رفیق تھے۔ جو افراد مخالف تھے، انھیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ شہزادے نے اب مناسب سمجھا کہ فوج لے کر کیا کھبل پہنچے اور وہاں کے انتظامات درست کر کے ستھانہ کی آبادی کے لیے تدابیر عمل میں لائے۔ انگریزوں کے بیانات سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ موسمِ گرما کا واقعہ ہے۔ سید عبدالجبار شاہ نے بالتصریح رقم فرمایا ہے کہ جولائی کا مہینہ اور برسات کا موسم تھا۔ دونوں بیانوں میں کوئی ایسا تفاوت نہیں کہ اسے بحث طلب سمجھا جائے۔ شہزادے نے لشکر تیار کیا اور روانگی سے پیشتر عجز و نیاز سے بارگاہِ باری تعالیٰ میں دُعا کی:

الٰہی! تُو دستگیر ہے۔ میں مصیبت زدہ ہوں، تُو مجھے سہارا دے۔ میں چیونٹی کی طرح عاجز و ناتوان ہوں، تو مجھے زور و قوت عطا کر۔ تُو ہی فریاد سننے والا ہے۔ تیرے سوا کسی کی یاوری پر بھروسا نہیں۔ الٰہی! جو لوگ مجھ سے سرتابی کیے بیٹھے ہیں، تُو اُن کے دل میں ندامت کا احساس پیدا کر دے تاکہ وہ پھر میرے رفیق بن جائیں اور رات دن میرے کاروبار کی بجا آوری میں مصروف رہیں۔

[1] "خزانۂ ضمیر" ص ۳۶ تا ۴۲۔

لشکر ستھانہ کے درے میں پہنچا تو بارش کے باعث اتنا پانی آیا ہوا تھا کہ گزرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ ناچار وہاں بیٹھ کر پانی کم ہونے کا انتظار کیا گیا۔ اس اثناء میں اتمان زئیوں کو لشکر کے آنے کی خبر مل گئی۔ جو لوگ شہزادے کے حامیوں میں سے تھے، وہ خیر مقدم کی تیاریاں کرنے لگے، جنھیں مخالفت پر اصرار تھا، وہ اہل و عیال اور سامان لے کر کشتیوں میں بیٹھے اور دریا عبور کر کے تربیلہ پہنچ گئے، جو کھبل کے سامنے انگریزی علاقے کا مشہور مقام ہے۔

سیّد عبدالجبار شاہ لکھتے ہیں کہ شہزادے نے کھبل کے شمال میں دریا کے متصل غازی شاہ کی پہاڑی پر ایک قلعہ تیار کرایا۔ اتمان زئی قوم نے اطاعت قبول کر لی، لیکن مخالف پارٹی کے لوگوں کے علاوہ بعض اتمان زئی ملک بھی کیا کھبل سے نکل کر تربیلہ چلے گئے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ واقعی شہزادے کے مخالف تھے یا اس وجہ سے سراسیمہ تھے کہ انگریزوں نے باز پرس کی تو کیا جواب دیں گے۔

انگریزوں کے پاس شکایتیں بیان کیا جاتا ہے کہ اسی زمانے میں ایک انگریز افسر دورے پر تربیلہ آیا ہوا تھا۔ اس نے کیا کھبل کے پناہ گزینوں کی شکایتیں سنیں اور حالت دیکھی تو بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اس نے حکومت کے پاس جو رپورٹ بھیجی، وہ خاصی مبالغہ آمیز تھی۔ پھر انھیں پناہ گزینوں نے اپنی فریاد کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے امب بھی قاصد بھیج دیے اور لکھا کہ کیا کھبل سے فارغ ہونے کے بعد شہزادے کا پہلا حملہ امب[1] پر ہوگا۔ نواب جہانداد خاں کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے فرزند نواب محمد اکرم خاں کی عمر صرف تیرہ چودہ سال کی تھی۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں نظم ریاست کی باگ ڈور تھی، وہ مذکورۂ بالا پیغام سے اس درجہ ہراس زدہ ہوئے کہ اپنا سب کچھ اٹھا کر نکلے اور دریا عبور کر کے دربند پہنچ گئے۔ انھوں نے بھی انگریزوں کو لکھا کہ ہماری حفاظت کا بندوبست ہونا چاہیے۔ اس طرح انگریزوں کو مداخلت کے لیے بظاہر معقول بہانہ مل گیا۔

---

[1] یہاں امب سے مراد امب قدیم نہیں، جو ستھانہ سے تین چار میل شمال میں ہے۔ طغیانی میں یہ امب برباد ہو گیا تو اس کی جگہ ایک چھوٹا سا موضع بن گیا اور امب کا مرکز حکومت بلوچ گڑھ میں منتقل ہو گیا جو امب قدیم سے تین میل شمال میں ہے۔ اسی کو عام لوگ امب کہنے لگے۔

انگریزی موقف کی حیثیت اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ یہ معاملہ ایسے علاقے کا تھا، جو مقرّرہ انگریزی حدود سے باہر تھا۔ وہاں مختلف قبیلے اور گروہ آپس میں جھگڑتے بھی رہتے تھے اور صلح بھی کر لیتے تھے۔ شہزادہ مبارک شاہ نے اگر کیا کھبل پر یورش کی تھی تو انگریز اصولاً یا اخلاقاً اس میں دخل نہ دے سکتے تھے۔ نیز امب والوں کے ہراس کے لیے تو کوئی بعید از خیال وجہ بھی موجود نہ تھی۔ کبھی ان سے لڑائی نہ کی تھی۔ خواہ مخواہ ایک فرضی ہوّا کھڑا کر کے فریاد و فغاں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

پھر معاملے کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ فرض کر لیجیے کہ شہزادے کا یہ اقدام درست نہ تھا، لیکن اُس سے حکومت انگلشیہ کے لیے کون سا خطرہ پیدا ہُوا تھا؟ انگریز صبر و تحمّل سے کام لیتے تو خط و کتابت اور نامہ و پیام کے ذریعے سے پناہ گزینوں کے لیے واپسی اور اہلِ امب کے لیے اطمینان و دل جمعی کا بندوبست کرا سکتے تھے، لیکن انھوں نے معاملات کو گفت و شنید سے سلجھانے کے بجاے جنگ کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے جنگ ہی کا ارادہ کیے بیٹھے تھے، البتہ انھیں انتظار تھا کہ کوئی اچھا بہانہ ہاتھ آ جائے نیز کون کہہ سکتا ہے کہ پناہ گزین انھیں کی شہ پر تربیلہ نہ آئے ہوں اور اہلِ امب انھیں کی انگیخت پر مہاجر بن کر دربند نہ پہنچے ہوں؟

ستھانہ میں قلعے کی تعمیر شہزادے نے کیا کھبل میں دفاعی انتظامات سے فراغت پائی تو ستھانہ کی آبادی پر توجہ کی۔ چونکہ تمام معاملات مصالحت سے روبراہ ہو چکے تھے، لہٰذا اس نے عفوِ عام کا اعلان کرا دیا اور کسی کے مال کو خفیف سا بھی نقصان نہ پہنچایا۔ اتمان زئی اس حسن سلوک سے بے حد خوش ہوئے۔ یہ دیکھ کر شہزادے نے ان سے کہا کہ اب ستھانہ کی آبادی کا انتظام بھی ہونا چاہیے۔ اتمان زئیوں کی تین شاخیں ہیں: الازئی، کنازئی اور اکازئی۔ قلعے کے چار پہلو ہوتے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ قلعۂ ستھانہ کے تین پہلوؤں کی تعمیر کا ذمہ یہ تین شاخیں اٹھائیں اور چوتھے پہلو کی تعمیر کا انتظام اہلِ برگ کریں، جو ستھانہ کے قریب پہاڑوں میں ایک مقام ہے، چنانچہ اسی تجویز کے مطابق قلعہ تعمیر ہوا اور ستھانہ کی آبادی کا بندوبست ہونے لگا۔

انگریزوں کی غلط بیانیاں انگریزوں نے اس واقعے کے متعلق جتنی بھی کتابیں لکھی ہیں،

اُن سب میں صورتِ حال کو سراسر غلط طریق پر پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ مجاہدین ملکا چلے گئے تھے۔ ۱۸۶۳ء میں انھوں نے ستھانہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ جدون اور اتمان زئیوں نے روکنے کی کوئی کوشش نہ کی، لہٰذا ان کی ناکابندی کی گئی، لیکن اس سے متوقع نتیجہ نہ نکلا۔ مجاہدین نے کھلم کھلا معاندانہ حرکتوں کا ارتکاب شروع کر دیا۔ ضروری ہو گیا کہ سرحد کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لیے مؤثر کوشش کی جائے[1]۔

۲۔ ۱۸۶۳ء کے موسم بہار میں قتل کی دو وارداتوں کی اطلاع ملی۔ پھر خبر پہنچی کہ مجاہدین نے یکایک ستھانہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ قبائل نے نہ محض انھیں روکنے کی کوشش نہ کی، بلکہ بعض نے اس قبضے کے لیے دعوت دی[2]۔

۳۔ ۱۸۵۸ء میں ستھانہ کی تباہی کے بعد مجاہدین ملکا چلے گئے۔ تین سال اطمینان سے گزار دینے کے بعد آس پاس کے علاقے کا امن خلل پذیر ہوا۔ برطانوی مقبوضات کے حواشی پر جو قبیلے آباد تھے، ان میں سے بھی بعض ان کے ساتھ شریک ہو گئے[3]۔

۴۔ مہم امبیلہ کا مقصد یہ تھا کہ ان مجاہدین اور آزاد قبیلوں کو سزا دی جائے، جو مدت سے ہمارے سرحدی اضلاع میں چھاپے مار رہے تھے[4]۔

۵۔ ۱۸۶۲ء میں مجاہدین کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ حکومتِ پنجاب کے لیے سرحدی جنگ کے مشورے کے سوا چارہ نہ رہا۔ جولائی ۱۸۶۳ء میں مجاہدین نے دیدہ دلیری سے ستھانہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور ہمارے ماتحت والیِ امب کو دہشت انگیز پیغامات بھیجے[5]۔

جو کچھ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں، کیا اس میں ہندوستانی مجاہدین کا کوئی ذکر ہے؟ بے شک مجاہدین شہزادے کے رفیق و معاون تھے، لیکن اتمان زئیوں پر لشکر کشی کا ذمہ دار صرف شہزادہ تھا اور یہ لشکر کشی اتمان زئیوں کی اکثریت کے حسبِ خواہش ہوئی تھی اور خاص اس سلسلے میں کسی کو کوئی جانی یا

---

[1] ہزارہ گزٹیئر ص ۱۶۸۔ [2] وائلی کی کتاب ص ۸۱۔ [3] نیویل کی کتاب ص ۵۰۔

[4] جان ایڈائی کی کتاب ستھانہ (تمہید)۔ [5] ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" ص ۱۸، ۱۹۔

مالی نقصان نہ پہنچا تھا۔ ستھانہ میں قلعہ تعمیر کرانے کا ذمہ دار شہزادہ تھا، لیکن انگریزوں نے خواہ مخواہ سارے معاملے کے لیے مجاہدین کو مجرم گردان لیا اور یہ تہمت بھی لگا دی کہ وہ والیِ امب کو دھمکا رہے تھے۔ بے شک وہ انگریزوں کے دشمن تھے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بے تکلّف تاریخی واقعات کا حلیہ بگاڑنا جائز سمجھ لیا جائے اور کسی بے سروپا اقدام کو درست ثابت کرنے کے لیے غلط بیانوں سے کام لیا جائے۔

ایک اور بیان جنگِ امبیلہ کے وجوہ و اسباب کی نسبت ایک اور بیان خاص توجہ کا محتاج ہے جو سیٹھی صاحب کے قلم سے پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل جرنل میں شائع ہوا تھا اور اس کی ترتیب میں حکومتِ پنجاب کے پرانے ریکارڈز سے استفادہ کیا گیا تھا۔ اس میں بعض نئی باتیں آگئی تھیں، مثلاً:

۱۔ شہزادہ مبارک شاہ اور مجاہدین نے والیِ امب کو بھی ایک دعوت نامہ بھیجا تھا، جس کا مضمون یہ تھا کہ ہر سچے مسلمان کو غیر مسلموں کا ساتھ چھوڑ کر دین کے لیے قربانیوں پر آمادہ ہونا چاہیے۔

۲۔ مجاہدین نے توپی کے انگریزی کیمپ پر ۳ ستمبر ۱۸۶۳ء کو چھاپا مارنے کی کوشش کی تھی۔ ملک عیسیٰ جدون ان کے ساتھ تھا، لیکن انگریزوں کو پہلے سے اطلاع ہوگئی تھی، لہٰذا دو جانوں کے سوا کوئی نقصان نہ ہوا۔

۳۔ چونکہ ابتدا میں سادات ستھانہ اور مجاہدین کا یہ خیال تھا کہ انگریز ستھانہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، اس لیے انھوں نے ستھانہ کے سامنے دریا کے دائیں کنارے پر دفاعی مورچے بنا لیے تھے۔ جب معلوم ہوگیا کہ انگریز ملکا پر پیش قدمی کے خواہاں ہیں تو اگرچہ سادات اور مجاہدین کی بڑی جنگی قوت ستھانہ سے ملکا کی طرف چلی آئی تاہم پہلے مورچے بدستور قائم رہے اور وقتاً فوقتاً نواگراں کی انگریزی چوکی پر گولیاں آتی رہیں[1]۔

---

[1] نواگراں ستھانہ کے عین سامنے دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ اسی گاؤں کے گھاٹ سے کشتی میں دریا کو عبور کرکے ستھانہ جاتے ہیں۔

۴۔ حملے کے متعلق انگریز افسروں کی تجاویز مختلف تھیں۔ رینل ٹیلر کمشنر کی رائے یہ تھی کہ ایک فوج جدونوں کے علاقے سے گزر کر ملکا پہنچے یا وہ راستہ اختیار کیا جائے جو ۱۸۵۸ء میں منگل تھانہ پہنچنے کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ دوسری فوج دریا کے دائیں کنارے سے بڑھے اور ستھانہ کے آس پاس دونوں فوجیں مل جائیں۔ پنجاب کے گورنر کی تجویز یہ تھی کہ فوج کے دو حصے مہابن پہاڑ کی دونوں سمتوں سے اس طرح بڑھیں کہ پہاڑ کو گھیرے میں لے لیں۔ مرکزی حکومت کا خیال یہ تھا کہ ستھانہ پہ توجہ بے شک مرتکز رہے، لیکن فوج کا بڑا حصہ منگل تھانہ اور ملکا کی طرف ایسے انداز میں پیش قدمی کرے کہ مجاہدین برندو ندی کی طرف نہ ہٹ سکیں۔ جنرل وائلڈ کی خواہش یہ تھی کہ جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے، اس میں مجاہدین کی تباہی کا مقصد خاص طور پہ پیش نظر رکھا جائے[1]۔

---

[1] پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل جرنل بابت دسمبر ۱۹۳۳ء، نیز ملاحظہ ہو جرنل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی بابت اپریل ۱۹۵۳ء۔

تیسرا باب

جماعتِ مجاہدین اور اخوند صاحب سوات

ڈاکٹر بیلیو کی رپورٹ اب آگے بڑھنے سے پیشتر یہ دیکھ لینا چاہیے کہ جنگ امبیلہ شروع ہونے کے وقت مجاہدین کی کیفیت کیا تھی۔ حُسنِ اتفاق سے ہمیں ایک ایسا بیان مل گیا ہے، جو اگرچہ اجنبی بلکہ مخالف ہے، تاہم اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے صحیح نتیجے پر پہنچنے میں ہمیں خاصی مدد مل سکتی ہے۔ یہ ڈاکٹر بیلیو کا بیان ہے، جس نے غالباً ۱۸۶۱-۶۲ء میں یوسف زئی علاقے کے متعلق ایک مفصل رپورٹ پیش کی تھی۔ یہ اگرچہ جنگ امبیلہ کے بعد ۱۸۶۴ء میں چھپی، لیکن مرتب اس سے پیشتر ہو چکی تھی، اس لیے کہ جنگ کے متعلق اس میں اشارہ تک موجود نہیں۔

عمومی کیفیت بیلیو لکھتا ہے کہ مجاہدین کی تعداد بارہ سو اور چودہ سو کے درمیان ہوگی۔ یہ لوگ تقریباً سب کے سب ہندوستانی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر بنگال خصوصاً ڈھاکہ اودھ، وسطی اور شمالی و مغربی صوبوں، نیز زیریں پنجاب کے ہیں۔ ان کا نصب العین یہ ہے کہ اسلام کو ہندوستان میں از سرِ نو پوری شان و عظمت سے قائم کر دیں۔ وہ اپنے موجودہ حلقۂ توطّن میں عین شریعت کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ انھوں نے فوجی تنظیم اختیار کر رکھی ہے۔ ان کے پاس ہتھیار بھی خاصے ہیں۔ دو چھوٹی توپیں بھی ہیں[1]۔

سیّد احمد شہید نے مجاہدین کو مختلف جماعتوں میں بانٹ دیا تھا، جن کے لیے الگ الگ سالار مقرر فرما دیے تھے۔ پھر ہر جماعت بیس بیس پچیس پچیس کی ٹکڑیوں میں منقسم تھی، جنھیں مجاہدین کی اصطلاح

---

[1] یوسف زئیوں کے متعلق عام رپورٹ (انگریزی) ص ۹۹۔

میں بھیلے کہتے تھے سیّد صاحب کے زمانے میں جماعتوں کی تعداد آٹھ سے متجاوز نہ ہوئی۔ ڈاکٹر بیلیو کا بیان ہے کہ مولانا عبداللہ کے عہد میں مجاہدین کی دس جماعتیں تھیں، جن میں سے نو ہندوستانیوں کی تھیں اور ایک مقامی اصحاب کی۔ ان کی تفصیل ذیل میں درج ہے :

دس جماعتیں

۱۔ جمعیت میاں عثمان جس میں ایک سو بیس مجاہد تھے۔ ان کے پاس بیس ڈوپی دار بندوقیں تھیں اور دس چقماقی ؛

۲۔ جمعیت مولوی شریعت اللہ، جو ڈیڑھ سو مجاہدین پر مشتمل تھی۔ ان کے پاس تیس ٹوپی دار بندوقیں تھیں، دس چقماقی اور توڑے دار۔ بہ لحاظ تعداد یہ سب سے بڑی جمعیت تھی ؛

۳۔ جمعیت عبدالغفور، اس میں ایک سو تیس مجاہد تھے۔ اس جمعیت میں تیس ٹوپی دار بندوقیں تھیں اور بیس توڑے دار۔ یہ خاص مولانا عبداللہ کی جمعیت تھی، لہٰذا اسے "سرکاری جمعیت" کہا جاتا تھا۔ یہ پوری کی پوری بنگالیوں پر مشتمل تھی ؛

۴۔ جمعیت قائم خاں، اس میں ایک سو تیس مجاہد تھے۔ ان کے پاس چھ ٹوپی دار بندوقیں تھیں اور بیس توڑے دار۔ مجاہدین کی یہ سب سے پرانی جماعت تھی اور اسے "ہندی جمعیت" کہا جاتا تھا، اس لیے کہ یہ صرف ہندوستانیوں پر مشتمل تھی ؛

۵۔ جمعیت نجف خاں، ایک سو تیس مجاہد، پندرہ ٹوپی دار بندوقیں اور بیس توڑے دار۔ اس میں نصف بنگالی تھے اور نصف ہندوستانی ؛

۶۔ جمعیت نعیم الدین، ایک سو پچیس مجاہد، چھ ٹوپی دار بندوقیں اور بیس توڑے دار۔ اس میں زیادہ تر بنگالی تھے ؛

۷۔ جمعیت منشی طفیل اللہ، ایک سو مجاہد، دس ٹوپی دار بندوقیں اور بیس

توڑے دار۔ یہ "نئی جمعیّت" کہلاتی تھی۔

۸ جمعیّت منشی بصیر الدّین، ایک سو مجاہد، چھ ٹوپی دار بندوقیں اور بیس توڑے دار۔

۹ جمعیّت مولوی ابراہیم، ایک سو تیس مجاہد، چار ٹوپی دار بندوقیں اور بیس توڑے دار۔

۱۰ جمعیّت بہرام الدّین بونیری، اس میں صرف چالیس مجاہد تھے اور ان کے پاس بندوق کوئی نہ تھی۔ اسے "دیسی جمعیّت" کہتے ہیں، جس میں ہزارہ، بونیر اور درمیانی کوہستانی علاقے کے باشندے شامل تھے[1]۔

تبصرہ ڈاکٹر بیلیو کا یہ بیان یقیناً کسی معتبر جاسوس کی فراہم کردہ اطلاعات پر مبنی ہوگا۔ سالاروں میں بعض آدمی ایسے ہیں، جن کا ذکر مقدمۂ انبالہ میں ایک سے زیادہ مرتبہ آیا۔ مثلاً جمعدار شریعت اللہ جو رام پور بلیا کے رہنے والے تھے، جمعدار نعیم الدّین جن کا وطن جیسور (بنگال) تھا، جمعدار نجف خاں جو ہندوستانی تھے اور مجاہدین کو قواعد کرایا کرتے تھے۔ جمعدار میاں عثمان ساکن بنگال، جمعدار مولوی ابراہیم، منشی طفیل اللہ یا طفیل علی[2]۔ مولوی بصیر الدّین مولوی فیّاض علی عظیم آبادی کا دوسرا نام تھا۔ بعض ایسے نام ترک کر دیے ہیں، جو جنگ امبیلہ کے سلسلے میں بہ طور خاص قابل ذکر تھے۔ مثلاً جمعدار ناصر محمد اور جمعدار کلیم الدّین جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا، لہٰذا ان معلومات کو مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔

اس حقیقت میں کوئی شبہہ نہیں کہ مجاہدین کے پاس ہتھیار زیادہ نہ تھے بلکہ سیّد صاحب کے زمانے میں بھی مختلف لوگ تلواروں، گنڈاسوں اور کلہاڑیوں سے کام لینے پر مجبور ہوتے تھے۔ تاہم بیلیو کے بیان میں ٹوپی دار، توڑے دار اور چقماقی بندوقوں کی جو کیفیت بتائی گئی ہے، وہ یقیناً نظر ثانی کی محتاج ہے۔ ایک اور نکتہ قابلِ توجّہ ہے اور وہ یہ کہ بندوقوں کی تعداد زیادہ فرض کر لینے کے باوجود یہ کتنا حیرت انگیز

---

[1] یوسف زئیوں کے متعلق عام رپورٹ (انگریزی) ص ۱۱۔

[2] روئداد مقدمۂ انبالہ (انگریزی)، ص ۶۱۔

[3] ایضاً ص ۷۳۔

واقعہ ہے کہ اتنے تھوڑے آدمیوں نے اتنے معمولی سامانِ جنگ کے ساتھ طویل مدت تک برطانیہ جیسی کثیرالوسائل حکومت کو خوفناک پریشانیوں میں مبتلا رکھا۔ اس سے مجاہدین کی ایمانی قوت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ یہ اسلامی تعلیم کا عملی نمونہ تھا، جو اِن بزرگوں نے مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کیا۔ سوچیے کہ اگر بارہ چودہ سو مسلمان بے سروسامانی کے باوجود قوت ایمان سے کام لے کر یہ دل افروز مناظر پیش کر سکتے تھے تو کروڑوں مسلمان اسلام کی پاک تعلیم کے عملی پیکر بن کر کیا کچھ نہیں کر سکتے تھے؟

بیلیو کی غلط بیانیاں بیلیو نے اپنی کتاب میں بعض ایسی باتیں بھی درج کر دی ہیں جو بداہتاً غلط ہیں۔ مثلاً وہ لکھتا ہے کہ:

۱ - مجاہدین اپنی اعلیٰ جنگی تنظیم کی بنا پر قبائل میں اپنی حیثیت بحال رکھ سکے اور وہ روپے دے کر کسی ایک فریق کو ساتھ ملا لیتے تھے۔

۲ - ان میں اکثر اَن پڑھ صنّاع اور مزدور تھے، جنھیں امام مہدی کی حکمرانی کے برکات کا فریب دے کر گھروں سے ہزاروں میل دُور پہنچا دیا گیا تھا۔ بعض مکّار و عیّار یا مجرم تھے، جو بھاگ کر یہاں پہنچ گئے تھے، البتہ بعض خالص مذہبی جذبے کی بنا پر ان میں شامل ہوئے تھے۔[1]

بلاشبہہ مجاہدین کی جنگی تنظیم کو مثالی حیثیت حاصل تھی، لیکن نہ قبائل پر اثر و رسوخ جنگی تنظیم کا نتیجہ تھا اور نہ مجاہدین کی سرگزشت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ قبائل پر انھیں لامتناہی اثر و رسوخ حاصل تھا۔ اِس کے برعکس وہ ہر نازک موقع پر قبائل کے ظلم و جور کا ہدف بنتے رہے، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔ ان کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ کسی پٹھان قبیلے کی حرصِ زر کے لیے سامانِ تسکین بہم پہنچا سکتے۔ باقی رہا دوسرا اعتراض تو یقیناً کسی جماعت کے تمام لوگوں کی ذہنی سطح یکساں نہیں ہوتی۔ بعض اصحاب کے قدم سیلِ ابتلا میں ڈگمگا بھی گئے، لیکن عام مجاہدین اپنے نصب العین اور اس کے حصول کے لیے ایثار و قربانی میں برابر قائم و استوار رہے۔

[1] یوسف زئیوں کے متعلق عام رپورٹ (انگریزی) ص ۱۰۱۔

اخوند صاحب سوات جنگ امبیلہ میں اخوند صاحب سوات کو بھی بڑی ممتاز حیثیت حاصل تھی، لہٰذا ان کے حالات بھی یہاں بیان کر دینا ضروری ہے۔ اخوند صاحب کا اسمِ گرامی عبدالغفور تھا۔ یہ سوات بالا کے ایک مقام جبڑی میں ۱۷۹۴ء کے آس پاس پیدا ہوئے۔ ان کے نسب کی بحث چھیڑنا غیر ضروری ہے۔ بہرحال وہ ایک غیر معروف گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ابتدا ہی سے طبیعت ذکر و فکر اور زہد و اتقا کی طرف مائل تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں گھر سے نکلے۔ کچھ مدت بدم گولہ (سوات) اور گوجر گڑھی (یوسف زئی) میں رہے۔ دو ڈھیر میں صاحبزادہ محمد شعیب سے بیعت کی۔ ہنڈ کے پاس بیکی میں دریائے سندھ کے کنارے بارہ سال ریاضتوں میں گزارے۔ سید احمد شہید سے بھی ملاقات کی اور اُن کے سرّی مشوروں میں شریک رہتے تھے۔ خادے خاں رئیس ہنڈ کو اخوند صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ سید صاحب کے عزم یورشِ اٹک کا راز اخوند صاحب کو معلوم تھا اور انھوں نے خانِ ہنڈ کو سید صاحب کا مخلص سمجھتے ہوئے یہ راز بتا دیا۔ خانِ ہنڈ نے سکھوں کو قبل از وقت خبردار کر دیا۔ اٹک کے جو مسلمان شہر اور قلعے کو مجاہدین کے حوالے کر دینے کی تیاریوں میں شریک تھے، انھیں خوفناک سزائیں جھیلنی پڑیں، اور پنجاب پر کامیاب اقدام کی سکیم ابتدائی مراحل ہی میں ناکام ہو گئی۔ اخوند صاحب کو اپنی اس نادانستہ حرکت پر اتنی ندامت محسوس ہوئی کہ بیکی سے نکل کر مدت تک روپوش رہے۔ غالباً سید صاحب کی شہادت کے بعد زیارتِ غلاماں میں ظاہر ہوئے۔ پھر کچھ دیر سلیم خاں میں رہے۔

امیر دوست محمد خاں کی امداد ۱۸۳۵ء میں امیر دوست محمد خاں نے پشاور کی بازیافت کے لیے سکھوں سے جنگ کا قصد کیا تو دوسرے دینی بزرگوں کے علاوہ اخوند صاحب سے بھی امداد کی درخواست کی۔ چنانچہ صاحب موصوف نیازمندوں کی خاصی بڑی جماعت کے ساتھ امیر کے پاس پہنچے اور امکانی مدد میں تامل نہ کیا۔ افسوس کہ امیر نے اس جنگ میں شکست کھائی۔ شکست کے بعد اخوند صاحب سوات چلے گئے۔ پھر سیدو (نزد منگورہ) میں اقامت اختیار کر لی جہاں ان کے گزارے کے لیے عقیدت مندوں نے زمینیں نذر کر دیں۔ وہیں نیکبی خیل کے قبیلۂ اکوزئی میں نکاح کیا، جس سے دو بچے پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۷ء میں وفات پائی۔ ان کی وجہ سے سیدو خاص شہرت کا مالک بن گیا اور آج کل سوات کا مرکزِ حکومت ہے۔ اخوند صاحب کے پوتے میاں گل عبدالودود نے سوات کی بادشاہی کا منصب حاصل کیا اور اب میاں گل کا صاحبزادہ جہاں زیب سوات کا حکمران ہے۔

چوتھا باب

جنگ امبیلہ کے مقدّمات

یورش کا فیصلہ بہرحال انگریزوں نے یورش کا فیصلہ کر لیا اور اس کے لیے سرگرمی سے تیاریاں شروع کر دیں۔ اس سلسلے کا ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ یورش کا فیصلہ پنجاب کے گورنر سر رابرٹ منٹگمری اور گورنر جنرل لارڈ ایلجن نے بطورِ خود کر لیا۔ سر ہیو روز[1] سپہ سالار کو اس مشورے میں شامل نہ کیا۔ جب اسے اطلاع دی اور اس نے بوجوہِ معقول تجویز سے اختلاف کیا تو اس کے اختلاف کو قابل توجہ نہ سمجھا گیا۔

یورش کا فیصلہ کرتے ہی ایک طرف تربیلہ سے دربند تک دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ فوجیں پھیلا دی گئیں، دوسری طرف سر رینل ٹیلر[2] کے زیرِ اہتمام ٹوپی اور مینئی میں لشکر کا اجتماع شروع ہو گیا، جو ہیو جیمس[3] کی جگہ پشاور کا عارضی کمشنر مقرر ہوا تھا۔ اس نے تمام خوانین کو جمع کر کے مشورے شروع کر دیے۔

ایک روز کمشنر مقامی خوانین اور فوج کو ساتھ لے کر ٹوپی سے کیا کھبل کی طرف روانہ ہوا تاکہ خود حالات کا معاینہ کرے۔ گیارہ باڑہ سے آگے آزاد علاقہ تھا۔ یہ لوگ بے خیالی سے اُس علاقے میں چلے گئے۔ شہزادے کے آدمیوں نے قلعے سے انھیں دیکھا تو مقابلے کے لیے نکل پڑے۔ یہ دیکھتے ہی کمشنر اور اس کے ساتھی پیچھے کی طرف بھاگے۔ اسمٰعیلہ کا خان آگے آگے جا رہا تھا۔ افراتفری میں اس کا گھوڑا دریا میں گر گیا، لیکن شہزادے کے آدمیوں نے اسے کوئی نقصان نہ پہنچایا۔

ستھانہ سے ملکا ابتدا میں انگریزی افواج کا اجتماع دیکھ کر یہی سمجھا جاتا تھا کہ ستھانہ پر حملہ ہونے والا ہے۔ لیکن خوانین اور قبائل سے کمشنر نے جو مشورے کیے، ان سے آشکارا ہو گیا کہ انگریزوں کی اصل منزلِ مقصود

---

[1] HUGH ROSE

[2] REYNELL TAYLOR

[3] HUGH JAMES

ملکا ہے۔ جب اس میں کوئی شبہہ نہ رہا تو شہزادے نے اتمان زئیوں کے رؤساء کو بلا کر کہہ دیا کہ اب ہم ملکا جاتے ہیں، آپ لوگ اطمینان سے بیٹھے رہیں۔ اگر ہم زندہ رہے تو خود آ کر سارا کاروبار سنبھال لیں گے، اگر اپنی آزادی کی حفاظت میں مارے گئے تو آپ کو حالات کے اعتبار سے جو کچھ مناسب نظر آئے، کر لینا۔ ہم اپنے بچاؤ کے لیے لڑ رہے ہیں۔ غیر کا پاؤں کسی کے گھر میں جم جائے تو نیکی اور حسنِ سلوک کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ اگر انگریزوں نے ہمارے کوہستانی علاقے پر جبراً قبضہ کر لیا تو گرد و پیش کے تمام مسلمانوں کی حیثیت کمزوری اور ناتوانی میں چیونٹیوں کی سی رہ جائے گی[1]۔

اقدام کی پہلی تجویز مولوی عبدالحق صاحب آروی نے اس سلسلے میں بعض ایسے حالات لکھے ہیں جو انگریزوں کی مرتب کی ہوئی کسی کتاب میں بیان نہیں ہوئے اور مولوی صاحب موصوف ان واقعات کے چشم دید گواہ تھے، لہٰذا سب سے پہلے یہ نئے حالات پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

موصوف فرماتے ہیں: کمشنر نے ابتدا میں خوانین کو اس امر پر مجبور کیا کہ جدونوں سے کہ کر ملکا تک جانے کی اجازت لے دیں۔ ٹوپی سے اوپر کا کوہستانی علاقہ سالار جدونوں کا تھا اور اس سے ملا ہوا بہ جانب مغرب منصور جدونوں کا۔ انگریزی فوجیں سالار جدونوں کے علاقے سے گزر کر آستانہ داروں کے علاقے میں پہنچ جاتیں جو جدونوں کے تابع تھے۔ اس سے آگے امازئی کا پرگنہ تھا، جس کا خان موزہ خاں والیِ امب کا دوست اور مواجب خور تھا۔ اس راستے سے ملکا پہنچنا نسبتاً سہل تھا، بہادر جدونوں کی دونوں شاخوں نے اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ہم غریب کاشتکار اور بے علم لوگ ہیں، لیکن کسی کی فوج کو اپنے علاقے میں داخل نہیں کر سکتے۔ دوسرے ہم مسلمان ہیں اور مسلمان بھائیوں کو برباد کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ خصوصاً شہزادہ ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کی آل ہے، ہم اسے اپنا سرتاج سمجھتے ہیں۔ کوئی اور راستہ تلاش کیجیے۔ ہمارے علاقے کا رخ کیا جائے گا تو ہم مقابلے پر مجبور ہو جائیں گے۔

شہزادے کے دفاعی انتظامات شہزادے نے ملکا پہنچتے ہی مولانا عبداللہ امیر مجاہدین کے

---

[1] "غزوۂ بنیر" ص ۷۵، ۷۶۔

مشورے سے یہ فیصلہ کر لیا کہ ستمہ کی طرف سے ملکا آنے کے جتنے راستے ہیں، ان سب کو ناقابلِ گزر بنا دینا چاہیے تاکہ اگر کوئی قبیلہ انگریزوں کو راستہ دینے پر آمادہ ہو جائے تو اس صورت میں بھی ملکا پہنچنا آسان نہ رہے۔ چنانچہ مقامی اور گرد و نواح کے گوجروں کو تاکید کر دی گئی کہ کلہاڑے لیں اور تمام پُرانے درخت کاٹ کاٹ کر جابجا راستوں میں ڈال دیں، نیز جہاں جہاں مناسب سمجھیں، خس و خار پھیلا دیں۔ تمام راستوں میں گہری خندقیں کھودنے کا انتظام بھی کر دیا گیا۔ غرض ضروری دفاعی انتظامات میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا گیا[1]۔

خوانین کی مجبوری انگریزی علاقے کے خوانین کمشنر کے احکام سے سرتابی نہ کر سکتے تھے۔ لیکن اُن سب کے دل ان تدابیر پر راضی نہ تھے، جو انگریز ملکا کی تباہی کے لیے اختیار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ مشوروں کے دوران میں دل کی باتیں بھی وقتاً فوقتاً کہہ جاتے تھے۔ ٹوپی کے رئیس فضل خاں اتمان زئی نے ایک روز کمشنر سے صاف کہہ دیا کہ آپ اتنی بڑی سلطنت کے مالک ہونے کے باوجود غریب کاشتکاروں کے پیچھے پہاڑوں میں کیوں دوڑتے پھرتے ہیں؟ اگر انھیں برباد کر دیا تو اس میں آپ کی کون سی عزّت اور نیک نامی ہوگی؟ اور اگر آپ نے شکست کھائی تو ساری دنیا میں بدنام ہو جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ ان سے اعراض کیا جائے[2]۔ کمشنر کو یہ رائے پسند نہ آ سکتی تھی، لیکن کرتا کیا؟ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ جدونوں کا انکار ان کے لیے شدید خطرات کا موجب تھا۔ ان کے متعدد دیہات انگریزی گولہ باری کی زد میں تھے، لیکن وہ خطرات سے بے پروا ہو کر انکار پر قائم رہے[3]۔

اقدام کی دوسری تجویز جدون راستہ دینے پر کسی بھی صورت راضی نہ ہوئے تو کمشنر نے ٹوپی کے بجائے صوابی کو مرکز بنا لیا۔ فیصلہ یہ کیا کہ خدّو خیل کے پرگنے میں سے چنگلئی، کن گلئی اور کوتل اشرف وغیرہ

---

[1] "غزائے بنیر" ص ۷۷ و ۷۸۔ [2] "غزائے بنیر" ص ۶۴ و ۶۵ و "کتاب العبرۃ" ص ۳۶۳۔

[3] سیّد عبدالجبار شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ انگریزی فوجیں تیار ہو کر جدونوں کے دیہات کی طرف بڑھیں، لیکن عین آخری وقت میں واپس ہو گئیں، اس لیے کہ جدون مقابلے پر تُلے بیٹھے تھے اور تیس پینتیس میل کا پہاڑی فاصلہ جس میں مسلسل چڑھائی تھی، لڑتے بھڑتے طے کرنا قرینِ مصلحت نہ تھا۔ ملاحظہ ہو "کتاب العبرۃ" ص ۳۶۵۔

ہوتے ہوئے ملکا پہنچیں۔ ۱۸۵۸ء کی جنگ میں انگریزی فوجوں نے پنجتار، چنگلئی اور منگل تھانہ کی تباہی کے لیے یہی راستہ اختیار کیا تھا۔ خدو خیل میں سڑک کی تعمیر بھی شروع کر دی اور چنگلئی میں رسد کے گودام بھی قائم کر دیے، جن میں اسلحہ، گولی بارود کے علاوہ اطراف سے غلّہ بھی فراہم کیا جاتا تھا۔ مجاہدین کے دستوں نے دفاع میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ جتنی سڑک بن جاتی، موقع ملتے ہی اُسے توڑ دیتے۔ ایک رات انھوں نے چنگلئی پر شبخون مارا۔ لوگوں سے کہ دیا کہ اگر تم انگریزوں کی رعایا ہوتے تو ہم تمھیں مجبور سمجھتے، لیکن تم آزاد علاقے کے رہنے والے ہو، پھر کیوں انگریزوں کا ساتھ دیتے ہو؟ اگر ان کے طرفدار بننا چاہتے ہو تو صاف صاف بتا دو۔ چنگلئی میں جو انگریزی کیمپ تھا، اسے بھی برباد کر ڈالا اور گوداموں کا جمع شدہ سامان بھی لُوٹ لیا۔ سیّد عبدالجبّار شاہ فرماتے ہیں کہ اخوند زادہ معراج دین ساکن برگ خود اس شبخون میں شریک تھا اور اس نے مجھے واقعات کی پوری تفصیل سنائی تھی۔ اخوند زادہ کو اس شبخون میں ایک دونالی رائفل ہاتھ آئی تھی، جو اب بھی موصوف کی اولاد کے پاس موجود ہے[۱] مجاہدین کے چھاپوں اور اہل خدو خیل کی ناسازگار روش کا اندازہ کرتے ہوئے کمشنر کو یہ تجویز بھی ترک کرنی پڑی۔

اقدام کی تیسری تجویز اب صرف ایک راستہ رہ گیا اور وہ وادیِ چملہ میں سے تھا۔ اس راستے کے سلسلے میں ضروری تھا کہ وادیِ چملہ اور بونیر کے باشندوں کا تعاون حاصل کیا جاتا اور یقین دلا دیا جاتا کہ مقصود ان پر یورش نہیں بلکہ ملکا پہنچنا اور مرکز مجاہدین کو تباہ کرنا ہے۔

اہل چملہ کو اطمینان دلانا مشکل نہ تھا، اس لیے کہ سمہ کے اکثر رؤساء و خوانین کے املاک وادیِ چملہ میں موجود تھے۔ مثلاً ہوتی، مردان، تورو، مایار کے کمال زئیوں، شیوہ، شیخ جانا، نواکلئی وغیرہ کے اژدوں، زیدہ، کنڈو، پنج پیر، مرغز، کھلابٹ، صوابی، مانیری، باجا بام خیل، سلیم خاں وغیرہ کے لوگوں کی اراضی چملہ کے مختلف دیہات میں تھیں[۲]۔ یہ تمام خوانین انگریزوں کے ساتھ تھے اور وہ خود اہل چملہ کو مطمئن رکھ

---

[۱] "کتاب العبرۃ" صفحہ ۳۶۶۔ [۲] چملہ میں اراضی یقیناً اس غرض سے رکھی گئیں کہ اگر کسی موقع پر میدانی علاقہ دشمن کی یورش کا ہدف بن جائے اور مقابلہ ممکن نہ رہے تو یہ لوگ میدانی علاقے سے اٹھ کر بہ اطمینان محفوظ پہاڑی وادی میں جا بیٹھیں۔ پرانے زمانے میں ایسے پہاڑی مقامات پر حملہ کرنا آسان نہ تھا۔

سکتے تھے، البتہ بونیر کا معاملہ خاص توجّہ کا محتاج تھا، جس کے لیے کمشنر نے سدم کے رئیس اعظم عجب خاں سے بات چیت شروع کی ۔

اہلِ بونیر سے بات چیت عجب خاں کے چھوٹے بھائی عزیز خاں کی شادی خانِ ڈگر کی بہن سے ہوئی تھی، جو بونیر کا سب سے بڑا رئیس تھا۔ اس وجہ سے عجب خاں کو خوانین بونیر احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس نے کمشنر کے کہنے پر زید اللہ خاں، حبیب خاں اور عصیم خاں عاشہ زئی، احمد خاں نسوزئی اور خانِ بگڑہ کو یہ کہہ کر راضی کر لیا کہ چملہ کا انتظام وہ خوانین کر لیں گے، جن کی اراضی اس وادی میں واقع ہیں۔ تمھاری طرف انگریزی فوج آئے گی ہی نہیں، پھر کیوں نہ روپیہ لے کر چپ چاپ بیٹھے رہو؟ انگریز وادیِ چملہ میں سے ہوتے ہوئے ملکا کو تباہ کریں گے۔ تمھاری آزادی پر کوئی زد نہ پڑے گی۔ چنانچہ تیرہ ہزار روپے دے کر انھیں راضی کر لیا گیا[1]۔

مولوی عبدالحق آروی کیا خوب فرماتے ہیں کہ خان بگڑہ نے جس کا نام احمد خاں تھا، حضرت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ چھوڑ کر فرنگی کے ساتھ دشت پیمائی شروع کر دی۔ حبیب خاں نے حبیبِ پاک صلعم کی محبّت کے بجائے رقیب کا دامن تھام لیا۔ عصیم آثم بن گیا[2]۔

خوانین کا لشکر بعض خوانین نے کمشنر کے سامنے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ہر خان اپنی حیثیت کے مطابق کم سے کم دس سوار اور چالیس پیادے فراہم کرے۔ یہ تجویز بھی منظور ہو گئی۔ اس طرح جو خاصا بڑا لشکر فراہم ہوا، اسے میدانی علاقے کے مختلف مقامات پر بٹھا دیا گیا اور کچھ آدمی انگریزی فوج کے آگے آگے چلنے کے لیے تجویز کر لیے گئے[3]۔ فوجوں کی روانگی کے ساتھ ہی انگریزوں نے خدو خیلوں، جدونوں، امازئیوں، مداخیلوں اور بونیر وال کے نام ایک اعلان شائع کیا جس کا مضمون یہ تھا کہ کسی قبیلے کو کوئی نقصان پہنچانا منظور نہیں۔ صرف ہندوستانی مجاہدین کے مرکز تک پہنچنا مقصود ہے۔ وہاں تک سیدھا راستہ وہی ہے جو وادیِ چملہ میں سے گزرتا ہے ۔

---

[1] "غزائے بنیر" صفحہ ۸۰ تا ۸۲ [2] "کتاب العبرت" صفحہ ۳۶۶، ۳۶۷ ۔ [3] "کتاب العبرۃ" صفحہ ۳۶۷ ۔

یہاں پھر ایک مرتبہ اس حقیقت پر غور کر لیجیے کہ "سری" میں بُرج بنانے یا ستھانہ کو آباد کرنے یا امان زئیوں کو زیرِ تصرف لانے کا ذمہ دار شہزادہ مبارک شاہ تھا، تاہم انگریزوں نے اس سلسلے میں جو اقدامات شروع کیے، ان میں مجاہدین کو اوّلین ہدف بنا لیا گیا، حالانکہ ان تمام سرگرمیوں میں ان کی حیثیت ثانوی تھی۔ وجہ یقیناً یہ تھی کہ شہزادے اور سادات ستھانہ کے خلاف کوئی کارروائی قبائل کے نزدیک پسندیدہ نہ ہو سکتی تھی۔ مجاہدین چونکہ اجنبی تھے، اور عام پٹھانوں کو جو قبائلی، نسلی اور خاندانی تعصبات میں ڈوبے ہوئے تھے، ہندوستانیوں سے کوئی خاص ہمدردی نہ ہو سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ برادری، قبیلے اور خیل کی محبت کے خوگر وسیع اسلامی مصلحتوں کو سمجھ ہی نہ سکتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں وہ بلندی، حوصلوں میں وہ ہمہ گیری اور دلوں میں وہ کشائش پیدا ہی نہ ہو سکتی تھی جب تک قبائلی اور نسلی تعصبات سے پاک نہ ہوتے۔

مجاہدین کا اعلانِ جہاد اب اس سلسلے کا صرف ایک ضروری واقعہ رہ گیا اور وہ اعلانِ جہاد تھا جو فارسی زبان میں مجاہدین کے امیر مولانا عبداللہ اور سید عمران شاہ ستھانوی کے دستخط سے خوانین اور اخوند سوات کے نام بھیجا گیا۔ اصل فارسی اعلان نہ مل سکا۔ مولوی عبدالحق نے اس کے صرف مطالب نظم کیے ہیں۔ نیویل نے اپنی کتاب میں اس کا انگریزی ترجمہ پیش کیا ہے۔ یہاں اس کا مفہوم اردو زبان میں پیش کیا جاتا ہے۔ حمد و ثنا اور سلام مسنون کے بعد مرقوم ہے:

> کفار کی ایک بڑی فوج اس غرض سے سلیم خاں، یاروسین اور شیخ جانا پہنچی ہے کہ اس ملک کو قتل و غارت کا ہدف بنائے۔ آپ کے لیے لازم ہے کہ اس اعلان کے دیکھتے ہی کمرِ ہمّت باندھ کر چملہ پہنچ جائیں۔ اپنے رفیقوں اور عزیزوں کو بھی اطّلاع دے دیں اور انھیں تیار کر کے ساتھ لائیں۔ ہم لوگ اپنی جمعیّت کے ساتھ درے کی چوٹی پر قدم جمائے بیٹھے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ سرپٹی[1] اور لنڈی یعنی موضع چنگلئی پر آ بیٹھیں اور مضبوط مورچے بنا لیں۔ ان ہدایات پر کاربند ہونے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ کریں۔ اگر

[1] سرپٹی اس پہاڑ کا نام ہے، جو چملہ کو خدو خیل سے جدا کرتا ہے۔

تاخیر ہوئی تو بدقماش کفّار سارے کوہستانی علاقے کو تباہ کر ڈالیں گے اور اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیں گے۔ خصوصاً چملہ، بونیر، سوات وغیرہ کے علاقوں کو (ہرگز نہ چھوڑیں گے) پھر ہمارا مذہب اور ہمارے املاک غیروں کے ماتحت چلے جائیں گے، لہٰذا حُبِّ اسلام، اصولِ ایمان اور دنیوی منافع کو پیش نظر رکھتے ہوئے موقع ہاتھ سے نہ دیں۔ کفّار بڑے عیّار اور دغاباز ہیں۔ وہ ہر ممکن فریب سے کام لے کر ان پہاڑوں میں آئیں گے۔ لوگوں پر ظاہر کریں گے کہ ہمیں تم سے کوئی سروکار نہیں، ہمارا جھگڑا صرف ہندوستانیوں سے ہے۔ ہم تمھیں کوئی آزار نہ پہنچائیں گے، بلکہ کسی کا بال بھی بیکا نہ ہونے دیں گے اور ہندوستانیوں کے استیصال کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ ملکی معاملات میں ہرگز دخل نہ دیں گے۔ وہ لوگوں کو روپے کا لالچ بھی دیں گے۔ آپ پر لازم ہے کہ ان کے فریب میں نہ آئیں، ورنہ وہ موقع پاتے ہی آپ کو بالکل تباہ کر دیں گے، دُکھ پہنچائیں گے، گوناگوں بے عزّتی کا ہدف بنائیں گے۔ آپ کی ساری دولت اور املاک ہتھیا لیں گے اور آپ کے دین کو تباہ کر ڈالیں گے۔ اُس وقت کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ ہم آپ کو بہ طورِ خاص متنبّہ کرتے ہیں[1]۔

اخوند صاحب کے نام خط

مولوی عبدالحق کے بیان سے مترشّح ہوتا ہے کہ عام اعلانِ جہاد کے علاوہ ایک خاص مکتوب اخوند صاحب سوات کو بھیجا گیا تھا، جس میں صاحب موصوف کی دین داری اور بزرگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ خدا نے آپ کو دنیا میں برتری عطا کی ہے۔ فرنگی جنگ کے ارادے سے فوج لے کر ہماری طرف آیا ہے۔ وہ مسلمانوں کی تخریب کے درپے ہے۔ دربند، تربیلہ اور امب میں بھی اس کے لشکر بیٹھے ہیں۔ والیِ امب اس کا فرمانبردار ہے۔ موزہ خاں امان زئی اس کے ساتھ اظہارِ اخلاص میں سرگرم ہے۔ ٹوپی اور مینئی کے رئیس بھی اس کے ہمراہ ہو گئے ہیں۔ جدونوں کو پیغامات

[1] یہ اُس اعلان کا ترجمہ ہے، جو احمد خاں رئیس نگرطہ کے نام تھا اور اس نے انگریزوں کے حوالے کیا۔

بھیجے جا رہے ہیں:

رفاقت نمودن بر تو ہست فرض ۔۔۔ بدانی کہ بر تست مانندِ قرض

نہ بر تو کہ بر کلمہ گویانِ کُل ۔۔۔ شدہ فرض بر دین جویانِ کُل

بہ آں شاہزادہ حمایت کنید ۔۔۔ بہ دینِ پیمبر رعایت کنید

کہ ایں ننگِ دیں مومناں را سزاست ۔۔۔ ز درگاہِ حق خود بہ نیکی جزاست

نیارند گر اہلِ اسلام ننگ ۔۔۔ بس از دستِ دشمن بگردند تنگ[1]

اخوند صاحب نے یہ مکتوب پڑھ کر فرمایا:

دریں وقت بے شک غزا ہست ایں ۔۔۔ چو شد شاہزادہ سرِ مومنیں

امارت بہ شہزادہ آمد درست ۔۔۔ کہ ہستند سادات سرا زنخست[2]

---

[1] "غزائے بنیر" ص۵۲ تا ۵۴ ۔ اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کی رفاقت نہ صرف آپ پر بلکہ تمام کلمہ گویاں اور دینِ حق کے خیر خواہوں پر فرض ہے ۔ آپ کو چاہیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی خاطر شہزادہ مبارک شاہ کی حمایت کریں ۔ دین کی عزّت کا پاس مومنوں کے لیے زیبا ہے ۔ خدا کی بارگاہ سے اس نیکی کی جزا ملے گی ۔ اگر مسلمان دین کی عزّت کا پاس نہ کریں گے تو دشمنوں کے ہاتھ سے سخت تکلیفیں اٹھائیں گے ۔

[2] ایضاً ۔ اس وقت بے شک مذہبی جنگ در پیش ہے ۔ شہزادہ مبارک شاہ مومنوں کا سردار ہے ۔ امارت اس کی مسلّم ہے اور سادات پہلے ہی سے سرداری کے منصب پر فائز چلے آتے ہیں ۔

پانچواں باب

جنگِ امبیلہ

(۱)

وادیِ چملہ یوں اُس جنگ کا آغاز ہوا، جو علاقۂ سرحد میں انگریزوں کے خلاف سب سے بڑی جنگ تھی۔ اس کے حالات بیان کرنے سے پیشتر وادیِ چملہ کی سرسری کیفیت بتا دینا ضروری ہے، جس میں امبیلہ گاؤں واقع ہے اور اس کی وجہ سے داخلے کا دروازہ "درۂ امبیلہ" کہلاتا ہے۔

چملہ ایک نہایت زرخیز اور سرسبز وادی ہے، جو پہاڑوں سے محصور ہونے کے باعث بہت محفوظ ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ چودہ پندرہ میل لمبی ہوگی اور چار میل چوڑی۔ بیچ میں ندی بہتی ہے، جس کا نام چملہ ہے اور وہ وادی کے مغربی گوشے سے شروع ہو کر مشرقی گوشے پر برندو ندی میں جا ملتی ہے، جو بونیر کو سیراب کرتی ہوئی آتی ہے اور انجام کار دریائے سندھ میں گرتی ہے۔

وادیِ چملہ کی جنوبی سمت میں وہ پہاڑی دیوار کھڑی ہے، جس کا نام سرپٹی ہے اور اسے کوہ مہابن کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے۔ شمالی سمت میں کوہ گڑو اسے بونیر سے جدا کرتا ہے۔ مشرقی سمت بھی ایک پہاڑی نے بند کر دی ہے، جس میں برندو ندی کے بہاؤ کے سوا کوئی دروازہ نہیں۔ مغربی سمت میں وہ درہ واقع ہے، جس کا نام امبیلہ ہے۔ پرانے زمانے میں کسی فوج کے لیے اس درے سے گزر کر چملہ میں پہنچنا آسان نہ تھا، اس لیے کہ درہ کم و بیش نو میل لمبا تھا اور قدم قدم پر ایسے موقعے تھے جہاں چند آدمی گھاٹ میں بیٹھ کر خاصی بڑی فوج کو روک سکتے تھے۔ خود وادی میں کُل بائیس گاؤں ہیں۔ ان میں سے بیشتر ان قبائل کے مملوکہ ہیں، جو یوسف زئی کے میدانی علاقے میں رہتے ہیں۔ کچھ اہلِ بونیر کی ملکیت ہیں۔ مثلاً امبیلہ گاؤں۔ میدانی علاقے کے لوگوں نے اس وادی میں ملکیتیں غالباً اس لیے ضروری سمجھی تھیں کہ جب

کوئی قوی دشمن میدانی علاقے پر دھاوا بولتا تو یہ لوگ بال بچّوں کو لے کر محفوظ مقام پر آ بیٹھتے۔ بڑے بڑے گاؤں یہ ہیں: سرپٹی کے ساتھ ساتھ لالو، کوگا، سُرہا، تنول ڈھیری، گُریا، مخزنئی، بیچ میں امبیلہ، ناواگئی، جنگئی، ڈھیری۔ وادی کے جنوب مشرق میں اصل مہابن پہاڑ ہے، جس پر ملکا واقع ہے۔ ملکا ہی پر حملہ جنگ امبیلہ کا اصل مقصد تھا۔ چملہ کے جنوب میں خدّوخیل واقع ہے۔ صرف کوہ سرپٹی کی دیوار دونوں کو جدا کرتی ہے۔

انگریزوں کی پیش قدمی

اب ہم سب سے پہلے جنگ امبیلہ کے متعلق وہ حالات بیان کریں گے جو انگریزوں نے مرتب کیے یا ان کی فراہم کی ہوئی معلومات کی بناء پر مرتّب ہوئے۔ حسنِ اتّفاق سے ہمیں اس بارے میں ایک ملکی مصنّف کی کتاب بھی مل گئی ہے، جو تمام حالات کا عینی شاہد تھا یا اس نے ہر چھوٹا بڑا واقعہ ان لوگوں کی زبان سے سنا تھا جنھوں نے جنگ میں نمایاں حصّہ لیا۔ انگریزوں کے بیان کردہ حالات پیش کرنے کے بعد ہم اس ملکی مصنّف کی کتاب کے مطالب تفصیلاً قلمبند کریں گے۔ اس طرح خوانندگانِ کتاب کو تمام حالات کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

انگریزی بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ فوج کے ہراول دستے نواکلئی میں جمع ہوئے تھے، لیکن بڑی فوج کا مقام اجتماع صوابی تھا اور انگریزوں کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ قبائل کو پیش قدمی کے راستے کا قبل از وقت علم نہ ہو سکے۔ گویا تیاری میں اخفا کا مقصد بہ طورِ خاص پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ ۱۸۔ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو بڑی فوج جنرل چیمبرلین کی سرکردگی میں صوابی سے روانہ ہوئی۔ اس کا ابتدائی رُخ درہ درہند کی طرف تھا، لیکن تھوڑی دُور جا کر اُس نے رُخ بدلا اور برمولئی کا قصد کر لیا۔ نواکلئی والی فوج بھی برمولئی پہنچ گئی اور درے میں پیش قدمی شروع ہو گئی[1]۔

---

[1] فوج کی تفصیلات نیویل اور وائلی کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہنٹر نے "ہمارے ہندوستانی مسلمان" کے حواشی میں بتایا ہے کہ پانچ ہزار ایک سو پچاس پیادہ فوج تھی، دو سو سوار، دو سو ہاتھی توپ خانہ، ایک ہزار کا جیش سول کمشنر کے ماتحت تھا اور تیرہ توپیں تھیں۔ اس کے علاوہ دربند، تربیلہ، ٹوپی، ایبٹ آباد، رستم، مردان وغیرہ میں بھی فوج مقیم تھی (صـ۲۲)۔ مقامی حمائتیوں کے دستوں کا شمار نہیں ہو سکتا۔

جنگی سکیم اور مشکلات جنگ کی ابتدائی سکیم یہ تھی کہ کرنل وائلڈ[1] کا دستہ سب سے پہلے چملہ پہنچ کر راستے کی دیکھ بھال کا انتظام کرے گا تاکہ فوج وادی میں پہنچے تو اسے ملکا کی جانب پیش قدمی میں انتظار نہ کرنا پڑے، لیکن یہ سکیم اس وجہ سے ملتوی کرنی پڑی کہ درے کے سفر میں بالکل غیر متوقع اور سخت مشکلات پیش آئیں، حتیٰ کہ ۲۰۔ اکتوبر کی آدھی رات تک باربرداری کا ایک بھی جانور موقع پر نہ پہنچ سکا۔ ایک رکاوٹ یہ پیش آئی کہ تقریباً اڑھائی سو بونیریوں نے جابجا مورچے قائم کر لیے اور پیش قدمی کرنے والی فوج پر آتش باری شروع کر دی۔ چنانچہ درے ہی میں ایک مقام پر فوج کا کیمپ قائم کر کے چوکی پہرے لگا دیے گئے۔

اب واضح ہو چکا تھا کہ چملہ میں سے گزرتے ہوئے ملکا پہنچنا اتنا سہل نہیں، جتنا ابتدا میں سمجھ لیا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ بونیر کے قبائل گرد و پہاڑ پر جمع ہونے لگے۔ ان کی موجودگی میں پیش قدمی کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ کسی وقت بھی حملہ کر کے فوج کی راہِ مراجعت منقطع کر دیتے اور اس کے لیے بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہ رہتی۔

نئے راستے کی تجویز مجاہدین اور سادات ستھانہ نے قبائل کے نام جو اعلان بھیجا تھا، اس نے پورے آزاد علاقے میں آگ لگا دی تھی اور ہر خطے سے لوگ جوشِ دفاع میں محاذِ جنگ پر پہنچنے لگے تھے۔ علاقہ سمہ کے خوانین انگریزوں کے زیرِ اثر تھے۔ چملہ و بونیر کے جن خوانین کو روپے دے کر رام کر لیا گیا تھا، وہ بھی چاہتے تھے کہ انگریزوں کا مقصد پورا ہو جائے، لیکن انھیں ہم قوموں کی مخالفت کا حوصلہ نہ تھا اور انگریزوں سے ملتے بھی تھے تو حد درجہ خفیہ خفیہ ملتے تھے تاکہ کسی پر یہ بھید کھل نہ جائے۔ چنانچہ چملہ و بونیر کے جو نمائندے ۲۲۔ اکتوبر کو انگریزوں سے ملے، انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ وادیٔ چملہ کے بیچ کا راستہ چھوڑ کر جنوبی راستہ اختیار کرنا چاہیے، جو کوگا کے پاس سے جاتا ہے اور پہاڑوں کے بیچ میں سے ملکا پہنچاتا ہے۔ انگریزوں کے لیے یہ راستہ اختیار کرنا بہت مشکل تھا۔ اندیشہ تھا کہ ان کی فوج پہاڑوں ہی میں تباہ ہو جاتی۔

بہر حال رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اگر فوج واپس بلا لی جاتی تو انگریزوں کی ہوا اکھڑ جاتی اور قبائل کے

[1] WILDE

حوصلے بڑھ جاتے۔ آگے بڑھنے کی بہ ظاہر صورت کوئی نہ تھی۔ رُک جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ قبائل کے جیش زیادہ جوش و خروش سے جمع ہونے لگے اور حالات لحظہ بہ لحظہ نازک سے نازک تر ہوتے گئے ؛

مجاہدین و سادات کے انتظامات | مجاہدین و سادات کو جب یقین ہو گیا کہ انگریز وادیِ چملہ سے پیش قدمی کا فیصلہ کر چکے ہیں تو انھوں نے جنوبی سمت کے خراب کیے ہوئے راستے درست کرا دیے۔ اس لیے کہ اُدھر سے یورش کا اندیشہ نہ رہا تھا۔ چملہ کی جانب کے تمام ضروری مقامات کی حفاظت کا بندو بست کر لیا۔ کچھ فوج سرپٹی کے مختلف مقامات کی حفاظت کے لیے متعین کر دی۔ باقی فوج لے کر امیر مجاہدین اور شہزادہ مبارک شاہ گڑو پہاڑ پر آ بیٹھے، جہاں بونیر، سوات، دیر، باجوڑ، کنڑ وغیرہ کے قبائلی لشکر جمع ہو رہے تھے۔ انگریزوں کو سب سے بڑھ کر اندیشہ یہ تھا کہ کہیں اخوند صاحب سوات مجاہدین کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ ہو جائیں۔ بونیر و سوات یا دوسرے خطّوں اور میدانی علاقے میں ان کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا۔ اخوند صاحب ہمہ گیر قبائلی ہیجان کو دیکھ کر خاموش نہ بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی موقع پر پہنچ گئے اور ان کی وجہ سے قبائلی جوش و خروش میں مزید تندی اور تیزی پیدا ہو گئی ؛

حفاظتی مورچے اور لڑائیاں | انگریزوں نے کیمپ کی حفاظت کے لیے دائیں بائیں کئی مورچے بنا رکھے تھے، جن میں سے دو بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہیں: ایک کیمپ کے دائیں جانب کا مورچہ، جس کا نام انگریزوں نے "ٹیلے[1] کا مورچہ" رکھا۔ دوسرا بائیں جانب کا مورچہ، جو "آشیانۂ عقاب[2]" کے نام سے موسوم تھا۔ ۲۲۔ اکتوبر کو انگریزی فوج کا ایک دستہ وادی میں اُتر کر کریا تک گیا جو تقریباً گیارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ واپسی میں اہلِ بونیر نے اس پر حملہ کیا اور بچاؤ کے لیے انگریزی رسالے کو پیش قدمی کرنی پڑی۔ "ٹیلے کے مورچے" اور "آشیانۂ عقاب" پر بار بار شدید خونریز لڑائیاں ہوئیں، یہاں تک کہ دونوں مورچے تین تین مرتبہ انگریزوں کے ہاتھ سے نکلے اور سخت جدوجہد کے بعد انھوں نے دوبارہ ان پر قبضہ کیا۔ انگریزی کیمپ پر بھی بار بار یورشیں ہوئیں۔ جب جنرل چیمبرلین کو یقین ہو گیا کہ آگے بڑھنا مشکل ہے تو

---

[1] CRAG PIQUET [2] EAGLE'S NEST

کیمپ کے لیے درے میں زیادہ اونچی جگہ تجویز کر کے فوج کو وہاں منتقل کر دیا گیا۔ قبائلی یورشوں میں انگریزوں کا سخت نقصان ہوا، بلکہ ایک موقع پر فوجیں واپس بلا لینے کی تجویز مکمل ہو چکی تھی، پھر وسیع مصلحتوں کے پیش نظر ملتوی کر دیا گیا۔ ایک یورش میں خود جنرل چیمبرلین بھی بری طرح زخمی ہو گیا۔ آخر اسے فوج کی کمان چھوڑ کر علاج کے لیے واپس آنا پڑا اور میجر جنرل گار ووک نے سپہ سالاری کا منصب سنبھالا۔

انگریزی سیاست کی کامیابی ادھر جنگ جاری تھی، اُدھر انگریزی سیاست بدستور قبائل میں تفرقہ انگیزی کی کوششیں کر رہی تھی۔ قبائل کی تربیت ایسی نہ تھی کہ وہ زیادہ دیر تک جنگ جاری رکھ سکتے۔ کشمکش جتنا طول پکڑتی گئی، قبائل میں انتشار کے امکانات اتنے ہی بڑھتے گئے۔ کمشنر نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنی سرگرمیاں بہت تیز کر دیں اور مختلف حیلوں بہانوں یا رشوتوں سے بعض قبیلوں اور بڑے بڑے خوانین کو ہم نوا بنا لیا۔ ان کے سامنے شرطیں یہ پیش کیں کہ کسی کو نقصان پہنچانا مقصود نہیں، صرف اتنا کافی ہے کہ ہندوستانی مجاہدین کو ملکا سے نکال دیا جائے اور اس آبادی کو برباد کرنے میں مدد دی جائے۔ چنانچہ کئی قبیلے اس پر راضی ہو گئے اور مقابلہ چھوڑ بیٹھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کے خلاف نبرد آزمائی کا جو طوفان جوش و خروش سے اٹھا تھا، وہ ٹھنڈا پڑنے لگا۔ جنرل گار ووک نے ۱۵۔ دسمبر کو فوج کے دو جیش تیار کیے اور لالو پر قبضہ کر لینے کے بعد اسے جلا دیا۔ وہاں سے امبیلہ پر یورش کی۔ یہ گاؤں بھی خالی ہو چکا تھا۔ اسے بھی جلایا۔ ان کامیابیوں نے قبائل کو صلح پر آمادہ کر دیا۔

صلح قبائل کی استقامت کا سب سے بڑا مرکز حضرت اخوند صاحب سوات تھے۔ انگریزوں نے ان سے بھی بار بار اپیلیں کیں کہ خونریزی کے امتداد سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ حکومت انگلشیہ کے وسائل بہت وسیع ہیں۔ مزید فوجیں آ جائیں گی اور قبائل ان کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ قبائل میں ایک گونہ پھوٹ پڑ چکی تھی، اس لیے کہ بعض خوانین ابتدا ہی سے انگریزی علاقے کے ہم قوموں کے ساتھ ساز باز کیے بیٹھے تھے۔ انھیں صرف عوام کے بے پناہ جوشِ مخالفت نے دم بخود کر رکھا تھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ جوش ٹھنڈا پڑ رہا ہے تو اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں اور خود حضرت اخوند صاحب کو بھی یہی مناسب نظر آیا کہ ملکا کی تباہی یا

GARVOCK

برائے نام تباہی پر راضی ہو جائیں۔ گفت و شنید کے بعد قرار پایا کہ اہلِ بونیر پیچھے ہٹ جائیں، ان کے خوانین میں سے بعض انگریز افسروں کی موجودگی میں ملکا کو تباہ کر دیں اور اس اثنا میں باقی خوانین بطور یرغمال انگریزوں کے پاس رہیں ۔

چنانچہ ۱۹- دسمبر کو چند انگریز افسر اور تھوڑے سے سپاہی خوانین بونیر اور بعض دوسرے رئیسوں کی ایک جماعت کے ہمراہ ملکا گئے اور اپنا مقصد پورا کر کے ۲۲- دسمبر کو واپس آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی فوج کی مراجعت شروع ہو گئی ۔

انگریزوں کا اندازہ ہے کہ اس جنگ میں دو سو اڑتیس افسر اور اہلِ فوج مقتول ہوئے، چھ سو ستر مجروح قبائلی مقتولین و مجروحین کا اندازہ تین ہزار کیا گیا[1]۔

مزید تفصیلات | رینل ٹیلر کے سوانح حیات میں بتایا گیا ہے کہ مندرجہ ذیل انگریز افسر ملکا گئے تھے: رینل ٹیلر، کرنیل ایڈ ٹی، کرنیل اے ٹیلر، میجر رابرٹس[2]، میجر جانسٹن اور لفٹننٹ کارٹر۔ ان کے ساتھ کچھ پٹھان سپاہی تھے، کچھ سکھ اور کچھ گورکھے۔ ۱۹- دسمبر کو روانہ ہوئے۔ شدید بارش کے باعث کربا میں رکنا پڑا۔ پھر چلے تو معلوم ہوا کہ امازئی قبیلے کے لوگ راستے میں جمع ہو رہے ہیں اور انھوں نے خدو خیلوں کو بھی امداد کے لیے بلا لیا ہے۔ اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ تھا کہ مزاحمت کا سروسامان کر لیا گیا ہے۔ خوانین بونیر نے نامہ و پیام سے انھیں ہموار کر لیا۔ ۲۱- دسمبر کی صبح کو ملکا پہنچ کر مکانوں کو آگ لگائی گئی۔ امازئیوں کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ ملکا کی آبادی کے ایک حصے کو آتش زنی سے بچا لیں تاکہ دوسرے قبیلوں کے روبرو دعویٰ کر سکیں خود انھوں نے اپنا حصہ محفوظ رکھا اور اسے گزند سے بچا لیا۔ رینل ٹیلر جو پوری کارروائی کی تکمیل کا ذمہ دار تھا، کوئی حصہ محفوظ چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔ سدم کے خان محمد عزیز خاں نے اس کی خواہش پوری کر دی۔ گویا پوری آبادی جلا دی گئی[3]۔

---

[1] نیویل کی کتاب ص۶۲۔ اس جنگ کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو وائلی کی کتاب ص۸۳ تا ۱۰۱۔ نیویل کی کتاب ص۵۰ تا ۶۲۔ رابرٹس کی کتاب "ہندوستان میں اکتالیس سال" ص۲۸۰-۲۹۳۔ ایڈ ٹی کی کتاب "ستھانہ"۔ یہ پوری کتاب اسی موضوع پر لکھی گئی ہے ۔

[2] بعد میں فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس ۔

[3] رینل ٹیلر کے سوانح حیات (انگریزی) ص۲۸۹-۲۹۱۔ اس سلسلے میں مقامی اصحاب کے بیانات آگے آئیں گے ۔

چھٹا باب

جنگ امبیلہ

(۲)

مقامی بیان اب ہم اس مرقّع کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو جنگ امبیلہ کے متعلق مولوی عبدالحق آروی نے "غزاے بنیر" کے نام سے منظوم صورت میں مرتب کیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے وہ جنگ امبیلہ کے عینی شاہد تھے۔ چونکہ اس جنگ کے حالات تفصیلاً جمع کر دینے کا ارادہ کر چکے تھے، اس لیے یقین ہے کہ انھوں شرکاے جنگ سے مل کر تمام واقعات کے متعلق خوب چھان بین کر لی ہوگی۔ لہٰذا ان کے بیانات کی صحت میں تامل کی کوئی وجہ نہیں۔ ان سے کم از کم مجاہدوں اور قبائلیوں کا نقطۂ نگاہ سامنے آجائے گا اور انگریزی بیانات کو بالمقابل رکھ کر صحیح صورت حال پر پہنچنے میں کوئی دقّت نہ رہے گی۔ جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، مولوی صاحب موصوف نے قبائلیوں کے کمزور پہلو نمایاں کرنے میں مداہنت سے کام نہیں لیا، لہٰذا ان کے پیش کردہ حالات زیادہ سے زیادہ مستند مانے جا سکتے ہیں۔

بارہ جوانوں کی مردانگی وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی فوج نے درے میں پیش قدمی شروع کی تو عجب خاں رئیس ستدم کے بھائی عزیز خاں[1] نے اہل امبیلہ کے پاس خفیہ پیغام بھیج دیا تھا کہ اپنی حفاظت کا بندوبست کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں مارے جاؤ۔ اکثر لوگ گھر بار اور بال بچوں کو سنبھالنے میں مصروف ہو گئے۔ دس بارہ نوجوان دوسروں کو اطلاع دیے بغیر کوتل پر پہنچ گئے جو امبیلہ سے دو اڑھائی

[1] یہ وہی عزیز خاں ہے جو رنیل ٹیلر کے بیان کے مطابق خوانین کے اس گروہ میں شامل تھا جسے انگریز افسروں کے ساتھ ملکا کو جلانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خوانین کی دورخی کا کیا حال تھا۔ وہ انگریزوں کا ساتھ دینے پر بھی مجبور تھے اور ان کے دل اپنے ہم قوموں اور ہم وطنوں کی دردمندی سے بھی خالی نہ تھے۔

میل کے فاصلے پر ہوگا تاکہ انگریزی فوج کا راستہ روک لیں۔ چاندنی رات تھی[1]، انھوں نے موزوں جگہیں تجویز کر کے مورچے بنا لیے۔ جب انگریزی فوج زد میں آئی تو ایک دم آتش باری شروع کر دی۔ وہ پہاڑ کے کے چپے چپے سے واقف تھے۔ کمال یہ کیا کہ ایک دو گولیاں چلاتے ہی ہر جوان دوڑ کر قریب کے دوسرے مورچے میں جا بیٹھتا اور بندوق سر کرنے لگتا۔ گویا دس بارہ نوجوانوں نے ایسی کیفیت پیدا کر دی کہ غنیم کو معلوم ہوا کئی سو آدمی گھات میں بیٹھے ہیں۔ اس حصے میں گھنا جنگل تھا اور نوجوانوں کو ایک مورچہ چھوڑ کر دوسرے میں جانے کے لیے کوئی دقت پیش نہ آتی تھی۔ صبح تک مقابلہ جاری رہا۔ روشنی ہونے لگی تو یہ لوگ واپس چلے گئے، لیکن انگریزی فوج کے لیے بے تکلف پیش قدمی کا ہر امکان زائل کر گئے۔

پہلی باقاعدہ لڑائی اس اثناء میں دولت زئی اور نوری زئی بونیریوں میں سے ستر اسّی آدمی اُس گلی میں پہنچ گئے، جو چملہ اور بونیر کے درمیان آمد و رفت کا راستہ ہے۔ جنوبی سمت میں کوگا کی جانب زرڑ قبیلے کے نوجوانوں کا ایک دستہ آ گیا۔ انگریزی فوج کے تیرہ سوار جن میں سے چار انگریز تھے، طلایہ گردی کے سلسلے میں کوگا پہنچے۔ گاؤں والوں نے کوئی مزاحمت نہ کی، لیکن وہ واپس ہونے تو ان پر ہر طرف سے آتش باری شروع ہو گئی۔ انگریزی توپیں بھی بروے کار آ گئیں اور پورا میدان آگ اور دھوئیں کے بادلوں سے ڈھک گیا۔ بونیریوں میں سے تین حقیقی بھائیوں نے تلواریں عَلم کیں، بجلی کی تیزی سے انگریزی فوج کے قلب پر حملہ آور ہوے اور تینوں شہید ہو گئے۔ باپ نے یہ سُنا تو وہ بھی جگر بندوں کی پیروی میں لڑتے ہوے شہادت سے سرفراز ہوا۔ اس گھرانے کی مردانگی دوسروں کے لیے مشعل راہ بن گئی۔ جو آتا، وہ دلیری سے حملہ کرتا اور غنیم کو مار کر خود شہادت پاتا۔ اس طرح بہت سے قبائلی شہید ہوے، لیکن انگریزی فوج کو پسپائی پر مجبور کر دیا اور ذاتی شجاعت کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ جو بھی کیفیت دیکھتا، جانبازی پر آمادہ ہو جاتا۔

---

[1] تقویم سے معلوم ہوتا ہے کہ جمادی الاولیٰ کی چھٹی یا ساتویں تاریخ تھی۔ گویا ان نوجوانوں نے رات کے ابتدائی حصے میں جا بجا مورچے قائم کر لیے تھے۔

کمشنر کی تدبیریں اب انگریز کمشنر نے خوانین پر زور ڈالنا شروع کیا کہ وہ چملہ سے جرگے بلائیں اور کار برآری کی کوئی صورت پیدا کریں۔ چنانچہ گوگا اور سُرہا کے تین ملک یعنی ملّا خاں، عبد اللہ اور فیروز پہاڑ کا چکر کاٹ کر خفیہ خفیہ کمشنر کے پاس پہنچے اور اپنی ارادت و اطاعت کا اظہار کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم مجبور ہیں، کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر اہلِ بونیر کا ساتھ نہ دیں تو ایک دن میں تباہ کر دیے جائیں۔ کمشنر نے انھیں بہت یقین دلایا کہ ہمیں نہ اہل چملہ سے کوئی کاوش ہے، نہ اہلِ بونیر سے۔ نہ کسی کے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی ایسا راستہ بتا دو کہ ہم ملکا پہنچ جائیں۔ اسے برباد کر کے واپس چلے جائیں گے۔ ملکوں نے وہ پہاڑی راستہ بتایا، جو لالو کے پاس سے چوٹی چوٹی ملکا جاتا ہے، لیکن جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، یہ راستہ اختیار نہ کیا جا سکتا تھا اس لیے کہ حد درجہ خطرناک تھا۔ کوئی بڑی فوج بھاری ساز و سامان کے ساتھ اس راستے جا نہ سکتی تھی اور تھوڑے آدمی بھیجے جاتے تو اندیشہ تھا کہ پہاڑوں ہی میں مارے جائیں گے۔ اس اثناء میں کمشنر نے مختلف خوانین کو میدانی علاقے میں جگہ جگہ متعیّن کر دیا تاکہ رسد کی بہم رسانی میں رکاوٹ پیدا نہ ہو، نیز میدانی علاقے سے مجاہدین کو کمک نہ مل سکے۔ چنانچہ رحمت خاں خٹک ابن طاؤس خاں اور محمد زمان خاں پولیٹیکل سُرکاوئی میں متعیّن ہوئے۔ امیر خاں، خوئند اد خاں اسمٰعیلہ، ابراہیم خاں زیدہ، مہابت خاں تورو کو شیر درے میں مامور کر دیا گیا۔ شہداد خاں رئیس ہنڈ کو لوند خوڑ اور سربلند خاں رئیس ہوتی کو پرمولئی بھیج دیا گیا۔ عجب خاں اور عزیز خاں کو خوانینِ بونیر سے بات چیت کے لیے اپنے پاس رکھا۔

شہزادہ اور مجاہدین کے انتظامات امیر عبداللہ رئیس مجاہدین اور شہزادہ مبارک شاہ نے بھی جلد سے جلد دفاعی انتظامات کر لیے۔ چنانچہ ایک جماعت اُس راستے کی حفاظت کے لیے بٹھا دی، جو لالو سے ملکا جاتا تھا۔ خُود بڑے لشکر لے کر میدان میں پہنچ گئے اور کاٹ گلہ کے مقام پر ڈیرے ڈالے۔ وہاں چملہ، بونیر اور دوسرے مقامات کے قبائلیوں کو بُلا کر جنگ کے متعلق مشورے کیے۔ فیصلہ یہ ہُوا کہ انگریزی لشکر کے مقابلے پر جو درے میں مقیم تھا، تین طرف مورچے قائم کر لیے جائیں اور ایک ایک مورچے میں مختلف قبیلوں کے آدمی بیٹھ جائیں۔ چنانچہ سیّد شاہ محمود (ابن سیّد عمر شاہ ستھانوی) سیّد اعظم اور

سید یوسف (ساکنانِ ناواگئی) کو جدونوں، خدوخیلوں، اما زئیوں اور علیشی زئیوں پر سردار مقرر کر کے انگریزی فوج کے دائیں جانب کوہ لالو پر بٹھا دیا گیا۔ اہلِ بونیر میں سے عائشہ زئی، گدائی زئی اور پنج پائی انگریزی فوج کے سامنے مورچے قائم کر کے جم گئے۔ سلار زئی، نوری زئی، دولت زئی اور چغرزئی لشکر جن کی تعداد پانچ ہزار سے کم نہ ہو گی، انگریزی فوج کے شمال اور مغرب میں کوہ گڑھ کو سنبھال لیا۔ مجاہدین سامنے کاٹ گلہ میں مقیم رہے۔ ان کے لیے روٹی ملکا سے آتی تھی اور بعض اوقات وہ لوگ کچھ کھائے پیے بغیر ہی گزارہ کر لیتے تھے۔

دوسری لڑائی قبائلیوں کی بہادری اور غیرت و حمیّت میں قطعاً کوئی شبہ نہ تھا، لیکن ان میں دو خرابیاں تھیں: ایک یہ کہ وہ منظم جنگ کی تربیت سے ناآشنا تھے، دوسرے بعض موقعوں پر بہادری کی نمایش میں بہترین جنگی مصلحتوں کو بھی نظر انداز کر جاتے تھے۔ چنانچہ غزوۂ بونیر کی دوسری جنگ میں اسی خرابی کے باعث انھیں ناحق نقصان اٹھانا پڑا۔ چغرزئی دیر سے میدانِ جنگ میں پہنچے تھے اور پہلی جنگ میں شریک نہ ہو سکے تھے، لہٰذا آئے تو جوشِ تہوّر میں سوچے سمجھے اور بات چیت کیے بغیر حملہ کر دیا۔ یہاں تک کہ ان سردارانِ لشکر سے بھی مشورہ نہ کیا، جو کوہ لالو کی جانب کے مورچوں میں مقیم تھے اور جن کی امداد کے بغیر چغرزئیوں کا حملہ نتیجہ خیز نہ ہو سکتا تھا۔ اس جنگ میں انگریزوں کا بھی سخت نقصان ہوا اور چغرزئیوں پر بھی شدید ضرب لگی۔ کوہ لالو کی جانب جو دستے مقیم تھے، وہ اچانک تیاری کے بغیر چغرزئیوں کی امداد کے لیے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ گھمسان کا رن پڑا جس میں سید اعظم ساکن ناواگئی نے شہادت پائی۔ کوہ لالو کی دو چوٹیاں ایک دوسری کے بالمقابل واقع ہیں۔ ان میں سے ایک چوٹی پر مجاہدین سید شاہ محمود کی سرکردگی میں ڈٹے رہے، لیکن دوسری چوٹی پر انگریز قابض ہو گئے۔ اس طرح کیمپ کے دائیں جانب انگریزوں کی دفاعی پوزیشن بہتر ہو گئی۔ اس کے بعد کم و بیش آٹھ نہایت خوفناک لڑائیاں ہوئیں، جن میں سے بعض کی کیفیت ہم سرسری طور پر بیان کریں گے اور آخری لڑائی کے حالات تفصیلاً بتائیں گے اس لیے کہ وہ براہِ راست مجاہدین سے تعلق رکھتی ہے۔

اخوند صاحب سوات کی طلبی اخوند صاحب سوات کو پہلے ہی اطلاع بھیجی جا چکی تھی۔

اب قبائل کی طرف سے تاکیدی خطوط ان کے پاس پہنچے۔ چنانچہ انھوں نے نفیر عام کا اعلان کر دیا اور حکم دے دیا کہ ہر شخص ہتھیار اور کھانے پینے کا سامان ساتھ لائے نیز جلد سے جلد موقع جنگ پر پہنچ جائے۔ اخوند صاحب کے رفیقوں میں عبدالرحمٰن کابلی معروف بہ "پاسنے بابا" بہت مشہور مقرر تھا۔ وہ جہاں تقریر کرتا آگ لگا دیتا۔ اخوند صاحب سیدو شریف سے اٹھے اور منگورہ پہنچ کر کچھ دیر قیام کیا۔ وہیں جمعہ کی نماز ادا کی۔ خطبہ دعوتِ جہاد پر مشتمل تھا جس میں صاف صاف اعلان کر دیا کہ اگر انگریز اس علاقے پر قابض ہو گئے تو میں ہجرت کر جاؤں گا۔ وہاں سے اٹھے تو بری کوٹ ہوتے ہوئے مقامِ جنگ پر پہنچ گئے۔ ان کی وجہ سے دُور دُور تک قبائل میں حرکت پیدا ہو گئی۔ مولوی عبدالحق آروی نے ایک ایک قبیلے، اس کی شاخوں اور خوانین کا مفصّل حال لکھا ہے۔ میں وہ تفصیلاً بیان کروں تو ان کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہو گی۔

تیسری لڑائی اخوند صاحب کی آمد سے پیشتر ہی انگریزوں نے ان مورچوں کی تسخیر پر توجہ کی، جو کیمپ کے بائیں جانب واقع تھے۔ چنانچہ انگریزی فوج مختلف پلٹنوں میں تقسیم ہو کر کوہ گڑو کے غازیوں پر حملہ آور ہوئی۔ ان میں بونیر کے غیور و جانباز بہادر مقابلے کے لیے موجود تھے۔ مثلاً پائندہ خاں، مندے نرے خاں، دیوان شاہ، قبط شاہ وغیرہ۔ انھوں نے شدید مقابلہ کیا۔ خود بھی بڑا نقصان اٹھایا، لیکن انگریزی پلٹنوں کا بھی صفایا کر دیا۔ ان غازیوں میں ایسے لوگ بھی تھے، جن کے پاس تلواریں تک نہ تھیں، اور انھوں نے خاردار درختوں سے موٹے موٹے ڈنڈے کاٹ لیے تھے۔ اس لڑائی میں تجلّی نور خاں بابوزئی اور ملّا غلام حسین نے بھی بڑی بہادری دکھائی۔ غازیوں میں ایک صاحب حلیم شاہ تھے، جن کا رنگ بے حد سرخ و سفید تھا اور آنکھیں نیلگوں۔ سرسری نظر میں وہ انگریز معلوم ہوتے تھے۔ ایک ہندوستانی مجاہد نے انھیں انگریز سمجھ کر پیچھے سے تلوار کا وار کیا۔ حلیم شاہ نے زخمی ہو جانے کے باوجود اس مجاہد کو بے تکلف معاف کر دیا۔ انگریزی فوج اپنا مقصد حاصل نہ کر سکی اور اہلِ بونیر نے مقابلے پر اپنے مورچے مستحکم کر لیے[1]۔

---

[1] غزوۂ بونیر، قلمی نسخہ ص ۱۳۸-۱۴۳۔ یہ "مشیانہ عقاب" کی مختلف لڑائیوں میں سے غالباً پہلی لڑائی کی کیفیت ہے۔

اخوند صاحب کی تشریف آوری | اخوند صاحب تشریف لے آئے تو آپ نے امبیلہ کی مسجد میں قیام اختیار کیا۔ وہیں امیر المجاہدین مولانا عبداللہ اور شہزادہ مبارک شاہ نے آپ سے ملاقات کی۔ صاحب موصوف اعلانِ عام کر چکے تھے کہ تسبیح و تہلیل، مسواک اور کلمے کے ذکر سے کہیں بڑھ کر آج یہ ضروری ہے کہ دشمن کا مقابلہ کرو۔ عصا چھوڑو اور تلوار ہاتھ میں لو۔ اس اعلان سے قبائل میں ایک عام حرکت پیدا ہو چکی تھی۔

مولوی عبدالحق فرماتے ہیں کہ مولانا عبداللہ نے اخوند صاحب کی خدمت میں پہنچتے ہی انتہائی دل فگاری سے عرض کیا: سب سے پہلے میرے عقائد سن لیجیے تاکہ میرا مذہب آپ پر واضح ہو جائے۔ چنانچہ عقائد سُن لینے کے بعد اخوند صاحب نے کہا کہ اب اور کسی شے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں اور ہر حال میں آپ کا خیر خواہ رہوں گا۔ محبت سے بغل گیر ہونے کے بعد فرمایا کہ آج میرے اور آپ کے ناموس پر حملہ ہوا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ مل کر انگریزوں سے جنگ کریں:

همان مولوی را امارت سپرد — که لائق به تو شد بدین دست بُرد
بگفتش تو هستی به هر سر امیر — بپویند پیشت صغیر و کبیر
نه پیچد سر خود ز حکم تو کس — تو هر دم به حکم خدا باش و بس
ازاں بر تو آمد امارت درست — که در جنگ داری تو آلات چست
ترا بس به هر باب کردیم امیر — دعاگوے باشم که هستم فقیر[1]

---

[1] "غزوات بنیر" ص ۱۴۲۔ پوری کیفیت کے لیے ملاحظہ ہو ص ۱۳۸-۱۴۲۔ اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ مولانا سے فرمایا: آپ سب کے امیر ہیں۔ آپ کے حکم سے کوئی سر نہ پھیرے گا۔ آپ خدا کے حکموں پہ چلتے رہیں۔ آپ کی امارت اس بنا پر درست ہے کہ آپ جنگ کے سروسامان سے بخوبی لیس ہیں۔ میں نے آپ کو امیر مانا۔ میں تو فقیر ہوں اور صرف دعا کرنا میرا کام ہے۔

ساتواں باب

جنگ امبیلہ

(۳)

عزم شبخون اخوند صاحب کی تشریف آوری کے بعد ان قبائل کے تازہ دم لشکر آ گئے، جو دریائے سندھ کے کنارے پر مقیم تھے۔ انھیں کوہ لالو پر عیسٰی زئیوں کی شکست کا حال معلوم ہوا تو اس داغ کو دھونے کے لیے فی الفور زبردست مجاہدانہ اقدام پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ باہم مشورے سے قرار پایا کہ انگریزی لشکر پر تین طرف سے شبخون مارا جائے۔ ایک طرف سے سوات کے اکوزئی بڑھیں، جن میں کنارۂ سندھ کے لوگ بھی شامل ہوں۔ دوسری طرف سے بونیر کے تمام جتھے حملہ آور ہوں۔ تیسری طرف سے مجاہدین کے دو جیش پیش قدمی کریں۔ چنانچہ یہ فیصلہ کر کے حضرت اخوند صاحب سے منظوری لی اور تمام لوگ تیاری کر کے اپنے اپنے ڈیروں میں مقیم ہو گئے۔

اکوزئی اور ان کے ساتھی آدھی رات کے بعد اٹھے اور چھپ چھپا کر انگریزی مورچوں کے قریب پہنچ گئے۔ انھیں حملے کے لیے اس امر کا انتظار تھا کہ ہندوستانی مجاہدین اپنی قرابینیں داغیں۔ دیر تک کوئی آواز نہ آئی تو وہ سمجھے کہ شبخون کی تجویز شاید ملتوی ہو گئی ہے۔ چنانچہ وہ چپ چاپ پیچھے ہٹے اور رات کی تاریکی میں اپنے ڈیروں پر پہنچ گئے۔ اس اثنا میں مجاہدین کے دو جیش نجف خاں جمعدار اور قائم خاں جمعدار کی سالاری میں تیمم سے نمازِ فجر ادا کر کے حملہ آور ہوئے اور ان کی قرابینوں کے شور سے پوری وادی گونج اٹھی۔ قرابینوں کی آواز سنتے ہی اکوزئی اور ان کے ساتھی بھی نعرے لگاتے ہوئے شیروں کی طرح میدانِ جنگ میں اتر آئے۔ ان میں سے الیاس خاں، عمارہ خاں، یوسف خاں اور فضل خاں سب سے پہلے انگریزی مورچوں میں پہنچے۔

چوتھی لڑائی | ان بہادروں نے بڑی مردانگی سے لڑائی شروع کی۔ قائم خاں جمعدار لڑتے لڑتے شہید ہوگیا۔ نجف خاں کی یہ کیفیت تھی کہ جس طرف رخ کرتا، دشمن کی صفیں چیرتا ہوا گھس جاتا اور انھیں درہم برہم کر دیتا۔ آخر وہ بھی شہید ہوگیا۔ باقی قابلِ ذکر شہداء میں سے حاجی خاں بامی خیل اور نور عالم مؤذن سیدو کے نام بتائے گئے ہیں۔ صلاح الدین میاں خیل ساکن ستھانہ سخت زخمی ہوا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے پر باقی لوگ واپس چلے گئے۔ مجاہدین میں سے ایک ایک نے میدانِ جنگ میں شہادت پائی۔ اس شبخون میں اہلِ بونیر نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور وہ چپ چاپ آرام کی نیند سوئے رہے۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس وعدہ خلافی کا سبب کیا تھا[1]۔

ایک ہراس انگیز آواز | چوتھی لڑائی کے بعد فریقین کے مورچے بدستور ایک دوسرے کے مقابلے پر قائم رہے۔ ایک روز اچانک کوہ گڑو کی چوٹی سے کسی نے پکار کر کہا کہ لوگو! اپنے آپ کو بچاؤ۔ انگریزی فوج درے سے نیچے اُترنے کا فیصلہ کر چکی ہے اور بڑے ساز و سامان سے حرکت میں آگئی ہے۔ یہ آواز سُنتے ہی تمام قبائلی سراسیمہ وار بھاگ نکلے۔ تھانہ کے چند خوانین نے امبیلہ پہنچ کر اخوند صاحب کو بھی ساتھ لیا اور بونیر کی جانب کے درے میں پہنچ گئے۔ گویا امبیلہ اور آس پاس کا علاقہ بالکل خالی ہوگیا۔

میرا خیال ہے کہ اس آواز کا انتظام ان خوانین نے کیا ہوگا، جو انگریزوں کے ساتھ تھے اور خفیہ خفیہ اپنے ہم قوموں سے بھی گفت و شنید کرتے رہتے تھے۔ اغلب ہے، وہ اہلِ بونیر میں سے بعض رؤساء کو ہم نوا بنا چکے ہوں۔ اسی وجہ سے بونیریوں نے وعدۂ شبخون کی خلاف ورزی کی اور اس پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ آواز خاصی کارگر ثابت ہوئی۔ اس سے قبائل کی بے ترتیبی روزِ روشن کی طرح آشکارا ہے۔

امیر المجاہدین مولانا عبداللہ، شہزادہ مبارک شاہ، سیّد شاہ محمود اور ان کے ساتھی بدستور اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے۔ اہلِ بونیر نے اخوند صاحب کو اس لیے گلی میں بٹھایا تھا کہ انگریز وادیِ چملہ میں سے ملکا تک کا راستہ مانگتے تھے اور اخوند صاحب گلی میں ہوں گے تو اُدھر کا رُخ نہ کریں گے اور بونیر محفوظ رہے گا۔

مولانا عبداللہ نے اخوند صاحب کے پاس پیغام بھیجا: "فرمائیے اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ ہم تو اپنا سر

[1] "غزوات ہبیرہ" (قلمی نسخہ) صفحہ ۱۴۳-۱۵۰۔

خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لیے ہندوستان سے آئے ہیں۔ دشمن کے مقابلے سے کیوں پیچھے ہٹیں؟ اگر آج ہٹ جائیں تو کل خدا کو کیا منہ دکھائیں گے؟ خدا کی راہ میں جان دے دینا سب سے بڑی نیکی ہے سر کی کیا پروا ہے۔ یہ بھی تو اُسی کا دیا ہوا ہے نا؟ اخوند صاحب نے جواب میں کہلا بھیجا کہ آپ بالکل درست فرماتے ہیں، لیکن یہ لوگ ٹھہر نہ سکے اور چند خوانین کے سوا سب بھاگ نکلے۔ پس آپ بھی ہمارے پاس آجائیں۔ چنانچہ مولانا اور شہزادے نے دامنِ کوہ میں مورچے قائم کر لیے اور اطمینان سے مقابلے پر جم گئے۔[1]

خانِ دیر اور انگریز اس اثناء میں غزن خاں والیِ دیر نے بھی اخوند صاحب کے پاس پیغام بھیجا کہ میں ہمہ تن تیار ہوں۔ استفسار کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ دیر اور سوات میں مدت سے لڑائیاں ہوتی رہی تھیں اور والیِ دیر کو اندیشہ تھا کہ شاید اخوند صاحب اس کی آمد کو مناسب نہ سمجھیں۔ اسی دوران میں انگریز کمشنر نے اخوند صاحب کو لکھا کہ آپ کیوں لوگوں کو ناحق قتل کرا رہے ہیں۔ برطانیہ کی طاقت بہت بڑی ہے۔ یہ غریب لوگ توپ و تفنگ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ آپ درویش ہیں۔ گوشہ نشینی اختیار فرمائیں اور ہم صرف ان مجاہدین کو ملکا سے نکالنا چاہتے ہیں، جن سے آپ کو بھی ہمیشہ اختلاف رہا۔ اخوند صاحب نے اس کے جواب میں لکھوایا کہ بے شک آپ بڑے زور آور ہیں، لیکن آپ سے بھی بالا تر ایک عادل اور قوی ہستی موجود ہے، جس نے اصحابِ فیل کو ابابیلوں سے تباہ کرایا۔ فرعون کو غرق کیا، نمرود کو مچھر سے ہلاک کرایا۔ بے شک میں فقیر ہوں، لیکن آپ کیوں فقیروں پر بار بار چڑھائی کرتے ہیں؟ یہ طرزِ عمل آپ کی شانِ حکومت کے سراسر خلاف ہے۔

مختلف لڑائیاں ساتھ ساتھ نفیرِ عام کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ آزاد علاقے کا کوئی بھی قبیلہ میدانِ جنگ سے باہر نہ رہا اور باجوڑ کے بہادر بھی آ پہنچے۔ انھوں نے اور دوسرے غازیوں نے پانچویں، چھٹی اور ساتویں لڑائی میں عظیم الشان کارنامے انجام دیے۔ مثلاً میاں کلئی کے ثناء اللہ اور خواجہ علی، جینڈول کے عباس خاں نے ایک لڑائی میں صرف اپنے ہم قوموں کی مدد سے انگریزوں کا مورچہ چھین لیا

---

[1] "غزوۂ بنیر" (قلمی نسخہ) صفحہ ۱۵۵ - ۱۵۱۔

اور اتنا سامانِ غنیمت ہاتھ لگا کہ غازی اسے اٹھا نہ سکے۔ ایک بہادر نے جوشِ شجاعت سے کمّل توپ کے مُنہ میں ٹھونس دیا۔ ایک لڑائی میں ادھیڑ عمر کی ایک خاتون کے کارنامے دیکھ کر بڑے بڑے بہادر انگشت بدنداں رہ گئے۔ انگریزی فوج کا ایک حصہ شکست کھا کر بھاگا اور ایک ٹیلے پر چڑھنے لگا، لیکن تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک آدمی گر گر کر ختم ہوتا گیا۔ چھ انگریز سپاہی درختوں کے جھنڈ میں ایک بڑے پتھر کے نیچے چھپ گئے۔ سوات میں ڈھیری جولاگرام نام ایک مقام ہے، جہاں کا باشندہ غلام محی الدین بےخبری سے ان میں جا شامل ہؤا۔ وہ سب اس سے لپٹ گئے۔ غلام محی الدّین نے پتّھر کا سہارا لے کر انھیں لاتوں سے پیچھے ہٹا دیا۔ پھر ساتھیوں کو آواز دے کر بُلایا۔ اُنھوں نے سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ سب سے زیادہ خون اس لڑائی میں بہا جسے مولوی عبدالحق نے جنگ امبیلہ کی چھٹی لڑائی قرار دیا۔

غزن خاں والیٔ دیر بھی فوج لے کر آگیا، لیکن عجیب بات یہ ہے، اس کی آمد مجاہدین کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکی بلکہ وہ خود بد دل ہوکر واپس چلا گیا۔ اس اثناء میں انگریزوں کے حامی خوانین نے اہلِ بونیر کو ہموار کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ انگریز کمشنر اپنی چالوں میں کامیاب ہؤا۔ قبائل آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے اور خود اکابر کو بھی احساس ہو گیا کہ صلح کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا۔

اصل مصیبت اصل مصیبت وہی تھی، جس کا ذکر ان صفحات میں بار بار آچکا ہے، یعنی قبائل غیر منظم تھے۔ ان میں حمیّت و شجاعت کی کمی نہ تھی، لیکن وہ زیادہ دیر تک جم کر مقابلہ جاری نہ رکھ سکتے تھے۔ اگرچہ مختلف خوانین نے بے توشہ غازیوں کے لیے لنگر جاری کر دیے تھے۔ مثلاً نخانہ کے خوانین محمد، حبیب، غلام، اسلم، میر محمد، عبّاس خاں، آصف خاں، خرّم سند خاں، رستم خیلوں میں سے شاہ نواز، سعادت، زرداد خاں، ماسم خاں، سمت خاں، سونیارے خاں، مہراللہ خاں، قدرت علی شاہ وغیرہ۔ لیکن وسیع منصوبہ بندی کے بغیر اتنے بڑے لشکر کے لیے کھانے پینے کا مستقل انتظام مشکل تھا۔ پھر ان خوانین میں کوئی تنظیمی صلاحیّت نہ تھی۔ اگر صلاحیّت ہوتی تو وہ آسانی سے ایسا بندوبست کر لیتے کہ پندرہ بیس ہزار کا لشکر مستقلاً موقع پر موجود رہتا۔ اتنے لشکر کے خورونوش کا انتظام مشکل نہ تھا۔ یہ دشمن کو روک سکتا تھا اور قبائلیوں کے کاروبار میں بھی کوئی خلل نہ پڑتا۔ خاص طور پر قابلِ غور امر یہ ہے کہ

قبائل میں صحیح دینی تعلیم نہ تھی، جس کے لیے سیّد احمد شہید نے کوشش شروع کی تھی، لیکن خود غرض خوانین نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ غرض وہ لوگ وقتی طور پر جوش میں آجاتے تھے اور دینی صداؤں سے متأثر بھی ہوتے تھے، لیکن مستقل دینی اور قومی کاموں کے لیے جس تربیت کی ضرورت تھی، وہ ان میں موجود نہ تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قیمتی جانی قربانیوں کے باوجود وہ انگریزوں کی مزاحمت میں بہ قدر آرزو کامیاب نہ ہو سکے اور انگریز بالکل ابتدائے کار میں مصالحت کی جو شرطیں پیش کر رہے تھے، اب اکثر لوگ انھیں کی طرف مائل ہونے لگے۔ جو خوانین انگریزوں کے ساتھ تھے، وہ بھی اپنے نقطۂ نگاہ کی اشاعت کرتے رہتے تھے، جن خوانین نے انگریزوں سے روپیہ لے رکھا تھا، وہ بھی سرگرم کار تھے۔ تمام اسباب و محرکات نے مل کر انگریزوں کے مقاصد کی تکمیل کا سامان فراہم کر دیا۔

آٹھواں باب

مجاہدین کی شانِ جانبازی

انتشار کی کیفیت قبائل میں انتشار کی سرسری کیفیت یہ ہے کہ اہل بونیر کے متعلق اُسی وقت سے گوناگوں وسوسے پیدا ہونے لگے تھے، جب انھوں نے امبیلہ کو چھوڑ کر چملہ اور بونیر کے درمیان درے میں مورچے لگائے تھے۔ اس کا مطلب صاف لفظوں میں یہ تھا کہ وہ اصل مقصد (چملہ سے انگریزوں کا گزرنا) سے دست بردار ہو چکے ہیں یا کم از کم اس سے چنداں دلچسپی باقی نہیں رہی اور اب صرف یہ چاہتے ہیں کہ انگریز بونیر کا رُخ کریں تو اُن سے لڑیں۔ وہی سب سے پہلے میدانِ جنگ میں اُترے تھے۔ امبیلہ انھیں کی ملکیت تھا۔ باقی قبائل کی حیثیت ان کے معاونوں اور ہمدردوں کی تھی۔ مالک ملکیت سے بے پروا ہو جائیں تو اُن کے معاون کب تک قائم و استوار رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ صواتی اور دوسرے قبائل بھی پیچھے ہٹتے گئے، صرف مجاہدین اور ساداتِ ستھانہ باقی رہ گئے۔

امیر المجاہدین کا فیصلہ اب تنہا امیر المجاہدین پر پیش قدمی کی ذمہ داری آپڑی۔ انھوں نے اپنی جانباز جماعت میں سے سو سو کی دو جمعیتیں منتخب کیں۔ ایک کا سپہ سالار ناصر محمد کو بنایا، دوسری کا کلیم الدین کو اور حکم دیا کہ وہ راہِ حق میں قربانی کا عملی نمونہ ان ہزاروں مسلمانوں کے سامنے پیش کریں جو باوجود کثرت تعداد میدان چھوڑ کر الگ ہو رہے تھے۔ واضح رہے کہ یہ شجاعت و مردانگی کی نمایش نہ تھی، اس کا مدعا یہ بھی نہ تھا کہ دنیا پر واضح ہو جائے، مجاہدین اپنے امیر کے حکم پر کس طرح جانیں دے دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اصل غرض یہ تھی کہ شاید قربانی کا عملی نمونہ اُن مسلمانوں میں اسلامی جانبازی کا جذبہ بیدار کر دے، جو تماشائیوں کی حیثیت میں پہاڑ کی اونچی دیوار پر کھڑے تھے۔ زبانی دعوت کا وقت نہ تھا، عملی دعوت کا موقع آگیا تھا۔ امیر المجاہدین نے اس کا بھی انتظام کر دیا۔ امبیلہ کے میدان میں راہِ حق

کے ان مجاہدوں نے جو نمونہ دکھایا، اس کی مثالیں تاریخ کے صفحات پر بہت کم یاب ہیں۔ اللہ تعالیٰ امبیلہ کی خاک کے ذرّوں، کوہ گڑو کے پتھروں اور قریبی جنگل کے درختوں کو گویائی کی قوت عطا کر دے تو وہی یہ خونچکاں داستان احسن طریق پر سنا سکتے ہیں ؎

تقریر اور دُعا امیر المجاہدین نے ان دو سَو جانبازوں کو انگریزوں کی بے پناہ قوت کے مقابلے میں کھڑا کر کے تقریر کی کہ بھائیو! ہر مجاہد کا جسم زخموں سے لالہ زار بن جانے والا ہے، لیکن تم جانتے ہو کہ ہمارے چمن کی یہ بہار ہمیشہ تازہ رہے گی۔ دشمن جنگ کے لیے آیا ہے، اس کے مقابلے سے ہٹنا ہمارے لیے گناہ ہے۔ تمھارے جسموں کا ایک ایک ٹکڑا بھی کٹ جائے تو پروا نہ کرو۔ دشمن کو پیٹھ دکھانا ہمارے لیے زیبا نہیں۔ تم جس آزمایش میں پڑنے والے ہو، اس کی ہولناکیوں سے میں ناواقف نہیں، لیکن تمھیں معلوم ہے کہ لوہا جب تک آگ میں پگھل نہیں جاتا، اس سے جنگی ہتھیار نہیں بن سکتے ؎

اس کے بعد حضرت امیر نے بارگاہ باری تعالیٰ میں دعا کی کہ الٰہی تو جہانوں کا کارساز ہے۔ تیرے سوا ہم کسی کی پناہ نہیں ڈھونڈتے۔ زور اور قوت تیرے ہاتھ میں ہے۔ ہم ناچیز مسکین کیا کر سکتے ہیں؟ تو غریبوں اور بیکسوں کا مددگار ہے۔ تیرے سوا کسی سے یاوری کی امید نہیں۔ اس جنگ میں صرف تیری مدد درکار ہے۔ یہ مجاہد صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ تو ہی اپنی رحمت سے انھیں زور اور قوت بخش سکتا ہے۔ تُو نے مومنوں کے لیے نصرت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ مالک! دشمنانِ دین پر ہمیں فتح عطا کر۔ میں ان غریب الوطن بیکسوں کو تیرے حوالے کرتا ہوں۔ یہ سب تیری راہ میں جان کی قربانی پیش کریں گے۔ اگر ملکی فوج ہمارا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں تو ہمیں کیا پروا ہے؟ اس کارزار میں فقط تُو ہمارا مددگار ہے"

پھر مجاہدین سے خطاب کرتے ہوئے کہا: بھائیو! اللہ تعالیٰ تمھارا مددگار ہو۔ وہی پاک ذات تمھارے لیے کافی ہے۔ میری طرف سے سلام قبول کرو۔ تم اس میدان میں رہ کر وہ فرض بجا لاؤ جو خدا نے تمھارے ذمے عائد کر رکھا ہے ؎

تمام مجاہدوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اگر ہم سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہو تو معاف فرما دیجیے۔ امیر نے بہ آوازِ بلند کہا کہ میں نے خدا کے لیے ہر خطا معاف کر دی، تم بھی میری خطاؤں کو

معاف کر دو۔ یہ کہتے ہی باقی ساتھیوں کو لے کر امیر صاحب ذرا بلندی پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ ملکیوں میں سے بھی کوئی میدان میں باقی نہ رہا۔ صرف دو سو کی یہ جماعت باقی رہ گئی، جس کی حق آئینی اس میدان میں آفتاب عالم تاب سے بڑھ کر درخشاں تھی ۔

حشر آفریں منظر مجاہدین اگرچہ دشمن کے مقابلے پر بہت تھوڑے تھے، تاہم وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح استوار کھڑے تھے۔ انگریزی فوجیں نمودار ہوئیں تو مجاہدین نے پہلے ایک باڑ ماری۔ پھر ہر طرف سے توپیں اور بندوقیں آگ اُگلنے لگیں۔ پورا میدان دھوئیں سے تیرہ و تار ہو گیا۔ مجاہدین نے تلواریں علم کیں اور دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ ان کی مثال وہی تھی، جیسے پروانے شمع پر گرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :

نہ ترسد مجاہد ز توپ و تفنگ　　　برد خویشتن را بہ میدانِ جنگ
چو بلبل کند قصد گلزار را　　　فراموش کند سختیِ کار را
چو بیند رخِ شمع پروانہ زار　　　بسوزد تنِ خویش دیوانہ وار
تو دیوانہ گوئیش، دیوانہ　　　کہ آگہ نہ از ذوقِ پروانہ
خدا ہر کرا مایۂ عقل داد　　　بکوشد بہ مال و سر اندر جہاد[۱]

بہر حال مجاہدین نے راہِ حق میں اس طرح جانیں دیں کہ اخوند صاحب سوات کوتل پر بیٹھے اس منظر کی تاب نہ لا سکے اور بے قراری سے اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ ہر ایک سے کہتے کہ جاؤ اور ان بہادروں کی امداد کرو۔ کبھی ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے :

الٰہی بدہ فتح اسلام را　　　بکن غرق خصمِ بد انجام را

---

[۱] مجاہد توپ اور بندوق سے کبھی نہیں ڈرتا۔ وہ ہر خوف سے بے پروا ہو کر میدانِ جنگ میں پہنچتا ہے۔ بلبل جب باغ کا قصد کرتی ہے تو ہر سختی بھول جاتی ہے۔ پروانہ شمع کا رخِ روشن دیکھتا ہے تو اپنے آپ کو دیوانہ وار اس کی آگ میں جلا دیتا ہے۔ تو اسے دیوانہ کہتا ہے تو سمجھ لے کہ تو خود دیوانہ ہے، اس لیے کہ پروانے کے ذوق سے تجھے قطعاً آگاہی نہیں۔ خدا جسے عقلِ سلیم کی نعمت دیتا ہے وہ مال و جان سے خدا کی راہ میں جہاد کے لیے کوشاں رہتا ہے ۔

لیکن ان ہزاروں غیور مسلمانوں میں سے کسی کو بھی امتحان گاہ میں پہنچ کر جانبازی کا حوصلہ نہ ہؤا، البتہ شہزادہ مبارک شاہ اٹھا اور اپنے بھائی سیّد شاہ محمود سے بات چیت کرکے اپنے ملازموں کے ساتھ میدانِ جنگ میں چلا گیا۔ چونکہ سارا میدان دھوئیں کے تاریک بادلوں میں مستور تھا، اس لیے کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ کس کا کیا حال ہؤا۔ شہزادہ اور سیّد محمود محفوظ رہے، البتہ مجاہدین سب کے سب شہادت سے سرفراز ہوئے۔ افسوس کہ اس بے مثال قربانی سے دعوتِ جہاد کو مؤثر بنانے کی جو غرض پیشِ نظر تھی، وہ پوری نہ ہوئی، تاہم مجاہدوں نے اپنے خونِ حیات سے امبیلہ کے میدان میں جو نقش مرتسم کیا تھا، وہ زمانے کی گردش سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا اور انشاء اللہ تا قیامت محفوظ رہے گا۔

انگریزوں سے بات چیت خانِ دیر اور اہلِ بونیر ہمّت ہار چکے تھے۔ باقی قبائل پر بھی افسردگی طاری ہو چکی تھی، لہٰذا یہی بہتر سمجھا گیا کہ بات چیت سے معاملہ طے کر لیا جائے۔ چنانچہ تمام خوانین کی رائے اور اخوند صاحب کی رضامندی سے یہ قرار پایا کہ انگریزوں کے کچھ آدمی نمایندگانِ خوانین کے ساتھ ملکا جائیں اور ایک دو مکان جلا کر واپس آ جائیں۔ شہزادہ مبارک شاہ نے یہ کیفیت دیکھی تو صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے کچھ نہ کہا، البتہ اپنے چچا سیّد عمران شاہ کو جنھیں ملکا کا منتظم بنایا گیا تھا، پوری کیفیت لکھ بھیجی کہ بال بچّوں اور ضروری سامان کو محفوظ مقام پر پہنچا دیں۔ امیر المجاہدین نے مولوی فیّاض علی کے نام اسی مضمون کا خط ارسال کر دیا۔

ملکا کا جلایا جانا مشہور یہی ہے کہ ملکا کے ایک دو مکان جلائے گئے۔ انگریزوں کا بیان ہے کہ پوری آبادی کو برباد کیا گیا۔ سیّد عبدالجبار شاہ فرماتے ہیں:

> ملکا ہماری اپنی ملکیت ہے اور ہم کو صحیح علم ہے کہ ایک گھر یا چھپّر بھی نہ جلایا گیا۔ جن اہلِ بونیر نے انگریزوں کو فاتح بنانے میں بڑی امداد دی تھی، وہی مانع ہوئے۔ وہ کہتے تھے کہ ملکا کا جلنا ہماری ذلّت ہے۔ ایک کوٹھے کے شہتیر کو آگ سے جھلسنے کی کوشش کی گئی، اُسے بچا لیا گیا اور انگریزی فوج ملکا تک جا کر واپس آ گئی۔

مجاہدین کا انتظام چغرزئی قوم کا ایک مَلک ہاشم علی خاں اخوند صاحب سوات کا مخلص مرید تھا۔

صاحب موصوف نے امیرالمجاہدین کا ہاتھ ہاشم علی خاں کے ہاتھ میں دے کر فرمایا: "یہ میری امانت ہے۔ اس کی خیانت کو میری خیانت سمجھنا"۔

چنانچہ ہاشم علی خاں نے پرگنہ چغرزئی میں بدہال کی طرف گلونو بوڑی (کشتِ گل یا پھولوں کا کھیت) نام ایک گاؤں مجاہدین کے لیے وقف کر دیا، جہاں انھوں نے کئی سال گزارے۔ زخمی مجاہدین کو بھی وہیں پہنچانے کا انتظام کر دیا گیا۔

گنج شہیداں | شہداء کو میدانِ جنگ ہی کے ایک گوشے میں دفن کیا گیا۔ امبیلہ گاؤں کے پیچھے چیڑ کے درختوں کا ایک جھنڈ ہے۔ اسی جگہ مجاہدین کا قبرستان ہے۔ کہتے ہیں کہ انجیر کے درخت کے پاس ایک بڑی ڈھیری ہے، جسے گنج شہیداں سمجھنا چاہیے:

در آں دائرہ سر مجاہد نہاد — دو لک آفریں بہر مرد باد
چو قبلہ نماید سرِ ہر شہید — سوے قبلہ می شد بہ حکم مجید
تو گوئی کہ آں کشت گلزار شد — بہ خونِ شہیداں چو گلنار شد[1]

جس مقام پر اخوند صاحب سوات کا قیام تھا، وہاں ایک کچی مسجد بنا دی گئی تھی۔ موجودہ حکومت سوات نے اس جگہ ایک پختہ اور شاندار مسجد تعمیر کرا دی ہے۔

امبیلہ کی جنگ میں کم و بیش چار سو مجاہدین جاں بحق ہوے۔ ان میں دو سو وہ تھے جنھوں نے ناصر محمد اور کلیم الدین کی سالاری میں تنہا انگریزی قوت کا مقابلہ کیا۔ سید عبدالجبار شاہ ستھانوی نے ان کی کیفیت بیان کرتے ہوے لکھا ہے کہ یہ لوگ صابر و شاکر، ہر وقت ذکرِ خدا میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے پہرے دار ایک دوسرے کو آواز دیتے تو ایسے انداز میں "سبحان اللہ" کا نعرہ بلند کرتے کہ جو یہ

---

[1] مجاہدوں نے اس میدان میں اپنے سر قربان کر دیے۔ ہر صاحب حوصلہ پر دو لاکھ بار آفریں۔ ہر شہید کا سر قبلے کا پتہ دے رہا تھا۔ شہادت کے بعد خدا کے حکم سے ان سب کے سر قبلہ رو ہو گئے۔ وہ میدان گلزار بن گیا، شہیدوں کے خون نے اسے انار کے پھول جیسا بنا دیا۔

نعرہ سنتا، اس کا دل تڑپ اٹھتا۔ دوسرا پہرے دار جواب میں کہتا: "الحمد للہ"۔ تیسرا پکارتا: "یرحمکم اللہ"۔ چوتھا جواب دیتا: "یہدیکم اللہ"۔

یہ جماعت ذات باری تعالیٰ کے عاشقوں کی جماعت تھی۔ ان کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ خدا کی راہ میں قربان ہو جائیں۔ اگر کسی کو میدانِ جنگ میں شہادت کی عزت نہ ملتی تو وہ اسے اپنی کم نصیبی سمجھتا۔ یہ وقتی جوش کا معاملہ نہ تھا بلکہ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ اسْتَقَامُوْا کے مطابق انھوں نے اسی دُھن اور شوق میں اپنی عمریں گزار دیں اور ہر قسم کے مصائب بہ طیب خاطر قبول کر لیے۔ مثلاً غربت، مسافرت، بھوک، سردی، گرمی، زمین پر سونا، ضروریاتِ زندگی سے محروم رہنا وغیرہ۔

لشکروں کا معاملہ اندازہ کیا گیا ہے کہ چیمبرلین کے ساتھ کُل سات ہزار فوج تھی، لیکن مقامی بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ دس ہزار کے لیے حسن ابدال کے پاس کیمپ تیار کیا گیا تھا۔ انگریزوں کے حامی خوانین و قبائل کے لشکر ان کے علاوہ تھے۔ ہنٹر نے ایک نوٹ میں قبائلی لشکر کی تعداد پچاس اور ساٹھ ہزار کے درمیان بتائی ہے۔ سیّد عبدالجبّار شاہ ذاتی معلومات کی بنا پر ہنٹر کے تخمینے کو نادرست قرار دیتے ہیں۔ ذیل میں وہ نقشہ درج کیا جاتا ہے، جس سے ہنٹر اور سیّد عبدالجبّار شاہ کا اندازہ واضح ہوتا ہے:

نمبر شمار	نام قبیلہ	ہنٹر کا تخمینہ	سیّد عبدالجبّار شاہ کا صحیح تخمینہ
۱	حسن زئی	دو ہزار	تین ہزار
۲	اکا زئی	ایک ہزار	سوا ہزار
۳	مدا خیل	چار ہزار	تین ہزار
۴	امازئی	ڈیڑھ ہزار	ڈیڑھ ہزار
۵	جدون	چار ہزار	پانچ ہزار
۶	خدو خیل	دو ہزار	اڑھائی ہزار
۷	چغرزئی مع عزّی خیل وغیرہ	چھ ہزار	چار ہزار

۸	قبائل بونیر	بارہ ہزار	بارہ ہزار
۹	اہل باجوڑ	تین ہزار	تین ہزار
۱۰	رانی زئی	دو ہزار	تین ہزار
۱۱	اہلِ دیر	چھ ہزار	دس ہزار
۱۲	قبائلِ صوات	دس ہزار	سولہ ہزار
	میزان =	۵۳۵۰۰	۶۴۲۵۰

پانچواں حصّہ
ہندوستان کے اندر
مقدّمے اور قیدیں

پہلا باب

عظیم آباد کے تین خاندان

تین خاندان عظیم آباد کے تین خاندان تھے، جن کے زیادہ تر ارکان سیّد احمد شہید سے وابستہ ہوئے اور ان اصحاب نے وابستگی کے تقاضوں کو جس للّٰہیت اور اخلاص سے پورا کیا اور جیسی عظیم الشان قربانیوں کی توفیق بارگاہِ الٰہی سے پائی، اس کی کوئی مثال ہمارے دورِ زوال کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ تینوں خاندانوں کو عظیم آباد میں اوّل درجے کی امیری کا رتبہ حاصل تھا۔ وہ سب کے سب پشتوں سے انتہائی فارغ البالی اور راحت و آسایش کی زندگیاں بسر کر رہے تھے، لیکن سیّد صاحب سے وابستگی کے بعد ان سب کے طرزِ حیات میں بنیادی تغیر پیدا ہوگیا اور انھوں نے اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی کیفیت ذیل میں درج ہے:

۱۔ شاہ محمد حسین نتھو پوری کا خاندان جو حضرت عباسؓ عمِّ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی نسل سے تھے۔ ان کے تھوڑے سے حالات "جماعتِ مجاہدین" میں درج ہو چکے ہیں۔

۲۔ مولوی الٰہی بخش کا خاندان جس کا سلسلۂ نسب حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے چچیرے بھائی حضرت جعفرؓ طیّار سے ملتا ہے۔ اس بزرگ کے فرزندوں نے ہندوستان میں دعوت و تنظیمِ جہاد اور فراہمیِ زر و مجاہدین کے اہم کام جس اعلیٰ پیمانے پر انجام دیے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ بعض افراد میدانِ جہاد کی جانفشانیوں میں بھی حصہ دار بنے۔

۳۔ مولوی فتح علی کا خاندان جن کا سلسلۂ نسب حضرت زبیرؓ عمِّ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے ملتا ہے۔ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی انھیں کے فرزند تھے، جن کے مجاہدانہ کارنامے گزشتہ صفحات میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ امیر المجاہدین مولانا عبداللہ بھی اسی خاندان سے تھے اور جماعت

کے مجاہدات کی باگ ڈور مولانا ولایت علی کے وقت سے زیادہ تر اسی خاندان کے ہاتھ میں رہی۔ اس کے جو افراد میدانِ جنگ میں شریک نہ ہو سکے، وہ اپنے وطن میں تنظیم کا کام انجام دیتے رہے۔

انسانوں کے بھیس میں فرشتے آپ میدانِ جنگ کی سرگرمیوں کا تھوڑا سا حال ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ تنظیمی سرگرمیوں کے سلسلے میں کارفرماؤں کو کن کن مشکلات و مصائب سے سابقہ پڑا۔ اس راستے کی صبر آزمائیاں شدت و وسعت میں میدانِ جنگ کی صبر آزمائیوں سے کم نہ تھیں، بلکہ میں کہوں گا آتش باری اور شمشیر زنی کی گرمی ہنگامہ میں جان دے دینا اتنا مشکل نہیں، جتنا مصائب لامتناہی کے ہجوم میں گھُل گھُل کر اور کُڑھ کُڑھ کر زندگی کے اوقات گزارنا مشکل ہے۔ ان مجاہدوں کے خاندان، گھر بار اور جائدادیں تباہ ہوئیں۔ انھوں نے جیلوں کی تاریک کوٹھڑیوں اور اندیمان کی بھیانک وحشت ناکیوں میں دن بسر کیے۔ ایک دوسرے سے دائمی مفارقت بھی قبول کر لی یہاں تک کہ حقیقی بھائیوں کو عالمِ غربت میں قبروں کی یکجائی بھی نصیب نہ ہوئی تاہم ان کی جبینِ عزیمت پر کبھی شکن نہ پڑی اور ان کے پائے استقامت میں کبھی لرزش نہ آئی۔ لاریب وہ انسانوں کی شکل میں فرشتے تھے، جو ہماری بگڑی ہوئی تقدیر کو بنانے کے سلسلے میں ایک صحیح عملی نمونہ پیش کرنے کی غرض سے اس دنیا میں آ گئے تھے۔

بے مثال اخلاص بہت کم خاندان ہیں جنھیں بیک وقت دعوت و تنظیم جہاد اور اجرائے جہاد کی سعادت نصیب ہوئی۔ سید صاحب دونوں میدانوں کے یگانہ شہسوار تھے۔ عظیم آباد کے ان تین خاندانوں نے کم و بیش ایک صدی تک دونوں کام سنبھالے رکھے اور ایسی قربانیاں خوش دلی سے کیں، جن کا تصور بھی ہمارے عہد میں قلوب پر لرزہ طاری کر دینے کے لیے کافی ہے۔ پھر یہ قربانیاں اس حالت میں کیں، جب ان کے اپنے ہی حلقے سے صدائے تحسین کی امید نہ ہو سکتی تھی بلکہ ہر فرد حکومتِ انگلشیہ کے خلاف جہاد کا نام سنتے ہی منزلوں دور بھاگتا تھا اور مجاہدین سے برائے نام تعلق کے لیے بھی تیار نہ تھا۔ لہٰذا ان بزرگوں کے خلوص اور للّٰہیت میں کسے کلام ہو سکتا ہے، جنھوں نے جان پر کھیل کر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کے چراغ روشن کیے۔ اسلامیت کی بحالی اور ملک کی آزادی کے لیے

جدوجہد کے ہزاروں داعی ہمارے زمانے میں پیدا ہوگئے اور ان کی ستائش میں اہل قلم نے سیکڑوں صفحات سیاہ کیے، لیکن ان میں سے کتنے ہیں جو ان بزرگوں کی برابری کا دم بھر سکیں، جن کے ذکر سے ذیل کے صفحات زینت پا رہے ہیں؛ پہلے ان میں سے بعض کے حالات اختصاراً سن لیجیے جنھیں مختلف دائروں میں کارفرمائی یا کارکردگی کی سعادت نصیب ہوئی:

مولانا احمد اللہ آپ مولوی الٰہی بخش جعفری کے خلفِ اکبر تھے۔ ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں پیدا ہوئے۔ والد نے احمد بخش نام رکھا تھا۔ سید صاحب سے وابستگی پیدا ہوئی تو انھوں نے احمد اللہ نام تجویز فرمایا۔ دینی علوم دوسرے اساتذہ کے علاوہ مولانا ولایت علی سے حاصل کیے۔ بہت ذہین اور ذکی تھے۔ فہم و فراست میں یگانہ مانے جاتے تھے۔ وقت کے رئیس ہونے کے باوجود بہت حلیم الطبع، منکسر المزاج اور صاحب مروت تھے۔ آپ کی شادی شاہ محمد حسین نمو ہیہ کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ حکام کی نظروں میں بھی بہت معزز تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ولیم ٹیلر کمشنر عظیم آباد نے انھیں، شاہ محمد حسین اور مولوی واعظ الحق کو تقریباً تین مہینے کے لیے سرکٹ ہاؤس میں نظر بند رکھا تھا۔ حکام بالا ٹیلر کی اس حرکت پر اتنے ناراض ہوئے کہ اسے کمشنری سے مستعفی ہونا پڑا۔ چنانچہ اس نے عظیم آباد ہی میں وکالت شروع کر دی۔ مولانا احمد اللہ کی گرفتاری اور سزایابی میں ٹیلر کی دیرینہ عداوت کو بھی خاص دخل تھا۔ مولانا کو اگرچہ خاندانی اور اعتقادی روابط کی بنا پر تحریک مجاہدین سے برابر دلچسپی رہی، لیکن تنظیم کا عملی کام انھوں نے صرف اس وقت کیا، جب ان کے بھائی مولانا یحییٰ علی گرفتار ہوگئے اور یہ مدت چند مہینے سے زیادہ نہ تھی، تاہم حکومت نے انھیں گرفتار کیا اور جھوٹی شہادتوں کی بنا پر پہلے ضبطی جائداد اور پھانسی کی سزا دی۔ پھر آخری سزا حبسِ دوام بہ عبورِ دریاے شور میں بدل دی۔ تفصیلات آگے آئیں گی۔

مولانا فیاض علی مولانا احمد اللہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ انھیں سے درسی کتابیں پڑھیں۔ مولانا ولایت علی سے حدیث کی سند لی۔ ۱۸۴۶ء میں مولانا کے ساتھ سرحد گئے۔ جنگِ ڈبّ کے بعد انھیں کے ساتھ واپس آئے۔ فنِ سپہ گری میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی۔ دوبارہ سرحد چلے گئے۔ جنگ امبیلہ کے وقت میں موجود تھے۔ غالباً گلونوبوڑی میں وفات پائی۔ آپ کی شادی شاہ محمد حسین نمو ہیہ کی

دوسری صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ اولاد کوئی نہ ہوئی۔ اپنے بھائی مولانا احمداللہ کے فرزند مولانا اشرف علی کو متبنّٰی کر لیا تھا۔ ان کے حالات الگ بیان ہوں گے۔

مولانا یحییٰ علی | مولانا احمداللہ کے تیسرے بھائی تھے اور ان سے دس برس چھوٹے تھے۔ علم و فضل، زہد و تقویٰ اور ایثار و قربانی میں انھیں خاندان کا گلِ سرسبد سمجھنا چاہیے۔ وہ خاصی مدت تک سرحد میں بھی رہے۔ واپس آئے تو دعوت و تنظیمِ جہاد کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آزادی کے آخری سانس تک اسی کام کے لیے وقف رہے۔ انبالہ کے مقدمے میں جسے انگریزوں نے "وہابیوں" کا سب سے بڑا مقدمہ قرار دیا تھا، مولانا یحییٰ علی سب سے بڑے ملزم تھے۔ چنانچہ انھیں پہلے ضبطیِ جائداد اور پھانسی کی سزا ہوئی۔ پھر آخری سزا حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور میں تبدیل کر دی گئی۔

متفرّق اصحاب | اس خاندان کے بعض دوسرے اصحاب کی کیفیت ذیل میں درج ہے:

۱ ـ مولوی اکبر علی: یہ مولانا احمداللہ کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ مجاہدین کی اس جماعت میں شامل تھے، جو سیّد احمد شہید کے ہمراہ سب سے پہلے جہاد کے لیے گئی تھی۔ سرحد میں بعارضۂ ہیضہ وبائی وفات پائی۔

۲ ـ حکیم عبدالحمید: مولانا احمداللہ کے فرزندِ ارجمند تھے یہ مولانا کی سزایابی اور ضبطیِ جائداد کے بعد اس دنیا کی ہر شے سے محروم ہو گئے اور نئے سرے سے زندگی شروع کی۔ علم و فضل میں کمال حاصل تھا۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی انھیں "خاقانیِ ہند" کہا کرتے تھے۔ طب میں وہ ممتاز درجہ حاصل کیا کہ امرا اور راجگان بہ منّت و خوشامد انھیں بلایا کرتے تھے۔

۳ ـ مولوی عبدالقدیر عرف اشرف علی: یہ بھی مولانا احمداللہ کے فرزند تھے۔ چونکہ مولانا فیّاض علی نے انھیں متبنّٰی کر لیا تھا، اس لیے ان کے ساتھ سرحد چلے گئے۔ واپس آ کر نام بدلا اور مختلف فنون حاصل کیے۔ بنارس کالج میں ریاضی کے اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ "اودھ اخبار" لکھنؤ کی ایڈیٹری بھی کی۔ کچھ مدت بہاول پور میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ پھر جوناگڑھ میں پرنسپل مقرّر ہوئے۔ انجام کار باندہ کے سکول میں ہیڈ ماسٹری کر لی تھی۔ سابقہ سرگرم سیاسی زندگی مدّت العمران کے لیے

پریشانی کا باعث بنی رہی۔ ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء (۲۔ شوال ۱۳۲۶ھ) کو وفات پائی ۔

۴۔ مولانا محمد عیسیٰ عرف امجد علی : یہ مولانا یحییٰ علی کے فرزند تھے۔ ابتدائی زندگی سرحدی مجاہدات میں گزری۔ واپس آکر نام بدلا اور علوم میں وہ درجہ حاصل کیا کہ اپنے عہد کے یگانہ علما میں شمار ہونے لگے۔ علی گڑھ کالج اور الٰہ آباد کالج میں عربی کے پروفیسر رہے۔ حکومت نے شمس العلماً کا خطاب دیا۔ ۲۲۔ نومبر ۱۹۲۱ء (۲۱۔ ربیع الاوّل ۱۳۴۰ھ) کو انتقال کیا ۔

۵۔ مولانا محمد یوسف رنجور : مولانا یحییٰ علی کے چھوٹے فرزند تھے۔ حصولِ علم کے بعد کلکتہ میں بورڈ آف اگزامینرز کے چیف مولوی مقرر ہوئے۔ آنکھیں خراب ہو جانے کے باوجود کلکتہ یونیورسٹی نے آپ کی علیحدگی منظور نہ کی۔ ۷۔ جون ۱۹۲۳ء (۲۲۔ شوال ۱۳۴۱ھ) کو بوقت ظہر انتقال کیا۔ انھیں خان بہادر اور شمس العلماء کے خطابات حاصل تھے ۔

۶۔ مولانا عبدالرحیم : مولوی فتح علی کے خاندان میں سے اکثر اصحاب کے حالات بیان کیے جا چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا چاہیے کہ مولانا ولایت علی کے ایک بھائی مولوی طالب علی تھے، جو مجاہدین کی پہلی جماعت میں سیّد صاحب کے ساتھ سرحد گئے اور چنگلئی میں وفات پائی۔ ایک بھائی مولانا فرحت حسین تھے، جنھیں بعض بیانات میں فرحت علی کہا گیا۔ یہ ۱۲۷۴ھ یا ۱۲۷۵ھ میں فوت ہوئے۔ ان کے فرزند مولانا عبدالرحیم بھی انبالہ والے مقدمے کے بڑے ملزموں میں تھے۔ یہ ۱۴۔ شعبان ۱۲۵۲ھ (۲۴۔ نومبر ۱۸۳۶ء) کو پیدا ہوئے۔ وطن میں تعلیم پائی۔ کم و بیش اٹھارہ سال جزائر انڈیمان میں گزارے، جن کی تفصیل آئندہ بیان ہو گی۔ واپس آکر حج کیا اور ۲۴۔ اگست ۱۹۲۳ء (۱۰۔ ذی حجہ ۱۳۴۱ھ) کو بانوے برس کی عمر میں فوت ہوئے ۔

۷۔ حافظ عبدالمجید : مولانا عنایت علی کے اکلوتے فرزند تھے۔ پوری زندگی سرحد میں گزاری اور وہیں فوت ہوئے ۔

دوسرا باب

مقدّمۂ انبالہ

(۱)

دعوت و تبلیغ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں سیّد احمد شہید کے زمانے سے دعوت و تبلیغ کا کام جاری تھا۔ اس میں اصلاحِ عقائد و اعمال کے علاوہ یہ تلقین بھی کی جاتی تھی کہ دوسرے فرائض و ارکان کے ساتھ جہاد بھی اسلام کا ایک بہت بڑا رکن ہے۔ جہاد کے لیے آدمی بھی فراہم کیے جاتے تھے اور روپیہ بھی۔ جب پنجاب میں سکھوں کی عمل داری ختم ہوئی اور ان کی جگہ انگریز آگئے تو جماعتِ مجاہدین کا تصادم براہِ راست اُن سے ہوا اور ہندوستان کے اندر کام کرنے والوں کے لیے اک گونہ نازک صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ مجھے تفصیلی کیفیت معلوم نہ ہوسکی، لیکن خیال ہے وہ سمجھتے ہوں گے کہ دعوت و تہیّہ جہاد اہم اصلاحی فرائض میں داخل ہے اور جب تک جس طور اس فرض کو انجام دینے کا موقع ملے، تامّل نہ ہونا چاہیے۔ ممکن ہے بعض داعیوں کا تاثر یہ ہو کہ مجاہدین ہندوستان میں نہیں بلکہ آزاد علاقے میں رہتے ہیں اور انھیں حسبِ استطاعت رقمیں پہنچانا یا شیفتگانِ جہاد کے لیے سرحد پہنچنے کا انتظام کر دینا جرم نہیں[1]۔ انگریزوں نے ابتدا میں اس طرف چنداں توجّہ نہ کی۔ جب دیکھا کہ مجاہدین خاصا خطرہ بن سکتے ہیں تو کاوش شروع ہوئی کہ انھیں امداد کہاں سے ملتی ہے؟ چونکہ سارا انتظام ابتدا سے خاص مصلحتوں کی بنا پر خفیہ رکھّا گیا تھا، اس لیے کسی کو صحیح سراغ نہ مل سکا اور بلا ثبوت دار و گیر کا ہنگامہ برپا کر دینے کے لیے کوئی وجہ جواز نہ تھی اگرچہ بعد میں ذکی الحس انگریز افسروں نے اسے ایک ہیبت انگیز سلسلے کی شکل دے دی۔

[1] بعض مقدمات میں ماخوذ مجاہدین کے وکیلوں نے دفاع میں یہی طریق استدلال اختیار کیا تھا اور سرکاری دعوے کو از روے تعزیراتِ ہند بے بنیاد قرار دیا تھا۔

غزّن خاں | ہوتی مردان کے پیہّ کمال زئی کا ایک پٹھان غزّن خاں (ابن جدّن خاں) سوار پولیس میں سارجنٹ تھا اور کرنال کے ضلع میں اسے مامور کیا گیا تھا۔ مئی ۱۸۶۳ء میں اسے چار آدمی پیدل جاتے ہوئے ملے، جن کی وضع قطع درویشوں کی سی تھی۔ ان کے رنگ زیادہ سانولے تھے اور ڈاڑھیاں چھوٹی چھوٹی۔ غزّن خاں نے سمجھا کہ ہو نہ ہو یہ بنگالی ہیں۔ اس کا اپنا بیان ہے کہ میں نے ہوتی مردان اور شیخ جانا میں ایسے متعدد آدمی دیکھے تھے[1]۔

غزّن خاں نے پوچھا: "کہاں سے آئے ہو؟" انھوں نے بتایا "ملکا سے اور اب ہم تھانیسر میں منشی محمد جعفر سے ملیں گے۔ پھر آگے نکل جائیں گے۔ مہینے دو مہینے کے بعد لوٹیں گے"۔

انھوں نے غزّن خاں سے کہا کہ تم بھی نوکری چھوڑو اور ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ وہاں بہت بڑی جنگ ہونے والی ہے۔

غزّن خاں انھیں گرفتار کر کے پانی پت کے تھانے میں لے گیا اور ایک رپورٹ تیار کی، جس میں بتایا گیا تھا کہ یہ لوگ حکومت کے دشمن ہیں۔ وہ ہر چند کہتے رہے کہ ہمیں چھوڑ دو۔ اگر روپیہ چاہتے ہو تو ہم تھانیسر سے دلا دیں گے، لیکن غزّن خاں نے انھیں نہ چھوڑا۔ جب وہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئے تو عدم ثبوت کی بنا پر انھیں رہا کر دیا گیا[2]۔ یقیناً ان کے خلاف کوئی ثبوت پیش نہ کیا جا سکتا تھا اور نہ پیش ہوا۔ صرف ایک غزّن خاں کا بیان تھا کہ وہ ملکا سے آئے ہیں اور دو مہینے کے بعد واپس جائیں گے۔ تنہا اس بیان پر انھیں سزا نہ دی جا سکتی تھی۔

غزّن کا کینہ | غزّن خاں کو ان کی رہائی پر سخت غصہ آیا۔ دل میں کینے اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ مسلمانوں کے اس دینی نظام کو انگریزوں کی خاطر برباد کرنے کے لیے تیار ہو گیا، جو بیچارگی کی حالت میں ہزار محنتوں اور مشقتوں سے بنایا گیا تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً اپنے بیٹے فیروز کو، جو حمزہ خاں

---

[1] "روئداد مقدمۂ انبالہ" (انگریزی) صفحہ ۱۴۲۔ [2] مقدمہ مسٹر سٹیفن اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے روبرو پیش ہوا تھا۔ صاحب موصوف نے ۱۸۔ مئی ۱۸۶۳ء کو حکم لکھا: "چھان بین کے بعد واضح ہوا کہ یہ چار آدمی معمولی مسافر ہیں، لہٰذا انھیں رہا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے"۔

میں مقیم تھا، لکھا: تم ملکا چلے جاؤ، وہاں ایک شخص اخوندزادہ عبداللہ رہتا ہے، اس کی مسجد میں جاکر ٹھہر جاؤ اور اس کے ذریعے سے پوری معلومات حاصل کرو کہ جماعت مجاہدین کو کہاں کہاں سے مدد ملتی ہے۔ غزن کا اپنا بیان ہے: میرا بیٹا فیروز میرے حکم کے مطابق ملکا گیا اور دس روز وہاں ٹھہرا رہا۔ اس زمانے میں بنگالی ستھانہ پر پیش قدمی کی تیاری کر رہے تھے۔ فیروز ان کے ساتھ ستھانہ اور کھبل گیا۔ پوری معلومات حاصل کر کے وہاں سے اپنے وطن حمزہ خاں لوٹا[1]۔

غرض فیروز یہ اطلاع لایا کہ قرابینوں، رائفلوں اور مجاہدین کو بھیجنے کا ذمہ دار محمد جعفر تھانیسری ہے۔ مجاہدین امازئی کے ملکوں مدد خاں اور موزہ خاں کے پاس پہنچتے تھے تو فخریہ جتایا کرتے تھے کہ ہندوستان میں بہت بڑے بڑے آدمی ہمارے دوست ہیں۔ اس سلسلے میں محمد جعفر کا نام لیا کرتے تھے۔ جسے وہاں خلیفہ کہا جاتا تھا۔ گویا وہ کوئی بہت بڑا نواب تھا[2]۔

یوں غزن خاں اور اس کے بیٹے کی رپورٹ نے پہلی مرتبہ مجاہدین کی تنظیم کا راز فاش کیا۔ سوار پولیس کے افسر کپتان موزلی[3] نے رپورٹ انسپکٹر جنرل پولیس کے پاس بھیجی اور ضلع انبالہ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کپتان پارسنز[4] کو اس سلسلے میں مزید تحقیقات کا حکم ملا۔

مولوی محمد جعفر کا بیان مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اپنی کتاب "کالا پانی" کے آغاز میں جو کچھ بیان کیا ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ واقعہ غالباً جنگ امبیلہ کے بعد پیش آیا، حالانکہ جنگ امبیلہ اُس وقت شروع بھی نہ ہوئی تھی اور غزن خاں کی انتقامی جدوجہد کا آغاز جنگ چھڑنے سے کم و بیش پانچ مہینے پہلے ہو چکا تھا۔

مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ غزن خاں نے ۲۸۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۸۰ھ (۱۱۔ دسمبر ۱۸۶۳ء) کو:

---

[1] روئداد مقدمۂ انبالہ" (انگریزی) صفحہ ۱۴۵۔ غزن کا اشارہ بہ ظاہر اس یورش کی طرف ہے جو شہزادہ مبارک شاہ نے کھبل پر کی تھی۔ اسے بنگالیوں کی یورش قرار دینا سراسر لغو تھا۔ اُس یورش میں مجاہدین یقیناً شامل تھے، لیکن ان کی تعداد مقامی لشکریوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ [2] ایضاً [3] ایضاً۔

[4] MOSELY

کسی ذریعے سے میرے حال سے واقف ہوکر اور ایسے وقت میں اپنی دنیوی بھلائی کا موقع جان کر ایک بڑی لمبی چوڑی اور جھوٹی کیفیت خیر خواہانہ بہ حضور صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کے حاضر ہوکر یہ مخبری کی کہ یہ جنگ جو ہندوستانی مجاہدین کے ساتھ سرحد پر ہو رہا ہے، ان لوگوں کو محمد جعفر نمبردار تھانیسر روپیہ اور آدمیوں سے مدد دیتا ہے[1]۔

ظاہر ہے کہ کیفیت جھوٹی نہ تھی، اگرچہ غزن خاں نے وہ اپنی دنیوی بھلائی کے لیے پیش کی تھی۔

غزن خاں یہ کیفیت پیش کر کے ڈپٹی کمشنر کے بنگلے سے نکلا اور مولوی محمد جعفر کے ایک دوست نے اس راز سے آگاہ ہوکر، اپنے ایک ملازم مسمّی قادا سے بہ طورِ افسوس ذکر کر دیا۔ قادا مولوی صاحب کا ہمسایہ اور خیر خواہ تھا۔ وہ انھیں بر وقت آگاہ کرنے کی غرض سے فوراً تھانیسر روانہ ہو گیا۔ چونکہ رات ہو گئی تھی اور مولوی صاحب کے گھر کے دروازے بند تھے، لہٰذا اس نے سوچا کہ صبح کو خبر کر دوں گا۔ عین اسی رات کپتان پارسنز پولیس کی خاصی بڑی جمعیّت لے کر تلاشی کے لیے مولوی صاحب کے مکان پر پہنچ گیا۔ گویا قادا نے جس غرض سے سفر کی مشقّت اٹھائی تھی، وہ پوری نہ ہوئی۔ سچ ہے مقدرات کو کوئی ٹال نہیں سکتا[2]۔

تلاشی کپتان پارسنز نے مولوی صاحب کے مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر انھیں جگا کر خانہ تلاشی کے وارنٹ دکھائے۔ سوءِ اتفاق سے مولوی صاحب نے چند گھنٹے پیشتر جماعتِ مجاہدین کے روپے کے متعلق ایک مرموز خط محمد شفیع ٹھیکیدار انبالہ کے نام لکھا تھا، جسے موصوف "بلا کا بھرا ہوا خط" قرار دیتے ہیں۔ یہ خط ان کی بیٹھک میں موجود تھا۔ انھوں نے چاہا کہ کپتان پہلے گھر کے اندر کی تلاشی لے لے تاکہ اس خط کو ضائع کر دینے کی مہلت مل جائے۔ کپتان نے اصرار کیا کہ پہلے بیٹھک کی تلاشی لی جائے گی۔ اس غرض سے دو دروازوں کا کھلوانا ضروری تھا۔ جو آدمی اندر سو رہے تھے، ان میں سے مولوی صاحب نے منشی عبدالغفور کو آواز دی کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب تلاشی کے لیے کھڑے ہیں، دروازہ جلد کھول دو۔

[1] "کالا پانی" المعروف بہ تواریخ عجیب صـ ۶۔ [2] ایضاً۔ ایضاً کپتان کا نام PARSONS تھا۔

مقصود یہ تھا کہ منشی صاحب متنبّہ ہو کر خط ضائع کر دیں۔ وہ گھبراہٹ میں اشارہ نہ سمجھ سکے۔ دروازہ کھلا تو وہ خط مل گیا، جو اصطلاحی لفظوں میں چند ہزار اشرفیاں روانہ کرنے کے ذکر پر مشتمل تھا۔ کچھ اور خط بھی ملے۔ منشی عبدالغفور ساکن گیا (بہار) اور ایک بنگالی لڑکے عبّاس کو بھی پولیس گرفتار کر کے لے گئی۔ مولوی صاحب کی گرفتاری کے وارنٹ نہ تھے، لہٰذا ان سے کوئی مزاحمت نہ کی[1]۔

اہلِ عظیم آباد کا سراغ مولوی محمد جعفر کے ہاں سے جو خط پکڑا گیا تھا، اس میں مکتوب الیہ کا نام شیخ شفاعت علی مرقوم تھا اور پتا محمد شفیع ٹھیکیدار میانمیر کا درج تھا، جس کا مکان صدر بازار انبالہ میں تھا۔ چنانچہ انبالہ میں محمد شفیع کے مکان کی اور میانمیر میں اس کی دکان کی تلاشی بھی ہو گئی۔ کپتان بمفیلڈ[2] وکیل استغاثہ نے اپنی تقریر میں بیان کیا: اس اثناء میں ایک اور ذریعے سے بھی مستند اطلاع مل چکی تھی کہ ستھانہ جانے والے آدمی محمد جعفر کے پاس ٹھہرتے ہیں اور وہ مجاہدین کو مالی امداد پہنچاتا ہے[3]۔ چنانچہ کپتان پارسنز کو مولوی محمد جعفر کی گرفتاری کا حکم دے دیا گیا۔

پارسنز تھانیسر پہنچا تو مولوی صاحب وہاں سے غائب ہو چکے تھے، جس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔ تھانیسر کی تحصیل، تھانہ اور ڈاک خانہ پیپلی میں تھے۔ وہاں کے پوسٹ ماسٹر نے ایک خط پیش کیا، جو عظیم آباد کے محی الدّین کی جانب سے تھانیسر کے عبدالغفور اور ریرو خاں کے نام بھیجا گیا تھا۔ مولوی محمد جعفر کے مکان سے جو خط ملا تھا، اس میں تسبیحوں کے لیے چھ ہزار سفید دانے[4] اور تین سو سُرخ دانے بھیجنے کا ذکر تھا۔ پیپلی والے خط میں یہ بتایا گیا تھا کہ میاں حسینی کو عظیم آباد سے سفید اور سرخ دانے دے کر بھیج دیا گیا ہے۔ یوں خفیہ سازباز کی ایک اور کڑی مل گئی، اور عظیم آباد میں بھی تلاشیوں کا سلسلہ جاری کر دیا گیا۔

مولوی جعفر کا فرار اور گرفتاری تلاشی کے بعد پولیس واپس چلی گئی تو مولوی محمد جعفر نے سوچا کہ ثبوت مل گیا ہے اور اب بچاؤ کی کوئی امید نہیں ہو سکتی، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ بھاگ کر کسی محفوظ مقام کی

---

[1] "کالا پانی" صفحہ ۸۔ مولوی محمد جعفر کی کتاب میں اسے دنکفیل لکھا گیا ہے۔ [2] BAMFIELD

[3] "روئداد مقدمۂ انبالہ" ص۲۳۔ [4] بعد میں معلوم ہوا کہ سفید دانوں سے مراد روپے ہیں اور سرخ دانوں سے اشرفیاں۔

طرف نکل جاؤں۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ "نامردی سے جان بچانا مناسب جانا۔" اگرچہ وہ حراست میں نہ تھے، لیکن مختلف لوگ ان کی نقل و حرکت کو تاکتے رہنے پر مامور تھے۔ انھوں نے اپنی والدہ اور اہلیہ سے مشورے کے بعد فرار کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۲۔ دسمبر ۱۸۶۳ء کو وہ پیپلی گئے۔ تحصیل اور تھانے میں ان کے دوست موجود تھے۔ سب نے رائے دی کہ خود انبالہ جا کر دریافت کرنا چاہیے، اصل معاملہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ شام کے وقت گھوڑے پر سوار ہو کر بظاہر انبالہ کی طرف روانہ ہوئے۔ نگرانی کرنے والوں نے سمجھ لیا کہ وہ واقعی انبالہ جا رہے ہیں، لیکن مولوی صاحب اپنے دل میں اور فیصلہ کر چکے تھے۔ تاریکی ہو گئی تو سڑک چھوڑ کر اس جگہ پہنچے، جہاں والدہ، بیوی بچے اور اپنے بھائی محمد سعید سے آخری ملاقات کرنی تھی۔ رات کے ایک بجے ایک عمدہ بہلی میں بیوی اور بچوں کو لے کر روانہ ہوئے۔ پانی پت پہنچ کر انھیں رخصت کر دیا۔ بہلی چلانے والے سے کہا کہ میرے بچوں کو پانی پت میں چھوڑ کر جمنا پار چلے جانا۔ کسی شخص کو ہمارا پتا نہ بتانا۔ بہلی اور بیل خود لے لینا۔

مولوی صاحب دہلی پہنچے اور میاں نصیر الدین سوداگر کی کوٹھی میں مقیم ہوئے، جہاں حسینی تھانیسری اور حسینی عظیم آبادی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ "عبداللہ" نام بھی ایک شخص تھا جس کا صحیح نام آگے چل کر "معظم سردار" ثابت ہوا۔ حسینی عظیم آبادی اور معظم سردار اشرفیاں لے کر آئے تھے[ل]۔ مولوی محمد جعفر نے یہ اشرفیاں حسینی تھانیسری کے حوالے کیں کہ جس طور بھی ممکن ہو، انھیں مجاہدین کے بیت المال تک پہنچا دو۔ خود حسینی عظیم آبادی اور معظم سردار عرف عبداللہ کو لے کر شکرم میں علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ پارسنز تھانیسر پہنچا تو مولوی صاحب کے کم عمر بھائی محمد سعید کو مار پیٹ کر فرار کا پورا حال معلوم کر لیا۔ یوں وہ مولوی صاحب کے تعاقب میں دہلی سے علی گڑھ پہنچا اور انھیں گرفتار کر کے واپس لے آیا۔

مزید گرفتاریاں اس اثناء میں محمد شفیع ٹھیکیدار، اس کا ملازم منشی عبدالکریم اور بعض دوسرے اصحاب بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ عظیم آباد میں مولانا احمد اللہ، مولانا یحییٰ علی اور مولانا عبدالرحیم بھی معرض احتساب

ل معظم سردار نے گواہی دیتے ہوئے بتایا کہ میرے کرتے میں ایک طرف چھیانوے اور دوسری طرف ستاسی اشرفیاں سلی ہوئی تھیں۔ حسینی کے کرتے میں غالباً ایک سو اشرفیاں تھیں (روئداد مقدمۂ انبالہ" ص۵۵)۔

میں آئے کپتان پارسنز، عظیم آباد کے کلکٹر اور بعض دوسرے افسروں کی معیت میں ۱۲۔ شعبان ۱۲۸۰ھ (۲۲۔ جنوری ۱۸۶۴ء) کو مولانا احمداللہ، مولانا یحیٰی علی وغیرہ کے مکانوں کی تلاشی کے لیے آیا۔ پولیس نے مکانوں کا احاطہ کر لیا۔ مولانا احمداللہ کلکتہ گئے ہوئے تھے۔ مولانا یحیٰی علی سے تقریباً آٹھ گھنٹے پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ پھر وہ لوگ چلے گئے۔ ۲۴ کو یہ لوگ دوبارہ آئے۔ کتابوں اور خطوں کو خوب دیکھا بھالا اور کچھ کاغذات ساتھ لے گئے۔ مولانا یحیٰی علی کے لیے دس ہزار روپے کی نقد ضمانت طلب کی، جس کا انتظام مولانا احمداللہ کے فرزند حکیم عبدالحمید نے کیا۔ مولانا عبدالرحیم اور ان کے ملازم میاں عبدالغفار کو دو روز حوالات میں رکھا، پھر جیل خانے بھیج دیا۔ دس بارہ روز کے بعد مولانا یحیٰی علی کی ضمانت بھی منسوخ کر کے انھیں گرفتار کر لیا۔ ۲۶۔ رمضان ۱۲۸۰ھ (۵۔ مارچ ۱۸۶۴ء) کو انھیں ریل گاڑی میں انبالہ بھیج دیا۔

مجاہدین کے سلسلے میں دعوت و تبلیغ اور تنظیمات کے ایک بہت بڑے اور فعّال کارکن قاضی میاں جان ساکن کمارکھلی (ضلع پبنہ بنگال) تھے، جن کی عمر اُس وقت ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی، انھیں بھی گرفتار کر کے انبالہ پہنچا دیا گیا۔ دہلی سے بصیرالدین اور علاءالدین تاجران جفت بھی گرفتار کر لیے گئے، ان کے ذریعے سے بھی ہنڈیاں بھیجی جاتی تھیں۔

حسینی تھانیسری کی گرفتاری مولوی محمد جعفر نے حسینی تھانیسری کو اشرفیاں دے کر دہلی سے روانہ کر دیا تھا۔ وہ بے چارہ بڑی احتیاط سے روانہ ہوا تا کہ رقم مجاہدین کے پاس پہنچا دے۔ وہ یکّے میں سوار ہو کر کرنال سے امرتسر جا رہا تھا۔ راستے میں پیپلی کے نائب تحصیل دار قاسم علی اور برکت علی سارجنٹ نے اسے گرفتار کر لیا۔ نائب تحصیل دار نے اپنے بیان میں کہا کہ میں تھانیسر میں مختلف مکانوں کی تلاشی کے بعد پیپلی پہنچا تو یہ شخص یکّے میں سوار تھا اور پردے چھوڑے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا: کہاں سے آئے؟ بولا تھانیسر سے اشنان کر کے آ رہا ہوں۔ وہ مسلمان تھا، اس لیے سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیوں اشنان کے لیے تھانیسر گیا؟ چنانچہ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی بغل میں دو روئی دار صدریاں تھیں۔ وہ ذرا بوجھل معلوم ہوئیں۔ انھیں کھول کر دیکھا تو دو سو نوّے اشرفیاں ملیں۔ ہر اشرفی کاغذ میں لپٹی ہوئی تھی۔ نیز اس کے پاس ترپن روپے تھے۔

اسیروں کے مصائب اور استقامت گرفتاری کے بعد ان بزرگوں کو انگریزوں نے جوشِ انتقام میں جو تکلیفیں دیں، ان کی پوری کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ یہ وقت کے نہایت معزز اور خوش حال افراد تھے، لیکن ان کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا گیا، جو معمولی حیثیت کے اخلاقی مجرموں کے متعلق بھی خلاف حق و انصاف سمجھا جائے گا۔ مثلاً مولوی محمد جعفر کے حالات کا سرسری نقشہ ملاحظہ فرمائیے:
گرفتاری کے بعد انھیں ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کیا گیا۔ کھانے کو دو روٹیاں اور تھوڑا سا ساگ ملا۔ روٹیوں میں ایک چوتھائی ریت اور مٹی شامل تھی۔ ساگ موٹے موٹے ڈنٹھل تھے، جنھیں چبانا بھی دشوار تھا۔ علی گڑھ سے شکرم میں دہلی کی طرف روانہ ہوئے تو ہتھکڑی اور طوق پہنایا گیا تھا۔ طوق میں ایک اور زنجیر ڈال کر اس کا سرا ایک مسلّح سپاہی کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا۔ کپتان پارسنز اور ایک انسپکٹر پولیس مولوی صاحب کے دائیں بائیں بھرے تمنچے لے کر بیٹھے۔ نہ کھانے کو کچھ دیا، نہ پینے کو۔ راستے میں نماز تیمّم کر کے اشاروں سے ادا کی جاتی رہی۔ دہلی میں انھیں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے بنگلے کے ایک تہ خانے میں رکھا گیا۔ وہاں سے کرنال اور کرنال سے انبالہ پہنچے، جہاں تینوں (مولوی محمد جعفر، حسینی عظیم آبادی اور معظم سردار) کو علیحدہ علیحدہ پھانسی کی کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا۔

خوفناک سزائیں مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ کپتان پارسنز سپرنٹنڈنٹ اور کپتان ٹائی[1] نے کہا کہ سب کچھ بتا دو۔ میں نے جواب دیا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اس کے بعد زدوکوب شروع ہوئی، یہاں تک کہ مولوی صاحب مار کھاتے کھاتے گر پڑے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یقین ہو گیا، یہ مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میرے ذمّے رمضان کے کچھ روزے باقی تھے۔ کچھ کھائے پیے بغیر روزے رکھنے شروع کر دیے۔ دوسرے دن زدوکوب کے بعد مجھے ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لے گئے۔ چاپلوسی سے کہا کہ سب کچھ بتا دو، تمھیں سرکاری گواہ بنا کر رہا کر دیں گے اور بڑا عہدہ بھی دیں گے۔ میں نے انکار کیا تو پھر مار پیٹ شروع ہوئی۔ صبح کے آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک بارہ گھنٹے زدوکوب جاری رہی۔ افطار کا وقت آیا تو

[1] TIGHE

میں نے بنگلے کے درخت سے پتے توڑ کر روزہ کھولا[۱]۔

سوچیے، ہم میں سے کتنے آدمی ہیں، جو راہِ حق میں اس قسم کی تکلیفیں صابرانہ برداشت کر لینے کا تصوّر بھی کر سکتے ہیں؟ ان بزرگوں نے یہ تمام تکلیفیں ایسے وقت میں اٹھائیں، جب ملک کی پوری فضا انگریزی تسلّط کے شادیانوں سے معمور تھی اور ایک بھی حلقے سے صدائے تحسین و اعانت بلند ہونے کی امید نہ تھی۔ للّٰہیت اور اخلاص کے ان مقدّس پیکروں نے سیّد احمد شہید کی جاری کردہ تحریک کے دامن میں پرورش پائی تھی۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ تحریک اس سرزمین میں اسلامیت کی کیسی عجیب و غریب تربیت گاہ تھی۔

---

[۱] یہ تمام تفصیلات مولوی محمد جعفر کی کتاب "کالا پانی" سے ماخوذ ہیں۔

تیسرا باب

مقدّمۂ انبالہ

(۲)

ملزمین | مقدمہ ابتدا میں کپتان ٹائی ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں پیش ہؤا۔ مندرجۂ ذیل اصحاب ملزم تھے :

۱ ۔ شیخ محمد شفیع ٹھیکدار، جو مختلف چھاؤنیوں میں فوجوں کو گوشت فراہم کرنے کا ذمہ دار تھا اور جس کی جائداد پچاس لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ یہ سید احمد شہید کے مخلص مرید شیخ محمد تقی کا بڑا صاحبزادہ تھا۔ شفاعت علی اسی کا دوسرا نام تھا ؛

۲ ۔ مولوی محمد جعفر ساکن تھانیسر، ان کے والد کا نام میاں جیون تھا۔ ذات ارائیں، عمر مقدمے کے وقت اٹھائیس سال کے قریب تھی۔ تھانیسر میں نمبردار تھے۔ عرائض نویسی اور اسٹام فروشی بھی کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تجارت اور زمینداری کا کاروبار بھی خاصا وسیع تھا۔ مجاہدین کے کام کے لیے ان کا نام "پیرو خاں" تھا۔ بعض بیانات کے مطابق یہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بھی چند ساتھیوں کو لے کر انگریزوں کے خلاف لڑنے کی غرض سے دہلی گئے تھے ؛

۳ ۔ مولانا یحییٰ علی جعفری عظیم آبادی، مقدمے کے وقت ان کی عمر غالباً سینتالیس سال تھی۔ مجاہدین کے کام کے لیے ان کا نام "محی الدین" تھا ؛

۴ ۔ مولانا عبدالرحیم، مولوی فرحت حسین کے فرزند اور مولانا ولایت علی کے بھتیجے۔ عظیم آباد کے رئیس۔ مقدمے کے وقت ان کی عمر اٹھائیس سال کی تھی ؛

۵ ۔ میاں عبدالغفار، مقدمے میں انھیں مولانا عبدالرحیم کا ملازم ظاہر کیا گیا۔ اغلب ہے وہ ابتدا میں

ملازم ہوں، لیکن اپنے حسن عمل اور جوشِ ایمان کی وجہ سے ان کا درجہ اتنا بلند تھا کہ ایک روایت کے مطابق عظیم آباد کے وہ تمام بزرگ جو سید صاحب سے وابستہ تھے، انھیں سیدی میاں عبدالغفار کہا کرتے تھے۔

۶۔ قاضی میاں جان ساکن کمارکھلی (ضلع پٹنہ) یہ نہایت ممتاز کارکن تھے اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، ان کے متعدد عرف تھے۔

۷۔ عبدالکریم انبالوی، عمر پینتیس سال، یہ شیخ محمد شفیع کا مختار تھا اور شیخ کی بھانجی سے اس کا نکاح بھی ہوگیا تھا۔

۸۔ عبدالغفور بن شاہ علی خاں ساکن ضلع شاہ آباد (ایک روایت کے مطابق ساکن ہزاری باغ) عمر پچیس سال۔ یہ تھانیسر میں مولوی محمد جعفر کے ہاں مقیم تھا۔

۹۔ حسینی ابن محمد بخش، عمر پچیس سال، ساکن تھانیسر۔ یہ مولانا عنایت علی کے عہد میں شریک جہاد رہا پھر اسے جماعتی کام کے سلسلے میں مولوی محمد جعفر کا معاون بنا دیا گیا۔

۱۰۔ حسینی ابن میگھو ساکن عظیم آباد، عمر پینتیس سال۔ یہ ملزم ۱۱ کا ملازم تھا۔

۱۱۔ الٰہی بخش ابن کریم بخش، یہ صاحب مولانا احمد اللہ کے مختار تھے اور ارسالِ زر زیادہ تر انھیں کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ ان کا اپنا کاروبار بھی تھا۔

ابتدائی کارروائی اور خوفناک مصائب

کپتان ٹائی کی عدالت میں غالباً ایک ہفتہ کارروائی جاری رہی۔ مقصود یہ تھا کہ ابتدائی چھان بین کے بعد ملزم سیشن سپرد ہوں۔ چنانچہ موصوف نے الزامات، گواہوں اور وثائقی شہادتوں کی تفصیل مرتب کی اور تمام ملزموں کو سیشن سپرد کر دیا۔ اس اثناء میں مقدمے کے گواہ پیدا کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا۔ مثلاً شیخ محمد شفیع کے حقیقی بھائی محمد رفیع کو پھانسی کی دھمکی دے کر گواہ بنا لیا گیا۔ مولوی محمد جعفر کے بھائی محمد سعید کو بھی مار پیٹ کر سرکاری ڈھب کی گواہی دینے پر آمادہ کر لیا گیا۔ جس روز مقدمہ پیش ہونے والا تھا، محمد سعید نے ایک سپاہی کے ذریعے سے مولوی محمد جعفر کو پیغام بھیجا کہ مار پیٹ کی بنا پر مجبور ہوگیا ہوں، اب میں عدالت میں اپنے بیانات سے

انکار کر دوں گا۔ مولوی صاحب نے کہلا بھیجا کہ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ تم پر حلف دروغ کا مقدمہ چلے گا اور سخت سزا ہوگی۔ میری رہائی صرف تمہارے بیان پر موقوف نہیں۔ تم بھی قید ہو گئے تو ضعیف والدہ دُہرا صدمہ برداشت نہ کر سکے گی۔

عباس نامی جس بنگالی لڑکے کو مولوی محمد جعفر کے مکان سے گرفتار کیا گیا تھا، اسے بھی پولیس نے حسبِ منشا ایک بیان سکھا دیا۔ جب ملزموں کے روبرو اسے بیان دینے کے لیے کہا گیا تو مولوی محمد جعفر کی صورت دیکھتے ہی وہ سب کچھ بھول گیا۔ پولیس اسے واپس لے گئی اور اتنا مارا کہ وہ فوت ہو گیا۔ پارسنز نے مشہور کر دیا کہ وہ بیماری سے فوت ہوا ہے[1]۔

مولانا عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ جن کوٹھڑیوں میں ہمیں بند کیا جاتا تھا، ان میں سے ہر کوٹھڑی پانچ فٹ لمبی اور چار فٹ چوڑی ہوگی۔ چھت بہت بلند، اوپر ایک چھوٹا سا روشن دان۔ ہر کوٹھڑی نہایت تنگ و تاریک تھی۔ شب و روز میں ایک بار اُس کا دروازہ کھلتا۔ اُس وقت ایک جمعدار اور دو تین سپاہی آتے۔ ان کے ساتھ ایک باورچی ہوتا، جس کے ہاتھ میں دو روٹیاں اور دال ہوتی۔ ساتھ ہی ایک سقا جس کی مشک میں پانی ہوتا اور ایک بھنگی جو گملا لیے آتا۔ باورچی ہر محبوس کو روٹیاں دال دے دیتا، سقا کوزے میں پانی ڈال دیتا اور بھنگی صاف گملا رکھ جاتا[2]۔

ملزموں کی یک جائی

ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں پیش ہو کر ملزموں نے نماز کی اجازت مانگی، نہ ملی تو وہ عین دورانِ مقدمہ میں تیمم کر کے بیٹھے ہوئے اشاروں سے نماز پڑھ لیتے۔ جب تک مقدمہ ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں تھا، تمام ملزم الگ الگ پھانسی کی کوٹھڑیوں میں بند تھے، جب مقدمہ سیشن سپرد ہوا تو ان سب کو حوالات میں اکٹھا کر دیا گیا۔ مدت کے بعد دوست اکٹھے ہوئے تو اپنی تمام مصیبتیں اور اذیتیں بھول گئے۔ مولوی محمد جعفر اکثر یہ شعر پڑھتے:

پائے در زنجیر پیشِ دوستاں
بہ کہ با بیگانگاں در بوستاں

[1] "تذکرۂ صادقہ" میں ہے کہ یہ واقعہ صدرالدین کو پیش آیا۔ صفحہ۔ یہ صحیح نہیں۔ صدرالدین کی گواہی باقاعدہ ہوئی۔ [2] "تذکرۂ صادقہ" صفحہ۔

مولوی صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ ہم سب مولانا یحییٰ علی کی صحبت کو غنیمت سمجھتے تھے، مگر شیخ محمد شفیع اور عبدالکریم کسی قدر کشیدہ خاطر رہتے تھے:

یہ خاکسار جب اپنی ذلیل النسبی اور کم علمی پر خیال کر کے انعامات الٰہی اور اس سرفرازی کو جو میرے حال بدآمال پر مبذول تھی، مقابلہ کر کے دیکھتا تو سمجھتا تھا کہ میری مثال ٹھیک ایسی ہے، جیسے کسی چمار کے سر پر . . . تاج شاہی رکھ دیا جاوے . . . اللہ تعالےٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ ایسے امتحانوں میں پیغمبر اور صحابہ لوگ بھی گھبرا جاتے تھے۔ اس صبر اور استقلال کے انعام کو خیال کر کے اوّل سے آخر تک میری زبان پر تو شکر ہی شکر جاری رہا۔ مولانا یحییٰ علی کی کیفیت اس سے بھی بڑھ چڑھ کر تھی۔ وہ اکثر اس رباعی کے مضمون کو ادا کیا کرتے تھے:

لَسْتُ اُبَالِیْ حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِماً ۔۔۔ عَلیٰ اَیِّ شِقٍّ کَانَ لِلّٰہِ مَصْرَعِیْ

وَ ذَالِکَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰہِ وَاِنْ یَّشَاءْ ۔۔۔ یُبَارِکْ عَلیٰ اَوْصَالِ شِلْوٍ مُّمَزَّعٖ[1]

قانونی امداد شیخ محمد شفیع نے ابتدائی عدالت ہی میں پہلے ایک انگریز وکیل مقرر کر لیا تھا، جس کا نام "تذکرۂ صادقہ" میں جانسن[2] بتایا ہے۔ پھر مسٹر گڈ آل[3] کو سات ہزار روپے پر مقرر کر لیا۔ سیشن کی عدالت میں گڈ آل صاحب ہی محمد شفیع اور اس کے منشی عبدالکریم کے مقدمے کی پیروی کرتے رہے۔ باقی ملزموں نے شروع میں کوئی وکیل مقرر نہ کیا۔ سیشن کی عدالت میں مولانا عبدالرحیم نے گڈ آل صاحب کی معرفت کلکتہ سے مسٹر پلاؤڈن[4] کو بلوایا۔ اکیس ہزار روپے فیس مقرر ہوئی۔ قیام و طعام اور سواری کا خرچ اس کے علاوہ تھا۔ پلاؤڈن صاحب مولانا عبدالرحیم اور مولانا یحییٰ علی کے علاوہ حسینی تھانیسری، حسینی عظیم آبادی،

---

[1] "کالا پانی" صفحہ ۱۹، ۲۰ ۔ جب میں مسلمان مارا جاؤں تو مجھے کچھ پروا نہیں کہ اللہ کی طرف میرا لوٹنا کسی بھی کروٹ ہو۔ اور یہ سب اللہ کی راہ میں ہے۔ وہ چاہے تو بوسیدہ اور ٹکڑے ٹکڑے اعضائے جسم میں برکت اور بالیدگی عطا کر دے۔

[2] JOHNSON [3] GOODALL [4] PLOWDEN

الٰہی بخش اور عبدالغفار کی طرف سے بھی پیروی کرتے رہے۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری نے خود اپنے مقدمے کی پیروی کی۔ قاضی میاں جان اور عبدالغفور کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ انھوں نے پیروی کا کیا انتظام کیا۔

پلاؤڈن صاحب کلکتہ سے انبالہ پہنچے تو اپنے مؤکلوں سے ملاقات کی درخواست دی، جسے ہربرٹ ایڈورڈز[1] کمشنر اور سیشن جج نے نامنظور کر دیا۔ جوڈیشل کمشنر لاہور کے پاس اپیل کی گئی تو وہ بھی نامنظور ہوئی۔ آخر پلاؤڈن صاحب نے یہ معاملہ گورنر کے پاس پیش کیا۔ وہاں سے منظوری آئی تو صاحب موصوف نے مؤکلوں سے مل کر وکالت نامے پر دستخط لیے اور پیروی کی تیاری شروع کی۔ اس میں دو ہفتے لگ گئے۔ اس دوران میں پلاؤڈن صاحب کا خرچ ملزموں کے ذمے پڑا۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوسکتا ہے کہ مقدمے میں ذمہ دار انگریز افسروں کی روش کس درجہ معاندانہ تھی۔ حکومت کی طرف سے استغاثے کی پیروی کپتان ہمفلیڈ کے ذمے تھی۔ اسسٹنٹ کمشنر بارکلے اس کا معاون تھا۔

پلاؤڈن صاحب کے اعتراضات

ملزموں کے خلاف مقدمہ دفعہ ۱۲۱ تعزیرات ہند کے ماتحت چلایا گیا تھا۔ استغاثہ یہ تھا کہ ستھانہ اور ملکا کے ہندوستانی مجاہدین حکمرانِ برطانیہ کے دشمن ہیں اور اس کے خلاف جنگ کر چکے ہیں۔ ملزم برطانوی رعایا ہیں، لیکن ان کے ذریعے سے مجاہدین کو روپے اور آدمیوں کی امداد ملتی رہی۔ اس طرح انھوں نے دانستہ اور غدارانہ اس عہدِ وفا و اطاعت کی خلاف ورزی کی جو رعایا کے ہر سچے اور وفادار فرد کے دل میں اپنے حکمران کے لیے موجزن رہنا چاہیے[2]۔

پلاؤڈن صاحب نے پہلا اعتراض یہ کیا کہ شہادت میں بتایا گیا ہے، ملزموں نے غیر ملکی دشمنانِ حکومتِ برطانیہ کے اقداماتِ دشمنی میں امداد کی یا اس کے لیے کوشش کی۔ یہ جُرم دفعہ ۱۲۱ تعزیراتِ ہند کے ماتحت نہیں آتا۔ مذکورہ دفعہ صرف ان اقداماتِ جنگ کے لیے ہے، جو

---

[1] HERBERT EDWARDES

[2] "روئداد مقدمہ انبالہ" ص۱۱۔

برطانوی رعایا برطانوی علاقوں کے اندر حکومت کے خلاف عمل میں لائے۔ سیشن جج نے یہ اعتراض مسترد کر دیا تو پلاؤڈن صاحب نے دوسرا اعتراض پیش کیا اور وہ یہ کہ میرے چھ مؤکلوں میں سے پانچ کے خلاف اس عدالت میں مقدمہ نہیں چل سکتا۔ انبالہ ڈویژن کی عدالتیں لفٹننٹ گورنر پنجاب کے ماتحت ہیں اور میرے پانچ مؤکل عظیم آباد کے رہنے والے ہیں، جو لفٹننٹ گورنر بنگال کے ماتحت ہے۔ ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۲۶ و ۲۷ کے مطابق جرائم کی تحقیقات یا تو ان اضلاع میں ہونی چاہیے، جہاں ان کا ارتکاب ہؤا یا ان اضلاع میں جہاں ان کے نتائج برآمد ہوئے۔ دفعہ ۲۸ کے ماتحت شرکت و اعانت کی کیفیت بھی یہی ہے۔ ہربرٹ ایڈورڈز نے یہ اعتراض بھی مسترد کر دیا۔

چوتھا باب

مقدمۂ انبالہ

(۳)

استغاثے کی شہادتیں کپتان پارسنز کے علاوہ استغاثے کی طرف سے بہت سی شہادتیں پیش ہوئیں، جن میں جماعتِ مجاہدین کے بعض کارندے، عظیم آباد، انبالہ، دہلی، ریواڑی وغیرہ کے مہاجن، تھانیسر کے نمبردار اور بھٹیارے بھی شامل تھے۔ ان سب کی تفصیلات بتائی نہیں جاسکتیں، لیکن جن شہادتوں کو دارو گیر میں نمایاں حیثیت حاصل ہے، ان کی کیفیت ذیل میں درج ہے:

۱ - عثمان علی بن حاجی نسیم الدین ساکن اوجھاپور ضلع چوبیس پرگنہ (بنگال)۔ اس گواہ نے جماعت کے ممتاز کارکنوں میں سے منشی ریحان الدین ناظر عدالت جیسور، مولوی میزان الحق (غالباً میزان الرحمٰن ڈھاکہ)، حاجی مفیض الدین (چوبیس پرگنہ)، منشی سید عبدالغنی اور سید عبدالحق کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔

۲ - معظم سردار بن برکت اللہ ساکن چاند پور (بنگال)۔ اس نے مولوی ابراہیم بن حاجی نصیر الدین ساکن پلاس پور (چاند پور سے چار کوس)، معین الدین اور قاضی غیاث الدین کا ذکر کیا۔

۳ - قاضی مراد علی بن شیخ وجیہ الدین ساکن چوکری پور (ضلع پبنہ بنگال)۔ یہ گواہ قاضی میاں جان کا بھائی تھا۔ جن حالات میں اُس نے گواہی دی ہوگی، وہ محتاجِ تصریح نہیں۔

۴ - لال محمد ساکن کمرگڈھی (عظیم آباد)۔ اس گواہ نے منشی عبدالہادی اور ہیبت اللہ کا ذکر کیا۔

۵ - عین الدین بن روشن (لالہ سرائے ڈھاکہ)۔ اس نے میزان الرحمٰن، قادر بخش اور وزیر محمد کا ذکر کیا۔

۶ ۔ سلیم الدین بن مہر اللہ (اسلام پور ضلع ڈھاکہ)۔ اس نے میزان الرحمٰن، طفیل اللہ یا طفیل علی، خدا بخش اور نجیب اللہ کا ذکر کیا۔

۷ ۔ صدر الدین بن جتبو (بھاگل پور ضلع مالدہ)، اس نے بصیر الدین، حاجی محمد، عبد العلی درزی (لال کرتی انبالہ) کا ذکر کیا۔

ان کے علاوہ غلام اکبر بن ملنگ غازی (گنانہ گڑھی بنگال)، محمد رفیع (برادر شیخ محمد شفیع)، حکیم محمد تقی بن فرید بخش (گنگوہ)، طالب علی نائب تحصیل دار پیپلی، غلام محمد ڈپٹی انسپکٹر پولیس اور عزت خاں (ہوتی مردان) کی شہادتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

شہادتوں کا نقشہ زیادہ تر شہادتیں ایسی تھیں، جن کا مدعا یہ تھا کہ ملزموں کے خلاف دعوت و تبلیغ کرنے یا روپیہ اور آدمی بھیجنے کے الزامات کو تقویت پہنچے۔ بعض افراد نے صحیح یا غلط بیان کیا کہ وہ اپنے وطن سے نکل کر عظیم آباد ٹھہرتے ہوئے مولانا یحییٰ علی، مولوی محمد جعفر، شیخ محمد شفیع یا ان کے کارندوں کی امداد سے ملکا پہنچے۔ پھر موقع پاکر وہاں سے بھاگے اور انگریز افسروں کی امداد سے وطن واپس آئے۔ ملزموں کے وکیل تمام گواہوں پر سخت جرح کرتے رہے۔ شیخ محمد شفیع کی طرف سے کمسریٹ کے دو انگریز افسر بھی پیش ہوئے، ایک کپتان اوگلوی[1] ڈپٹی اسسٹنٹ کمیسری جنرل، دوسرا کرنل ریڈی[2] ڈپٹی کمیسری جنرل۔ ان دونوں نے بیان کیا کہ شیخ محمد شفیع کا انتظام رسد ہمیشہ حد درجہ تسلی بخش رہا۔ افسر اس کے کام سے اس قدر مطمئن تھے کہ گرفتاری کے بعد بھی ٹھیکہ اسی کے نام رکھا۔ ایک صاحب نے یہ بھی بتایا کہ حکومت کے متعلق اس کے خیالات اچھے پائے گئے۔

مقدمے کی عمومی کیفیت ملزموں کے بیانات زیادہ مفصل نہ تھے۔ مولوی محمد جعفر لکھتے ہیں کہ مولانا یحییٰ علی تو وکیل مقرر کرکے روپیہ برباد کرنے پر راضی ہی نہ تھے، بلکہ اگر دوسرے لوگ ان کو نہ روکتے تو اپنے نیک اعمال کا اقبال کرنے کو تیار تھے، مگر ان کی طبیعت کچھ ایسی سیدھی اور بے عذر تھی

---

[1] OGILVIE

[2] REDIE

کہ جب ان سے مختار نامے پر دستخط کرنے کو کہا گیا تو اس پر بھی دستخط کر دیے[1]۔

مقدمہ یقیناً بے بنیاد نہ تھا۔ سب لوگ مجاہدین کی امداد میں حسبِ حیثیت سرگرم رہے، لیکن ان الزامات کا قانونی ثبوت فراہم کرنا مشکل تھا اور جو شہادتیں فراہم کی گئیں، ان میں بناوٹ اور سکھانے پڑھانے کا عنصر خاصا غالب تھا۔

ملزموں کے بیانات کے بعد پہلے گڈآل صاحب نے شیخ محمد شفیع اور منشی عبدالکریم کی طرف سے ایک لمبی تقریر کی، جو روئداد مقدمہ کے بیتالیس صفحات میں سمائی ہے۔ اس کے بعد مسٹر پلاؤڈن نے تقریر کی، جو روئداد کے تینتیس صفحات میں آئی۔ آخر میں بمفیلڈ نے دونوں تقریروں کا جواب دیا۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ گڈآل اور پلاوڈن نے الزامات کو بے بنیاد ثابت کرنے میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا، لیکن حکومت انگلشیہ سخت سزاؤں کا فیصلہ کر چکی تھی، لہٰذا یہ سعی بے نتیجہ رہی۔

فیصلہ ہربرٹ ایڈورڈز نے جو فیصلہ لکھا، وہ روئداد کے ایک سو پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی مخالف و موافق شہادتوں پر مفصل بحث کی۔ سماعت مقدمہ کے دوران میں حکومت نے حسبِ قاعدہ چار اسیسر بھی مقرر کر دیے تھے جن میں سے دو ہندو تھے اور دو مسلمان۔ مولوی محمد جعفر فرماتے ہیں: سیشن جج نے چاروں اسیسروں سے کہا کہ اپنی رائے لکھ کر پیش کرو:

> ہم نے دیکھا کہ یہ چاروں اسیسر اُس وقت بھی ہماری شکلوں کو دیکھ دیکھ کر آنسو بھر بھر لاتے تھے اور دل سے ہماری رہائی کے خواہاں تھے، مگر جب صاحب جج اور کمشنر کی رائے کو ہماری سزا پر مائل پایا تو مارے ڈر کے انھوں نے بھی لکھ دیا کہ ہمارے نزدیک سبھی جرم مندرجہ فرد قرارداد ان پر ثابت ہے[2]۔

ہربرٹ ایڈورڈز کے فیصلے کی اجمالی کیفیت ذیل میں درج ہے:

۱۔ شیخ محمد شفیع سزائے موت مع ضبطی جائداد۔ لاش گورستان جیل میں دفن کی جائے۔

۲۔ مولانا یحییٰ علی 〃 〃 〃 〃 〃 〃۔

---

[1] "کالا پانی" ص۲۱۔ [2] "کالا پانی" ص۲۳۔

۳ - مولوی محمد جعفر تھانیسری، سزائے موت مع ضبطیٔ جائداد

۴ - مولانا عبدالرحیم، حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور مع ضبطیٔ جائداد ۔

۵ - قاضی میاں جان، " " " ۔

۶ - میاں عبدالغفار، " " " ۔

۷ - منشی عبدالکریم، " " " ۔

۸ - عبدالغفور، " " " ۔

۹ - الٰہی بخش، " " " ۔

۱۰ - حسینی عظیم آبادی، " " " ۔

۱۱ - حسینی تھانیسری، " " " ۔

صرف منشی عبدالکریم اور حسینی تھانیسری کے متعلق ہربرٹ ایڈورڈز نے لکھا کہ قانوناً گنجائش ہوتی تو ان کی سزا کم کردی جاتی، نیز ہر ملزم کے سلسلے میں تصریح کی کہ اسیسر بالاتفاق اسے مجرم قرار دیتے ہیں، لیکن جن حالات میں اسیسروں نے یہ رائے دی، اس کی کیفیت اوپر پیش کی جاچکی ہے۔

ہربرٹ ایڈورڈز کے سوانح حیات اس کی بیوی نے دو جلدوں میں لکھے تھے۔ دوسری جلد میں مقدمہ انبالہ کے فیصلے کو" ایک نہایت اہم سیاسی کام" قرار دیا گیا ہے، لیکن جو حقائق اس سلسلے میں پیش کیے جاچکے ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ کام کی حیثیت کچھ بھی نہ تھی۔ بلاشبہ ملزمین علیٰ قدرِ مراتب مجاہدین کی امداد کرتے رہے، مگر جن شہادتوں کی بنا پر اس مقدمے کو خاص اہمیت دی گئی، ان میں سے زیادہ تر بے سروپا اور بناوٹی تھیں۔ پھر اُن شہادتوں کی وجہ سے ملزموں کو جو خوفناک سزائیں دی گئیں، ان پر حق و انصاف ہمیشہ خون کے آنسو بہاتے رہیں گے۔ یہ عدل نہ تھا، سراسر جوشِ انتقام تھا۔

جوڈیشل کمشنر کے پاس اپیل ہربرٹ ایڈورڈز کا فیصلہ ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو صادر ہوا تھا۔ پلاؤڈن اور گڈآل نے مزید فیس لے کر جوڈیشل کمشنر پنجاب کی عدالت میں اپیل دائر کردی۔ اُس زمانے میں رابرٹس[1]

[1] ROBERTS - پنجاب میں چیف کورٹ اس کے بعد قائم ہوا، پھر اسے ہائی کورٹ کا درجہ دیا گیا۔

جو ڈیشنل کمشنر تھا۔ اس نے بھی اڑسٹھ صفحے کا فیصلہ لکھا، جس میں مولانا یحییٰ علی، مولوی محمد جعفر اور شیخ محمد شفیع کی سزائے موت کو حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور میں بدل دیا، اس لیے کہ یہ سزا یحییٰ علی اور جعفر جیسے لوگوں کے لیے پھانسی کی موت کے مقابلے میں زیادہ تلخ و ناخوش گوار ہوگی[۱]۔ مزید لکھا کہ سب کے جرموں کا درجہ ایک جیسا نہیں۔ یحییٰ علی، قاضی میاں جان اور محمد جعفر تھانیسری کا جرم اوّل درجے کا ہے ان کی جائدادیں ضرور ضبط کی جائیں اور حبسِ دوام کی سزا بھی پوری دی جائے، یعنی معافی وغیرہ نہ ہو۔ عبدالرحیم، الٰہی بخش اور محمد شفیع کے جرم کا درجہ ذرا کم ہے۔ انھیں حبس دوام میں ضرور کچھ رعایت دی جائے، البتہ جائدادوں کی ضبطی لازم ہے۔ عبدالغفار اور عبدالغفور کے جرم درجے میں اور بھی کم ہیں۔ انھیں قید میں مزید رعایت دی جائے۔ ان سے کمتر درجہ عبدالکریم اور حسینی عظیم آبادی کا ہے اور سب سے کم درجہ حسینی تھانیسری کا۔ آخر میں تمام کاغذات لفٹنٹ گورنر پنجاب کے سامنے پیش کر دیے تاکہ وہ آخری آٹھ قیدیوں کے معاملے پر مرحمت کے نقطۂ نگاہ سے غور فرمائیں۔ یہ فیصلہ مری سے ۲۴۔ اگست ۱۸۶۴ء کو صادر ہوا۔

معلوم ہوتا ہے کہ لفٹنٹ گورنر کو بھی آخری فیصلے میں خاصا وقت لگا، اس لیے کہ جن تین بزرگوں کو پھانسی کا حکم سنایا گیا تھا، ان کی سزا عمر قید میں تبدیل ہونے کی اطلاع انھیں ۱۶۔ ستمبر ۱۸۶۴ء کو ملی۔

---

[۱] روئداد دانیالہ صفحہ ۵۰۰۔

پانچواں باب

قید اور کالا پانی

ذمّہ دار افسروں کا زورِ تعصب مولوی محمد جعفر لکھتے ہیں کہ جس روز سزا کا حکم سنایا جانے والا تھا، ہربرٹ ایڈورڈز نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ "تم بہت عقل مند، ذی علم اور قانون دان ہو اپنے شہر کے نمبر دار اور رئیس ہو، لیکن تم نے اپنی ساری عقل مندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا۔ اب تمھیں پھانسی دی جائے گی۔ جائداد ضبط ہو گی۔ تمھاری لاش بھی تمھارے وارثوں کو نہ ملے گی اور تمھیں پھانسی پر لٹکا ہوا دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو گی۔" میں نے جواب دیا:

جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے، آپ کے اختیار میں نہیں۔ وہ ربّ العزّت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے آپ کو ہلاک کر دے۔ اس جواب باصواب پر وہ بہت خفا ہوا مگر پھانسی کا حکم دینے سے زیادہ اور میرا کیا کر سکتا تھا[1]۔

مولوی محمد جعفر اٹھارہ سال کالے پانی گزار کر واپس آ گئے۔ ہربرٹ ایڈورڈز اس فیصلے سے چار سال بعد دسمبر ۱۸۶۸ء میں فوت ہو گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ مولوی صاحب موصوف کے بیان کے مطابق کپتان پارسنز پاگل ہو کر راہیِ ملکِ عدم ہوا۔

راہِ خدا کے جانباز مولوی صاحب کہتے ہیں: پھانسی کا حکم سن کر میں اتنا خوش ہوا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت مل جانے پر بھی اتنی مسرّت نہ ہوتی۔ مولانا یحییٰ علی بھی نہایت بشاش تھے، البتہ شیخ محمد شفیع کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس روز تماشائی بکثرت کچہری کے احاطے میں جمع تھے اور اکثر زار زار روتے تھے یا دم بخود ساکت کھڑے تھے۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں: پارسنز میرے نزدیک آ کر

[1] "کالا پانی" ص ۲۳، ۲۴۔

کہنے لگا: "پھانسی کے حکم پر تمھیں رونا چاہیے، اتنے خوش کیوں ہو؟" میں نے چلتے چلتے جواب دیا:

"شہادت کی امید پر (خوش ہوں)، جو سب سے بڑی نعمت ہے۔ تم اس کو کیا جانو"[1]

جیل خانے پہنچتے ہی پھانسی والے تینوں قیدیوں کو الگ الگ کوٹھڑیوں میں بند کر دیا۔ تنگ و تاریک کوٹھڑیاں، شدید گرمی کا موسم۔ ایک ہی رات میں مولوی محمد جعفر کے قول کے مطابق جہنم کا نمونہ سامنے آگیا۔ دوسرے ہی دن خود بخود تار کے ذریعے سے حکم پہنچ گیا کہ پھانسی والے قیدیوں کو رات کے وقت میدان میں باہر سلایا کرو۔

جیل والوں کی پیشکش جیل خانے کے دیسی کارکن یعنی وارڈر اور سپاہی ان بزرگوں کے بے حد معتقد ہو گئے، خصوصاً مولانا یحییٰ علی کے، جو ہر لحظہ توحید اور عملِ صالح کا وعظ فرماتے رہتے تھے۔ ان کی کوٹھڑی کے سامنے سکھ سپاہی آجاتا یا ہندو سپاہی، تھوڑی ہی دیر میں ہر ایک پر یہ کیفیت طاری ہوتی کہ کھڑا روتا رہتا۔[2] ایک رات سب محافظ باہم صلاح کر کے آئے اور ان تینوں بزرگوں سے کہا کہ آپ یہاں سے بھاگ جائیں۔ ہم پر بہ جرمِ غفلت مقدمہ چلے گا اور سزا ہو جائے گی، ہم اسے بھگت لیں گے، لیکن آپ کی جان تو بچ جائے گی۔ تینوں نے ان لوگوں کے حسنِ نیت اور ہمت کا شکریہ ادا کیا اور ان کے لیے دعا کی، مگر کہا کہ بھاگیں گے نہیں، خدا چھڑائے گا تو چھوٹ جائیں گے۔ مولوی محمد جعفر نے یہ بھی کہا کہ اس کی مرضی نہ تھی تو میں بھاگ جانے کے باوجود علی گڑھ سے پکڑا آیا۔ اب دوبارہ ایسی حرکت نہ ہوگی۔[3]

ابتلا بالائے ابتلا سوءِ اتفاق سے قیدیوں میں بخار نے وبا کی صورت اختیار کر لی اور اس میں بہت سے قیدی نذرِ اجل ہو گئے۔ قاضی میاں جان نے بھی جو بہت بوڑھے تھے، اسی وبا میں وفات پائی۔ مولوی محمد جعفر لکھتے ہیں: مرنے سے ایک روز پہلے انھوں نے خواب دیکھا تھا کہ ایک جواہر نگار تخت آسمان سے اترا اور اس پر بٹھا کر انھیں آسمان پر لے گئے۔ ضعف اور کبرسن کے باوجود وہ بڑے ہی صابر اور مستقل مزاج تھے۔[4]

---

[1] کالا پانی ص۲۵۔
[2] "تذکرہ صادقہ" ص۱۰۱۔ [3] "کالا پانی" ص۲۷ و ۲۸۔ [4] ایضاً ص۲۸۔

اس وبا میں مولانا یحییٰ علی ایک مہینہ سخت بیمار رہے۔ الٰہی بخش پاگل ہوگیا اور اس کی گردن پر پلستر لگائے گئے۔ میاں عبدالغفار بھی بیمار ہوگئے۔ مولانا عبدالرحیم اپنی مشقت بھی پوری کرتے، دوپہر اور شام کو ایک ایک گھنٹے کی چھٹی ملتی تو ہسپتال جا کر بیماروں کی بھی خبر لیتے۔ کسی کے کپڑے ملوث ہوجاتے تو انھیں دھو دیتے۔ مولوی محمد جعفر بھی سخت بیمار ہوئے۔ انگریزی دواؤں سے انھیں افاقہ نہ ہوا تو انگریز ڈاکٹر نے خود مولوی صاحب کی تجویز کے مطابق سیب، بہی کے مربّے، بنفشہ، انار کے شربت اور مفرح دوائیاں منگوا دیں۔

انھیں دنوں میں مولوی محمد جعفر کی والدۂ ماجدہ کو سانپ نے کاٹا اور وہ فوت ہوگئیں۔[۵] وہ بڑی جائداد کی مالک تھیں۔ جلیل القدر فرزند کی سزا کے بعد ان کی زمینیں اور مکان چھن گئے۔ اس انقلاب احوال سے ان پر جو گزری ہوگی، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ خدا جانے، وہ کہاں سوتی ہوں گی اور کس حالت میں وقت گزارتی ہوں گی، لیکن دنیا کی تکلیفیں کتنی ہی شدید ہوں، بہ حال عارضی ہیں۔ پائداری صرف آخرت کی زندگی کو ہے، جو حسنِ عمل اور راہِ حق میں تکالیف و شدائد پر صبر کا ثمرہ ہے۔ وہ مرحومہ یقیناً زیادہ سے زیادہ ثواب کی مستحق تھیں۔

مشقّت اور اس میں تخفیف پھانسی کی سزا حبسِ دوام میں بدلی تو ان بزرگوں کے سر اور ڈاڑھی مونچھ مونڈ کر انھیں منڈی بھیڑ کا سا بنا دیا گیا۔ مولانا یحییٰ علی ڈاڑھی کے کٹے ہوئے بال اٹھا کر کہتے تھے: "افسوس نہ کر، تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اس کی خاطر کاٹی گئی۔"

انبالہ جیل کا داروغہ نبی بخش، نائب داروغہ رحیم بخش اور دوسرے دیسی اہلکار ان کے بزرگوں کے دلی معتقد اور خیر خواہ تھے، لیکن انگریز سپرنٹنڈنٹ کے خوف سے بہ طورِ خود رعایتی برتاؤ نہ کر سکتے تھے۔ مولوی محمد جعفر کا بیان ہے کہ انھوں نے تینوں (یحییٰ علی، شفیع اور جعفر) کو کاغذ کوٹنے کے کام پر لگایا، جو مشقّت کا سب سے زیادہ سخت کام تھا۔ "تذکرہ صادقہ" میں ہے کہ مولانا یحییٰ علی رہٹ چلانے کے کام پر لگائے گئے تھے اور تمازتِ آفتاب میں یہ مشقّت کرتے کرتے آپ کے پیشاب میں خون آنے

---

۵ کالا پانی ص۲۸۔

لگا تھا۔ دو تین دن بعد خود سپرنٹنڈنٹ نے شیخ محمد شفیع اور مولانا یحییٰ علی کو سُوت کھولنے کے آسان کام پر لگا دیا اور مولوی محمد جعفر سے کہا کہ ردّی کاغذ پھاڑ پھاڑ کر چوبچے میں ڈالتے رہا کرو۔ بلکہ یہ بھی کہ دیا اس ردّی میں تمھارے ہاتھ کے لکھے ہوئے کاغذ بھی ہوں گے۔ اپنا دل بہلانے کو انھیں بھی پڑھتے ہی رہو ؛

مجیب الدین تحصیل دار انبالہ جیل کے قیدیوں میں مجیب الدّین تحصیل دار ساکن نارنول بھی تھا' جسے رشوت ستانی کے جرم میں سزا ہوئی تھی۔ غالباً ڈپٹی کمشنر اور کمشنر کے ایما پر اس نے مقدمۂ سازش کے بعض اسیروں کو ورغلا کر سرکاری گواہ بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انگریزوں نے مجیب الدّین سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جائے گا تو سزائے قید معاف کر کے اسے دوبارہ تحصیل دار بنا دیا جائے گا۔ مولوی محمد جعفر کو یہ حالات معلوم ہوئے تو اپنے ساتھیوں کو سمجھانا شروع کیا کہ ہماری دنیا تو خراب ہو گئی' اب آخرت کو کیوں برباد کرتے ہو ؟ مجیب الدّین نے یہ حالات دیکھے تو ذمّہ دار انگریز افسروں سے کہ دیا کہ جب تک محمد جعفر اور یحییٰ علی موجود ہیں' کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مولوی محمد جعفر' مولانا یحییٰ علی اور میاں عبدالغفّار کو دوسرے قیدیوں کے ہمراہ لاہور بھیجنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ بعد ازاں مجیب الدّین کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ شیخ محمد شفیع' منشی عبدالکریم' الٰہی بخش سوداگر اور بعض دوسرے اصحاب سرکاری گواہ بننے پر آمادہ ہو گئے۔ انھیں کے بیانات کی بنا پر مولانا احمد اللہ کو سزا ہوئی اور انھیں کی شہادتیں بعد کے مقدّمات کو کامیاب بنانے کا ذریعہ بنی رہیں ؛

اہلِ عظیم آباد کو ترغیب مولانا عبدالرّحیم کو اس لیے انبالہ جیل میں رکھا گیا کہ شاید ان کے ذریعے سے کچھ کام نکل سکے۔ وہ خود اپنے امتحانوں میں سے ایک امتحان یہ بتاتے ہیں :

> کمشنر صاحب و ڈپٹی کمشنر صاحب کی خواہش ہوئی کہ بہ ذریعۂ کمترین مولوی عبداللہ ساکن افغانستان سے پیغامِ مصالحت کیا جائے کہ جن سے بمقام امبیلہ وغیرہ سرکار سے جنگ ہوئی تھی اور وہ اس کمترین کے چچازاد بھائی تھے [۱]

[۱] " تذکرۂ صادقہ " صہ ۷۴ ؛

مولانا نے کچھ نہیں بتایا کہ پیغام مصالحت مولانا عبداللہ کو بھیجا گیا یا نہ بھیجا گیا۔ بھیجا گیا تو وہاں سے کیا جواب آیا، البتہ ایک مستند روایت کے مطابق اہلِ عظیم آباد کے پاس سرکار کی طرف سے تجویز پیش ہوئی تھی کہ مولانا عبداللہ کو راضی کر کے واپس بلا لو تو نہ صرف ضبط شدہ جائدادیں بحال کر دی جائیں گی بلکہ چھ لاکھ کی نئی جاگیر دی جائے گی۔ اہلِ عظیم آباد نے جس طرح طوفانِ ترہیب میں ایمان کی کشتی محفوظ رکھی تھی، اُسی طرح سرصرِ ترغیب سے بھی قطعاً متاثر نہ ہوئے ؀

یحییٰ علی، عبدالغفّار اور جعفر یہ تینوں بزرگ دوسرے قیدیوں کے ساتھ انبالہ سے پیدل روانہ ہوئے۔ لدھیانہ، پھلور، جالندھر اور امرت سر کے راستے لاہور پہنچے۔ پورے سفر میں ان کے بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ چند مہینے لاہور سنٹرل جیل میں گزارے۔ پھر ریل کے ذریعے سے ملتان اور وہاں سے کشتی میں سوار ہو کر کوٹڑی پہنچے۔ وہاں سے دوبارہ ریل میں سوار کر کے کراچی پہنچا دیے گئے۔ وہاں بھی تھوڑی دیر ٹھہرے رہے۔ پھر بادبانی جہاز میں بمبئی گئے اور کچھ مدّت تھانہ جیل میں گزاری۔ ۸۔ دسمبر ۱۸۶۵ء کو بمبئی سے جمنا جہاز میں سوار ہوئے اور چونتیس روز کے سفر کے بعد ۱۱۔ جنوری ۱۸۶۶ء کو پورٹ بلیئر (جزیرہ انڈمان) پہنچ گئے ؀

مولانا عبدالرّحیم مولانا عبدالرّحیم نے مزید کچھ وقت انبالہ جیل میں گزار کر ایک سال آٹھ مہینے کی مدّت لاہور جیل میں گزاری۔ انھیں ضیق النّفس کا عارضہ تھا۔ اس اثناء میں یہ عارضہ بہت تکلیف دیتا رہا۔ وہ بھی ریل میں ملتان، وہاں سے کشتی میں کوٹڑی، پھر ریل میں کراچی اور وہاں سے دخانی جہاز میں بمبئی پہنچے۔ بمبئی سے انڈمان تک کا سفر سخت مصیبت خیز تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ تمام قیدیوں کو جہاز کے نچلے حصّے میں ایک جنگلے کے اندر بند کر دیا گیا تھا۔ سیلون کے قریب پہنچے تو ہر قیدی کو پہلے دورانِ سر کا عارضہ شروع ہُوا، پھر قے اور دست جاری ہو گئے۔ نہ وہ بے چارے خود غلاظت صاف کر سکتے تھے، نہ جہاز والوں کو صفائی کا کچھ خیال تھا:

> اسی میں شب و روز رہنا پڑتا تھا۔ میں اپنی نماز پنج وقتی اس نجس حالت میں بلا وضو و تیمم کسی طور پر ادا کر لیتا تھا؀

خدا کی رحمت سے غیبی تائید کی ایک صورت پیدا ہوگئی۔ جہاز کا ایک خلاصی سخت بیمار ہوا۔ کپتان کے پاس دوائیں تھیں، لیکن ڈاکٹر کوئی نہ تھا۔ محافظ پلٹن کا جمعدار شیخ قاسم مولانا عبدالرحیم کو خاندانی شخص سمجھ کر ان کے پاس آیا، کیفیت بیان کی اور انھیں کپتان کے پاس لے گیا۔ مولانا طب سے آگاہ تھے۔ مریض کی حالت دیکھی۔ کپتان نے دواؤں کی الماری کھول دی۔ مولانا نے دوائیں سونگھ سونگھ کر روغن بید انجیر کی شیشی نکالی۔ اس میں سے ایک تولہ لے کر سونف اور پودینے کا تھوڑا تھوڑا عرق شامل کیا اور مریض کو پلا دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے افاقہ ہوگیا۔ جمعدار نے مولانا کے لیے کپتان کی منظوری سے اپنے قریب قیام کا انتظام کر لیا اور اسی کے ہاں سے کھانا ملنے لگا۔

طوفان کے باعث جہاز تیئیس دن کے بجائے ایک مہینا اور اکیس دن میں پورٹ بلیر پہنچا۔

سرکاری گواہوں کی حالت مقدمۂ انبالہ کے کُل گیارہ قیدی تھے، جن میں سے قاضی میاں جان انبالہ ہی میں فوت ہو چکے تھے۔ مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم، مولوی محمد جعفر اور میاں عبدالغفار انڈمان پہنچے۔ وہاں کے سوانح ایک مستقل باب میں بیان ہوں گے۔ باقی قیدیوں میں سے زیادہ تر سرکاری گواہ بن گئے تھے۔ ان کی کیفیت اختصاراً یہیں بتا دینی چاہیے:

۱۔ **شیخ محمد شفیع**: پچاس لاکھ کی جائداد ضبط ہوگئی۔ سرکاری گواہ بن جانے کے بعد اسے رہا کر دیا گیا۔ جائداد واپس نہ ملی۔ ۱۸۶۵ء اور ۱۸۷۱ء کے مقدمات میں اس نے گواہی دی۔ کُل دو سال قید رہا۔

۲۔ **عبدالکریم**: ڈیڑھ سال قید رہا۔ پھر مختلف مقدمات میں اس سے شہادتیں لی گئیں۔

۳۔ **عبدالغفور**: اس کی قید لفٹنٹ گورنر نے گھٹا کر حبسِ دوام کے بجائے دس سال کر دی تھی۔ ۱۸۷۱ء کے مقدمے میں یہ بھی سرکاری گواہ تھا۔

۴۔ **حسینی تھانیسری**: ۱۸۷۱ء کے مقدمے میں سرکاری گواہ بنا، کُل سات سال قید رہا۔

۵۔ **حسینی عظیم آبادی**: دس سال قید رہا۔ ۱۸۷۱ء کے مقدمے میں اس نے بھی شہادت دی تھی۔

۶۔ **الٰہی بخش**: یہ بھی سرکاری گواہ بن گیا تھا۔ مولانا احمد اللہ کے خلاف شہادت دی اور قید کی سزا

معاف ہوگئی ۔

شیخ الکل میاں نذیر حسینؒ یہاں یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ اس مقدمے اور مولانا احمد اللہ والے مقدمے میں، جس کا ذکر آئندہ باب میں آئے گا، شیخ الکل میاں نذیر حسین محدّث دہلوی بھی ہدفِ ابتلا بنے تھے۔ میاں صاحب مرحوم اہلِ حدیث کے سرتاج تھے۔ اہلِ حدیث اور "وہابیوں" کو مترادف سمجھا جاتا تھا۔ مخبروں نے میاں صاحب کے خلاف بھی شکایتیں حکومت کے پاس پہنچائیں۔ ان کے مکان کی تلاشی ہوئی اور بہت سے خط پائے گئے، جو ہندوستان کے مختلف حصوں سے آتے رہتے تھے۔ ان میں یا تو مسئلے پوچھے جاتے تھے یا مختلف دینی کتابوں کے متعلّق دریافت کیا جاتا تھا۔ میاں صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ کے پاس اتنے خط کیوں آتے ہیں؟ انھوں نے بے تکلّف جواب دیا کہ یہ سوال خط بھیجنے والوں سے کرنا چاہیے نہ کہ مجھ سے۔ ایک خط میں مرقوم تھا کہ "نخبۃ الفکر" (اصول حدیث کی ایک کتاب) بھیج دیجیے۔ مخبر نے کہا کہ یہ خاص اصطلاح ہے، جس کا مفہوم کچھ اور ہے اور یہ لوگ خطوں میں اصطلاحی الفاظ سے کام لیتے ہیں۔ میاں صاحب نے یہ سُنا تو جلال میں آگئے اور فرمایا:

نخبۃ الفکر کیا؟ توپ؟ نخبۃ الفکر کیا؟ بندوق؟ نخبۃ الفکر کیا؟ گولہ بارود؟[1]

بہرحال آپ کو دہلی سے راولپنڈی لے گئے اور وہاں کم و بیش ایک سال جیل خانے میں نظربند رکھا۔ دو آدمی ساتھ تھے: ایک میر عبدالغنی ساکن سورج گڑھ جو بڑے عابد و زاہد بزرگ تھے۔ انھوں نے جیل خانے ہی میں وفات پائی۔ میاں صاحب نے خود تجہیز و تکفین کی اور نماز جنازہ پڑھائی۔ دوسرے صاحب عطاء اللہ تھے، جنھوں نے اس زمانے میں پوری صحیح بخاری سبقاً سبقاً پڑھی اور قرآن مجید بھی حفظ کر لیا۔ میاں صاحب نے سرکاری لائبریری سے کتابیں منگوانے کی اجازت لے لی تھی اور ان کا بیشتر وقت مطالعے میں گزرتا تھا ۔

راولپنڈی ہی میں مجاہدین کے متعلّق بہت سے کاغذات جمع کر دیے گئے تھے، جن میں سے اکثر فارسی

---

[1] الحیات بعد الممات یعنی میاں نذیر حسین کے سوانح حیات، صفحہ ۸۱ و ۸۲

میں تھے۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد ان کاغذات کی جانچ پڑتال پر لگائے گئے تھے۔ وہ بھی دیر تک راولپنڈی میں مقیم رہے۔ ذوق کے دیوان کی ترتیب انھوں نے وہیں شروع کی تھی۔ میاں نذیر حسین کے خلاف کوئی الزام پایہ ثبوت کو نہ پہنچ سکا تو تقریباً ایک سال کے بعد انھیں ابتلا سے نجات ملی۔

میاں صاحب کے صاحبزادے مولانا سید شریف حسین کے ایک مکتوب سے واضح ہوتا ہے کہ چیمبرلین صاحب تحقیقات پر مقرر ہوے تھے۔ پہلے چند آدمی دہلی آئے اور میاں صاحب سے مجاہدین یا ان کے معاونین کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ پھر چیمبرلین کے حکم سے انھیں پشاور طلب کیا گیا۔ میاں صاحب پشاور پہنچے تو معلوم ہوا کہ چیمبرلین راولپنڈی چلا گیا۔ چنانچہ میاں صاحب کو راولپنڈی آنا پڑا۔ اس اثنا میں چیمبرلین کسی سرکاری کام کے سلسلے میں انبالہ گیا اور وہاں فوت ہوگیا۔ میاں صاحب اس کے قائم مقام کے انتظار میں راولپنڈی ہی میں ٹھہرے رہے۔ قائم مقام نے میاں صاحب سے مجاہدین کا پوچھا اور انھوں نے بے خبری ظاہر کی تو وہ بہت خفا ہوا۔ یہ خط اس زمانے میں لکھا گیا تھا جب میاں صاحب کی ابتلا پر پانچ مہینے گزر چکے تھے۔[1]

---

[1] مکاتیب نذیریہ صفحہ ۲۲۔

چھٹا باب

عظیم آباد کا پہلا مقدمہ

مولانا احمد اللہ مولانا احمد اللہ کے ابتدائی حالات پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے علم و فضل، زہد و تقدس، فہم و تدبر اور بلند حیثیتی کے باعث بہت معزز و محترم مانے جاتے تھے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ انھیں دینی مقاصد و عزائم سے گہری دل بستگی تھی۔ کوئی نہیں کہ سکتا کہ ان کے دل میں تحریکِ جہاد کے لیے زیادہ سے زیادہ تڑپ موجود نہ تھی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ انھوں نے براہِ راست تحریک کی تنظیم میں قطعاً قابلِ ذکر حصہ نہ لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ حصہ لینے کی ضرورت محسوس نہ کی، صرف یہ وجہ تھی کہ ان کے بھائی اور عزیز تقریباً سب کے سب تحریک میں سرگرمی سے شریک ہو چکے تھے اور انھوں نے تنظیم و اجرائے جہاد کے مختلف ذمہ دارانہ مناصب سنبھال رکھے تھے۔ ان حالات میں مولانا احمد اللہ کے لیے یہی مناسب تھا کہ جائداد کی نگرانی اور دیکھ بھال میں لگے رہیں تاکہ اہلِ خاندان کی عام ضرورتوں کے انتظام میں خلل واقع نہ ہو۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے صرف تھوڑی دیر کے لیے تنظیم کا کام سنبھالا تھا، جب ان کے بھائی مولانا یحییٰ علی مقدمۂ انبالہ کے سلسلے میں گرفتار ہو چکے تھے۔ گویا جس حد تک عملی سرگرمیوں کا تعلق ہے، مولانا احمد اللہ کے خلاف جو مقدمہ قائم کیا گیا، وہ حد درجہ کمزور تھا، لیکن حکومت کے دل میں بزرگانِ عظیم آباد کے خلاف ایک خاص جذبۂ عناد بھڑک اٹھا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ سید احمد شہید کے عقیدت مند خاندانوں میں سے کسی کو بھی اپاہج اور ناکارہ بنائے بغیر نہ چھوڑے۔ مولانا احمد اللہ نے اپنے ممتاز اوصاف کی بنا پر سب سے بڑھ کر توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ ان کے خلاف زبردست گواہ پیدا کر کے ایک خوفناک مقدمہ قائم کیا گیا۔ اس سلسلے میں دشمنی کی آگ کو ہوا دینے کا زیادہ تر کام ولیم ٹیلر نے انجام دیا، جسے ۱۸۵۷ء میں مولانا احمد اللہ کی نظر بندی

نقشہ مکانات

مولانا احمد اللہ، مولانا یحییٰ علی و مولانا عبدالرحیم

نوٹ :- یہ نقشہ پنجاب پبلک لائبریری کی کتاب "مقدمہ وہابیان" TRIAL OF THE WAHABIS سے لیا گیا ہے۔ میرے عزیز دوست خواجہ نور الٰہی صاحب لائبریرین نے ازراہِ عنایت اس نقشے کی ایک نقل تیار کرا دی، جس کے لئے وہ دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس نقشے سے مکانوں کی حقیقی حیثیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اب انھیں مٹے ہوئے کم و بیش نوّے برس گزر چکے ہیں اور ان کی جگہ بلدیہ عظیم آباد کی عمارتیں بن گئی ہیں۔ یہ خاکہ بطور یادگار محفوظ رہنا چاہیے۔

۱- یہ بڑا دروازہ تھا۔ جو لوگ باہر سے آتے تھے، وہ اسی دروازے سے قافلے والے مکان میں داخل ہوتے تھے۔

۲- یہ مولانا احمد اللہ کے مکان سے قافلے والے مکان میں آنے کا نجی راستہ تھا۔

۳- میرا اندازہ یہ ہے کہ باغیچے کے اردگرد راستہ چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے مکان بنے ہوئے تھے، جن میں باہر سے آنے والے لوگ رہتے تھے۔ چنانچہ جو نقشہ عدالت میں پیش کیا گیا، اس میں بتایا گیا ہے کہ مکان نمبر ۳ اور مکان نمبر ۴ میں امین الدین، سلام الدین اور بعض دوسرے لوگ رہتے تھے، جنھوں نے مقدمے میں مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم وغیرہ کے خلاف گواہی دی۔

کے باعث کمشنری کے عہدے سے استعفا دینا پڑا تھا اور وہ عظیم آباد ہی میں وکالت کر رہا تھا[1]۔

مقدمے کی کیفیت | اس مقدمے کی مفصل روئداد کہیں سے نہ مل سکی۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ مقدمۂ انبالہ کا فیصلہ ہو چکا تو حکومت مولانا احمد اللہ کی سزادہی میں سرگرم ہوئی۔ گرفتاری کے بعد انھیں سب سے پہلے مسٹر منرو[2] منصرم مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ پھر حسبِ دستور ان کا مقدمہ مسٹر اینسلے[3] سیشن جج کے سپرد ہوا۔ شیخ محمد شفیع، منشی عبدالکریم اور الٰہی بخش سوداگر اسیرانِ مقدمۂ انبالہ کے علاوہ ولیم ٹیلر کی کوششوں سے مقامی آدمیوں نے بھی مولانا کے خلاف گواہیاں دیں۔ مولانا مسعود عالم مرحوم لکھتے ہیں:

ان کے مقدمے کی ساری کارروائی اور فیصلے راقم کی نظر سے گزرے ہیں۔ پورا مقدمہ "بنایا ہوا" معلوم ہوتا ہے۔ خود حکّام کو اس بات کا اقرار ہے کہ الٰہی بخش (ملزم انبالہ) کی شہادت کے بغیر مولانا احمد اللہ کی سزایابی مشکل تھی[4]۔

مولانا احمد اللہ کے فرزندِ ارجمند علامہ حکیم عبدالحمید نے اس ابتلا کے متعلق "شہر آشوب" کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی، جس میں بتایا گیا ہے کہ مولانا سے ایک سال پیشتر ان کے چھوٹے بھائی یحییٰ علی کو انبالہ میں سزا ہو چکی تھی۔ رمضان ۱۲۸۱ھ کی آخری تاریخ (۲۷۔ فروری ۱۸۶۵ء) کو مولانا کے لیے سزا کا حکم صادر ہوا۔ معلوم ہے کہ پہلے ضبطیِ جائداد کے علاوہ پھانسی کی سزا کا فیصلہ سنایا گیا، پھر اسے

---

[1] جرنل بمبئی ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک مضمون میں بتایا گیا ہے کہ جب مولانا احمد اللہ کے مکان کی تلاشی لی گئی تو انھوں نے سات سو آدمی جمع کر لیے تھے اور وہ مجسٹریٹ کے مقابلے کے لیے تیار تھے۔ (جلد چہاردہم ص۳۵۶)۔ لیکن میرے نزدیک مولانا کی عام روش کو ایسی ہنگامہ جوئی سے کوئی مناسبت نہ تھی اور یہ سراسر افترا ہے جو کسی نے مولانا کو مجرم ثابت کرنے کے لیے وضع کیا۔

[2] MUNRO [3] AINSLIE

[4] "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" طبع دوم ص۱۴۱ و ۱۴۲۔ اس سلسلے میں مولانا نے مسٹر کاک برن کمشنر کے مراسلے بنام سیکرٹری حکومت بنگال، رقومہ ۱۳۔ مئی ۱۸۶۵ء کا حوالہ دیا ہے۔ یقیناً الٰہی بخش جیسے مُخلص کارکن کا مولانا کے خلاف گواہی دینے کے لیے تیار ہو جانا بڑا ہی افسوسناک تھا خصوصاً اس بنا پر کہ مولانائے موصوف نے مولانا یحییٰ علی کی طرح کبھی تحریک میں سرگرم حصّہ نہ لیا۔

حبسِ دوام میں بدل دیا گیا[1]

"تذکرۂ صادقہ" میں مرقوم ہے کہ مولانا کی گرفتاری کے وقت جو انگریز عظیم آباد میں ججی کے عہدے پر مامور تھا، وہ نہایت منصف مزاج، عادل اور نیک طینت تھا۔ حاسدوں نے سمجھا کہ جب تک یہ جج رہے گا مقدمہ سرسبز نہ ہوگا۔ چنانچہ اسے بدلوا کر دوسرا جج مقرر کرایا گیا جو مولانا کے مزاج اور طبیعت سے بالکل ناواقف تھا۔

مولانا کا صبر و استقامت حکیم عبدالحمید صاحب فرماتے ہیں کہ اہلِ شہر میں سے کچھ لوگ مولانا کے خلاف سرگرمِ عمل رہے:

زاں یکے دل سیاہ و نامش نور | ہم چناں نام زنگیِ کافور
واں دگر ریش گاؤ و تن فربہ | بر مراتب از آں بُز و خربہ[2]

مولانا کو پھانسی کا حکم سنایا گیا تو ان پر قطعاً کوئی پریشانی طاری نہ ہوئی۔ بالکل یہی کیفیت مولانا یحییٰ علی کی ہوئی تھی:

روز حکمِ قصاصِ ظلم قریں | نہ کسے دیدہ بر جبینِ شاں چیں
نارِ نمرود پیشِ شاں گلشن | نورِ ایماں ز روے شاں روشن
ہر دو در[3] خوبی و سلامت فردِ | کوہِ صبر و در استقامت فرد
خلق از حالِ شاں بہ بوالعجبی است | نہ ملول از اجل نہ شاد از زیست
نہ بہ دل شاں ز دار بیم و ہراس | نہ ز تیغ و تفنگ غم و وسواس
نہ پرستندۂ زر و جاہ اند | رنگ بردار صبغۃ اللہ اند
ساغرِ زندگی اگر پُر نیست | مُردنِ کس بہ جز تصوّر نیست

[1] ولیم ٹیلر کی سوانح حیات جلد ۲، صفحہ ۴۹۱۔

[2] میں نے بڑی کوشش کی کہ ان آدمیوں کے متعلق کچھ معلوم ہو جائے۔ افسوس کہ میں ناکام رہا۔ پہلے آدمی کے نام کا ایک حصہ یقیناً "نور" تھا۔ [3] یعنی دونوں بھائی احمد اللہ اور یحییٰ علی۔

آخر الامر شد بریں انجام | کہ نوشتند حکمِ حبسِ دوام
دُور از خانماں، جدا از زن | قربتِ غربت و جلائے وطن
تا کہ جاں را بہ جسم رابطہ است | مُردہ خواندن خلافِ ضابطہ است

ہم چناں ماند لیک صدمۂ فوت
حبسِ دائم بود خلیفۂ موت

جائداد کی ضبطی مصیبت محض یہ نہ تھی کہ ان بزرگوں کو حبسِ دوام کی سزا ہوئی۔ یہ قید کی تکلیفیں صابرانہ برداشت کر سکتے تھے، لیکن جائدادوں کی ضبطی کے باعث ان کے بال بچے بے خانماں کر دیے گئے تھے اور ان کے لیے نہ کہیں سر چھپانے کو جگہ تھی، نہ گزارے کا کوئی انتظام تھا، نہ ان میں سے کوئی بالواسطہ یا بلا واسطہ معین و شریکِ جرم سمجھا جا سکتا تھا۔ مسٹر راون شا[1] نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ عظیم آباد کے مسلمانوں نے منقولہ جائدادوں کی بولی نہ دینے پر اتفاق کر لیا تھا، بایں ہمہ جوشِ انتقام میں لاکھوں کی جائدادیں کوڑیوں میں دے دی گئیں۔ ۱۹۳۹ء میں یعنی نیلامی سے کم و بیش پچھتر سال بعد حاجی پور کے دیہاتی حلقے کے ممبر مسٹر عبدالحسن نے ان جائدادوں کی کیفیت دریافت کی تھی۔ جواب میں کرشن بلبھ سہائے نے جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ ذیل میں درج ہے:

جائداد غیر منقولہ:

		روپیہ	آنہ	پائی
۱	مولانا عبدالرحیم	۱۲۸۶۶	—	—
۲	مولانا یحییٰ علی	۲۰۶۰	۴	۰
۳	مولانا احمد اللہ	۵۸۷۷۶	۴	۰
	میزان =	۷۳۷۰۲	۸	۰

---

[1] RAVENSHAW

جائداد منقولہ:

	روپے	آنے	پائی
۱- مولانا عبدالرحیم	۲۳۲	۷	۱۰
۲- مولانا یحییٰ علی	۶۴۵	۰	۰
۳- مولانا احمداللہ	۲۵۱۷	۱۲	۹

واضح رہے کہ جائداد منقولہ میں تینوں بزرگوں کی کتابیں، مکانوں کا فرنیچر، یکے، گھوڑے، سنہری اور روپہلے زیور، پالکیاں وغیرہ نہایت بیش بہا چیزیں شامل تھیں اور یہ چیزیں بہت زیادہ قیمت کی تھیں۔ پھر ان کے مکان مسمار کرا دیے گئے اور ان کے محلّے صادق پور کا احاطہ بلدیہ عظیم آباد کو دے دیا گیا۔ اسی میں وہ جگہ بھی شامل تھی جسے "قافلہ" کہا جاتا تھا، اس لیے کہ وہاں مجاہدین اور جماعت کے کارکن ٹھہرا کرتے تھے۔[۱] وہاں بلدیہ کی عمارت قائم ہوئی۔

اہل وعیال کی بے بسی عید کے دن اہل وعیال کو مکانوں سے نکال دیا گیا۔ حکیم عبدالحمید فرماتے ہیں:

چوں شبِ عید را سحر کردند — ہمہ را از مکاں بدر کردند

ضبط و تاراج جملہ مال و متاع — نقد و جنس و ہمہ اثاث و زراع

بہرِ ما بود آہ جرمِ سخت — بُردنِ سوزنے ز جملہ رخت[۲]

من نہ تنہا کہ ہمرہم تن ہا — بچگان و زنان و شیون ہا

(میں اکیلا نہ تھا بلکہ ہمراہ بہت لوگ تھے — بچے تھے، عورتیں تھیں اور ان کی آہ و فریاد تھی)

احمداللہ بود مجرم شاہ — طفلک بے گناہ را چہ گناہ

(احمداللہ حکومت کا مجرم سہی، — لیکن بے گناہ بال بچوں کا کیا قصور تھا؟)

---

[۱] قافلے اور مکانات کا جو نقشہ مقدمے میں پیش ہوا تھا، اس کی نقل بطور یادگار کتاب میں شامل کر دی گئی ہے۔

[۲] ذرا تصور کیجیے کہ عید کے دن انھیں نکالا گیا اور کسی کو سوئی تک اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔

مایۂ عیشِ ساز ماتم شد عیدِ ما غرّۂ محرّم شد
(ہماری زندگی کا سرمایہ ماتم کا سامان بن گیا ہماری عید محرم کا چاند بن گئی)

زندہ بودم ولیک مردہ صفت ضَاقَتِ الْاَرْضُ لِیْ بِمَا رُحُبَتْ
(یقیناً میں زندہ تھا لیکن حالت مُردوں کی سی تھی میرے لیے زمین اپنی ساری وسعت پر بھی تنگ ہوگئی)

حکیم صاحب طبابت کرتے تھے اور انھوں نے مستقل دواخانہ قائم کر رکھا تھا۔ وہ بھی پورے کا پورا مع ادویہ ضبطی میں آگیا، گویا معمولی روزی کا سامان بھی ختم ہوگیا:

دلم از زخم زخم غم صد قاش عاجز از اکتساب وجہِ معاش
(میرا دل زخموں سے ٹکڑے ٹکڑے تھا، میں اپنی روزی پیدا کرنے سے محروم ہوگیا تھا)

بستہ از چار سُو درِ تدبیر دست بشکستہ پائے در زنجیر
(چاروں طرف سے تدبیر کے دروازے بند تھے ہاتھ ٹوٹے ہوئے اور پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے)

فرماتے ہیں کہ جو سامان ضبط ہوا، اس میں نادر چیزیں اور پارچات تھے۔ سب سے بڑھ کر رنج کتابوں کا تھا:

کُتبِ ملّتِ مسلماناں رفت در دستِ حرف ناخواناں
(مسلمانوں کی مذہبی کتابیں ناخواندہ لوگوں کے ہاتھ پڑ گئیں)

داند ایں ہر کہ باتمیز بود مالِ یغما کرا عزیز بود
(صاحب تمیز جانتا ہے کہ لوٹ کا مال کن لوگوں کو عزیز ہوتا ہے)

راست گویندہ ایں مثل گفت است دل بے رحم و دولت مفت است
(سچ کہنے والے نے یہ مثل کہی ہے مالِ مفت دلِ بے رحم)

اشتر و فیل و گاو و استر و اسپ باغ ہا و منازلِ دلچسپ
(اونٹ، ہاتھی، گائیں بیل، خچر، گھوڑے باغ اور عمدہ مکان)

آں بنا ہائے شامخ و محکم کہ بہ گیتی بود عدیلش کم
(وہ بلند و مضبوط عمارتیں جن کی مثال زمانے میں کم ملے گی)

اندر آں خانہ طالباں چو نجوم　　روز و شب مشتغل بہ درس علوم
(ان عمارتوں میں طالب علم ستاروں کی طرح　　رات دن علم پڑھنے میں مشغول رہتے تھے)

جملہ دیوار و سقف و خانہ و در　　بیل زن کردہ منہدم یکسر
(تمام دیواریں، چھتیں، مکان اور دروازے　　بیلچے والوں نے یکقلم ڈھا دیے)

آں عمارت نہ خرد تر بشکست　　کہ مرا شیشہ در جگر بشکست
(وہ عمارت ریزہ ریزہ نہ ہوئی　　کہنا چاہیے کہ میرے جگر میں شیشہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا)

خانہ را آں جماعتِ سفاک　　پاک رُفتند چوں خس و خاشاک
(ظالموں نے گھر کو اس طرح　　صاف کر دیا گویا اس میں جو کچھ تھا وہ خس و خاشاک تھا)

آخر میں اپنے آپ کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ پھر خدا کی بارگاہ میں دُعا کی ہے کہ تُو زمانے کا کارساز اور مالک ہے۔ تُو نے حضرت ایوبؑ کو مصیبتوں سے رہا کیا، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کو ملا دیا:

از تو روز و شب ایں دعا دارد　　نہ جز ایں ہیچ مدعا دارد
(میں بھی رات دن تجھ سے دعا کرتا ہوں　　اس کے سوا کوئی آرزو نہیں)

رنج را مایۂ نجاتم کُن　　گنجِ تکفیرِ سیّاتم کُن
(جو رنج میں نے اٹھائے ہیں انھیں میری نجات کا ذریعہ بنا　　اور میری بُرائیوں کے کفارہ کا خزانہ بنا دے)

مجتمع ساز و خانہ آبادم
(ہم کو اکٹھا کر دے، گھر کو آباد کر)

کُن ز دیدارِ عمّ و اب شادم
(اور مجھے والد اور چچا کے دیدار سے شاد کر)

کچھ معلوم نہیں کہ مولانا احمد اللہ عظیم آباد سے کب انڈمان گئے، صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم، میاں عبدالغفار اور مولوی محمد جعفر سے بہت پہلے ۱۵۔ جون ۱۸۶۵ء کو وہاں پہنچ گئے۔

ساتواں باب

مالدہ اور راج محل کے مقدّمے

مرکز عظیم آباد بلاشبہہ مجاہدین کو مدد پہنچانے والوں کے خلاف سخت دار و گیر شروع ہو گئی تھی۔ انبالہ اور عظیم آباد کے مقدّموں میں ملزموں کو حد درجہ ہول انگیز سزائیں دینے کا مقصد یہی تھا کہ تمام کارکنوں پر ہراس طاری ہو جائے اور وہ امدادی کام چھوڑ دیں، لیکن معاملہ مصلحت کا نہ تھا، یہ تھا کہ جو کام دین میں اصولی و بنیادی لحاظ سے ضروری ہے، اسے بہرحال انجام پانا چاہیے، خواہ کتنی ہی مشکلات پیش آ جائیں اس وقت مسلمانوں میں ایسے غیور و جسور افراد بہت کم رہ گئے تھے، جو حکومت کی دار و گیر سے بے پروا ہو کر یہ فرض انجام دیتے رہتے۔ تاہم ہر مرکز کو سنبھالنے کے لیے مردانِ کار سامنے آتے رہے۔ مثلاً مولانا احمداللہ کی گرفتاری اور سزایابی کے بعد مرکز کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا، اس کام کا بیڑا مولانا مبارک علی نے اٹھالیا۔ اس بزرگ کا وطن حاجی پور (ضلع مظفر پور، بہار) تھا اور وہ غالباً مولانا ولایت علی یا مولانا فرحت حسین سے بیعت ہوئے تھے۔ بیعت کے ساتھ ہی اپنا وطنِ مالوف چھوڑ کر تنظیم میں امداد کے لیے عظیم آباد ٹھہر گئے۔ مولانا مسعود عالم فرماتے ہیں:

> عجیب قیامت کا سماں تھا۔ ان حالات میں مولوی مبارک علی صاحب نے جان جوکھم میں ڈال کر تنظیم جماعت کا کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور ایک عرصے تک اپنا فرض حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ مقدمات سازش کی پیروی میں انھوں نے مولوی محمد حسن صاحب ذبیح کا ہاتھ بٹایا[۱]۔

[۱] ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، طبع دوم صفحہ ۱۰۸۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ مولوی محمد حسن ذبیح مولانا ولایت علی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ دار و گیر کے زمانے میں وہی زبیری اور جعفری خاندانوں کی کفالت کے ذمہ دار تھے اور انھیں نے تمام مقدمات کی پیروی کا بیڑا اٹھایا تھا۔

بالکل یہی کیفیت دوسرے مرکزوں کی تھی ؂

ہنٹر کا بیان اس امر کی تصدیق ہنٹر کے بیان سے بھی ہوتی ہے ۔ وہ لکھتا ہے :

"۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۸ء تک روپے کی فراہمی اور مجاہدین کی بھرتی بدستور جاری رہی اور سازش سے عہدہ برآ ہونے کے لیے حکومت کو ایک خاص محکمہ قائم کرنا پڑا ۔ یہ سطریں سپردِ قلم کرنے کے وقت "وہابیوں" کی دیکھ بھال کرنے اور انھیں جائز حدود کے اندر رکھنے پر صرف ایک صوبے میں جو کچھ خرچ ہو رہا ہے، وہ اتنا ہے کہ ایک ایسے برطانوی ضلعے کے دیوانی اور فوجداری انتظامی مصارف کے لیے کفایت کرے، جس کی آبادی پورے سکاٹ لینڈ سے ایک تہائی ہو ۔ فتنہ اس درجہ پھیل چکا تھا کہ پتا چلانا مشکل تھا ۔ انسداد کا کام کہاں سے شروع کیا جائے ۔ ہر ضلع کا مرکز (تنظیم مجاہدین کا مرکز) ہزاروں کنبوں میں بے چینی اور بدامنی پھیلاتا ہے ۔ ناظم مرکز کے خلاف امکانی شہادت انھیں لوگوں سے مل سکتی ہے، جو اس کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہوں ۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ اپنے مرشد کا راز فاش کرنے کے بجائے مرجانے کو ترجیح دیں گے"[۱] ؂

مرکزِ مالدہ مرکزِ مالدہ کی بنیاد ہنٹر کے بیان کے مطابق ۱۸۴۰ء کے لگ بھگ پڑی تھی ۔ اس بیان کا مفاد یہ ہے کہ مولانا ولایت علی کے ایک خلیفہ عبدالرحمٰن لکھنوی ضلع مالدہ میں تشریف لائے ۔ انھیں حالات سازگار معلوم ہوئے تو اسی ضلعے کے ایک گاؤں میں مدت تک ٹھہرے رہے ۔ ایک مقامی خاتون سے شادی کر لی اور مدرس کی حیثیت میں کام کرتے رہے ۔ گاؤں میں چھوٹے چھوٹے زمیندار رہتے تھے ۔ ان کے بچے مولوی عبدالرحمٰن کے پاس تعلیم پانے لگے ۔ بہ الفاظِ ہنٹر مولوی صاحب بڑے پُرجوش اور پُرتاثیر انداز میں لوگوں کو جہاد کی دعوت دیتے اور ان سے باقاعدہ اعانتی رقمیں وصول کرتے ۔ سال بہ سال جمع شدہ رقمیں اور فراہم شدہ آدمی اس غرض سے عظیم آباد بھیج دیتے کہ انھیں سرحد میں پہنچانے کا انتظام کر دیا جائے[۲] ؂

---

[۱] "ہندوستانی مسلمان" انگریزی ص ۹۱ ؂

[۲] ایضاً ایضاً ص ۱۷ ؂

مولوی امیرالدین | مولوی عبدالرحمٰن کے ماتحت رقمیں فراہم کرنے والوں میں ایک صاحب رفیق منڈل تھے، جن کے متعلق ہنٹر نے لکھا ہے کہ انھیں فراہم شدہ رقم کا ایک چوتھائی حصہ حقِ تحصیل کے طور پر ملتا تھا۔ رفیق منڈل نے مدّت تک کام بے خلل جاری رکھا۔ ۱۸۵۳ء میں اس کے متعلق شبہات پیدا ہوئے۔ تلاشی لی گئی تو ایسے خطوط برآمد ہوئے، جن سے ثابت ہوتا تھا کہ مرکز مجاہدین سے اس کا تعلق ہے۔ چنانچہ اس کی گرفتاری عمل میں آئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے رہائی پائی اور جماعتی کاروبار اپنے فرزند مولوی امیرالدّین کے حوالے کر دیا[1]۔

مولوی امیرالدّین نے انتہائی سرگرمی سے کام جاری رکھا اور مجاہدین کے لیے آدمی فراہم کرتے رہے۔ صرف ان کی گرفتاری پر یہ کام رکا۔ ہنٹر کا بیان ہے کہ مولوی صاحب کا حلقۂ کار پورے ضلع مالدہ کے علاوہ متّصلہ اضلاع میں سے مرشد آباد اور راج شاہی کے بعض حصّوں پر بھی مشتمل تھا۔ دریائے گنگا کے دونوں کناروں اور اس کے جزیروں میں بسنے والے مسلمان مولوی امیرالدّین کو بہت عزّت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ مولوی صاحب نے کُل کتنے آدمی فراہم کیے، لیکن مجاہدین کی ایک چوکی کے چار سو تیس آدمیوں میں سے کم و بیش دس فی صد موصوف ہی کے حلقے سے گئے تھے۔

فراہمئ زر کے طریقے | ہنٹر لکھتا ہے کہ مولوی امیرالدین چار ذریعوں سے روپیہ فراہم کرتے تھے:

۱۔ زکوٰۃ کی تمام رقمیں ان کی خدمت میں پیش کی جاتی تھیں۔

۲۔ صدقات کا پورا روپیہ ان کے پاس آتا تھا۔

۳۔ عیدالفطر کے موقع پر مسلمان بہ طور فطرانہ جو کچھ دیتے ہیں، وہ بھی مولوی صاحب ہی کے پاس جمع ہوتا تھا۔

۴۔ ان تین ذریعوں کے علاوہ مولوی صاحب نے حکم دے رکھا تھا کہ ہر گھر میں کھانا پکاتے وقت

---

[1] "ہندوستانی مسلمان" (انگریزی) صفحہ ۔ مولانا مسعود عالم نے خدا جانے کس بنا پر لکھ دیا کہ ہنٹر نے مولوی امیرالدین کو عبدالرحمٰن کا فرزند بنایا ہے حالانکہ اس نے مولوی صاحب کو رفیق منڈل ہی کا فرزند بنایا ہے۔ "منڈل" بنگال و بہار میں غالباً وہی معنی رکھتا ہے جو دکن اور وسطِ ہند میں "پٹیل" کے اور ہماں "نمبردار" کے ہیں۔ [2] "ہندوستانی مسلمان" (انگریزی) صفحہ ۴۲۔

کنبے کے ہر فرد کی طرف سے ایک ایک مٹھی چاول الگ رکھے جائیں اور ہر جمعہ کو جمع شدہ جنس اُس شخص کے حوالے کر دی جائے، جو گاؤں سے رقمیں وصول کرنے کا ذمّہ دار ہو[1]۔

ظاہر ہے کہ اس طرح لوگوں کو روپیہ یا جنس دینے میں چنداں تکلیف محسوس نہ ہوتی تھی اور تھوڑی تھوڑی رقمیں یا جنس جمع ہو کر معتدبہ امداد کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ دیہاتی تحصیل داروں پر بڑے تحصیل دار مقرّر تھے، جو سال بھر میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور پورے حلقے کا دورہ کرتے تھے۔ اس طرح وعظ و تبلیغ کا کام بھی انجام پاتا تھا اور لوگوں میں خدمتِ دین کا جذبہ بھی تازہ رہتا تھا۔ ہنٹر نے لکھا ہے کہ مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی اور مولانا فیّاض علی بھی مولوی امیر الدّین کے پاس قیام کر چکے تھے اور مولوی صاحب کا اصل وطن نارائن پور تھا[2]۔

راون شا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رفیق منڈل کے تین صاحبزادے تھے۔ ایک مولوی امیر الدّین دوسرے مولوی شکور محمد جو مجاہدین میں شامل ہو گئے تھے، تیسرے صاحبزادے کا پورا حال معلوم نہ ہوا۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ اس نے مضافات میں تبلیغ و تحصیل کا انتظام سنبھال لیا تھا[3]۔

مقدمۂ مالدہ | مولوی امیر الدّین اور ان کے رفیقوں کا راز مولانا احمد اللہ کے مقدّمے میں فاش ہو چکا تھا، لیکن خاصی دیر تک ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ یہ زمانہ غالباً تحقیق و تفتیش میں بسر ہوا۔ افسوس کہ اس مقدّمے کی روئداد نہ مل سکی۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ مولوی امیر الدّین پٹنہ میں گرفتار ہوئے۔ ان کے خلاف بغاوت کا مقدّمہ دائر کیا گیا۔ حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور اور ضبطیٔ املاک کی سزا ملی۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں وہ انڈمان پہنچے۔ مزید حالات دوسرے بزرگوں کی سرگزشت اسیری کے سلسلے میں بیان ہوں گے۔

---

[1] "ہندوستانی مسلمان" (انگریزی) ص ۷۳، ۷۴۔

[2] ایضاً ایضاً ص ۷۴، ۷۵۔

[3] "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" طبع دوم ص ۱۵۲۔

مقدمۂ راج محل | مقدمۂ مالدہ کے فوراً بعد ابراہیم منڈل ساکن اسلام پور (نواحِ راج محل[1]) کے خلاف مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ یہ بزرگ بڑے غیور دین دار تھے۔ بزرگانِ عظیم آباد سے ان کا تعلق تھا۔ راج محل کے پورے علاقے میں ان کے تقوے، دین داری اور جوشِ حمیت اسلام کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ یقین ہے کہ یہ جماعتِ مجاہدین کا کام بڑی سرگرمی سے کرتے ہوں گے، لیکن نہ اس کی تفصیلات معلوم ہیں، نہ مقدمے کی روئداد ہمارے سامنے آئی۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ ابراہیم منڈل کو اکتوبر ۱۸۷۰ء میں حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور اور ضبطیِ املاک کی سزا ہوئی تھی، البتہ انھیں انڈمان نہ بھیجا گیا۔ کچھ نہیں بتایا جا سکتا کہ اس کی وجہ کیا ہوئی۔ مولانا مسعود عالم کے بیان کے مطابق رسالہ اشاعت والسنہ میں مرقوم ہے کہ ابراہیم منڈل کو لارڈ لٹن کے حکم سے ۱۸۷۸ء میں رہا کر دیا گیا تھا۔ ان کا انتقال موجودہ صدی کے اوائل میں ہوا۔ ان کا پوتا زندہ ہے اور ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جنھوں نے ابراہیم منڈل کو دیکھا تھا۔ اسلام پور اور اس کا نواحی علاقہ آج بھی دین داری اور اخلاقی برتری کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ حکومت کی طرف سے مسٹر اوکنلے نے مقدمۂ مالدہ اور مقدمۂ راج محل کی پیروی کی تھی[2]۔

---

[1] راج محل پہلے ضلع مالدہ میں تھا، پھر مرشد آباد میں ضم ہو گیا۔ آج کل سنتھال پرگنہ میں شامل ہے۔

[2] "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک"۔ ص ۱۵۴ - ۱۵۶۔

آٹھواں باب

عظیم آباد کا دُوسرا مقدّمہ

(۱)

آخری بڑا مقدمہ مجاہدین کے خلاف آخری بڑا مقدمہ ۱۸۷۱ء میں بمقام عظیم آباد دائر ہوا۔ اس میں سات ملزم تھے: پیر محمد، امیر خاں، حشمت داد خاں[1]، مولوی مبارک علی، مولوی تبارک علی (ابن مولوی مبارک علی)، حاجی دین محمد اور امین الدّین۔ ان میں سے مولوی مبارک علی کے کچھ حالات پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔ مولوی تبارک علی کے خلاف یہ الزام تھا کہ وہ مولانا عبداللہ کے ساتھ جنگ امبیلہ میں شریک رہے اور ایک دستے کی کمان ان کے ہاتھ میں تھی۔ پیر محمد، دین محمد اور امین الدّین کے خلاف مجاہدین کی اعانت کا الزام تھا۔ امیر خاں اور حشمت داد خاں کے حالات آگے بیان ہوں گے۔

اس مقدّمے کی ابتدائی سماعت مسٹر باربور[2] منصرم جائنٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں یکم مارچ ۱۸۷۱ء کو شروع ہوئی۔ ۲۷۔ مارچ کو ملزموں پر فردِ جرم عائد کر کے انھیں سیشن سپرد کیا گیا۔ یکم مئی سے مقدّمے کی سماعت مسٹر پرنسپ[3] سیشن جج نے شروع کی، حکومت کی طرف سے ایک سو چھتّیس گواہ تھے، لیکن ایک سو تیرہ پیش ہوئے اور چھیالیس آدمیوں نے ملزموں کی طرف سے شہادتیں دیں۔ بیچ میں کچھ دیر کے لیے سماعت ملتوی بھی ہوتی رہی۔ غالباً ۱۸۷۱ء میں مقدّمے کا فیصلہ ہوا۔

حشمت داد خاں اور امیر خاں حشمت داد خاں اور امیر خاں دونوں خانانِ میوات میں سے تھے۔ حشمت داد خاں بن نجف خاں قصبہ اندور تحصیل تجارہ ریاست الور کا تھا اور بابر کے مشہور حریف

---

[1] انھیں عام لوگ حشم داد خاں لکھتے ہیں۔ صحیح نام حشمت داد خاں ہے۔ ان کے مفصّل حالات آئندہ باب میں بیان ہوں گے۔

[2] BARBOUR

[3] PRINCIP

حسن خاں میواتی کے اخلاف میں سے راجا جلال خاں کی نسل میں سے تھا۔ ۱۲۵۰ھ (۳۵-۱۸۳۴ء) میں اس نے حبیب اللہ خاں خانزادہ ساکن محلہ سلطان گنج عظیم آباد کی شرکت میں چمڑے کی تجارت شروع کی۔ یہ لوگ مال خرید خرید کر جہان خاں خانزادہ مقیم کلکتہ کے پاس آڑھت پر بھیجتے تھے۔ حشمت داد خاں نے اس زمانے میں جہان خاں کے ساتھ مل کر عظیم آباد کے محلہ عالم گنج میں ایک خوب صورت مسجد تعمیر کرائی جو اب تک حشمت داد خاں کی مسجد کہلاتی ہے۔

کلکتہ میں مرکز تجارت ۱۸۴۵ء میں جہان خاں کا انتقال ہوگیا اور اس کے بیٹے امام علی خاں نے ناتجربہ کاری سے آڑھت کا کاروبار تباہ کر لیا۔ حشمت داد خاں، امیر خاں اور زور آور خاں[1] نے مل کر کلکتہ میں اپنی آڑھت قائم کرلی۔ پہلے ایک گودام کرایے پر لے کر کام چلایا، بعد میں اپنا گودام بنا لیا اور ایک خوب صورت سہ منزلہ کوٹھی محلہ کولوٹولہ میں تعمیر کرائی، جس پر کثیر رقم خرچ ہوئی۔ یہ ۱۲۷۰ھ (۵۴-۱۸۵۳ء) میں تکمیل کو پہنچی۔ امیر خاں زیادہ تر وہیں رہتا تھا، لیکن عظیم آباد کی سکونت بھی ترک نہ کی۔ کاروبار بہت ترقی کر گیا اور یہ لوگ نامی گرامی سوداگر بن گئے۔

۱۲۷۶ھ (۶۰-۱۸۵۹ء) میں حشمت داد خاں نے حج کیا۔ واپس آکر کاروبار کی الگ شاخ بھی قائم کرلی۔ عظیم آباد کے گرد و نواح میں چمڑے کے بہت سے گودام بنا لیے اور مشترکہ آڑھت کے علاوہ کلکتہ میں اپنی جداگانہ آڑھت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں زور آور خاں کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد حشمت داد خاں اور امیر خاں کے خلاف مقدمہ دائر ہوا، جس کی تفصیلات آئندہ بیان ہوں گی۔

داستان ابتلا امیر خاں پر ابتلا کا آغاز ۱۸۶۴ء کے مقدمۂ انبالہ سے ہوا تھا، اس لیے کہ اہل عظیم آباد کی ہنڈیوں میں سے ایک ہنڈی امیر خاں کی دکان کے ذریعے سے بھی آئی تھی۔ چنانچہ کپتان پارسنز

---

[1] زور آور خاں بھی بہت بڑا تاجر تھا۔ آڑھت میں اشتراک کے علاوہ وہ امیر خاں کی عظیم آباد والی دکان کا ناظم و کارندہ بھی تھا، نیز اس نے بھاگل پور، جبل پور، گورکھ پور وغیرہ میں دکانیں قائم کر رکھی تھیں۔ ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۵ء) میں وفات پائی۔

کلکتہ گیا تو اس نے امیر خاں کی دکان کی تلاشی بھی لی[۱]۔ کہتے ہیں کہ خان موصوف کو گرفتار بھی کیا گیا تھا۔ یہ امر یقینی ہے کہ اس کا منشی صاحب علی اور شریک کار زور آور خاں مقدمۂ انبالہ کے گواہوں میں شامل تھے۔

امیر خاں اور حشمت داد خاں کی دین دارانہ زندگیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ انھیں مجاہدین کی تحریک سے دلی ہمدردی ہو گی اور یقیناً مالی امداد میں دریغ نہ کرتے ہوں گے، لیکن عملی امداد کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، البتہ یہ واضح ہے کہ وہ بہت بڑے تاجر تھے، یہاں تک کہ انھیں کروڑ پتی قرار دیا جاتا تھا۔ اس لیے انگریزوں کے علاوہ مختلف قوموں کے دیسی تاجر بھی انھیں اچھی نظروں سے نہ دیکھتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے خلاف رپورٹیں ہوتی رہیں۔ یکایک انھیں ۱۰۔ جولائی ۱۸۶۹ء کو ہفتے کے دن ایک بجے بعد دوپہر بنگال ریگولیشن ۱۸۱۸ء کے ماتحت گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کے لیے دو پولیس افسر آئے۔ اوّل مسٹر برچ[۲] ڈپٹی کمشنر پولیس کلکتہ، دوم مسٹر ریلی[۳] ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس۔ انھوں نے نہ کوئی وارنٹ دکھایا اور نہ گرفتاری کا کوئی سبب بتایا۔ عجیب امر یہ ہے کہ گرفتار کرتے ہی خان صاحب کو ایسٹ انڈین ریلوے کے سٹیشن ہوڑہ پر لے گئے، جو کلکتہ کی عدالتوں کے دائرۂ اختیار سے باہر تھا[۴]۔

حشمت داد خاں کو بھی اسی ریگولیشن کے ماتحت بتاریخ ۱۲ جولائی کلکتہ میں گرفتار کیا گیا۔ پہلے اسے کلکتہ سے عظیم آباد لے گئے، پھر دیلگا جیل پہنچا دیا جو عظیم آباد سے تین میل کے فاصلے پر ہے[۵]۔

امیر خاں کی پریشانی

امیر خاں کو ہوڑہ سے گیا لے گئے جہاں ۲۶۔ اگست ۱۸۶۹ء تک

---

[۱] "روئداد مقدمۂ انبالہ" ص ۳۶۔

[۲] BIRCH [۳] REILLY

[۴] "بڑا وہابی مقدمہ" (انگریزی) ص ۳۔

[۵] ایضاً ایضاً ص ۱۴۔

رکھا گیا۔ اس وقت اس کی عمر چھہتّر سال تھی۔ ریل کا سفر تیسرے درجے میں کرایا گیا۔ جیل میں اس کے قیام کے لیے ایسا کمرہ تجویز کیا گیا، جس کی چھت کھپریل کی تھی اور اسے مال گودام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ امیر خاں کے قیام کے وقت بھی اس کمرے کے دو تہائی حصے میں رسّے بھرے ہوئے تھے۔ پھر اسے علی پور جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ وجہ گرفتاری دریافت کرنے کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ اور آخر جولائی میں صرف اتنا بتایا گیا کہ گورنر جنرل با جلاس کونسل کے حکم سے گرفتاری عمل میں آئی ہے اور وارنٹ دکھانے کی اجازت نہیں۔ بریچ کے جواب کا مفاد یہ تھا کہ "رانی کے حکم" سے امیر خاں کو گرفتار کیا گیا[1]۔ "رانی" سے مراد ملکہ وکٹوریا تھی۔

---

[1] یہ تمام حالات مسٹر اینسٹے (AINSTEY) وکیل امیر خاں کی تقریر سے ماخوذ ہیں، جو ہیبیس کارپس کے سلسلے میں موصوف نے مسٹر نارمن چیف جسٹس کی عدالت میں کی۔ ملاحظہ ہو "بڑا وہابی مقدمہ" ص ۳-۶

نواں باب

عظیم آباد کا دوسرا مقدمہ

(۲)

ہیبیس کارپس کی درخواست مجبور ہو کر امیر خاں اور حشمت داد خاں کی طرف سے ہیبیس کارپس کی درخواستیں کلکتہ کی عدالت میں دی گئیں۔ اس سلسلے میں اسیروں کی طرف سے تین ممتاز وکیل پیش ہوئے: اول مسٹر اینسٹے[1]، جسے اس کام کے لیے بمبئی سے بلایا گیا تھا۔ مقدمے کی پیروی زیادہ تر اسی نے کی۔ دوم مسٹر انگرام[2] جس کی وکالت کی آمدنی اس زمانے میں ایک لاکھ ماہانہ سے کم نہ تھی۔ سوم مسٹر ایوانز[3] جس نے کوئی تقریر نہ کی۔ مقدمے کی سماعت یکم اگست ۱۸۷۰ء سے شروع ہوئی۔ پہلے مسٹر اینسٹے نے امیر خاں اور حشمت داد خاں کے حالات گرفتاری و اسیری پیش کیے۔ جن کے سلسلے میں اس امر پر زور دیا کہ ملکۂ وکٹوریہ کے اعلان کے بعد تمام ہندوستانیوں کو وہی حقوق آزادی حاصل ہیں جن سے انگریز انگلستان میں مستفید ہیں، لہٰذا ان حقوق سے تعرض سراسر غیر منصفانہ ہے۔

اس کے بعد کئی روز تک ایڈووکیٹ جنرل کی تقریر جاری رہی، جس میں قابلِ ذکر صرف دو امر تھے:

---

[1] یہ شخص انیسویں صدی کے مشہور انگریز وکلاء میں سے تھا۔ کچھ مدت کلکتہ میں رہا، پھر بمبئی میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ چند مہینے ہائی کورٹ کا جج بھی رہا۔ ۱۷۔ اگست ۱۸۷۳ء کو بمبئی میں وفات پائی۔ سوانح نگاروں نے لکھا ہے: "تیز مزاجی کے باعث معاصرین سے اکثر اس کے جھگڑے رہتے تھے، لیکن ہیبیس کارپس کے مقدمے میں اس نے جو طویل تقریریں کیں، وہ متانت اور ثقاہت سے لبریز تھیں۔

[2] INGRAM۔ اس نے ہیبیس کارپس کے مقدمے میں جو تقریر کی، وہ بڑی ہی تیز اور بےباکانہ تھی، یہاں تک کہ سرکاری وکیل وہ تقریر سن چیخ اٹھا۔

[3] EVANS۔ یہ انگریز ۱۸۷۶ء سے ۱۸۹۹ء تک گورنر جنرل کی کونسل کا ممبر رہا۔ البرٹ بل کے مباحث کو ختم کرنے میں اس نے نمایاں حصہ لیا تھا۔

اوّل یہ کہ ہندوستانیوں کو مساوی درجہ حاصل نہیں، دوم یہ کہ ان میں مذہبی جنونی موجود ہیں جو بغاوت پھیلاتے ہیں۔ انھیں کو "وہابی" کہا جاتا ہے۔ پھر مسٹر اینسٹے نے طویل تقریر میں سرکاری وکیل کی ایک ایک دلیل رد کی اور ثابت کر دیا کہ امیر خاں اور حشمت خاں کی گرفتاری سراسر غیر منصفانہ تھی۔

مسٹر انگرام کی تقریر

۱۶۔ اگست کی سماعت میں مسٹر انگرام نے ایک نہایت پُر تاثیر تقریر کی، جس میں قانونی نظائر پیش کرنے کے علاوہ فرمایا:

جناب والا! فرض کیجیے کہ آپ برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ فرض کیجیے کہ آپ شمالی اٹلی میں سفر کر رہے ہیں اور آپ کو میلان کے قید خانے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ وہاں ایک معزز قیدی سے دوچار ہوتے ہیں، جسے دوستوں، محبّوں اور قانونی مشیروں سے الگ کر دیا گیا، اس کا کاروبار تباہ کرا دیا گیا اور اس کے معاملات بربادی کی آخری منزل پر پہنچ گئے۔ غور فرمائیے، جناب والا! آپ کی روش کیا ہوگی؟ یقیناً آپ اس پورے معاملے کو ساری مہذب دنیا میں نشر کریں گے۔ میں، جناب والا! حتمی اقرار کرتا ہوں کہ امیر خاں کے مقدمے اور حکومت ہند کی حماقت کو انگلستان کے چپے چپے میں نشر کروں گا۔ جو آنکھیں اوائریو[1] کے مصائب پر آنسو بہا چکی ہیں، وہ امیر خاں کے مصائب پر بھی روئیں گی۔ اوائریو کبھی بمبا کے تاریک تہ خانوں سے باہر نہ نکلتا۔ اگر مسٹر گلیڈسٹون کی انسانیت پرور کوششیں بروئے کار نہ آتیں۔ جناب والا! انگریز قوم سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ امیر خاں کے مقدمے کے متعلق اپنا فتویٰ صادر کرے۔ کیا اس باب میں کوئی شبہہ ہے کہ وہ فتویٰ کیا ہوگا؟ یہ انھیں حروف اور انھیں آتشیں الفاظ میں لکھا جائے گا، جنھوں نے آشوری

[1] یہ اٹلی کا ایک محب وطن شاعر تھا، جو آسٹریا کے خلاف آزادی کی جنگ کرتا ہوا گرفتار ہوا۔ آسٹریا والوں نے اسے قید میں سخت تکلیفیں دیں۔ گلیڈسٹون کو سیاحت اٹلی کے دوران میں اس کے حالات معلوم ہوئے جنھیں اس نے خوب نشر کیا۔ یوں گلیڈسٹون ہی کی کوششوں سے اسے رہائی ملی۔ انگرام نے شمالی اٹلی اور میلان کے جیل خانوں کا ذکر اسی لیے کیا تھا کہ وہ گلیڈسٹون کے ذریعے معلومات اور اسیر کی رہائی کے لیے سرگرم کوششوں کا ذکر منظر عام پر لانا چاہتا تھا۔ وہ خود امیر خاں اور حشمت داد خاں کے متعلق انھیں سرگرمیوں کا عزم کیے بیٹھا تھا جو گلیڈسٹون نے اوائریو کی رہائی کے لیے اختیار کی تھیں۔

بادشاہ کی روح پر پژمردگی طاری کر دی تھی۔ فتویٰ یہ ہوگا: ولیم گرے اور لارڈ میو[1]! تم نے برطانوی رعایا پر ظلم کیا۔ تم نے انگریزی قانون کی حرمت زائل کی۔ تم ترازو میں تولے گئے اور پورے نہ اترے۔

فیصلہ اور دوسری درخواست جیسا کہ یقین تھا، مسٹر جسٹس نارمن نے ۱۹۔ اگست ۱۸۷۰ء کو ہیبیس کارپس کی دونوں درخواستیں نامنظور کر دیں گویا فیصلہ امیر خاں اور حشمت داد خاں کے خلاف ہؤا۔ اسی دن مسٹر اینسٹے نے دونوں کے لیے ضمانت کی درخواستیں دے دیں۔ ۸۔ ستمبر کو ان درخواستوں کی سماعت ہوئی۔ فیصلہ پھر خلاف صادر ہؤا، لیکن اس سے پیشتر مسٹر اینسٹے عدالت کو اطلاع دے چکا تھا کہ اس نے امیر خاں اور حشمت داد خاں کی طرف سے سر ولیم گرے اور لارڈ میو کے خلاف برطانیہ میں دو مقدمے دائر کر دیے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان مقدموں کے سلسلے میں کیا کارروائی ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ پہلے حکومت ہند ان دونوں بزرگوں کو کسی قانونی کارروائی کے بغیر ہی نظر بند رکھنا چاہتی تھی۔ جب دیکھا کہ اس میں کامیابی کی امید نہیں تو عظیم آباد کے دوسرے مقدمے میں انھیں الجھا لیا گیا۔

آخری فیصلہ اس مقدمے میں بھی اینسٹے اور انگرام امیر خاں اور حشمت داد خاں کی طرف سے پیروی کرتے رہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک موقع پر اینسٹے کو بمبئی جانا پڑا تو اخبار "انگلشمین" میں یہ لکھ دیا گیا کہ اینسٹے فیس کی کمی کے باعث بددل ہو کر چلے گئے۔ موصوف نے اس جھوٹی خبر کی تردید کرتے ہوئے مقدمے کو سراسر شرمناک بتایا[2]۔

مسٹر پرنسپ سیشن جج کو سماعت کے دوران میں بے ضابطگیوں کا علم ہو چکا تھا۔ انھوں نے بعض بے ضابطگیوں کی تصریح بھی کی۔ حشمت داد خاں اور پیر محمد کے خلاف کوئی بات ثابت نہ ہو سکی۔ لہٰذا ۴۔ جولائی ۱۸۷۱ء کو انھیں اس لیے رہا کر دیا گیا کہ بادی النظر میں وہ بے قصور ہیں۔ باقی پانچ

---

[1] ولیم گرے بنگال کا لفٹنٹ گورنر تھا اور لارڈ میو گورنر جنرل۔ [2] ان کے اصل الفاظ یہ تھے:

THE SHAMEFUL CASE MISCALLED WAHABI ENGUIRY

ملزموں کو معمول کے مطابق حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور اور ضبطیِ جائداد کی سزا دی گئی۔ حالانکہ ان کا کوئی خاص جرم نہ تھا۔ خصوصاً امیر خاں کو اس سزا سے دو سال بیشتر بے وجہ ہدفِ آزار بنایا گیا تھا۔

امیر خاں اور مبارک خاں اس کے بعد امیر خاں کے وارثوں نے اس کی رہائی کے لیے بڑی کوششیں کیں۔ ان کا کاروبار گرفتاری کے زمانے میں تباہ ہو چکا تھا۔ جائداد فیصلۂ سزا کے بعد ضبط کر لی گئی تھی۔ پھر اس کبیر السّن بزرگ کو قید میں رکھنے کی کون سی وجہ ہو سکتی تھی؟ افسوس کہ لارڈ میو کی حکومت کسی درخواست سے متاثر نہ ہوئی۔ صرف اتنا ہوا کہ امیر خاں کو انڈمان نہ بھیجا گیا۔ مولوی مبارک علی بھی انڈمان نہ بھیجے گئے اور وہ بے چارے ہندوستان ہی میں بہ حالتِ اسیری جان بحق ہوئے۔ امیر خاں کے متعلق ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۷۸ء میں انھیں رہا کر دیا گیا[۱]۔ ایک بیان میں ان کی رہائی کی تاریخ ۱۸۷۹ء بتائی گئی ہے[۲]، جو غلط ہے۔

امیر خاں کی وفات گرفتاری کے وقت امیر خاں کی عمر پچھتّر سال بتائی گئی تھی۔ رہائی کے وقت وہ کم و بیش پچاسی سال کے سن کو پہنچ چکا ہوگا؛ دس سال اس نے سخت تکلیفوں میں بسر کیے، لہٰذا صحت بہت بگڑ چکی ہوگی، تاہم صاحبِ عزیمت مسلمان کی طرح رہا ہوتے ہی اس نے اپنا کاروبار ازسرِ نو شروع کر دیا، لیکن زمانے کی نیرنگیاں ملاحظہ ہوں۔ کاروبار شروع کیے چند ہی روز ہوئے تھے۔ اس نے مسجد کے نزدیک ایک مکان کرایے پر لے لیا تھا۔ مغرب کے قریب ادائے نماز کے لیے اپنے مکان سے آہستہ آہستہ مسجد کی طرف جا رہا تھا کہ ایک گھوڑا گاڑی تیزی سے آئی اور اس سے ٹکرائی۔ صدمے سے یہ بیچارا گر پڑا۔ ناک سے خون جاری ہو گیا۔ بہ حالتِ غشی اٹھا کر مکان پر پہنچایا گیا۔ نیم ساعت بعد اسی حالت میں وفات پائی۔ ۱۳۔ ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ (۸۔ نومبر ۱۸۷۸ء) تاریخ تھی اور ہفتے کا دن۔ کلکتہ میں میّت کو غسل دے کر بذریعہ ریل عظیم آباد لے گئے اور وہاں ایک باغ میں دفن کیا۔

تاریخِ وفات مولوی واحد علی صاحب نے طویل تاریخ وفات لکھی، جس میں حادثے کی تفصیلات

---

[۱] رسالہ "اشاعت السنۃ" جلد ۵، نمبر ۱۲ بہ حوالہ "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" ص ۱۶۸۔

[۲] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، بمبئی جلد ۱۴ ص ۳۷۵ بہ حوالہ ایضاً ایضاً۔

بھی بیان کر دیں۔ اسے بہ طورِ یادگار ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

دانی بہ کلکتہ چیساں پیش آمد امرِ ناگزیر — گردید از آں، در شہرہا آندوہگیں پیر و جواں
ذی قعد را چوں شنبہ شہم سیزدہ تاریخِ او — ایں واقعہ، ایں حادثہ گردید وا قع ناگہاں
یعنی امیرِ نامور، می دانی نام نامیش — گر ضم کنی لفظ "امیر" اے مہرباں بالفظ "خاں"
بعد از رہائی خانۂ بگرفت نزدِ مسجدے — بہرِ نماز از آں مکاں ہنگام مغرب شد رواں
طے راہِ مسجد می نمود آہستہ آں عالی منش — در شاہرہ از اتفاق آمد یکے گردوں دواں
ضربے چو بر سر زاں رسید افتاد بر روے زمیں — برپا شد از ہر چار سو ہنگامۂ شور و فغاں
خویش و ملازم زیں صدا ہر سو شتاباں آمدند — دیدند حالش ایں چنیں بردند باز اندر مکاں
تا نیم ساعت در غشی ماندند بے ہوش و حواس — ہم دیدہ می شد دم بدم خون است از بینی رواں
ناگہ رسید آں وقت کو، انساں مجبور است ازو — ناچار رخت عمر شاں بربستہ شد سوے جناں
کس گفت از واحد بگو تاریخ سالِ عیسوی — تا یاد ماند بعد ازیں تاریخ سالِ فوت شاں
واحد بگفتا: روحِ او رفتہ سوے خلدِ بریں — زاں بعد شد از جان و دل مصروف در تجہیزِ آں
دادند چوں غسل و کفن [۷۸] بُردند اندر مسجدش [۱۸] — خواندہ نمازِ میتش خلقِ خدا اے دو جہاں
خویش و عزیزاں ہم چناں در پٹنہ بیروں خاستہ — تا آنکہ آخر نعشِ شاں بر ریل گردیدہ رواں
واحسرتا چوں ریل بر اسٹیشنِ پٹنہ رسید — بہرِ گرفتن آمدند آں نعش ہر پیر و جواں
ہمراہِ نعش آنجا شدہ مجمع ز خویش و اقربا — زاں جا نہادہ بر پلنگ آوردہ اندر بوستاں
کردند ادا بارِ دگر ایں جا نمازِ نعش را — بس دفن اندر بوستاں کردند با آہ و فغاں

تاریخ ہجری واحد از کروبیاں پرسید و گفت
آباد رضوان و جناں جنت مقامش شد بداں

۹۵ ھ ۱۲

حشمت داد خاں کی وفات حشمت داد خاں نے بھی رہائی کے بعد اپنا کاروبار از سرِ نو درست

کر لیا۔ اس نے امیر خاں سے کچھ مدّت پیشتر ۵۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۴ھ (۸۔ مئی ۱۸۷۷ء) کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔ تاریخِ وفات یہ ہے:

شکر آں منعمے کہ او بہ عباد　　نورِ ایماں بہ خان حشمت داد

پس ازاں وقت آخری چو رسید　　بے ہمہ شُد و جان شیریں داد

یک ہزار و دوصد و نوّد و چار　　سال تاریخِ آں بہشت آباد

۱۲　ھ　۹۴

اس کے صاحبزادے عبداللہ خاں نے ۲۔ شوّال ۱۲۹۵ھ (۲۹۔ ستمبر ۱۸۷۸ء) کو وفات پائی۔ اس کی وفات کا مادّۂ تاریخ "یغفرہٗ" ہے[1]۔

دوسرے مقدمۂ عظیم آباد کے باقی اسیروں میں سے صرف مولوی تبارک علی کے حالات معلوم ہیں جو سرگزشت انڈمان کے سلسلے میں بیان ہوں گے۔

نارمن پر حملہ آخر میں اتنا اور بتا دینا چاہیے کہ ہیبیس کارپس اور دوسرے مقدمات میں جس چیف جسٹس جان نارمن نے خلاف فیصلے صادر کیے تھے، اس پر ایک صاحب عبداللہ پنجابی نے احاطۂ عدالت میں قاتلانہ حملہ کیا اور ۲۱۔ ستمبر ۱۸۷۱ء کو نارمن صاحب نے وفات پائی۔ تحقیقات پر معلوم ہوا کہ عبداللہ دماغی خرابی کے عارضے میں مبتلا تھا۔ ہنٹر نے اپنی کتاب کے صفحہ ۹۸ پر اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن اس کے باوجود اسے پھانسی کی سزا دی گئی۔

---

[1] حشمت داد خاں اور امیر خاں کے یہ حالات "مرقع مبہوات" مصنفۂ شرف الدین خاں ساکن سانٹھاواڑی ضلع گوڑگانوہ سے ماخوذ ہیں۔ یہ مجھے پروفیسر محمد سلیم صاحب دواخانہ حمیدیہ نوّاب شاہ سے ملے، جن کے لیے موصوف دلی شکریے کے مستحق ہیں۔

دسواں باب

سرگزشت انڈمان

(۱)

تمہید | راہِ حق کے ان مجاہدوں کو گرفتاری، تفتیش اور مقدمے کے دوران میں جن خوفناک مصائب سے سابقہ پڑا، ان کی سرسری کیفیت گزشتہ ابواب میں پیش کی جا چکی ہے بلکہ وہ حالات بھی بتائے جا چکے ہیں، جو سزا کے بعد انڈمان پہنچنے تک پیش آئے، تاہم ان کی مصیبتیں یہیں ختم نہ ہوئیں۔ انڈمان میں قید کی مدت بھی بیشتر پریشانیوں ہی میں گزری، اگرچہ ان میں سے بعض افراد نے افتاد کو ناگزیر اور من اللہ سمجھتے ہوئے ہجوم مشکلات کے باوجود زندگی بہ اطمینان گزارنے کے سامان پیدا کر لیے۔ یہ دَور ابتلا پہلے دَور کا ضمیمہ ہے، لہٰذا اس کے حالات بھی جس قدر معلوم ہو سکے، عرض کر دینے چاہییں تاکہ حق و آزادی کی خاطر قربانیوں کی یہ خونچکاں داستان تا بہ حدِ امکان مکمل ہو جائے۔

جزائر انڈمان | انڈمان بحرِ ہند میں چھوٹے بڑے ایک ہزار جزیروں کا مجموعہ ہے، جو کلکتہ سے سات سو اسّی میل جنوب میں، رنگون سے تین سو ساٹھ میل جنوب مغرب میں، مدراس سے سات سو چالیس میل جنوب مشرق میں اور سیلون سے اتنی ہی دُور مشرق میں واقع ہیں۔ ان جزیروں کی عام تقسیم یہ ہے: انڈمان کلاں اور انڈمان خورد، انڈمان کلاں پانچ بڑے جزیروں پر مشتمل ہے: شمالی انڈمان، وسطی انڈمان، جنوبی انڈمان، بارا تانگ اور رٹ لینڈ۔ اردگرد کے چھوٹے جزیروں کا شمار نہیں ہو سکتا۔ انڈمان خورد ان کے جنوب میں ہے۔ مزید جنوب میں جزائر نکوبار شروع ہو جاتے ہیں۔ انڈمان کلاں کے مختلف جزیرے سرسری نظر میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے معلوم ہوں گے، لیکن اصل میں ان سب کو تنگ آبنائیں ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔

ان جزیروں سے متعلق ابتدا میں خوفناک افسانے مشہور رہتے تھے۔ ستمبر ۱۷۸۹ء میں پہلے پہل انگریزوں نے ان میں اسیروں کی نوآبادیاں قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ لفٹننٹ بلیئر وہاں کچھ قیدی لے کر گیا، جس کے نام پر جزیرے کا دارالحکومت پورٹ بلیئر موسوم ہوا، لیکن ۱۷۹۶ء میں خرابی آب و ہوا کے باعث یہ آبادی ترک کر دی گئی ؛

۱۸۵۷ء میں یہاں اسیروں کی جو نوآبادی قائم ہوئی وہ بھی پورٹ بلیئر ہی کے آس پاس تھی، جس کا موقع اور محل خوب سمجھ لینا چاہیے۔ جنوبی انڈمان کی مشرقی سمت میں ایک کھاڑی دور تک اندر چلی گئی ہے اور اس نے زمین کی ایک سات میل لمبی تنگ ناے بنا دی ہے۔ یہی پورٹ بلیئر ہے۔ اس کھاڑی کے دہانے پر ایک جزیرہ ہے، جس کا نام روس آئی لینڈ ہے۔ اندر جا کر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جزیرہ چیتھم اور جزیرہ وائپر (افعی) واقع ہیں۔ کھاڑی کے دونوں بازوؤں پر نوآبادی کے مشہور مقامات ہیں مثلاً جنوبی بازو پر ایبرڈین، فونکس بے، ہڈو، نیوی بے وغیرہ، شمالی بازو پر ہوپ ٹاؤن۔ یہ مقامات ہم نے اس لیے بتا دیے کہ آئندہ جا بجا ان کا ذکر آئے گا ؛

آبادی کا دوسرا دور ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ عظیم میں جن لوگوں کو طویل قید کی سزائیں ملیں، وہ اصلاً سیاسی قیدی تھے، کیونکہ انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے جہاد کیا تھا یا کم از کم ان پر الزام یہ تھا۔ حکومت مناسب نہ سمجھتی تھی کہ انھیں عام جیل خانوں میں رکھے۔ ڈر یہ تھا کہ مبادا ان کے خیالات سے دوسرے قیدی متاثر ہوں، لہٰذا فیصلہ ہوا کہ جزائر انڈمان کو از سرِ نو آباد کیا جائے اور ۱۸۵۷ء کے قیدی وہاں بھیج دیے جائیں۔ اس حقیقت کو خوب پیش نظر رکھیے کہ انڈمان کی آب و ہوا اور زمین، نوآبادی کے قیام کے لیے حد درجہ ناسازگار تھی اور اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ تاہم حکومت نے ۱۸۵۷ء کے قیدیوں کو وہاں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ جس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ تھا کہ حکومت ان کے متعلق انتقامی روش پر کاربند تھی۔ اگرچہ وہ قیدی تھے اور دورانِ قید میں ان کی صحت اور جان کی حفاظت حکومت کے فرائض میں داخل تھی تاہم وہ اس فرض سے بالکل بے پروا ہو کر انھیں ایسی جگہ بھیجنے میں متامّل نہ ہوئی، جس کا ماحول، جس کی آب و ہوا اور فضا حد درجہ مضرِ صحت بلکہ تباہ کن تھی ؛

اس سلسلے میں ملک کی بعض نہایت عظیم الشّان شخصیّتیں انڈمان پہنچیں، جن میں سے اکثر
دوبارہ وطنِ عزیز کی زیارت نصیب نہ ہوئی۔ مثلاً مولانا فضل حق خیرآبادی یا نوّاب ممّوں جو واجد
شاہ کی بیگم حضرت محل والدۂ برجیس قدر کے نائب تھے اور اودھ میں انگریزوں کے خلاف مسلسل
لڑائیاں کرچکے تھے۔ وہ ۱۸۶۶ء تک انڈمان میں رہے۔ پھر سراوکے انگریز فرمانروا کی طلب پر ان
بعض دوسرے اسیروں کے ہمراہ وہاں بھیج دیا گیا۔ وہیں انھوں نے وفات پائی۔ بعض ممتاز اسیر
کے نام آئندہ ضمناً آجائیں گے۔

کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کتنے آدمی وہاں بھیجے گئے۔ مولوی محمد جعفر فرماتے ہیں کہ ۱۸۶۱ء میں
کے تقریباً ایک ہزار قیدی رہا کر دیے گئے تھے، جن کے خلاف قتل کا کوئی الزام عائد نہ تھا یا جو سرغنہ
نہ سمجھے جاتے تھے۔[1]

قید میں امتیاز اس سلسلے کا ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ انگریزوں نے قیدیوں میں امتیاز
برابر باقی رکھا، یعنی عام اہلِ ملک سے نہایت غیر ہمدردانہ برتاؤ ہوتا تھا، لیکن گوروں یا دیسی عیسا
کو بہت اچھی حالت میں رکھا جاتا تھا۔ مولوی محمد جعفر لکھتے ہیں:

> غدر ۱۸۵۷ء کی بدولت بیسیوں راجے اور نوّاب اور زمیندار، مولوی، مفتی،
> قاضی، ڈپٹی کلکٹر، منصف، صدر امین، صدر الصدور، رسالدار، صوبیدار، جمعدار
> وغیرہ وہاں قید ہیں، مگر وہ معزز ہندوستانی جنٹلمین بھی جن کے آگے سیکڑوں ہزاروں
> نوکر تھے بوجہ سیاہ پوست اور جنم ہند کے دوسرے چوڑھے چماروں کی طرح موٹا جھوٹا
> کھانا پکاتے اور عام لوگوں کے ساتھ سخت مشقت کرتے۔ مگر یورپین گورے بلکہ اکثر
> دوغلے کالے کلوٹے بھی فقط بوجہ شرف کوٹ پتلون یا کلمہ عیسائی کے پلٹن کے گوروں کے
> برابر کھانا کپڑا پاتے۔ ایک علیحدہ بنگلیا ان کے رہنے کو، ایک نوکر بلا تنخواہ
> خدمت کو۔[2]

---

[1] "تاریخ عجیب" ص ۳۹ [2] "کالا پانی" ص ۵۷-۵۸

مولوی صاحب نے ۱۸۷۹ء کا ایک عبرت انگیز واقعہ بتایا ہے: جگن ناتھ پوری کا ایک راجہ کسی سلسلے میں قید ہوکر کالے پانی پہنچا۔ چونکہ اس کا رنگ کالا تھا، اس لیے عام چماروں کے ساتھ کھانا پاتا اور مشقت کرتا۔ نازک مزاجی کے باعث مشقت نہ ہوسکتی تو بید کی سزا ملتی۔ وہ چند روز بعد تکلیفیں اٹھاتا اٹھاتا فوت ہوگیا۔ انھیں دنوں اودھ کا ایک کرنٹا جس کا نام لیٹیمر تھا، وہاں پہنچا تو اسے گوروں کے ساتھ عمدہ کھانا ملنے لگا۔ ایک علٰحدہ مکان، پلنگ اور عیش و آرام کا پورا سامان اس کے لیے مہیا ہوگیا اور ڈپٹی کمشنر کی کچہری میں اسے کلرک بنا دیا گیا۔

خود ملکی قیدیوں میں بھی حکّام نے اپنی مرضی سے امتیازات قائم کر رکھے تھے۔ یہ مقام تھا، جہاں ان بزرگوں کو زندگیوں کا خاصا بڑا حصّہ گزارنا پڑا، جن میں سے بعض دنیوی لحاظ سے وقت کے امراء تھے۔ علوِ حوصلہ اور شانِ عزیمت کے اعتبار سے انھیں انسانیت کے گلہائے سرسبد سمجھنا چاہیے۔ اب آپ ان میں سے ایک ایک بزرگ کی اسیری کے حالات ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا احمد اللہ | مولانائے ممدوح ۱۵۔ جون ۱۸۶۵ء کو عظیم آباد سے پورٹ بلیئر پہنچے تھے۔ گویا جماعتِ مجاہدین کی اعانت کا فرض انجام دینے والوں میں سے انڈمان پہنچنے میں مولانا کو سب پر سبقت حاصل ہوئی۔ اُس زمانے میں سیّد اکبر زمان[۱] اکبر آبادی چیف کمشنر انڈمان کے میر منشی تھے۔ انھوں نے مولانا کے حالات اور بلند حیثیّت سے پوری آگاہی حاصل کر لی تھی، چنانچہ وہ چیف کمشنر سے اجازت لے کر مولانا کو اپنے مکان پر لے گئے، جو روس آئی لینڈ میں تھا۔ پھر پاس ہی ایک اور مکان کا انتظام کر دیا اور چیف کمشنر کی کچہری میں اپنے ماتحت تحریر کا کام مولانا کو سونپ دیا۔ اس طرح ان کی اسیری کے ابتدائی پانچ سال قدرے اطمینان سے گزر گئے۔

ہندوستان کا وائسرائے لارڈ میو انڈمان کے دورے میں ایک مسلمان قیدی کے ہاتھ مارا گیا تو تمام ممتاز مسلمان قیدیوں پر انگریزوں کا عتاب ازسرِ نو نازل ہوُا اور ان کے متعلّق عام بدظنی

---

[۱] مولانا عبدالرحیم نے لکھا ہے کہ سیّد اکبر زمان نہایت شریف اور بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ ہم سب لوگوں کے ساتھ جو بعد کو وہاں پہنچتے چلے گئے، ایک نگاہ مہربانی رکھتے اور محبت و الفت رکھتے۔ "تذکرۂ صادقہ" ص ۴۹۔ یہ قلعہ آگرہ کے فوجی محکمے م[؟] میں میر منشی تھے۔ غدر میں حصہ لینے کی بنا پر بیس سال قید کی سزا ہوئی۔ انڈمان میں قید پوری کرکے آگرہ آئے ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔

پھیل گئی۔ اس وجہ سے اکثر مسلمان قیدیوں کو صدر سے منتقل کر کے دور افتادہ جزیروں میں بھیج دیا گیا۔ چنانچہ مولانا کو وائپر[1] آئی لینڈ میں تبدیل کر دیا گیا، جہاں عموماً بوڑھے اور کمزور آدمیوں کو رکھا جاتا تھا۔ محکمۂ طبابت میں محرّری کا عہدہ آپ کو دیا، جس کی تنخواہ راشن کے علاوہ دس روپے ماہوار تھی۔ ہسپتال کے قریب ایک مکان قیام کے لیے اور ایک ملازم خدمت کے لیے دے دیا گیا۔ مولانا سرکاری کام انجام دینے کے بعد زیادہ وقت قرآن مجید کی تلاوت، نماز اور ذکر و دعا میں صرف کرتے یا اپنے رفیقوں کو توحید اور نیک عملی کی تلقین فرماتے۔ آپ کے ساتھی قیدیوں نیز پولیس اور پلٹن کے آدمیوں میں سے تقریباً ہر شخص مومن موحد، پابندِ صوم و صلوٰۃ اور تہجد گزار بن گیا[2]۔

مولانا عبدالرحیم آپ کے اقربا میں سے تھے، وہ مہینے میں ایک مرتبہ آپ سے مل آتے۔ مئی ۱۸۷۱ء میں مولوی محمد حسن (بن مولانا ولایت علی) جو مولانا احمد اللہ کے حقیقی بھانجے تھے، ملاقات کے لیے انڈمان پہنچے اور ایک مہینا رہ کر واپس چلے آئے۔

آخری دَور اور وفات قید کی تکلیف، اقربا سے علیحدگی، آب و ہوا کی ناسازگاری، غذا کی ناموافقت اور تقاضائے سن سے مولانا کی طبیعت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ جب مولانا عبدالرحیم نے اجازت لے کر اپنا کاروبار شروع کر دیا اور ایبرڈین میں دکان کھول لی تو وہ مہینے میں پندرہ بیس روپے بالالتزام مولانا کی خدمت میں پیش کر دیتے تاکہ آپ اپنے لیے اچھی غذا کا انتظام بخوبی کر سکیں، لیکن مولانا طبعی عالی ہمتی اور سخاوت کے باعث اپنی تنخواہ کی رقم اور یہ رقم خفیہ خفیہ غریب قیدیوں کی امداد میں صرف کر دیتے۔ آخر مولانا عبدالرحیم نے مولانا کو اپنے پاس لے آنے کی اجازت مانگی جو نامنظور کر دی گئی۔ ان کے لیے کاروبار کا لائسنس حاصل کرنے کی کوشش کی گئی، وہ بھی ناکام رہی۔ ہر طرف سے مجبور ہو کر مولانا عبدالرحیم

---

[1] وائپر کے لفظی معنی ہیں افعی، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ جزیرہ کھاڑی کے اندر واقع تھا۔ بوڈن کلوس (BODEN KLOSS) نے لکھا ہے کہ اسے "دوزخ" کا نام دے دیا گیا تھا اور یہاں نہایت خوفناک قیدی رکھے جاتے تھے (IN THE ANDAMANS & NICOBARS صفحہ ۲۵)

[2] "تذکرہ صادقہ" صفحہ ۵۔

نے التجا کی کہ مولانا کے پاس رات گزارنے کی اجازت دے دی جائے تاکہ بیماری میں ان کی خدمت انجام پائے۔ اس اثناء میں وہ روزانہ اپنی جائے قیام یعنی ایبرڈین سے مولانا کے پاس وائپر آئی لینڈ جاتے اور کس طرح؟ ایبرڈین سے ایک کوس کا فاصلہ پیدل طے کر کے نیوی بے سے کشتی پر سوار ہوتے، جہاں سے وائپر آئی لینڈ ایک کوس تھا۔ پھر اتر کر مولانا کے مکان پر پہنچتے۔ دن بھر ان کی خدمت کرتے اور شام کو واپس آ جاتے۔ بڑی ردّ و کد کے بعد چودھویں روز یہ درخواست منظور ہوئی۔

مولانا عبدالرحیم کے بیان کے مطابق آپ کو بخار تھا۔ زیادہ تر بے ہوش رہتے تھے۔ وہ چودھویں روز عصر کے وقت آپ سے رخصت ہو کر واپس آنے لگے تو آپ کو بظاہر اچھا پایا۔ ہوش و حواس درست تھے۔ انھیں تقویٰ، ابتغاء مرضات اللہ اور مصائب میں صبر و استقلال کی وصیت کی۔ اپنے اقربا میں سے مولانا محمد حسن کے متعلّق رضامندی کا اظہار فرمایا۔ اسی رات آٹھ بجے کے قریب آپ سجن دنیا کو چھوڑ کر داخل خلد بریں ہوئے۔ ذی حجہ ۱۲۹۸ھ کی اٹھائیسویں تاریخ تھی (۱۲- نومبر ۱۸۸۱ء)۔ غشی کی حالت میں بھی ذکر اللہ جاری رہتا۔ نماز کا اس قدر خیال تھا، گویا ہر وقت تحریمہ بندھا رہتا اور نماز پڑھا کرتے۔

تکفین و تدفین مولانا عبدالرحیم پہلے آپ کے مکان پر پہنچ گئے، پھر مولوی محمد جعفر، میاں عبدالغفار، سیّد اکبر زمان، مولوی محمد جان اور بعض دوسرے حضرات تشریف لے آئے۔ سب سے پہلے یہ کوشش کی گئی کہ ان کے برادر صغیر مولانا یحییٰ علی کے پہلو میں (روس آئی لینڈ) دفن کیا جائے، لیکن حکام نے اجازت نہ دی۔ چنانچہ آپ کو ڈنڈا س پائنٹ میں سمندر کے کنارے ایک ٹیلے پر جہاں اور بھی چند قبریں تھیں، آخری نیند سلا دیا گیا۔ مولانا عبدالرحیم لکھتے ہیں کہ وہ مقام حد درجہ وحشت ناک نظر آیا۔ ایک طرف جنگلی درخت آسمان سے باتیں کرتے تھے، دوسری طرف سمندر کی موجیں پہاڑ کی مانند اُٹھ کر جزیرے سے ٹکراتی تھیں:

ایسی حالت میں ہم لوگ ایسے دُرِّ یتیم کو، ایسے لعلِ شب چراغ کو، ایسے یاقوتِ احمر کو اپنے ہاتھوں مٹی میں دبا کر آہ سرد بھرتے ہوئے، با چشمِ گریاں و دلِ بریاں اپنی اپنی

جگہوں پر واپس آئے[1]۔

اللہ اللہ اس بے نیاز کی شانِ بے نیازی کہ جس بزرگ نے زندگی کا ایک ایک لمحہ حصولِ رضا میں صرف کیا، اس کی آزمائش کا دور وفات پر بھی ختم نہ ہوا۔ اقبال کیا خوب کہ گئے ہیں:

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ می خواہی زخاکی بیش ازآں خواہی

مولوی محمد جعفر لکھتے ہیں کہ مولانا جب بہت نحیف ہو گئے تو اپنی حالتِ زار کے پیشِ نظر اپنے بیٹے مولوی محمد یقین کو بُلا کر ملاقات کرنی چاہی۔ مولوی صاحب کلکتہ میں مقیم تھے اور چار پانچ دن میں پورٹ بلیئر پہنچ سکتے تھے، لیکن حکومت نے اجازت نہ دی۔ گویا مولانا ان رعایتوں سے بھی محروم رہے جو عام قیدیوں کو حاصل تھیں۔ مولانا کے ملازم کا نام عبدالواحد تھا۔ اس نے بتایا کہ آخری وقت میں آنکھ کھول کر الّا اللہ یا مالک الملک کہا اور سرد ہو گئے[2]۔

تاریخِ وفات مولوی محمد ایوب خاں رام پوری مقیم جزیرہ نے مولانا کا قطعۂ تاریخ لکھا۔ چند شعر ذیل میں درج ہیں:

چوں ازیں دارِ فنا جانبِ باغِ رضواں ... الحمداللہ رواں گشت بہ صد دل شاداں
شمش و ہفتاد سنِ عمرِ شریفش بودند ... بغتتہً گشت نصیبش سفرِ جاویداں
بست و ہشتم شبے بود از مہِ ذی حجّہ کہ او ... راہیِ ملکِ بقا گشت ز دارِ گذراں
اعتقادش بہ احادیثِ نبیؐ از ہمہ بیش ... اعتمادش ہمہ ہر دم بہ نصوصِ قرآں
ہمہ زہد و ہمہ تقویٰ و ہمہ صوم و صلوٰۃ ... ہمہ مصروفِ عبادت ہمہ صرفِ عرفاں
سالِ تاریخِ وفاتش ز تفکّر جستم ... دَخَلَ الْخُلْدَ بفرمود ہماں دم رضواں
مہر قرباں بہ تمامی و محترم اقرب ... سنِ تسعہ ز احادش بگر فتم پئے آں

(دخل الخلد = ۱۲۹۹)

[1] "تذکرہ صادقہ" ص۵۸۔ [2] "کالا پانی" ص ۸۲ و ۸۳۔

مولانا محمد سعید نے برجستہ فرمایا: رہاگشتن مومن از سجنِ دنیا

قطعہ تاریخ یہ ہے:

چو مردِ خدا مولوی احمد اللہ — مقیمِ جزیرہ بہ حکمِ نصاریٰ
شب ماہِ ذی حجہ و بست و ششم — ز دنیائے دُوں شُد بہ فردوسِ اعلیٰ
بہ تاریخ فوتش ندا کرد ہاتف — رہاگشتن مومن از سجنِ دنیاؑ

۱۲ ھ ۹۹

مولانا یحییٰ علی مولانا یحییٰ علی انبالہ سے لاہور، ملتان، کراچی، بمبئی وغیرہ ہوتے ہوئے ۱۱۔ جنوری ۱۸۶۶ء کو انڈمان پہنچے تھے۔ سید اکبر زماں مہر منشی نے انھیں بھی اپنے پاس روس آئی لینڈ میں رکھا اس طرح مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی یک جا ہو گئے۔ مولانا یحییٰ علی بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح فرصت کے اوقات قرآن و حدیث پڑھانے یا لوگوں کو نیک کاموں کی تلقین کرنے میں گزار دیتے۔ تقریباً دو سال بعد آپ بیمار ہو گئے اور حسبِ قاعدہ ہسپتال میں ڈاکٹری علاج ہونے لگا۔ مولانا عبدالرحیم اُس زمانے میں گھاٹ پر محرّر تھے۔ انھوں نے مولانا کی خدمت کے لیے رخصت طلب کی۔ حکم ہوا کہ بارہ بجے سے تین بجے تک کام کیا کریں تاکہ دوسرے منشی کو کھانا کھانے کی فرصت مل جائے۔ چنانچہ مولانا عبدالرحیم تین گھنٹے کام کرتے، باقی وقت مولانا یحییٰ علی کی خدمت میں گزارتے۔ مولانا دورانِ علالت میں یادِ خدا اور صبر و شکر میں مصروف رہتے۔ جو لوگ مزاج پُرسی کے لیے آتے، انھیں برابر پند و نصیحت فرماتے۔ گویا امر بالمعروف کا فریضہ زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی ترک نہ کیا۔

وفات علالت کی عام کیفیت ایسی نہ تھی کہ ان کی زندگی کے متعلق تشویش پیدا ہوتی۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ ان کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ بھی دن میں دو مرتبہ دیکھنے کے لیے آتے۔ چونکہ مکان نشیب میں تھا اور ہسپتال بلندی پر واقع تھا، لہٰذا مولانا کو آنے جانے میں بڑی تکلیف ہوتی۔ مولانا عبدالرحیم فرماتے ہیں: میں تین بجے ہسپتال پہنچا تو مولانا یحییٰ علی کی طبیعت اچھی تھی۔ بہ اطمینان نمازِ عصر ادا کی۔ چار بجے یکایک زبان میں لکنت پیدا ہوئی اور طبیعت بگڑ گئی۔ ڈاکٹر نے دوا دی جو حلق سے

لہ دونوں تاریخیں "تذکرہ صادقہ" صفحہ ۵۲ پر ہیں اور وفات کا آخری قطعہ سوانح احمدی میں ہے صفحہ ۲۲۵۔

فرو نہ ہوئی۔ فوراً مولانا احمد اللہ کی طرف آدمی دوڑایا گیا، وہ بھی آگئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ پانی کا گھونٹ بھی حلق سے نیچے نہ اترتا تھا، تاہم زبان پر ذکر اللہ جاری تھا اور ہوش بجا تھے۔ مولانا عبدالرحیم نے سرِ مبارک زانو پر رکھ لیا۔ اسی حالت میں چند منٹ بعد رُوحِ پُر فتوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ شوال ۱۲۸۴ھ کی چھبیسویں تاریخ تھی (۲۰۔ فروری ۱۸۶۸ء)۔ گویا مولانا نے انڈمان میں دو سال ایک مہینا اور نو دن گزارے۔ یہ وقت بڑے اطمینان سے بسر ہوا، اس لیے کہ اُن کے برادرِ مکرّم (مولانا احمد اللہ) جلیل القدر بھانجے (مولانا عبدالرحیم) اور رفیق پاس تھے۔

تکفین و تدفین میّت کو ہسپتال سے مکان پر لے گئے۔ سیّد اکبر زماں نے چیف کمشنر سے اجازت لے کر تمام جزیروں میں اعلان کر دیا تھا کہ جو لوگ تکفین و تدفین میں شریک ہونا چاہیں، آ جائیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی موقع پر پہنچ گئے۔ کُل شرکاء چار پانچ ہزار سے کم نہ ہوں گے۔ کئی مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور انھیں روس آئی لینڈ میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اللہ اکبر! قدرت نے عالمِ وجود میں بھیجا تو عظیم آباد کے ایک امیر گھرانے کی آغوشِ محبت میں جگہ دی، لیکن پوری زندگی صرف عشقِ حق میں مصیبتیں اٹھاتے اٹھاتے اتمام کو پہنچا دی اور اس سرزمین میں دفن ہوئے جس کا تصور بھی کبھی ان کے دماغ میں نہ گزرا تھا۔ تاہم ان کی عزیمت ہر دَور میں ہر مصیبت سے بالکل غیر متاثر رہی۔ سچ ہے:

زیرِ شمشیرِ غمش رقص کناں باید رفت
کانکہ شد کشتۂ او نیک سرانجام افتاد

مولوی احمد کبیر پھلواروی نے تاریخ وفات لکھی[1]:

چونکہ یحییٰ علی ستودہ خصال	عالم و زاہد و محدّث بود
روحِ پاکش گزاشت محبسِ تن	راہِ ملکِ وصالِ حق پیمود
گشت راضی خدائے پاک ازو	عزتش پیشِ قدسیاں افزود
ہاتفے سالِ او ز روئے الم	رضی اللہ ربہٗ فرمود

۱۲۸۴ھ

[1] "تذکرۂ صادقہ" صفحہ ۷۹۔

کمالِ استقامت انڈمان پہنچنے کے بعد مولانا کو خاندانی مکانوں کے انہدام کی خبر ملی تو اپنی اہلیہ کو ایک خط لکھا، جس میں اس واقعے پر دلی قلق کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ رات کو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ انور سے لقا کا شرف حاصل ہوا۔ حضورؐ نے آیاتِ کریمہ . . . وَبَشِّرِ الصَّابِرِینَ الَّذِینَ . . . . رَاجِعُون۔ تلاوت فرمائی۔ اس مکاشفے کے بعد دل بالکل مطمئن ہو گیا۔ آخر میں فرماتے ہیں :

دریائے عشقِ خالقِ ہر دو جہاں میں ہم نام و نشان دارِ فنا کے ڈبا چکے
کفنی گلے میں ڈال کے تسمہ کمر کے بیچ جوگی ہوئے ہیں محرمِ اسرار کے لیے
اے خدائے منؔ فدایت جانِ من جملہ فرزندان و خان و مانِ من [1]

سیّد صاحب کے دوبارہ ظہور کا عقیدہ بہت پختہ تھا بلکہ دَورِ ابتلاء میں فرمایا کرتے تھے کہ ظہور کا وقت بہت قریب آ گیا ہے اس لیے کہ نیازمندوں کی مصیبتیں شدت کے آخری درجے پر پہنچ گئی ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ۔

---

[1] "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" صفحہ ۱۸۴، ۱۸۵ ۔

گیارھواں باب

سرگزشتِ انڈمان

(۲)

مولانا عبدالرحیم پہلے اور دوسرے مقدمے کے قیدیوں میں سے مولانا عبدالرحیم سب کے بعد انڈمان پہنچے تھے۔ سید اکبر زماں نے انھیں بھی مولانا احمداللہ اور مولانا یحییٰ علی کے مکان میں ٹھہرایا۔ پھر گھاٹ پر محرری کی اسامی مل گئی، جس کی تنخواہ چھ روپے ماہوار تھی۔ سید انشاء اللہ ساکن باندہ مولانا عبدالرحیم کے رفیق کار تھے۔ یہ غدر کے سلسلے میں انڈمان پہنچے تھے اور بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ مولانا ان کی بھی مدد کرتے رہے۔ تین سال کے بعد مولانا کو کمسٹریٹ کے محکمے میں تبدیل کر دیا گیا۔ پھر یہ بندوبست کے محکمے میں مامور ہو گئے۔ اس اثنا میں ایک دکان دار سے مل کر تجارت بھی شروع کر دی، جس میں چار سو روپے کا فائدہ ہوا۔ یہ رقم انھوں نے ایک دوست کے پاس امانت رکھ دی تاکہ خود آزادانہ کاروبار کی اجازت لے لیں تو یہ روپیہ راس المال کا کام دے۔

لارڈ میو کے قتل پر معزز مسلمان قیدی ہدفِ عتاب بنے تو مولانا کو بھی مرکز سے ایک دور افتادہ مقام پر بھیج دیا گیا۔ ان کے چھوٹے ماموں مولانا یحییٰ علی فوت ہو چکے تھے۔ بڑے ماموں مولانا احمداللہ سے بھی الگ ہو گئے۔ جس انگریز افسر کے ماتحت انھیں لگایا گیا، وہ حد درجہ درشت مزاج تھا۔ مولانا نے انتہائی مستعدی سے کام کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس کے جسم پر بہ کثرت سیاہ داغ پڑ گئے تھے۔ اگرچہ وہ ڈاکٹر تھا، لیکن اپنی اس بیماری کا علاج نہ کر سکا۔ خانساماں نے اسے بتایا کہ مولانا کے پاس اس مرض کی دوا ہے۔ چنانچہ اس کی فرمایش پر مولانا نے ایک خاص ترکیب سے روغن لوبان کشید کر کے اسے دیا، جس کے استعمال سے داغ دور ہو گئے۔ اس وجہ سے وہ مولانا پر اور بھی مہربان ہو گیا بلکہ اس

دوا کو سرکاری دواخانے میں رکھنے کی اجازت مانگی جو اس وجہ سے نہ مل سکی کہ اس طرح ایک قیدی کا اعزاز وقت کے تمام ڈاکٹروں پر فائق ہوجاتا ؂

کاروبار کی اجازت مقررہ مدت پوری کرکے مولانا نے کاروبار کی اجازت لے لی اور اس غرض سے تیس روپے میں ایک مکان بھی خرید لیا، لیکن انھوں نے جو روپیہ ایک دوست کے پاس بہ طورِ امانت رکھ چھوڑا تھا، وہ اتفاقاً اس سے ضائع ہوگیا اور جلد ملنے کی کوئی امید نہ رہی، حالانکہ اسی کے بھروسے پر کاروبار کی اجازت لی تھی۔ چونکہ سب لوگ انھیں، مولانا احمد اللہ اور دوسرے ساتھیوں کو حسنِ عمل کی وجہ سے بہت محترم سمجھتے تھے، اس لیے بعض دوستوں کو حادثے کا علم ہوا تو انھوں نے پانچ سو روپے کا سامان مہیا کر دیا اور کہا کہ آہستہ آہستہ اس کی قیمت ادا کر دی جائے۔ بعدازاں لوگ اپنی امانتیں مولانا کے پاس رکھنے لگے۔ یہ اس شرط پر روپیہ رکھتے کہ کاروبار میں لگا دیں گے اور روپے والے کو جتنی رقم کی ضرورت ہو، پندرہ دن پیشتر اطلاع دے دے تاکہ فراہم کر لیا کریں۔ اس طرح ان کے پاس دس بارہ ہزار روپیہ جمع ہوگیا اور انھوں نے وسیع پیمانے پر تجارت شروع کر دی۔ مولانا احمد اللہ کے چھوٹے فرزند مولوی محمد یقین کو عظیم آباد سے کلکتہ بلا کر اپنا ایجنٹ مقرر کر دیا۔ پانچ فی صد کمیشن میں مولوی صاحب کو دیتے۔ بعض دوسرے تاجروں نے بھی موصوف ہی کو اپنا ایجنٹ بنا لیا اور کم و بیش سو روپے ماہوار کی آمدنی انھیں ہونے لگی۔ کاروبار کی وسعت کے پیشِ نظر مولانا عبدالرحیم نے اپنے فرزند مولوی عبدالفتاح کو بھی انڈمان بلا لیا۔ وہ پندرہ مہینے وہاں رہ کر ناسازگاریِ آب و ہوا کے باعث واپس چلے گئے ؂

رہائی لارڈ لارنس گورنر جنرل نے مولانا کی اپیل پر حبسِ دوام کا حکم منسوخ کر دیا تھا اور تا صدورِ حکمِ ثانی انڈمان میں رکھے جانے کا فیصلہ صادر کیا تھا۔ مولانا کی اہلیہ کی طرف سے لارڈ رپن کے پاس رہائی کی عرضداشت پیش ہوئی اور لارڈ موصوف نے نہ محض انھیں بلکہ انڈمان کے ان تمام قیدیوں کو رہا کر دیا، جنھیں اعانت مجاہدین کے سلسلے میں سزائیں دی گئی تھیں۔ چنانچہ مولانا یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۰۰ھ (۱۰ مارچ ۱۸۸۳ء) کو تقریباً سوا انتیس سال کے بعد وطن پہنچے۔ ان کے خاندانی مکان منہدم کرا کے جگہ بلدیہ کے حوالے

کی جا چکی تھی، جس پر بازار اور بلدیہ کی عمارت بن گئی تھی یہاں تک کہ خاندانی قبرستان کا بھی نشان باقی نہ رہا تھا۔ اہل و عیال محلہ نمو ہیہ میں مقیم تھے۔ پٹنہ پہنچنے کے دوسرے دن اپنے مکانوں کی جگہ پہنچے اور نقشہ یکقلم منقلب نظر آیا تو وہاں کھڑے ہو کر انتہائی درد سے یہ شعر پڑھے:

یا منزلاً لعب الزمان باهله — فابادهم بتفرق لا یجمع
ان الذین عهدتهم بك مرةً — کان الزمان بهم یضر و ینفع
اصبحت تفزع من یراك وطالما — کنا الیك من المعادل نفزع
ذهب الذین یعاش فی اکنافهم — بقی الذین حیاتهم لا تنفع[1]

فرماتے ہیں کہ میں نے مراجعت پر شہر کا رنگ ڈھنگ، چال چلن، لباس، پوشاک اور کل طرز معاشرت بدلا ہوا پایا تو رہائی پر حد درجہ افسوس ہوا:

کاش میں بھی اسی جزیرے (انڈمان) کا پیوند زمین ہو جاتا تو بروز حشر اپنے دونوں ساتھیوں (مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی) کے ہمراہ محشور ہوتا[2]

باقی حالات عظیم آباد پہنچتے ہی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پابندی عائد کر دی تھی کہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو کچہری میں حاضری لکھوایا کریں اور بلا اجازت شہر سے باہر نہ جائیں۔ جب کہیں جائیں تو جائے قیام کی متصلہ چوکی یا تھانے میں اطلاع بھیج دیا کریں۔ سات برس تک یہ پابندی قائم رہی۔ بعد ازاں صرف ملک سے باہر جانے کے لیے اجازت ضر[وری] قرار دی گئی حالانکہ اس زمانے میں باہر جانے کے لیے پروانہ راہداری لینے کا دستور نہ تھا۔ مولانا نے پہلی مرتبہ سنہ ۱۳۰۱ھ اور دوسری مرتبہ سنہ ۱۳۱۰ھ میں حج کیا۔ ۱۰۔ ذی الحجہ

---

[1] تذکرہ صادقہ ص ۱۷۸۔۱۷۹۔ مولانا مسعود عالم مرحوم نے ان اشعار کا مفہوم اردو میں یوں ادا کیا ہے: اے وہ منزل جس کے رہنے والے زمانے کی دست برد کا شکار ہوئے اور انھیں اس طرح منتشر کر دیا گیا کہ پھر جمع ہونے کی توقع نہیں۔ وہ جنھیں کبھی تیری آغوش میں آسودہ حال دیکھا تھا، زمانہ ان کے سہارے نفع نقصان پہنچاتا تھا، جو تجھے اب دیکھتا ہے گھبرا اٹھتا ہے۔ کبھی یہ حالت تھی کہ مشکلات سے گھبرا کر ہم تیری آغوش میں پناہ ڈھونڈتے تھے۔ وہ لوگ تو گزر گئے جن کے سایے میں زندگی زندگی تھی۔ اب وہ باقی رہ گئے ہیں، جن کی زندگیاں کسی بھی کام کی نہیں۔ [2] ایضاً۔

۱۳۴۱ھ (۲۴-اگست ۱۹۲۳ء) کو قبل مغرب تقریباً نوے برس کی عمر میں وفات پائی۔ "تذکرۂ صادقہ" جس کا دوسرا نام "الدر المنثور فی تراجم اہل صادق فور" ہے، انھیں کی مرتب کی ہوئی ہے۔ حکیم محمد شریف فخری نے تاریخ وفات کہی:

ازیں کاخ مجازی شد بہ جنت — امیرم مولوی عبد الرحیم آہ
چو شد ہشتاد و نہ از عمر پاکش — وصالاز مرگ آں فرمود ناگاہ
بہ بود آں مشعل بیت ہدایت — ز انوارش گرفتے راہ گمراہ
دم آخر نبودہ بر زبانش — بر جز نام خدا اللہ اللہ
مرا کردہ اسیر بند ماتم — بہ زد در جنت الفردوس خرگاہ
بہ فخری پیر ملہم گفت سالش
امام پاک داں تشریف برد آہ

مولانا ابو الکلام آزاد بھی مولانا عبد الرحیم سے ملے تھے فرماتے تھے کہ میں ایک مرتبہ پٹنہ گیا اور مولوی مظہر الحق بیرسٹر کے مکان پر ٹھہرا تو مولانا عبد الرحیم نے پیغام بھیجا کہ ملنے کے لیے آنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ وہ آگئے اور کچھ دیر بات چیت کر کے چلے گئے۔ دوسرے دن میں ان کی ملاقات کے لیے گیا۔ بہت بوڑھے ہوگئے تھے۔

مولوی محمد جعفر مولوی محمد جعفر نے ۱۸- ذی حجہ ۱۲۷۸ھ (۱۶- جون ۱۸۶۲ء) سے اپنے حالات لکھنے شروع کیے تھے، یہ تلاشیوں میں حکومت کے ہاتھ آئے اور ان کا خلاصہ مقدمے کے دوران میں بھی پیش ہوا۔ ہنٹر نے بھی وہ خلاصہ اپنی کتاب میں درج کیا ہے ان حالات سے واضح ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کی ولادت ۱۸۳۷ء کے لگ بھگ ہوئی۔ دس سال کی عمر تک کوئی تعلیم نہ پائی۔ بارہ سال کے ہوئے تو ان کے والد میاں جیون کا انتقال ہوا اس وقت ان کا چھوٹا بھائی محمد سعید صرف چھ مہینے کا تھا۔ پھر خود بخود تعلیم کا شوق پیدا ہوا۔ کچھ کتابیں پڑھ کر عرائض نویسی شروع کی۔ تھوڑی ہی مدت میں یہ کمال حاصل کر لیا کہ تمام عرائض نویس اور وکیل قاعدوں، ضابطوں اور قانونوں میں ان سے مشورے لیتے۔ تھانیسر

میں خاصی بڑی جائداد پیدا کر لی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں وہ دس بارہ ہم مشربوں کو ساتھ لے کر آزادی کی جنگ کے لیے دہلی پہنچے۔ جب انگریز دہلی پر دوبارہ قابض ہو گئے اور قومی تحریک کے لیے کامیابی کی کوئی امید باقی نہ رہی تو چپ چاپ واپس چلے آئے اور معمول کے مطابق اپنا کام شروع کر دیا۔ پانی پت میں شادی کی۔ گرفتاری کے وقت ان کے دو بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ بڑا بیٹا ان کی اسیری کے زمانے میں فوت ہو گیا۔ چھوٹا بیٹا، بیٹی اور پہلی بیوی ان کی رہائی کے وقت زندہ تھے۔

انڈمان کی زندگی | جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، وہ ۱۱۔ جنوری ۱۸۶۶ء کو مولانا یحییٰ علی اور میاں عبد الغفار کے ہمراہ انڈمان پہنچے تھے۔ جہاز سے اترتے ہی سید اکبر زماں کی کوشش سے چیف کمشنر کی کچہری میں "محرر سکشن وار" یا "نائب میر منشی" مقرر ہو گئے۔ ایک گھر رہنے کو اور ایک نوکر خدمت کو مل گیا۔ جہاں چاہتے رہتے اور جہاں چاہتے جاتے روک ٹوک مطلق نہ تھی۔[۱] اپنی اہلیہ کو وطن سے بلانے کی کوشش کی، اس میں ناکام رہے تو ایک کشمیری خاتون سے نکاح کر لیا جو ایک بلائے ناگہانی میں پھنس کر بہ حالتِ قید انڈمان پہنچی تھی، یہ بیوی ۳۰۔ اپریل ۱۸۶۸ء کو فوت ہو گئی۔ پھر انھوں نے دوسری مرتبہ المورہ کی ایک برہمنی سے نکاح کیا، جس غریب کو خاندانی عداوت کے باعث بے وجہ ایک قتل میں ملزم گردان کر کالے پانی کی سزا دلوا دی گئی تھی۔ مولوی صاحب نے اسے حلقہ بگوشِ اسلام بنایا۔ اس نکاح سے آٹھ بچے ہوئے۔ وہ اکیلے انڈمان گئے تھے۔ رہائی پا کر واپس ہوئے تو ایک بیوی اور آٹھ بچے کُل نو افراد ان کے ہمراہ تھے۔ اُن کی پوری مدتِ قید ملازمت میں گزری۔ نجی طور پر کچھ تجارت بھی کر لیتے تھے۔ ذاتی کوشش سے انگریزی سیکھ لی اور مختلف انگریز افسروں کو اردو پڑھانے لگے۔ اُس زمانے میں سرکاری ملازموں کو عرضیاں اور اپیلیں لکھنے کی ممانعت نہ تھی۔ خود فرماتے ہیں:

> میں نے عرضی و اپیل انگریزی زبان میں لکھنے شروع کر دیے تھے، جس میں علاوہ ترقی استعدادِ علمی کے ہزاروں روپے کا فائدہ بھی مجھ کو ہوا۔ یہی دو پیشے یعنی معلمیِ صاحبان اور عرائض نویسی تھے، جن میں مجھ کو سو روپے ماہوار سے کم نہ ملتا تھا۔ چونکہ میرے سوا وہاں

---

[۱] "کالا پانی" ص ۵۹

کوئی مسلمان انگریزی خواں نہ تھا، میں نے بڑے بڑے مقدّمات اہلِ اسلام میں ان کو بڑی بڑی مدد دی اور بڑی بڑی آفتیں اور الزام مسلمانوں پر سے ٹلوا دیے[1]۔

لکھتے ہیں کہ دورانِ قیامِ انڈمان میں تین مرتبہ نہایت خوفناک حوادث سے محض بہ فضلِ الٰہی محفوظ رہا۔ ایک مرتبہ عید قربان کے موقع پر انھوں نے بیل ذبح کیا تھا، اس وجہ سے بعض ہندو قیدی ان کے سخت دشمن ہو گئے اور ایک سے زیادہ مرتبہ مقدّمات میں الجھانے کی کوشش کی۔ خاصی مدّت روس آئی لینڈ میں گزاری۔ لارڈ میو کے قتل کے بعد انھیں بھی دوسرے مقامات پر بھیجا گیا، مثلاً کچھ مدّت ہدو میں گزاری۔

رہائی — انھوں نے رہائی کے لیے کئی کوششیں کیں جو کامیاب نہ ہو سکیں اور ایک مرتبہ اپنے بھتیجے کو بھی انڈمان بلانا چاہا، لیکن درخواست منظور نہ ہوئی۔ فرماتے ہیں، ۱۸۸۱ء سے دل میں خیال پیدا ہو گیا تھا کہ ہم جلد رہا ہو کر ہندوستان جانے والے ہیں۔ چنانچہ ۳۰۔ دسمبر ۱۸۸۲ء کو ان کی رہائی کا حکم صادر ہو گیا اور یہ اطلاع سب سے پہلے پانی پت میں ان کی پہلی بیوی کو ملی۔ ۲۲۔ جنوری ۱۸۸۳ء کو یہ حکم انڈمان پہنچا۔ وہ پہلے اپنی انڈمان والی اہلیہ کی رہائی کے انتظار میں بیٹھے رہے اور خود انڈمان میں ٹھہرے رہنے کی اجازت لے لی۔ اس اثناء میں اپنا سامان فروخت کیا۔ مکان کو وقف کر کے مسجد بنا دینا چاہتے تھے، ڈپٹی کمشنر نے اسے منظور نہ کیا۔ ۹۔ نومبر ۱۸۸۳ء کو سترہ سال دس مہینے کے بعد انڈمان سے روانہ ہوئے۔ جہاز پر علی رضا نام ایک مشہور تاجر ان کی خدمت تواضع کرتا رہا۔ ۱۳۔ نومبر ۱۸۸۳ء (۱۴۔ محرم ۱۳۰۱ھ) کو کلکتہ پہنچے اور مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی کے بھائی مولوی عبدالرؤف کے پاس چینا پاڑا میں دو روز مقیم رہے۔ پھر الٰہ آباد، کان پور، علی گڑھ، سہارن پور ہوتے ہوئے ۲۱۔ نومبر ۱۸۸۳ء کو رات کے نو بجے انبالہ چھاؤنی کے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ ۱۲۔ دسمبر ۱۸۶۳ء کو تھانیسر سے فرار ہوئے تھے۔ کچھ کم بیس سال کے بعد دوبارہ وطن میں آزادی کی زندگی نصیب ہوئی۔ ایک بڑے کنبے کے علاوہ آٹھ ہزار روپے نقد ساتھ لائے تھے۔

---

[1] "کالا پانی" صفحہ ۷۵۔

بعد کے حالات | بعد کے حالات تفصیلاً معلوم نہیں۔ رہائی کے وقت مولوی صاحب کا ایک شاگرد کپتان ٹمپل انبالہ چھاؤنی میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ اس نے آپ کو لکھا کہ اگر میرے پاس رہنا پسند کریں تو ضمانت دے کر حکومت سے اجازت لے سکتا ہوں۔ یہ مناسب قیام کا خدا ساز انتظام تھا۔ مولوی صاحب نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ٹمپل نے ان کے لیے بیس روپے ماہانہ اپنی طرف سے مقرّر کر دیے۔ تیس روپے انھیں بعض دوسرے انگریزوں کو پڑھانے سے مل جاتے تھے۔ جب تک ٹمپل انبالہ چھاؤنی میں رہا، مولوی صاحب کو کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ اس کا تبادلہ ہو گیا تو ان پر پابندیاں بڑھ گئیں، لیکن فروری ۱۸۸۸ء میں حکومت نے خود بخود تمام پابندیاں اٹھا دیں۔ وہ مختلف شہروں میں جاتے آتے رہے۔ مسلمان ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مولانا سید عبدالحی رائے بریلوی نے ۱۸۹۵ء میں دہلی، پانی پت، سرہند، انبالہ، دیوبند، گنگوہ وغیرہ کا سفر کیا تھا تو وہ انبالے میں مولوی محمد جعفر کے مکان پر بھی گئے تھے، لیکن اس وجہ سے ملاقات نہ ہو سکی کہ مولوی صاحب کئی روز پیشتر کھرتولہ (ریاست پٹیالہ) چلے گئے تھے[1]۔ غالباً ۱۹۰۵ء میں وفات پائی۔ ان کے فرزند ارجمند مولوی محمد اسماعیل وکیل انبالہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں غیر مسلموں کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔

تصانیف | متفرق رپورٹوں یا مجموعہ ہائے ضوابط کے علاوہ مولوی محمد جعفر نے تین کتابیں لکھیں، جن کی مختصر سی کیفیت ذیل میں درج ہے:

۱۔ تاریخ عجیب: یہ جزائر انڈمان کی تاریخ ہے، جس میں جزیروں کی جغرافیائی تفصیلات کے علاوہ ان کی آبادکاری کی کیفیت عہد بہ عہد بتائی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں ان تمام زبانوں کی بول چال کا مختصر سا مرقع درج کر دیا ہے، جو انڈمان میں بولی جاتی تھیں، مثلاً اُردو، عربی، فارسی، ترکی، ساحلی، پشتو، مکرانی، بلوچی، سندھی، نکوباری، مرہٹی، بنگالی، برمی، چینی، کشمیری، پنجابی وغیرہ۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولوی صاحب نے قیامِ انڈمان کے زمانے میں وہاں کی تقریباً تمام بولیاں سیکھ لی تھیں۔ یہ کتاب حکومت کی منظوری سے ۱۸۷۹ء میں مطبع نول کشور نے چھاپی تھی۔

---

[1] رمضان احباب (رسالہ معارف مارچ ۱۹۳۹ء)

اب بہت کم یاب ہے ؎

۲ - تواریخ عجیب : یہ کتاب زیادہ تر "کالا پانی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں مولوی صاحب نے اپنی گرفتاری، مقدمے، قید، سفرِ انڈمان، اسیری کی زندگی اور رہائی کی پوری سرگزشت بیان کی ہے۔ ضمناً اپنے رفقاء کے حالات بھی بیان کر دیے ہیں۔ چھوٹی سی کتاب ہے اور دو تین مرتبہ طبع ہو چکی ہے ؎

۳ - سوانحِ عجیبہ : یہ سیّد احمد بریلوی اور ان کے اکابر خلفاء کے حالات پر مشتمل ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۹۵ء میں مطبع مجتبائی سے شائع ہوئی تھی۔ بعد ازاں اس کے دو ایڈیشن چھپے۔ اس کتاب کی حقیقی حیثیت کے متعلق "سیّد احمد شہید" میں بحث ہو چکی ہے۔ اعادے کی ضرورت نہیں ؎

لاہوری احمدی جماعت کے ممتاز رکن ڈاکٹر بشارت احمد مرحوم نے ایک مرتبہ مجھ سے ذکر کیا کہ وہ انبالہ میں مولوی محمد جعفر سے ملے تھے، جب مولوی صاحب خاصے بوڑھے ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ دین کے متعلق انھوں نے جتنی باتیں کیں، خاص درد اور سوز سے لبریز تھیں۔ رخصت کے وقت دعا کی۔ وہ بھی بڑی ہی پر تاثیر تھی ؎

باقی اصحاب اسیرانِ انڈمان میں سے حکمِ رہائی کے وقت مندرجۂ ذیل حضرات زندہ تھے :

۱ - میاں عبدالغفار ساکن عظیم آباد جو مقدمۂ انبالہ میں ماخوذ ہوئے تھے۔ مولانا یحییٰ علی اور مولوی محمد جعفر کے ساتھ ۱۱ - جنوری ۱۸۶۶ء کو انڈمان پہنچے۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں انھوں نے درخواست دے کر اپنی اہلیہ اور دو لڑکوں کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔ رہائی کے بعد وہ اہل و عیال کے ساتھ عظیم آباد واپس آئے اور ۱۳۳۳ھ (۱۵-۱۹۱۴ء) کے لگ بھگ وفات پائی ؎

۲ - مولوی امیرالدین، انھیں مقدمۂ مالدہ میں حبسِ دوام اور ضبطیِ جائداد کی سزا ہوئی تھی۔ مارچ ۱۸۷۲ء میں انڈمان پہنچے۔ اُس وقت تک نئے قانون جاری ہو چکے تھے۔ ان میں قیدیوں کے لیے وہ رعائتیں باقی نہ رہی تھیں جن سے پہلے قیدی مستفید ہوتے رہے تھے لہٰذا مولوی صاحب کو مدت تک سخت مشقت کرنی پڑی۔ پھر وہ مدرسے میں معلم مقرر ہو گئے۔ ۳ - مارچ ۱۸۸۳ء کو مولانا عبدالرحیم

عظیم آبادی اور میاں عبدالغفّار کے ساتھ ہندوستان روانہ ہوئے۔ بعد کے حالات معلوم نہ ہوسکے۔

۳۔ مولوی تبارک علی: انھیں عظیم آباد کے دوسرے مقدّمے میں حبسِ دوام اور ضبطی جائداد کی سزا ہوئی تھی۔ ان کے والد ماجد مولوی مبارک علی قید ہی میں فوت ہو چکے تھے۔ مولوی تبارک علی کو بھی انڈمان میں ابتداءً سخت مشقت کرنی پڑی۔ پھر سٹیشن محرّر مقرر ہو گئے اور رہا ہو کر ۲۔ مارچ ۱۸۸۳ء کو انڈمان سے روانہ ہوئے۔

۴۔ میاں مسعود گل یا مسعود خاں: یہ ضلع بوگڑا[1] (بنگال) کے رہنے تھے۔ مولانا مسعود عالم کے بیان کے مطابق سنہ ۱۸۶۰ء میں گرفتار ہوئے تھے[2]۔ ان کے مقدّمے کا حال بالکل معلوم نہ ہوسکا، لیکن یہ یقینی ہے کہ ۱۸۸۳ء میں رہا ہو کر ۲۸۔ اپریل کو انڈمان سے رہگرائے وطن ہوئے۔

۵۔ ابراہیم منڈل: مقدّمۂ راج محل کے سلسلے میں ان کا ذکر آ چکا ہے۔ مولوی محمد جعفر، امیر خاں، تبارک علی اور امیر الدّین کی گرفتاری کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ایک بوڑھے اور ضعیف شخص ابراہیم منڈل کو اسلام پور میں (گرفتار کیا) اور اپنے معمولی اور پرانے گواہوں سے جو چاہا گواہی دلوا کر بے چاروں کو کالے پانی کو روانہ کیا[3]۔

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ابراہیم منڈل کو بھی کالا پانی بھیجا گیا تھا۔ مولانا مسعود عالم نے ۱۹۴۷ء میں لکھا تھا کہ ابراہیم منڈل کے انتقال کو چالیس پینتالیس سال گزر چکے ہیں[4]۔ گویا وہ موجودہ عیسوی صدی کے آغاز تک زندہ تھے۔

اور جو اصحاب گرفتار یا قید ہوئے، ان کے متعلق کچھ علم نہ ہوسکا۔

گورنر جنرل کا حکم آخر میں اتنا اور عرض کر دینا چاہیے کہ "وہابی" اسیرانِ انڈمان کی رہائی کے سلسلے میں حکومتِ ہند کے محکمہ داخلہ کی طرف سے ۱۱۔ جنوری ۱۸۸۳ء کو مندرجہ ذیل اعلان بغرضِ اطلاعِ عوام شائع ہوا تھا:

---

[1] "تذکرۂ صادقہ" میں اسے "بگوڑا" لکھا گیا ہے (صفحہ ۱۷۷)۔ [2] "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" صفحہ ۱۶۹، ۱۷۰۔

[3] "کالا پانی" صفحہ ۷۹۔ [4] " " صفحہ ۱۵۵۔

مقدمہ کے تمام پہلوؤں پر کامل غور وخوض اور حکومت بنگال وحکومت پنجاب سے مشورہ کے بعد گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ جن لوگوں کو سلطنت کے خلاف جنگ میں شرکت واعانت کے جرم کی بنا پر حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی تھی اور وہ ہنوز یہ سزا بھگت رہے ہیں۔ انھیں اب رہا کر کے گھروں میں آنے کی اجازت دے دی جائے البتہ انھیں پولیس کی نگرانی قبول کرنی ہوگی نیز مقامی حکومتیں ان کی بود وماند پر جو پابندیاں عائد کرنا مناسب سمجھیں، وہ لازماً منظور کرنی پڑیں گی[1]۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ اس فیصلے پر پہنچنے اور اسے نافذ کرنے میں کون کون سے فوری محرکات بروئے کار آئے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ "وہابیت" کا ہوّا ہندوستان میں کھڑا کرنے کے ذمہ دار چند انگریز افسر تھے جن میں سے ولیم ہنٹر کو سب سے بڑھ کر نمایاں حیثیت حاصل ہوئی اور اس کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" مدت تک حکومت کی پالیسی کا مبنیٰ بنی رہی۔ جب سر سید احمد خاں مرحوم اور بعض دوسرے اصحاب نے اس "ہوّے" کو بالکل بے بنیاد ثابت کر دیا تو ارباب اختیار کی رائے میں تغیر پیدا ہوا۔ اس ضمن میں سب سے مؤثر و نتیجہ خیز مساعی سر سید مرحوم ہی کی تھیں۔

تاریخ | مولوی محمد جعفر تھانیسری نے ان اسیران مظلوم کی رہائی کا ایک قطعہ تاریخ بھی درج کیا ہے یعنی:

تنے چند از عظیم آباد پٹنہ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ بودند اہل علم وفضل باہر
بر ایشاں با عبور بحرِ پُر شور ‏ ‏ ‏ ‏ چو شُد حکم دوام حبس صادر
از ایناں چند کس مُردند در قید ‏ ‏ ‏ ‏ رہا گشتند باقی ماندہ آخر
بحکم والسرائے قیصرِ ہند ‏ ‏ ‏ ‏ کہ دارد بر رعایا رحم وافر
چو کردم فکر تاریخ رہائی ‏ ‏ ‏ ‏ مرا بیتے خوشے آمد بہ خاطر
نظیرش کم تواند یافت آں کس ‏ ‏ ‏ ‏ کہ باشد در فنِ تاریخ ماہر
پس از طول زمن الحمد للہ ‏ ‏ ‏ ‏ رہا گشتند اسیرانِ جزائر
حروف صدر بیان سال ہجری ‏ ‏ ‏ ‏ سنین عیسوی از شعر ظاہر[2]

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور۔ مورخہ ۱۰۔ جنوری ۱۸۸۳ء۔ [2] سوانح احمدی طبع اول ص ۲۲۵۔

بارھواں باب
لارڈ میو کا قتل

لارڈ میو مجاہدینِ اسلام و آزادی کے زمانۂ اسیری کا ایک اہم واقعہ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ میو کا قتل ہے، جو انڈمان میں ہؤا اور اس وجہ سے ہمارے مجاہدوں کی اسیری کا دَور بھی امتداد پذیر ہؤا اور ان پر سختیاں بھی بڑھ گئیں۔ مثلاً جن رعایتوں سے وہ مستفید ہو رہے تھے، چھین لی گئیں اور انھیں مرکز سے اٹھا کر الگ الگ دُور دُور علاقوں میں بھیج دیا گیا بلکہ یہ کوشش بھی کی گئی تھی کہ انھیں قتل کے الزام میں الجھا کر حد درجہ سخت سزائیں دی جائیں۔ چونکہ اس واقعے کو بھی ان کی اسیری سے اک گونہ تعلق ہے، لہٰذا اسے بھی یہاں بیان کر دینا چاہیے۔

لارڈ میو ۱۸۶۹ء میں ہندوستان کا گورنر جنرل اور وائسرائے مقرر ہو کر آیا تھا۔ دوسرے معاملات کی طرح اسے انڈمان میں بھی اصلاحات جاری کرنے کا خاص خیال تھا۔ چنانچہ اس نے ایک نیا مجموعۂ ضوابط مرتب کرایا، جسے ۱۸۷۱ء سے نافذ کر دیا گیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ خود انڈمان کو دیکھے اور تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد وسیع پیمانے پر اصلاحات جاری کرے۔ چنانچہ وہ کلکتہ سے رنگون گیا اور وہاں سے ۸۔ فروری ۱۸۷۲ء کو صبح کے وقت انڈمان پہنچا۔ لیڈی میو کے علاوہ متعدد اصحاب اس سفر میں اس کے ہمراہ تھے۔

جزیرے کا دَورہ انڈمان پہنچنے کے ساتھ ہی چیف کمشنر نے اطمینان دلا دیا کہ وائسرائے کی حفاظت کے تمام انتظامات بخوبی کر لیے گئے ہیں، مثلاً:

۱ ۔ مشقتی قیدیوں کو حکم دے دیا گیا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی کام پر سے غیر حاضر نہ ہونے پائے۔

۲ ۔ پولیس کی گارد وائسرائے کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے رہے گی۔ گارد کے ہر سپاہی کی بندوق

بھری ہوگی ؂

۳ - جن جزیروں میں زیادہ سنگین مجرم رہتے ہیں، ان میں پولیس کے علاوہ مسلح فوج بھی وائسرائے کی حفاظت پر مامور ہوگی ؂

غرض وائسرائے اکیس ضرب توپ کی سلامی کے بعد جہاز سے اترا۔ اس نے مختلف مقامات دیکھے۔ قیدیوں کے زنانہ اور مردانہ ہسپتال بھی ملاحظہ کیے۔ بعض بارکوں کا بھی معائنہ کیا۔ جزیرے میں ریل جاری کرنے کے متعلق بھی گفتگو کی۔ دوپہر کا کھانا چیف کمشنر کے ساتھ کھایا۔ مولوی محمد جعفر چشم دید حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ راستہ چلتے وقت پولیس کے آدمی جب وائسرائے کے بہت نزدیک ہو جاتے اور قیدیوں کو ذرا دُور ہٹاتے تو وائسرائے اس پر ناراضی کا اظہار کرتا۔ خود مولوی صاحب بعض اوقات وائسرائے سے اتنے قریب ہو جاتے کہ کپڑے سے کپڑا چھونے کی نوبت آجاتی[1] ؂

قیدیوں کی خوشی | چیف کمشنر اور افسران آباد کاری نے پرانے قیدیوں کو یقین دلایا تھا کہ وائسرائے کے تشریف لے جاتے ہی اچھے چال چلن والے اسیرانِ بغاوت اور دوسرے قیدی رہا کر دیے جائیں گے اس وجہ سے پرانے قیدی بہت خوش تھے اور اپنے آپ کو رہا شدہ سمجھتے تھے۔ کسی کو اندازہ نہ تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں ایک ایسا حادثہ پیش آجائے گا، جو نہ محض اس خوشی ہی کو ختم کر دے گا، بلکہ نئی مصیبتوں کا پیش خیمہ بن جائے گا ؂

انڈمان میں سال اور ساگھو کے علاوہ ایک لکڑی ہوتی ہے، جس کا رنگ خون کی طرح سُرخ ہوتا ہے۔ وہ نہایت پائدار، خوش نما اور خوش بودار ہوتی ہے۔ ان لکڑیوں کے لیے ایک آراگھر بھی بنا دیا گیا تھا۔ وائسرائے نے اسے بھی دیکھا اور وہاں اس عجیب و غریب لکڑی کا ایک بڑا تختہ ملاحظہ کیا جس سے انجام کار وائسرائے کا تابوت بنایا گیا[2] ؂

ماؤنٹ ہیریٹ کا معاینہ | ایک گھنٹہ دن باقی رہ گیا تھا۔ پرائیویٹ سکرٹری کا اصرار تھا کہ اب باقی دورہ اگلے روز پر ملتوی کر کے جہاز پر تشریف لے چلیں۔ لارڈ میو نے کہا کہ ابھی دن باقی ہے، ٹھنڈا

---

[1] تاریخ عجیب صفحہ ؂
[2] ؍؍ ؍؍ ؂

اور سہانا وقت ہے۔ ماؤنٹ ہیریٹ[1] کو دیکھ لینا چاہیے، جہاں ایک سنیٹوریم بنانے کی تجویز تھی۔ چنانچہ اس کی سواری کے لیے ایک یابو حاضر کر دیا گیا۔ نصف چڑھائی پر جا کر وائسرائے نے اصرار کیا کہ میں پیدل چلوں گا اور ساتھیوں سے کہا کہ جو چاہے یابو پر سوار ہو جائے۔ مونٹ ہیریٹ پر وائسرائے دیر تک غروب آفتاب کا تماشا دیکھتا رہا اور اس نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری سے کہا "ایسا خوب صورت نظارہ میں نے عمر بھر کبھی نہیں دیکھا"۔

قاتلانہ حملہ : ایسی کے وقت اندھیرا ہونے لگا تھا۔ وائسرائے اور اس کے ساتھی راستے کا تین چوتھائی حصہ طے کر چکے تو مشعلوں والے پہنچ گئے۔ مولوی محمد جعفر لکھتے ہیں کہ اس وقت سات بجے تھے:

لارڈ صاحب بہادر ریل ہوپ ٹاؤن پر پہنچے۔ دو مشعل والے لارڈ صاحب کے آگے، سپرنٹنڈنٹ صاحب اور پرائیویٹ سکرٹری لارڈ صاحب کے داہنے بائیں اور ایک لفٹنٹ اور ایک کرنیل فریگیٹ گلاس گیو (جس جہاز پر لارڈ میو آئے تھے) کے تھوڑے فاصلے پر پیچھے کی طرف لارڈ صاحب بہادر کے داہنے بائیں چلتے تھے اور مسلح گارد فری پولیس کا لارڈ صاحب سے پیچھے پاؤں سے پاؤں ملا ہوا چلتا تھا . . . لارڈ صاحب بہادر نے مع پرائیویٹ سیکرٹری کے آہستہ آہستہ چل کر گھاٹ کی سیڑھیوں کی طرف جا کر بوٹ میں اترنا چاہا۔ اس وقت یک بیک لارڈ صاحب بہادر کی طرف کچھ ضرب کے کھٹکے کی آواز سنی گئی اور جب اُس طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ لارڈ صاحب کی پشت پر کوئی ہاتھ مع چھری کے وار کر رہا ہے اور ایک آدمی لارڈ صاحب کی پشت پر چمٹا ہوا ہے۔ دس بارہ آدمی ایک دم اُس شخص پر گر پڑے۔ ارجن قیدی نے پکڑ کر چھری اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ افراتفری میں مشعلیں گُل ہو گئی تھیں۔ پرائیویٹ سکرٹری نے قیدی کو مار پیٹ سے چھڑایا۔

---

[1] جنوبی انڈمان کی یہ مشہور پہاڑی ہے، جس کی بلندی ۱۱۹۳ فٹ ہے۔ اس کا نام انڈمان کے ایک حاکم کرنیل ٹائٹلر (۱۸۶۲ - ۱۸۶۴) کی بیوی HARRIET کے نام پر رکھا گیا تھا۔ سب کا بیان ہے کہ یہ جگہ بہ لحاظ آب و ہوا بہت خوشگوار ہے۔ ہوپ ٹاؤن اس کے قریب واقع ہے۔

وائسرائے کی وفات

لارڈ میو ضرب کھا کر سمندر میں گر گئے۔ جب دیکھا تو وہ گھرے پانی میں کھڑے اپنا منہ صاف کر رہے تھے۔ پرائیویٹ سکرٹری سے کہا "مجھے ضرب لگائی گئی، لیکن کچھ فکر نہیں، ضرب معمولی ہے"۔ ممدوح کو گاڑی پر بٹھا دیا گیا جو پُل پر کھڑی تھی۔ مشعلیں دوبارہ روشن کی گئیں۔ اُس وقت دیکھا کہ ان کی پشت پر کوٹ کٹ کر ایک چھید ہو گیا ہے، جس میں سے پرنالے کی طرح خون بہتا ہے۔ اسے رومالوں سے بند کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ ایک دو منٹ تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر ان کے پاؤں لڑکھڑائے اور پیچھے کی طرف گر پڑے۔ آہستہ سے کہا: "میرا سر اوپر اٹھاؤ"۔ ساتھ ہی ختم ہو گئے۔

جہاز پر پہنچا کر ڈاکٹروں نے دیکھا تو کہا کہ اب ہر کوشش بے سود ہے۔ دو کاری زخم مونڈھے کے پاس سے شروع ہو کر سینے تک چیرتے چلے گئے تھے۔ ان میں سے ایک بھی جان لینے کے لیے کافی تھا۔

شیر علی قاتل

قاتلانہ حملہ شیر علی قیدی نے کیا تھا، جو اصلاً تیراہ کا آفریدی تھا۔ کمشنر پشاور کے سوار اردلیوں میں بھرتی ہوا۔ اس کے خاندان کی دو شاخوں میں مدت سے شدید عداوت چلی آتی تھی اور جھگڑوں میں دونوں شاخوں کے بہت سے آدمی مارے جا چکے تھے۔ شیر علی کو بھی گھر والوں کی طرف سے بار بار بلاوے آئے کہ آؤ اور دشمنوں سے بدلہ لو۔ ایک مرتبہ اسے خبر ملی کہ دشمنوں میں سے ایک پشاور آیا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ اٹھا اور پشاور کے ایک باغ میں اس نے دشمن کو قتل کر دیا۔ [1] اس پر قتل کا مقدمہ قائم ہوا اور ۲۔ اپریل ۱۸۶۷ء کو پھانسی کا حکم سنایا گیا، لیکن چونکہ اس کا عام چلن اچھا تھا۔ جنگ امبیلہ میں بھی وہ شریک رہا تھا اور انگریزوں کی خدمات انجام دی تھیں لہٰذا سزائے موت کو حبسِ دوام بعبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔ ۱۸۶۹ء سے اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی بڑے انگریز کو قتل کرے گا۔ وہ اکثر روزے رکھتا۔ تنخواہ اور مزدوری سے جو کچھ بچ رہتا، مہینے دو مہینے کے بعد اس کا کھانا پکا کر مسکینوں میں تقسیم کر دیتا۔ نیک کرداری کے باعث وہ بہت ممتاز ہو گیا تھا اور نگران بھی اس کی زیادہ دیکھ بھال نہ کرتے تھے۔

---

[1] ملاحظہ ہو رینل ٹیلر کے سوانح حیات۔ انگریزی۔ صفحہ ۲۶۸-۲۷۲۔ ٹیلر نے یہ حالات لارڈ میو کے قتل کے بعد ۱۳۔ فروری ۱۸۷۲ء کے لندن ٹائمز میں شائع کرائے تھے۔

مشقتی قیدیوں کے لیے اسے حجام بنا دیا گیا تھا۔

جُرم کی تفتیش انگریزوں کو یقین تھا کہ شیر علی کا یہ فعل گہری سازش کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ڈپٹی کمشنر پولیس کلکتہ کے علاوہ لالہ ایشوری پرشاد کو تفتیش کے لیے بھیجا گیا۔ آخر الذکر مقدمات سازش خصوصاً مقدمہ انبالہ اور پہلے مقدمہ عظیم آباد میں کارکردگی کے باعث سورج گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر بن چکا تھا۔ ان لوگوں نے ممتاز قیدیوں کو الجھانے کی بڑی کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

خود شیر علی کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ دن بھر گھات میں رہا لیکن حملے کا موقع نہ مل سکا۔ ناامید ہو کر وہ ماؤنٹ ہیریٹ پر جا بیٹھا۔ گویا تقدیر خود اسے موقع پر لے گئی۔ بے شک بڑا شہ زور تھا: ایک موقعے پر بھاری بیڑی اور ہتھکڑی توڑ کر اس نے بتی بجھائی اور گورے پہریدار کی سنگین چھین کر اسے زخمی کر دیا، لیکن دیکھنے میں بہت دُبلا پتلا اور بدرُو تھا۔ خیال میں یہ بات نہ آتی تھی کہ لارڈ میو جیسے طویل القامت اور بھاری بھرکم شخص پر وہ حملہ کر سکے گا۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ حملہ کس کے ایماء سے کیا؟ جواب دیتا : خدا کے حکم سے۔

پھانسی کی سزا غرض اس پر مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا ہوئی۔ منظوری کے بعد پھانسی دینے لگے تو اس نے بلند آواز سے کہا:

> میں نے جب اس کام کا ارادہ کیا تھا تو اپنے تئیں مردہ سمجھ لیا تھا۔ . . مسلمان بھائیو! میں نے تمھارے دشمن کو مار ڈالا۔ اب تم شاہد رہو کہ میں مسلمان ہوں اور کلمہ پڑھا۔ دو دفعہ کلمہ ہوشیاری سے پڑھا۔ تیسری بار پھانسی کی رسّی سے گلا گھُٹ کر پورا کلمہ ادا نہ ہوا۔

یوں لارڈ میو کے قتل سے ایک مہینا چار روز بعد ۱۱۔ مارچ ۱۸۷۲ء کو اسے پھانسی دی گئی۔ کہتے ہیں کہ ۱۸۷۱ء میں چیف جسٹس نارمن پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا تو لارڈ میو کو بھی خبردار کر دیا گیا تھا اور حفاظت کے بڑے انتظامات کر لیے گئے تھے، لیکن خود لارڈ میو

مسکراتے ہوئے کہتے کہ مارنے والے کو یہ انتظامات روک نہ سکیں گے[1]۔

اس واقعے کی وجہ سے مجاہدین کو مزید دس سال قید میں بسر کرنے پڑے۔

---

[1] یہ حالات مولوی محمد جعفر کی "تاریخ عجیب" سے ماخوذ ہیں (صفحہ ۶۵-۸۲) جو اس واقعے کے عینی شاہد تھے۔ مولوی صاحب نے بعض خوفناک بے انصافیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ جھنڈا شاہ نام ایک سر بھنگی فقیر ۱۲۔ دسمبر ۱۸۵۸ء کو ضلع رائے بریلی سے بجرم ترغیب بغاوت چودہ برس کی سزا پا کر انڈمان آیا تھا اور اسے ۱۲۔ دسمبر ۱۸۷۲ء کو رہا ہو جانا چاہیے تھا، لیکن "تاریخ عجیب" کی ترتیب تک وہ رہا نہ ہوا تھا۔ لارڈ میو کو مسلمانوں کا دشمن غالباً اس لیے کہا کہ اس کے عہد میں مسلمانوں خصوصاً "وہابی" مسلمانوں پر بہت سختیاں ہوئی تھیں۔

تیرھواں باب

نظامِ عمل اور اصطلاحات

غلط فہمی اور غلط بیانی دعوت و تبلیغ کے متعلق کچھ تفصیلات گزشتہ ابواب میں پیش کی جا چکی ہیں، انھیں دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ روپیہ کن کن ذریعوں سے اور کس کس طریق پر جمع کیا جاتا تھا۔ یہاں سب سے پہلے ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا چاہیے، جس میں بعض اصحاب نیک نیتی سے مبتلا ہوے۔ اس کا سرچشمہ ڈاکٹر ہنٹر جیسے متعصب، حق ناشناس اور خدا ناترس انگریزوں کی مسلسل و متواتر غلط بیانیاں تھیں یعنی سمجھ لیا گیا تھا کہ جماعت مجاہدین کے داعی عوام کو رات دن جہاد بالسیف کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں ان کا خاص مشغلہ یہی ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو بطائف الحیل عساکر مجاہدین میں بھرتی کر کے سرحد پہنچا دیں، جہاں سے مراجعت بوجوہ بہت دشوار تھی۔ مقدمہ انبالہ کے بعض گواہوں نے اپنے بیانات میں یہ بھی کہا کہ وہ سرحد سے واپس آنے کے آرزومند تھے، لیکن نگرانی ایسی سخت و شدید ہوتی تھی کہ دیر تک واپسی کی کوئی صورت نہ بنی۔

حقیقت حال پر نظر رکھی جائے تو داعیوں کا اصل کام یہ تھا کہ مسلمانوں کو دینِ حقہ کے پابند بنائیں۔ ان کی زندگیاں شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ضروری معلومات بہم پہنچاتے رہیں اور جو جو عقیدے یا اعمال یا رسمیں خلاف اصول اسلام ہوں، انھیں ترک کرا دیں۔ البتہ وہ یہ بھی بتاتے تھے کہ جہاد اسی طرح ایک اہم اسلامی حکم ہے جس طرح نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج یا دوسرے اسلامی احکام ہیں۔ یہ بھی ضرور بتاتے ہوں گے کہ غیر مسلموں کے تسلط سے ہندوستان دارالحرب بن چکا ہے، اس لیے کہ اس میں اسلامی واجبات و احکام کی تعمیل آزادانہ نہیں ہو سکتی۔ بعض احکام کی بجا آوری سے یقیناً تعرض نہیں کیا جاتا، تاہم یہ برائے نام آزادی مسلمانوں کی قوت و طاقت اور حکم و اختیار کا نتیجہ نہیں بلکہ حاکموں کی

مصلحت شناسی اور اجازت بخشی کا نتیجہ ہے۔ حاکم جس وقت چاہیں، اسے ختم کر سکتے ہیں ۔

حوصلہ سوز تغیر گویا وہ لوگ اسلامیت کے چند تقاضوں نہیں بلکہ تمام تقاضوں کو پورا کرانے کے لیے کوشاں تھے۔ ان میں سے ایک ضروری تقاضا جہاد کا بھی تھا۔ ہنٹر وغیرہ نے اسی کو مرجع و محور ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ صورتِ حال کے متعلق عوام کے خاصے بڑے طبقے میں غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ پھر مختلف لوگ اٹھے اور انھوں نے اپنے اپنے اسلوب فکر کے مطابق جہاد کی قدر و قیمت گھٹانے یا ہندوستان کو اس کے دائرۂ عمل سے نکالنے کی کوششیں شروع کر دیں، جو حضرات جہاد کے معتقد تھے، انھوں نے ایک عجیب محتاط راستہ اختیار کیا یعنی امامِ جہاد کے شرائط پر حد درجہ زور دیا اور بالآخر صاف کہہ دیا کہ آج نہ جامع الشروط امام مل سکتا ہے اور نہ جہاد کا سوال زیرِ غور آ سکتا ہے۔ اس طرح سید صاحب کی جماعت کے داعیوں اور کارکنوں کی جانبازانہ کوششوں کے ایمان افروز نتائج مٹا دیے گئے، جن کے لیے انھوں نے دنیوی زندگی کی تمام راحتیں، اطمینان و دلجمعی کے تمام سامان اور فارغ البالی کے تمام وسائل بے دریغ قربان کیے تھے۔ جن زہرہ گداز مشکلات میں یہ کارنامہ انجام پایا تھا، ان کا تصوّر بھی ہمارے عہد کے دعوے داران دعوت شاید ہی کر سکیں ۔

مخالفانہ مساعی کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا کہ اس کا حصر مشکل ہے، مثلاً کہیں اختلاف عقائد کا فتنہ اٹھایا گیا، کہیں سید صاحب کی جماعت کے کارکنوں کا رشتہ اہلِ نجد سے جوڑا گیا اور اہلِ نجد کے متعلق غلط بیانیوں کے جو طومار قرنوں میں تیار کیے جا چکے تھے، ان سب کو سید صاحب کی جماعت کے سر پر پٹک دیا گیا۔ کہیں اسبابِ جہاد میں موشگافیاں کرتے کرتے معاملہ اس منزل پر پہنچا دیا گیا کہ اس حکم کے وجود اور عدم میں کوئی فرق نہ رہا۔ آخر میں بعض لوگوں نے جہاد کی حیثیت ہی منقلب کر دی۔ یہ نہ بھولیے کہ ان تمام مختلف الاشکال مساعی کو حکومتِ انگلشیہ کی خاص سرپرستی حاصل رہی۔ اکثر مسلمانوں کو فریضۂ جہاد سے بچ نکلنے کی سہل اور بے مشقت راہیں مل گئیں تو وہ ان راہوں پر چل نکلے۔ اس طرح اصل مقصد ہی کا انھیں کوئی احساس نہ رہا۔ اسلامی فکر و نظر میں یہ خوفناک تغیر بڑا ہی حوصلہ سوز اور ہمت فرسا تھا۔ اگر یہ فتنے نہ اٹھتے یا نہ اٹھائے جاتے تو یقیناً سید صاحب کی جماعت کے داعیوں کی

کوششیں مسلمانوں کو قرنوں پہلے آزادی کی منزل مقصود پر پہنچا دیتی اور ہماری بیداری کی تاریخ جنگ طرابلس سے کم وبیش سوا سو سال پیشتر شروع ہوتی ۔

ایک مثال ہنٹر نے اپنی کتاب میں ایک واقعہ لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بوڑھا آدمی سرکٹ ہاؤس میں پیپل کے نیچے بیٹھا ہوا لوگوں کو وعظ سنا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ محرّم کا مہینا قریب آرہا ہے، تم لوگ اس موقعے پر نئے کپڑے پہنو گے، حالانکہ اس قسم کی تمام باتیں خدا اور اس کے رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نزدیک نادرست ہیں ۔

اس بوڑھے واعظ کی سواری کا ایک یابو تھا، جسے چرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا اور اس کے پاؤں میں گھاس کا رسّا بندھا ہوا، دو اس کے ساتھی تھے۔ وعظ کے بعد اس نے تھوڑی دیر آرام کیا۔ پھر وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر دوسری جگہ چلا گیا ۔

وعظ سُننے کے بعد سامعین نے مختلف رائیں ظاہر کیں: ایک بولا: یہ شخص ہمارے باپ دادا کی قبروں پر چراغ جلانے سے روکتا ہے، دوسرے نے کہا: یہ ہماری لڑکیوں کی شادیوں پر باجے گاجے اور ناچ رنگ کا مخالف ہے۔ تیسرے نے یہ رائے ظاہر کی کہ یہ شخص قرآن مجید سے واقف ہے اور کتابِ پاک نے ہمیں یہی حکم دیا ہے کہ صرف خدا کی عبادت کی جائے۔ چوتھا اٹھا اور بے تکلف گویا ہوا: بھائیو! یہ تو "وہابی" ہے ۔

اگر ہم رنگ آمیزیوں سے قطع نظر کرلیں تو اس واقعہ سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہ کہ ایک مسکین واعظ نے مسلمانوں کو بُری رسموں اور غیر شرعی مشغلوں سے باز رکھنے کی کوشش کی، نہ کسی سے کچھ مانگا، نہ لیا۔ اسی طرح وہ جا بجا وعظ کہتا پھرتا تھا ۔

یہی بے غرضانہ دعوت و تبلیغ تھی، جسے ہنٹر جیسے لوگوں نے سالہا سال تک ہوّا بنائے رکھا۔ لطف یہ کہ نہ اسلام کے متعلق صحیح معلومات پیش نظر تھیں، نہ یہ پتا تھا کہ "وہابیت" کیا شے ہے بلکہ سیّد صاحب کی جماعت کے لوگوں کو "وہابی" قرار دینا ہی جہالت کی ایک بدترین مثال تھی، لیکن ہمارا مقصد غلط بیانیوں کی تردید نہیں بلکہ ہم جماعت کے نظامِ دعوت کی مختصر سی کیفیت پیش کرنا چاہتے ہیں ۔

نظامِ دعوت ہمارے سامنے نظامِ دعوت کا کوئی مرتب مرقع موجود نہیں، البتہ مختلف کارکنوں کی سرگرمیوں کے سلسلے میں جابجا جو کچھ بیان ہوا، اسے سامنے رکھ کر ایک معقول اور زیادہ سے زیادہ قرینِ صحت خاکہ تیار کیا جا سکتا ہے مثلاً:

۱ - مختلف اضلاع میں دعوت و تبلیغ کے مرکز قائم تھے۔ ہر ضلعے کو سہولت کار کے لحاظ سے مختلف ٹکڑوں میں بانٹ کر جابجا ماتحت مراکز بنا دیے گئے تھے۔

۲ - گاؤں سب سے چھوٹا یونٹ تھا اور شاید ہی کوئی گاؤں ہو، جہاں مرکز نہ بنا دیا گیا ہو۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے دیہات میں تحصیل اموال کی غرض سے دو دو مرکز قائم کر دیے گئے تھے۔

۳ - دعوتِ اصلاح اور فراہمی سرمایہ کے علاوہ ہر مرکز کے ذمے ایک ضروری کام یہ تھا کہ اپنے حلقے کے تمام مقدمات کا منصفانہ فیصلہ کرے تاکہ جماعت کے کسی آدمی کو سرکاری کچہریوں میں جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اس انتظام کے بدیہی فوائد کا اندازہ فرمائیے:

ا - غیر مسلم حکومت قائم ہو جانے کے باوجود مسلمانوں کے لیے اسلامی اصول اور قوانین کے مطابق فیصلے کرا لینے کا نظام مہیا کر دیا گیا۔

ب - غیر اسلامی قانون کی براہِ راست تابعیت اور اس کے ضمن میں حصول مقاصد کے غیر اسلامی وسائل اختیار کی ضرورت جماعت کے کسی آدمی کو پیش نہ آسکتی تھی۔ اس طرح قلب میں اسلامی اقدار کی عزت و عظمت برقرار رہتی تھی۔

ج - افرادِ ملت زندگی کے عام کاروبار میں صرف اپنوں ہی سے وابستہ رہتے تھے۔ غیروں سے وابستگی یا ان پر انحصار کا کوئی امکان پیدا نہ ہو سکتا تھا۔

۴ - نظامِ جماعت کے استحکام اور مقدموں کے فیصلوں کے لیے مساجد کی آبادی ضروری تھی۔ چنانچہ تمام دیہات میں مسجدوں کی آبادی کا خاص اہتمام کیا جاتا اور ان میں ایسے امام رکھے جاتے جو دعوت و تبلیغ کے فرائض بھی بوجہ احسن انجام دے سکتے اور فصل خصومات کے

گراں قدر وظائف سے بھی عہدہ برآ ہو سکتے۔

۵- چھوٹی چھوٹی تبلیغی کتابیں یا اصلاحی رسالے بہ کثرت لکھے اور شائع کیے گئے۔ اس سلسلے میں شاہ اسمٰعیل شہید کی "تقویت الایمان" یا اس کا ضمیمہ "تذکیر الاخوان" کے علاوہ سید اولاد حسن قنوجی، مولوی خرم علی بلہوری، مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی اور بیسیوں دوسرے بزرگوں کے چھوٹے چھوٹے رسالے بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اکثر رسالوں اور کتابوں کی زبان اتنی سہل ہوتی کہ معمولی اردو خواں بھی ان سے مستفید ہو سکتے۔ بعض اصحاب نے ضروری مسائل کو نظم کر دیا تھا، جسے یاد کر لینا بہت آسان تھا۔ جا بجا چھاپے خانے قائم کر دیے گئے تھے جن میں اس قسم کی کتابیں متواتر چھاپی جاتیں اور دو دو چار چار پیسے میں مل جاتیں۔ دینی خدمات کے علاوہ ان کے ذریعے سے اردو زبان کی جو خدمت انجام پائی وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

"قافلہ" مولانا ولایت علی اور ان کے اخوان و اعزہ کی برکت سے عظیم آباد دعوت و تبلیغ اور فراہمی مجاہدین و سرمایہ کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ اس لیے وہاں داعیوں اور مجاہدوں کی آمد کا سلسلہ برابر جاری رہتا۔ بعض لوگ روپیہ لے کر آتے۔ بعض شائقین جہاد کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں لاتے۔ روپے اور مجاہدین کو بہ آرام و حفاظت سرحد پہنچایا جاتا۔ بعض لوگ دعوت و تبلیغ کی تربیت حاصل کرنے کے لیے آ جاتے۔ اہلِ عظیم آباد نے اپنے مکانوں میں ایک وسیع مکان الگ کر دیا، جہاں مہمان بھی ٹھہرتے تھے۔ وعظ بھی ہوتے تھے اور درس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس کا نام ہی "قافلہ" پڑ گیا تھا[1]۔ یہ قابلِ یادگار مرکز ۱۸۶۵ء تک قائم تھا۔ جب بزرگانِ عظیم آباد کی جائدادیں ضبط ہوئیں تو ان کے مکانوں کے علاوہ "قافلہ" بھی منہدم کرا دیا گیا اور اس کی جگہ بلدیہ کی عمارتیں بن گئیں۔ اب کوئی شخص پہلی حالت کا تصور

---

[1] معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا نام "قافلہ" کیوں رکھا گیا۔ ایک وجہ تو یہ ذہن میں آتی ہے کہ یہ مقام چونکہ مجاہدین کے قافلوں کے لیے وقف تھا اس لیے اسے قافلہ کہنے لگے۔ ممکن ہے یہ وجہ بھی ہو کہ سید صاحب کے اہل و عیال اور ساتھی سرحد سے ٹونک پہنچے تھے تو جو جگہ ان کے قیام کے لیے تجویز ہوئی تھی اسے "قافلہ" ہی کہتے تھے۔ اغلب ہے اہلِ عظیم آباد نے وہی نام پسند کر لیا ہو۔

بھی نہیں کر سکتا۔ اس عمارت کا ایک خاکہ مقدمۂ انبالہ میں پیش ہوا تھا۔ میں اسے شائع کر رہا ہوں تاکہ موجودہ اور آئندہ نسلیں اس مقام کو نہ بھولیں جس کی فضا کم و بیش تیس سال تک ذکرِ حق اور دعوتِ دین کی صداؤں سے معمور رہی ؎

اصطلاحات ان بزرگوں نے مصالح اخفا کے پیشِ نظر مختلف افراد و امکنہ اور اشیا کے مخصوص نام یا اصطلحات مقرر کر لیے تھے، جنھیں جماعت کے خاص کارکنوں کے سوا کوئی نہ سمجھتا تھا۔ خط و کتابت میں عموماً یہی اصطلاحی نام استعمال کیے جاتے تھے ؎

مقدمہ انبالہ میں جو گواہ پیش ہوئے، ان میں سے بعض کی شہادتیں مصطلحہ اسما ہی کی توضیح پر مشتمل تھیں۔ اس توضیح کے بغیر ان تحریرات و مکاتیب کی حقیقی حیثیت آشکارا نہ ہو سکتی تھی، جو تلاشیوں کے دوران میں مختلف اصحاب کے مکانوں سے برآمد ہوئے تھے۔ پیش کردہ الزامات کو ثابت کرنے کے لیے مصطلحات کی توضیح بھی ضروری تھی ؎

میرا خیال ہے کہ تمام گواہ ان اصطلاحات سے براہِ راست واقف نہ ہو سکتے تھے۔ پولیس کو کہیں سے کچھ سراغ مل گیا تو اس کے مطابق گواہوں سے شہادتیں دلا دی گئیں۔ مولانا مسعود عالم مرحوم نے لکھا ہے کہ راون شا نے اپنی رپورٹ میں اصطلاحات کی فرہنگ درج کر دی تھی[1]

میں نے مختلف اصحاب کے موسومہ مکاتیب کا مطالعہ وقتِ نظر سے کیا تو یہ حقیقت بروئے کار آئی کہ اصطلاحات میں مکتوب الیہ کے پیشے کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا۔ مثلاً دہلی کے تاجرانِ جفت کو جو خط بھیجے جاتے تھے، ان میں عموماً جوتوں کا ذکر ہوتا تھا، لیکن قرینہ پیشِ نظر رکھتے ہوئے کبھی ان سے مجاہدین مراد ہوتے تھے اور کبھی روپے۔ اسی طرح جب کسی کتب فروش کے ذریعے سے ہنڈی بھیجی جاتی تھی تو "روپوں" کے لیے عموماً "کتابوں" کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی ؎

اسمائے رجال سب سے پہلے مختلف کارفرماؤں اور کارکنوں کے فرضی یا مصطلحہ اسمائی کی فہرست

---

[1] ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صـ ۱۲۳ ؎

درج کی جاتی ہے :

اصل نام	مصطلحہ نام
مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی	محی الدین
مولانا فیاض علی عظیم آبادی	بصیر الدین[1]
مولانا عبداللہ (امیر المجاہدین)	بابو صاحب
محمد شفیع ٹھیکیدار	شفاعت علی
مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی	رحیم بیگ
مولوی محمد جعفر تھانیسری	پیرو خاں
عبدالقادر	غلام قادر
مولانا احمد اللہ عظیم آبادی	احمد علی[2]
محمد احسان	روح اللہ
معظم سردار	عبداللہ
قاضی میاں جان	محمد شاکر، عبدالرحمٰن، عبداللہ خاں
عبدالغفور	عبدالغنی

[1] مولانا مسعود عالم نے اس نام کو "بشیر الدین" قرار دیا، میں نے جہاں دیکھا "بصیر الدین" ہی دیکھا۔

[2] مولانا احمد اللہ کا یہ اصل نام تھا۔ سید صاحب نے بیعت کے بعد ان کا نام احمد اللہ قرار دیا۔

[3] قاضی صاحب کے یہ مصطلحہ نام مقدمۂ انبالہ میں پیش ہوئے۔ معلوم نہیں کہ وہ مختلف اصحاب سے خط و کتابت کے وقت مختلف نام استعمال کرتے تھے یا انھوں نے مختلف اوقات میں مصطلحہ نام اختیار کیے۔

بعض لوگوں نے سرحد سے واپس آکر نام بدل لیے تھے مثلاً محمد عیسیٰ (ابن مولانا یحییٰ علی) نے یہاں آکر اپنا نام امجد علی رکھا اور عبدالقدیر (ابن مولانا احمد اللہ) نے اشرف علی ۔

بعض عہدوں کے ناموں کی بھی اصطلاحیں مقرر کر لی تھیں مثلاً:

منیب	امام
نائب	امیر

امکنہ و اشیا اشیا و امکنہ کے باب میں جو کچھ معلوم ہو سکا، اس کی کیفیت بھی ملاحظہ فرما لیجیے:

مصطلحہ نام	اصل مقام یا شے
قافلہ[1]	رنگروٹوں کا جیش
بڑا گودام	مجاہدین کے سرحدی مرکز ملکا یا ستھانہ
چھوٹا گودام	عظیم آباد (پٹنہ)
مقدمہ	جنگ
مختار	ذاتِ باری تعالیٰ
سفید پتھر، سفید دانے یا بلوری دانے	روپے اور ہنڈیاں
سنہری دانے، یاقوت سرخ، دہلی کے سنہری جوتے، سرخ پھندے	اشرفیاں

[1] پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ اس مکان کا بھی نام تھا جو اہل عظیم آباد نے جماعتی سرگرمیوں کے لیے وقف کر رکھا تھا ۔

جیساکہ عرض کیا جا چکا ہے، اصطلاحات موقعے اور حالات کے مطابق وضع کر لی جاتی تھیں۔
مثلاً محمد شفیع نے فوجوں کو گوشت مہیا کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا اور وہ گائے بیل وغیرہ خریدتا رہتا تھا۔
جب اس کے خط میں مجاہدین کا ذکر کیا جاتا تھا تو "سانڈ" کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔ بعض تحریرات
میں مجاہدین کو "مسافر"، "بیوپاری" اور "خدمت گار" کہنے کا ذکر بھی آتا ہے۔

چھٹا حصّہ

(جنگ امبیلہ سے آخر تک)

پہلا باب

مجاہدین پر قبائلیوں کی یورش

مجاہدین اور ساداتِ ستھانہ | جنگ امبیلہ کے سلسلے میں بتایا جاچکا ہے کہ مجاہدین کے لیے خود اخوند صاحب سوات نے چغرزئیوں کے علاقے میں قیام کا انتظام کر دیا تھا اور زخمیوں کو بھی وہاں پہنچا دیا تھا۔ ساداتِ ستھانہ اس کے بعد بھی ہمیشہ مجاہدین کے ہمدرد اور خیرخواہ رہے۔ مجاہدین نے بھی ان سے حسنِ علائق کا سلسلہ برابر قائم رکھا، تاہم تیس پینتیس برس سے ان کے درمیان دائرۂ جہاد میں اشتراک و تعاون اور یک جائی و یک جہتی کی جو صورت چلی آرہی تھی، وہ جنگِ امبیلہ کے بعد قائم نہ رہی، اس لیے کہ قیام گاہیں الگ الگ ہو چکی تھیں اور بُعدِ مکانی کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ ان کی وقتی سرگرمیوں میں بھی پہلے کی سی یکجہتی باقی نہ رہے۔ سرحدی لاکا ہنے مصالحت کے لیے جو شرطیں انگریزوں سے طے کی تھیں، بداہتہً ان میں بھی یہ غرض مخفی تھی کہ مجاہدین اور ساداتِ ستھانہ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو جائیں اور ان کے درمیان مل جُل کر رہنے یا ایک دوسرے کی مدد کے لیے بروے کار آنے کا کوئی امکان نہ رہے۔ اس میں مجاہدین اور سادات دونوں کے لیے نقصان کے صریح پہلو موجود تھے۔ مجاہدین کو ہر نازک حالت میں سادات کے پاس قیام کے لیے جگہ مل سکتی تھی اور جو حالات ہم بیان کر چکے ہیں، ان سے صاف واضح ہے کہ سرحدِ آزاد کے جس طبقے نے نتائج و عواقب سے بالکل بے پروا ہو کر مجاہدین کو سینے سے لگائے رکھا اور اس عزیز تعلق کی پاس داری میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا، وہ صرف ساداتِ ستھانہ تھے۔ جس جنگی قوت پر ساداتِ ستھانہ ہر حال میں کامل اعتماد کر سکتے تھے، وہ مجاہدین کی قوت تھی۔ دونوں کی علیحدگی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مجاہدین کو ساداتِ ستھانہ جیسے معاون نہ مل سکے

اور سادات ستھانہ مجاہدین جیسے جانبازوں سے محروم ہو گئے۔ آئندہ دونوں کے لیے قدم قدم پر پریشانیاں پیدا ہوئیں اور ایک دوسرے کے لیے زیادہ سے زیادہ اخلاص و محبت کے باوجود باہم عملی امداد کی کوئی تدبیر نہ بن سکی۔ اغلب ہے انگریزوں کو بھی معاہدے کے اس پہلو کا پورا اندازہ ہو۔

کرنل وائلی کا بیان کرنل وائلی نے لکھا ہے کہ مجاہدین علاقہ چنغرزئی کے علاقے میں کچھ دیر مقیم رہے جو علاقہ بونیر کی مشہور ندی برندو کے شمال میں واقع ہے، لیکن وہاں ان کے لیے امن و اطمینان کی صورت پیدا نہ ہو سکی، اس لیے کہ ان کے میزبان یعنی چنغرزئی افغان اکثر اخراج کی دھمکیاں دیتے رہتے تھے:

> معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۸ء میں وہ (مجاہدین) علاقہ چنغرزئی سے اٹھ کر باج کٹہ واقع بونیر میں منتقل ہو چکے تھے۔ یہیں اپریل ۱۸۶۸ء میں فیروز شاہ اُن سے آ ملا جو دہلی کے آخری بادشاہ کا فرزند تھا۔[1]
>
> بونیر میں ہندوستانی مجاہدین کی موجودگی اخوند صاحب کے لیے ناخوش گوار تھی، لہٰذا اس نے اپنے ہم مشربوں کو ترغیب دی کہ مجاہدین کو خارج کر دینے کا فیصلہ

---

[1] شہزادہ فیروز شاہ، ابوظفر بہادر شاہ کا فرزند نہ تھا، جیسا کہ وائلی نے لکھا ہے بلکہ چچیرا بھائی تھا۔ یعنی یہ شاہ عالم ثانی کا پوتا اور شہزادہ ناظم بخت برادر اکبر شاہ ثانی کا فرزند تھا۔ ۱۸۵۶ء میں حج کے لیے چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی کے وقت "غدر" شروع ہو چکا تھا۔ راستے ہی میں شہزادے نے ایک فوج کی کمان سنبھال لی اور دیر تک انگریزوں کے خلاف لڑتا رہا۔ جب انگریز ہندوستان پر دوبارہ مسلط ہو گئے تو شہزادہ آزاد علاقے میں چلا گیا۔ ۱۸۶۸ء میں مجاہدین کے پاس پہنچا۔ غالباً یہ خیال کر کے کہ اتنے تھوڑے آدمیوں سے انگریزوں کے خلاف مؤثر اقدام نہ کیا جا سکے گا، وہ چلا گیا۔ بعد کی زندگی کے متعلق دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ اس نے ترکستان میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں فوت ہوا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ مکہ معظمہ چلا گیا اور وہاں ۱۸۹۵ء میں وفات پائی۔

کرلیں۔ اس فیصلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجاہدین جن کی تعداد اب تقریباً سات سو تھی، عجلت سے ملکا چلے گئے، جہاں وہ اپنے پرانے مکان دوبارہ تعمیر کرنے لگے۔ ان میں سے بعض کو آگے چل کر بونیر میں آباد ہونے کی اجازت مل گئی لیکن اخوند صاحب کے خلاف سازشوں کا سلسلہ جاری رہنے کے باعث اخراج کا حکم دوبارہ نافذ کر دیا گیا اور انھیں شدید نقصان پہنچا کر جبراً ملک سے باہر نکال دیا گیا۔ چنانچہ انھوں نے پہلے چنعرزئیوں کے پاس پناہ لی، پھر پلوسی چلے گئے۔ وہاں سے تاکوٹ منتقل ہو گئے۔ انجامِ کار حسن زئیوں کے علاقے میں پہنچے اور پلوسی کے قریب میدان میں کچھ زمین پٹے پہلے لی۔ وہاں وہ ۱۸۸۸ء تک رہے[1]۔

حقیقتِ حال مجاہدین کے مراکز سے متعلق وائلی کا بیان فی الجملہ درست معلوم ہوتا ہے لیکن بونیر سے اخراج کا معاملہ تھوڑی سی تفصیل کا محتاج ہے

اخوند صاحب صوات کے لیے مجاہدین سے کشمکش کی بظاہر کوئی وجہ موجود نہ تھی۔ صاحب موصوف کا اصل مرکز صوات تھا۔ بونیر کے بیشتر قبیلے انھیں مقدس بزرگ مانتے تھے۔ مجاہدین نے کوئی روحانی مسند قائم نہ کی تھی کہ اخوند صاحب سے رقابت کا سوال پیدا ہوتا، پھر یہ کیوں کر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ مجاہدین اخوند صاحب کے خلاف سازشیں کر رہے تھے؟

البتہ ملا صاحب کوٹھا عرف حضرت جی اور اخوند صاحب کے درمیان اک گونہ رنجش مدت سے چلی آتی تھی۔ چونکہ ملا صاحب بھی وقت کے عظیم القدر روحانی بزرگ تھے اور وہ بونیر و صوات کے مختلف علاقوں میں دورے کرتے رہتے تھے، اس لیے باہمی کشمکش کے ممکنات موجود تھے۔ ملا صاحب کا روحانی تعلق سید احمد شہید سے تھا۔ ہندوستان میں سید صاحب کے تمام نیازمندوں پر مقدمات کے سلسلے میں "وہابیت" کی تہمت لگ چکی تھی۔ اس کی صدائے بازگشت

[1] "وائلی کی کتاب" ص ۱۰۵ و ۱۰۶

سرحد میں بھی پہنچی اور اخوند صاحب کے حلقۂ اثر میں ملا صاحب کے متعلق ایسی باتیں کہی جانے لگیں، جن سے یہ ظاہر کرنا منظور تھا کہ ملا صاحب کو ٹھا بھی "وہابی" ہیں ۔

ملا صاحب جب دورے پر نکلتے تھے تو ہر گاؤں کے لوگ انھیں پالکی میں سوار کر کے عقیدت مندانہ خود اٹھاتے ہوئے اپنے ہاں لے جاتے تھے ۔ انھیں اخوند صاحب کے حلقۂ اثر کی بات چیت اور الزامات کا علم ہوا تو دورہ کرتے ہوئے اخوند صاحب کی قیام گاہ سیدو شریف پہنچے اور موصوف سے کہا :

آپ کی مجلس میں مجھ پر اعتقادی اور مذہبی تہمت اور الزام لگایا جاتا ہے ۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ اپنے مرید علماء کو بلوا دیں اور میں ان کے روبرو الزامات کی تحقیق کے لیے اپنے آپ کو پیش کروں ۔ اگر مجھ پر شرعی الزام ثابت ہو تو سزا دی جائے یا توبہ قبول کی جائے ۔ اگر کوئی الزام ثابت نہ ہو تو بدگوئی اور اتہامات کا سلسلہ بند کر دیا جائے[۱]

اخوند صاحب نے جواب دیا کہ نہ مجھے کسی بدعقیدگی کا شبہہ ہے، نہ مجھے اتنا علم ہے کہ آپ سے بحث و مذاکرہ کروں، نہ بحث و مذاکرہ پسند ہے، نہ یہ زیبا ہے کہ میری مجلس میں آپ کے خلاف اعتراضات و الزامات معرض بحث میں آئیں۔ جو لوگ ایسی باتیں کہتے ہیں، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں[۲] ۔

فتنے کا آغاز سید عبدالجبار شاہ نے حکمرانیِ سوات کے زمانے میں اس واقعے کی پوری چھان بین کی تھی ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملا صاحب عرف حضرت جی کے خلاف فتنۂ مخالفت اٹھانے کا اصل ذمہ دار علاقہ نکپی خیل کے ایک گاؤں درد یال کا ایک معمر قاضی تھا، جس کی عمر ڈیڑھ سو سال کی ہو چکی تھی اور سید عبدالجبار شاہ نے خود پوری کیفیت اس کی زبان سے سنی ۔

---

[۱] "کتاب العبرۃ" مصنفہ سید عبدالجبار شاہ (قلمی نسخہ) ص ۴۲۳ ۔

[۲] " " " " ۔

قاضی مذکور نے بتایا کہ میں اخوند صاحب کا مرید تھا، لیکن سوات اور ستھانہ کے اکثر لوگ ملا صاحب کے ارادت مند تھے۔ یہ صورتِ حال مجھے بڑی ناخوش گوار معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ایک روز اخوند صاحب سے کہا کہ سوات، ستھانہ، ہشت نگر اور پشاور کے علماء کا استاد میں ہوں، جو آپ کا مرید ہو چکا۔ میرے لیے اپنے وطن میں کسی اور کی پیروی برداشت کرنا ممکن نہیں اور ایسی تدبیروں سے کام لے سکتا ہوں کہ ملا صاحب کوٹھا بدنام ہو جائیں۔ اخوند صاحب پہلے تو اس پر راضی نہ ہوئے۔ جب میں نے اصرار کیا اور انھیں بھی ایک طرح کا الٹی میٹم دے دیا تو مان گئے چنانچہ میں نے ملا صاحب کے خلاف "وہابیت" کا فتنہ اٹھایا۔ دو ہزار عالموں کو لے کر کوٹھا کا رخ کیا۔ عالموں کو باجا بام خیل میں بٹھا دیا جو کوٹھا سے قریب ہے۔ اپنے شاگردوں کا ایک وفد ملا صاحب کے پاس بھیج دیا۔ انھوں نے کچھ سوال کیے، جن کے جوابات کو بگاڑ کر میں نے علماء کے سامنے پیش کیا اور ملا صاحب کی وہابیت کا فتویٰ لے کر سب جگہ نقارہ بجوا دیا[1]۔

اس افترا کی اصل بنیاد یہ تھی کہ ملا صاحب سید احمد شہید کے مرید تھے۔ سید صاحب، شاہ اسمٰعیل اور ان کے رفیقوں کے خلاف "وہابیت" کا فتویٰ ہندوستان کے بعض علماء صادر کر چکے تھے۔

ملا صاحب پر یورش غالباً ۱۲۸۲ھ (۶۶-۱۸۶۵ء) کا واقعہ ہے کہ ملا صاحب معمول کے مطابق بونیر گئے ہوئے تھے۔ وہاں کے دولت زئیوں میں سے باری خیل فرقہ ان کا بہت معتقد تھا۔ اخوند صاحب کے ارادت مندوں نے اس وقت تک ملا صاحب کے خلاف "وہابیت" کی آگ اس شدت سے مشتعل کر دی تھی کہ سوات و بونیر کے لشکر جمع ہو کر ان کے اخراج کے لیے جا پہنچے۔ یہاں تک کہ ملا صاحب کے ساتھ باری خیل فرقے کو بھی جلا وطنی کی سزا دے دی گئی۔ ملا صاحب بونیر سے اٹھے اور چملہ سے گزرتے ہوئے موضع چرڑی چلے گئے جو امازئیوں کا مشہور مقام تھا۔ مخالف

---

[1] "کتاب العبرۃ" (قلمی نسخہ) صفحہ ۴۲۶-۴۲۸۔

لشکروں نے تعاقب کرتے ہوئے چروڑی کا محاصرہ کرلیا اور ملاؤں نے امازئیوں کے خلاف بھی "وہابیت" کی تہمت تراش کر جہاد کا فتویٰ دے دیا۔

اہلِ حق کی بے بسی اور عزیمت امازئی تعداد میں بہت کم تھے اور تنہا پورے بونیر و صوات کا مقابلہ نہ کرسکتے تھے، لیکن ان کی افغانی غیرت یہ ننگ بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہ تھی کہ اپنے معزز اور مقدس مہمان کو مخالفوں کے حوالے کردیں یا کسی دباؤ کے ماتحت اپنے گھروں سے نکال دیں۔ موزہ خاں رئیس چروڑی اور جبّار خاں نے خود ملا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر صاف صاف عرض کردیا کہ نہ مقابلے کی طاقت ہے، نہ کسی تدبیر سے آپ کو محفوظ طریقے پر باہر نکال سکتے ہیں۔ ملا صاحب نے فرمایا کہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاؤ۔ دیر تک دعا میں مشغول رہے۔ پھر فرمایا کہ اگر بارہ غیور افراد اخلاص سے جانی قربانی پر آمادہ ہوجائیں تو یہ مور و ملخ کا سا لشکر شکست کھا جائے گا۔ یہ سنتے ہی ساداتِ منگل تھانہ میں سے سیّد جبّار اور ان کے بھائی نے سب سے پہلے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کردیا۔ تھوڑی دیر میں نو مزید غیور افراد سامنے آگئے، لیکن بارہ کا عدد پورا نہ ہوا۔ یہ گیارہ جانباز باہر نکلے تو چار سو کے قریب امازئی جوان ان کے ساتھ ہوگئے۔ اس زور سے حملہ کیا کہ صوات و بونیر کا لشکر شکست کھا کر بھاگا۔ امازئیوں نے میلوں اس کا تعاقب کیا اور ملا صاحب بہ اطمینان چروڑی سے اٹھ کر کوٹھا پہنچ گئے[1]، جہاں بونیر و صوات کا لشکر نہ پہنچ سکتا تھا اس لیے کہ کوٹھا انگریزی علاقے میں تھا۔

مجاہدین کے خلاف اقدام جب سیّد صاحب سے انتساب کی بنا پر ملا صاحب کے خلاف "وہابیت" کا الزام لگ چکا تھا تو مجاہدین اس سے کیوں کر محفوظ رہ سکتے تھے، درآں حالیکہ وہ براہِ راست سیّد صاحب کی جماعت سمجھے جاتے تھے اور ان کی دینی تحریک کی تاسیس ہی سیّد صاحب نے فرمائی تھی؟ چنانچہ چروڑی کے محاصرے سے پہلے یا اس کے بعد مجاہدین کو بھی نکال دینے کا فیصلہ کرلیا گیا اور بہت بڑا لشکر ان کے خلاف حرکت میں آیا۔ بتایا جاچکا ہے کہ

[1] "کتاب العبرت" ص ۲۵۔

وہ گلو نو بوڑی (علاقہ چغرزئی) میں رہتے تھے۔ اس گاؤں سے تھوڑی دُور باہر ایک گلی یا تنگنا سے دو پہاڑوں کے درمیان تھی جس سے گزر کر گلو نو بوڑی جاتے تھے۔ اس کا نام گلی بدہال تھا۔ امیرالمجاہدین مولانا عبداللہ کو مخالفانہ اقدام کا علم ہوا تو انھوں نے ایک جمعدار کو پچاس مجاہدین کے ساتھ گلی بدہال میں بٹھا دیا، اس لیے کہ حملہ آوروں کی آمد کا وہی راستہ تھا۔ ان مجاہدین نے حفاظتی مورچے قائم کر لیے۔ مخالفین گلی کے قریب پہنچے تو جمعدار نے انھیں روکا۔ مخالفین نے تلواریں نکال لیں۔ یہ دیکھتے ہی مجاہدین نے قرابینوں سے گرابیں ماریں اور کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ تمام مجاہدین گلی ہی میں شہید ہو گئے، لیکن مخالفین کو اتنا نقصان پہنچ چکا تھا کہ انھیں قدم آگے بڑھانے کی ہمت نہ پڑی[1]۔

سیّد عبدالجبّار شاہ کا بیان سیّد عبدالجبّار شاہ ستھانوی کتاب العبرت میں اس خوفناک جنگ کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں، سرحدی علما نے جب دیکھا کہ چند کالے کالے دُبلے پتلے ہندوستانی راستہ روکے بیٹھے ہیں تو ایک دم ان کی غیرت جوش میں آگئی:

> عوام کو حکم دے دیا کہ "اللہ اکبر" کہہ کر ان بے دینوں کو مارو۔ یہ تم کو مجاہدین کے گھر لوٹنے سے روک رہے ہیں، حالانکہ وہ (مجاہدین) کیمیاگر ہیں۔ ان کے گھر سونے چاندی سے بھرے پڑے ہیں۔ بس پھر کیا تھا ایک دم صواتی اور ان کے طرف دار بونیری ہمارے مجاہدوں پر ٹوٹ پڑے وہ سچے مومن تھے سب قرابین کے ہتھیار سے مسلح تھے۔ جمعدار نے حکم دیا اور مجاہدین پینترے بدل بدل کر اور قرابین میں چالیس پچاس گولیاں ڈال کر لشکر کے ہجوم کو اڑانے لگے۔ پانچ چھ سو لشکری ڈھیر ہو گئے۔ ملکی لشکروں نے چاروں طرف سے ہجوم کر کے بھی مار کھائی پھر دور سے توڑے دار بندوقوں سے پچاس نفوس کو شہید کر کے راستہ آزاد کرا لیا۔ مگر پھر کون ان بہادروں کا سونا چاندی لوٹنے جاتا۔ سب نے پوچھا کہ آگے ایسے جانباز کتنے ہیں؟ لوگوں نے کہا ہزار بارہ سو نفری ان کی ہے۔ بس یہ سنتے ہی سب واپس ہو گئے[2]۔

---

[1] "کتاب العبرت" ص ۴۲۶

[2] ایضاً

ذمہ داری کا مسئلہ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت جی صاحب یعنی ملّا صاحب کو بٹھا اور جماعت مجاہدین کے خلاف ہنگامہ بپا کرنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ سیّد عبدالجبار شاہ نے ذاتی تحقیقات کی بنا پر جو کچھ لکھا ہے، اس سے واضح ہے کہ اس فتنے کا اصل بانی قاضی درویال تھا۔ اسی نے حضرت اخوند صاحب کے انکار کے باوجود مخالفت کی آگ سلگائی اور اسے ہوا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت اخوند صاحب قاضی کی باتوں سے متاثر نہ ہوتے تو یہ معاملہ نازک صورت اختیار نہ کرتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قاضی نے حضرت اخوند کے سامنے اس مسئلے کو زیادہ سے زیادہ بُری صورت میں پیش کر کے حسب منشا کارروائی کی گنجایش پیدا کر لی ہو، یعنی واقعی یقین دلایا ہو کہ ملّا صاحب اور مجاہدین کا عقیدہ خلاف شریعت ہے۔ ہندوستان میں بیسیوں علما نیک نیتی سے یہی سمجھتے رہے۔ البتہ ظاہر ہے کہ ان کی رائے غلط تھی اور اس سے جو نتیجے نکلے وہ حد درجہ الم خیز اور غم انگیز تھے۔

ضروری تصریحات یہاں یہ حقیقت بھی واضح کر دینی چاہیے کہ گلی بدہال اور گلونو بوڑی بہت قریب ہیں۔ ان کے نزدیک ہی ٹبارا ہے۔ اس وجہ سے بعض اوقات گلونو بوڑی کی اقامت کو ٹبارا کی اقامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے جب مولانا رحمت اللہ مرحوم امیر المجاہدین سے پرانے واقعات کے متعلق بات چیت کی تھی تو وہ گلونو بوڑی کے قیام کو ٹبارا ہی کا قیام قرار دیتے تھے۔ میرے استفسار پر انھوں نے گلونو بوڑی، بدہال اور ٹبارا کی جغرافیائی حیثیت واضح فرمائی۔ گلی بدہال کی لڑائی کو پالنگ کی لڑائی بھی کہا جاتا ہے، اس لیے کہ پالنگ بھی یہاں سے بالکل قریب ہے۔ امیر رحمت اللہ نے فرمایا: مخالفین کا لشکر اتنا زیادہ تھا کہ ڈگر سے میدانِ جنگ تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ بایں ہمہ جماعتِ مجاہدین میں سے پچاس جانبازوں نے اس ٹڈی دل پر ایسی ہیبت طاری کر دی کہ پھر اسے آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ ہُوا۔

مجاہدین کا نقلِ مکان اس واقعے کے بعد مجاہدین نے گلونو بوڑی کی سکونت ترک کر دی اور وہ پلوسی چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ ملکا میں ان کی مدت قیام سات سال بنتی ہے (۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۴ء)۔ ایک

روایت کے مطابق تین سال انھوں نے گلونو بوڑی میں گزارے۔ (۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۶ء) سید عبدالجبار شاہ فرماتے ہیں :

وہ لوگ گلونو بوڑی سے بونیر والوں کے حملے کے بعد نکل کر علاقہ چغرزئی میں بہ مقام ڈَبَّ سر چلے گئے۔ وہاں سے بھی کسی حادثہ ناموافقت کی وجہ سے حسن زئی قبیلے میں آ گئے اور لمبا عرصہ یہاں ان کا قیام قلعہ پلوسی میں ۱۸۸۰ء تک رہا[1] ۔

ڈَبَّ سر کابل گرام کے پاس ہے۔ امیر رحمت اللہ فرماتے تھے کہ یہاں مجاہدین نے جو قلعہ بنایا تھا اس کے کونوں پہ برج تھے ۔

---

[1] کتاب العبرۃ قلمی نسخہ ص ۴۲۹ ۔

ضمیمہ

اس سلسلے میں ایک چیز باقی رہ گئی یعنی مولانا غلام رسول مرحوم عرف مولانا عبداللہ (قلعہ میہاں سنگھ والے) نے حضرت اخوند صاحب صوات اور حضرت ملا سید امیر صاحب کوٹھا دونوں کو دیکھا تھا اور دونوں کی صحبت میں وقت گزارا تھا۔ دونوں بزرگوں کے متعلق ان کے بیانات ذیل میں درج ہیں۔
واضح ہے مولانا غلام رسول مرحوم خود وقت کے بہت بڑے عالم، مصلح اور ولی اللہ تھے اور ان کے بیانات خاص توجہ کے مستحق ہیں:

ا۔ حضرت اخوند صاحب صوات:

۱۔ مولانائے محترم جس زمانے میں کسب فیض کے لیے اہل اللہ کے جویاں تھے، اس زمانے میں کسی سے حضرت اخوند صاحب کی تعریف سنی، فوراً صوات روانہ ہو گئے:

اخوند صاحب سے ملاقی ہوئے، آپ فرماتے کہ اخوند صاحب بڑے زاہد، عابد، متقی ہیں، لیکن سنت سے ناواقف[1]۔

۲۔ مولانا سید عبداللہ غزنوی مرحوم کو کتاب وسنت کی پیروی کی بناء پر افغانستان کے حق ناشناس ملاؤں کے شور وشغب کے باعث وطن سے نکلنا پڑا تو صوات میں آ گئے تھے۔ مولانا غلام رسول لکھتے ہیں:

آپ شہر سے نکال دیے گئے۔ بلوائے عام آپ کے سر پر ہو گیا اور ملک سوات (صوات) میں آ کر اقامت اختیار کی۔ اخوند عبدالغفور صاحب جو زہد وریاضت میں ممتاز تھے اور مجددیہ قادریہ کے طریق اور صوم الدہر کے ساتھ دم بھرنے والے، پہلے تو نہایت عمدہ مروت کے ساتھ پیش آئے اور دل دہی ودلداری کی۔ آخر الامر جب آپ نے مولانا عبداللہ غزنوی کے

---

[1] "سوانح حیات" (سوانح مولانا غلام رسول) ص ۳۸۔

حاسدوں کا نوشتہ آپ کے پاس پہنچا تو بلا تحقیق مروّت کا دامن کھینچ لیا۔ کچھ مدت وہاں رہ کر حضرت سیّد میر صاحب کوٹھا والوں کے پاس تشریف لائے۔[1]

ب۔ حضرت ملّا صاحب کوٹھا:

مولانا غلام رسول حضرت ملا صاحب کی خدمت میں پہنچے تو فرماتے ہیں کہ انھیں دیکھتے ہی قدرے تسکین ہوگئی۔ سلسلہ بعیت دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا: میں بعیت شدہ سیّد احمد صاحب بریلوی، مرشدِ مولوی اسماعیل صاحب شہید کا ہوں۔ مجھ کو انھیں سے فیض حاصل ہے:

مجھے دوبارہ زندگی حاصل ہوگئی۔ پژمردگی جاتی رہی۔ اتنا سرور ہوا کہ دنیا و ما فیہا بھول گیا . . . حضرت صاحب میری طرف دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے کہ یہ عجیب استعداد کا آدمی ہے۔ میرے چراغ میں رمق باقی تھی۔ روغن ڈالا گیا، جو مراد تھی وہ بر آئی . . . . حضرت کا فیض مثل موج دریا تھا، کوئی بھی خالی نہیں جاتا تھا۔ جو حلقے میں بیٹھ جاتا، یک بارگی اس کے تمام لطائف جاری ہو جاتے۔ متبعِ سیّد الانام بن جاتا . . . جو شخص بعیت کے لیے جاتا اوّل اس کے عیوب سے اس کو مطلع کر کے پھر بعیت کرتے۔ آپ کے وظائف مطابق سنت تھے۔[2]

---

[1] سوانح عمری مولوی عبید اللہ الغزنوی ص ۲۸ .

[2] " سوانح حیات" ص ۳۹-۴۰ .

دوسرا باب

کوہ سیاہ کی مہمیں

اگرور میں فوجی چوکی آزاد قبائل اطمینان سے بیٹھے تھے، لیکن حکومت انگلشیہ اپنے اثر و اقتدار کا دائرہ بڑھانے کے لیے کوئی نہ کوئی فتنہ اٹھاتی رہتی تھی۔ چنانچہ نومبر ۱۸۶۷ء میں اگرور کے مشہور مقام اوگی میں ایک فوجی چوکی قائم کر دی گئی، حالانکہ اس کی کوئی ضرورت ۱۸۵۳ء کے بعد پیش نہ آئی تھی۔ آزاد قبائل اس چوکی کا مطلب یہی سمجھ سکتے تھے کہ حکومت آہستہ آہستہ انھیں زیر اثر لانے کے لیے تدبیروں کا جال پھیلا رہی ہے۔ چنانچہ ان میں بے چینی پیدا ہوئی۔ واٹلی کا بیان ہے کہ ۳۰۔ جولائی ۱۸۶۸ء کو پانسو کے ایک لشکر نے اس چوکی پر ہلّا بول دیا۔ اس لشکر میں آس پاس کے تمام قبیلوں کے آدمی موجود تھے، حتیٰ کہ پریاری کے سیدوں نے بھی اس میں بہ قدر مناسب حصہ لیا[1]۔ "ہزارہ گزیٹیر" کے بیان کے مطابق یہ لشکر حسن زئیوں، اکازئیوں، چغرزئیوں اور پریاری سیدوں پر مشتمل تھا۔ چوکی کے بائیس جوانوں نے جم کر مقابلہ کیا اور حملہ آوروں کے چھ آدمی قتل کر دیے، لیکن انھوں نے چوکی کے چار جوانوں کو بھی گرفتار کر لیا اور بہت سا سامان بھی اٹھا کر لے گئے[2]۔

حکومت کو شبہہ ہوا کہ یہ حملہ عطا محمد خاں رئیس اگرور کی انگیخت پر کیا گیا ہے۔ چنانچہ لفٹنٹ کرنل روتنی[3] فوج لے کر ۳۱۔ جولائی کو آدھی رات کے وقت ایبٹ آباد سے اوگی وارد ہوا۔ گویا اس نے بیالیس میل کا فیصلہ پچیس گھنٹوں میں طے کر لیا۔ ۲۔ اگست کو والیِ امب کی فوج موقع پر پہنچ گئی۔ رئیسِ اگرور کو گرفتار کر کے ایبٹ آباد بھیج دیا گیا اور خود کرنل راوتی وہاں بیٹھا رہا، اس لیے کہ وادیِ اگرور

---

[1] واٹلی کی کتاب، ص ۳۶ [2] "ہزارہ گزیٹیر" ص ۱۶۹ [3] ROTHNY

میں شدید بے چینی کے آثار نمایاں تھے۔ اس اثنا میں زبردست اقدامات کا فیصلہ کر لیا گیا۔ مختلف چھاؤنیوں سے فوجیں طلب کر لی گئیں۔ بریگیڈیئر جنرل وائلڈ کو اس مہم کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ مہم کے آغاز تک قبائلی لشکر برطانوی علاقے کے بائیس گاؤں جلا چکے تھے اور ان کی یورشوں میں چونسٹھ آدمی مقتول و مجروح ہو چکے تھے۔

کوہ سیاہ کی دوسری مہم اس مہم کے لیے جو فوج جمع کی گئی، وہ ساڑھے نو ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ مہاراجہ کشمیر نے بھی بارہ سو آدمی انگریزی فوج کی اعانت کے لیے سرحد پر بھیج دیے تھے۔ اگرچہ ان سے کوئی کام نہ لیا گیا۔

اتنی بڑی فوج کے اجتماع کا اثر یہی ہو سکتا تھا کہ مختلف طبقات پر ہیبت طاری ہو جاتی چنانچہ ٹیکری اور نندھیاڑ کے بعض حسن زئیوں اور صداتیوں نے مصالحت پر آمادگی کا یقین دلا دیا۔ البتہ چغرزئیوں، اکازئیوں، دیشی اور تاکوٹ کے سواتیوں اور پریاری سیدوں سے مقابلہ در پیش رہا۔ مستند اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی مجاہدین اس مہم میں قبائلی لشکروں کے معاون بنے رہے بلکہ دوران کشمکش میں وہی تھے جنھوں نے ہر مقام پر جانبازانہ مقابلہ کیا۔

انگریزی فوج دو حصوں میں منقسم تھی، ایک حصے کا سالار کرنل برائٹ[1] اور دوسرے کا واگھن[2] تھا۔ ۳۔ اکتوبر کو دونوں جیش مختلف سمتوں سے بڑھے اور تین روز میں ان تمام مقامات پر قابض ہو گئے، جہاں سے کوہ سیاہ اور اس کے نواحی علاقے میں ہر سمت کامیاب اقدامات کیے جا سکتے تھے۔ چند روز میں باقی قبیلوں نے بھی صلح کر لی۔ پھر انگریزی فوج پریاری، ٹیکری اور نندھیاڑ میں سے گزرتی ہوئی واپس آ گئی۔ اس پوری مہم میں صرف ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آیا، یعنی پریاری سیدوں نے انگریزی فوج کی ایک عقبی ٹکڑی پر حملہ کیا، جس کی سزا میں اُن کا ایک گاؤں جلا دیا گیا۔ ۲۰۔ اکتوبر کو فوج انگریزی علاقے میں واپس آ گئی۔ اس مہم میں انگریزوں کے مقتولین و مجروحین کی کُل تعداد صرف چونتیس تھی[3]۔

---

[1] BRIGHT [2] VAUGHAN

[3] "ہزارہ گزٹیئر" صفحہ ۱۷۱ و ۱۷۲، نیز وائلی اور نیویل کی کتابیں۔

کشمکش کا امتداد انگریزی فوج کشی اگرچہ بظاہر کامیاب رہی تھی تاہم اس سے عام حالات میں کوئی خوش آیند تغیّر پیدا نہ ہوا اور کشمکش کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ مثلاً:

۱ ۔ جولائی ۱۸۶۹ء میں اگرور کے دو گاؤں، برجار اور گل ڈھیری جلائے گئے۔

۲ ۔ اگست ۱۸۶۹ء میں جسکوٹ پر حملہ ہوا۔

۳ ۔ ۷۔ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو ایک انگریزی جیش نے اکازئیوں کا ایک گاؤں شہتوت تباہ کر ڈالا اور اعلان کرا دیا کہ حکومت کی اجازت کے بغیر اس گاؤں کو آباد نہ کیا جائے۔

۴ ۔ ۹۔ اپریل ۱۸۷۰ء کو اکازئیوں نے برجار پر حملہ کیا۔

۵ ۔ ۱۵۔ اپریل کو اکازئیوں اور خان خیل حسن زئیوں نے سنجل بٹ جلا دیا۔

غرض دونوں جانب سے مخالفانہ سرگرمیاں جاری تھیں۔ قبائلیوں کو موقع ملتا تو وہ انگریزی علاقے پر چھاپے مارتے۔ انگریزی فوج اٹھتی تو قبائلیوں کی فصلوں اور آبادیوں کو تباہ کرتی۔ ۱۸۷۰ء میں حکومت کو احساس ہوا کہ خانِ اگرور کو بے وجہ معزول کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کی ریاست بحال کر دی گئی۔ اکازئیوں کو چونکہ شہتوت گاؤں آباد کرنے کی ممانعت تھی، اس لیے وہ وقتاً فوقتاً انگریزی علاقے میں انتقامی اقدامات کرتے رہتے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں ان سے آخری تصفیہ ہو گیا۔

فساد در فساد ۱۸۷۵ء میں عطا محمد خاں رئیس اگرور نے وفات پائی اور اس کا بیٹا گوہر خاں جانشین ہوا۔ کچھ دیر بعد حسن زئیوں اور اگرور یوں کے درمیان فسادات شروع ہو گئے، جن کا اثر انگریزی علاقے پر بھی پڑا۔ حسن زئیوں کے ایک خان احمد علی خاں کو اس کے دشمن فیروز خاں نے فروری ۱۸۸۰ء میں قتل کر دیا۔ احمد علی خاں کے بھائی ہاشم علی خاں کو مداخیلوں سے امداد مل گئی۔ فیروز خاں بھاگ کر علاقہ امب میں پناہ گزیں ہوا۔ ہاشم علی خاں، فیروز خاں تک نہ پہنچ سکا تو اس کے ماموؤں مظفر خاں اور سمندر خاں کو اس بنا پر قتل کرا دیا کہ وہ بھی احمد علی خاں کے قتل میں شریک تھے۔

عطا محمد خاں مرحوم رئیس اگرور کے تعلقات اپنے چچیرے بھائی اللہ داد خاں سے نہایت ناخوش گوار تھے۔ یہ عداوت ان کی اولاد کو بھی میراث میں ملی۔ اللہ داد خاں کے بیٹے عبداللہ خاں کو اگرور کے چھ گاؤں

پٹے پر ملے ہوئے تھے۔ علی گوہر خاں نے وہ پٹا منسوخ کرانا چاہا۔ عبداللہ خاں اپنے مرکز دل بوڑی سے نکلا اور آزاد قبائلیوں کی امداد لے کر اُس نے اگرور کے دیہات پر متعدد چھاپے مارے۔ حکومت نے اس کا مشاہرہ ضبط کرنے کے علاوہ اسے مدد دینے والے قبائل کی ناکا بندی کر لی۔ اس طرح تادیبی اور انتقامی کارروائیوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔

عجیب امر یہ ہے کہ ہاشم علی خاں کے ایک چھاپے کے سلسلے میں چھان بین کرتے ہوئے کارکنانِ حکومت کو محسوس ہوا کہ یہ چھاپا خانِ اگرور کے ایما سے مارا گیا ہے۔ چنانچہ خان کو معزول کر کے لاہور میں نظر بند کر دیا گیا۔ حسن زئیوں اور پریاریوں کے خلاف زیادہ شدید اقدامات کی تجویزیں زیرِ غور آ گئیں۔

دو انگریز افسروں کا قتل

۱۸- جون ۱۸۸۸ء کو ایک نیا حادثہ پیش آیا، جو حکومت کے لیے زبردست فوجی اقدامات کا بہانہ بن گیا۔ اس کی کیفیت یہ ہے:

میجر بیٹی[1] اور کپتان ارمسٹن[2] ساٹھ فوجیوں اور انیس جوانانِ پولیس کے ہمراہ اوگی سے روانہ ہو کر برچار کے ٹیلے پر چڑھے۔ سرکاری بیانات میں بتایا گیا ہے کہ وہ گرد و نواح کے علاقے کا اندازہ کرنا چاہتے تھے۔ مقامی روایت یہ ہے کہ وہ شکار کھیلنے کے لیے نکلے تھے۔ بہر حال مقصد خواہ کچھ ہو، ریوڑ چرانے والے گوجروں نے ان پر گولیاں چلائیں۔ سرکاری بیانات میں بتایا گیا ہے کہ ان پر حملہ انگریزی علاقے میں ہوا، لیکن ان پہاڑوں پر کوئی ایسی واضح حد بندی موجود نہ تھی، جس سے سمجھا جا سکتا کہ انگریزی علاقہ ختم ہو کر قبائلی علاقہ شروع ہو گیا ہے۔ بندوقوں کی آواز سن کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ اس پر میجر بیٹی نے اپنے ساتھیوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔ ایک حوالدار زخمی ہو گیا، جو انگریزی جمعیت کے عقبی حصے میں تھا۔ میجر بیٹی اور کپتان ارمسٹن اسے بچا کر ساتھ لانے کے لیے لوٹے اور دست بدست لڑائی میں دونوں مارے گئے۔ مشہور کر دیا گیا کہ پریاری سید اور خان خیل حسن زئی (بہ قیادت ہاشم علی خاں) بھی بندوقوں کی آواز سن کر مخالفانہ حملے میں شریک ہو گئے تھے۔

---

[1] BATTYE

[2] URMSTON

بہرحال چند روز بعد حسن زئی، اکازئی اور پریاری سیّد خاصی بڑی تعداد میں کوہ سیاہ کے ٹیلوں پر جمع ہو گئے۔ ۲۷ - جون ۱۸۸۸ء کو عبداللہ خاں (بن اللہ داد خاں) بھی میدان (زندیلوسی) سے ایک سو بیس ہندوستانی مجاہدوں کو لے کر آ گیا[۱]۔

کوہ سیاہ کی تیسری مہم

اس طرح کوہ سیاہ کی تیسری مہم کا آغاز ہوا۔ انگریزوں نے اس کے لیے بھاری فوج جمع کی جس کی تعداد سرسری اندازے کے مطابق بارہ ہزار سے کم نہ ہو گی۔ اس کے ساتھ چوبیس توپیں تھیں۔ میجر جنرل میکوئین[۲] کو اس کا سپہ سالار بنایا گیا۔ پوری فوج کے دو برگیڈ تھے ایک کا سالار برگیڈیر جنرل گیلبرتھ[۳] تھا، دوسرے کا برگیڈیر جنرل چینر[۴]۔ ہر برگیڈ کے دو کالم بنا دیے گئے تھے۔ جنرل میکوئین نے تین کالموں کا مرکز اجتماع اوگی قرار دیا اور چوتھے کا دربند۔ اوگی کے تین کالموں کو حکم دے دیا گیا کہ وہ کوہ سیاہ کے شمالی و مشرقی حصّے سے پیش قدمی کرتے ہوئے اس کی چوٹی پر پہنچیں۔ اس طرح ان قبائل کے سر پر پہنچ جائیں جو کوہ سیاہ کی مغربی ڈھلانوں یا اس پہاڑ اور دریائے سندھ کے مابین آباد تھے۔ دربند والے کالم کو دریا کے کنارے کنارے یا اس سے قریب شمال کی طرف بڑھنا تھا۔ پہلے تین کالموں نے اکتوبر کی چوتھی اور پانچویں تاریخ کو مقررہ کام پورا کر لیا۔ ان میں سے صرف پہلے کالم کو تھوڑی سی مزاحمت سے سابقہ پڑا، لیکن چوتھے کالم کو کئی خونریز لڑائیاں پیش آئیں۔ یہ کالم دربند سے بلیہ پہنچا اور وہاں سے شنگری پر بڑھا تو مقابلہ ہوا۔ شنگری پر قبضہ جما لینے کے بعد پھر اس نے پیش قدمی شروع کی تو تورو اور کوٹ کئی کے درمیان سخت لڑائی ہوئی ؛

تورو اور کوٹ کئی کی لڑائی

اس لڑائی کے متعلق نیویل اور وائلی نے جو حالات بیان کیے ہیں، وہ اتنے مختصر ہیں کہ ان سے اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا[۵]۔ "ہزارہ گزٹیئر" کا بیان ہے کہ قبائلی لشکر تورو کے شمال مشرق میں کوئی آٹھ سو گز کے فاصلے پر ایک نالے کے کنارے قدم جمائے کھڑا تھا۔

---

[۱] "ہزارہ گزٹیئر" صفحہ ۱۷۷-۱۷۸ ؛ [۲] MCQUEEN [۳] GALBRAITH

[۴] CHANNER [۵] نیویل کی کتاب صفحہ ۹۴-۹۸ اور وائلی کی کتاب صفحہ ۴۰-۴۵ ؛

اس کی دائیں جانب دریا تھا اور بائیں جانب پہاڑ جس کی ڈھلانوں میں انھوں نے مورچے قائم کر لیے تھے۔ گویا غنیم ان کے خلاف پیش قدمی کرتا تو اس پر تین طرف سے ہلاکت یا آگ برسنے لگتی۔ مجاہدین بھی اس قبائلی لشکر میں شامل تھے لیکن ان کی صحیح اور معیّن تعداد کا علم نہ ہو سکا۔ یہ لڑائی ایک ندی کے کنارے ہوئی تھی۔ ایک روایت کے مطابق ندی اور آس پاس کے جنگل میں کچھ آدمی چھپے ہوئے تھے۔ ایک ناظر کا چشمدید بیان ہے کہ ڈیڑھ سو آدمیوں نے ندی اور درختوں سے نکل کر انگریزی فوج پر یورش کی:

"رائل آئرش رجمنٹ نے بڑے استقلال کے ساتھ نہایت چالاکی اور جلدی سے دشمن پر گولیوں کی بارش شروع کی، جس سے غنیم کا رُخ پلٹ گیا اور اکثروں نے اپنے آپ کو ندی میں گرا دیا۔ چونکہ پانی عمیق تھا بہت سے افغان غرق ہو گئے۔ بعض . . . مارے گئے"[1]

"ہزارہ گزٹیئر" سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی فوج نے بڑی توپوں اور کلدار توپوں کی آتش باری کے بعد غنیم پر حملہ کیا۔ دوسرے لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے لیکن مجاہدین مقابلے پر قائم رہے۔ وہ تلواریں لے کر نکلے اور بجلی کی تیزی سے انگریزی فوج کی طرف بڑھے، لیکن ایک ایک کر کے گولیوں سے شہید ہوتے رہے۔ صرف تیرہ بچے جو دریا کے قریب ایک جنگل میں کچھ دیر بعد موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

غالباً یہی موقع ہے، جب انگریزوں نے "گٹیلنگ گن" استعمال کی۔ اسے کلدار توپ سمجھنا چاہیے جو گٹیلنگ نام ایک موجد نے بنائی تھی۔ اس کے خزانے میں بیک وقت ڈیڑھ سو کارتوس بھر دیتے تھے پھر اس کا منہ غنیم کی طرف کر کے ایک چرخ زور سے پھرا دیتے تھے اور اس سے علی الاتصال گولیاں نکلتی رہتی تھیں۔ غنیم کے حملے کو روکنے کے لیے یہ توپ بہت کارآمد تھی۔[2]

---

[1] جنگ کوہ سیاہ صفحہ ۳۳۔ یہ کتاب میجر نواب افسر جنگ نے مرتب کی تھی جو بعد میں سر افسر الملک بنے اور دولت آصفیہ میں سپہ سالار کے عہدے پر مامور ہوئے۔ افسر جنگ کو ایک مشن میں شامل ہونے کے لیے بھیجا گیا تھا جو کابل جا رہا تھا۔ مشن رُک گیا اور افسر جنگ کوہ سیاہ کی تیسری مہم میں شریک ہو گئے جو ان دنوں چھڑ گئی تھی۔ جنگ کے بعد حیدرآباد پہنچ کر انھوں نے یہ کتاب مرتب کر دی جو دار الطبع سرکار عالی میں چھپی۔ [2] ایضاً صفحہ ۳۴-۳۵۔

جانی نقصان نیویل رقمطراز ہے کہ

اس میدان میں بعدازاں اٹھاسی نعشیں گنی گئیں، جن میں سے اڑتالیس نعشیں ہندوستانی مجاہدین کی تھیں[1]۔

میجر افسر جنگ کا بیان ہے:

دوسرے روز جھاڑیوں میں انچاس نعشیں اور ندی کے کنارے چھبیس اور انتالیس پتھروں میں اور چھ ایک پہاڑ پر دکھائی دیں۔ ندی میں کس قدر ڈوبے، ان کا شمار معلوم نہیں ہوا[2]۔

گویا جو نعشیں انگریزوں کو مل سکیں، وہ ایک سو بیس تھیں۔

تاہم اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس موقعے پر انگریزوں کا کچھ نقصان نہ ہوا۔ ان کے بڑے افسروں میں سے صوبیدار میجر جیتر سنگھ اور کپتان بیلی مارے گئے۔ متعدد افسر زخمی ہوئے، مثلاً لفٹنٹ کلیو کی گردن میں گولی لگی اور مونڈھے میں رہ گئی۔ کپتان راڈ فرڈ کی چھاتی میں بائیں طرف گولی کا زخم تھا۔ کرنیل کروک شینک بھی زخمی ہوا، جو درہ بند والے کالم کا سالار تھا[3]۔ سپاہی بھی خاصی تعداد میں مارے گئے اگرچہ ان کی پوری کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔

غرض اس لڑائی میں انگریزوں کی کامیابی صرف اعلیٰ آتش بار اسلحہ کی فراوانی پر موقوف تھی۔ امیر رحمت اللہ مرحوم اس لڑائی کو تورہ وکنڈوہ کی جنگ قرار دیتے تھے۔ ان کا بیان تھا کہ کم و بیش پانسو مجاہدین شہید ہوئے۔ یہ تعداد اس بنا پر قرین صحت مانی جا سکتی ہے کہ پوری ہم کے قبائلیوں اور مجاہدین کے شہدا پر مشتمل ہو گی۔

بعد کے حالات کوٹکئی پر قبضے کے بعد انگریز آگے بڑھے اور انھوں نے دریا کے مشرقی کنارے نیز دریا اور کوہ سیاہ کے درمیانی علاقے میں متعدد مقامات جلائے۔ مثلاً کنٹر، کناری، ٹلی، سیری اور کن

---

[1] نیویل کی کتاب صفحہ ۹۸۔ [2] جنگ کوہ سیاہ صفحہ ۳۴۔ [3] ملاحظہ ہو جنگ کوہ سیاہ صفحات ۳۰-۳۵-۳۶-۳۷-۴۷-۴۹۔

دریا کو عبور کر کے مغربی کنارے پر پلوسی اور میدان میں مجاہدین کے قلعے اور آبادیاں جلائیں۔ ہزارہ گزیٹیر میں بتایا گیا ہے کہ مجاہدین نے غلّے اور گھاس کے جو عظیم الشان ذخیرے فراہم کر رکھے تھے، وہ بھی برباد کر دیے گئے۔ امیر رحمت اللہ فرماتے تھے کہ ہم نے اہل و عیال کو پلوسی سے نکال کر بانگیڑہ بھیج دیا تھا اور خود کابل گرام چلے گئے تھے۔ نیویل رقمطراز ہے:

۱۳۔ اکتوبر کو دریائے سندھ کے دائیں کنارے میدان میں ہندوستانی جنونیوں کا مرکز تباہ کر دیا گیا۔ گزشتہ چالیس سال میں انگریزی فوجوں سے اس بدنام گروہ کے تصادم کا یہ پانچواں موقع تھا اور پہلے کی طرح انھیں مجبور کیا گیا کہ اپنا مرکز کسی اور جگہ بنائیں[1]۔

قبائلیوں کا عام شیوہ تھا کہ وہ ابتدا میں بہت جوش و خروش دکھاتے تھے، لیکن جم کر مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ ۱۳۔ اکتوبر کو اکازئی اور ۱۶۔ کو حسن زئی انگریزوں کی پیش کردہ شرائط صلح ماننے کے لیے تیار ہو گئے اور مجاہدین مقابلے پر تنہا رہ گئے۔ پھر پریاری سیدوں اور ٹیکری والوں نے بھی انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی۔

افسر جنگ نے ایک عجیب قصّہ لکھا ہے یعنی یہ کہ مجاہدین اور دوسرے قبیلوں کا ایک وفد حضرت اخوند صاحب سوات کے صاحبزادے کے پاس بھی گیا کہ انگریزوں کی فوج ہمارے ملک کی طرف آرہی ہے اور مسلمانوں کو لازم ہے کہ جہاد کے لیے تیار ہو جائیں۔ صاحبزادے نے باتفاق علماء جواب دیا کہ انگریز تمھارے مذہبی معاملات میں دخل نہیں دیتے، مسجدیں مسمار نہیں کرتے، بزرگوں کے آثار کو نہیں چھیڑتے۔ پھر ان کے خلاف جہاد کیوں کر جائز ہو سکتا ہے؟ ان کی فوج کشی کا سبب یہ ہے کہ تم لوگ ان کے علاقوں میں چوریاں کرتے ہو۔ پچھلے دنوں بے وجہ ان کے دو سرداروں اور پچاس آدمیوں کو مار ڈالا[2]۔

---

[1] نیویل کی کتاب صفحہ ۹۹۔ نیویل نے پہلے چار موقعے یہ بتائے ہیں: ۱۸۵۲ء میں ستھانہ اور کوٹلی، ۱۸۵۷ء میں نارنجی، ۱۸۵۸ء میں ستھانہ اور منڈی، ۱۸۶۳ء میں امبیلہ۔ [2] جنگ کوہ سیاہ صفحہ ۸۶ - ۹۰۔

اغلب ہے افسر جنگ نے یہ سب باتیں ذمہ دار انگریز افسروں سے سُنی ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ صاحبزادے اور علماء کا جواب سراسر غلط اور نادرست تھا۔

چوتھی مہم ۱۸۸۸ء کی جنگ کے بعد صلح کی ایک شرط یہ طے ہوئی تھی کہ قبائلی لوگ ان انگریزی فوجوں یا افسروں کو کوئی آزار نہ پہنچائیں گے، جو انگریزی اور قبائلی علاقے کے درمیان بڑے پہاڑ پر جائیں آئیں گے۔ اس میں سڑکیں بنانے کی کوئی توضیح نہ تھی۔ حکومت انگلشیہ نے مارچ ۱۸۹۰ء میں اگرور سے کوہ سیاہ کے ٹیلوں تک کئی سڑکیں بنانے کا فیصلہ کر لیا اور اکتوبر میں ایک لشکر جنرل میکرین کی سالاری میں اوگی بھیج دیا۔ مدعا یہ تھا کہ لشکر کوہ سیاہ کی چوٹی تک جا کر انگریزی تسلّط کا عَلَم نصب کر دے۔ قبائلیوں کو انگریزوں کی بدعہدی بہت ناخوش گوار معلوم ہوئی۔ چنانچہ ہاشم علی خاں کے بھائی سکندر خاں نے کچھ خان خیل حسن زئی اور اکازئی جمع کیے اور بر جا پہنچ کر انگریزی کیمپ پر آتش باری کی۔ یہ کیفیت دیکھ کر حکومت نے پھر ایک مہم میجر جنرل ایلس[1] کی سرکردگی میں تیار کی۔ اس کے لیے بھی دربند اور اوگی میں فوجیں جمع کی گئیں، جن کی تعداد چھ ہزار تین سو تھیں، ان فوجوں کے ساتھ اٹھارہ توپیں تھیں۔ مارچ ۱۸۹۱ء میں اس مہم کا آغاز ہوا۔ اکازئیوں اور حسن زئیوں نے کوئی قابل ذکر مزاحمت نہ کی۔ انگریزی فوجوں نے ان کے علاقے پامال کر ڈالے۔ ہاشم علی خاں چغرزئیوں کے علاقے میں بھاگ گیا۔ "ہزارہ گزٹیئر" میں بتایا گیا ہے کہ صرف ایک جگہ شدید مزاحمت سے سابقہ پڑا، جہاں اہلِ بونیر، جدون، ہندوستانی مجاہدین اور بعض دوسرے قبیلے چغرزئی کے علاقے میں اور اس پہاڑ پر جمع تھے، جو علاقہ حسن زئی اور بونیر کے درمیان واقع ہے۔ صورتِ حال میں سخت الجھاؤ پیدا ہونے کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس اجتماع کے بعض حصّے متعدد مقامات پر انگریزی فوجوں سے متصادم ہوئے۔ اس سلسلے میں غازی کوٹ کی لڑائی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جہاں ہندوستانی مجاہدین کے ایک جیش نے ۱۸۔مارچ کی شب کو ڈوگروں کی چوکی پر بہادرانہ حملہ کیا۔ لیکن وہ شدید نقصان اٹھا کر پسپا ہو گئے[2]۔

---

[1] ELLES [2] ہزارہ گزٹیئر صا ۱۸۱۔

وائلی رقم طراز ہے کہ غازی کوٹ دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جہاں ۴ سکھ رجمنٹ کی ایک چھوٹی سی کمپنی موجود تھی:

۱۹- مارچ کو تین بجے صبح ... ہندوستانی مجاہدوں کی ایک بڑی جماعت اس پر حملہ آور ہوئی۔ ۴ سکھ رجمنٹ اور ۳۲ پاؤنیرز نے جلد کمک موقع پر پہنچادی اور دشمن سخت نقصان اٹھا کر پسپا ہو گیا[1]۔

"ہزارہ گزیٹیئر" کے مطابق غازی کوٹ کی لڑائی میں مجاہدین کا جانی نقصان پچاس سے کم نہ تھا وائلی ۲۳- مارچ کو ایک اور لڑائی کا ذکر کرتا ہے، جس میں جغرزئیوں اور ہندوستانی مجاہدین نے حصہ لیا۔ دست بدست جنگ ہوئی اور انھیں سخت نقصان پہنچا[2]۔

امیر رحمت اللہ مرحوم نے بالتصریح بتایا تھا کہ اس مہم میں مجاکوٹ (بیوں کا پہاڑ)، غازی کوٹ اور دیدل کمار چ پر سخت لڑائیاں ہوئیں، لیکن ان کی کوئی تفصیل اس مرحوم سے معلوم نہ ہو سکی۔

صلح جنگ امبیلہ کی طرح اس جنگ کے سلسلے میں بھی قبائل جا بجا جمع ہونے لگے تھے۔ انگریزی حکومت نے ایک طرف ان قبائل کو یقین دلایا کہ کسی کو نقصان پہنچانا منظور نہیں، دوسری طرف کمکی فوجیں طلب کر لیں۔ آخر قبائلیوں نے غیر مشروط اطاعت کا اقرار کر لیا۔ حسن زئیوں، اکازئیوں، مداخیلوں، پریاری سیدوں اور جغرزئیوں نے عہد نامہ لکھ کر دے دیا۔ جس کی دو شرطیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

۱- قبائل کبھی اس امر کے روادار نہ ہوں گے کہ ہاشم علی خاں ان کے درمیان آئے اور آباد ہو جائے۔

۲- معاہد قبائل میں سے کوئی بھی ہندوستانی مجاہدین کو اپنے ہاں مرکز بنانے کے لیے جگہ نہ دے گا۔

---

[1] وائلی کی کتاب صفحہ ۵۳۔ [2] ایضاً ایضاً۔

امیر رحمت اللہ کے بیان کے مطابق اوپر بتایا جا چکا ہے کہ مجاہدین نے اہل و عیال کو مرکز کی تباہی سے پیشتر ہی بانگیڑہ بھیج دیا تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ ہم لوگ پھر گلونہ بوڑی یا بٹارا میں کچھ مدت رہے۔ جب سواتیوں اور اہل بونیر سے پھر کشمکش کی صورت پیدا ہوئی تو دوسری جگہ منتقل ہونے کا انتظام کیا گیا، اس کی تفصیل آیندہ باب میں ملے گی۔

ساداتِ ستھانہ تمام بیان کی غرض سے اختصاراً یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ جنگ امبیلہ کے بعد ساداتِ ستھانہ پر کیا گزری۔ اس خاندان کے جوانوں میں سے دو ہستیاں حد درجہ ممتاز تھیں: ایک شہزادہ مبارک شاہ، دوم سید شاہ محمود بن سید عمر شاہ شہید۔ شہزادہ ملکاہی میں رہتا تھا۔ وہ شعبان ۱۲۸۹ھ (ستمبر ۱۸۷۲ء) میں اپنے بعض عزیزوں کی شادی میں شرکت کے لیے ناواگئی (وادی چمپلہ) گیا ہوا تھا۔ شمشیر ضرب پستول ہر وقت بھرا ہوا ہاتھ میں رکھتا تھا۔ ناواگئی ایک ملازم سے کہا کہ پستول خالی کر لاؤ۔ ملازم سے تمام گولیاں نہ نکل سکیں، اور اس نے پستول شہزادہ صاحب کو دے دیا جو ایک شخص سے باتوں میں مشغول تھے۔ انھوں نے پستول ران پر رکھ لیا اور باتوں میں منہمک رہے۔ عین اس اثنا میں پستول کو جھٹکا لگا اور وہ چل گیا۔ گولی شہزادہ کے زیر ناف لگی، تھوڑی دیر بعد اسی زخم سے وفات پائی۔ صرف چھتیس سینتیس سال کی عمر تھی۔

سید شاہ محمود پہلے اپنے اہل و عیال اور بھائیوں کے ساتھ گبائی میں رہتے تھے۔ پھر وہ درہ ستھانہ میں (ستھانہ سے چار میل) بہ مقام آل رہنے لگے اور بھائیوں کو اس مقام پر آباد کر دیا جہاں شہزادہ مبارک شاہ نے برج بنایا تھا یعنی سیری میں۔ ان کی کچھ جدی زمین بانگیڑہ میں تھی، جہاں سے فصلانہ لینے جاتے تھے۔ وہاں بعض لوگ اس وجہ سے مخالف بن گئے کہ مدت تک ان زمینوں کے حاصلات سادات کو نہ دیتے تھے اور سید شاہ محمود نے یہ جدی ملکیت بحال کرالی تھی۔ رمضان ۱۲۹۵ھ (۲۔ستمبر ۱۸۷۸ء) کو اچانک دشمنوں نے انھیں بانگیڑہ میں شہید کر ڈالا۔ صرف چونتیس سال کی عمر تھی۔ اس طرح خاندان کے دو روشن چراغ گل ہو گئے اور ان کے بعد ساداتِ ستھانہ پر جو آفتیں نازل ہوئیں ان کی اجمالی کیفیت آگے چل کر بیان کی جائے گی۔

تیسرا باب

مولانا عبداللہ کا آخری دَور

انگریزوں کا جوشِ انتقام | بلاشبہہ مجاہدین انگریزوں کے خلاف جہاد ضروری سمجھتے تھے، لیکن گزشتہ مہموں کی سرگزشت سے صاف واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے کبھی پیش دستی نہ کی۔ جھگڑے ہمیشہ قبائل سے ہوتے رہے۔ مجاہدین دفاعی کارروائیوں میں برابر شریک رہے۔ ان کے بنیادی عقیدے اور قبائل سے عہد تعاون کا تقاضا یہی تھا، لیکن غور کیجیے کہ انگریز ہمیشہ انھیں ہر علاقے سے خارج کرانے کی کوششیں کرتے رہے۔ یہ نکتہ خاص توجہ کا محتاج ہے کہ وہی کیوں ہر موقع پر جوشِ انتقام کا ہدف بنتے تھے؟ اس کی مختلف وجہیں ذہن میں آتی ہیں۔ پہلی اور نہایت اہم وجہ یہ ہے کہ مجاہدین ہندوستان کو انگریزی تسلّط سے آزاد کرانے کے عَلَم دار تھے۔ اگرچہ ان کی تعداد اتنی نہ تھی کہ انگریزوں جیسی وسیع الاقتدار حکومت کو ان سے کوئی خاص خطرہ ہوتا، لیکن وہ آزادی کا ایک نشان تھے اور ان کی مثال ہزاروں حریت طلب ہندوستانیوں کی حمیت کے لیے مہمیز بن سکتی تھی۔ انگریزوں کے نزدیک آزادی کی اس تحریک کو دبائے رکھنے کی صحیح تدبیر یہی تھی کہ مجاہدین کو زیادہ سے زیادہ نشانۂ آزار بنایا جاتا۔ دوم قبائل میں جنگی صلاحیت موجود تھی، اگرچہ تنظیم کوئی نہ تھی۔ مجاہدین قبائل کو منظم بھی کر سکتے تھے اور انھیں بہترین سیاسی و مذہبی مقاصد کے لیے لڑا بھی سکتے تھے، لہٰذا انگریزوں کا اوّلین مدعا یہ تھا کہ انھیں کہیں چین سے بیٹھنے اور تنظیمی کام کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

نئے مرکز کی تلاش | ۱۸۹۱ء کی جنگ کے بعد مجاہدین کو حسن زئیوں، اکازئیوں، مدّاخیلوں وغیرہ کے علاقوں سے نکال دیا گیا تو وہ نئے مرکز کی تلاش میں نکل پڑے۔ سیّد عبدالجبار شاہ نے لکھا ہے کہ امیر المجاہدین مولانا عبداللہ خود امازئی قبیلے کے پاس پہنچے اور کہا کہ ایک گاؤں اجارے پر دے دیجیے۔

ہم وہاں رہیں گے اور اجارے کی رقم باقاعدہ ادا کرتے رہیں گے ؛

امازئیوں کے تعلّقات ان دنوں اپنے ہمسایے مبارک خیلوں سے خوش گوار نہ تھے۔ وہ مجاہدین کو ایک گاؤں دے دینے کے لیے تیار ہو گئے، لیکن شرط یہ پیش کی کہ جب ہمیں کسی افغان قبیلے سے لڑائی کی نوبت آئے تو مجاہدین کا لشکر ہمارے ساتھ شامل ہو۔ اس صورت میں ہم اجارے کی رقم بھی نہ لیں گے۔ امیر المجاہدین نے یہ شرط قبول نہ کی۔ عذر یہ پیش کیا کہ مسلمانوں کی باہمی لڑائیوں میں ہم کسی کا ساتھ نہیں دے سکتے بلکہ ان لڑائیوں کو روکنے کی انتہائی کوشش کریں گے، البتّہ حربی کافروں سے جنگ ہو تو ہم مقدمۃ الجیش بن کر لڑیں گے ؛

مبارک خیلوں سے درخواست امازئیوں سے فیصلہ نہ ہو سکا تو امیر صاحب مبارک خیلوں کے پاس پہنچے۔ شہزادہ مبارک شاہ اور شہزادہ سیّد محمود حوادث کا شکار ہو چکے تھے۔ امیر صاحب نے شہزادہ مبارک شاہ کے فرزند اکبر سیّد فیروز شاہ کے پاس بھی پیغام بھیجا کہ مبارک خیلوں سے ٹیلوائی کا گاؤں اجارے پر لینے میں امداد دی جائے۔ چنانچہ سیّد فیروز شاہ نے اپنے بھائی سیّد بہادر شاہ کو امیر صاحب کے پاس بھیج دیا۔ اتّفاق یہ کہ مبارک خیلوں نے بھی ویسی ہی شرط پیش کر دی۔ انھوں نے کہا کہ ہم تو سب سے کمزور ہیں۔ خود کبھی کسی پر حملہ نہیں کیا، دوسرے زور آور قبیلے ہم پر حملہ کرتے رہتے ہیں۔ دفاعی جنگ میں تو ہمارا ساتھ ضرور دینا چاہیے۔ اگر یہ شرط منظور نہ ہو تو ہم کوئی جگہ نہیں دے سکتے۔ گویا امیر صاحب کو مبارک خیلوں سے بھی مایوس ہونا پڑا ؛

بارگاہِ الٰہی میں دُعا سیّد بہادر شاہ کہتے ہیں کہ اس حالت میں امیر صاحب نے آسمان کی طرف رُخ کر کے بڑے عجز سے کہا "اے عظیم الشّان آسمانوں کے بنانے اور قائم رکھنے والے خدا! تیری راہ میں اب تک خلوصِ نیّت کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ صبر اور رضا بہ قضا کا دامن نہیں چھوڑا، مگر اب تو تیری زمین پر جگہ ہی نہیں ملتی۔ اب تُو ہی بتا، میں کہاں جاؤں؟ تیری زمین پر بسنے والے تو مجھے اپنے پاس رکھنے کے لیے تیار نہیں" ؛

یہ دعا اردو میں تھی۔ سیّد بہادر شاہ کا بیان ہے کہ قبائلیوں میں سے کوئی اردو نہ سمجھتا تھا صرف

میں نے اسے سمجھا۔ مبارک خیلوں کا جرگہ اردو زبان تو نا آشنا تھا البتہ اس نے انداز سے معلوم کرلیا کہ امیر صاحب دعا کر رہے ہیں۔ موصوف کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ہم لوگ ایک ڈھیری کی بلندی پر بیٹھے تھے، جس کی ایک جانب نالہ جاری تھا۔ یہ دردناک الفاظ امیر صاحب کی زبان سے نکلے تو عین اُسی وقت سب کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ایسا معلوم ہوا کہ شدید زلزلے کا جھٹکا تھا۔ بے شک وہاں کبھی کبھی زلزلے آجایا کرتے تھے، لیکن یہ جھٹکا بالکل غیر معمولی تھا۔ گاؤں سوا سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ہوگا۔ اہلِ جرگہ نے سمجھا کہ گاؤں میں کچھ مکان ضرور گر گئے ہوں گے۔ چنانچہ ایک آدمی کو خبر لانے کے لیے دوڑایا۔ اس نے واپس آکر بتایا کہ وہاں کسی کو جھٹکا محسوس ہی نہیں ہوا۔

ٹیلوائی کا فیصلہ تمام حالات پر غور کرنے کے بعد مبارک خیلوں کو یقین ہوگیا کہ یہ جھٹکا امیر صاحب کی دعا کا کرشمہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کرلیا کہ خدا کے ایسے نیک اور حق پرست بندے کو ناراض کرنا غضب کا موجب ہوگا۔ ٹیلوائی کا گاؤں خود منت سماجت سے امیر صاحب کو اجارے پر دے دیا۔ چنانچہ تمام مجاہدین وہیں آبسے۔ مولانا عبداللہ کی حیاتِ مبارک کے باقی اوقات اسی جگہ بسر ہوئے[1]۔ یہ مقام اس وجہ سے بھی امیر صاحب کو بہت پسند تھا کہ اس میں غلہ خاصا پیدا ہوتا تھا اور پانی کی کوئی کمی نہ تھی۔

مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی نے لکھا ہے کہ سرحد آزاد میں ہر گاؤں کے مالک کو ایک چھوٹا سا لشکر رکھنا پڑتا ہے، ورنہ وہاں کا قیام آپس کے نفاق و شقاق اور مخالفت و معاندت کے باعث نہایت مشکل ہے، لہٰذا مولانا نے بھی اپنے ہمراہیوں کو فنونِ سپاہ گری کی تعلیم دی۔ حاسدوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ وہ سلطنت برطانیہ سے مقابلے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ وہ صرف اس غرض سے سرحد گئے تھے کہ محض آزادانہ زندگی بسر کریں اور کسی کے ماتحت نہ رہیں[2]۔

---

[1] یہ تمام حالات سید عبدالجبار شاہ کی کتاب "العبرت" سے ماخوذ ہیں۔ صفحہ ۴۳ و ۱۳۴۔

[2] "تذکرۂ صادقہ" صفحہ ۱۴۸۔

بلاشبہہ وہ آزاد رہنا چاہتے تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ تھوڑی سی جمعیت سے وہ انگریزی حکومت کو شکست نہ دے سکتے تھے، لیکن ان کا اصل مقصد اس کے سوا کیا تھا کہ جمعیت فراہم کریں اور ہندوستان کو انگریزوں کے تسلّط سے نجات دلائیں؟ وہ صرف تنہا آزاد نہ رہنا چاہتے تھے، بلکہ سب کو آزادی کی نعمت سے شاد کام دیکھنے کے خواہاں تھے۔

مولانا عبدالرحیم نے امیرالمجاہدین کے حقیقی مقاصد پر پردہ ڈالنے کی جو کوشش کی، اس کی ضرورت نہ تھی اور جس تحریر سے مجاہدین کے نصب العین پر ضرب لگے، وہ کسی شکل میں بھی زیبا نہیں سمجھی جا سکتی۔

سرحد ڈیورینڈ

حکومتِ ہند نے افغانستان اور ہندوستان کی درمیانی سرحد متعیّن کرنے کے لیے ایک کمیشن جنرل ڈیورینڈ کی سرکردگی میں امیر عبدالرحمٰن خاں فرمانروائے افغانستان کے پاس بھیجا تھا۔ اس کی طے کردہ حد اب تک سرحد ڈیورینڈ کے نام سے مشہور ہے۔ امیر عبدالرحمٰن خاں دل سے اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا، لیکن انگریزوں کی مخالفت بھی نہ کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سرحد متعین ہونے کے بعد جو آزاد علاقہ انگریزوں کی طرف چلا جائے گا، وہ انگریزی حلقۂ اثر سمجھا جائے گا اور انگریز آہستہ آہستہ اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیں گے۔ مجبور ہو کر اس نے حد بندی کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ اس کے بعد انگریزوں نے باقاعدہ حد بندی شروع کر دی، جس سے آزاد قبائل میں تشویش و اضطراب کی ایک عام لہر دوڑ گئی۔

۱۸۹۵ء میں ترکی اور یونان کے درمیان جنگ ہوئی تھی اور عام مسلمان اس امر پر بے حد پریشان تھے کہ یورپی حکومتیں ترکی کی مرکزی اسلامی سلطنت ہضم کر لینے کے درپے ہیں۔ سرحدی ملاؤں نے بالکل بجا پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ انگریز ہندوستان سے باہر اپنے معاندانہ مقاصد پورے کر رہے ہیں اور آزاد قبائل کے سرداروں کو وظیفے دے دے کر خاموش رکھنا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ بہ اطمینان باہر کے مسلمانوں کو خاصا نقصان پہنچا لیں گے تو آزاد قبائل کی آزادی بھی محفوظ نہ رہے گی۔

بعض غلط اطلاعات بھی پھیلائی گئیں۔ اس طرح مل ملا کر سرحد آزاد میں ایک ایسے ہنگامے کا انتظام ہو گیا جسے نیویل نے اپنی کتاب میں "نہایت خوفناک" قرار دیا ہے[1] اور یقیناً ایسا ہمہ گیر

[1] "نیویل کی کتاب" صفحہ ۲۰۹۔

جوش پہلے کبھی پیدا نہ ہوا تھا ؛

۹۸-۱۸۹۷ء کی جنگ انھیں حالات نے سرحد کے مختلف حصّوں میں معرکہ آرائی کے سامان فراہم کر دیے، جن میں سب سے بڑھ کر خونریز جنگ ملاکنڈ میں ہوئی۔ بونیر کے ایک ملا سعد اللہ خاں اس جنگ میں پیش پیش تھے۔ وہ عام طور پر سرتور فقیر یعنی مستانہ فقیر کے لقب سے مشہور تھے۔ ملا صاحب ہڈّا نے مہمندوں کے علاوہ تیراہ کے افریدیوں، وزیریوں اور مسعودوں تک میں جہاد کا زبردست جوش پیدا کر دیا جس کے شعلے تین سال تک بھڑکتے رہے۔ اس موقع پر مولانا عبداللہ امیر المجاہدین نے بھی اعلانات شائع کیے اور مقاصدِ جہاد کو ہر ممکن تقویت پہنچائی۔ ملّا صاحب ہڈّا ان غیور حضرات میں سے تھے جو زندگی کے آخری سانس تک ہر ممکن ذریعے سے انگریزوں کے خلاف جہاد کی آگ کو ہوا دیتے رہے۔ وہ اخوند صاحب صوات سے فیض یاب تھے اور خود ان کے ارادت مندوں میں حاجی صاحب ترنگ زئی اور ملّا صاحب سنڈاکے جیسے لوگ شامل تھے۔ ان حضرات کی تدبیروں کے متعلق کسی کی رائے خواہ کچھ ہو لیکن ان کی غیرت و حمیت اور جوشِ اسلام کے بارے میں ایک لمحے کے لیے شبہہ نہیں ہو سکتا ؛

مولانا سید عبدالجبار شاہ ستھانوی بھی اس جنگ میں مجاہدین کی طرف سے شریک ہوئے تھے۔ وہ خاندان کی تنہا امید گاہ تھے اور ان کی والدہ وعمہ کسی حالت میں بھی انھیں خطرے کے کسی مقام پر بھیجنے کے لیے آمادہ نہ تھیں، لیکن رضائے الٰہی کے خیال سے انھوں نے کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی۔ اسی موقع پر سید موصوف امیر المجاہدین مولانا عبداللہ اور ان کے بھائی مولانا عبدالکریم سے ملے جو اُس وقت توروسک میں مقیم تھے ؛

مجاہدین نے بڑی جانبازی سے مقابلہ کیا، لیکن اعلیٰ درجے کے آتش بار اسلحہ کے سامنے ان کی جانبازی کچھ کام نہ آئی۔ چنانچہ وہ شکست کھا گئے۔ سید عبدالجبار شاہ کا بیان ہے کہ جس مورچے پر شدید ترین جنگ ہوئی، اس میں خود میں موجود تھا۔ مقابلہ چھ بجے صبح شروع ہوا اور بارہ بجے کے بعد تک جاری رہا۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ توپ خانے کی آتش باری نے قبائلیوں میں بہت ابتری

پھیلائی۔ بونیروال شروع میں پسپا بھی ہوئے۔ وہ صرف پندرہ سو تھے اور مقابلے پر انگریزی لشکر دو ہزار سے زیادہ ہی تھا۔ اس کے ساتھ توپیں بھی تھیں اور رسالہ بھی:

پچاس ساٹھ سے زائد سوار، انگریزوں کی نعشیں اٹھالے جانے میں مارے گئے، جو بالکل مجھ سے ساٹھ یا ستّر گز کے فاصلے پر تھے۔ اس موقعے پر ہمارا صرف ایک نشانچی حملہ کرتا ہوا مارا گیا۔ باقی سب اس گھمسان سے سلامت نکل آئے، جن میں ایک مَیں بھی تھا[1]۔

سیّد صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ انگریزوں نے اپنے مقتول سپاہیوں کی تعداد کم بتائی ہے۔ نیویل نے اپنی کتاب میں اس جنگ کا مفصّل نقشہ پیش کیا ہے[2]۔ انگریزی فوج ملاکنڈ اور چک درہ سے فارغ ہو کر بونیر بھی پہنچی، لیکن ہمیں ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ انھیں جماعتِ مجاہدین کی سرگرمیوں سے براہِ راست کوئی تعلّق نہیں۔ یہ تفصیلات اس عہد کی عمومی سیاسی سرگزشت کا حصّہ ہیں۔

درۂ خیبر کی سرگزشت انگریزوں کے عہدِ حکومت میں درۂ خیبر سے باقاعدہ آمد و رفت کا آغاز ۱۸۷۸ء سے ہوا اور ۱۸۸۳ء سے باقاعدہ سڑک بنی۔ یہ سڑک درہ اور آس پاس کے مختلف قبیلوں نے انگریزوں سے گراں قدر رقمیں لے کر خود بنائی تھی اور وہی اس کے مختلف حصّوں کی حفاظت کے ذمّہ دار بنے تھے۔ یہ مندرجہ ذیل قبیلے تھے: کوکی خیل، ملک دین خیل، زخہ خیل اور شنواری، لیکن بعض لوگ ایسے بھی تھے، جنھوں نے مخالفت کا سلسلہ جاری رکھا اور انگریزوں سے تعاون قبول نہ کیا۔ ان میں سے ملک دین خیل کا ایک سردار کمال خاں بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ وہ انتہائی مردانگی اور شجاعت سے کام لے کر وقتاً فوقتاً حملے کرتا رہا، چنانچہ ایک موقع پر انگریزی رسالے کا ایک پکٹ کاٹ کر رکھ دیا۔ صرف ایک سوار زندہ بچ کر نکل سکا۔ پھر کمال خاں نے رسالے کی

---

[1] "شہادت الثقلین" جلد اوّل قلمی نسخہ ص ۱۴۴۔ [2] "نیویل کی کتاب" ص ۲۲۳-۲۴۸۔

ایک چوکی پر حملہ کیا۔ کمشنر کا سامان کوہاٹ جا رہا تھا، راستے میں اس پر چھاپا مارا اور پورا سامان لے کر نکل گیا۔ انگریزوں نے اس کی گرفتاری کے لیے دو ہزار روپے کا انعام مقرر کیا تھا۔ کمال خاں کے ایک قبائلی دشمن نے اس جواں مرد کو اچانک گولی کا نشانہ بنایا اور وہ شہید ہو گیا۔ قاتل انعام لینے کے لیے پشاور پہنچا تو اسے جواب ملا کہ تم نے سرکاری اعلان کی بناء پر نہیں بلکہ اپنی دشمنی کی بناء پر اسے مارا ہے لہٰذا انعام کے مستحق نہیں سمجھے جا سکتے۔ وہ ناکام واپس گیا۔ کمال خاں کا بھائی اس کی تاک میں بیٹھا تھا اور راستے ہی میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ۱۸۹۷ء میں تیراہ اور آس پاس کے علاقے بھی عرصۂ کارزار بنے۔ لیکن ان لڑائیوں سے مجاہدین کا براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لیے تفصیلات نظر انداز کی جاتی ہیں[2]۔

وفات | مولانا عبداللہ نے ۲۷۔ شعبان ۱۳۲۰ھ (۲۹۔ نومبر ۱۹۰۲ء) کو وفات پائی۔ تقریباً چوہتر سال کی عمر ہوئی۔ ہوش مندی کی زندگی کا ایک ایک لمحہ رضائے باری تعالیٰ کے مطابق راہِ حق میں جہاد کرتے ہوئے صرف کیا۔ وہ اس مجاہد کبیر کے فرزند تھے، جس کا خاندان بہار کے ممتاز امراء میں شمار ہوتا تھا۔ مولانا کی والدہ حیدر آباد دکن کے ایک رئیس مرزا واحد بیگ کی صاحبزادی تھیں، لیکن مولانا نے نہ ددھیال کی امیری سے کوئی فائدہ اٹھایا، نہ ننھیال کی ریاست سے۔ سب کچھ چھوڑ کر انتہائی تکلیفوں، مصیبتوں اور پریشانیوں میں دن گزارے، اس لیے کہ حصولِ رضا کا راستہ یہی تھا۔ اس ہمت و عزیمت کے بزرگ ہر قوم کے لیے عزت و برتری کا بہترین سرمایہ ہیں۔ افسوس کہ ہم ان کے حیات آموز کارناموں کو گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا چکے ہیں۔ مولانا کی قبر ٹیلوائی ہی میں ہے۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا، لیکن چڑھائی کے باعث گاؤں میں نہ جا سکا۔

ازواج و اولاد | مولانا عبداللہ کا پہلا نکاح مولانا فرحت حسین (عمِ مکرم) کی صاحبزادی مسماۃ صالحہ سے ہوا۔ یہ خاتون مولانا عبدالرحیم ماخوذ مقدمۂ انبالہ کی حقیقی بہن تھیں۔ ان سے تین صاحبزادے

---

[1] ملاحظہ ہو یوسفی صاحب کی کتاب "آزاد پٹھان"۔ [2] "تذکرۂ صادقہ" ص ۱۴۸۔

ہوئے: (۱) عبدالقدوس (۲) مطیع اللہ اور (۳) امان اللہ۔ عبدالقدوس سرحدِ آزاد میں بہت محترم مانے جاتے تھے۔ انھوں نے پوری زندگی دعوت و تبلیغ میں گزار دی اور مولانا کی وفات سے صرف چار مہینے بعد ذی قعدہ ۱۳۲۰ھ (فروری ۱۹۰۳ء) میں فوت ہوئے۔ مطیع اللہ اور امان اللہ کے فرزند یکے بعد دیگرے امارت کے منصب پر فائز ہوئے۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔ پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد مولانا نے دوسرا نکاح سرحد میں کر لیا تھا۔ اس خاتون سے صاحبزادہ عبدالسبوح پیدا ہوا۔ مولانا کا عہدِ امارت تقریباً چالیس سال پر پھیلا ہوا ہے اور جماعتِ مجاہدین کی سرگزشت کا یہ نہایت شاندار باب ہے۔

ساداتِ ستھانہ کے حالات یہاں ساداتِ ستھانہ کے حالات بھی اختصاراً بیان کر دینے چاہئیں:

۱۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ شہزادہ مبارک شاہ ایک اندوہناک حادثے میں شہید ہوئے اور سیّد شاہ محمود نے ایک معاند گروہ کے ہاتھوں اچانک شہادت پائی۔ خاندان کے یہی روشن چراغ تھے۔ شہزادے کے بال بچے ملکا ہی میں مقیم رہے۔ سید شاہ محمود کے اہل و عیال کو مرحوم کے چھوٹے بھائیوں نے سنبھال لیا اور وہ درۂ ستھانہ کے اندر مقیم تھے۔

۲۔ والیِ امب کا اس خاندان سے قریبی رشتہ تھا، خصوصاً سیّد عمر شاہ اور سیّد شاہ محمود سے ذاتی تعلّقات بہت گہرے تھے۔ سیّد شاہ محمود نے والیِ امب پر ایک احسان بھی کیا تھا یعنی عشرہ کے قریب اپنی خریدی ہوئی زمین بے توقّف والیِ امب کے حوالے کر دی تھی، جس سے اس کے مقاصد کو تقویت پہنچتی تھی۔ والیِ امب نے اب چاہا کہ سیّد شاہ محمود کے بال بچّوں اور بھائیوں کے لیے بہ اطمینان ستھانہ میں اقامت اختیار کر لینے کا بندوبست کر دے، چنانچہ یہ کوشش ایک حد تک نتیجہ خیز ثابت ہونے لگی۔ اس واقعے نے، جس سے خود سیّد شاہ محمود کے بچوں یا بھائیوں کو کوئی علاقہ نہ تھا، شہزادہ مبارک شاہ کے فرزند سیّد فیروز شاہ کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ سید عمر شاہ کا خاندان آبائی مسلک کے خلاف

انگریزوں سے مل گیا ہے اور بہ طور خود ستھانہ کی پوری اراضی پر قابض ہو جانے کا خواہاں ہے۔ فیروز شاہ حد درجہ تیز مزاج اور غصہ ور آدمی تھا۔ اس نے اصل حالات کی چھان بین یا حد درجہ قریبی خونی رشتوں سے بالکل بے پروا ہو کر چھاپوں کا سلسلہ شروع کر دیا، جن میں سید شاہ محمود کے بھائی اور ان کا بڑا بیٹا سید شاہ رسول بے دردی سے شہید کر ڈالے گئے۔ صرف ایک شیر خوار بچہ باقی رہ گیا، جس کی ابتدائی تربیت کیّا (زنڑ کھیل) میں ہوئی۔ پھر تعلیم اور حفاظت کی غرض سے اسے ہندوستان بھیج دیا گیا، یعنی سید عبدالجبار شاہ۔

۳۔ سید موصوف کی زندگی کا ابتدائی دَور حد درجہ درد انگیز اور الم ناک تھا، لیکن خدا نے اپنی رحمت سے ان کے لیے ترقی و تعالی کے عجیب و غریب اسباب فراہم کر دیے۔ چنانچہ وہ ریاست امب کے وزیر اعظم بنے۔ دو اڑھائی سال صوات کے بادشاہ رہے۔ ستھانہ کی از سر نو آبادی کا انتظام انھیں نے کیا اور خاندان کے تمام جھگڑوں کو مٹا کر جمعیت و یکجائی کا بندوبست بھی کر دیا۔ نیز انھوں نے متعدد تصانیف مکمل کیں، جن میں سے چار پانچ ایسی ہیں کہ سرحد کے متعلق مفصل تاریخی معلومات کا ان سے بہتر اور گراں تر خزینہ کوئی نہیں۔ سید فیروز شاہ فوت ہو گیا تو اس کے بھائیوں اور بچوں نیز خاندان کے دوسرے افراد کو بھی سید عبدالجبار شاہ نے اپنی سرپرستی میں لے لیا[۱]۔

---

[۱] افسوس کہ اس کتاب کی طباعت کے دوران میں وہ بھی راہیِ عالم بقا ہوئے۔

چوتھا باب

مولانا عبدالکریم

ابتدائی زندگی مولانا عبداللہ کے بعد مولانا عبدالکریم مجاہدین کے امیر منتخب ہوے۔ وہ آٹھ نو سال کے تھے، جب اپنے والدِ ماجد مولانا ولایت علی کے ہمراہ سرحد پہنچے تھے[۱]۔ بیچ میں ایک مرتبہ ہندوستان واپس آ گئے تھے، جب مولانا عنایت علی امیر مجاہدین تھے اور خاندان کے متعدد افراد کو ان سے اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۸۶۱ء میں مولانا عبداللہ کے ہمراہ دوبارہ سرحد گئے۔ پھر ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ وہیں بسر ہوا۔ جنگ امبیلہ سے ۹۸-۱۸۹۷ء کی جنگ تک نیز بعد کی تمام مہموں میں برابر شریک رہے۔ تبلیغی اور تنظیمی مقاصد کے لیے وہ سرحد کے مختلف حصّوں میں پہنچے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ میاں کلئی (باجوڑ) بھی گئے تھے، جہاں خاصی دیر مقیم رہے۔

بہرحال مولانا عبداللہ کے بعد وہ امیرِ مجاہدین بنے تو خدا جانے کیا حالات پیش آئے کہ تھوڑی ہی دیر میں انھیں ٹیلوائی چھوڑ کر نئے مرکز کا انتظام کرنا پڑا اور وہ اسمست میں مقیم ہو گئے، جہاں اب تک جماعتِ مجاہدین موجود ہے۔

اسمست اسمست برندو ندی کے عین کنارے پر واقع ہے، جو بونیر سے نکلتی ہے اور کوہستانی علاقے کے نشیبی مقامات سے گزرتی ہوئی جہلم ندی سے مل کر دریاے سندھ میں گرتی ہے۔ برندو نے

---

[۱] حافظ عبدالمجید (ابن مولانا عنایت علی) کی جو یادداشتیں اسمست میں میری نظر سے گزریں، ان میں مولانا عبدالکریم کی تاریخ پیدائش ۱۲۵۷ھ بتائی گئی ہے۔ ایک اور روایت سے معلوم ہوا کہ ان کی پیدائش ۱۲۵۵ھ میں ہوئی۔ بہرحال والد کے ساتھ سرحد آتے وقت مولانا کی عمر آٹھ نو سال یا دس گیارہ سال کی ہوگی۔

اسمست کے مقام پر اردو زبان کے حرف " د " کی شکل اختیار کرلی ہے۔ یعنی اسمست کی زمین میں داخل ہونے تک یہ ندی پہاڑ کی دو دیواروں کے درمیان چلی آرہی ہے۔ " د " کے درمیانی گوشے پر پہنچ کر ایک دیوار ذرا پیچھے ہٹ گئی ہے اور اس نے آبادی کے لیے تھوڑا سا خلا پیدا کردیا ہے۔ موڑ سے گزر کر تھوڑی دور پر پھر دونوں پہاڑی دیواریں پہلے کی طرح اس قدر قریب آگئی ہیں کہ ندی کے طاس کے سوا ان میں کوئی فصل باقی نہیں رہا ؎

اسمست کی آبادی اسی درمیانی خلا میں ہے۔ آبادی کے آس پاس جو زمین قدرے ہموار ہے، اس میں کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ اس کے جنوبی حصے میں قبرستان ہے۔ آبادی ندی کی سطح سے تقریباً دو سو فٹ کی بلندی پر ہوگی۔ چونکہ ندی میں زور کا پانی بہت کم آتا ہے، اس لیے اس کے کناروں کی زمین میں بھی مجاہدین کھیتی باڑی کرلیتے ہیں اور انھوں نے کچھ پھل والے درخت بھی لگالیے ہیں۔ اسی حصے میں پن چکیاں بھی ہیں۔ قبرستان سے نیچے ایک میدان ہے، جہاں مجاہدین ایک زمانے میں باقاعدہ پریڈ کیا کرتے تھے۔ غالباً اب بھی کرتے ہیں۔ ندی میں زیادہ پانی اُس وقت آتا ہے، جب بارشوں کا زور ہو، ورنہ عموماً بارہ پندرہ گز ہی کے عرض میں پانی بہتا ہے، حالانکہ پورا طاس ڈیڑھ دو سو گز سے کم نہ ہوگا ؎

آبادی کی کیفیت آبادی کے مکان پہاڑی علاقوں کی طرح درجہ بدرجہ اوپر نیچے ہیں۔ تمام مکان دو سو سے کم نہ ہوں گے۔ یہ مختلف حصوں میں بٹے ہوئے ہیں مثلاً:

۱ ۔ ان کسانوں کے گھر جو کھیتی باڑی کرتے ہیں اور مجاہدین میں شامل نہیں۔ یہ مقامی لوگ ہیں ؎

۲ ۔ عیال دار مجاہدین کے گھر ؎

۳ ۔ مجاہدین کی بارکیں جو مختلف جماعتوں کے ناموں سے موسوم ہیں ؎

۴ ۔ گھوڑوں اور خچروں کے اصطبل ؎

۵ ۔ اسلحہ خانہ ؎

۶ ۔ غلّے کا گودام جس میں مکئی، جَو، گندم اور چاول کے لیے الگ الگ کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔

ہر شخص کو خواہ وہ عام سپاہی تھا یا رئیس، یکساں مقدار میں جنس ملتی تھی ۔

جانور گرمیوں میں آس پاس کی پہاڑیوں پر چر کر پیٹ بھر لیتے ہیں۔ سردیوں کے لیے گھاس کاٹ کر خشک کر لی جاتی ہے۔ پوری آبادی کے گرد ایک دیوار کھچی ہوئی ہے، جس میں دو دروازے ہیں۔ ایک بڑا دروازہ جس سے عام لوگ آتے جاتے ہیں۔ یہ جنوبی حصے میں ہے۔ دوسرا چھوٹا دروازہ جو عیال دار مجاہدین کے مکانوں کے پاس کھلتا ہے اس کا رُخ شمالی سمت میں ہے۔ آبادی سے باہر لیکن اس سے متصل بڑے دروازے کے پاس سادہ سی مسجد ہے۔ اس کے سامنے ایک مکان ہے، جہاں باہر سے آنے جانے والے مسافر ٹھہرتے ہیں۔ آبادی کا رخ مشرق کی طرف ہے اور پُشت کی طرف اس سے پیچھے پہاڑی دیوار تدریجاً بلند ہوتے ہوتے پہلی حالت پر پہنچ گئی ہے۔ شمال مغرب میں پہاڑ کے ساتھ ساتھ پگ ڈنڈی جاتی ہے۔ اس پگ ڈنڈی پر چلتے چلتے آبادی سے تقریباً ایک میل باہر نکل جائیں تو پہاڑ سے دو چشمے نکلے ہیں، جن کا پانی بہت اچھا ہے۔ پینے کا پانی ایک چشمے سے لیتے ہیں، دوسرے چشمے پر عموماً نہاتے ہیں، لہٰذا اس کے پاس غسل خانہ بنا دیا گیا ہے ۔

پشتو زبان میں اسمست غار کو کہتے ہیں۔ چونکہ اس جگہ پہاڑ میں کئی چھوٹے بڑے غار بنے ہوئے ہیں، شاید اسی وجہ سے مقام کا نام اسمست پڑ گیا۔ ویسے بھی پہاڑوں کے درمیان اس جگہ کی حیثیت ایک ایک بڑے غار کی سی ہے۔ یہ پرانے اوضاعِ جنگ کے لحاظ سے خاصا مستحکم تھا۔ موجودہ زمانے کے اسلحہ نے اس کی محفوظیت باقی نہیں چھوڑی ۔

مجاہدین کی عام کیفیت مولانا عبدالکریم نے یہ مرکز ۱۹۰۲ء میں قائم کیا تھا۔ آج کل کی کیفیت پیشِ نظر رکھ کر پچاس پچپن سال پہلے کے حالات کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ مرکز جہاد ہی کی غرض سے قائم ہوا تھا اور اس میں جسمانی راحت کے سامان بہت کم تھے، لیکن یہاں کی آب و ہوا خاصی خوش گوار ہے۔ مجاہدین کی کوششوں سے سبزیوں کی کاشت بھی ہونے لگی ۔

آبادی میں ہندوستان کے تمام حصوں کے باشندے موجود تھے۔ زیادہ تر مجاہدین بنگال اور بہار کے تھے۔ ان لوگوں کی بےنفسی کا یہ عالم تھا کہ اپنے اصل وطن کے متعلق کسی کو کچھ نہ بتاتے تھے بلکہ

بعض اصحاب اپنے نام بھی بدل لیتے تھے تاکہ متعلقین کو کسی ذریعے سے کچھ معلوم نہ ہو سکے اور وہ اطمینان سے رضائے باری تعالیٰ کا حق ادا کر سکیں۔ ایک صاحب سے ملاقات ہوئی، جن کے والد بنگال سے آئے تھے اور سرحد میں شادی کر لی تھی، لیکن انھوں نے اولاد کو اپنے اصل وطن کے متعلق کبھی کچھ نہ بتایا تاکہ ان کے دل میں اہل وطن سے تعلق پیدا کرنے اور واپس جانے کا کوئی امکان نہ رہے۔ ایک بنگالی امیر کا ذکر سُنا جو بہت بڑا زمیندار تھا۔ دو مرتبہ حج کر چکا تھا۔ ہر سال ہزاروں روپے مجاہدین کی خدمت کے لیے بھیجتا تھا۔ پھر اچانک گھر بار چھوڑ کر اسمست پہنچ گیا۔ ہر وقت یہی دعا اس کی زبان پر رہتی تھی کہ ایسی جگہ موت آئے، جہاں اجنبی اقتدار کا سایہ تک موجود نہ ہو۔ چنانچہ وہ اسمست ہی کی آغوش میں آخری نیند سویا۔

عہدِ امارت مولانا عبدالکریم کے عہدِ امارت میں چھوٹی چھوٹی کشمکشیں ضرور ہوئی ہوں گی، جن کی کوئی تفصیل ہمیں معلوم نہیں ہو سکی، لیکن اس زمانے میں ملک کے اندر خاصی سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی اور ہر قابلِ ذکر طبقے کی آرزو یہ تھی کہ ملک اجنبی تسلّط کے داغ سے پاک ہو جائے۔ گویا سیّد احمد شہید اور ان کے رفقاء و معتقدین نے جس مقصد کا چراغ سوا سو سال پیشتر جلایا تھا اس کی روشنی عام ہونے لگی تھی۔ وہ کیفیت نہ رہی تھی کہ دردمندوں کا ایک گروہ تنہا اسلامیت و آزادی کے لیے ہر قسم کی قربانیاں کرتا ہے اور عوام کو خبر ہی نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے یا جو لوگ حالات سے کسی قدر واقف ہوں، ان کے قلب بھی اجنبی حکومت کے خوف سے اس درجہ مرعوب ہو گئے ہوں کہ فدا کارانِ راہِ حق و آزادی کے سائے سے بھی دُور بھاگیں۔

ہندوستان کے مسلم عوام میں جوشِ حمیت کی پہلی لہر ۱۸۹۵ء کی جنگِ یونان و ترکی کے دوران میں اٹھی، اسی وقت سے ہمہ گیر احساس کا آغاز ہوا کہ یورپی طاقتیں مختلف حیلوں بہانوں سے مسلمانوں کی آخری بڑی سلطنت کو ختم کر دینے کے درپے ہیں، جو کم و بیش چار سو سال سے حاملِ خلافت ہونے کے باعث ہمہ گیر عقیدت کا مرکز چلی آتی تھی۔ نیز اسی کو خدمتِ حرمین شریفین کی سعادت حاصل تھی۔ پھر سیاسی بیداری کا دائرہ برابر پھیلتا اور وسیع ہوتا رہا۔ اس کی شدت بھی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی گئی۔

پے بہ پے ایسے واقعات پیش آتے رہے، جن سے ان شعلوں کو ہوا ملتی رہی۔ اب صورتِ حال یہ نہ تھی کہ امیر المجاہدین کو مختلف ذریعوں سے کام لے کر امداد حاصل کرنی پڑتی بلکہ خود عام مسلمان حصولِ آزادی کے جوش میں ان مراکز سے وابستگی پیدا کرنے کے لیے کوشاں تھے، جن سے تحریکِ آزادی کو تقویت پہنچ سکتی تھی۔ اس سلسلے میں مجاہدین کا مرکز سب سے پہلے آتا تھا، اس لیے کہ وہ سوا سو سال سے اسلامیت و آزادی کا علمدار چلا آتا تھا۔ نیز وہ ہندوستان سے بہت قریب تھا بلکہ اس کے حواشی پر واقع تھا۔

روابط کی توسیع پوری تفصیل معلوم نہ ہو سکی، لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہہ نہیں کہ ہندوستان میں مجاہدین کی امداد کے لیے متعدد ایسے مرکز بن گئے جو پہلے موجود نہ تھے۔ ان میں روپے اور جانباز آدمیوں کی فراہمی کے لیے سرگرمی سے کام ہوتا تھا۔ ان کے ذریعے سے سیکڑوں افراد اور ہزاروں روپے سرحدِ آزاد میں پہنچتے تھے۔ اس کام کی تفصیل کتاب کے اس حصے میں بیان ہوگی، جو ملک کی اندرونی سرگرمیوں سے متعلق ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مولانا عبدالکریم کو ان کے دائرۂ کار کے لحاظ سے روپے اور مجاہدوں کی قلت غالباً کبھی محسوس نہ ہوئی، اگرچہ اتفاقات کی بنا پر انھیں کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام دینے کا موقع نہ مل سکا۔

۱۹۱۴ء میں جنگِ یورپ شروع ہوگئی، جس میں اکثر اہلِ ملک کی ہمدردیاں دو وجہ سے ان طاقتوں کے لیے وقف تھیں جو انگریزوں کے خلاف برسرِ پیکار تھیں: اول اس لیے کہ انگریز ملک پر مسلّط تھے اور ان کے تسلّط سے نجات حاصل کرنے کی سہل ترین صورت یہ تھی کہ وہ جنگ میں شکست کھاتے اور شکست کی تمام مصیبتوں کا ہدف بنتے جن کا ہدف وہ مدتِ مدید تک اہلِ ہند کو بناتے رہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ سلطنتِ عثمانیہ انگریزوں کی مخالف طاقتوں میں شامل تھی اور مسلمان سلطنتِ عثمانیہ کو اس سبب سے بھی اپنی نہایت بیش بہا متاع سمجھتے تھے کہ وہ آخری بڑی اسلامی سلطنت تھی اور اس سبب سے بھی کہ وہ منصبِ خلافت کی حامل تھی اور اسے مذہبی تقدس کا درجہ حاصل تھا۔ اس زمانے میں مولانا عبدالکریم کو ہندوستان کے مختلف حلقوں سے مستحکم روابط پیدا کرنے کا

موقع مل گیا۔

ہندوستانی لیڈروں سے تعلقات مسلمانوں میں بہت سے سیاسی لیڈر بروئے کار آ چکے تھے، جن میں سے بعض کو بلند مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ مثلاً مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مسیح الملک حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد۔ باقی لیڈروں کی عام حیثیت سیاسی تھی، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" کے ذریعے سے قرآنی دعوت کا سلسلہ ایسے دل پذیر انداز میں شروع کیا تھا کہ وہ سیاسی لیڈر ہونے کے علاوہ وقت کے یگانہ دینی رہنما بھی سمجھے جاتے تھے اور آزادیٔ وطن کی تحریک میں انھیں سبقت کا وہ مقام حاصل تھا، جو عوام کی نظروں میں کسی دوسرے لیڈر کو حاصل نہ تھا۔ مجاہدین کے روابط اگرچہ سب سے تھے، لیکن مولانا ابوالکلام مخصوص دینی حیثیت کے باعث ممتاز ترین درجے پر فائز تھے، چنانچہ مولانا عبدالکریم ہر ضروری معاملے کے متعلق مولانا آزاد ہی سے مشورہ لیتے رہتے تھے اور جب کوئی اہم ضرورت پیش آتی تھی تو اپنے خاص قاصد بھیج کر اس کی تکمیل کا انتظام کرا لیتے تھے۔ مثلاً ایک موقع پر مجاہدین کو قابل ڈاکٹر کی ضرورت پیش آئی۔ مولانا آزاد کو یہ اطلاع ملی تو انھوں نے اپنے نیازمندوں میں سے ایک ایسے نوجوان کو بھیج دیا جو ڈاکٹری کی تعلیم کے تمام مراحل طے کر چکا تھا، اگرچہ اس نے آخری سند نہ لی تھی۔ چنانچہ وہ مدت تک مجاہدین کے پاس رہا۔ پھر کابل چلا گیا اور وہاں سے ہندوستان واپس آیا۔

وفات مولانا عبدالکریم نے ۲۵۔ ربیع الاول ۱۳۳۳ھ (۱۱۔ فروری ۱۹۱۵ء) کو بروز پنج شنبہ نماز فجر کے وقت اسمست میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ وہ اس قافلے کے آخری فرد تھے، جس کے سرخیل مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی اور مولانا عبداللہ رہ چکے تھے۔ ان پر امارت کا وہ مقدس دور ختم ہو گیا، جس کی ابتدا سید احمد شہید سے ہوئی تھی۔ بعد میں جو سلسلہ شروع ہوا، وہ سیاسی اور مذہبی لحاظ سے خاصا مختلف اور قدرے فروتر تھا۔ خواہ یہ سمجھ لیا جائے کہ جس فضا میں مولانا عبدالکریم نے تربیت پائی تھی، وہ بعد کے لوگوں کو میسر نہ آ سکی، خواہ یہ سمجھ لیا جائے کہ گرد و پیش کے حالات میں خاصا تغیر پیدا ہو جانے کے باعث وہ طریقے بدل چکے تھے، جن پر

مولانا عبدالکریم اور ان کے پیش رو کاربند رہے ٭

اولاد اور خاندان مولانا عبدالکریم کا صرف ایک صاحبزادہ محمد حسن[1] تھا، جو ان کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ان کے بڑے بھائی مولانا عبداللہ کے چار صاحبزادے تھے، جن میں سے ایک مولانا عبدالقدوس کو یاغستان میں انتہائی ہر دل عزیزی حاصل تھی اور انھوں نے ذی قعدہ ۱۳۲۰ھ (جنوری ۱۹۰۳ء) میں وفات پائی[2]۔ مولانا عبدالسبّوح بھی فوت ہو چکے تھے۔ صرف دو بیٹوں کی اولاد باقی تھی۔ امان اللہ کے فرزند مولانا رحمت اللہ اور مطیع اللہ کے فرزند مولانا نعمت اللہ۔ آخر الذکر بالاتفاق امیر منتخب ہوئے۔ ان کے حالات آئندہ ابواب میں بیان ہوں گے ٭

یہاں اتنا اور بتا دینا چاہیے کہ مولانا مطیع اللہ (ابن مولانا عبداللہ) کی بعض تصانیف کا بھی علم ہوا مثلاً:

۱ - اربعین فی ما علی الامیر والتابعین

۲ - احادیث استقامت بعد الہجرۃ

۳ - اربعین فی فضل الجہاد

۴ - دار الفتن سے ہجرت واجب ہے ٭

---

[1] محمد حسن کی تاریخ ولادت ۱۳۰۶ھ (۸۹-۱۸۸۸ء) ہے، تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی ٭

[2] ان کا ایک صاحبزادہ عبدالمتین تھا، جو ایک سال بعد یعنی ۱۳۲۱ھ میں فوت ہوا ٭

پانچواں باب

امیر نعمت اللہ

مسلک میں تبدیلی جیسا کہ گزشتہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے، امیر عبد الکریم کی وفات پر نعمت اللہ (بن مطیع اللہ بن امیر عبد اللہ) جماعتِ مجاہدین کے امیر منتخب ہوئے۔ ہمارے سامنے جو بیانات آئے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے عہد میں انگریزی حکومت کے متعلق مسلک میں تغیّر رونما ہو گیا۔ اس سے تمام مخلص متوسّلین کے دلوں میں خلش پیدا ہو گئی اور وہ سمجھنے لگے کہ جماعتِ مجاہدین اپنے اصل فرائض و وظائف کی راہ سے ہٹ گئی ہے۔

تبدیلِ مسلک کی کئی شہادتیں موجود ہیں، مثلاً ۲۱-۱۹۲۰ء میں یہاں جماعتِ مجاہدین کے بعض کارکنوں پر مقدّمہ قائم ہوا تھا، جس کے تفصیلی حالات آگے چل کر پیش ہوں گے۔ اس میں مختلف اصحاب نے تبدیلِ مسلک کا عذر پیش کرتے ہوئے جماعت کا کاروبار ترک کر دینے کا اعتراف کیا۔ ایک صاحب نے خود مرکزِ مجاہدین میں پہنچ کر امیر نعمت اللہ سے دریافت کیا کہ آیا واقعی آپ نے انگریزوں سے صلح کر لی ہے؟ امیر نے بتایا کہ صلح تو نہیں کی، البتہ ایسا انتظام کر لیا ہے کہ انگریزی حکومت کے کارندے مجاہدین کے لیے روپیہ لانے، لے جانے والوں کو تنگ نہ کریں، تاہم امیر نعمت اللہ کے مقربین میں سے جو لوگ حقیقتِ حال سے آگاہ تھے، انھوں نے علیحدگی میں مستفسر کو یقین دلا دیا کہ امیر نے واقعی صلح کر لی ہے۔ اس کے ثبوت میں یہ واقعہ پیش کیا گیا کہ شاہ امان اللہ خاں نے دو بم پنجاب پہنچانے کی غرض سے بھیجے تھے۔ امیر نعمت اللہ نے ایک بم اپنے پاس رکھ لیا اور دوسرے کے ارسال کا انتظام ایسے طریق پر کیا کہ انگریزی کارکنوں کو بر وقت علم ہو جائے۔ چنانچہ یہ بم راستے میں پکڑا گیا اور منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکا۔ گویا ارسال کے ساتھ اس کے پکڑوانے کا انتظام خود امیرِ موصوف نے کیا۔[1]

[1] یہ ۱۹۲۱ء کے مقدمے کے ملزم مستری ابراہیم وزیر آبادی کا بیان تھا جو تحقیقِ احوال کے لیے اسمست گئے تھے۔

صلح کی سرگزشت اس سلسلے میں نہایت اہم اور مستند معلومات سید عبدالجبار شاہ ستھانوی کی اس کتاب سے مل گئیں، جس میں انھوں نے صوات کی بادشاہی کے حالات رقم فرمائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۱۹۱۷ء میں دو بڑے واقعات پیش آئے تھے:

۱۔ مجاہدین میں سے بعض حضرات تنھیا گلی کے علاقے میں مقیم تھے، انھوں نے ریونیو کمشنر کی کوٹھی سے سامان لوٹا۔ والیِ امب نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر یہ پورا سامان واپس کرا دیا۔

۲۔ اسی گروہ کے بعض افراد نے تنھیا گلی کے علاقے میں دو گورے سپاہیوں یا افسروں کو گولی سے ہلاک کر دیا۔ یہ لوگ ریاست امب میں سے گزر کر جا رہے تھے۔ والیِ ریاست نے انھیں گرفتار کر کے انگریزی حکومت کے حوالے کر دیا۔

ان واقعات کی وجہ سے انگریزی حکومت نے مجاہدین کے خلاف دار و گیر کے انتظامات بہت سخت کر دیے۔ ویسے بھی یورپ میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ جرمنی اور ترکی کا ایک وفد کابل میں پہنچا تھا تاکہ امیر حبیب اللہ خاں کو ہم نوا بنا کر ہندوستان پر حملہ کرا دے۔ اس وجہ سے بھی سرحد آزاد میں آنے جانے والے آدمیوں کی شدید نگرانی ہوتی تھی۔ اسی دور میں مجاہدین کے دو کارندے ہندوستان سے دس ہزار روپے کے قریب رقم لے جاتے ہوئے پکڑے گئے[1]۔ یہ رقم بحقِ سرکار ضبط ہوئی اور کارندے گرفتار کر لیے گئے۔ اس واقعے کا طبعی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ جماعتِ مجاہدین میں انگریزوں کے خلاف سخت اشتعال پیدا ہوتا۔ چنانچہ انھوں نے انگریزی علاقے پر یورشوں کا فیصلہ کر لیا۔ ساداتِ ستھانہ سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے، لہٰذا اس باب میں سید عبدالجبار شاہ سے بھی مشورہ ضروری سمجھا گیا۔

---

[1] رولٹ رپورٹ میں مرقوم ہے کہ مارچ ۱۹۱۷ء میں دو بنگالی مسلمان گرفتار ہوئے تھے جن کے پاس سے آٹھ ہزار روپے برآمد ہوئے۔ یہ مجاہدین میں شریک تھے، لیکن انھیں اپنے اپنے ضلعے سے سرمایہ فراہم کرنے کے لیے ہندوستان بھیج دیا گیا تھا۔

(رشد کمیشن کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۱۸ء انگریزی ص ۱۷۵)۔

چنانچہ امیر نعمت اللہ نے اس غرض سے مولوی عبدالوہاب سندھی کو صوات بھیج دیا۔ سید عبدالجبار شاہ نے فرمایا کہ اعتدال کا مسلک نہ چھوڑنا چاہیے:

"میں ملاکنڈ ایجنسی کی معرفت اصل حقیقت گورنمنٹ برطانیہ پر ظاہر کر دیتا ہوں چونکہ سر جارج روس کیپل[1] مجھ سے ذاتی طور پر ناراض ہے، لہٰذا جب میں اپنی طرف سے یہ حالات سنا دوں، تب آپ لوگ نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم پر اپنی طرف سے ایسی ہی مشورہ طلبی کا اظہار کریں۔ اصلیت سے وہ واقف ہو چکا ہوگا، اس لیے ان کی وساطت کو رد نہ کرے گا۔ آپ کے قیدیوں اور روپے کو واپس دے گا۔"[2]

سید عبدالجبار شاہ کا مکتوب

چنانچہ سید عبدالجبار شاہ نے بہ طورِ خود ایک مفصل خط اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ چک درہ کے نام بھیجا، جس میں مجاہدین کی پوری سرگزشت اختصاراً بیان کی ساتھ ہی بتایا کہ زمانہ نازک ہے۔ ایسے اسباب موجود ہیں جو مجاہدین کو آمادۂ جنگ کرنے کے محرک ہو سکتے ہیں اور اگر جنگ چھڑ گئی تو اندیشہ ہے کہ دوسرے عناصر بھی ساتھ ہو جائیں گے اور حکومت کے لیے سرحد میں ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ مجاہدین کا گزارہ اسی رقم پر ہے، جو ہندوستان سے وقتاً فوقتاً پہنچتی رہتی ہے۔ یہ رقم چھن چکی ہے۔ وہ لازماً برانگیختہ ہو کر مخالفانہ اقدامات کریں گے اور نفیرِ عام کی صورت میں ہزاروں آدمی ان کے ساتھ ہو جائیں گے۔ مناسب یہی ہے کہ ان کی ضبط شدہ رقم واپس کر دی جائے اور ان کے قیدی چھوڑ دیے جائیں۔

---

[1] یہ اس زمانے میں صوبہ سرحد کا چیف کمشنر تھا۔ اسے پٹھانوں میں بہت ہر دل عزیزی حاصل تھی اور انگریزی حکومت سرحدی معاملات میں اسی کی رائے پر عمل کرتی تھی۔ سید عبدالجبار شاہ کا مدعا یہ تھا کہ روس کیپل صوات کی بادشاہی کے سلسلے میں میرا مخالف ہے۔ اگر براہِ راست اسے لکھوں گا تو وہ جوشِ مخالفت کے باعث میری رائے کے خلاف عمل کرے گا۔ اگر میں اپنے طور پر ملاکنڈ ایجنسی کی معرفت صحیح رائے بھجواؤں گا اور صاحبزادہ عبدالقیوم کی طرف سے بھی اس کی تائید ہوگی تو روس کیپل مان جائے گا۔

[2] شہادت الثقلین، حصہ دوم قلمی نسخہ ص ۲۴۷۔

یہی مشورہ صاحبزادہ سرعبدالقیوم کی طرف سے بھی روس کیپل کے پاس پیش ہوا۔ سیّد عبدالجبّار شاہ فرماتے ہیں:

"میں نے ۱۲۔ جون ۱۹۱۷ء کو یہ تحریک کی تھی اور معلوم نہیں کتنے ہفتے یا مہینے بعد وہ سارے مجاہد قیدی بھی رہا ہو گئے اور صلح کا وہی مجوزہ وعدہ بھی ہو گیا۔ ضبط شدہ پیسے کے علاوہ غالباً دس ہزار روپیہ سالانہ بھی روس کیپل نے امیر نعمت اللہ کو دلوایا۔"[1]

صحیح صورتِ حال ان تفصیلات سے سب کو اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ مصالحت یا مفاہمت کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو چکی تھی۔ اغلب ہے، امیر نعمت اللہ کا خیال یہی ہو کہ اس طرح ہندوستان سے مالی امداد حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی اور جو مجاہدین ان کے پاس تھے، وہ قلتِ تعداد اور بے سروسامانی کے عالم میں کوئی بڑا کارنامہ انجام نہ دے سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے، یہ رائے عین خلوص پر مبنی ہو، تاہم ظاہر ہے کہ اصل معاملہ مجاہدین کی تعداد یا سروسامان کا نہ تھا۔ پیشتر جو دَور گزر چکے تھے، ان میں بھی جماعتِ مجاہدین بہ لحاظ شمار بارہ چودہ سو سے کبھی نہ بڑھی تھی اور اتنے جانباز بہتر سے بہتر سروسامان کے ساتھ بھی ہندوستان کے دامن سے محکومی کا دھبّا نہ دھو سکتے تھے۔

اس معاملے کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ جماعتِ مجاہدین ایک سو سال سے ایک خاص مقصد اور خاص نصب العین کی حامل چلی آتی تھی۔ کروڑوں کی آبادی کے اس وسیع جنگل میں جو کراکورم سے راس کماری تک پھیلا ہوا تھا، جماعتِ مجاہدین کے سوا کون سا گروہ تھا جو اجنبی حکومت کی پرچھائیں سے بھی بیزار و متنفّر ہوتا؟ امیر نعمت اللہ کے مجوزہ انتظام سے مجاہدین کے لیے اک گونہ سہولت کا بندوبست تو ضرور ہو گیا ہو گا، لیکن اس طرح اس نصب العین کی آبرو کیا باقی رہ سکتی تھی، جس کے لیے ہزاروں غیور جانباز سرحدی کوہستانوں میں اپنا خونِ حیات بے دریغ بہاتے رہے۔ ہزاروں نے اہل و عیال اور اعزّہ و اقارب سے دائمی مفارقت گوارا کی اور ہندوستان کے طول و عرض سے بے شمار روپیہ ہر سال سرحد پہنچتا رہا؟

---

[1] "شہادت الثقلین" حصہ دوم قلمی نسخہ ص ۴۴۷-۴۵۴۔

مرکز چمرکنڈ امیر عبدالکریم اور امیر نعمت اللہ کے عہد میں جماعتِ مجاہدین کے لیے ملک بھر کے اندر وسیع پیمانے پر کام ہوا۔ اس عہد میں میرے اندازے کے مطابق پنجاب کو نمایاں تقدم حاصل رہا، جو مجاہدین کے علاقے سے بہت قریب تھا، حالانکہ پہلے یہاں سرگرمیِ عمل کا کوئی خاص ثبوت نہیں ملتا۔

اسی زمانے میں مولانا عبدالرحیم جو سرحد آزاد میں محمد بشیر کے اختیاری نام سے مشہور عالم ہوئے اسمست پہنچے اور انھوں نے پورے یاغستان میں مرکزِ اسمست کے ماتحت شاخیں قائم کرنے کا قطعی فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ سرحد کشمیر سے وزیرستان تک ہر موزوں مقام پر چھوٹے چھوٹے مرکز قائم کر دیے گئے، جن کے مجاہدین کا وظیفہ یہ تھا کہ آس پاس کے قبائل میں جہاد کی روح تازہ رکھیں اور وقتاً فوقتاً انگریزی علاقوں پر حملے کراتے رہیں۔ اگرچہ ان حملوں سے کوئی بڑا مقصد حاصل نہ ہوسکتا تھا، تاہم ایک بدیہی فائدے سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا اور وہ یہ کہ انگریزی حکومت جنگ یورپ کے محاذوں کے علاوہ سرحد پر بھی توجہ جمائے رکھنے کے لیے مجبور ہوتی۔ نیز ان حملوں سے ہندوستان کی انقلابی تحریک کو یقیناً تقویت پہنچتی۔

ان میں سے چمرکنڈ کا مرکز باقی رہ گیا، جسے مولانا محمد بشیر کی وجہ سے ایسی شہرت حاصل ہوئی کہ جماعتِ مجاہدین کا اصل مرکز بھی اس کے سامنے ماند پڑ گیا۔ اسمست کا نام شاید گنتی کے اصحاب کو معلوم ہو، چمرکنڈ کا نام ہر ایک کی زبان پر تھا۔ اس مرکز کے مفصل حالات آیندہ بیان ہوں گے۔

امیر نعمت اللہ ہی کے زمانے میں لاہور کے کالجوں میں سے طلبہ کی ایک جماعت مرکزِ مجاہدین میں پہنچی۔ وہ سب سے پہلے افغانستان گئے۔ پھر بعض وہاں سے روس یا ترکی گئے۔ بعض واپس آکر جماعتِ مجاہدین میں شامل ہوگئے۔ ان کے مفصل حالات موقع پر لکھے جائیں گے۔ نیز سرحد کے طلبہ وہاں گئے۔ ان کے علاوہ عام مہاجرین کی تعداد چار پانسو سے کم نہ ہوگی، جو نہ سب کے سب وہاں رہے اور نہ عہدِ ہجرت نباہ سکے۔

مختلف لڑائیاں امیر نعمت اللہ کے عہد میں بہت سی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی ہوئیں، جن میں سے رستم اور چک درہ کی لڑائیاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ رستم کی لڑائیوں کا سلسلہ حاجی صاحب

ترنگ زئی کی تحریک پر شروع ہوا تھا اور مجاہدین نے ان میں سرگرم حصہ لیا تھا[1]۔ ان کی خبریں جماعت کی طرف سے بلیٹن کی شکل میں شائع ہوتی رہیں۔ ایک بلیٹن اتفاق سے مجھے مل گیا جس کے اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

۱۔ ۵۔شوال ۱۳۳۳ھ (۱۶۔اگست ۱۹۱۵ء) کو مجاہدین ہندوستانی سرحد برطانیہ میں گھس گئے اور ایک پہاڑی پر مورچہ بندی کر کے مقیم ہوئے۔ یہ پہاڑی موضع سرخوئی سے ایک میل کے قریب واقع ہے اور تیرہ میل سلطنت برطانیہ کے اندر۔ اس مقام سے قلعہ رستم اور کیمپ آٹھ میل پر ہیں اور دن کو نظر آتے ہیں۔

۲۔ ۹۔شوال ۱۳۳۳ھ (۲۰۔اگست ۱۹۱۵ء) کی شب کو مجاہدین نے کیمپ رستم پر حملہ کیا۔ کیمپ سے برابر مدافعانہ توپوں اور بندوقوں کے فیر ہوتے رہے۔ ... رستم کے باشندوں نے خبر دی کہ برطانیہ کے زخمی سولہ ڈولیوں میں مردان کو روانہ کیے گئے۔ گھوڑوں، اونٹوں اور خچروں کا بہت نقصان ہوا۔

۳۔ ۱۱۔شوال ۱۳۳۳ھ (۲۲۔اگست ۱۹۱۵ء) کی شب کو مجاہدین نے پھر حملہ کیا۔ مدافعت میں بہت سرگرمی سے توپیں اور بندوقیں تمام رات چلتی رہیں۔ رستم کے باشندوں کی زبانی معلوم ہوا کہ چالیس ڈولیاں زخمی سپاہیوں کی مردان گئیں۔

۴۔ ۱۳۔شوال ۱۳۳۳ھ (۲۴۔اگست ۱۹۱۵ء) کی شب کو مجاہدین نے پھر حملہ کیا اور چاہا کہ کیمپ میں گھس جائیں، لیکن چاروں جانب تاروں کا جنگلا لگا ہوا تھا اور خندقیں کھودی گئی تھیں۔ اس شب کی جنگ میں ایک انگریز افسر مارا گیا۔

۵۔ ۱۴۔شوال ۱۳۳۳ھ (۲۵۔اگست ۱۹۱۵ء) تمام رات بارش ہوتی رہی۔ نو بجے دن کو برطانیہ نے پانچ ہزار فوج، دو رسالوں اور اکیس توپوں کے ساتھ اچانک تین جانب سے مجاہدین پر

[1] مولوی عبدالرزاق کے بیان سے مترشح ہوا کہ ان لڑائیوں میں سب سے بڑا حصہ واقعی مجاہدین کا تھا۔ [2] سرکاوئی؟

حملہ کیا۔ مجاہدین نے جانبین کی پہاڑیاں پکڑ لیں اور گولہ باری ہونے لگی۔ ۔ ۔ نو بجے سے صبح چار بج گئے۔ آخر میں ایک کرنیل مارا گیا۔ فوج فرار ہو کر قلعہ رستم میں پناہ گزیں ہوئی۔ اس جنگ میں کوئی اہلِ ملک (مقامی) شریک نہ تھا۔ مجاہدین کے دس شہید اور چھ زخمی ہوے۔ برطانیہ کے تقریباً چھ سو مقتول اور زخمی ہوئے۔

اس سلسلے کے تمام بلیٹن ہاتھ آ جاتے تو سرحدی لڑائیوں کے متعلق ایک مفصّل و مستند دستاویز تیار ہو جاتی۔

امیر کی شہادت امیر نعمت اللہ نے ۱۹۱۷ء میں انگریزوں سے اک گونہ مصالحت کا جو انتظام کر لیا تھا، اس کی وجہ سے صرف مجاہدین ہی میں افسردگی پیدا نہ ہوئی بلکہ ہندوستان کے اندر جو لوگ فراہمیِ زر اور تیاریِ مجاہدین میں لگے ہوے تھے، ان میں سے بھی اکثر اس درجہ متاثر ہوے کہ انھوں نے اعانت سے دست کشی اختیار کر لی۔ مجاہدین میں اکثر لوگ ایسے تھے، جو نہ صرف اعزّہ و اقارب سے منقطع ہوے تھے بلکہ دنیوی اطمینان و فارغ البالی کی امیدوں کے بھی تمام چراغ گُل کر چکے تھے۔ جب انھیں امیر کی مصالحانہ روش میں کسی خوش آیند تغیّر کی توقّع نہ رہی تو ایک نوجوان نے موصوف کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا خیال یقیناً یہ ہو گا کہ یہ رکاوٹ دور ہو جائے گی تو جہاد کے لیے بہترین صورتیں نکل آئیں گی۔ اس نوجوان کا اصل نام عبدالرشید اور اختیاری نام محمد یوسف تھا۔ وہ ایک خوش حال گھرانے کا چشم و چراغ تھا اور اس کے والد غالباً ضلع مردان میں مدارس کے انسپکٹر تھے۔ محمد یوسف نے شاید بی۔ اے تک تعلیم پائی تھی۔ وہ ان چودہ طلبہ میں سے تھا، جو لاہور سے اسمست پہنچے تھے۔ پہلے اپنے رفقاء کے ہمراہ کابل چلا گیا، جہاں امیر حبیب اللہ خاں کی حکومت نے ان سب کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔ پھر وہ رہا ہوا تو مولانا محمد بشیر اسے کابل سے اپنے ساتھ یاغستان میں لے آئے۔ مولانا اسے اپنے فرزند کے برابر سمجھتے تھے۔ کچھ مدت وہ انھیں کے ساتھ دو روز [illegible] پھر امیر نعمت اللہ نے اسے اپنا معتمد خصوصی بنا لیا۔ اس نے بتاریخ ۱۷ شعبان [illegible] بروز یک شنبہ چاشت کے وقت امیر نعمت اللہ کو شہید

کر ڈالا۔ تفصیل یہ بتائی گئی کہ امیر مرحوم اپنے مردانہ مکان کی چھت پر بیٹھے تھے۔ تعمیر کے سلسلے میں کوئی ہدایت دینے کے لیے اٹھے اور ایک طرف کو آگے آگے چل پڑے۔ یوسف ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے یکایک پستول نکالا اور امیر کے سر پر دو یا تین مرتبہ فائر کیے۔ امیر گرے اور اسی وقت جاں بحق ہو گئے۔ شہادت کے وقت ان کی عمر پینتالیس سال کی تھی ؂

یوسف بہ اطمینان نیچے اترا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ آیا اس کی خواہش یہ تھی کہ جماعت کو اکٹھا کر کے نئے امیر کے انتخاب و بیعت کا انتظام کرائے یا وہ اسمست سے نکل کر کسی ایسے علاقے میں پہنچ جانا چاہتا تھا، جہاں اس پر ہاتھ نہ ڈالا جا سکتا۔ لیکن مکان کے صحن میں مختلف لوگوں نے فائروں سے اسے آناً فاناً ختم کر دیا ؂

مولانا محمد بشیر کے متعلق شبہات مولانا محمد بشیر اس وقت چمرکنڈ کی طرف سرحد آزاد میں تنظیم کا کام کر رہے تھے۔ چونکہ انھیں محمد یوسف سے خصوصی تعلق تھا، اس لیے جماعت کے مختلف آدمیوں کے دل میں سوءِ ظن پیدا ہوا کہ وہی واقعۂ قتل کے حقیقی محرک ہیں۔ انھیں امیرِ مرحوم کی فاتحہ خوانی اور نئے امیر کی بیعت کے سلسلے میں اسمست آنا تھا۔ خیر خواہوں نے مشورہ دیا کہ نہ جائیں، مبادا ان پر خواہ مخواہ قتل کا مقدمہ قائم کر دیا جائے۔ انھوں نے فرمایا کہ نہ اپنے متعلق سوءِ ظن کا روادار ہو سکتا ہوں اور نہ آپ لوگوں کے مشورے پر عمل کر کے سوءِ ظن کو یقین کے درجے پر پہنچا دینا میرے لیے مناسب ہے۔ چنانچہ وہ بے باکانہ اسمست گئے اور مطالبہ کیا کہ سب سے پہلے پوری چھان بین کر لی جائے۔ اس طرح انھوں نے خود تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرائی۔ جب وہ ہر لحاظ سے بری الذمہ ثابت ہوئے تو نئے امیر کی بیعت کی ؂

خود مولانا محمد بشیر نے کابل میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ یوسف بہت ہی جوشیلا نوجوان تھا۔ اسلامیت اور آزادی کے عشق میں وہ ہر قربانی کے لیے ہمہ تن تیار رہتا تھا۔ بعض کارکنانِ جماعت نے امیر صاحب کے حالات اس کے سامنے ایسے انداز میں بیان کیے کہ اسے اشتعال آ گیا۔ مولانا فرماتے تھے کہ یوسف کے سامنے صورتِ حال کو اشتعال انگیز انداز میں پیش کرنے والے اصحاب

میں سے ایک مولوی فضل الٰہی بھی تھے۔ معتمد خصوصی کی حیثیت میں اسے غالباً ایسی باتیں معلوم ہو گئی ہوں گی، جن سے دوسروں کے بیانات کی تصدیق ہوتی تھی۔ مولوی عبیداللہ نے ۱۹۲۱ء کے مقدمے میں، جس کا ذکر آگے آئے گا۔ بیان کیا تھا کہ اکتوبر یا نومبر ۱۹۱۹ء میں مولوی فضل الٰہی کے مکان پسر وزیر آباد میں انگریزوں سے امیر صاحب کی صلح کا ذکر ہوا تھا، نیز یہ کہ جو چندہ بھیجا جاتا ہے، مجاہدین پر صرف نہیں ہوتا، پھر خود مولوی عبیداللہ اسمست پہنچے اور امیر صاحب سے یہ سوال کیا۔ انھوں نے اعتراف کیا صرف ظاہرداری کی صلح کی ہے تاکہ جو چندہ ہندوستان سے آتا ہے اس میں رکاوٹ پیدا نہ ہو لیکن امیر کے کاتب (سکرٹری) یعنی یوسف نے علیحدگی میں بتایا کہ امیر کا یہ بیان صحیح نہیں دراصل اس نے صلح کر لی ہے، عیش میں پڑ گیا ہے اور جہاد کا کام ترک کر دیا ہے۔

غصے اور رنج کا بڑا سبب یہ تھا کہ مصلحت آمیز مصالحت کے باعث نہ صرف جہاد کے کام میں رکاوٹ پیدا ہوئی تھی بلکہ ہندوستان کے اندر نظام اعانت کا سلسلہ بھی درہم برہم ہو رہا تھا۔ بہر حال حقیقی اسباب خواہ کچھ ہوں اس رنجدہ صورتِ حال میں امیر صاحب کی جان بھی گئی، جو بہت بڑے کارناموں کی صلاحیت رکھتے تھے اور ایک پُرخلوص نوجوان کی زندگی بھی ختم ہوئی جو ملّت کے اہم مقاصد میں بہ درجہا بہتر خدمات کا موجب بن سکتا تھا۔

امیر صاحب کے شمائل و خصائل مولوی محمد علی مرحوم قصوری کابل سے نکل کر یاغستان چلے گئے تھے تو چمرکنڈ ہوتے ہوئے اسمست بھی پہنچے تھے۔ انھوں نے امیر نعمت اللہ کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ لکھتے ہیں:

> مرحوم ایک بھاری بھرکم، خوب صورت، وجیہہ اور دراز قامت جوان تھے۔ گفتگو میں نہایت شائستہ، متین اور سنجیدہ۔ بڑے زیرک اور مردم شناس آدمی تھے۔ ان کے خطبات خاصے دل نشین ہوتے تھے۔ خوب صورت ترشی ہوئی ڈاڑھی، سر پر خوب صورت ستھرے پٹے رکھتے تھے۔ لباس میں پٹنہ اور یو۔ پی کا قدیم غرارہ لمبا کرتا اور تکمہ دار صدری پہنتے تھے۔ سر پر عمامہ اور ہاتھ میں نفیس چھڑی[1]۔

[1] مشاہداتِ کابل و یاغستان ص ۱۰۵ [partially cut off]

مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمان امراء و مشائخ کی طرح وہ عورتوں کے بے حد شوقین تھے۔ ایک حافظ صاحب کو اپنی جگہ امام مقرر کر رکھا تھا۔ کبھی کبھار مسجد میں تشریف لاتے تو ایک بندوق بردار سنگین چڑھائے ان کے پیچھے حفاظت کے لیے کھڑا رہتا۔ نماز ہو چکتی تو بندوق بردار امیر صاحب کو زنان خانے میں پہنچا کر واپس آتا اور خود نماز ادا کرتا[1]۔

بعض دوسرے مخلص کارکنوں کے بیانات سے بھی ان امور کی تصدیق ہوتی ہے[2]، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ امیر نعمت اللہ بڑے اچھے خصائص کے حامل تھے۔ انگریزوں سے مصالحت کے باعث رائے عامہ میں ان کے متعلق انقلاب پیدا ہوا، ورنہ امید تھی کہ ان کا عہد جماعت کے لیے بہت خوش گوار ہوتا۔

حافظ عنایت اللہ صاحب (خطیب جامعہ اہل حدیث گجرات) اکتوبر ۱۹۱۵ء میں اسمست گئے تھے اور عید قربان کی نماز امیر نعمت اللہ کی اقتدا میں پڑھی تھی۔ انھوں نے دو باتیں بہ طور خاص محسوس کیں: اوّل یہ کہ زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے کوئی قابلِ ذکر انتظام موجود نہ تھا، دوسرے یہ کہ خاندانِ امارت کے سب اصحاب متاہل تھے، مقامی لوگ بھی شادیاں کر لیتے تھے، لیکن ہندوستانی مجاہدین عموماً تجرّد کی زندگی بسر کرتے۔ حافظ صاحب نے ان دونوں باتوں کے متعلق امیر صاحب کو توجہ دلائی، مگر کوئی اطمینان بخش جواب نہ ملا۔

اولاد امیر نعمت اللہ کی شادی ان کے عمِ محترم مولانا امان اللہ کی صاحبزادی حکیمن بانو سے ہوئی تھی، جو ان کے جانشین امیر رحمت اللہ کی حقیقی بہن تھی۔ تین صاحبزادے یادگار چھوڑے: برکت اللہ، صبغت اللہ اور آیات اللہ۔ امیر کی وفات کے وقت تینوں بہت چھوٹے تھے۔ بڑے صاحبزادے برکت اللہ کا نکاح امیر رحمت اللہ کی دختر رضیہ سے ہوا۔ ان کے بڑے بیٹے کا نام نور الہدیٰ ہے۔ آگے چل کر جماعتِ مجاہدین نے "المحرض" "اور المجاہد" کے نام سے جو اخبار یکے بعد دیگرے جاری کیے، ان پر نور الہدیٰ ہی کا نام بہ طورِ مدیر لکھا جاتا تھا۔

---

[1] "مشاہدات کابل و یاغستان" ص ۱۰۸۔ [2] علاوہ بیانات مختلف اصحاب کے جو میں نے مقدمے میں دیے، ان کا ذکر آگے آئے گا۔

چھٹا باب

کابل میں ترکی اور جرمن وفد

جرمنوں کی امیدیں جرمنوں میں جب سے یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ وہ سلطنتِ برطانیہ کی جگہ لے لیں اور اپنے تجارتی و سیاسی روابط کو عالم گیر بنا دیں، اسی وقت سے وہ ہندوستان کی سیاسی سرگرمیوں کو بھی اپنی خاص امید گاہ سمجھنے لگے تھے۔ تقسیم بنگال کے بعد یہاں دہشت انگیزی کا خاصا خطرناک دور شروع ہو گیا تھا۔ اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے جرمنی کے مشہور جرنیل اور مصنّف فان برن ہارڈی نے ۱۹۱۱ء میں لکھا تھا کہ امید ہے، بنگال کے ہندو جن کی سیاسی سرگرمیاں عالم آشکارا ہیں، اپنے مسلمان ہم وطنوں سے اتحاد کر لیں۔ ان عناصر کے اتحاد سے ایک ایسا خطرہ صورت پذیر ہو جائے گا جو انگلستان کے تسلّط کی بنیادیں ہلا سکتا ہے۔

حرّیت پرست ہندوستانیوں نے امریکہ اور یورپ کے مختلف ملکوں میں بیٹھ کر آزادیِ وطن کے لیے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ ان میں سے لالہ ہردیال ایم۔ اے کی "غدر پارٹی" کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ پہلی جنگِ یورپ کے آغاز پر ایک شخص چمپاکرمن پلائے زیورچ میں مقیم تھا۔ اس نے جرمنی میں ایک انجمن قائم کی، جس کا نام "انڈین نیشنل پارٹی" رکھا۔ لالہ ہردیال ایم۔ اے، مولانا برکت اللہ بھوپالی، ڈاکٹر تارک ناتھ داس، چندراکے، چکرورتی، ہرمبالال گپتا وغیرہ اس میں شریک ہو گئے۔ یہ جرمنی کی وزارتِ خارجہ سے وابستہ تھے۔ ان کی سرگرمیوں کے مفصّل حالات پیشِ نظر موضوع سے خارج ہیں۔

ہندوستان میں ہنگامے کی تدبیریں پہلی جنگِ یورپ کے دوران میں جرمنوں کی خواہش

یہ تھی کہ کسی تدبیر سے ہندوستان میں ہنگامہ بپا کر دیں تاکہ انگریز ہندوستان سے بہ اطمینان سپاہ بھرتی کر کے بیرونی محاذوں پر بھیجنے کے بجائے خود وہاں کے ہنگامے میں الجھ جائیں۔ اس مقصد کے لیے دو منصوبے مرتّب کیے گئے۔ ایک یہ کہ ان بنگالیوں کو زیادہ سے زیادہ اسلحہ پہنچا دیے جائیں، جو دہشت انگیز سرگرمیوں میں مشغول تھے۔ یہ عموماً ہندو تھے اور ان کا اثر و رسوخ بھی ہندوؤں ہی تک محدود تھا۔ دوسرا منصوبہ یہ تھا کہ افغانستان سے ہندوستان پر حملہ کرا دیں نیز یاغستانی قبائل کے لیے فوجی تربیت اور اسلحہ کا انتظام کر دیں۔ اس طرح ہندوستان کی شمالی و مغربی سرحد پر خونریز جنگ کی طرح ڈال دیں۔

بنگال میں اسلحہ پہنچانے کی کوشش بنگال میں اسلحہ پہنچانے کے منصوبے کو لباسِ عمل پہنانے کا کام بٹاویہ، بنکاک اور شنگھائی کے جرمن قونصلوں سے متعلق تھا۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ایک جہاز میں تیس ہزار بندوقیں، بے شمار کارتوس اور دو لاکھ روپیہ بھیجا جائے اور یہ جہاز خلیج بنگال کے ان جزیروں میں لنگر انداز ہو، جو نواکھالی کے قریب میگھنا دریا کے دہانے پر واقع ہیں۔ بنگالیوں کی انقلابی پارٹی نے فیصلہ کر لیا کہ جہاز کے پہنچتے ہی ہتھیار اپنے کارکنوں میں تقسیم کر دیں۔ ان ریلوں کے تمام پل توڑ دیں، جو مختلف صوبوں سے بنگال پہنچتی تھیں۔ اس طرح بنگال کو باقی ہندوستان سے منقطع کر کے اس پر قابض ہو جائیں۔ پھر جرمنی سے فوجوں اور اسلحہ کی بہم رسانی باقاعدہ شروع ہو جائے۔

جرمنوں نے غالباً تین مرتبہ اسلحہ پہنچانے کی کوشش کی، لیکن سوءِ اتفاق سے تینوں کوششیں ناکام رہیں۔ اس اثناء میں سازش کا سراغ مل گیا اور وہ بنگالی گرفتار ہو گئے یا مارے گئے، جو اسلحہ اتروانے کے ذمّہ دار تھے۔ انگریزی حکومت نے پورے ساحلی علاقے میں ایسے انتظامات کر دیے کہ کوئی جہاز ہندوستان تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔ ایک جہاز میں تھوڑا سا سامان آیا، وہ راستے ہی میں پکڑا گیا۔[1]

---

[1] جرمن کوششوں کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سڈیشن کمیٹی کی رپورٹ ص ۱۱۹-۱۲۵۔ یہ عام طور پر رولٹ رپورٹ کے نام سے مشہور ہے۔

تبصرہ یہ منصوبہ بہ لحاظ تجویز بھی خام تھا اور اس کے لیے جو تنظیمات کی گئیں، وہ بھی سراسر ناقص تھیں۔ سمندروں پر برطانوی بیڑے کو جو تسلّط حاصل تھا، اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسلحہ سے بھرا ہوا جہاز پہنچایا ہی نہ جا سکتا تھا۔ اگر جہاز پہنچ بھی جاتا تو خفیہ خفیہ اسلحہ کی اتنی بڑی مقدار اتاری نہ جا سکتی تھی منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو جب بھی بیس تیس ہزار بندوقوں اور ریوالوروں سے کچھ نہ بنتا۔ سرسری ہنگامہ تو ضرور پیدا کیا جا سکتا تھا، لیکن یہ امید نہ ہو سکتی تھی کہ منظم جنگ کرنے والوں کی بڑی جماعت مہیا کی جا سکے گی۔ بے شبہہ انقلابیوں میں بڑے بڑے جانباز موجود تھے، لیکن ان کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ انھیں اپنے جیسے جانباز زیادہ تعداد میں نہ مل سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جرمنوں پر اضطرار کی حالت طاری تھی اور وہ نتائج کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کہیں نہ کہیں ہنگامہ پیدا ہو جائے تاکہ برطانیہ کی توجہ یورپ کے میدانوں سے دوسری طرف منتقل ہو۔ غرض یہ منصوبہ اصلاً بھی غیر موثر تھا اور اسے پورا کرنے کے لیے ٹھیک ٹھیک کوششیں بھی نہ ہو سکیں۔

ترکی اور جرمن مشن اس سے بہ درجہا زیادہ معقول و مؤثر منصوبہ وہ تھا، جس کا تعلق افغانستان اور یاغستان سے تھا۔ اسے کامیاب بنانے کے لیے جرمنوں اور ترکوں کا ایک وفد کابل پہنچا۔ فان ہن تیگ[1] جرمن وفد کا سرخیل اور قیصر جرمنی کا نمائندہ تھا۔ کاظم بے ترکی وفد کا قائد تھا، جسے سلطان محمد خامس عثمانی نے بہ حیثیت خلیفۃ المسلمین اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔ ان کے ساتھ کچھ ہندوستانی اصحاب بھی تھے، مثلاً راجا مہندر پرتاپ، مولانا برکت اللہ بھوپالی[2]۔ کچھ فوجی افسر بھی تھے، جنھیں

---

[1] VON HENTIG

[2] مولانا اصلاً فتح پور کے باشندے تھے، بہ سلسلۂ تعلیم بھوپال گئے، اس لیے بھوپالی مشہور ہوئے۔ خود بھی اپنے آپ کو بھوپالی لکھتے تھے۔ قرآن مجید اور صحاح ستہ کے حافظ تھے۔ مبئی میں میٹرک تک انگریزی پڑھی۔ پھر تبلیغِ اسلام کے جوش میں انگلستان چلے گئے۔ وہاں سے امریکہ پہنچے۔ ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر رہے۔ ہر مقام پر تبلیغِ اسلام، مسلمانوں کی تنظیم اور آزادیِ وطن کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ امیر حبیب اللہ خاں نے انھیں باصرار اپنے پاس رکھا، پھر روس چلے گئے، لینن ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ وہاں سے جرمنی، فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں رہے، آخر کیلیفورنیا جا کر وفات پائی۔

یاغستان میں عسکری تربیت کی غرض سے ساتھ لے لیا گیا تھا۔ فوجی افسروں میں ترکوں کے علاوہ پٹھان بھی تھے، جو فرانس کے جنگی میدانوں سے بھاگ کر جرمنوں کے پاس پہنچے تھے یا جرمنوں کے ہاتھ اسیر ہو گئے تھے۔ نمایندۂ قیصر کا وظیفہ یہ تھا کہ امیر حبیب اللہ خاں والیِ افغانستان کو آلات و اسلحہ، فوج اور زر و مال کی زیادہ سے زیادہ امداد کا یقین دلائے۔ خلیفۃ المسلمین کے نمایندے کی ممتاز حیثیت مذہبی تھی۔ وہ افغانستان کے امیر، وہاں کے باشندوں اور یاغستانی قبائلیوں کی مذہبی اور دینی حمیت کو بیدار کرنا چاہتا تھا۔ یاغستان میں منظم ترین جماعت مجاہدین کی تھی، جو دینی اور سیاسی دونوں حیثیتوں کی حامل تھی اور جوہر مجاہدانہ سعی کو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کامیاب بنا سکتی تھی۔

یہ مشن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا اور والیِ افغانستان انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے ہندوستان پر حملہ کر دیتا تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ نتیجہ کیا نکلتا، لیکن اس حقیقت میں شبہہ نہیں کہ اس وقت ہندوستان میں فوجی قوت گیارہ ہزار یا پندرہ ہزار سے زیادہ نہ تھی اور افغانوں یا یاغستانیوں کو اسلحہ مل جاتے تو یقیناً یہاں حد درجہ نازک صورتِ حال پیدا ہو جاتی۔ اب اس پوری داستان کی حیثیت محض "کاشکے" کی ہے اور خدا جانے تاریخ میں ایسے کتنے "کاشکے" موجود ہیں:

یک کاشکے بود کہ بہ صد جا نوشتہ ایم

افغانستان کی فضا اُس وقت افغانستان کی فضا مشن کی کامیابی کے لیے ساز گار نہ تھی۔ حبیب اللہ خاں مرحوم فرمانروائے افغانستان طبعاً بھی عزم و ہمت کا آدمی تھا نیز اس نے اپنی زندگی کا سانچا اس نوع کا بنا لیا تھا کہ کسی ایسے اقدام کی چنداں امید نہ ہو سکتی تھی جس میں ہر قدم پر محنت، مشقت، جفاکشی، جانبازی یا چرچل کے تاریخی الفاظ کے مطابق "خون" اور "آنسوؤں" کو قبول کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ بے شک اس اقدام کے ساتھ افغانستان کے لیے بہتری کی توقعات وابستہ کی جا سکتی تھیں، اس کے علاوہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے ایشیا کو انگریزوں کے تسلّط سے نجات دلا دینے کے امکانات بھی موجود تھے، لیکن ایسے منصوبوں کو وہی جوانمرد کامیاب بنا

سکتے ہیں جو :

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن بر آید

کے مسلک پر عمل پیرائی کے خوگر ہوں عشق اور بوالہوسی میں فرق و امتیاز کا مقام یہی ہے، غالب کیا خوب کہ گیا ہے :

با رقیباں ہم فنیم ، امّا دعوئ گاہِ شوق
مُردن است از ما وزیں جنسِ گرانجاں زیستن

جہاں زندگی کی محبت مقاصد پر غالب آجائے ، وہاں کسی اقدام سے گراں قدر نتائج کی امید کیوں کر کامیاب ہو سکتی ہے ؟

امیر حبیب اللہ خاں کے بھائی سردار نصر اللہ خاں کے دل میں انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ موجود تھا، لیکن وہ بیچارا تنہا کیا کر سکتا تھا۔ مولانا محمد بشیر نے امیر سے بات چیت کر کے اسے ایک حد تک عمل و حرکت پر آمادہ کر لیا تھا ، بلکہ وہ امیر کے لیے آزاد قبائل کے سرداروں اور ملاؤں سے بیعت نامے بھی حاصل کر لائے تھے تاہم پورے معاملے کی حیثیت ایسی تھی جیسے کسی کو بہ زور کھینچ کر اندر سے باہر لانے کی کوشش کی جائے ۔ تھوڑی دیر تک امید بندھی رہی کہ کاروبار حسبِ مراد ہو رہا ہے، پھر یکایک ایسے اسباب پیدا ہو گئے یا پیدا کر دیے گئے کہ امیر کی بہانہ جو اور استراحت دوست طبیعت سہارا پا کر آسودگی کے لیے وقف ہو گئی ۔

اقدام کی شرط امیر ہندوستان پر حملے کے لیے تیار ہوا تو اس نے یہ شرط پیش کر دی کہ حملے سے پہلے انڈین نیشنل کانگرس سے معاہدہ ہو جانا چاہیے اور اس کام کے لیے مولانا محمد علی یا اجمل خاں یا پنڈت موتی لال نہرو یا اس پایے کے کسی دوسرے ہندوستانی لیڈر کو کابل آنا چاہیے[۱]

یہ شرط اصولاً ہر اعتبار سے معقول اور درست تھی۔ اگر ہندوستان کی کوئی ایسی جماعت امیر کا

---

[۱] " مشاہدات کابل و یاغستان" ص ۳۲ ۔

ساتھ دینے پر ہمہ تن آمادہ نہ ہو جاتی، جسے یہاں کی بہت بڑی اکثریت کا اعتماد حاصل ہوتا تو افغانوں کا ہر اقدام خطرناک پیچیدگیوں کا باعث ہو سکتا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ اول دوران جنگ میں ایسی کوئی شرط امیر کی خواہش کے مطابق پوری نہ ہو سکتی تھی، دوم ایسی شرطوں کی تکمیل پر وسیع جنگی اقدامات کو موقوف رکھنا سراسر غیر معقول تھا، البتہ میدانِ عمل میں اترنے اور کام کا ایک حصہ پورا کر لینے کے بعد حسب صواب دید معاہدے کیے جا سکتے تھے، سوم مقصد یہ نہ تھا کہ افغانستان ہندوستان پر قابض ہو جائے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستان کے لیے آزادی کا بندوبست ہو جائے اور آزاد ہندوستان افغانستان کے لیے بدرجہا زیادہ مفید ہو سکتا تھا۔

حکومت موقتہ کا قیام اس زمانے میں متعدد ہندوستانی کابل پہنچے ہوئے تھے، جو مختلف ذریعوں سے امیر کو حرکت میں لانے کے لیے کوشاں تھے مثلاً مولانا محمد بشیر جو جماعت مجاہدین کے وکیل اور نمایندے تھے۔ مولوی محمد علی قصوری جنھوں نے صرف مقاصد اسلامیت و آزادی کو پیش نظر رکھ کر حکومت افغانستان کی ملازمت اختیار کی تھی۔ مولانا عبید اللہ سندھی جنھیں حضرت شیخ الہند مرحوم نے جہاد آزادی کو تقویت پہنچانے کی غرض سے کابل بھیجا تھا۔ مولانا عبید اللہ کے علاوہ مولانا منصور انصاری اور مولانا سیف الرحمٰن بھی اسی مقصد کے لیے بھیجے گئے تھے۔ راجا مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ بھوپالی خود وفد کے ساتھ آئے تھے۔ نیشنل کانگرس سے معاہدے کی کوئی شکل بنتی نظر نہ آئی تو ان اصحاب نے سوچا کہ ہندوستانیوں کی ایک عارضی حکومت بنا لینی چاہیے اور وہ افغانستان سے معاہدہ کر کے امیر حبیب اللہ خاں کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دے دے۔

اس عارضی حکومت میں راجا مہندر پرتاپ کو صدر بنایا گیا۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ مولوی محمد علی قصوری کو وزارت خارجہ کا منصب سونپا گیا۔ مولانا محمد بشیر کو وزارت دفاع پر مامور کرنے کے علاوہ یاغستان سے لشکر تیار کرنے کا ذمہ دار بنا دیا گیا اور حملے کی ایک منظم سکیم تیار کر لی گئی۔[1]

---

[1] "مشاہدات کابل و یاغستان" ص ۳۳۔ مرحوم عبد الرحمٰن صدیقی نے جو مشرقی پاکستان کے عارضی گورنر بھی رہے تھے لکھا ہے کہ اس سے پیشتر

(آگے سامنے صفحے پر ملاحظہ فرمائیے)

مولانا عبید اللہ فرماتے ہیں کہ حکومت موقتہ میں ہندوستانیوں کے علاوہ ترک اور جرمن بھی شریک تھے۔[1] یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ ترکوں اور جرمنوں کی شرکت کس لحاظ سے مناسب تھی؟

منصوبہ ختم | امید کی کلیاں پھر شگفتہ ہو گئیں۔ امیر نے کارگاہ اسلحہ کے تمام انگریز ملازموں کو برطرف کر دیا۔ یہ پہلا قدم تھا۔ اس اثنا میں انگریز بھی سرگرم عمل رہے۔ انھوں نے ایک بہت بڑے پیر کو ہم نوا بنا لیا، جسے افغانستان میں وسیع اثر و رسوخ حاصل تھا بلکہ خود امیر بھی اسی کا معتقد تھا۔ امیر نے غالباً دعائے خیر کے لیے ہندوستان پر حملے کے منصوبے کا ذکر کیا۔ پیر نے کہا کہ ٹھہرو، میں تین روز استخارہ کرنے کے بعد جواب دوں گا۔ چوتھے روز بتایا کہ ہندوستان پر حملہ افغانستان کے لیے تباہی کا موجب ہوگا۔[2] اس کے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہو گیا گویا مشن کے کامیاب ہونے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔

کہا جاتا ہے کہ اس کارکردگی کے صلے میں انگریزوں نے پیر صاحب کو پچاس لاکھ روپے دیے اور

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵۱۶) ۳ ایک عارضی حکومت برلین میں بھی قائم ہوئی تھی، جس میں مولانا برکت اللہ کو وزیر خارجہ بنایا گیا تھا۔ نیز جرمنی اور ترکی وفد عراق و ایران کے راستے آیا تھا۔ ایک مقام پر معلوم ہوا کہ شمال سے روسی فوجیں اور جنوب سے انگریزی فوجیں بڑھ رہی ہیں اور بیچ میں فاصلہ اس قدر کم رہ گیا ہے کہ وفد افغانستان نہ پہنچ سکے گا۔ مولانا برکت اللہ نے کسی رہبر کی امداد کے بغیر صرف ستاروں کو دیکھ دیکھ کر رہنمائی کی اور رات کی تاریکی میں خطرناک حصے سے وفد کو نکال لائے۔ وہ ساتھ نہ ہوتے تو وفد کبھی افغانستان نہ پہنچ سکتا۔ (ملاحظہ ہو رسالہ "اردو" بابت جولائی ۱۹۴۱ء۔ مولانا برکت اللہ پر مقالہ)۔

راجا مہندر پرتاپ کے بیان کے مطابق وہ خود اس وقت تک کے لیے صدر مقرر ہوئے جب تک کانگرس حکومت نہ بنالے۔ مولانا برکت اللہ وزیر اعظم اور مولانا عبید اللہ سندھی وزیر داخلہ بنائے گئے۔ (میری داستانِ حیات انگریزی ص ۵۱)۔

[1] "کابل میں سات سال" ص ۱۶۔ [2] "مشاہدات کابل و یاغستان" ص ۳۴۔ افسوس کہ مولوی صاحب نے اس پیر کا نام نہیں لکھا اور ایسے معاملات میں قیاس آرائی قطعاً غیر مناسب ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت صاحب چار باغ تھے جنھیں اس کام کے لیے مکہ معظمہ سے بلایا گیا تھا۔ (مولانا عبید اللہ کی ذاتی ڈائری)۔

امیر حبیب اللہ خاں کو آٹھ کروڑ روپے کا لالچ دیا گیا[۱]

اگر یہ درست ہے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ ساڑھے آٹھ کروڑ روپے اتنے بڑے کام کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ اگر افغانستان حملہ کر دیتا اور لڑائی چھڑ جاتی تو اس سے بدرجہا زیادہ رقم حفظ و دفاع کی تدبیروں میں صرف ہو جاتی۔ جانی نقصان اس کے علاوہ ہوتا۔ یہ بھی غیر اغلب نہ تھا کہ ہندوستان انگریزوں کے ہاتھ سے نکل جاتا اور گزشتہ چالیس سال کی تاریخ بالکل دوسرے رنگ میں لکھی جاتی۔

مولانا عبید اللہ کا بیان مولانا عبید اللہ مرحوم نے جرمن اور ترکی مشن کی ناکامی کے بعض دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً:

۱۔ جرمن اور ہندوستانی ممبر آپس میں یکجہتی قائم نہ رکھ سکے، جو ایسی مہمات کے لیے ضروری ہے۔

۲۔ ہندوستانی ممبر سارا الزام جرمنوں پر تھوپتے تھے، جرمن ممبر شکایت کرتے تھے کہ برلین اور استنبول میں جو سبز باغ دکھائے گئے تھے، ان کا عُشرِ عشیر بھی یہاں نظر نہیں آتا۔

۳۔ مشن کا جو مقصد تھا، اس کے مطابق تیاری نہ کی گئی۔

۴۔ مولانا نے راجا مہندر پرتاپ کو بعض کوتاہیوں کی طرف متوجہ کیا تو انھوں نے کہا کہ جرمن چانسلر نے بھی توجہ دلائی تھی اور میرے لیے آسانی پیدا کرنی چاہی تھی مگر میں نے خلاف شان سمجھ کر انکار کر دیا[۲]۔

ان امور پر بحث کی ضرورت نہیں، بنیادی چیز وہی ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے یعنی امیر حبیب اللہ خاں کی بے عزمی اور تن آسانی۔ اگر یہ چیز حائل نہ ہوتی تو نہ جرمنوں اور ہندوستانیوں میں اختلاف پیدا ہوتا اور نہ وہ ایک دوسرے کو ملزم قرار دینے کے لیے مضطرب ہوتے۔

مولانا عبید اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ راجا مہندر پرتاپ دراصل ہندو مہا سبھا سے وابستہ تھے۔

---

[۱] "مشاہدات کابل و یاغستان" صفحہ ۳۵۔ [۲] "کابل میں سات سال" صفحہ ۵۲، ۵۳۔

وہ صرف اس غرض سے ساتھ آئے تھے کہ اگر افغانستان جرمنی اور ترکی کے اتحاد میں شامل ہونے کا قصد کرے تو اس کی اطلاع پنڈت مدن موہن مالوی کو ہوجائے، نیز جہاں تک ممکن ہو ہندوستان کی سرحد سے افغانی حملے کی مصیبت کو ٹالا جائے اور جو پوزیشن امیر افغانستان کی ہو، وہی مہاراجا نیپال کو دلائی جائے ۔

ممکن ہے مولانا کا تاثر بالکل درست ہو، لیکن اس صورت میں صحیح راہِ عمل یہ تھی کہ وفد کو افغانستان لایا ہی نہ جاتا۔ کہ دیا جاتا کہ افغانوں سے کوئی تعلق پیدا ہی نہ کرنا چاہیے اور یہ بہت آسان تھا۔ خود وفد کو افغانستان لاکر ناکام واپس لے جانا راجا مہندر پرتاپ یا کسی دوسرے ہندو کارکن کے لیے باعثِ عزت نہ تھا۔ مولانا نے تو یہ بھی لکھ دیا ہے کہ برلین کی " انڈین نیشنل پارٹی " نے اپنی ہندو تحریک کو ہندوستانی تحریک کا رنگ دینے کی غرض سے مولانا برکت اللہ کو برائے نام اس میں شریک کر لیا تھا، لیکن مولانا برکت اللہ اتنے سادہ لوح نہ تھے کہ اپنے ہندو رفیقوں کی فرقہ پرستی کے لیے عوام فریب پردہ بننا گوارا کر لیتے ۔

مولانا ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ وفد امیر حبیب اللہ خاں کو جنگ میں شامل کرنا چاہتا تھا اور امیر کو انگریزوں نے بہت سی مراعات کی امید دلا رکھی تھی، نیز ارکانِ وفد کے سامنے کوئی تسلی بخش پروگرام نہ تھا اور ان کا باہمی اختلاف سب باتوں پر مستزاد ہوا۔ مستقبل ہند کے متعلق ہمارے نظریات چونکہ مشن کے ممبروں سے پوری طرح نہ ملتے تھے، اس لیے ہمیں دربار میں جلدی بڑھنے کا موقع مل گیا۔ حکومت نے مشن کے ممبروں کو آخری جواب دینے سے پہلے ہمیں ان سے ملنے کے سامان بہم پہنچا دیے اور اس طرح ان کے خواب کو مختلف تعبیرات سے پریشان کرنے کی کوشش کی گئی[1]

---

[1] کابل میں سات سال" ص۸۱ ۔ اس کا مطلب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے متعلق مولانا کا نظریہ چونکہ وفد سے مختلف تھا، لہٰذا امیر افغانستان کی نظروں میں مولانا کا اعتبار بڑھ گیا اور انھوں نے اپنے نظریے کی بناء پر ارکانِ وفد سے ملاقاتیں کیں تو ان کا منصوبہ درہم برہم ہوگیا۔ مولانا زندہ ہوتے تو اپنے اس ارشاد کی تشریح فرماتے۔ اب اسے بہ شکل موجودہ قبول کر لینے کے سوا چارہ نہیں ۔

اعلانات جہاد خان ہن تیگ تو ناکام واپس چلا گیا، لیکن خلیفۃ المسلمین کے نمایندے محمد کاظم بے نے مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے لیے اعلانات جہاد مرتّب کرا دیے تھے، جن پر محمد کاظم کے علاوہ مولانا برکت اللہ نے بھی شیخ الاسلام ترکیہ کے وکیل کی حیثیت میں دستخط کیے تھے۔ تمام اعلانات تو نہ مل سکے، لیکن جو اعلان باشندگانِ یاغستان کے لیے تیار کیا گیا تھا، وہ ان کاغذات میں مل گیا جو مولانا محمد بشیر نے ۱۹۳۴ء میں بہ مقام کابل میرے حوالے کیے تھے۔ چونکہ اس میں یاغستان کے بعض متفرق واقعات کا بھی ذکر ہے اور اس کی فارسی میں بھی یاغستانی و افغانی انداز نمایاں ہے، اس وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ خود مولانا محمد بشیر اور بعض دوسرے یاغستانی کارکن اس کی ترتیب میں شریک رہے۔ یہ ایک اہم تاریخی دستاویز ہے، جسے موجودہ و آیندہ نسلوں کے لیے بہ طور یادگار محفوظ رہنا چاہیے۔ لہٰذا میں نے اسے ضمیمہ باب کے طور پر مع ترجمہ شاملِ کتاب کر دیا ہے۔

ضروری تصریحات اس اعلان میں بعض یاغستانی واقعات کی طرف اشارے ہیں، جن کے متعلق سرسری توضیح ضروری ہے۔ خیری بے ایک ترک افسر تھے، جنھیں یاغستانی قبائل کی تنظیم اور عسکری تربیت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ جو طلبہ فروری ۱۹۱۵ء میں ہجرت کر کے گئے تھے، ان میں ایک صاحب محمد حسن بھی تھے، جو ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ بعد ازاں انھوں نے "محمد یعقوب" نام اختیار کر لیا اور اب اسی آخری نام سے معروف ہیں۔ وہ بھی کابل سے خیری بے کے ہمراہ آئے تھے۔ بعض مواجب خوروں نے انگریزوں کے ایماء سے ان پر حملہ کرا دیا، جس میں یاغستان کے ایک ملّا عبدالحلیم شہید ہوئے، وہیں کے ملّا سید اکبر نے تادیباً مجرموں کے گھر جلوا دیے اور ان کا مال اسباب لٹوا دیا۔

دوسرا قابلِ تصریح واقعہ نواب دیر کا ہے۔ دیر کی ہمسایہ ریاست جندول کا رئیس عمرا خاں مدت العمر انگریزوں سے لڑتا رہا۔ اس کے بیٹے عبدالمتین خاں نے ضرورت کے وقت نواب دیر سے مدد مانگی۔ نواب موصوف نے مدد میں تامّل نہ کیا، لیکن جندول کو غاصبوں سے آزاد کرا کے عبدالمتین خاں کے حوالے کرنے کے بجائے خود اس پر قابض ہو گیا۔ اس تصرّف کو بھی اسلامی نقطۂ نگاہ سے نازیبا قرار دیا گیا ہے۔

ضمیمہ ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلّیاً و مسلماً

اعلانِ مقدسِ دینی بہ اہالیِ پٹھانستان

(قبائل ساکنہ میانِ افغانستان و دریائے سندھ)

استقلال کی دعوت

برادرانِ دینی !
اکنوں فرصت بے بہا خداوند تعالیٰ بہ شما
ارزانی فرمودہ است کہ مثلش در صدہا سال
میسر نمی شود۔ اگر شما قدرے دست و پا را
بجنبانید۔ می توانید کہ ایں ملک وسیع را
(کہ میانِ دریائے اٹک و افغانستان
واقع است) بہ کم زحمت بدست آوردہ
یک سلطنتے مستقل اسلامی قائم نمائید و
بدونِ مزاحمتِ کسے با دولت ہائے دنیا
علائقِ سیاسی و تجارتی و علمی پیدا کنید و
درحمایت خلیفہ سید المرسلین السلطان المعظم
بودہ در آیندہ از آسیبِ انگلیس ایمن شوید
و بہ مددِ علمائے حقہ از دار الخلافت اولادِ
خود را بہ زیورِ علوم و فنون آراستہ در میدانِ
تمدن و ترقی ہم دوشِ اقوامِ متمدنہ و مترقیہ

دینی بھائیو ! اس وقت خدا نے
آپ کو نہایت قیمتی مہلت عطا کی ہے،
جس کی نظیر صدیوں میں بھی نہیں ملتی۔ اگر آپ
ذرا ہاتھ پاؤں ہلائیں تو ممکن ہے کہ اس وسیع
ملک کو جو دریائے اٹک اور افغانستان
کے درمیان واقع ہے، تھوڑی سی زحمت
سے قبضے میں لے آئیں۔ وہاں ایک مستقل
اسلامی سلطنت قائم کرلیں اور کسی کی رکاوٹ
کے بغیر دنیا کی سلطنتوں سے آپ کے سیاسی
تجارتی اور علمی روابط پیدا ہوجائیں۔ اس طرح
آپ رسولوں کے سرتاج (صلعم) کے خلیفہ
سلطانِ معظم کی حمایت میں آجائیں اور
آیندہ انگریزوں کے گزند سے محفوظ ہوجائیں"
علمائے حق کی مدد سے آپ اپنی اولاد کو
دار الخلافت میں علوم و فنون سکھا سکیں گے

گردیدہ و نسل ہائے آیندہ شما در داریں محمود العافیہ و مسعود العاقبہ باشند۔ و فی ذالک فلیتنافس المتنافسون ۵

اور متمدن و ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش تمدن و ترقی کے میدان میں گامزن ہو سکیں گے۔ آپ کی آیندہ نسلیں دونوں جہانوں میں کامیاب و نیک بخت ہوں گی اور چاہیے کہ رغبت رکھنے والے اس کی خواہش کریں ۵

جنگ اور انگریزوں کی پریشانیاں

الحال فرصتِ زرین این است کہ انگلیس کہ دشمنِ اسلامیان خصوصاً و شرقیان عموماً ہست، از سہ سال دریں جنگ عالمگیر گرفتار بودہ۔ لکوکہا نفوس انگلیسی نژاد ضائع کردہ است و ہمہ لشکر ہائے او در ملکِ فرانس و اطالیہ و بلقان و مصر و عراق عرب دوچار جنگ ہائے ہولناک و خونریز می باشند۔ ہر ماہ ضائعات لشکر انگلیسی بہزارہا می رسد۔ اکنوں مسئلۂ کمک رسانیدن بر ایں میدان ہائے جنگ ہم دشوار شدہ است۔ ملتِ انگلیس از صدمات و نقصانات ایں جنگ بجان آمدہ است و قوتِ جنگی انگلیس روز بروز کم می شود۔ امّا دولتِ ترکی و دولتِ جرمن و رفیقانِ ایشاں مظفر و منصور می شوند

یہ سنہری موقع ہے۔ انگریز مسلمانوں کے خصوصاً اور اہلِ شرق کے عموماً دشمن ہیں۔ وہ تین سال سے عالمگیر جنگ میں الجھے ہوئے ہیں۔ ان کی قوم کے لاکھوں افراد ضائع ہو چکے ہیں۔ ان کے لشکر فرانس، اٹلی، بلقان، مصر اور عراق عرب میں خوفناک و خونریز جنگ سے دوچار ہیں۔ ہر مہینے ان کے ہزاروں آدمی ضائع ہوتے ہیں۔ اب مذکورہ بالا میدان ہائے جنگ میں کمک پہنچانا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ ان صدموں اور نقصانوں کے باعث انگریز قوم کی جان پر آ بنی ہے۔ ان کی قوت روز بروز کم ہو رہی ہے، لیکن سلطنت ترکی نیز حکومت جرمنی اور ان کے حلیف ہر میدان میں کامیاب و بامراد ہیں۔ بلجیم، پولینڈ، سرویا، رومانیا اور مانٹی نیگرو جیسے وسیع

و ملک ہائے زرخیز و پہنا مثل بلجیم و پولینڈ و
سرویا و رومانیا و مانٹی نگرو و سالکینہ تسخیر کردہ اند
و در ملک روس فتوحات شان روز افزوں
است۔ المختصر انگلیس و رفیقانش از شکست ہائے
پے در پے شکستہ دل و خستہ تن و در باختہ
ہمت و سراسر درماندہ شدہ اند و لیکن جرمنہا
و ترکان و اطرشہا و بلغارہا از فتح و فیروزی تازہ
بتازہ قوی دل و بلند حوصلہ و مجسم آمل ہستند۔

حصولِ مرام کا بہترین وقت

دریں چنیں حالت پریشان و
خطرناک انگلیس اگر قبائل حدود یہ
متفق شدہ یکبارگی از شمال تا جنوب صرف
حملہ ہائے غارت گری آغاز نمایند و از جنگ بزرگ
احتراز کردہ شبخونہا و حملہ ہا را بر تمام وسعت
حدود بلا انقطاع مجری دارند، در چند ماہ لشکرِ
انگلیس را آں جانب دریائے اٹک خواہند
راند و اثر ایں حملہ ہائے متواتر بر حدود در ہمہ
میدان ہائے جنگ زود ظاہر شود و شکست
انگلیس محقق گردد۔ وقتیکہ انگلیس شکست
یافت، خلیفہ معظم بہ اتفاقِ دولت ہائے متفقہ
در مجلس صلح برائے حکومت متحدہ پٹھانستان
سند استقلال و آزادی حاصل کردہ ہر گونہ

اور زرخیز ملک پورے مسخر کیے جا چکے ہیں۔
روس میں ان کی فتوحات روز افزوں ہیں۔ مختصر
یہ کہ انگریز اور ان کے ساتھی شکستیں کھا کھا کر
شکستہ دل ہو چکے ہیں۔ ان کے بدن زخموں سے
چور ہیں۔ وہ ہمت ہار چکے ہیں اور بالکل بے دست و پا
ہو چکے ہیں۔ لیکن فتح و ظفر کے باعث جرمنوں، ترکوں،
آسٹرویوں اور بلغاریوں کے دل قوی اور حوصلے
بلند ہیں اور وہ سراپا امید ہیں۔

اگر انگریزوں کی اس پریشان اور خطرناک
حالت میں سرحدی قبائل متفق ہو کر شمال سے
جنوب تک بیک وقت غارت گرانہ حملوں
کا آغاز کر دیں، بڑی جنگ سے بچے رہیں
اور پوری سرحد پر شبخونوں اور چھاپوں کا تانتا
باندھ دیں تو چند ہی مہینوں میں انگریزوں کے لشکر
کو دریائے اٹک کے پار پہنچا دیں گے۔ جنگی
میدانوں پر ان مسلسل حملوں کا اثر جلد ظاہر ہو
جائے گا اور انگریزوں کی شکست میں کوئی کسر
باقی نہ رہے گی۔ جب انگریز شکست کھا جائیں گے
تو خلیفہ معظم مجلس صلح میں اپنی دوست حکومتوں
سے متحدہ پٹھانستان کے لیے استقلال و آزادی
کی سند حاصل کر لیں گے اور ہر قسم کی مدد

مدد خواہد فرستاد۔ من بعد کسے را یارائے مدافعت در ملکِ پٹھانستان نہ خواہد بود :

برآ ز خواب اکنوں وقت تو سخت تنگ است
ایں لحظہ گر نیابی تیرت شد از انامل
فرصت چو نو بہارے در عمرِ شخص و قومے
یک بار رفتہ ناید مثلِ شباب زائل

پہنچائیں گے۔ اس کے بعد کسی کو پٹھانستان میں لڑائی کا یارا نہ رہے گا :

تو اب خواب سے بیدار ہو، وقت بہت تنگ ہے اگر اس وقت بھی نہ جاگے گا تو تیرا تیر گرفت سے نکل جائے گا۔ مہلت کی حیثیت نوبہار کی سی ہے شخصوں اور قوموں کی زندگی میں وہ ایک بار چلی جائے تو پھر نہیں آتی جس طرح گزرا ہوا شباب دوبارہ نہیں لوٹتا ۔

ترکوں کی شیر دلی

برادرانِ دینی! زیادہ از سہ سال می شود کہ برادرانِ دینی شما از ترکاں لکوکہا در عدد جان و مال خویش را براہِ خدا نثار کردہ در میدان ہائے یورپ و آسیا و افریقہ دوش بدوش با حلیفانِ خویش دادِ مردانگی دادہ اند و جوہرِ شجاعت و شیر دلی را اظہار نمودہ نیک نامیِ جاوید حاصل کردہ اند و می کنند۔ اما شما اے آفریدیہا و سواطیہا و دیگر قبائل مانند زناں خانہ نشیں شدہ بچگان ترکی را یتیم و زنانِ عثمانی را بیوہ شدن می بینید و شمارا نہ غیرتِ اسلامی و نہ عرقِ مروت بہ جنبش می آید ۔

دینی بھائیو! تین سال سے زیادہ مدت ہو چکی ہے کہ تمھارے ہم مذہب بھائی ترک لاکھوں کی تعداد میں اپنے جان و مال خدا کے لیے قربان کیے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے یورپ، ایشیا اور افریقہ کے میدانوں میں اپنے حلیفوں کے پہلو بہ پہلو مردانگی کی داد دیتے ہوئے شجاعت و شیر دلی کے جوہر آشکارا کیے ہیں اور ہمیشہ کی نیک نامی حاصل کر لی ہے اور کر رہے ہیں لیکن آپ آفریدیو، صواتیو اور دوسرے قبیلوں والو! عورتوں کی طرح اپنے گھر میں بیٹھے ہو، ترک بچوں کے یتیم اور عثمانی عورتوں کے بیوہ ہونے کا تماشا دیکھ رہے ہو۔ کیا آپ کو غیرتِ اسلامی حرکت میں نہیں لاتی اور آپ کی رگِ مروت نہیں پھڑکتی ؟

خیری بے پر حملہ

و عجیب تر ایں کہ تنے چند از بے ناموساں زیر ریاستِ زمان خاں

عجیب بات یہ ہے کہ زمان خاں کی ریاست کے چند بے ننگ و ناموس افراد نے خدا،

از خدا و رسولؐ و مومنین شرم نہ کردہ بر عالی جناب
خیری بیگ کہ از سلالۂ جلیلۂ ملت ترکی می آید
و برائے اعانت برادرانِ اسلام خود را بحدود
رسانیدہ است، حملہ آوردہ ملا عبد الحلیم مرحوم
مغفور را شہید نمودند۔ ازیں زیادہ تر سواد الوجہ
فی الدارین نمی تواند شد۔ بدنام کنندۂ نکونامے
چند۔ اما زہے سعادت علمائے کرام و خصوصاً
جناب ملا سید اکبر[1] کہ آں بدکاراں را
بسوختن خانہائے شاں و گرفتن مالِ تاوان
بہ پاداشِ کیفر نا فرجام شاں رسانیدند و
نیز نام نامی قبیلۂ کوکی خیل مانند اسم منور
محسود و مہمند برائے دوام بر جریدۂ عالم ثبت
شد۔ مردم کوکی خیل البتہ سزاوار نام آفریدی
ہستند و در حقِ شاں ایں اشعار القا شدہ است:

آفریدی دلاور نزد علی خیبر
بر غریبان مدبر چوں برق آسمان است
حب وطن ہمین است، مردانگی چنین است
حکم اللہ این است، ایں کار دینیان است

رسولؐ اور مومنوں سے شرم نہ کرتے ہوئے عالی جناب
خیری بیگ پر حملہ کیا، جو ترکوں کی جلیل القدر قوم کے
فرزند ہیں اور اسلامی بھائیوں کی امداد کے لیے
یہاں پہنچے ہیں۔ ان لوگوں نے ملا عبد الحلیم مرحوم کو
شہید کر ڈالا۔ اس سے بڑھ کر دونوں جہانوں کی
روسیاہی کا سامان اور کیا ہو سکتا ہے، بدنام کنندۂ
نکونامے چند۔ علمائے کرام کے لیے یہ امر کتنی خوش نصیبی
کا باعث ہے کہ انھوں نے ان بدکاروں کے گھر جلائے
ان سے مالی تاوان وصول کیا۔ اس طرح انھیں کیفر کردار
کو پہنچایا۔ اس سلسلے میں جناب ملا سید اکبر خاص طور پر
قابل ذکر ہیں۔ قبیلہ کوکی خیل کا نام بھی محسودوں
اور مہمندوں کے روشن نام کی طرح دین کے دفتر میں
ثبت ہو گیا، بے شک کوکی خیلوں کے لیے آفریدیوں
کا نام زیبا ہے، یہ اشعار ان کے حق میں القا ہوئے:
دلاور آفریدی درۂ خیبر کی علی مسجد کے نزدیک
بیٹھ دکھانے والے مغربیوں کے لیے آسمان سے گرنے والی بجلی بن گئے
حب وطن کا تقاضا یہی ہے، مردانگی اسی کا نام ہے
خدا کا حکم یہی ہے اور اہل دین ایسے ہی کارنامے انجام دیتے
ہیں۔

[1] یہ وہی بزرگ ہیں جنھیں وائلی نے سرحدی ملاؤں میں "آگ کا لوکا" قرار دیا ہے (کوہ سیاہ سے وزیرستان تک انگریزی ص ۲۷۹)۔

بایدکہ برمزار ملا عبدالحلیم شہید تاریخ واقعہ
شہادتش نصب شود تا در قرون آتیہ یادگار
بماند ٭

قبائل عرب اور قبائل سرحد

اے مسلمانان پٹھانستان!
بحمد اللہ شما خود را مسلمان
پندارید ولیکن حالت موجودۂ شما بہ حالت
قبائل عرب در جاہلیت قبل از اسلام
ے ماند۔ ہنگام ظہور خاتم النبیین (صلعم)
ملک عرب مسکن قبائل چادر نشین و کوچری
و پراگندہ بود۔ چنانکہ امروز حالت قبائل شما است
آں قبائل عرب مدام در جنگ باہمی مشغول
بودند چنانکہ شما نیز در خانہ جنگی مبتلا شدید۔ آں
قبائل عرب حکومت منتظم و با قانون نہ داشتند،
شما ہم نہ دارید۔ ایشاں قطاع الطریق بودند،
شما نیز راہ برید اما از فیض انفاس طیبۂ نبویہ
حالت بدویت عرب بہ مدنیت مبدل گشت
آں قبائل پراگندہ بہ رشتہ انما المومنون اخوۃ
(ہمہ مومنین برادر اند) منسلک شدہ یک
حکومت جمہوری روحانی بوجود آمد۔ نماز
پنجگانہ حسیات برادری و برابری را
استوار کرد۔ زکوٰۃ بیت المال اساس مادی

ضروری ہے کہ ملا عبدالحلیم شہید کی لوح مزار پر
ان کی تاریخ شہادت کندہ کی جائے تاکہ آنے والے
زمانوں کے لیے یادگار رہے ٭

اے پٹھانستان کے مسلمانو! خدا کا شکر ہے کہ تم
اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہو، لیکن تمھاری موجودہ حالت
اسلام سے پیشتر دور جاہلیت کے عرب قبیلوں کی سی ہے
حضرت خاتم النبیین صلعم کے ظہور مبارک کے وقت عرب
خیمہ نشین، صحرا گرد اور منتشر قبائل کا مسکن تھا۔
تمھارے قبیلوں کی حالت بھی آج کل یہی ہے۔ عرب
کے قبائل ہمیشہ باہم لڑتے رہتے تھے، تم بھی خانہ جنگی
میں مبتلا ہو۔ عرب قبیلوں کی کوئی منتظم اور
قانونی حکومت نہ تھی، تمھاری حالت بھی یہی ہے
وہ ڈاکے مارتے تھے، تمھارا کام بھی لوٹ مار ہے۔
لیکن حضرت رسول اکرم صلعم کے انفاس پاک کی برکت
سے عرب کی بدویت مدنیت میں بدل گئی، وہ
بکھرے ہوئے قبیلے (سب مومن بھائی بھائی ہیں)
کے رشتے میں پروئے گئے اور ایک روحانی
جمہوری حکومت وجود میں آگئی، دیکھو پانچ وقت
کی نماز سب میں برادری اور برابری کے احساسات
پختہ کرتی ہے۔ زکوٰۃ و بیت المال ملت کی
اجتماعی عمارت کے لیے مادی بنیاد اور مالی

وپشتیبانی مالی برائے عمارت اجتماعی ملت اسلامی شد۔ صوم و روزہ داری مسلمانان را برائے مشقتِ جہاد فی سبیل اللہ تجربہ بخشید و حج بیت اللہ برائے اقوام اسلامیہ ہمہ دنیا رابطہ اتحاد سیاسی و تجارتی و دینی پیدا کرد :

پشتیبانی کے ضامن ہیں۔ روزے کے ذریعے سے مسلمانوں میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے مشقت برداشت کرنے کی عادت پکی ہوتی ہے۔ بیت اللہ کا حج دنیا بھر کی مسلمان قوموں کے درمیان تجارتی، سیاسی اور دینی رابطے پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے:

جملہ خلائق آں زماں از جہل مثلِ مردگاں
انفاس آں روحِ رواں بدمید شاں جانے بہ تن
بزدود زلیشاں جاہلی، فرسودہ زیشاں کاہلی
بخشود شاں را عاقلی بخشید شاں ملکِ زمن
گردہ پراگندہ بہم زاں ساخت قومے محتشم
یک رشتۂ حبِ اتم از بہر شاں کردہ رسن

اس زمانے کے سب لوگ جہالت کی وجہ سے مُردوں کی مانند تھے۔ رسول اکرم صلعم کے انفاس پاک روح بن کر ان کے بدنوں میں دوڑ گئے۔ حضورؐ نے ان کی جہالت کے داغ دھو ڈالے، ان کی کاہلی مٹا دی۔ ان کو عقل بخشی اور زمانے بھر کی حکومت دے دی۔ بکھرے ہوئے اجزا کو اکٹھا کر کے حضورؐ نے ایک عالی شان قوم بنا دی اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت کے رشتے میں وہ سب بندھ گئے۔

عربوں کی کایا پلٹ

حالات ملاحظہ فرمائید کہ جنابِ رسالت مآب چگونہ قلب ہیئت ایں قبائل وحشیہ عرب نمود، چوں قبائل پیرامون مکہ قصد ہلاک پیغمبرؐ نمودند، پیغمبرؐ مکہ را گذاشت و بہ مدینہ رفت، در دوازدہم ربیع الاول بہ مدینہ منورہ رسید و در ماہِ رمضان یعنی ہفت ماہ بعد یک بیرق برائے عمِ خود حمزہ رضی اللہ عنہ درست کردہ بنائے جہاد فی سبیل اللہ نہاد و در مدت دہ سال

حالات پر غور کرو، جناب رسالت مآبؐ نے کس طرح عرب کے وحشی قبائل کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ جب مکے کے اردگرد کے قبیلے حضرت پیغمبر صلعم کو (خاک بدہن) قتل کرنے کے درپے ہو گئے تو حضورؐ مکے سے نکل کر مدینے چلے گئے۔ ۱۲۔ ربیع الاول کو وہاں پہنچے اور سات ماہ بعد رمضان کے مہینے میں اپنے چچا حضرت حمزہؓ کے لیے ایک جھنڈا بنا کر جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد ڈال دی۔ مدینہ منورہ کے دہ سالہ قیام میں آنحضرتؐ

قیامِ آنحضرتؐ در مدینہ غزوات یعنی جنگ ہائے
پیغمبر را کہ خود حضور داشت بست و ہشت
شمردہ اند و سریہ ہائے آنحضرتؐ را یعنی جنگہائے
کہ آنحضرت لشکر فرستادہ و خود حاضر نبودہ
پنجاہ و شش مے گویند۔ از بست و ہشت
جنگ کہ پیغمبرؐ خود تشریف داشتند در نہ غزوہ ہا
با دشمن مقابلہ و مقاتلہ نمود۔ سائرین یا متارکہ'
مصالحہ یا عدم مقابلہ دشمن تمام شد ۔

دعوتِ کار

آخریں سریہ ۲۶۔ ماہ صفر سال
یازدھم ہجری بہ ریاست اسامہؓ بن زیدؓ در
حالت مرض الموت خود جانب جبل دبل روان
فرمود' و دوازدھم ربیع الاول گویا دو ہفتہ بعد
جناب سید الکونینؐ از دارِ فانی بہ ملکِ جاودانی
رحلت نمود ۔ تفکر باید کردن کہ ذات ختمی
مآب با عبادت و ہزار ہا امور معاشرت و
سیاست و قضاوت درمدت دہ سال
ہشتاد و چہار غزوہ و سریہ را ہم ادارہ نمود۔
ہمیں فعالیت و چستی کاری و بیدار مغزی
بود کہ عون ایزدی در دہ سال جریان تاریخ
بشریت را تبدیل کرد و راست است
ان لیس للانسان الا ما سعیٰ روبرائے انسان

جن لڑائیوں میں بہ نفسِ نفیس شریک رہے
ان کی تعداد اٹھائیس بتائی جاتی ہے اور سریے
یعنی جن جنگوں کے لیے آنحضرت نے لشکر بھیجے
چھپن تھے۔ جن اٹھائیس جنگوں میں حضور صلعم
بہ نفسِ نفیس شریک رہے ان میں سے نو میں
دشمن سے لڑائی کی نوبت آئی۔ باقی یا تو صلح ہو
گئی یا التوائے جنگ پر معاملہ طے ہو گیا یا سرے سے
مقابلے کا موقع ہی نہ آیا ۔

آخری مرتبہ ۲۶۔ صفر ۱۱ھ کو آنحضرت
نے مرض الموت میں ایک لشکر اسامہ بن زید کی
سرکردگی میں بھیجا۔ ۱۲۔ ربیع الاول کو گویا دو ہفتے بعد
سید الکونین صلعم اس جہانِ فانی سے ہمیشہ قائم رہنے
والی دنیا کو تشریف لے گئے۔ سوچنا اور غور کرنا چاہیے
کہ حضرت پیغمبر صلعم نے دس سال کی مدت میں عبادتوں
اور ہزاروں سیاسی، معاشرتی اور قضائی معاملوں
کے باوجود چوراسی جنگوں کا انتظام بھی فرمایا۔
یہی کارکردگی، یہی چستی اور مستعدی، یہی بیدار مغزی
تھی جس نے خدا کی مدد سے بشریت کی تاریخ کے
دھارے کا رخ بدل ڈالا۔ سچ ہے،
انسان کے لیے کچھ نہیں مگر اسی قدر کہ وہ
کوشش کرتا ہے ۔

راہِ عمل | اے مسلمانانِ پٹھانستان! اکنوں
وقت آمد کہ بہ پیغمبر علیہ السلام اقتدا نمودہ
ہمہ قبائل را بہ سلکِ اتحادِ سیاسی بیارید
از ہمہ قبائل وکلا را انتخاب کردہ یک حکومت
متحدہ تشکیل بدہید۔ لاشک ہر قبیلہ در
امور داخلیہ آزاد خواہد ماند، اما در معاملات
با دولت ہائے خارجہ حکومت متحدہ جواب دہ
باشد۔ دریں امر را در زمان جریان ایں
جنگ عالمگیر باتمام رسانیدہ و بہ اتفاق رائے
جناب خیری بیگ صاحب یک سررشتہ
و منصوبہ برائے حملہ عمومی قبائل درست کردہ
بر انگلیس حملہ ہائے غارت گری و جہادی
آغاز کنید، و پیش از انعقاد صلح ہمہ زمین
ایں جانب دریائے اٹک را بہ دست آرید
تا شما را ہنگام صلح از خلیفہ معظم سند استقلال
با مدد ہر گونہ حاصل شود۔ اختلافاتِ پارینہ
شیعہ و سُنی وغیرہ را فراموش کردہ ہمہ
اہل قبیلہ برادر شوید ؛

شو مجتمع چو پرویں برآ بہ چرخ رفعت
چو ذرہ شو پریشاں خاکت اگر مکان است

اے پٹھانستان کے مسلمانو! وقت آگیا
ہے کہ تمام قبیلے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی پیروی
میں سیاسی اتحاد پیدا کریں۔ تمام قبیلوں سے وکیل
اور نمایندے منتخب کر کے ایک متحدہ حکومت
بنائی جائے۔ بلاشبہہ تمام داخلی امور میں ہر
قبیلہ آزاد رہے گا، لیکن بیرونی ملکوں سے
تعلقات و روابط کے باب میں حکومت متحدہ
جواب دہ ہو گی۔ اس کام کو موجودہ جنگِ عالمگیر
کے دوران میں پورا کر لو اور جناب خیری بے
کے اتفاق رائے سے تمام قبائل کے لیے
ایک منصوبہ بنا کر انگریزوں پر غارت گرانہ
چھاپوں اور جہاد کا آغاز کر دو۔ صلح ہونے سے
پیشتر دریائے اٹک کے اس پار (سمت سرحد)
کی زمین قبضے میں لے آؤ تا کہ آپ کو خلیفہ
معظم کی طرف سے استقلال کی سند اور ہر قسم
کی مدد مل سکے۔ شیعہ سنی وغیرہ کے پرانے
اختلافات بھلا دو اور تمام قبیلے بھائی بھائی
بن جاؤ ؛

تم پرویں ستاروں کی طرح جمع ہو جاؤ
اور بلندی کے آسمان پر پہنچو۔ اگر ذرّوں کی
طرح بکھرے رہو گے تو خاک کے سوا تمھارا کوئی مکان نہ ہو گا۔

شیعه و هم وہابی آخر مطیع قرآں
از جنگ تو نصاریٰ سلطان این جہان است

شیعہ ہوں یا وہابی آخر سب قرآن کے فرماں بردار ہیں۔ مسلمانو! تمھاری خانہ جنگی کا نتیجہ ہے کہ نصاریٰ اس جہان کے حکمران بن گئے۔

نور خرد بداری، حیواں صفت چرائی
ممکن ترا هر آنچه ممکن بدیگران است

تمھیں خدا نے عقل عطا کی ہے، پھر حیوانوں کی خصلتیں کیوں لیے بیٹھے ہو؟ جو دوسروں کے لیے ممکن ہے تمھارے لیے کیوں ممکن نہیں؟

انساں خلیفهٔ حق، حاکم بملک فطرت
برق و بخار و دریا او را ز خادمان است

انسان خدا کا خلیفہ ہے، وہ اس کائنات کا حاکم ہے۔ بجلی، بھاپ، دریا سب اس کے خادم ہیں۔

او رشکل و نقل و بُعد اجرام علویہ را
سنجد کہ عقلِ پاکش میزان آسمان است[1]

انسان بلندی پر نظر آنے والے ستاروں کی شکل، نقل و حرکت، اور ایک دوسرے سے دوری کا اندازہ کرتا ہے، اس کی عقل آسمان کی ترازو ہے۔

نواب دیر اور خان جندول

از استماع این خبر که جناب نواب صاحب دیر اول عبدالمتین خاں ابن عمرا خاں را مدد نموده در بدست آوردن ملک موروثی او موفق شد، اما پس ازاں خود غاصب شده بر ملک جندول متصرف گشت، در عالم اسلامی ہیجانے پیدا شد و مسلمانان صادق را دل فگار گردید زیرا که مسلمان چگونه مرتکب چنیں

یہ خبر سن کر عالم اسلامی میں ہیجان پیدا ہوا کہ نواب دیر پہلے عمرا خاں رئیس جندول کے بیٹے عبدالمتین خاں کا مددگار بنا اور اس کے موروثی ملک کو دوسروں کے قبضے سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا، لیکن بعد میں خود غاصب بن کر جندول پر قابض ہو گیا۔ سچے مسلمانوں کے دل اس واقعے سے زخمی ہو گئے مسلمان کس طرح یوں وعدہ شکنی کا

[1] ان شعروں میں جو استفہام ہیں، وہ کسی تصریح کے محتاج نہیں۔

خلاف وعدگی شود۔ قرآن مجید مے فرماید
لیس بامانیکم ولا امانی اہل الکتاب من یعمل
سوءً یجزبہ (قانون الٰہی) نہ حسبِ خواہش
شماست (اے مسلماناں) ونہ حسبِ خواہش
مردم کتاب (یہود و نصاریٰ) بلکہ قانون الٰہی
ایں است ہر کہ بدی کند پاداش بدی یابد۔
باید کہ نواب صاحب دیر از عادت نفاق توبہ
کردہ بہ دوست و برادر دینی خود ایفائے عہد
کند وبا مسلمانان قبائل متفق شدہ متوقع
فتوحات عظیمہ شود ؛

مرتکب ہو سکتا ہے ؟ قرآن مجید کا ارشاد ہے:
اے مسلمانوں نہ تو قانونِ الٰہی تمہاری خواہش
کے تابع ہے اور نہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ
کے خواہش کے تابع۔ قانون الٰہی یہ ہے کہ جو کوئی
برائی کرے گا، اس کی سزا پائے گا۔ چاہیے کہ
نواب دیر نفاق سے توبہ کر کے اپنے دینی
بھائی اور دوست سے عہد نبھائے اور
مسلمانوں کے ساتھ ہو کر بڑی فتوحات
کا امیدوار بنے ؛

علماء اور ملاؤں سے اپیل

اے علمائے کرام
وملایانِ عظام کہ وارث نبی علیہ السلام ہستید
بر دو دستور پیغمبر صلعم بہ دقت ملتفت شوید۔
نخستیں ایں است کہ بنیاد اسلام بر دور
کردن دشمنی از میانِ خلائق و پیدا کردن
اتحاد میانِ قبائل نہادہ شود چنانکہ قرآن
شاہد است: واذکروا نعمت اللہ علیکم
اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم (یاد بکنید
انعام خدا را کہ بر شما مبذول کردہ ہنگامیکہ
شما دشمن بودید۔ پس او درمیان دلہائے شما
الفت پیدا کرد)۔ دوم ایں است کہ

اے معزز عالمو اور جلیل القدر ملاؤ!
آپ لوگ نبی علیہ السلام کے وارث ہیں۔
حضرت پیغمبر صلعم کے دو دستوروں پر بطور خاص
توجہ کیجیے: اول یہ کہ آپس کی دشمنی رفع کرنا
اور قبائل کو متحد کر دینا اسلام کی بنیاد ہے
جیسا کہ قرآن گواہ ہے: یاد کرو خدا کا انعام جو
تم پر نازل ہوا۔ جب تم آپس میں دشمن تھے
پس اس نے تمہارے دلوں میں محبت
پیدا کر دی۔ دوسرا دستور یہ کہ جب
مسلمانوں کے درمیان دینی اخوت پیدا
ہو گئی اور قبیلوں کے درمیان اتحاد کا

چوں اخوت دینی میان مسلمین و رابطہ اتحاد میان قبائل استوار شد جناب پیغمبرؐ بر خلاف دشمنانِ خدا و رسول و بدخواہان انسانیت جہاد و غزا آغاز کرد۔ نتیجہ ایں دو دستور العمل چناں شد کہ مسلماناں دارائے عالم گردیدہ حسب فرمان واجب الاذعان لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ شما را ہم باید کہ بایں دو اصول قدیم متمسک شدہ قبائل را بہ سلک اتحاد کشید و بر دشمنان خدا حملہ آور شدہ پٹھانستان را ملک مستقل بہ سازید و قبائل را برائے دوام از آسیبِ انگلیس ایمن نمائید و عنداللہ والرسول ماجور و عندالناس محبوب گردید۔

رابطہ مضبوط ہو گیا تو جناب پیغمبرؐ نے دشمنانِ خدا و رسول اور بدخواہانِ انسانیت کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ ان دو دستوروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان جہان کے مالک بن گئے۔ اس ارشاد کے بموجب کہ رسول اللہ کی پیروی میں تمھارے لیے نیک نمونہ ہے۔ آپ لوگوں کو بھی چاہیے کہ ان دو پختہ اصول پر مضبوطی سے جم جائیں۔ قبیلوں کو اتحاد کے رشتے میں پروئیں۔ خدا کے دشمنوں پر حملہ آور ہوں پٹھانستان کو ایک مستقل ملک بنا لیں اور قبیلوں کو ہمیشہ کے لیے انگریزوں کے آسیب سے محفوظ کر دیں۔

ایں جا نکتہ وطن پروری ہم موجود است در ایام صلح انگلیس و روس نے گذاشتند کہ مسلماناں متفق شوند و ہمیشہ تخم خلاف و نفاق میانِ ایشاں مے کاشتند۔ اکنوں ایں دشمنان دین خود در بلا مبتلا اند۔ ما را باید کہ ازیں فرصت استفادہ کنیم و غفلت ازیں فرصت غداری بوطن و اہلِ وطن خواہد بود۔

اس جگہ وطن پروری کا نکتہ بھی موجود ہے۔ صلح کے اوقات میں انگریز اور روس مسلمانوں کو اتفاق کا موقع نہ دیتے تھے اور ہمیشہ ان کے درمیان مخالفت و نفاق کا بیج بوتے رہتے تھے۔ اب یہ دشمن خود مصیبت میں مبتلا ہیں، ہمیں چاہیے کہ فرصت سے فائدہ اٹھائیں۔ اس فرصت سے غفلت وطن اور اہلِ وطن سے غداری کے مترادف ہو گی۔

مشمار مرد کاں و احبِ وطن نہ باشد
ننگِ بشر ہمان است لعنِ خدا بر آنست
اللّٰھم انصر من نصر دین محمد و اجعلنا منہم
و اخذل من خذل دین محمد و لاتجعلنا منہم۔
آمین !

جس شخص کے دل میں وطن کی محبت نہیں اسے مرد نہ سمجھ، وہ انسانیت کے لیے باعثِ ننگ۔ اس پر خدا کی لعنت ہو۔ اے خدا تو ان لوگوں کا مددگار ہو جو دینِ محمدؐ کے مددگار ہیں اور ہمیں ان میں شامل کر اور ان لوگوں کو رسوا کر جو دینِ محمدؐ کی رسوائی کے درپے ہیں اور ہمیں ان میں شامل نہ کر۔

المحرم الحرام ۱۳۳۶ھ (اکتوبر ۱۹۱۷ء)

وکیل تقدس مآب شیخ الاسلام
(مولوی) محمد برکت اللہ

وکیل خلیفہ سید المرسلین السلطان المعظم
محمد کاظم یوزباشی

ضمیمہ ۲

راجا مہندا پرتاپ کا بیان

راجا مہندا پرتاپ نے بھی اپنی "داستانِ حیات" میں جرمن اور ترکی مشن کے حالات اختصاراً بیان کیے ہیں، جن کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

۱ - راجا صاحب ۱۵- فروری ۱۹۱۵ء کو برلین پہنچے تھے اور ۱۵- اپریل کو وہاں سے بہ عزم افغانستان روانہ ہوئے۔ راستے میں وہ ویانا (آسٹریا) ٹھہرے، جہاں عباس حلمی پاشا سابق خدیو مصر اور سردار امراؤ سنگھ سے ملاقات کی، پھر استنبول میں سلطان محمد رشاد خاں، غازی انور پاشا، غازی طلعت پاشا اور ولی عہد سلطنت سے ملے۔ وہاں سے روانہ ہوکر بغداد پہنچے جہاں غازی روف پاشا سے ملاقات ہوئی۔ ایران کے راستے ہرات پہنچے۔

۲ - راجا صاحب کے رفقا یہ تھے: ڈاکٹر فان ہن تیگ، (جس کا درجہ سفارت خانے سکرٹری کا تھا) ڈاکٹر بیکر[1]، مسٹر روہر[2] (ہن تیگ کا سکرٹری)، مولانا برکت اللہ۔ کچھ افغان افریدی جنگی قیدی، دو بونیر کے افغان جو ریاستہائے متحدہ امریکہ سے آئے تھے۔ راستے میں کچھ اور جرمن ہمراہ ہوگئے۔ ترکوں میں سے کاظم بے کا ذکر ضروری ہے۔

۳ - ہرات سے ان کے لیے سرکاری مہمان داری کا انتظام ہوگیا تھا۔ ۲- اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچے۔ باغ بابر میں انھیں ٹھہرایا گیا۔ پغمان میں امیر حبیب اللہ خاں اور سردار نصر اللہ خاں سے وفد نے ملاقات کی جو صبح سے بعد دوپہر تک جاری رہی۔ پھر ان سے الگ الگ ملاقاتیں ہوئیں۔ راجا صاحب کے پاس قیصر جرمنی اور سلطان ترکی کے خطوط تھے۔ فان ہن تیگ کے پاس جرمن چانسلر کا مکتوب تھا۔

---

[1] BAKER [2] ROHR

۴ ۔ کابل میں حکومت موقتہ قائم کی، جس کے صدر راجا صاحب، وزیرِ اعظم مولانا برکت اللہ اور وزیرِ داخلہ مولانا عبید اللہ تھے۔ مسٹر اللہ نواز خاں، ڈاکٹر خوشی محمد (عرف محمد علی و احمد حسن) وغیرہ سکرٹری مقرر ہوئے۔

۵ ۔ حکومت موقتہ کی طرف سے زارِ روس کے پاس سفارت بھیجی گئی۔ خط سونے کے پتر پر لکھا گیا تھا۔ اسے ڈاکٹر خوشی محمد (محمد علی) اور ڈاکٹر متھرا سنگھ (جس کا دوسرا نام راجا صاحب نے شمشیر سنگھ لکھا ہے) روس لے گئے۔

۶ ۔ ۱۹۱۶ء کے اواخر میں راجا صاحب مزار شریف اور ۱۹۱۷ء میں روس گئے۔

۷ ۔ راجا صاحب اور مولانا برکت اللہ ہی کی کوشش سے وہ مہاجر طلبہ رہا ہوئے جنہیں حکومتِ افغانستان نے افغانستان پہنچتے ہی قید کر لیا تھا[۱]۔

---

[۱] MY LIFE STORY از راجا مہندا پرتاپ (ص ۴۲ تا ص ۵۶)۔

ساتواں باب

امیر رحمت اللہ

نیا امیر امیر نعمت اللہ کی شہادت کے وقت ان کے بڑے صاحبزادے برکت اللہ بہت چھوٹے تھے اور جماعت مجاہدین میں مولانا رحمت اللہ (بن امان اللہ بن امیر عبداللہ) کے سوا کوئی شخص ایسا نہ تھا، جس کی امارت پر سب یا اکثر اصحاب متفق ہو جاتے۔ وہ امیر شہید کے برادر عمزاد اور برادر نسبتی تھے اور انھیں کو جماعت میں سب سے زیادہ اثر و رسوخ حاصل تھا۔ چنانچہ وہی بالاتفاق امیر چنے گئے۔ ہمیں ان کی حربی اور انتظامی صلاحیتوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کی پوری تربیت امیر عبداللہ مرحوم اور امیر عبدالکریم مرحوم کی آغوش میں ہوئی تھی۔ ۱۸۸۸ء سے وہ آگ اور خون کے ان ہنگاموں میں شریک چلے آتے تھے، جنھیں عرف عام میں لڑائیاں کہا جاتا ہے۔

مولوی برکت اللہ اور ان کے بھائیوں کی تربیت انھیں امیر صاحب نے کی، وہ سب ان کے حقیقی بھانجے تھے اور مولوی برکت اللہ کی شادی امیر رحمت اللہ ہی کی اکلوتی صاحبزادی سے ہوئی۔ برکت اللہ جوان ہوئے اور جماعت کے کاروبار میں سرگرم حصہ لینے کی صلاحیتیں ابھر آئیں تو انھیں سپہ سالاری اور مدارالمہامی کے عہدے سونپ دیے گئے۔

تلقب کا مسئلہ مولوی برکت اللہ ابتدا ہی سے جماعت میں "شہزادہ" کے لقب سے معروف ہو گئے تھے۔ بعض محتاط حضرات نے اس تلقب کے متعلق اچھی رائے ظاہر نہیں کی[1] اور یقیناً جماعت مجاہدین کے سلسلے میں اس نوع کے تلقبات کو کوئی بھی پسندیدہ یا خوش گوار نہیں سمجھ سکتا اور نہ اس کے لیے

[1] مثلاً ملاحظہ ہو مولانا مسعود عالم مرحوم کی کتاب "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک"۔ طبع دوم صد ۱۰۵۔

کوئی معذرت پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس لقب کا آغاز یوں ہوا کہ برکت اللہ صاحب بہت کم عمر تھے، جب ان کے والد نے اچانک شہادت پائی، لوگ پیار سے برکت اللہ کو "شہزادہ" کہنے لگے۔ شدہ شدہ یہ مستقل لقب بن گیا، ورنہ ظاہر ہے کہ نہ جماعت مجاہدین کی امارت کا سلسلہ موروثی تھا، نہ کسی امیر جماعت کی حیثیت مستقل حاکم یا بادشاہ کی تھی کہ اس کے بچے کو "شہزادہ" قرار دیا جاتا، نہ کسی امیر یا مولانا ولایت علی مرحوم کے خاندان میں سے کسی فرد نے اس قسم کے انتسابات کبھی گوارا سمجھے، جن سے دنیوی بادشاہی کی بو آتی ہو۔ یہ خدا کی راہ میں انتہائی جانبازانہ خدمات کا معاملہ تھا اور منصب امارت جماعت کے اتفاق و رضامندی پر موقوف تھا۔ انتخاب کے سلسلے میں امیر کی مہارت فن حرب اور صلاحیت قیادت کے علاوہ للہیت، زہد و تقویٰ اور جذبۂ خدمت دین کو پیشِ نظر رکھا جاتا تھا۔ مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی، مولانا عبداللہ اور مولانا عبدالکریم انھیں خصوصیات کی بناء پر امیر چنے گئے تھے اور ان کے جو حالات اوپر پیش کیے جا چکے ہیں ان سے روز روشن کی طرح آشکارا ہے کہ ان کی بیش بہا زندگیوں کا ایک ایک لمحہ صرف خدمت دین اور جہاد آزادی میں صرف ہوا اور انھوں نے دنیا کی ہر متاع بے دریغ اس راہ میں قربان کر دی۔ ان میں سے بعض کو چھوٹے یا بڑے علاقوں میں حکمرانی کا موقع بھی ملا، تاہم وہ اپنے آپ کو برابر "فقیر" سمجھتے رہے اور "فقر" ہی ان کا سرمایہ افتخار تھا۔ لیکن دنیوی مال اسباب سے محرومی کا فقر نہیں، بلکہ علامہ اقبال کی اصطلاح میں "فقر غیور"، جس کا مقصد و نصب العین خدا کی رضا کے سوا کچھ نہیں اور جو اس رضا کی خاطر دنیا کی ہر شے کو بے دریغ ٹھکرا دیتا ہے۔

غرض ایسے تلقبات و انتسابات دانستہ اختیار کیے گئے ہوں یا اتفاقیہ کسی کے نام کا جزو بن گئے ہوں، انھیں کسی بھی نقطہ نگاہ سے جماعت مجاہدین کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں۔ وہاں صرف ایک ہی امتیاز مطلوب و زیبا ہے اور وہ یہ کہ کس نے مقاصد خدمت میں زیادہ سے زیادہ مشقتیں اٹھائیں اور زیادہ سے زیادہ قربانیاں کیں۔

اس عہد کا کام جس حد تک مجھے علم ہے مولانا رحمت اللہ کے عہد امارت میں رزم و پیکار کا

کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ ممکن ہے کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوئی ہوں۔ پہلی جنگ یورپ نیز افغانستان کی تیسری جنگ کے دوران میں سرحد آزاد کے اندر جابجا جو مرکز بن گئے تھے، وہ آہستہ آہستہ ٹوٹتے رہے۔ صرف ایک چمرکنڈ کا مرکز باقی رہ گیا، جس نے خود اسمست کے مرکز سے بھی زیادہ شہرت حاصل کر لی۔ یہ مرکز جماعت کے ایک ممتاز رکن مولوی عبدالکریم[1] نے قائم کیا تھا، جو قنوج (یو۔ پی) کے رہنے والے تھے۔ افسوس کہ ان کے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔ صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ مرکز قائم کر لینے کے بعد انھیں امیر نعمت اللہ کے متعلق ناخوشگوار اطلاعات ملیں تو اسمست چلے گئے۔ ہندوستان کے تمام مرکزوں کو اطلاع دے دی کہ چندہ چمرکنڈ بھیجیں۔ واپس چمرکنڈ پہنچے تو بھلے چنگے سوئے، صبح دیکھا تو فوت ہو چکے تھے۔ مولوی عبدالرزاق نے بتایا کہ خاصے سن رسیدہ تھے۔

کچھ مدت تک مولوی فضل الٰہی مرحوم وزیر آبادی یہاں عارضی طور پر امیر ہوئے۔ پھر اس کا انتظام مستقلاً مولانا محمد بشیر شہید کے حوالے کر دیا گیا اور اپنی شہادت تک کم و بیش چودہ برس وہی اس کے نظم و نسق کے ذمہ دار رہے۔ مولانا محمد بشیر نے سرحد پہنچتے ہی حکومت افغانستان اور وہاں کے بعض اکابر سے گہرے تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ اس وجہ سے جماعت مجاہدین کو افغانستان میں خاص احترام حاصل رہا۔ غالباً ایک رقم بھی سالانہ ملتی تھی، خود مولانا محمد بشیر کو جو کچھ ملتا تھا، پورے کا پورا جماعت کی نذر کر دیتے تھے وہ وقتاً فوقتاً کابل جاتے رہتے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں مولوی برکت اللہ صاحب اور جماعت کے دس بارہ اصحاب کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے تاکہ اربابِ اختیار سے جماعت کا رشتہ براہ راست استوار کر دیں۔ یہ ان کا آخری سفر تھا جس سے مراجعت پر وہ شہید کر ڈالے گئے۔

"المحرض" اور "المجاہد" زمانے کا مذاق بدل چکا تھا اور اخبارات اشاعت مقاصد کا ایک عمدہ ذریعہ بن گئے تھے۔ اس وجہ سے خود جماعت نے بھی ایک معمولی دستی پریس کے ذریعے سے مختلف اوقات میں اخباروں کے اجراء کا انتظام کیا۔ ان میں سے دو اخباروں کے چند پرچے مجھے

---

[1] امیر عبدالکریم نہیں بلکہ یہ جماعت مجاہدین کے ایک پرانے رکن تھے، جو غالباً ۱۹۲۲ء میں فوت ہوئے۔

اتفاقیہ مل گئے: ایک کا نام "المحرض" تھا، اس کی پیشانی پر یہ آیت درج ہوتی تھی: یاایہا النبی حرض المومنین علی القتال (اے نبیؐ، مسلمانوں کو لڑائی کا شوق دلا) اس کا پہلا پرچہ ۸۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کو نکلا تھا۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس کے کل کتنے پرچے شائع ہوے۔ دوسرا اخبار "المجاہد" جنوری ۱۹۴۰ء سے نکلنا شروع ہوا۔ اس کی پیشانی پر یہ آیت ثبت تھی: ولنبلونکم حتیٰ نعلم المجاہدین منکم والصابرین ونبلوا اخبارکم (اور ہم تمھیں ضرور آزمائیں گے تاکہ جان لیں کون تم میں سے جہاد کرنے والے ہیں اور کون ثابت قدم رہنے والے اور تمھارے احوال کو جانچیں گے)۔ یہ مولانا محمد بشیر شہید کی یادگار میں نکالا گیا تھا چنانچہ اس پر لکھا جاتا تھا: "یہ یادگار شہید ملت الغازی المہاجر مولوی محمد بشیر رحمۃ اللہ علیہ" دونوں اخباروں میں عموماً فارسی اور اردو کے مضامین ہوتے تھے۔ کبھی کبھی پشتو کے مقالات بھی درج کیے جاتے تھے۔ جماعت مجاہدین کے عام مخاطبین یہی تین زبانیں سمجھتے تھے۔ میں ان دونوں اخباروں کی پیشانیوں کی تصویریں کتاب میں شامل کر رہا ہوں تاکہ یادگار کے طور پر محفوظ رہیں ؛

امیر کی سیرت مولانا رحمت اللہ کی سیرت کے متعلق مولوی محمد علی صاحب قصوری مرحوم نے "مشاہدات کابل و یاغستان" میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، میں اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ خود میں ۱۹۴۵ء میں ان سے ملا تھا، یقین جانیے کہ مجھے وہ زہد و تقویٰ، ایثار و قربانی اور سادگی و بے نفسی کا ایک مثالی نمونہ نظر آئے۔ ممکن ہے منصب امارت پر فائز ہونے سے پیشتر ان کی عام حالت مختلف ہو اور مولوی محمد علی مرحوم نے انھیں غالباً ۱۹۱۸ء میں دیکھا تھا، جب مولانا نعمت اللہ امیر تھے۔ میں اسمست گیا تو امیر صاحب نے کھدر کی شلوار اور کھدر کا لمبا کرتا پہن رکھا تھا۔ سر پر کھدر کی دستار تھی جسے سیاہ رنگوا لیا تھا۔ پاؤں میں دیسی جوتا تھا، لیکن دونوں پاؤں کے جوتوں کی شکل مختلف تھی، میں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک جوتا کسی سے بدل گیا تھا، تلاش کے باوجود مل نہ سکا تو امیر صاحب بدلا ہوا جوتا ہی پہن رہے ہیں، وہ کام دے رہا ہے اور جب کام دے رہا ہے تو اسے چھوڑ کر نیا جوتا خریدنا محض تکلف ہے یا نفس پروری ؛

وہ پانچوں وقت کی نماز مسجد میں خود پڑھاتے تھے۔ جماعت کے کاموں سے فارغ ہوتے تو

اس کھیت میں کام کاج کے لیے چلے جاتے جو امیر کے لیے مخصوص تھا۔ اس میں موسم کی سبزیاں بوتے۔ روزانہ یا تیسرے دن سبزی اتارتے۔ تھوڑی سی اپنے لیے رکھ کر باقی سب کی سب مجاہدین کے گھروں میں بانٹ آتے۔ مجھے تین چار روز ان کی خدمت میں رہنے اور گھنٹوں بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ وہ خود بہت کم بولتے تھے۔ میں کوئی سوال کرتا تو تفصیل سے جواب دیتے۔ دینی علوم امیر عبدالکریم مرحوم سے پڑھے تھے۔ فنونِ حرب جماعت کے مشاق استادوں سے سیکھے تھے، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، وہ عنفوانِ شباب سے مختلف معرکوں میں شریک ہونے لگے تھے۔ پرانی وضع کے تمام ہتھیاروں کا استعمال بہت اچھے طریقے پر جانتے تھے ؛

جہادِ کشمیر آزادیٔ کشمیر کے جہاد میں جماعت مجاہدین بھی شامل ہوئی تھی، اس کے ساتھ امیر صاحب بھی کشمیر پہنچے اور جب تک لڑائی ملتوی نہ ہوئی، برابر محاذ جنگ پر رہے۔ سرحد آزاد سے باہر آنے کا ان کے لیے یہ پہلا اور آخری موقع تھا۔ میرا خیال تھا کہ جماعت کے حالات مرتب کر لینے کے بعد دوبارہ ان کی خدمت میں پہنچوں گا اور کم از کم وہ حصے انھیں ضرور سنا لوں گا، جن کا تعلق ان کی ہوشمندی کے زمانے سے ہے، لیکن افسوس، میں اپنا کام پورا نہ کر پایا تھا کہ انھیں مالک حقیقی کی طرف سے بلاوا آگیا اور وہ اس عالم میں پہنچ گئے، جہاں جانے والے واپس نہیں آتے اور موت کے دروازے سے گزرے بغیر ان تک پہنچنا ممکن نہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ؛

موجودہ صورتِ حال مولانا رحمت اللہ کی وفات کے وقت مولوی برکت اللہ نظر بند تھے اور غالباً اب تک نظر بند ہیں۔ حکم نظر بندی شاید سابقہ حکومت سرحد نے جاری کیا تھا، جس کی وجہ و علت مجھ پر منکشف نہ ہو سکی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اب جماعت کے نظم کا کیا حال ہے اور کاروبار کس طرح چل رہا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ مولوی برکت اللہ نے ہوش سنبھالنے کے وقت سے ضروری انتظامات کے سلسلے میں جو سرگرمیاں دکھائیں، وہ یقیناً قابلِ ستائش تھیں۔ انھوں نے مختلف دوائر سے تعلقات پیدا کیے، امیر رحمت اللہ اپنی سادگی اور خلوت پسندی کے باعث وہ کام انجام نہ دے سکتے تھے، جو مولوی برکت اللہ نے انجام دیے ؛

اب وہ حالات ہی باقی نہیں رہے، جن میں جماعت کی تاسیس ہوئی تھی۔ ان مقاصد کی حیثیت ہی بدل چکی ہے، جن کے لیے سوا سو سال تک بے مثال قربانیوں کا سلسلہ غیر منقطع طریق پر جاری رہا۔ نئے ماحول نے جہاد فی سبیل اللہ کے مواقع بھی بدل دیے ہیں اور اب تنظیمات بھی نئے اصول پر ہونی چاہئیں اس لیے کہ وہ دور ختم ہو گیا جس کے تقاضوں کی بناء پر سید شہید نے ۱۸۲۶ء میں خطۂ سرحد کو بطور مرکز منتخب کیا تھا۔

حرفِ آرزو حکومت پاکستان مولوی فضل الٰہی مرحوم کی تحریک پر مزروعہ اراضی کے دو چک ان اصحاب کے لیے مخصوص کر چکی ہے، جنھوں نے جماعت مجاہدین کی اعانت کے سلسلے میں انگریزی حکومت کے ماتحت گوناگوں محنتیں اور مشقتیں برداشت کیں۔ کیا جماعتِ مجاہدین کے وہ افراد کم از کم ایسے ہی سلوک کے مستحق نہیں جو اسمست میں بیٹھے ہیں اور حالات سے واقفیت رکھنے والے اصحاب کو علم ہے کہ ان کے معمولی گزارے کا بھی کوئی قابلِ ذکر وسیلہ موجود نہیں؟ آخر یہی لوگ ہیں، جن کے اسلاف اسلامیت و آزادی کا پرچم سربلند رکھنے کے لیے جانیں لڑاتے رہے اور ان کے خونِ حیات سے سرحدی کوہستان کی وادیاں اور ٹیلے مزین ہوتے رہے۔ کیا ساداتِ ستھانہ و ملکا یا سادات بونیر پر خصوصی توجہ مبذول نہ ہونی چاہیے، جو سید شہید کے وقت سے مجاہدین کے بہترین معاون رہے؟ کیا پورے علاقہ سرحد میں کوئی دوسرا گھرانا مل سکتا ہے، جس نے ان سادات کے برابر مجاہدین کی خدمات انجام دی ہوں یا اس حق پرست گروہ کی یاوری میں ویسی جانی اور مالی قربانیاں کی ہوں؟ ان حضرات کی کوئی خدمت اور کوئی قربانی کسی دنیوی منفعت کے لیے نہ تھی۔ وہ صرف اپنے خدا سے جزا کے آرزومند تھے۔ لیکن کیا کروڑوں فرزندانِ توحید کی اس وسیع سرزمین میں، جو آج آزادی کی نعمتِ عظمیٰ سے دل شاد و بامراد ہے، ان بزرگوں اور جواں مردوں کی قدر و منزلت اور عزت و احترام کا زیادہ سے زیادہ عملی اظہار نہ ہونا چاہیے، جنھوں نے خوفناک تاریکی میں اپنی شہ رگ کے لہو سے آزادی کے چراغ جلائے اور اس جذبۂ صادقہ کو کبھی افسردہ نہ ہونے دیا، جو قوموں اور ملتوں کی زندگی کا نقشِ بلند اور فلاح و دوام کا وسیلۂ ارجمند ہے؟

آٹھواں باب

جماعتِ مجاہدین اور بزرگانِ یاغستان

روشنی کی کرنیں جماعت مجاہدین کے قیام یاغستان کی طویل داستان من وعن سنائی جا چکی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ جماعت کو بارہا نہایت رنجیدہ حالات سے سابقہ پڑا اور سرحدیوں یا یاغستانیوں کے ہاتھوں ایسی خوفناک تکلیفیں اٹھائیں، جن کا ذکر بھی دل میں ناسور ڈال دینے کے لیے کافی ہے، جن دشمنوں کے خلاف جانبازانہ جنگ مجاہدین کا نصب العین تھا، شاید وہ بھی ان سے زیادہ تکلیفیں نہ پہنچاتے، تاہم اس تاریکی میں بھی روشنی کی کرنیں ملتی ہیں، مثلاً سادات ستھانہ وملکا یا سادات بونیر جن کا دامن وفا ہر دور میں مہتاب کی طرح اجلا اور بے داغ رہا اور جن کی اعانت ورفاقت کبھی کسی ذاتی غرض سے آلودہ نہ ہوئی۔ حضرت سید امیر ملا صاحب کوٹھا زندگی کی آخری ساعت تک مجاہدین کے معاون وخیر خواہ رہے، اگرچہ اس سلسلے میں انھیں حد درجہ دردناک مصائب کا ہدف بننا پڑا۔ حضرت اخوند صاحب سوات نے بھی جنگ امبیلہ کے بعد مجاہدین سے انتہائی خلوص کا برتاؤ کیا تھا، بلاشبہ بعد ازاں اس برتاؤ کی کیفیت بدل گئی۔ ان کے علاوہ بھی مختلف بزرگوں سے وقتاً فوقتاً جماعت کو بلاواسطہ یا بالواسطہ امداد ملتی رہی۔

ملا صاحب ہڈہ بہ لحاظ فضل وتقدس ان میں سے تقدم ملا نجم الدین صاحب کو حاصل ہے جو ملا صاحب ہڈہ کے نام سے معروف ہیں۔ وہ یاغستان کے بہت بڑے عالم اور مقبول عوام پیر طریقت تھے۔ اس کے علاوہ افغانستان کے مشرقی حصوں میں بھی انھیں وسیع اثر ورسوخ حاصل تھا۔ اجنبی اقتدار کے متعلق ان کا نقطہ نگاہ وہی تھا، جس پہ جماعت مجاہدین قرنوں سے کاربند چلی آتی تھی۔ چنانچہ جب ۱۸۹۵ء میں انگریزوں نے چترال پہ پیش قدمی کی تو ملائے موصوف نے اس پیش قدمی کی مزاحمت اور آزادی یاغستان

کی حفاظت میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا۔ بعد میں بھی آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی مقصد کی پیش بُرد میں صرف ہوا۔ مجاہدین کو چمرکنڈ میں مرکز قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی تو ملا صاحب ہی کی مسجد کے سایے میں اس کے لیے جگہ تجویز ہوئی۔ تفصیلات چمرکنڈ کی جاے وقوع اور کیفیت آبادی کے سلسلے میں پیش ہوں گی ۔

ملّا صاحب بابڑہ یہ ملا صاحب بھی تحریک آزادی کے تمام کارکنوں اور مجاہدین کو ہر ممکن ذریعے سے مدد دیتے رہے۔ مرکز چمرکنڈ کی حفاظت میں ان کے اثر ورسوخ کا بھی خاص حصہ ہے۔ ان کا اصل نام غالباً عبدالکریم تھا۔ یاغستان کے اکابر علماء و اہل طریقت میں شمار ہوتے تھے۔ مولوی محمد علی قصوری نے سفر یاغستان میں ان کی زیارت کی تھی، لکھتے ہیں :

> ملّا صاحب سفید ریش بزرگ تھے۔ میرے خیال میں اس وقت (۱۶-۱۹۱۵ء) میں ان کی عمر ستّر سے متجاوز ہوگی۔ مگر صحت نہایت عمدہ تھی، بغیر عینک کے قرآن شریف پڑھتے تھے اور ایسے تیز رو کہ جوان بھی مشکل سے ساتھ دے سکیں۔ دُبلے پتلے جسم کے، دراز قامت اور چہرے سے نور ایمانی اور فہم وفراست عیاں تھے۔ بات چیت میں نہایت سنجیدہ[۱] ۔

ملّا صاحب سنڈاکے ان ملّا صاحب کا اسم گرامی علی احمد تھا۔ چکیسر کی طرف دریاے سندھ کے مغربی کنارے پر "سنڈاکے" نام ایک گاؤں ہے، ملّا صاحب اسی کی نسبت سے مشہور ہیں۔ زہد وعبادت میں انھیں اونچا درجہ حاصل تھا۔ اہل صوات نے نواب دیر کے تصرف سے آزادی حاصل کرنے کے لیے تنظیمات کا سلسلہ شروع کیا تو ملا صاحب کو اپنے ہاں لے آئے، اوّل اس خیال سے کہ ایک مقدس اور خدا رسیدہ بزرگ کی سرپرستی میں ضروری تنظیمات جلد پایۂ تکمیل پر پہنچ جائیں گی، دوم یہ خیال ہوگا کہ ملا صاحب، حضرت صاحب ہڈہ کے مرید اور خلیفہ ہیں اور ان کے متعدد خواجہ تاش

---

[۱] "مشاہدات کابل ویاغستان" ص۸۳ ۔

آس پاس کے مختلف علاقوں میں موجود تھے، لہٰذا ان کی وجہ سے سب کی تائید و اعانت حاصل ہو گی۔ ویسے بھی اس قسم کی تحریکات میں مقدس بزرگوں کا شمول عوام میں خاص برکات کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے صوات میں جو تحریک جاری کی، اس کے حالات آگے چل کر بیان کیے جائیں گے۔

حاجی صاحب ترنگ زئی | حاجی صاحب کا نام فضل واحد تھا۔ تحصیل چارسدہ کے ایک گاؤں ترنگ زئی کے باشندے تھے۔ یہ ان اٹھ مقامات میں شامل تھا، جن کی وجہ سے زمانۂ ماضی میں علاقہ چارسدہ کا نام ہشت نگر رہا۔ سید عبدالجبار شاہ ستھانوی حاجی صاحب کے متعلق لکھتے ہیں کہ انھیں:

> میں نے دیکھا ہے، وہ ایک عابد و زاہد اور صالح شخص ہے، علم اس کا زیادہ نہیں۔ بہت سادہ، صاف دل اور نیک بزرگ ہے[1]۔

مولانا حسین احمد مدنی فرماتے ہیں کہ حاجی صاحب نہایت متقی، پرہیزگار، صاحب علم و فضل اور مشہور پیران طریقت و سلوک میں سے تھے[2]۔ ان کا تعلق شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کی تحریک آزادی سے بھی پیدا ہو گیا تھا۔ پہلی جنگ یورپ میں ترک انگریزوں کے خلاف جرمنی کے معاون بن گئے اور خلافت اسلامیہ کی طرف سے جہاد کا اعلان ہو گیا تو حاجی صاحب بھی دعوتِ جہاد کے لیے وقف ہو گئے۔ زمانہ بڑا نازک تھا، جب معلوم ہو گیا کہ انھیں گرفتار کر لینے کی تجویزیں زیر غور ہیں تو ضعف پیری کے باوجود بہت بڑی جائداد چھوڑی اور وطن مالوف سے ہجرت کر کے بونیر چلے گئے۔ اہل و عیال کو بھی ساتھ لے گئے۔ ان کے فرزندوں میں سے فضل اکبر عرف بادشاہ گل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ملا صاحب بابڑہ اور ملا صاحب سنڈاکے کی طرح حاجی صاحب نے بھی حضرت صاحب ہڈہ ہی سے روحانی فیض حاصل کیا تھا۔

جنگ رستم | بونیر پہنچتے ہی حاجی صاحب نے نفیر عام کا صور پھونک دیا۔ چونکہ خود دامن درۂ حسن

---

[1] شہادت الثقلین حصہ دوم قلمی نسخہ ص ۱۴۰۔ [2] نقش حیات جلد دوم ص ۱۸۱۔

کی زندگی اور بہت بڑی جائداد چھوڑ کر راہِ حق میں گامزن ہوے تھے، علاوہ بریں علم وفضل اور تقدس میں خاص شہرت حاصل تھی۔ اس لیے بہت جلد خاصی بڑی جمعیت کو بغرض جہاد تیار کر لیا۔ جماعتِ مجاہدین بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئی اور انھوں نے سدم یارستم کے علاقے میں انگریزی چوکیوں پر ہلّہ بول دیا۔ حکومت کو ان کی سرگرمیوں کا علم ہو چکا تھا اور مقابلے کے لیے پوری تیاری کر لی گئی تھی۔ حملہ آوروں کے خلاف توپوں کی گولہ باری شروع ہوگئی اور پہلے ہی حملے میں ایک سو کے قریب جانیں تلف ہوئیں۔ اس پُرزور مدافعت نے قبائلیوں کو پریشان کر دیا اور وہ منتشر ہونے لگے میں بارہا عرض کر چکا ہوں کہ وہ ہر دینی دعوت پر خلوص سے جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے، لیکن چونکہ باقاعدہ عسکری تنظیمات سے محروم تھے اور منظم فوجوں کی طرح جم کر لڑنا انھیں نہ آتا تھا، اس لیے ان کی قربانیاں عموماً دلخواہ نتائج پیدا نہ کرتی تھیں۔ البتہ جماعت مجاہدین نے استقامت سے مقابلہ کیا اور مسلسل چھاپے مارتے رہے۔ اس رزم وپیکار کے سلسلے میں جماعت کا ایک بلٹیں امیر نعمت اللہ کے حالات میں پیش کیا جا چکا ہے۔

حاجی صاحب کی مجاہدانہ مساعی کے ساتھ ساتھ صاحب سنڈاکے نے صوات میں جو اقدامات کیے ان کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ صوات کے عمومی حالات کا سرسری نقشہ پیش کر دیا جائے۔

صوات میں صورت حالات صوات کے بادشاہ سید اکبر شاہ ستھانوی کی وفات عین اس دن ہوئی تھی، جس دن ہندوستان میں "غدر" کا آغاز ہوا یعنی ۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء کو۔ مرحوم بادشاہ کے فرزند شہزادہ مبارک شاہ کم وبیش چھ مہینے تک نظم ونسق کے بکھرے ہوے شیرازے کو درست کرنے میں لگے رہے، جب انھوں نے دیکھا کہ مخالف قوتوں کا طوفان خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے تو وہ خود باہر نکل آئے کہ اہل صوات اپنے لیے جو انتظام مناسب سمجھیں، کر لیں۔ ان لوگوں کی عقیدت وارادت کا سب سے بڑا مرجع حضرت اخوند صاحب صوات تھے، انھوں نے بادشاہی قبول نہ کی اور قبائل نے اپنا اپنا انتظام کر لیا۔

رئوساے باجوڑ کی ایک شاخ جندول میں حکمران تھی، جو باجوڑ ہی کا ایک حصہ ہے۔ خان جندول

کے ایک فرزند عمرا خاں نے گزشتہ صدی کے آخری بیس سال میں خاصی شہرت حاصل کر لی۔ والد نے اسے اختلاف کی بنا پر باہر نکال دیا تھا۔ وہ ۱۸۷۸ء میں لوٹا اور ایک سال کی کشمکش کے بعد جندول پر قابض ہوگیا، پھر اس کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا، چنانچہ اس نے ۱۸۹۰ء تک پوری ریاست دیر کے علاوہ باجوڑ کے بڑے حصے اور جنوبی صوات پر بھی قبضہ کر لیا۔ پھر وہ چترال کے اس دعوے دار کا حامی بن گیا جو ریاست سے جلاوطن تھا اور ایک ہی ہلّے میں اس نے چترال کو بھی لے لیا۔ اس اثنا میں محمد شریف خاں رئیس دیر بالا صوات میں جلاوطن ہو کر بیٹھا رہا۔

۱۸۹۵ء میں انگریزوں نے چترال پر پیش قدمی کی تو فوج کو پائیں صوات اور دیر سے گزارے بغیر چارہ نہ تھا۔ اس طرح براہ راست عمرا خاں سے کشمکش شروع ہوگئی۔ انگریزوں نے اپنے پرانے شیوے کے مطابق دیر کے جلاوطن رئیس محمد شریف خاں کو ساتھ لیا۔ قبائل دیر عمرا خاں کے حامی تھے اور وہ اپنے رئیس کے ساتھ ہو گئے۔ انگریزی فوج کے لیے بہ سہولت گزر کا انتظام ہو گیا اور دیر کے علاوہ صوات کا وہ علاقہ بھی، جو عمرا خاں کے قبضے میں تھا، انگریزوں نے محمد شریف خاں کے حوالے کر دیا۔

دیر و صوات کی کشمکش محمد شریف خاں دور اندیش اور تجربہ کار آدمی تھا، اس نے اہل صوات کو مطمئن رکھنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر اس کے جانشین اورنگ زیب خاں کے عہد میں اہل صوات ظلم و جور کا ہدف بن گئے۔ اورنگ زیب خاں کانوں سے بہرا تھا، زبان میں لکنت تھی اور مرض جذام میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے پہلے ہی دن سے سارا کاروبار اپنے ملازموں پر چھوڑ دیا، جن کے سامنے زیادہ سے زیادہ پیسے وصول کرنے کے سوا کوئی نصب العین نہ تھا۔ پھر اورنگ زیب خاں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مختلف علاقے اجاروں پر دے دیتا اور بندھی رقمیں وصول کر لیتا۔ اجارہ دار جس طرح چاہتے رعایا کا خون چوستے۔ اہل صوات نے دو تین مرتبہ ریاست دیر کے کارکنوں کو بزور باہر نکال دیا، لیکن وہ فوج لے کر آتے اور قوت کے بل پر تمام بقایے وصول کر لیتے۔

تنگ آکر اہل صوات نے یہ سوچا کہ کسی کو بادشاہ بنا کر قومی قوت کی تنظیم کا انتظام کریں، پھر لڑ کر نواب دیر کے چنگل سے رہائی پائیں۔ اسی سلسلے میں وہ ملّا صاحب سنڈاکے کو اپنے ہاں لائے تھے،

اسی سلسلے میں مختلف شخصیتوں کے سامنے بادشاہی کی پیش کش کی' لیکن دیر کی زبردست جنگی قوت کے خوف سے کوئی شخص کانٹوں کا تاج سر پر رکھنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔

سیّد عبدالجبّار شاہ ستھانوی آخر سب نے بالاتفاق طے کیا کہ بادشاہی کے لیے سب سے بڑھ کر موزوں سیّد عبدالجبار شاہ ہیں' جو ریاست امب کے وزیر کی حیثیت میں اپنی انتظامی' سیاسی اور حربی صلاحیتوں کے روشن ثبوت پیش کر چکے تھے۔ ان کے اعزّہ و اقربا بونیر' چملہ' صوات اور یاغستان کے دوسرے حصّوں میں جا بجا موجود تھے اور یقین تھا کہ وہ سب سیّد موصوف کے معاون بن جائیں گے' نیز سادات کے اس گھرانے کا ایک جلیل القدر فرد (سیّد اکبر شاہ) ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۷ء تک صوات میں بادشاہی کے منصب پر فائز رہ چکا تھا۔ یہ سیّد اکبر شاہ' سیّد عبدالجبار شاہ کے جدِ امجد سیّد عمر شاہ کے حقیقی بھائی تھے۔

غور و مشورہ کے بعد قرار پایا کہ سیّد عبدالجبّار شاہ صوات میں شرعی اصول کے مطابق نظامِ حکومت قائم کریں' قومی قوت کو منظم کر کے بتدریج صوات کو دیر کے تصرف سے نجات دلائیں اور تمام وزرا و سا و خوانین سیّد موصوف کے معین و یاور رہیں۔ ۹- جمادی الاخریٰ ۱۳۳۳ھ (۲۴- اپریل ۱۹۱۵ء) کو دریائے صوات کے جنوبی کنارے پر بانڈی بالا میں درختہائے چنار کے نیچے سیّد عبدالجبار شاہ کی دستار بندی ہوئی اور وہ صوات کے حکمران بنے۔ ملّا صاحب سنڈاکے کو اس حکومت میں غیر رسمی طور پر شیخ الاسلام کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

مشکلاتِ کار پیشِ نظر کام بے حد کٹھن تھا اور اس کے لیے انتہائی محنت و جفاکشی کے علاوہ تمام قومی عناصر کے دلی تعاون اور حسنِ تدبیر کی ضرورت تھی۔ مثلاً:

۱- دیر کی جنگی قوت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مناسب قوت فراہم کر لینا خاصے وقت کا محتاج تھا۔

۲- قبائل کی عام حالت ایسی تھی کہ جب تک ان سب کو نئے انتظام کے ماتحت صریح فائدہ نظر نہ آتا' امید نہ تھی کہ وہ خوش دلی سے اس کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہوں گے۔

۳- پھر ہر قبیلے میں مختلف گروہ تھے۔ لہٰذا ہو ائرۂ نظم میں ان کے درمیان توازن قائم رکھے بغیر اندیشہ

لگا رہتا تھا کہ وہ بگڑ جائیں گے ۔

۴ - سوات و دیر اگرچہ یاغستانی علاقے تھے اور یاغستانی علاقوں کے معاملات میں انگریزوں کو براہ راست مداخلت کا حق حاصل نہ تھا، تاہم حکومت ہند نواب دیر کی حامی اور سرپرست تھی اور ذراسی بھی بے احتیاطی ایسے حالات پر منتج ہو سکتی تھی کہ حکومت مذکورہ دیر کی حمایت کے لیے میدان جنگ میں اتر آتی ۔

۵ - چکدرہ کی فوجی چھاؤنی ایسے مقام پر واقع تھی، کہ ہر وقت پیچیدگیوں کا خطرہ لگا رہتا تھا ۔

غالباً ایسے ہی نازک حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سیّد عبدالجبّار شاہ نے ملّا صاحب سنڈاکے سے بابت چیت کے دوران میں یہ معاملہ بھی طے کر لیا تھا کہ سوات کی تنظیمات مکمّل ہونے اور دیر کے تصرف سے آزادی حاصل کرنے تک کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے جس سے حکومت ہند کو مداخلت کا بہانہ مل جائے ۔ ایک بہت بڑی وجہ تشویش یہ تھی کہ جنگ یورپ زوروں پر تھی ترک انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں ہمہ گیر تشویش پھیلی ہوئی تھی ۔ انگریزوں کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ یاغستان میں کوئی ایسا ہنگامہ بپا نہ ہو جو یاغستانی قبائل کو مشتعل کر دے ۔ سر جارج روس کیپل صوبہ سرحد کا چیف کمشنر تھا، اس کی خود رائی سب پر واضح تھی حکومت سرحدی معاملات میں اسی کی رائے پر عمل کرتی تھی سو سیّد عبدالجبّار شاہ کا سخت مخالف اور نواب دیر کا سرگرم حامی تھا ۔

ملّا صاحب سنڈاکے کا اقدام | حاجی صاحب ترنگ زئی نے بونیر میں جو اقدام کیا تھا، اس سے کوئی دل خواہ نتیجہ نہ نکلا اور قبائل بونیر ابتدائی نقصان کے بعد افسردہ ہو کر بیٹھ گئے تو حاجی صاحب نے ملّا کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ بھی کچھ کریں اور ہمیں سوات میں بلا لیں ۔ یہ پیغام ملا تو ملّا صاحب سنڈاکے نے براہ راست انگریزوں کے خلاف جہاد کے وعظ کہنے شروع کیے اور اس غرض سے بڑا لشکر تیار کر لیا۔ سیّد عبدالجبّار شاہ نے ایک خاص مجلس میں اس اقدام کے مضر پہلو واضح کیے اور لوگوں نے ان پہلوؤں کو معقول تسلیم کیا تو ملّا صاحب ناراض ہو کر چلے گئے ۔ یہ دیکھ کر لوگوں پر پریشانی طاری ہوگئی ۔ انھوں نے

سمجھا کہ ایک خدا رسیدہ ہستی جس کی اپنی کوئی غرض نہ تھی، ناراض ہو کر چلی گئی، یہ امران سب کے لیے غضب آسمانی کا موجب بنے گا۔ چنانچہ ملا صاحب کو راضی کر کے لایا گیا، ان کی تجویز کے مطابق لشکر تیار کر لیے گئے اور حملہ کر دیا گیا۔ انگریزی فوج پہلے سے تیار تھی۔ اس نے منظم طریق پر گولہ باری شروع کی تو قبائلی لشکر ٹھہر نہ سکے اور منتشر ہو گئے یہاں تک کہ افراتفری میں ملا صاحب کو بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔ انگریزوں نے اب نواب دیر کی فوج بھی طلب کر لی اور دونوں نے مشترکہ حیثیت میں صوات کے اندر پیش قدمی کا فیصلہ کر لیا۔ جو عناصر سید عبدالجبار شاہ کی تنظیمات سے بہ دل متنفر تھے اگرچہ بہ ظاہر انھیں کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، وہ سب یک سو ہو کر بیٹھ گئے۔ ملا صاحب سنڈاکے نے بونیر پہنچ کر سید علی ترمذی غوث بونیر کے مزار شریف پر ڈیرہ جا لگایا۔ شاید ان کی خواہش یہ تھی کہ اہلِ صوات اگر دشمن کے مقابلے میں استقامت کا مظاہرہ نہ کر سکے تو اہلِ بونیر کو تیار کرنا چاہیے۔

دفاعی تدبیریں اب سید عبدالجبار شاہ نے منتشر قومی عناصر کو فراہم کر کے ایک دفاعی منصوبہ تیار کیا، جس کا مدعا یہ تھا کہ پیش قدمی کرنے والے انگریزی لشکر پر خفیہ پہاڑی مورچوں سے بے پناہ چھاپوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا جائے، نیز حضرت اخوند صاحب صوات کے ایک خلیفہ صاحبزادہ بابا سے اہلِ دیر کے نام ایک اعلام لکھوایا، جس کا مضمون یہ تھا کہ میں دنیوی معاملات اور ملکی جنگوں سے ہمیشہ الگ رہا ہوں، لیکن انگریزوں نے آزاد اسلامی ملکوں پر حملے شروع کر دیے ہیں۔ یہ ایسا معاملہ ہے جو مدت مدید سے پیش نہ آیا تھا۔ انگریز خلیفۃ المسلمین کے خلاف بھی جنگ کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ صوات پر لشکر لے آئے ہیں اور دیر کا لشکر بھی ان کے ساتھ ہے۔ اہلِ دیر کو میری نصیحت یہ ہے کہ اسلام اور ایمان بیچ کر صوات کو انگریزوں کے قبضے میں نہ دیں۔ بہتر یہ ہے کہ واپس چلے جائیں یا آگے نہ بڑھیں اور جہاں ہوں وہیں ٹھہرے رہیں، اگر آگے بڑھے تو:

> میں بہ ذات خود قتال کے لیے موجود رہوں گا، میری موت تمھارے ہاتھ شہادت کی موت ہو گی اور تمھارے مُردے اہلِ صوات کی گولیوں سے داخل صفِ کفار ہوں گے، دنیا کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ دو دن کی زندگی کی خاطر ایمان ضائع کر دینا سخت بدنصیبی

کا باعث ہوگا ۔

اس اعلام کی نقلیں اہلِ دیر کے علاوہ اہلِ صوات کو بھی بھیج دی گئیں اور ایسا بندوبست کر دیا گیا کہ ہر شخص اس کے مضمون سے آگاہ ہو جائے ۔ یہ بھی جان لے کہ مدافعت کرنے والے لشکر کے علمدار حضرت صاحبزادہ بابا ہوں گے ۔ ملا صاحب سنڈاکے کو بھی یہ اعلام پہنچا دیا گیا۔ ساتھ ہی لکھا گیا کہ دریائے سندھ سے جلال آباد (افغانستان) تک آپ کے لیے لشکر فراہم کرنے کا بندوبست ہو چکا ہے ، تشریف لائیں اور جو مورچہ اپنے لیے پسند کریں ، اس میں بیٹھ جائیں ۔

نواب دیر اور انگریزوں کے لیے سراسیمگی

حضرت صاحبزادہ بابا لشکر لے کر اس جگہ سے قریب جا بیٹھے جہاں انگریزوں اور نواب دیر کا لشکر تھا۔ ان کے اعلام نے ہمہ گیر سراسیمگی پیدا کر دی تھی۔ اس اثنا میں ملا صاحب سنڈاکے بھی بونیر سے تشریف لے آئے اور انھوں نے پائیں صوات کے جنوبی و مغربی حصے میں شموزئی اور اون زئی کے درمیان ڈوپ نامی پہاڑ پر صاحبزادہ بابا سے بھی آگے بڑھ کر مورچہ قائم کر لیا۔ سیّد عبدالجبار شاہ نے عبدالواحد جمعدار کو مع ان کی نفری کے ملا صاحب کے ہمراہ کر دیا تھا۔ بہت سے غازی بھی اس مورچے میں پہنچ گئے تھے۔ یوں ملا صاحب سنڈاکے کے مورچے سے انگریزی لشکر پر چھاپوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سیّد عبدالجبار شاہ فرماتے ہیں کہ بلاناغہ ہر رات شبخون مارا جاتا۔ ادھر صاحبزادہ بابا کے اعلام نے اہلِ دیر کو بھی بے حد متاثر کیا ۔ وہ دن کے وقت تو چپ چاپ بیٹھے رہتے ، رات کے وقت خود انگریزی کیمپ پر چھاپے مارتے ۔ ایک شب کے چھاپے میں دو تین آدمی مقتول ہوئے ۔ صبح کے وقت سب پر آشکارا ہو گیا کہ یہ لوگ لشکر دیر سے متعلق تھے ۔ نواب بھی پریشان ہو گیا اور انگریز بھی ۔ آخر انگریزی فوج پیش قدمی کا ارادہ ترک کر کے چکدرہ کے پاس میدان میں خیمہ زن ہو گئی [1]

---

[1] یہ حالات سیّد عبدالجبار شاہ کی کتاب شہادۃ الثقلین حصہ دوم سے ماخوذ ہیں ۔

بقیہ حالات | سیّد عبدالجبّار شاہ تقریباً دو سال صوات کے حکمران رہے، پھر انھیں مختلف اسباب کی بناء پر وہاں سے نکلنا پڑا، جن کی تفصیل موجودہ کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ ملّا صاحب سنڈاکے بالا سوات میں چلے گئے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کب ان کی وفات ہوئی۔ حاجی صاحب ترنگ زئی بونیر سے صوات پہنچے۔ سیّد عبدالجبار شاہ نے ان کے لیے اتنے غلّے کا انتظام کر دیا تھا جو وقت کے نرخ کے مطابق پانچ چھ ہزار روپے کا ہوگا۔ پھر حاجی صاحب بالا صوات میں اپنے ایک مرید کے ہاں جا ٹھہرے۔ انجام کار صوات کے قیام کو ناپسند کرتے ہوئے مہمند قبیلے میں چلے گئے، وہیں اقامت اختیار کر لی اور وہیں وفات پائی۔

نواں باب

شیخ الہندؒ کی تحریکِ آزادی

ایک اہم تحریک شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نے آزادی کی جو تحریک منظم کی تھی، اگرچہ اسے براہ راست جماعت مجاہدین سے ربط و تعلق نہ تھا، لہٰذا اس کے تفصیلی تذکرے کا یہ موزوں مقام نہیں، تاہم دونوں تحریکوں میں اشتراک کے کئی پہلو موجود تھے۔ دونوں کا سلسلہ ارادت شاہ اسمٰعیل شہید اور سیّد احمد شہید پر منتہی ہوتا تھا۔ دونوں کے مقاصد میں خاصی یکسانی تھی۔ دونوں مسلمانوں کی سربلندی اور ہندوستان کی آزادی کے لیے کوشاں تھیں۔ دونوں نے ابتدائی سرگرمیوں کے لیے یاغستان کو منتخب کیا اور ہندوستان کے حواشی میں یہی ایک موزوں خطہ تھا، جہاں بین الملّی پیچیدگیوں سے محفوظ رہ کر تہیّہ ساز و سامان، فراہمی افراد اور استعداد عمل کے لیے جدوجہد کی جا سکتی تھی۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت شیخ الہند کے مقرر فرمائے ہوئے کارکن بوقت ضرورت جماعت مجاہدین سے مدد لیتے رہے۔ دونوں جماعتوں کے کارکنوں کو جہاں ایک دائرے میں کام کا موقع ملا، وہ اشتراک پر کاربند رہے۔ لہٰذا اس تحریک کا مجمل سا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

ابتدائی طریق کار افسوس کہ اس تحریک کے پورے حالات اب تک روشنی میں نہ آسکے۔ میں جانتا ہوں کہ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عبید اللہ مرحوم سندھی نے اپنے اپنے حلقہ ہائے عمل کے متعلق خاصی گراں قدر معلومات فراہم کر دی ہیں، لیکن جس حد تک مجھے علم ہے، تحریک کے ابتدائی طریق کار کا سراغ لگانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ میرے مطالعے اور غور و فکر کا نچوڑ یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند اپنی عملی زندگی کے آغاز ہی میں ایک نقشۂ عمل تیار کر چکے تھے اور اسے لباسِ عمل پہنانے کی کوششیں انھوں نے اس وقت سے شروع کر دی تھیں، جب ہندوستان کے اندر سیاسی سرگرمیاں محض

برائے نام تھیں۔ ملک کے حالات کسی تیز تحریک کے لیے ہرگز سازگار نہ تھے۔ مسلمانوں پر حیرانی اور افسردگی طاری تھی۔ وہ ثریّا سے تحت الثریٰ میں جا گرے تھے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی کھوئی ہوئی حیثیت حاصل کرنے کے لیے کون سا راستہ اختیار کریں اور کس طریقِ عمل پر گامزن ہوں۔ ایسے اصحاب بہت کم نظر آتے تھے، جن کے خلوص پہ اعتماد کیا جاسکے اور جو پیشِ نظر مقاصد کے لیے بے تکلف ہر قسم کی قربانیوں پر آمادہ ہوں، پھر حضرت شیخ الہند کے سامنے ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کو حکومت کے عتاب کا ہدف بننے سے حتی الامکان محفوظ رکھیں۔

اسلامی درسگاہوں کی تحریک میرے اندازے کے مطابق انھوں نے یہ طے کیا تھا کہ جن جن اصحاب میں عملی صلاحیت پائیں، انھیں جا بجا خصوصاً یاغستان کے مختلف حصّوں میں دینی اور اسلامی درسگاہیں قائم کرنے کی ترغیب دیں۔ ملّا صاحب سنڈاکے نے بھی حضرت شیخ الہند سے ملاقات کی تھی۔ انھوں نے جب کام شروع کیا تو ابتدا میں ایک اہم اسلامی درسگاہ ہی قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ حاجی صاحب ترنگ زئی شیخ الہند سے استفادہ کر چکے تھے، ان کے پیشِ نظر بھی درسگاہیں قائم کرنے ہی کا سلسلہ تھا۔

سیّد عبدالجبار شاہ ستھانوی لکھتے ہیں: جب مجھے نمایندگانِ صوات نے بتایا کہ ملّا صاحب سنڈاکے اسلامیہ کالج پشاور کے بالمقابل ایک عالی شان اسلامی درسگاہ کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں، تو میں نے ان پہ صاف صاف واضح کر دیا کہ یہ اصطلاح ایک خاص جماعت کا شعار ہے، جس میں مولوی صاحبان اور علماء شامل ہیں۔ اسلامی درسگاہوں کو حکومتِ برطانیہ کے خلاف تنظیمات کا پردہ بنا لیا گیا ہے اور حاجی صاحب ترنگ زئی جو اپنے ضلعے میں ایسی درسگاہیں قائم کرنا چاہتے ہیں، وہ بھی اس حلقے کے ایک رکن ہیں۔ سیّد صاحب کہتے ہیں کہ مجھے یہ تو علم نہ تھا یہ اصطلاح کس نے ایجاد کی اور اس کا مرکز کہاں تھا، لیکن جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان نے واضح کر دیا تھا کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں ترکوں کے دشمن حملہ آوروں کی پشتیبانی کر کے خلافتِ اسلامیہ کو برباد کر دینے کے درپے ہیں۔ اس پر مسلمانوں میں ہمہ گیر بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ علماءِ حق خلافتِ اسلامیہ اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لیے

سرگرم عمل ہو گئے۔ اس سلسلے میں تبلیغ و اشاعت کے لیے بہترین طریقہ یہ سمجھا گیا کہ گاؤں گاؤں اور بستی بستی میں اسلامی درسگاہیں قائم کر دی جائیں[1]۔

صحیح تربیت غرض شیخ الہند کا ابتدائی منصوبہ یہی تھا اور اسے حضرت کے تعلیمی مشاغل سے خاص مناسبت تھی۔ یاد رہے کہ سید احمد شہید نے جب مسلمانوں کو بہ غرض جہاد منظم کرنے کا قصد فرمایا تھا تو پیروں کے شیوے کے مطابق مختلف علاقوں کے دورے شروع کر دیے تھے۔ جگہ جگہ وعظ بھی ہوتے، بیعت بھی لی جاتی، " توجہ " بھی دی جاتی۔ اس طریقے کو سید شہید کے مشاغل سے خاص مناسبت تھی۔ میرے نزدیک مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی بانیانِ دارالعلوم دیوبند کا اصل مقصد و نصب العین بھی وہی تھا، جس کے لیے کارفرمایانِ دیوبند میں سے صرف حضرت شیخ الہند سرگرم عمل ہوے۔ اس طریقے اور شیوے کے مطابق جلد حسبِ مراد نتیجے برآمد ہونے کی توقع نہ رکھی جا سکتی تھی، تاہم ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ انقلابی مساعی کے ساتھ ساتھ عوام کی صحیح تربیت کا کام بھی انجام پاتا جاتا، جس طرح سید شہید کی دعوت اصلاح میں انجام پاتا تھا۔ اُس انقلاب سے بڑھ کر مصیبت خیز اور تباہ کن شے کوئی نہیں ہو سکتی، جس کے عوام پیش نظر مقاصد کی تربیت سے کاملاً بے بہرہ ہوں۔ دریاؤں کا پانی نہروں کے ذریعے سے کھیتوں میں پہنچتا ہے تو زمین کی اندرونی صلاحیتیں پیداوار کے انبار فراہم کر دیتی ہیں، لیکن اگر وہ پانی بے پناہ سیل کی شکل اختیار کر لے تو بستیوں کی ویرانی اور فصلوں کی بربادی کے سوا کیا نتیجہ نکلے گا؟

حوادث کا ہجوم و تواتر مجھے یقین ہے کہ حضرت شیخ الہند مرحوم و مغفور اپنے اسی منصوبے کے مطابق کاربند رہنا چاہتے تھے، لیکن حالات کی خوفناک مخالفانہ رفتار اور حوادث کا ہجوم و تواتر ان کے صبر و شکیب کے لیے شدید آزمائشوں کا موجب بن گیا۔ مولانا حسین احمد فرماتے ہیں کہ حضرت کی گہری نظر واقعات عالم، بالخصوص ہندوستان اور ترکی پر مرکوز رہتی تھی۔ طرابلس اور بلقان کے زہرہ گداز مظالم

---

[1] شہادت الثقلین حصہ دوم قلمی نسخہ ص۳۷۔

اور اندرونِ ہند میں انگریزوں کی روز افزوں چیرہ دستیوں نے انھیں اس قدر متاثر کیا کہ آرام اور چین تقریباً حرام ہوگیا۔ گویا وہ اپنے اختیار سے نکل گئے۔ نتائج و عواقب سے بے پروا ہوکر انھیں سر بہ کف اور کفن بردوش میدان انقلاب میں نکلنا پڑا۔ زمانے کی تاریکیاں، موسم کی کالی کالی گھٹائیں، احوال کی نزاکتیں، اہلِ ہند بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ کمزوریاں رکاوٹ بن کر سامنے آئیں اور کچھ عرصہ اسی غور و خوض میں گزرا، مگر پانی سر سے گزر چکا تھا، اس لیے خوب سوچ سمجھ کر صرف قادرِ مطلق پر اعتماد اور بھروسا کر کے کام شروع کر دیا۔[1]

ابھی وہ کوئی فیصلہ کن قدم نہ اٹھا سکے تھے کہ پہلی جنگ یورپ شروع ہوگئی۔ دو تین ماہ بعد ترک انگریزوں کے خلاف جنگ میں شامل ہو گئے۔ گویا اطمینان و دلجمعی سے آہستہ آہستہ کام جاری رکھنے اور نتائج کا انتظار کرنے کی مہلت ختم ہوگئی اور اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ جو کچھ بھی ممکن ہو، فی الفور کیا جائے تاکہ انگریزوں کی مشکلات میں اضافہ ہو، ترکوں کو تقویت پہنچے اور ہندوستان کی آزادی کا خواب اپنی صحیح تعبیر سے ہم آغوش ہو جائے۔

فوری کام کی ضرورت حضرت شیخ الہند ان تمام اصحاب کی طبیعتوں اور صلاحیت استقامت کا اندازہ فرماتے رہتے تھے، جو ان کے پاس تعلیم و استفادہ کی غرض سے آتے۔ ان میں سے بعض موزوں اصحاب کو انھوں نے اپنے کام کے لیے چن لیا تھا۔ انھیں حکم دے دیا کہ جلد سے جلد یاغستان پہنچ جائیں اور آزاد قبائل کو ہندوستان پر حملے کے لیے اٹھائیں، مولانا عبید اللہ مرحوم کو انھوں نے افغانستان بھیج دیا کہ امیر حبیب اللہ خاں والیِ افغانستان کو اس نازک وقت میں خدمت اسلامیت کے لیے جانبازانہ اقدام پر آمادہ کریں۔ حاجی صاحب ترنگ زئی اور ملا صاحب سنڈاکے کے متعلق ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ وہ حضرت شیخ الہند کی تحریک سے وابستہ تھے۔ ان کے علاوہ مولانا سیف الرحمٰن، مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری، مولانا فضل ربی، مولانا فضل محمود، مولانا محمد اکبر حضرت شیخ کے خاص

---

[1] "نقشِ حیات" جلد دوم ص ۱۳۵، ۱۳۶۔

کارکن تھے۔ خود ہندوستان میں ان کے مخلص کارکنوں کا شمار مشکل ہے، مثلاً مولانا عبدالرحیم رائے پوری، مولانا خلیل احمد، مولانا محمد احمد چکوالی، مولانا محمد صادق (کراچی) شیخ عبدالرحیم سندھی، مولانا محمد ابراہیم راندیری، مولانا غلام محمد دین پوری، مولانا تاج محمود (امروٹ، ضلع سکھر)، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم عبدالرزاق انصاری وغیرہ سیکڑوں ایسے اصحاب ہیں، جن کے نام بھی ہمیں معلوم نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، نواب وقار الملک اور وقت کے اکثر بڑے بڑے رہنما حضرت شیخ الہند کے مشیر و معاون تھے۔

مولانا عبیداللہ سندھی مولانا عبیداللہ سندھی کابل جانے کے لیے تیار ہو گئے تو اس سلسلے میں پہلا اہم مسئلہ روپے کا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس مقصد کے لیے حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون مرحوم سے ملاقات کی۔ انھوں نے بے تامل پانچ ہزار روپے پیش کر دیے، جو مولانا عبیداللہ کو دے دیے گئے[1]۔ معلوم نہیں، اس کے سوا بھی کوئی رقم ملی یا نہ ملی۔ دوسرا مسئلہ اخفا کا تھا، خفیہ پولیس مولانائے مرحوم پر متعین تھی اور ان کی ہر نقل و حرکت کی نگرانی کی جاتی تھی۔ اس مصیبت سے بچنے کی تدبیر یہ سوچی گئی کہ مولانا بہاول پور اور سندھ چلے جائیں۔ وہاں دیہات میں اس طرح رہنے لگیں، گویا کوئی کام ان کے پیش نظر نہیں۔ چنانچہ وہ ۱۹۱۵ء کے اوائل میں دہلی چھوڑ کر پہلے بہاول پور بعد ازاں

---

[1] حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون مرحوم نے پچیس روپے ماہانہ کی ملازمت سے زندگی شروع کی تھی۔ پھر وہ بہت بڑے تاجر بن گئے اور ان کی آمدنی لاکھوں روپے سالانہ تھی۔ وہ ہر دور اور ہر عہد میں قومی کاموں کے لیے معتدبہ رقمیں نکالتے تھے۔ موجودہ صدی کے اوائل میں سندھ کے اندر تبلیغ اسلام کے لیے جو کام جاری ہوا تھا، اس میں بھی بے شمار روپیہ خرچ کیا۔ خلافت، لیگ اور مسلم کانفرنس کی تنظیمات میں بھی وہ چپ چاپ گرانقدر امداد دیتے رہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ اجرائے کار کے سوا ان کے سامنے کوئی غرض نہ تھی۔ دوسرے اداروں کو جو روپیہ دیا اس کا حساب مشکل ہے۔ خود کراچی میں دو اداروں کا پورا خرچ ان کے ذمے تھا۔

سندھ پہنچ گئے۔ اس اثناء میں راستے کے انتظامات بھی کرتے رہے۔ پھر یکایک نکلے اور ۱۵ اگست کو سوراب کے علاقے میں داخل افغانستان ہوئے۔ شیخ عبدالرحیم سندھی[1] بلوچستان کی آخری حد تک ساتھ رہے۔ قیام افغانستان کے حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ قندھار ہوتے ہوئے ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچے۔ سردار نصر اللہ خاں، امیر حبیب اللہ خاں اور ان کے فرزند اکبر سردار عنایت اللہ خاں سے ملاقاتیں کیں۔ ترکی اور جرمن مشن آیا اور ہندوستانیوں نے حکومت موقتہ قائم کی تو مولانا بعض وجوہ سے اس کے ہم نوا نہ رہ سکے۔ راجا مہندر پرتاپ صدر حکومت موقتہ کے متعلق مولانا کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ کانگرس کے بجائے ہندو مہا سبھا کے کارندے ہیں اور انھوں نے خود حکومت موقتہ کی سکیم لالہ لاجپت رائے کو دے دی تھی۔ غالباً اسی سکیم کی بنا پر لالہ لاجپت رائے نے یہاں افغانوں کے حملے کا افسانہ تیار کیا تھا۔ حکومت موقتہ کی طرف سے روس، جاپان اور ترکی مشن بھیجے گئے۔ مولانا ان کی تجویز و ترتیب میں شریک رہے۔ افغانستان میں خدام خلق کی ایک جماعت بنائی، جس کا نام "جنود اللہ" رکھا۔ امیر امان اللہ خاں کے عہد میں ایک ہندوستانی تعلیم گاہ قائم کرنے کی اجازت لی، لیکن برطانوی سفیر نے زور دے کر یہ اجازت مسترد کرا دی۔ ۱۹۲۲ء میں افغانستان سے نکل کر ماسکو اور استنبول ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔[2] ۱۹۳۹ء میں وطن واپس آئے۔

---

[1] یہ اچاریا کرپلانی کے بڑے بھائی تھے، مسلمان ہو جانے کے بعد پوری زندگی تبلیغِ اسلام میں بسر کر دی۔ سیاسی کاموں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ سرہند میں وفات پائی۔ میرے عزیز و مکرم دوست شیخ عبدالمجید سندھی بھی ان کے عزیزوں میں ہیں۔ وہ بھی اسلام لانے کے وقت سے برابر قید و بند کی تکلیفیں اٹھاتے رہے ہیں۔

[2] ظفر حسن صاحب ایبک نے لکھا ہے کہ مولانا ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو کابل سے نکلے تھے۔ ڈاکٹر خوشی محمد کے علاوہ خود ظفر حسن ایبک، ڈاکٹر نور محمد سندھی، اقبال شیدائی، ظفر عمر مسعود، عبدالعزیز، عبدالرشید اور بینرجی بنگالی ان کے ساتھ تھے۔ محمد نادر شاہ مرحوم اس زمانے میں سپہ سالار کے عہدے پر مامور تھے لیکن امان اللہ خاں نے انھیں قطغن و بدخشاں میں رئیس ہیئت تنظیمیہ کی حیثیت میں مقرر کر دیا تھا۔ امان اللہ خاں کی خواہش یہ تھی کہ مولانا اور دوسرے اصحاب محمد نادر شاہ سے نہ مل سکیں لہٰذا سفر روس کے لیے درہ پنجشیر کا راستہ تجویز کیا، جو بدخشاں سے دور اور بے حد دشوار گزار تھا۔ (ملاحظہ ہو "چٹان" ہفتہ وار بابت ۴ ستمبر ۱۹۵۹ء)

ریشمی خطوط مولانا نے کابل سے ایک خط ریشمی پارچے پر لکھ کر شیخ عبدالحق نومسلم کے ہاتھ شیخ عبدالرحیم سندھی کے پاس بھیجا تھا اور تاکید کردی تھی کہ شیخ صاحب فوراً حجاز چلے جائیں یا کسی معتمد علیہ حاجی کے ذریعے سے خط حضرت شیخ الہند کو پہنچادیں۔ شیخ عبدالحق طلبہ کے ساتھ ہجرت کر کے کابل پہنچا تھا اور بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ نواز خاں کا ملازم تھا۔ وہ شخص ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد تھا، لیکن خدا جانے کیا حالات پیش آئے کہ اس نے خط شیخ عبدالرحیم کے حوالے کرنے کے بجائے اللہ نواز خاں کے والد خان بہادر رب نواز خاں کو دے دیا۔ ان کے ذریعے سے پنجاب کے گورنر مائیکل اوڈوائر کے پاس پہنچا۔ اس طرح حکومت کو حضرت شیخ الہند، مولانا عبیداللہ اور دوسرے کارکنوں کی تحریک کے کچھ راز معلوم ہو گئے۔ اسی وقت سے شیخ عبدالرحیم کا تعاقب شروع ہو گیا اور حضرت شیخ الہند کو بھی مکہ معظمہ میں گوناگوں حوادث سے گزرتے ہوئے بالآخر گرفتاری و نظر بندی قبول کرنی پڑی۔ اصل خط کا مضمون غالباً یہ تھا کہ حکومت موقتہ نے افغانستان سے عہدنامہ کر لیا ہے۔ باقی حکومتوں کے پاس بھی سفارتیں بھیجی جارہی ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت ترکیہ سے بھی ربط و ضبط پیدا کرنا منظور ہے۔ آخر میں حضرت موصوف سے درخواست کی گئی تھی کہ ربط و ضبط پیدا کرنے اور معاہدہ کرانے میں امداد دیں۔ اس ریشمی خط کے ساتھ مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری کی طرف سے بھی ایک خط تھا۔ رولٹ رپورٹ میں ریشمی خط کے متعلق جو کچھ مرقوم ہے، غلط اور ناقص معلومات پر مبنی ہے[1]۔

حضرت شیخ الہند ہندوستان میں گرفتاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ حضرت شیخ الہند بہت پریشان ہو گئے تھے کہ کہیں بیٹھے بٹھائے گرفتار نہ ہو جائیں اور اس طرح ضروری جدوجہد کے اوقات تعطل میں بسر نہ ہوں، لہٰذا وہ باہر جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے دوسرے مشیروں کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی مشورہ کیا۔ مولانا آزاد کی رائے قطعی طور پر یہ تھی کہ باہر نہ جانا چاہیے اور یہیں بیٹھ کر کام کرنا چاہیے۔ اگر اس اثناء میں گرفتاری ہو جائے تو اسے قبول کیے بغیر چارہ نہ ہوگا۔

---

[1] رولٹ رپورٹ ص ۱۷۶-۱۷۸

وہ جانتے تھے کہ باہر جا کر کوئی کام نہ ہوسکتا تھا اور باہر رہ کر معطل بیٹھنے سے اندر رہ کر معطل ہوجانا بہرحال بہتر تھا۔

حضرت شیخ الہند نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے حجاز پہنچیں، وہاں سے ذمہ دار ترک وزیروں اور ماموروں سے ربط و ضبط پیدا کر کے ایران و افغانستان کے راستے یاغستان جائیں۔ چنانچہ وہ چند رفقا کے ساتھ حجاز چلے گئے۔

حج کیا، اس وقت ترکوں کی طرف سے غالب پاشا حجاز کا گورنر تھا۔ مکہ معظمہ کے مشہور تاجر حافظ عبدالجبار دہلوی کے ذریعے سے غالب پاشا کے ساتھ ملاقاتیں کیں اور ان سے تین تحریریں حاصل کیں:

۱ - پہلی تحریر مسلمانانِ ہند کے نام تھی۔

۲ - دوسری تحریر مدینہ منورہ کے گورنر بصری پاشا کے نام تھی جس میں مرقوم تھا کہ حضرت شیخ الہند معتمد علیہ شخص ہیں، ان کا احترام کیا جائے اور انھیں استنبول پہنچا دیا جائے۔

۳ - تیسری تحریر غازی انور پاشا کے نام تھی کہ ان کے مطالبات پورے کیے جائیں۔

غالب پاشا نے خود حضرت موصوف کو تاکید کی کہ آپ تمام ہندوستانیوں کو آزادیِ کامل پر آمادہ کریں، ہم ہر ممکن امداد دیں گے اور صلح کی کانفرنس منعقد ہوگی تو اس میں ہندوستان کے لیے آزادیِ کامل کی حمایت کریں گے۔ ان میں سے پہلی تحریر ہندوستان کی تاریخ سیاسیات میں "غالب نامہ" کے نام سے معروف ہوئی۔

انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات حضرت شیخ الہند حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ چلے گئے اور ابھی وہ استنبول جانے کے لیے تیار نہ ہوئے تھے کہ انور پاشا، وزیر حربیہ ترکیہ اور جمال پاشا گورنر شام کے مدینہ منورہ پہنچنے کا تار آگیا۔ چنانچہ ان سے بھی تخلیہ میں ملاقاتیں ہوئیں۔ جمال پاشا نے وہی مطالب دہرائے جو غالب پاشا حضرت شیخ الہند کے سامنے پیش کر چکا تھا۔ نیز وعدہ کیا کہ وہ شام پہنچ کر حضرت کے حسبِ خواہش ترکی، عربی اور فارسی میں ایسی تحریرات بھیج دے گا، جنھیں جابجا شائع کیا جا سکے۔

حضرت نے یہ بھی کہا کہ مجھے محفوظ طریق پر حدود افغانستان تک پہنچا دیا جائے تاکہ میں یاغستان چلا جاؤں۔ ہندوستان کے راستے گیا تو انگریز مجھے گرفتار کرلیں گے۔ جمال پاشا نے اس بناء پر معذوری ظاہر کی کہ روسی فوجیں ایران میں سلطان آباد تک پہنچ گئی ہیں، گویا افغانستان کا راستہ کٹ گیا ہے۔ فی الحال آپ کو افغانستان پہنچانا غیر ممکن ہے۔ واپسی میں گرفتاری کا خطرہ ہے تو حجاز یا ترکی عملداری کے کسی دوسرے مقام پر ٹھہر جائیں ۔

"غالب نامہ" کا ارسال حضرت خود تو حجاز ہی میں ٹھہر گئے، لیکن غالب نامہ اور دوسرے ضروری کاغذات بہ طریقِ محفوظ ہندوستان پہنچانے کی تدبیر یہ سوچی کہ کپڑے رکھنے کے لیے لکڑی کا ایک صندوق بنوایا، اس کے تختے اندر سے کھود کر کاغذات رکھ دیے۔ پھر انھیں اس طرح ملا دیا کہ باہر سے دیکھنے والا کتنا ہی مبصر کیوں نہ ہو، پتا نہ لگا سکے بلکہ شبہ بھی نہ کر سکے۔ یہ صندوق مولانا ہادی حسن رئیس خان جہاں پور (مظفر نگر) اور حاجی شاہ بخش سندھی کے حوالے کر دیا گیا۔ بمبئی میں جہاز پر سی آئی ڈی بھی موجود تھی اور اہلِ شہر بھی بہ کثرت آئے ہوئے تھے۔ انھیں میں سے مولانا محمد نبی نام ایک مخلص نے مولانا ہادی حسن صاحب سے کہا کہ اگر کوئی چیز محفوظ رکھنی ہو تو ابھی مجھے دے دیجیے۔ چنانچہ صندوق انھیں دے دیا گیا، وہ اسے محفوظ نکال لائے اور توڑ کر تحریریں نکال لیں۔ دہلی میں حاجی احمد میرزا فوٹوگرافر نے ان کے فوٹو لیے اور مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری کے ہاتھ یہ تحریریں سرحد بھیج دی گئیں۔ بعد ازاں حضرت نے اپنے ایک عزیز کو اس خیال سے تحریروں کا راز بتا دیا کہ وہ ہندوستان واپس جا کر ان کے فوٹو لینے اور جا بجا پہنچانے کا پیغام اربابِ کار تک پہنچائے۔ اسے گرفتار کر لیا گیا اور اس نے سب کچھ بتا دیا، جس کی بنا پر مختلف اصحاب کی تلاشیاں ہوئیں اور انھیں گوناگوں مصائب سے سابقہ پڑا ۔

حضرت شیخ الہند کی اسیری اور رہائی شریف حسین نے انگریزوں سے خفیہ عہد و پیمان کر کے ترکوں سے غداری کی اور حجاز میں جتنے ترک موجود تھے، وہ سخت و شدید ظلم و جور کا ہدف بنے۔ حضرت شیخ الہند اور ان کے رفیقوں کو اسیر کر کے شریف نے جدّہ پہنچا دیا، جہاں سے انگریز انھیں پہلے مصر لے گئے، پھر مالٹا میں نظر بند کر دیا۔ تین برس سات مہینے کے بعد ۲۰۔ رمضان ۱۳۳۸ھ (۸۔ جون ۱۹۲۰ء)

کو بمبئی پہنچا کر انھیں رہا کیا ۔

زمانہ قیام حجاز میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم عبدالرزاق انصاری، مولانا محمد ابراہیم رانڈیری وغیرہ نے حضرت کی جو خدمت کی، وہ ان کے حسنات عالیہ کا گراں بہا حصّہ ہے ۔

چند گزارشیں حضرت مرحوم نے جس جذبے، خلوص، ہمّت اور والہیت سے کام کیا، اس کے بارے میں یہ عاجز کیا کہہ سکتا ہے، جو ان اوصاف وخصائص کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتا، لیکن صاف ظاہر ہے کہ اصل منصوبہ جن حالات میں تیار کیا گیا، وہ حد درجہ ناسازگار تھے۔ چھان بین اور غور وفکر کی مہلت قطعاً میسّر نہ تھی۔ جدھر روشنی کی کوئی کرن نظر آئی اس سے استفادے میں تامل نہ کیا گیا۔ چونکہ پورا منصوبہ عالم اضطرار میں تیار ہوا تھا، اس لیے اس کا کوئی پہلو بھی پایدار ثابت نہ ہوا، لیکن میدانِ عمل کی ہر شے کا حسن صرف جذبہ عشق اور وارفتگی حُبِّ مقاصد پر موقوف ہے۔ یہاں تدبیروں کی پختگی، منصوبوں کی پایداری اور عقل وخرد کی دور بینی ومصلحت اندیشی کو کون پوچھتا ہے؛

در عجائب ہائے طور عشق حکمتہا کم است
عقل را با مصلحت اندیشی مجنوں چہ کار

حضرت کے تمام کارکن علم وفضل، زہد وتقویٰ، بے غرضی وبے نفسی اور جرأت وایثار میں اپنی مثال آپ تھے۔ مولانا عبید اللہ مرحوم نے کم وبیش پچیس سال غربت میں گزارے، گویا اصل زندگی اسی کام کی نذر کر دی۔ مولانا سیف الرحمٰن اور مولانا منصور انصاری نے جلاوطنی کی حالت میں وفات پائی۔ ان میں سے کسی کی حرارت اسلامیت وآزادی آخری سانس تک ایک لمحہ کے لیے بھی افسردہ نہ ہوئی لیکن مجھے بہ صد ادب یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ وہ حضرات جن کاموں پر مامور ہوئے، ان کے لیے ہر لحاظ سے موزون نہ تھے، جو جرنیل خطرناک مقامات پر فوجوں کے علمدار بننے کی ہمت رکھتے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ سیاسی مجالس میں بھی ویسے ہی اہم کارنامے انجام دے سکیں ۔

ایک تعجب انگیز امر مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی کتاب "اسیرِ مالٹا" میں پورے وثوق وقطعیت سے فرمایا تھا کہ حضرت شیخ الہند نے نہ غالب پاشا، انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقاتیں

کیں، نہ ان کے لیے ایسا کوئی موقع تھا، لیکن "نقشِ حیات" میں ایک ایک شے کا تفصیلاً ذکر فرمایا، ساتھ ہی اس طرزِ عمل کے جواز کی دو وجہیں پیش کر دیں۔ فرماتے ہیں:

۱۔ تعریضی جواب دینا یعنی ایسے کلمات کو جواب میں استعمال کرنا، جن کے دو معنی ہوں، متکلم ان کے دوسرے معنی لے اور مخاطب کچھ اور سمجھے، یہ جھوٹ نہیں ہے اور ایسے موقعے پر بلاشبہ جائز ہے[۱]۔

۲۔ عام لوگ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ ہر حالت میں بُرا اور حرام ہے حالانکہ جھوٹ بعض اوقات میں فرض اور واجب ہو جاتا ہے اور بعض اوقات میں مستحب اور بعض اوقات میں مباح اور بعض اوقات میں حرام اور مکروہ ہوتا ہے[۲]۔

"تعریضی جواب" کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، لیکن دوسری صورت کے متعلق جب مولانا حسین احمد مدنی جیسے بزرگ جواز کا فتویٰ دیں تو میرے جیسے فرومایۂ علم کے لیے کچھ عرض کرنی کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے، تاہم صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ دل اس پر مطمئن نہیں اور اگر ذاتی تحفّظ کے مسئلے کو اسی انداز میں قبول کر لیا جائے، جس انداز میں اسے پیش کیا گیا ہے تو پھر مجاہدانہ کارناموں اور ان کے ضمن میں قربانیوں کا معاملہ ختم سمجھنا چاہیے اور تسلیم کر لینا چاہیے کہ عزیمت کوئی شے نہیں، جو کچھ ہے رخصت ہی رخصت ہے، نصب العین کے لیے کام ایسے طریق پر کرنا چاہیے کہ جان کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ گزند کا اندیشہ ہو تو مقدم شے جان کا تحفّظ ہے، خواہ نصب العین کا حشر کچھ ہو۔ جب تک تاریخ کے صفحات سے عزیمت کے تمام واقعات دھو نہ ڈالے جائیں، اس مسلک کو دل کیوں کر قبول کر سکتا ہے، جو مولانا حسین احمد نے پیش فرمایا ہے، اگرچہ اس کے لیے دواوینِ فقہ میں کوئی بنیاد موجود ہو۔

---

[۱] نقشِ حیات جلد دوم صفحہ ۲۰۴۔

[۲] 〃 〃 صفحہ ۲۰۵۔

دسواں باب

مولانا محمد بشیر شہید

ایک عظیم المرتبت شخصیّت مولانا محمد بشیر اگرچہ جماعت مجاہدین میں امارت عظمیٰ کے منصب پر فائز نہ ہوے، تاہم ان کے مجاہدانہ کارناموں کی حیثیت اتنی بلند ہے کہ امیر نعمت اللہ اور امیر رحمت اللہ کے عہد کی پوری سرگزشت میں سب سے بڑا حصّہ مولانا مرحوم ہی کا تھا۔ وہ ایک عجیب وغریب شخصیت کے مالک تھے۔ جن حالات میں انھوں نے وطن چھوڑا تھا، وہ غالباً بہت کم اصحاب کو پیش آئے ہوں گے، لیکن پوری مدّتِ ہجرت میں ایک بھی مرتبہ یہ خیال نہ آیا کہ وطن واپس آئیں۔ حالانکہ ان کے لیے واپسی کے مواقع بہ سہولت پیدا ہو سکتے تھے۔ میں نے ۱۹۳۴ء میں ایک مرتبہ ان سے عرض کیا کہ اب ہندوستان سے باہر رہنے کے بجاے اندر رہ کر زیادہ مفید کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے یہ سنا تو بیٹھے بیٹھے کھڑے ہو گئے، میں نے دیکھا کہ آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ فرمایا: "اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ تم خلوص سے یہ سب کچھ کہ رہے ہو تو میں سمجھتا کہ تمھیں انگریزوں نے میرے پاس بھیجا ہے۔ میں جس دن گھر بار چھوڑ کر نکلا تھا، خدا سے عہد کیا تھا کہ جب تک ہندوستان کی سرزمین پر انگریز کا سایہ بھی موجود ہے، خواہ اس کی حیثیت کچھ ہو، کبھی واپس نہ جاؤں گا اور اس سرزمین میں سانس لینا اپنے اوپر حرام سمجھوں گا۔ میں یہ عہد اپنے آخری دم تک بنا ہوں گا"۔

غرض وہ ان عظیم الشان انسانوں میں سے تھے جو قرنوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ان جیسا مخلص، دین دار، باحمیّت، غیور اور آزادی و اسلامیت کا شیدائی کوئی نہ دیکھا۔ استقامت میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔

خاندان ان کا اصل نام عبدالرحیم تھا، لیکن سرحد پہنچنے کے بعد محمد بشیر کے اختیاری نام کو وہ

شہرت حاصل ہوئی کہ اصل نام بہت کم لوگوں کو یاد رہا۔ ان کے والدِ ماجد مولانا رحیم بخش ملوال (مالہووال) ضلع فیروز پور کے باشندے تھے۔ وہاں سید احمد شہید کی جماعت کے ایک فرد مولوی حیدر علی آ بسے تھے، جن سے مولانا رحیم بخش کے بڑے بھائی حافظ محمد اسمٰعیل نے بیعت کی۔ خود مولانا رحیم بخش نے بھی ابتدائی تعلیم انھیں مولوی حیدر علی سے پائی۔ خود فرماتے ہیں:

میں نے ایسا کوئی عالم متبعِ سنت وشریعت نہیں دیکھا۔ . . اس خاکسار پر ان مولوی صاحب کے بڑے احسان ہیں۔ جو کچھ علم میں نے پڑھا ہے، اس میں ان کی مدد رہی ہے۔ افغانانِ ملوال سلطان خاں صاحب، سکندر خاں صاحب، جمال الدین خاں صاحب آپ (مولوی حیدر علی) کی بڑی عزت کرتے۔ اس عاجز کے برادر حافظ محمد اسمٰعیل صاحب بجائے خلیفہ تھے[1]۔

مولانا رحیم بخش نے دہلی جاکر شیخ الکل میاں نذیر حسین مرحوم سے حدیث کی سند حاصل کی۔ پھر لاہور آ گئے اور چینیاں والی مسجد میں امام بنا دیے گئے۔ یہیں انھوں نے نکاح کیا۔ متعدد دینی کتابیں لکھیں جو اُس عہد میں بہت مقبول ہوئیں۔ غالباً ان کے پانچ بچے تھے۔ دو بچپن میں فوت ہو گئے، تین ان کے بعد زندہ رہے: ایک مولانا عبدالرحیم عرف مولانا محمد بشیر، دوسرے مولوی عبدالرحمٰن جو اسلامیہ کالج میں ایف۔ اے تک تعلیم پانے کے بعد محکمۂ انہار میں ضلع دار بن گئے تھے۔ افسوس کہ جوانی ہی میں فوت ہو گئے۔ ایک ان کی ہمشیر تھی جس کا نام زینب تھا۔

مولانا کی ابتدائی زندگی مولانا عبدالرحیم ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے پوری تعلیم پائی۔ قرآن، حدیث اور تاریخ سے خاص شغف تھا۔ پھر انھوں نے اپنے والد کی تصانیف کے علاوہ دوسری دینی کتابوں کے تراجم کا سلسلہ شروع کرا دیا اور ایک اعلیٰ دارالاشاعت قائم کر لیا۔ جس کا نام "عبدالرحیم عبدالرحمٰن تاجرانِ کتب" قرار دیا۔ چنانچہ وہ اسی کام میں منہمک ہو گئے اور اسی کو اپنی

[1] اسلام کی دسویں کتاب مصنفہ مولانا رحیم بخش ص ۲۵۲۔

زندگی کا مستقل مشغلہ بنالیا۔ یہاں تک کہ مولانا رحیم بخش کا انتقال ہوا تو ان کے منصب کی طرف بھی توجہ نہ کی اور مولانا عبدالواحد غزنوی مرحوم چینیاں والی مسجد کے امام مقرر ہوئے۔

ہجرت کے وقت مولانا عبدالرحیم کے چار بچے موجود تھے: عبدالحکیم، عبدالعلیم، عبدالعظیم اور صفیہ بیگم۔ بڑے صاحبزادے عبدالحکیم پندرہ برس کی عمر میں پہلے فوت ہو چکے تھے۔ صفیہ بیگم مولانا کی ہجرت سے چند ماہ بعد فوت ہوئی اور عبدالعظیم دو سال بعد۔ باقی دو بچوں میں سے عبدالحلیم ایک لڑکا اور پانچ لڑکیاں چھوڑ کر ۱۹۳۹ء میں رہ گرائے عالم بقا ہوا۔ ایک صاحبزادہ عبدالعلیم خدا کے فضل سے زندہ و سلامت ہے اور ایک کارخانے میں اچھی ملازمت پر مامور ہے۔

ہجرت مولانا اوائل ہی سے جماعت مجاہدین کے کام میں حصہ لینے لگے تھے۔ تحقیقی طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ روپیہ فراہم کرنے کے علاوہ وہ اور کیا کام کرتے تھے۔ انھوں نے خود مجھے بتایا کہ میں ہندوستان سے ہجرت کا ارادہ کر چکا تھا، لیکن خیال تھا کہ تجارت کے سلسلے میں باہر جاؤں گا، پھر جہاں مناسب ہوگا، توطن اختیار کرلوں گا۔ ابھی کچھ طے نہ کر سکے تھے کہ یورپ میں جنگ چھڑ گئی اور دھڑا دھڑ گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ دیکھتے دیکھتے کالجوں کے طلبہ نکل کر سرحد پہنچ گئے۔ ایک عزیز دوست نے مولانا کو خبر دی کہ آپ کے بھی وارنٹ جاری ہو چکے ہیں۔ انھوں نے فوراً اپنے دل میں ایک فیصلہ کیا۔ صبح اٹھتے ہی گھر والوں سے کہا کہ ایک آدمی سے روپے لینے ہیں اور میں اس کی طرف جا رہا ہوں، اگر آج نہ گیا تو روپے ملنے کی امید نہیں۔ چونکہ کاروبار کے سلسلے میں ایسے معاملات پیش آتے رہتے تھے، اس لیے کسی کو تفصیل پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ بھائی، بچوں اور بہن سے مل کر روانہ ہو گئے۔ لیکن کسی کو خبر نہ تھی کہ مستقل طور پر ہجرت کر کے جا رہے ہیں۔ راولپنڈی پہنچ کر خطوط لکھے، لیکن ان خطوط کے لاہور پہنچنے سے دو گھنٹے بیشتر وہ سرحد کو عبور کر کے آزاد علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔

مولوی محی الدین احمد قصوری نے بتایا کہ مولانا عبدالرحیم ایک سے زیادہ مرتبہ مشورے کے لیے والد مرحوم (مولانا عبدالقادر) کے پاس آئے، جو جماعت مجاہدین کے ایک سرگرم کارکن تھے۔ والد برابر یہ مشورہ دیتے رہے کہ باہر نہ جانا چاہیے اور یہیں کام کرنا چاہیے، لیکن مولانا فیصلہ کر چکے تھے، چپ چاپ

نکلے اور سرحد جاکر وہ کام شروع کر دیا، جسے وہ اپنے عقیدے میں بہترین اسلامی، دینی اور قومی کام سمجھتے تھے۔

پابندیِ عہد اُس زمانے میں اُن کے دارالکتب کا کام بہت اعلیٰ پیمانے پر پہنچا ہوا تھا۔ سیکڑوں روپے کی آمدنی تھی۔ ان کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ بھائی نیا نیا ملازمت میں داخل ہوا تھا۔ بہ ظاہر کاروبار کے جاری رہنے یا بال بچوں اور اہلِ خاندان کا گزارہ چلنے کی کوئی صورت نہ تھی، لیکن مولانا نے سلطانِ فرض کے مقابلے میں کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ بعد میں انھیں برابر معلوم ہوتا رہا کہ بچوں کے گزارے کی کوئی اچھی صورت نہیں اور وہ سخت تکلیف میں ہیں، تاہم انھوں نے خدا سے جو عہد کر لیا تھا، اس کی پابندی میں فرق نہ آنے دیا" من المومنین رجالٌ صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ" کی جیتی جاگتی مثال بنے رہے۔

کالجوں کے طلبہ فروری ۱۹۱۵ء میں سرحد گئے تھے اور خود مولانا کے مکان پر ان کی روانگی کے مشورے ہوتے رہے۔ مولانا نے اس سے کچھ دن بعد ہجرت کی۔ صحیح تاریخ معلوم نہ ہو سکی، لیکن ۱۹۱۵ء میں مجاہدین کی جن جنگی کارروائیوں کا مختصر سا مرقع امیر نعمت اللہ کے حالات میں پیش کیا جا چکا ہے، ان میں مولانا برابر شریک رہے، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ کارروائیاں مولانا ہی کی کوششوں کے باعث عمل میں آئیں۔

سرحدِ آزاد میں سرگرمیاں مولانا محمد بشیر صرف اس امر پر قناعت نہ کر سکتے تھے کہ مجاہدین کو اپنے حلقے میں وقتاً فوقتاً جو لڑائیاں پیش آتی رہتی ہیں، ان کے لیے تنظیمات زیادہ بہتر صورت اختیار کر لیں یا جماعت کے افراد میں کسی قدر اضافہ ہو جائے۔ وہ غیر معمولی دل و دماغ کے انسان تھے۔ سرحد پہنچتے ہی طے کر لیا کہ پورے آزاد علاقے میں جا بجا چوکیاں قائم کی جانی چاہئیں تاکہ انگریزی مقبوضات پر ہر مقام سے مسلسل حملوں کا سلسلہ جاری ہو جائے اور یہ حملے صرف مجاہدین کی ٹولیوں تک محدود نہ رہیں جن کی تعداد بہرحال بہت زیادہ نہ تھی۔ مولانا حتی الامکان تمام آزاد قبائل کو ان سرگرمیوں میں اجتماعاً شریک کر دینے کے لیے مضطرب تھے اور اس غرض سے سرحدِ آزاد میں دورے شروع کر دیے۔ جنگِ یورپ شد و مد سے جاری تھی۔ ابتدائی دور میں جرمنوں کی کامیاب ترکتازوں کے باعث محض برطانیہ ہی

نہیں بلکہ تمام اتحادیوں کی حالت بہت نازک ہوگئی تھی۔ ہندوستانیوں کے لیے آزادی حاصل کرنے کا موقع اسی صورت میں پیدا ہوسکتا تھا کہ جنگ میں انگریزوں کو شکست ہوتی۔ جب ترک انگریزوں اور اتحادیوں کے خلاف جنگ میں جرمنی کے معاون بن گئے تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے بھی ہندوستان میں حد درجہ ضروری کام یہ تھا کہ انگریزوں کی مشکلات میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جاتا۔ اس کی صورت یہی تھی کہ سرحد پر جا بجا خطرات کا طوفان بپا کر دیا جاتا تاکہ انگریز اپنی فوجوں کا بڑا حصہ سرحد کی حفاظت کے لیے رکھنے پر مجبور ہو جاتے اور باہر کسی محاذ پر کمک نہ بھیج سکتے۔ مولانا محمد بشیر کی تمام سرگرمیاں اسی مقصد کو کامیاب بنانے کے لیے وقف ہوگئیں۔ نتائج سے بحث نہیں، لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لیے مولانا نے کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا۔ جماعتِ مجاہدین کی تاریخ کے آخری دور میں اتنا بڑا اور وسیع الاثر کام صرف مولانا محمد بشیر جیسی عظیم المرتبت شخصیت ہی انجام دے سکتی تھی۔

کابل میں اثر و رسوخ اس مقصد کے لیے حکومتِ افغانستان سے بھی گہرے تعلقات پیدا کر لینا ضروری تھا۔ مولانا محمد بشیر نے یہ کام بھی بطریقِ احسن انجام دیا۔ جس حد تک مجھے اندازہ ہے، ان کی گفتگو بہت سادہ ہوتی تھی اور انھوں نے کسی امر کی وضاحت کے لیے کبھی خطیبانہ انداز اختیار نہ کیا، لیکن ان کے اخلاص و للہیت کا یہ عالم تھا کہ جس کے سامنے بھی اپنا نقطۂ نگاہ پیش کرتے وہ حد درجہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔

اس زمانے میں افغانستان پر امیر حبیب اللہ خاں حکمران تھا۔ وہ انگریزوں کے ساتھ خاص تعلقات کے باعث ہر ایسے اقدام سے گریزاں رہتا تھا، جو اس کے تعلقات پر برائے نام بھی اثر انداز ہوسکے، لیکن مولانا محمد بشیر نے امیر حبیب اللہ خاں کو بھی بے حد متاثر کر لیا۔

مرحوم مولوی محمد علی قصوری لکھتے ہیں کہ مولانا محمد بشیر امیر المجاہدین کے وکیل بن کر کابل آئے تو نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں، پھر خود امیر حبیب اللہ خاں سے ملاقات کی:

امیر صاحب کے مزاج میں اتنا عمل دخل پیدا کر لیا کہ موصوف نے انھیں یاغستان

کی تنظیم کے لیے مامور فرمایا اور بارہ ہزار روپیہ سالانہ تنظیمی اخراجات کے لیے ان کے حوالے کیا[1]

یاغستان کے لیے وکیل امیر چنانچہ وہ یاغستان چلے گئے اور تھوڑی ہی مدت میں وہاں کے اکثر ملاؤں اور سرداروں سے امیر صاحب کے نام بیعت کے خطوط حاصل کر لائے :

اعلیٰ حضرت ان خطوط کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور مولوی محمد بشیر صاحب کو "ملا بشیر" کا خطاب مرحمت فرمایا۔ تمام یاغستان کے لیے ان کو وکیل مختار مقرر کیا اور ایک فرمان اسی مضمون کا مرحمت فرمایا کہ ملا بشیر امیر صاحب کی طرف سے بیعت لینے کے مجاز ہیں . . . اعلیٰ حضرت پر انگریزی حکومت کا اس قدر خوف طاری تھا کہ وہ علانیہ انگریزوں کے خلاف کسی سازش میں شرکت کرنے سے ڈرتے تھے۔ ملا بشیر کا یہ کمال تھا کہ وہ اعلیٰ حضرت کو خوف و ہراس کے اس گنبد سے نکال لائے[2]

خاص طور پر قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ امیر حبیب اللہ خاں کے تعلق میں ایسے کارنامۂ عظیم کا اعزاز مولانا محمد بشیر کے سوا کوئی دوسرا شخص حاصل نہ کر سکا ۔

مولانا کے معاون مولوی محمد علی فرماتے ہیں کہ سرحد آزاد کے دو پٹھان انگریزی فوج میں صوبیدار میجر کے عہدوں پر مامور تھے۔ وہ فرانس کے کسی میدان سے موقع پا کر بھاگے اور جرمنوں کے پاس پہنچ گئے۔ پھر ترکی و جرمن مشن کے ساتھ افغانستان آئے۔ یہ دونوں افسر اس زمانے میں مولوی صاحب مرحوم کے ساتھ ہو گئے جب وہ تنظیمی کام کے سلسلے میں یاغستان آ گئے تھے :

چنانچہ انھوں نے پہلے تو یاغستانیوں کو تربیت عسکری دینی شروع کی . . . .

بعد میں جب میں اسمست آیا تو وہ ملا بشیر کی معیت میں تیراہ اور محسود علاقے میں

---

[1] مشاہدات کابل و یاغستان ص ۲۹ ۔

[2] " " ص ۳۰ ۔

گئے۔ اس علاقے میں ان کے اثر سے ملّا بشیر کا دورہ بہت کامیاب رہا۔

غرض مولانا کو تنظیمات جہاد کے سوا کسی مشغلے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی کام کے لیے وقف ہو گیا۔ انھیں جہاں ڈھب کا کوئی آدمی ملا، اس سے یہی کام لیا۔ گویا وہ برقِ حق کی ایک زبردست رَو تھے کہ جہاں جہاں سے گزرے زندگی حرارت پیدا کرتے اور ایمان و حمیت کے چراغ جلاتے گئے۔

لہ مشاہدات کابل و یاغستان صفحہ ۳۔ مولوی عبدالرزاق کا بیان ہے کہ ان میں سے ایک نام عبدالسبحان تھا اور دوسرے کا عبدالرحمٰن۔ بے شک یہ انگریزی فوج میں رہ چکے تھے، لیکن انھیں مفرور قرار دینا درست نہ ہوگا۔ دونوں یاغستان کے نہیں بلکہ پشاور کے آس پاس کے تھے۔ امریکہ جا کر انھوں نے کیلیفورنیا میں اپنے ہندوستانی اور افغانی بھائیوں کے ساتھ سکونت اختیار کر لی تھی اور "غدر پارٹی" میں شریک ہو گئے۔ مولانا برکت اللہ نے انھیں برلین بلا لیا۔ جرمن مشن کے ساتھ یہ کابل آئے۔ یاغستانیوں کو قواعد سکھانے کے علاوہ مجاہدین کی تعلیم و تربیت بھی کچھ دیر کی۔ اس سے پیشتر مجاہدین مغلوں کے عہد کی پریڈ کیا کرتے تھے، عبدالسبحان اور عبدالرحمٰن نے انھیں نئی پریڈ کے علاوہ سگنل کا کام بھی سکھایا۔

کابل والا منصوبہ ناکام ہو جانے پر عبدالسبحان کاظم بے کے ہمراہ روس کے راستے واپس چلا گیا۔ تاشقند پہنچا تو سنا کہ امان اللہ خاں نے جنگ استقلال چھیڑ دی ہے۔ چنانچہ لوٹ پڑا۔ کابل کی جنگ ختم ہو گئی تو جرمنی جا کر شادی کر لی۔ پھر کچھ مدت شنگھائی (چین) میں گزاری۔ دوسری جنگ یورپ شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے کابل آ کر بنیانیں بننے کا کارخانہ قائم کیا۔ سبھاش چندر بوس ہندوستان سے نکل کر کابل کے راستے جاپان چلا گیا تو کچھ معلوم نہیں کہ کس بنا پر عبدالسبحان کو قید کر دیا گیا اور چار سال قید میں گزار کر اس نے وفات پائی۔ یہ تفصیلات مولوی عبدالرزاق کو اس لیے معلوم ہیں کہ وہ خاصی مدت عبدالسبحان کے ساتھ گزار چکے تھے۔

عبدالرحمٰن نے یاغستان سے واپس ہو کر "کوٹکی" میں توطن اختیار کر لیا تھا اور وہیں ۱۹۳۵ء میں انتقال کیا۔

گیارھواں باب

شہادت کا حادثۂ الیمہ

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

مرکز چمرکنڈ مولانا محمد بشیر معمول کے مطابق انگریزوں کی مخالفت اور ہندوستان کی آزادی کے لیے مختلف منصوبے تیار کرنے میں مصروف تھے۔ اس زمانے میں ان کا مستقل مقام مرکز چمرکنڈ تھا، جس کی مختصر سی کیفیت ذیل میں درج ہے :

جلال آباد کے شمال اور شمال مشرق میں کوہ ہندوکش کی متعدد شاخیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک شاخ وہ ہے، جو جلال آباد کے پاس سے دریائے کنڑ کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ اسمار کے قریب اس میں سے ایک اور شاخ نکلی ہے جو پہلی شاخ کے متوازی مشرق میں واقع ہے۔ ان شاخوں میں یاغستان کے کئی مشہور مقام آتے ہیں، مثلاً پَشَت (بہ فتح شین)، چغتا سرائے، قنبر، جن بٹئی، دیر وغیرہ۔ پشت سے تین چار میل شمال میں دریائے کنڑ کا ایک موڑ ملتا ہے، جس کے قریب مشرقی سمت میں ایک درہ واقع ہے۔ عین اس مقام پر سرکانی نام ایک موضع ہے۔ درے سے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیں تو چوٹی سے مشرقی سمت اتر کر کوئی نصف میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے، جسے بالا چمرکنڈ کہتے ہیں۔ اس سے آگے دو تین فرلانگ پر ایک بہت بڑی مسجد ہے، جو حضرت ملا صاحب ہڈہ نے تعمیر کرائی تھی اور آج کل مسجد صاحب مبارک کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے پہاڑی نالوں کی افراط ہے۔ مسجد کے پاس شیخ چمرکنڈ نے اپنے رہنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ اسی مسجد سے متصل جنوبی سمت میں مجاہدین کا مرکز ہے۔ مسجد اور آبادی کے درمیان صرف

ایک تنگ گلی واقع ہے ۔

آبادی کی کیفیت یہ ہے کہ گلی کے ساتھ ساتھ چار مکان ہیں۔ دو میں مجاہدین رہتے تھے۔ ایک میں غلہ وغیرہ رکھا جاتا تھا۔ چوتھے اور مغربی سمت کے مکان میں مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی مقیم تھے۔ صرف اس کا دروازہ گلی میں تھا۔ مجاہدین کے مکانوں کا دروازہ مشرقی سمت میں تھا۔ مکانوں کی اس لائن کے جنوب میں مشرقی سمت ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جس میں مولانا محمد بشیر رہتے تھے۔ اس کے ساتھ چھوٹا سا صحن تھا، جس میں اس آبادی کے اندر آنے کا دروازہ واقع تھا۔ اس چھوٹے صحن کے ساتھ مشرق میں ایک بڑا کمرہ بنا دیا گیا تھا، جسے مہمان خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ مجاہدین کے اس مرکز کی مکانیت اتنی ہی تھی، لیکن اس کے چاروں طرف کی دیواریں ایسی بنادی گئی تھیں جو ضرورت کے وقت فصیل کے طور پر استعمال ہو سکیں۔ آج بھی یہی کیفیت ہے اور اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ نماز کے لیے سب لوگ مسجد میں جمع ہوتے تھے۔ پائیں چمرکنڈ اس مقام سے پانچ چھ میل نیچے میدان میں واقع ہے ۔

ہمہ گیر شہرت

یہ چھوٹا سا مرکز تھا جو ۱۶-۱۹۱۵ء میں قائم ہوا اور مولانا محمد بشیر کی امارت کے زمانے میں اس نے ہمہ گیر شہرت حاصل کی، یہاں تک کہ مجاہدین کے اصل مرکز اسمست کی شہرت بھی اس کے آگے ماند پڑ گئی۔ دیکھیے، خدا کی راہ میں خلوص و حسنِ نیت سے سرگرمِ عمل رہنے کی برکت و کرامت کہ پانچ سات چھوٹے چھوٹے اور کچے مکانوں کی آبادی نے آزادی و اسلامیت کی تاریخ میں کتنا بلند مرتبہ حاصل کر لیا ۔

یہاں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ مجاہدین کا یہ مرکز حکومتِ افغانستان کی خاص سفارش اور حضرت ملا صاحب اڈہ کے معزز خلفاء کی سرپرستی میں بنا تھا، جن میں سے حضرت بادشاہ صاحب اسلام پور، حضرت ملا صاحب بابڑہ اور میاں صاحب سرکانی بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ بابڑہ چمرکنڈ کے شمال میں آٹھ دس گھنٹے کی مسافت پر ہے اور حاجی صاحب ترنگ زئی کا مرکز غازی آباد تقریباً سات گھنٹے کی مسافت پر ۔

شہادت کا قبل از وقت احساس مولانا محمد بشیر کا خیال مدت سے یہ تھا کہ وہ اچانک شہید کر دیے جائیں گے۔ ستمبر ۱۹۳۴ء میں مجھے بہ مقام کابل ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا تو انھوں نے اپنے اس خیال یا تاثّر کا کئی مرتبہ اظہار کیا تھا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو یہ بھی فرمایا تھا کہ پہلے ان پر ایک دو مرتبہ قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں۔ یاغستان کے ہر حصّے میں وہ بے حد ہر دلعزیز تھے۔ افغانستان کے چھوٹے بڑے، غریب امیر، معمولی کارکن اور ارکانِ حکومت ان کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ جماعت میں انھیں جو خاص مقام حاصل تھا، اسے پیش نظر رکھتے ہوئے وہم بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کوئی انھیں گزند پہنچانے کی جسارت کرے گا، البتہ انگریزی حکومت اور اس کے متوسلین مولانا کے جانی دشمن تھے، اس لیے کہ جانتے تھے، جب تک مولانا زندہ ہیں، ان کا دل و دماغ اور ان کے قوائے عمل انگریزی حکومت کا تختہ الٹنے میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھیں گے، لیکن انگریزوں کا ہاتھ مولانا تک پہنچنے کی نظر بہ ظاہر کوئی صورت نہ تھی، اِلّا یہ کہ وہ اپنی کسی کارندے کو چمرکنڈ بھیج دیتے اور وہ جماعتِ مجاہدین میں شامل ہو کر موقع کا انتظار کرتا۔ سُنا جاتا ہے کہ جس وقت مولانا اطراف کوہاٹ میں انگریزوں کے خلاف تنظیمات فرما رہے تھے تو انگریزوں نے ان کی جائے اقامت کا حال معلوم کر کے ہوائی جہاز سے گولہ باری کرائی تھی، لیکن مولانا بہ فضلِ خدا محفوظ رہے ۔

وصیّت نامۂ مجمل احساسِ شہادت کے پیش نظر مولانا نے ۲۶۔ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ (۱۱۔ اپریل ۱۹۳۴ء) کو دو وصیت نامے لکھے۔ ایک مجمل و مختصر، دوسرا مفصّل۔ مختصر وصیت نامہ عام تھا۔ مفصّل کی پیشانی پر مرقوم تھا: "متعلق ابراہیم وغیرہ"۔ وصیت نامہ مجمل کا متن ذیل میں درج ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد سلام مسنون کے اور وداعِ آخری کے سب بھائیوں مجاہدین ہندی چمرکنڈ کو معلوم رہے کہ اگر بہ قضائے الٰہی میں اتفاقیہ مارا جاؤں یا اپنی موت جلدی مر جاؤں تو حضرت امیر صاحب کے اسمس سے نیا حکم یا صدر[1] آنے تک میرے بعد جماعت چمرکنڈ

[1] اشتباہ سے بچنے کے لیے جماعت چمرکنڈ کے امیر کو "صدر" کہتے تھے ۔

چمر کنڈ کا نقشہ سنہ ۱۹۲۹ء میں

یہ نقشہ مولوی عبدالرزاق صاحب نے تیار

کھیت

کھیت

مولوی فضل الٰہی

صحن

صحن

چشموں کا پانی
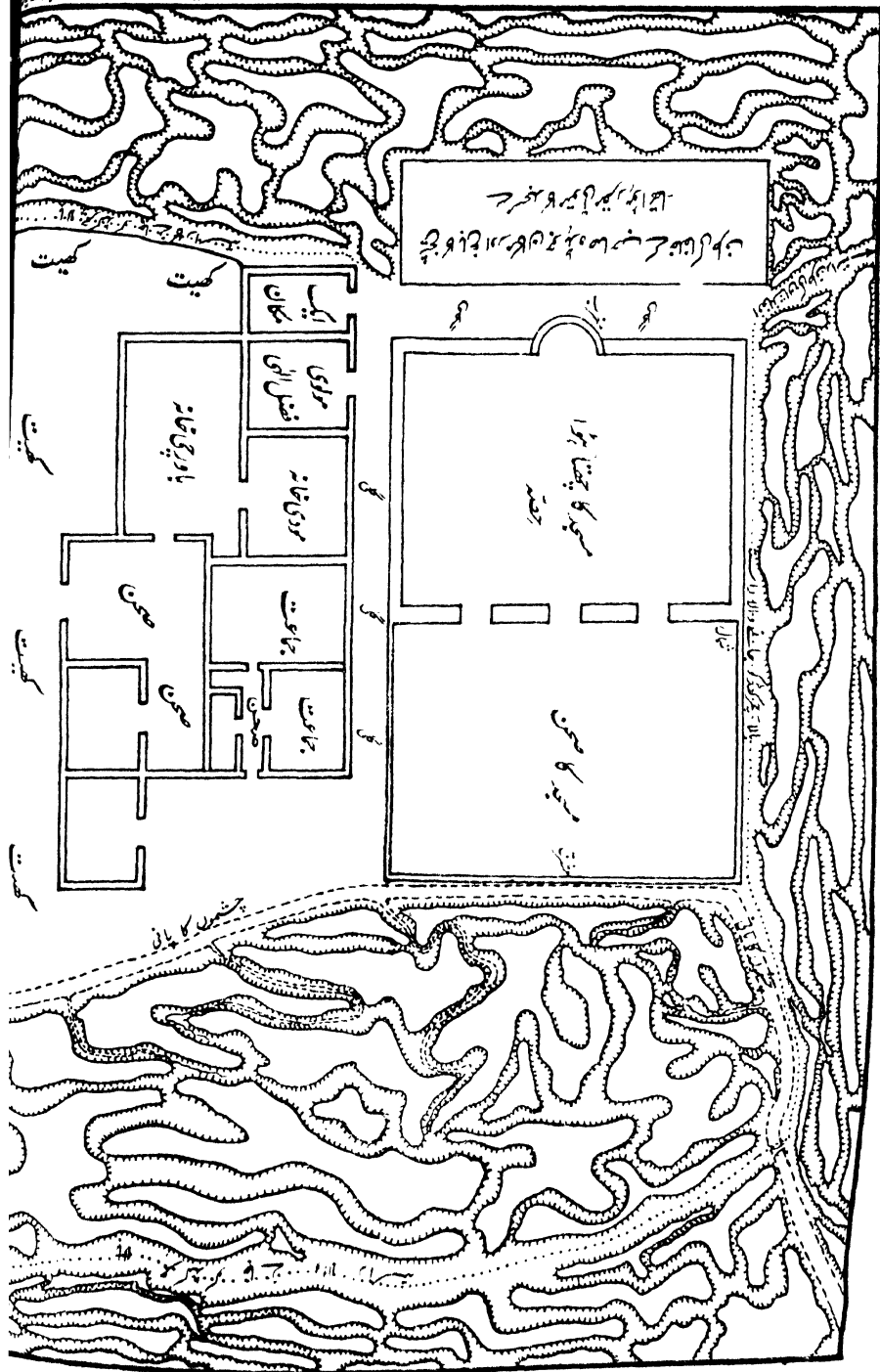
کے امام وصدر جناب میاں معاذ صاحب رہیں گے اور سالاری جمعیّت یعنی جنگ و مدافعت کے سررشتہ دار اور مشیرِ خاص میاں معاذ صاحب کے بھائی ایّوب صاحب ہوں گے۔ خزانچی بھی بدستور میاں معاذ صاحب ہی رہیں یا بھائی ایّوب صاحب، جیسا کہ ان کا اتفاق ہو۔ بھائی عنایت اللہ بدستور جمعدار رہیں اور ان دونوں کے حکم کو میرے حکم کے برابر جانیں۔

عزیزی ارجمند ابراہیم، غلام علی، نیز عبدالقدوس خاں ان تینوں کے ہر بات میں خصوصی معاون و یاور ہو کر جماعت کو سنبھالیں۔ باقی سب بھائی عزیزان عبداللہ و ماہ و سمندر و اکبر و میر غلام و فیروز بھی ہوشیار اور ان سرداروں کے پورے تابعدار رہ کر خدا و رسولؐ کو راضی کریں۔ میرا قاتل میری طرف سے معاف ہے۔ اس کا معاملہ خدا پہ چھوڑ دیں، البتہ جماعت سے خارج کر دیں۔ مرقومہ ۲۶۔ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ

فقیر محمد بشیر بقلم خود از چمر کنڈ

مفصّل وصیّت نامہ اسی تاریخ کو مولانا نے ایک اور وصیت نامہ لکھا، جس میں مختلف امور کے متعلق مفصّل ہدایات درج تھیں۔ اس کی نقل ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد سلام مسنون سب بھائیوں خاص کر حضرت امیر صاحب اسمس اور چمر کنڈ کے صدر و سالار صاحبان کو بخوبی روشن رہے کہ اس عرصہ بست سالہ قیام جمعیّت میں مَیں نے اپنے لیے کابل یا چمر کنڈ یا کسی اور جگہ ذاتی روپیہ پیسہ ورثے میں نہیں چھوڑا۔ نہ ایک حبّہ یا ایک تار دھاگا تک نیچے اپنے کسی عزیز و رشتہ دار کو روانہ کیا اور خود بھی اپنا گزارہ اس معیار پر رکھا، جس سے کم میں مَیں کر نہ سکتا تھا۔ اس لیے آج فارغ البال خدائے متعال کی رحمت پہ توکّل کر کے اس کی بارگاہ میں حاضر ہو رہا ہوں۔ اگر ہو سکے اور جب کبھی یاد آ جاؤں تو دعا سے فراموش نہ کریں۔

جب عزیزی مولوی صبغت اللہ[1] صاحبزادہ چمرکنڈ سے رخصت ہو کر اسمس گئے تو دو تفنگچے میں نے ان کو ہدیہ کیے، وہ میرے ذاتی ہی تھے اور یہ تیسرا تفنگچہ جہازی جو ابراہیم کے پاس ہے، وہ بھی میرا ذاتی ہے۔ یہ تیسرا تفنگچہ عزیزی ارجمند مثیل فرزند ابراہیم ہی کا ملک جانیے یا جمعیت اسے اس کی قیمت دے دے۔ دراصل زمانۂ انقلاب[2] گزشتہ افغانستان کے وقت سے جمعیّت چمرکنڈ میں لگائے ہوئے تین سو روپے کابلی کے عوض میں نے یہ تفنگچہ لیا تھا ؛

حضرت امیر صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ میرا خیال عزیزی ابراہیم کی شادی کسی موزوں جگہ کرانے کا تھا اور میں ارجمندی سے وعدہ کر چکا تھا، مگر موقع نہ پا سکا۔ پس اگر آپ میرے اس خیال و وعدہ کو عزیز کے متعلق جو کہ فداکاری و صداقت کا پُتلا ہے، سرانجام کر دیں گے اور اسے اسمس میں یا چمرکنڈ میں خوش رکھیں گے اور کام لیں گے تو میرے بعد مجھ پر احسان کریں گے ؛

چھوٹا ہشت تکہ جرمنی تفنگچہ جو خود میرے گلے میں ہوتا تھا، نیز ایک مشہدی صافہ ریشمی جو مجھے تحفۃً ملا تھا، نیز تین ریشمی دوپٹے سرکاری اور آپ کے حضور میں پیش ہونے کے ہیں۔ دونوں گرم چپکن میرے سیاہ و خاکی بھی آپ جسے دیں، باقی کپڑے ابراہیم کے علم میں ہیں۔ میرے پٹکوں میں سے ایک شاہ جی نعمت اللہ صاحب کو دے دیا جائے۔ سفید چپکن کام کے نہیں رہے۔ تاہم چھوٹا میاں صاحب معاذ اور بڑا بھائی ایوب یا حاجی صاحب عبدالعلیم لے لیں یا جسے یہ دیں۔ موٹا تفنگچہ بھی مع موٹے کارتوسوں کے جو غالباً میرے ٹرنک میں ہیں، سرکاری ہے۔ مندرجۂ فوق ہشت تکہ جرمنی تفنگچے کے کچھ کارتوس بھی میرے ٹرنک میں ہیں۔ اگرچہ وہ بھی میرے ایک دوست نے تحفۃً دیے تھے، سرکاری ہی سمجھے جائیں،

---

[1] صبغت اللہ بن امیر نعمت اللہ شہید ؛ [2] بچہ سقّا کے دور کا انقلاب ؛

البتہ میری خواہش ہے کہ ان کارتوسوں کے حساب میں سے چمرکنڈ کے وفادار جمعیتی بھائیوں کو فی نفر ایک ایک روپیہ گھی کے لیے دے دیا جائے۔ خدائے پاک آپ کو جزائے خیر دے گا۔

میرے ٹرنک میں جو کاغذات ہیں، ان میں بعض جماعت کے لیے بہت قیمتی سندات و تصدیقات خدمت اسلام پر حاوی ہیں۔ کسی ناقابل اعتماد اور بے پروا ہاتھ میں نہ جانی چاہئیں۔ امنائے خاص جمعیت دیکھیں اور محفوظ رکھیں۔

بہ فضل خداوندی چمرکنڈ کا کتب خانہ بھی خوب ہی کتب دینی و تاریخی پر حاوی ہے۔ اگر محفوظ رہے گا اور کبھی کبھی دھوپ لگوا کر اسے کیڑوں سے بچاتے رہیں گے تو جب کبھی کوئی عالم جید جمعیت میں آجائے تو اسے بہت کام دے گا۔ اس لیے اس کی نگہداشت و حفاظت میں پوری کوشش کی جائے۔

حدود افغانستان میں روغنِ زرد اور غلہ و تفنگ کی آزادی کا فرمان مجریۂ حکومت حاضرہ بھی ملفوف وصیت نامہ ہے۔ انشاء اللہ جدید صدر کی مُہر اور دستخط سے بھی حکومت اس لطف و مہربانی کو جاری رکھے گی جو خود میری مُہر سے وہ رکھتی تھی۔

عام ارکان جماعت سے استدعا ہے۔ اسمس میں ہوں یا چمرکنڈ میں یا کسی اور جگہ، اگرچہ میں نے اپنی طرف سے طاقت بشری کے مطابق اس معیار پر رفتار کی کوشش کی ہے کہ چھوٹوں کو فرزندوں کی جگہ اور ہمسروں کو بھائیوں کی مانند سمجھا۔ تاہم میں ایک گناہگار انسان تھا اور انتظام جمعیت کی ذمہ داریوں کا تیراہ و وزیرستان تک مسئول رہا۔ کسی کو مجھ سے کسی قسم کی کوئی رنجش اور خفگی ہو تو معاف فرماویں۔ دوسروں کی ہر قسم کی زیادتیاں جو کسی نے دیدہ و دانستہ یا سہواً میرے حق میں کیں، حسبۃً للہ معاف کر چکا ہوں۔

سب رخصتی و وداعی سلام قبول کریں۔ مرقومہ ۲۶۔ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ

فقیر محمد بشیر بقلم خود از چمرکنڈ

شہادت | مولانا غالباً اوائل ستمبر ۱۹۳۴ء میں مولوی برکت اللہ ابن امیر نعمت اللہ اور جماعت

کے چھ سات آدمیوں کے ہمراہ کابل گئے تھے۔ وہاں سے اواخر اکتوبر میں واپس آئے۔ رمضان المبارک کی پہلی رات کو اپنے کمرے میں شہید کر دیے گئے۔ جماعت کے ذمہ دار افراد نے بتایا کہ مولانا کی شہادت ایک پنجابی طالب علم عبدالحلیم نام کے ہاتھ سے ہوئی جو پہرے پر متعیّن تھا۔ اس سازش میں غالباً اور لوگ بھی شامل تھے۔ مولانا اپنے کمرے میں تنہا سوتے تھے اور عادت یہ تھی کہ کواڑ بند کر کے سو جاتے تھے، اندر سے زنجیر نہ لگاتے تھے۔ سحری کے لیے ایک آدمی انھیں جگانے گیا اور دروازہ کھولا تو دیکھا کہ مولانا دروازے کے سامنے ہی زمین پر چت لیٹے ہوئے ہیں۔ اس نے دوسرے مجاہدین کو بلایا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں دیکھا گیا تو مولانا چارپائی کی پائنتی کی طرف زمین پر چت پڑے تھے اور قاتل یا قاتلوں نے انھیں بکرے کی طرح ذبح کر ڈالا تھا۔

جماعت کے دستور کے مطابق ہمیشہ رات کو تین پہرے ہوتے تھے۔ پہلا نماز عشا سے ساڑھے دس بجے تک۔ دوسرا ساڑھے دس سے دو بجے تک۔ تیسرا صبح تک۔ عبدالحلیم کا پہرا دوسرا تھا۔ اندازہ یہ ہے کہ اسی وقت میں اس کے ساتھی آئے۔ سب نے مل کر بحالت خواب دبا لیا۔ پھر چارپائی سے نیچے اتار کر گلے پر چھری پھیر دی۔ جسم پر زخم کا اور کوئی نشان نہ تھا، البتہ ازار بند تک کپڑے خون آلود تھے۔ مولانا کے پاس ایک کتّا بھی تھا، جو رات کے وقت کسی کو مجاہدین کی بستی کے پاس نہ آنے دیتا تھا۔ یہ کتّا چھت پر بندھا ہوا تھا۔ گویا عبدالحلیم نے اپنے ساتھیوں کو بُلانے سے پیشتر اسے بھی قابو کر لیا تھا۔

قاتل کی سرگزشت جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، قاتل کا نام عبدالحلیم تھا۔ وہ اس زمانے میں آیا تھا، جب مولانا کابل گئے ہوئے تھے۔ بالکل نوجوان تھا۔ ڈاڑھی ابھی نکل ہی رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ میں ضلع گورداسپور سے آیا ہوں اور مسجد میں ٹھہر گیا۔ مولانا اور مولوی برکت اللہ واپس آئے تو اس وقت بھی مسجد ہی میں رہتا تھا۔ مولوی برکت اللہ اسمست چلے گئے تو مولانا کو اس کا خیال آیا۔ اسے کھانا بھی باقاعدہ پہنچاتے اور چاے بھی اپنے ساتھ پلاتے۔ حالات دریافت کیے تو اس نے بتایا کہ ماں باپ مر چکے ہیں۔ کچھ انگریزی پڑھ لی تھی، اب تلاش معاش کے سلسلے میں افغانستان جانا چاہتا ہوں۔ پروانۂ راہ داری نہ مل سکا لہٰذا چمرکنڈ چلا آیا۔ مولانا نے اسے جماعت میں رہنے پر آمادہ کر لیا۔ قرآن مجید پر ہاتھ رکھوا کر

عہد لیا کہ نہ احکامِ جماعت کی خلاف ورزی کرے گا، نہ بد عہدی اور غداری کا مرتکب ہوگا۔ مجاہدین کے دل میں اس کے متعلق شبہات تھے، لیکن مولانا نے فرمایا کہ اس نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر میری تسلی کر دی ہے، اب شبہہ کی کوئی گنجایش نہیں۔ اس کی تعلیم کے لیے پشاور سے کتابیں منگوائیں ؎

بعض غور طلب امور اس حقیقت میں کوئی شبہہ نہیں کہ مولانا کی شہادت عبد الحلیم کی سازش اور تعاون سے ہوئی، لیکن اس سلسلے میں بعض امور ایسے تھے، جن کا کوئی اطمینان بخش حل نہ مل سکا مثلاً:

۱ - جماعت کا دستور یہ تھا کہ نمازِ عشا سے پیشتر کسی کو رات کے پہرے داروں کا علم نہ ہوتا تھا۔ نماز کے بعد جمعدار مختلف آدمیوں کو اطلاع دے دیتا کہ تمھیں فلاں وقت سے فلاں وقت تک پہرہ دینا ہوگا۔ اس وقت نہ اندر کا کوئی آدمی باہر جا سکتا تھا، نہ باہر کا اندر آ سکتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ عشا کے بعد پہرے داری کا علم ہونے پر عبد الحلیم نے اپنے ساتھیوں کو کس ذریعے سے اطلاع دی ؟

۲ - وہ خود نحیف البدن اور کمزور آدمی تھا اور تنہا ایسے اقدام کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ نیز مولانا کو جس حالت میں شہید پایا گیا، اس سے صاف واضح تھا کہ یہ ایک سے زیادہ آدمیوں کا کام تھا، وہ آدمی کون تھے اور کہاں سے آئے ؟

۳ - مولانا کا کتّا صرف عبد الحلیم سے مانوس تھا، اس لیے کہ وہ مولانا کے ساتھ رہتا تھا۔ کتّے کو چھت پر باندھنے کا کام اسی کے ہاتھوں انجام پایا۔ اگر وہ سازش میں شریک نہ تھا تو قاتلوں کے لیے یہ آسانیاں کیوں بہم پہنچائیں ؟

۴ - چمرکنڈ کا گاؤں مجاہدین کے مرکز سے تین یا چار فرلانگ پر تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر عبد الحلیم کے ساتھی چمرکنڈ میں مقیم تھے تو اس نے اپنے پہرے کے وقت میں کس ذریعے سے انھیں اطلاع دی؟ نصف میل جانا اور نصف میل آنا وقت طلب تھا۔ اگر وہ پہرا چھوڑ کر خود جاتا تو دوسروں کو فوراً علم ہو جاتا، لہٰذا یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ خود مرکز کے اندر یا اس کے بہت قریب اس کا کوئی شریک کار پہلے سے موجود تھا ؎

۵ - اگر اس کے ساتھی چمرکنڈ میں منتظر بیٹھے تھے تو عجیب بات یہ ہے کہ اہل چمرکنڈ کو اگلے دن ظہر کے وقت تک مولانا کی شہادت کے متعلق کوئی علم نہ ہو سکا ۔

مولوی فضل الٰہی وزیرآبادی اگرچہ جماعت مجاہدین سے الگ تھے تاہم ان کا مکان مجاہدین کی آبادی میں داخل تھا اور اس کا دروازہ باہر کی گلی میں کھلتا تھا، یعنی اس مکان کے ساکن آمد و رفت میں مجاہدین سے بے تعلق تھے۔ نیز اس کا ایک راستہ مولانا کے مکان کی چھت پر سے جاتا تھا، لہٰذا واقعاتِ شہادت کی بنا پر شبہہ کیا گیا کہ مولوی فضل الٰہی بھی اس سازش میں شریک ہیں۔ گویا عبدالحلیم نے ان کے کسی مقرر کیے ہوئے آدمی کے ذریعے سے ساتھی قاتلوں کو اطلاع دے کر بلایا اور اس مقدس بزرگ کو شہید کر کے وہ چُپ چاپ رفوچکّر ہو گئے، جس نے بیس سال کی زندگی کا ایک لمحہ جہاد فی سبیل اللہ میں گزارا۔ مولوی فضل الٰہی اور مولانا محمد بشیر کے درمیان جو شدید اختلافات چلے آتے تھے، وہ اس شبہے کے لیے تقویت کا باعث بن گئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولوی فضل الٰہی حادثۂ شہادت سے تین روز پیشتر گل صاحب چارمنگی کے پاس چلے گئے تھے۔ گویا ان کی براہِ راست شرکت کا بہ ظاہر کوئی امکان نہ تھا ۔

بادشاہ گل اور دوسرے اصحاب کی آمد

جماعتِ مجاہدین نے شہادت کے واقعے کو چھپائے رکھا، البتہ بادشاہ گل، گل صاحب چارمنگی وغیرہ کو فوراً اطلاعات بھیج دیں کہ مولانا شہید ہو چکے ہیں۔ آپ جلد از جلد آ کر نماز جنازہ میں شریک ہوں۔ ظہر کے وقت اہل چمرکنڈ کو اطلاع ملی تو انھوں نے مجاہدین کی بستی پر چڑھائی کر دی۔ اس اثناء میں بادشاہ گل صاحب آگئے اور شورش دب گئی۔ یکم رمضان المبارک کو عصر کے وقت مولانا اپنے خون آلود کپڑوں میں دفن ہوئے ۔

۲۔ رمضان المبارک کو گل صاحب چارمنگی بھی آگئے۔ بادشاہ گل نے دو سو چالیس روپے میں دو بیل خریدے۔ خچروں پر گیہوں منگوائے۔ آس پاس کے ملکوں اور خوانین کو دعوت دے کر بلایا۔ سب کے لیے کھانے کا انتظام کیا۔ ۴۔ رمضان المبارک کو نماز صبح کے بعد مسجد میں اجتماع ہوا۔ بادشاہ گل نے زبردست تقریر کی، جس میں جماعت مجاہدین کے علاوہ مولانا محمد بشیر کے اوصاف و محامد

بیان کیے اور ان کی عظیم الشان اسلامی خدمات پر روشنی ڈالی۔ آخر میں کہا کہ یہ قتل انگریزی حکومت کی سازش اور ایما سے ہوا ہے۔ اہل چمرکنڈ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تمھارے علاقے میں ایسے واقعے کا پیش آنا تمھارے لیے باعثِ ننگ و عار ہے۔

چونکہ مولوی فضل الٰہی پر بھی شبہہ تھا، اس لیے اجتماع میں فیصلہ ہوا کہ وہ اپنا مال اسباب لے کر مجاہدین کی بستی سے نکل جائیں، چمرکنڈ نہ رہیں۔ یاغستان میں اور جہاں چاہیں، قیام رکھیں۔

شہادت کی ذمہ داری اب رہا یہ امر کہ مولانا کو شہید کرنے کا حقیقی ذمہ دار کون تھا، تو اس بارے میں یقینی و قطعی طور پر کچھ عرض کرنا مشکل ہے، البتہ چند امور بالکل واضح ہیں:

۱ ۔ جس گروہ نے مولانا کو شہید کیا، اس میں عبدالحلیم یقیناً شریک تھا اور اس کے سرگرم تعاون کے بغیر یہ کام انجام نہ پا سکتا تھا۔

۲ ۔ عبدالحلیم کو اپنے پہرے کا علم رات کے نو بجے ہوا ہوگا۔ اس کے بعد خود اس کے لیے باہر جا کر اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینے کا کوئی امکان نہ تھا لہٰذا ضروری ہے کہ تسلیم کیا جائے اس کے شرکا مرکز سے بہت قریب کسی محفوظ مقام پر چھپے بیٹھے ہوں گے۔ یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ ممکن ہے انھوں نے مناسب موقع کے انتظار میں اس طرح کئی راتیں گزاری ہوں اور باہم اشارے مقرر کر لیے گئے ہوں۔

۳ ۔ یہ اہتمام تنہا عبدالحلیم نہ کر سکتا تھا، اس کے پس پشت کوئی بڑی طاقت ہونی چاہیے جس کے وسائل بہت وسیع ہوں۔

۴ ۔ اگر یہ درست ہے کہ عبدالحلیم ہندوستان سے تلاش معاش کے سلسلے میں افغانستان جا رہا تھا تو وہ چمرکنڈ کیوں پہنچا؟ خیال ہو سکتا ہے کہ جو راستہ اس نے اختیار کیا تھا، چمرکنڈ بھی اس میں ایک منزل تھا، لیکن وہ وہاں دیر تک کیوں ٹھہرا رہا؟ اس کے پہنچنے سے کئی روز بعد مولانا کابل سے آئے، پھر وہ آٹھ دس دن تک مولوی برکت اللہ مدارالمہام جماعت مجاہدین کی مہمانی میں لگے رہے۔ عبدالحلیم نے یہ پوری مدت چمرکنڈ کی مسجد میں گزاری اور کہیں نہ گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے

کہ وہ کسی گہری سازش کے ماتحت وہاں پہنچا تھا اور خود مولانا کے خلوص و اعتماد نے اسے کام کرنے کی مہلت دے دی ؛

۵ - شہادت کے بعد عبدالحلیم کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ قرینہ یہ ہے کہ وہ ہندوستان چلا آیا۔ یہاں اسے دار و گیر کا کوئی خطرہ نہ ہو سکتا تھا، اس لیے کہ اس کا فعل بہ اعتبار نتیجہ انگریزی حکومت کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ غیر اغلب نہیں کہ یہ سب کچھ اسی حکومت کے اہتمام و انتظام سے انجام پایا ہو ؛

مولانا نے جس دن راہِ ہجرت میں قدم رکھا تھا وہ اپنی جان جاں آفریں کے حوالے کر چکے تھے، لیکن کتنے رنج و قلق کا مقام ہے کہ جو بلند پایہ شخصیت دشمنانِ اسلامیت و آزادی کے خلاف جہاد کرتی ہوئی مرنے کی آرزومند تھی، وہ اپنوں کے ہاتھوں رمضان المبارک کی پہلی رات میں بہ حالت بےکسی ذبح ہوئی۔ یقین ہے کہ مولانا کے جذبۂ فداکاری کی زبان پر آخری وقت میں بھی یہ ترانہ ہوگا :

جانے کہ داشت کرد فدائے تو آذری
شرمندہ از تو گشت کہ جانِ دگر نہ داشت

بارھواں باب

مولانا محمد بشیر کی شخصیت

قتل کی ذمہ داری مولانا محمد بشیر کی شہادت کے متعلق جتنی تفصیلات دست یاب ہو سکیں، پیش کر دی گئیں۔ صرف ایک بات رہ گئی اور وہ یہ کہ مولانا کی شہادت سے تقریباً ایک سال قبل محمد نام ایک شخص نے بھی انھیں شہید کرنا چاہا تھا اور وہ فائر کرتے ہوئے گرفتار ہوا۔ حسنِ اتّفاق سے مولانا کو کوئی گزند نہ پہنچا اور محمد کو اسی وقت جماعت سے خارج کر دیا گیا۔ غالباً اس حادثے کے ساتھ ہی مولانا نے وصیت نامے مرتّب کر دیے تھے، اس لیے کہ انھیں خیال ہو گیا تھا، خدا جانے کب ایسا واقعہ دوبارہ پیش آجائے۔

بائیس سال کے بعد آج یہ عرض کر دینا غالباً افشائے راز نہ سمجھا جائے کہ جو تفصیلات پہلے پیش کی جا چکی ہیں، یہ والا حضرت سردار شاہ محمود خان غازی نے اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے سے مہیا کی تھیں۔ اُس زمانے میں وہ افغانستان کے وزیر حربیہ تھے، لہٰذا ان کے مستند ہونے میں کلام کی گنجایش نہ ہونی چاہیے۔ سردار موصوف کو بھی مولانا سے خاص تعلّق تھا۔ ظاہر ہے کہ اس پوری سازش کی روح رواں عبدالحلیم تھا، لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، وہ تنہا یہ کام انجام نہ دے سکتا تھا اور جن حالات میں اس نے سازش کو لباسِ عمل پہنایا، ان میں باہر سے کوئی امداد حاصل نہ کر سکتا تھا جب تک مجاہدین کی بستی کے اندر کوئی شخص اس کا پورا ہم نوا نہ ہوتا۔ غالباً اسی وجہ سے مولوی فضل الٰہی مرحوم کے متعلق بعض قلوب میں شبہات پیدا ہوئے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ مولوی فضل الٰہی اور مولانا محمد بشیر کے باہمی تعلّقات حد درجہ خراب تھے، تاہم اس زمانے میں بھی اور بعد کے دور میں بھی اکثر صائب الرائے افراد کا خیال یہی تھا کہ یہ سب کچھ انگریزوں کے ایماء اور ساز باز سے ہوا۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے کیا کیا تدبیریں

اختیار کیں؟ اس سوال کا کوئی مفصل اور مستند جواب اب تک نہ مل سکا۔ اتنا اور عرض کر دینا چاہیے کہ مولانا کی شہادت ساڑھے دس اور ڈیڑھ دو بجے کے درمیانی وقت میں ہوئی۔ غالباً رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے اور قاتل جاتے وقت مولانا کے کمرے سے چار بندوقیں، ایک ریوالور اور ایک کابلی دُھسا بھی لے گئے۔ ان میں سے کسی کے متعلق بعد میں کچھ معلوم نہ ہو سکا اور نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ عبدالحلیم زندہ ہے یا فوت ہو گیا اور زندہ ہے تو کہاں ہے؟

مولانا کی شخصیت اس طرح وہ عظیم الشّان شخصیت اس دنیا سے رخصت ہوئی، جس نے بیس سال تک جماعتِ مجاہدین کی رگوں میں زندگی کا نیا خون دوڑائے رکھا اور جس کا وجود مسلسل و متواتر انگریزی حکومت کے لیے انتہائی سراسیمگی و اضطراب کا باعث بنا رہا۔ مولانا ۱۹۱۵ء میں یاغستان پہنچے تھے اور جاتے ہی مجاہدانہ سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے یاغستان کے مختلف حصّوں میں جہاد کے مرکز قائم کیے۔ تمام قبیلوں میں وعظ و تذکیر سے اسلامی حمیت و غیرت کی آگ بھڑکائی اور انھیں انگریزوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کیا۔ ان کے باہمی تفرقے مٹائے تاکہ وہ متحد ہو کر موثر و نتیجہ خیز کام کر سکیں۔ انھیں جس خطّے یا جس شخصیت سے تھوڑی یا بہت امداد کی امید ہو سکتی تھی، اس کے پاس بے تکلف پہنچے اور اپنے ساتھ ملانے میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا۔ یاغستان یا افغانستان میں جو اثر و رسوخ اور جو احترام و ہر دل عزیزی انھیں مدت العمر حاصل رہی، وہ شاید ہی کسی دوسرے ہندوستانی مجاہد کو حاصل ہوئی ہو۔ پھر انھوں نے خدا کی راہ میں ایثار و بے نفسی کے جو نمونے پیش کیے، ان کی مثالیں بھی دورِ حاضر میں بمشکل ملیں گی۔ اُن کے پاس ہر عہد میں ہندوستان اور افغانستان سے گراں قدر رقمیں پہنچتی رہیں۔ ان کے بال بچوں کی مالی حالت کچھ مدت بعد بہت سقیم ہو گئی تھی، تاہم ایک حبّہ بھی کسی کو نہ بھیجا اور ہر شے جماعتِ مجاہدین کے کاموں کے لیے وقف رکھی۔ مولوی محمد علی قصوری نے فرمایا ہے کہ امیر حبیب اللہ خاں کے عہد میں انھیں مستقل طور پر ایک ہزار روپیہ ماہانہ ملتا تھا۔ وہ اس رقم میں سے صرف پانچ روپے اپنے گزارے کے لیے رکھ لیتے تھے، باقی رقم جماعت کے حوالے کر دیتے تھے۔ بعد کے ادوار میں بھی غالباً یہ رقم بدستور جاری رہی۔ پھر ان کے مخلص نیاز مند نذور و تحائف کی شکل میں برابر کچھ نہ کچھ دیتے رہتے تھے، لیکن

مولانا اپنی ذات کی طرح ہر شے کو اللہ کی راہ میں وقف کر چکے تھے اور کسی ذاتی تحفے سے بھی کبھی کوئی فائدہ نہ اٹھایا، الّا یہ کہ بعض دوستوں اور نیازمندوں کے دیے ہوئے اسلحہ میں سے کوئی چیز ضرورتاً اپنے پاس رکھ لی یا کوئی کپڑا استعمال کر لیا۔ ان کا لباس بہت سادہ ہوتا تھا۔ معمولی شلوار، معمولی کُرتا اور ایک لمبا سیاہ چوغہ، سر پر عموماً سفید پگڑی رکھتے تھے۔ کبھی کبھی سادہ سی لُنگی بھی باندھ لیتے تھے۔ ایک تمنچہ ہر وقت گلے میں حمائل رہتا تھا۔

محمد علی قصوری کا بیان مولوی محمد علی قصوری کو کابل اور یاغستان میں مولانا کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ بار بار ان کی تعریف کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مولانا محمد بشیر :

حیرت انگیز انسان تھے۔ ان کی انتظامی قابلیت اور سیاسی سوجھ بوجھ بے مثال تھی۔ انھوں نے کابل پہنچتے ہی امیر صاحب (حبیب اللہ خاں) کے مزاج میں اتنا عمل دخل پیدا کر لیا کہ امیر صاحب نے ان کو یاغستان کی تنظیم کے لیے مامور فرمایا اور بارہ ہزار روپیہ سالانہ تنظیمی اخراجات کے لیے ان کے حوالے کیا[1]۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں :

ملّا بشیر صاحب بھی ایک بے نظیر انسان تھے۔ مجسّم عمل، خلوص کا پُتلا، انگریز کے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں بڑے مشّاق۔ مقرر ایسے اعلیٰ درجے کے کہ بڑے بڑے مجمعے ان کی آتش بیانی سے مسحور ہو جاتے تھے[2]۔

پھر ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے :

جماعت کے با اثر حضرات میں سے امیر نعمت اللہ کے بعد ملّا بشیر تھے . . . .

ملّا بشیر واقعی حیرت انگیز شخص تھے۔ سلف صالح کے سچّے جانشین، ان تھک کارکن، مجسّم عمل، ایثار کا پیکر، بے غرض، صحیح معنوں میں انقلابی لیڈر تھے۔ انھیں دیکھ کر

---

[1] "مشاہدات کابل و یاغستان" صـ ۲۹ ۔

[2] " " صـ ۶۱، ۶۲ ۔

اقبال کا مشہور شعر یاد آتا تھا:

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

امیر حبیب اللہ خاں صاحب نے اُن کے کام سے خوش ہو کر بارہ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ وہ اس میں سے قُوتِ لایموت رکھ لیتے۔ غالباً پانچ روپیہ ماہوار اور باقی سب بیت المال میں اسلحہ کے لیے جمع کرا دیتے تھے۔ ان کا اثر تمام یاغستان میں بے نظیر تھا۔ ہر قبیلے کے ملک اور شیوخ ان کی بے حد عزّت کرتے تھے۔ حق یہ ہے کہ انھیں کی وجہ سے تمام علاقوں میں امیر نعمت اللہ کا خاصا وقار قائم ہو گیا تھا[ہ]۔

ایک قابلِ غور نکتہ ایک قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ امیرِ مجاہدین کے جن حالات سے بعض دوسرے مخلص اصحاب پر بُرا اثر پڑا اور وہ نہ محض واپس چلے آئے بلکہ مجاہدین کا کام بھی چھوڑ دیا، وہ حالات مولانا محمد اشبیر کے بھی سامنے آئے اور یقیناً انھیں انتہائی رنج پہنچا ہوگا، تاہم انھوں نے اپنا کام نہ چھوڑا۔ وہ جس نصب العین کے لیے اہل وعیال اور گھر بار کو ترک کرنے پر آمادہ ہوئے تھے، بدستور ان کے سامنے رہا۔ دوسرے لوگوں نے یہ سمجھا کہ خود ان کی طرح جماعت کے ہر فرد کو بے نفس، بے غرض اور پیکرِ ایثار ہونا چاہیے۔ یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو وہ کام چھوڑ کر لوٹ آئے۔ مولانا کی خواہش بھی یقیناً یہی تھی، لیکن انھوں نے کام نہ چھوڑا اور سمجھ لیا کہ مشکلات زیادہ ہیں تو ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے زیادہ محنت و مشقّت اور زیادہ جفاکشی و جاں فشانی کی ضرورت ہے۔ اس سے مولانا کے عشقِ مقاصد کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

قوموں اور ملکوں کی تقدیریں بدلنا اور انھیں غلط راستے سے ہٹا کر صحیح راستے پر لگانا آسان کام نہیں۔ اس کے لیے غیر معمولی صبر و استقامت کی ضرورت ہے۔ مقصد و نصب العین کے سچے شیدائی مشکلات و موانع سے گھبرایا نہیں کرتے بلکہ اپنی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیتے ہیں اور اپنی ہمّتوں کو استوار بنا

ہ "مشاہدات کابل و یاغستان" صفحہ ۱۱۱، ۱۱۲۔

لیتے ہیں۔ عرفی نے اپنے مشہور شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے :

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

مولانا کی پوری مجاہدانہ زندگی اس استقامت کی ایک عجیب و غریب مثال ہے۔ مرکزِ مجاہدین کی بعض خرابیوں یا کمزوریوں کی بنا پر وہ نہ اصل کام سے دست بردار ہوئے اور نہ ہمت ہاری۔ افغانستان میں امیر حبیب اللہ خاں کے تذبذب اور بے ہمتی نے ان کے ایک عظیم الشان منصوبے کو ناکام بنا دیا تھا، تاہم وہ پریشان نہ ہوئے اور اپنی زندگی کے آخری سانس تک پیشِ نظر مقصد کے لیے تدبیریں سوچتے اور اسباب فراہم کرتے رہے۔ نظیری کیا خوب کہہ گیا ہے :

کارِ ما با گردشِ طاس است و نقشِ کعبتین
با حسابِ انجم و کج بازیِ گردوں چہ کار

ضمیمہ

کابل میں ایک دعوت میں کتاب مکمل کر چکا تھا کہ اتفاقیہ حاجی میر شمس الدین مرحوم معتمد انجمن حمایت اسلام کی کتاب "سیاحتِ افغانستان" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں چلسے کی ایک دعوت کا ذکر ہے جو راجا مہندر پرتاپ کی طرف سے مہاجرین ہند کو ہوٹل مرکزی اندرابی (کابل) میں بتاریخ ۱۱۔ نومبر ۱۹۲۶ء بوقت تین بجے بعد دوپہر دی گئی تھی۔ اس دعوت میں حاجی میر شمس الدین اور دوسرے ہندوستانیوں کے علاوہ جماعتِ مجاہدین کی طرف سے بھی بعض اصحاب شریک تھے، جو وفد کی صورت میں کابل آئے تھے۔ مثلاً مولانا محمد بشیر، سید فضل اللہ شاہ، مولوی محمد اسماعیل •

راجا صاحب کی تقریر اس موقع پر راجا صاحب نے ایک لمبی تقریر کی۔ اس میں دوسرے امور کے علاوہ جماعتِ مجاہدین کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

> آپ میں سے اکثر احباب کو غالباً اس صد سالہ تحریک مجاہدین ہندیہ کا پہلے سے علم ہوگا کہ کس طرح اس تحریک کے بانیوں نے جب ہندوستان میں اپنی قومی سلطنت وحکومت کے قصر کو اغیار کے ہاتھوں تباہ ہوتے پایا تو اس کی حفاظت وبحالی کے لیے املاک واوطان، خویش واقارب اور ہر قسم کی راحت وآرام کو لات مار کر بیابانوں اور سرحد ہند کے تنگ وتاریک پہاڑوں میں آکر جگہ پکڑی، اور دشمن کی ہر تباہ کن کوشش کے باوجود ہندوستان کی آزادی کے حصول کے لیے کسی قربانی وفداکاری سے کبھی بھی دریغ نہ کیا۔ . . اگرچہ ملک وملت نے اس جماعت اور اس تحریک کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں کی، مگر ایک زمانہ آئے گا جب ہندوستان کے افق پر ان کے کارنامے سنہری حروف سے لکھے ہوئے نظر آئیں گے اور مادر وطن کا ایک ایک فرزند اس پر بجا فخر کرتا دکھائی دے گا•

اس کے بعد راجا صاحب نے حاجی میر شمس الدین کی تعلیمی خدمات کا ذکر فرمایا اور یہ بھی کہا کہ قومیں ایک ہی جست میں ترقی نہیں کرتیں بلکہ مقدس مقاصد کے لیے قرنوں فداکارانہ قربانیاں کی جایا کرتی ہیں•

مولانا بشیر کے ارشادات راجا صاحب کے بعد مولانا محمد بشیر نے اپنی طرف سے اور تمام ارکان وفدِ مجاہدین کی طرف سے راجا صاحب کا شکریہ ادا کیا اور جماعت کے نصب العین نیز بعض فداکاریوں کا بھی ذکر فرمایا۔ اس ضمن میں کہا :

اگرچہ گزشتہ چھ سال کے عرصے میں بعض افراد کی کوتہ اندیشیوں کے باعث ایسی سراپا فدائیت تحریک بھی شقاق و اختلاف کی بھینٹ چڑھ چلی تھی اور اس کے مشہور مراکز اسمٓد[1] و چمرکنڈ میں تعلقات منقطع ہو چکے تھے، مگر خدائے پاک کا کمال احسان ہے کہ سال حال کے دوران میں یہ سب جماعت پھر ایک ہو گئی ہے اور اسمد سے لے کر وزیرستان تک کے مراکز ایک ہی سلسلے میں منسلک ہو کر ایک ہی نظام کے ماتحت خدمات مذہبی و ملی بجا لا رہے ہیں۔ اس کا یہ ادنیٰ ثمرہ ہے کہ آج آپ اپنے درمیان ان کل مراکز کے نمایندے اس جگہ یکجا تشریف فرما دیکھ رہے ہیں . . . پروگرام محض اس قدر ہے کہ ہندوستان کی آیندہ آزادی کے قصر کی بنیادوں کے وہ پتھر نہایت ہی مضبوطی سے نصب کر دیں جن کی بنیاد پر اس کی اپنی حکومت کے قصر کے ستون اور دیواریں کھڑی ہوں ؛

مولوی محمد اکبر ترجمان نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ مجاہدین کے درمیان اتفاق کا سہرا مولانا بشیر کے سر ہے اور یہ محض ان کی مخلصانہ مساعی کا ثمرہ ہے[2]

ضروری امور ان تقریروں سے مندرجہ ذیل امور واضح ہوتے ہیں :

۱ - جماعتِ مجاہدین کے مرکز اسمست سے وزیرستان تک پوری سرحد آزاد میں قائم تھے۔

۲ - اس کے دو بڑے مرکزوں یعنی اسمست اور چمرکنڈ میں چھ سال تک اختلاف و انشقاق کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ ان کے درمیان تعلقات بھی منقطع ہو چکے تھے۔

۳ - چھ سال کے بعد ۱۹۲۶ء میں مولانا محمد بشیر کی کوششوں سے اختلاف دور ہوا اور دونوں مرکز ایک نظام کے ماتحت کام کرنے لگے۔

۴ - جماعتِ مجاہدین کے مقاصد میں آزادیِ ہند کو نمایاں ترین درجہ حاصل تھا اور یہ مقصد آخری دور ہی میں نہیں بلکہ سید شہید کے وقت سے جماعت کے سامنے رہا۔

[1] یہ اسمست ہے غالباً سماعت کی بنا پر اسے "اسمد" لکھ دیا گیا۔ [2] سیاحت افغانستان ص ۲۶-۲۹۔

تیرھواں باب

مولوی فضل الٰہی وزیر آبادی

ابتدائی کام جماعت مجاہدین کے ایک بہت بڑے کارکن مولوی فضل الٰہی وزیرآبادی تھے، جن کا ذکر مولانا محمد بشیر کی شہادت کے سلسلے میں ایک سے زیادہ مرتبہ آچکا ہے۔ وہ کسی امیر گھرانے کے فرد نہ تھے۔ ان کے والدِ ماجد مولوی میراں بخش ریلوے کے محکمے میں ملازم ہوے اور غالباً پلیٹیر کے درجے پر پہنچ کر سبک دوش ہو گئے۔ تقریباً اڑھائی ہزار روپیہ انھیں بونس کے طور پر ملا۔

مولوی فضل الٰہی نے بھی اسی محکمے میں ملازمت اختیار کر لی تھی، لیکن ان کے دل میں ابتدا ہی سے دینی اور اسلامی خدمات کی تڑپ موجود تھی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس ذریعے سے جماعت مجاہدین کے ساتھ تعلق پیدا کیا۔ ۱۹۰۳ء یا ۱۹۰۴ء میں اسمست پہنچے اور امیر عبدالکریم کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔ وہاں سے حکم ہوا کہ ہندوستان جا کر جماعت کے لیے چندہ اور آدمی فراہم کرتے رہیں۔ وہ پہلے بھی بطورِ خود یہی کام کر رہے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں ملازمت ترک کر دی اور جماعتی کاموں کے لیے وقف ہو گئے۔ وہ چپ چاپ ملک کے طول و عرض میں پھرتے رہتے تھے۔ تمام ممتاز ملکی رہنماؤں سے گہرے تعلقات پیدا کر لیے۔ ان میں سے بطورِ خاص قابلِ ذکر مولانا ابوالکلام آزاد ہیں، جن کی دینی دعوت نے "الہلال" کے ذریعے سے عالمگیر شہرت حاصل کر لی تھی۔ مولوی فضل الٰہی نے اس دوران میں ہزاروں روپے فراہم کیے اور اپنے ساتھ مخلص کارکنوں کی ایک بہت بڑی جماعت پیدا کر لی، جس کے افراد، فراہم کردہ روپیہ اور آدمی اسمست پہنچاتے تھے۔ جماعت کو جس چیز کی ضرورت ہوتی تھی، اس کا انتظام مولوی صاحب موصوف کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مولانا ابوالکلام کے ذریعے سے ایک فرد کو اسمست پہنچایا جو ڈاکٹری کی تعلیم پوری کر چکا تھا۔

گرفتاری اور اسیری یہ کام سہل نہ تھا۔ قدم قدم پر قسم قسم کے خطرات درپیش تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں مولوی صاحب کی بھی سرگرمیاں انگریزوں کی خفیہ پولیس کے علم میں آگئیں اور انھیں گرفتار کرکے جالندھر کے جیل خانے میں بند کر دیا گیا، لیکن مولوی صاحب کا نشہ ایسا نہ تھا، جسے اسیری کی ترشی اتار سکتی۔ انھوں نے جیل میں ولی محمد نام ایک وارڈر کو اپنا ہم نوا بنا لیا اور اس کے ذریعے سے تمام رفیقوں کو سرگرمی کے ساتھ کام جاری رکھنے کی تحریری ہدایتیں دیتے رہے۔ سوءِ اتفاق سے ایک تحریر پکڑی گئی۔ ولی محمد وارڈر پختہ کار نہ تھا، اس نے مصیبت سر پر آتے دیکھی تو تمام راز افشا کر دیے اور مولوی صاحب کی تحریرات جن جن رفیقوں کے پاس جاتی تھیں، ان سب کے نام بتا دیے۔ چنانچہ ان لوگوں کو بھی گرفتاری کی مصیبتوں سے سابقہ پڑا۔

مولوی صاحب کے والدِ ماجد ۱۹۱۶ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے تھے اور ۱۹۱۸ء میں فوت ہو گئے۔ اس حادثے نے مولوی صاحب کے گھر بار کا نظم و نسق درہم برہم کر ڈالا۔ چنانچہ وہ مجبوراً ایک سال کے لیے تین ہزار روپے کی ضمانت دے کر اس شرط پر رہا ہوئے کہ وزیر آباد سے باہر نہ جائیں گے۔ شدید پابندی کی اس مدت میں بھی انھوں نے جماعتِ مجاہدین کا کام جاری رکھا اور اس میں کوئی فرق نہ آنے دیا، حالانکہ ان کے لیے خطرات بہت بڑھ گئے تھے۔

ہجرت ضمانت کی میعاد ختم ہوئی تو وہ معمول کے مطابق فراہمی زر اعانت کے لیے دورے کرنے لگے۔ ساتھ ساتھ چھریاں قینچیاں بھی بیچا کرتے تھے۔ جون ۱۹۲۰ء میں قاضی کوٹ سے اسلحہ برآمد ہونے کی اطلاع ملی تو مستری ابراہیم کے بیان کے مطابق مولوی صاحب نے کہا کہ اب زندگی کا خاتمہ ہے۔ جہاں مجھے اپنے بچاؤ کا موقع ملے گا وہاں چلا جاؤں گا۔ انھیں دنوں میں وہ ہجرت کرکے یاغستان چلے گئے اور اپنے بال بچوں کو بھی وہیں بلا لیا۔ معلوم نہیں، کتنی مدت اسمست میں گزاری، پھر چمرکنڈ چلے گئے اور ہجرت کی بقیہ مدت وہیں بسر کی۔ چمرکنڈ کی جماعت کے رئیس مولوی عبدالکریم کا انتقال ہوا تو مولانا محمد بشیر تیراہ و وزیرستان گئے ہوئے تھے۔ جماعت نے مولوی فضل الٰہی کو عارضی طور پر رئیس منتخب کر لیا۔ مولانا بشیر اپنا کام انجام دے کر واپس آئے تو مرکزِ اسمست کی

ہدایت کے مطابق وہ مستقل رئیس بن گئے۔ غالباً یہ امر پہلی مرتبہ مولانا محمد بشیر اور مولوی فضل الٰہی کے درمیان اختلاف کا باعث ہوا، جو آخری وقت تک قائم رہا۔

یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دونوں میں سے کسی کو ریاست و امارت کی خواہش تھی، اس وجہ سے ان کے درمیان تکدّر پیدا ہوا۔ دونوں بڑے ہی مخلص اور ایثار پیشہ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے طریق کار اور لائحۂ عمل میں بیّن فرق تھا اور دونوں چاہتے تھے کہ جماعتی کاروبار کو اپنے ذوق، طبیعت اور صواب دید کے مطابق چلائیں۔ یہ اختلاف یقیناً حد درجہ ناخوش گوار تھا، جسے دُور کرنے کے لیے بعض مخلصوں نے بارہا کوششیں کیں، لیکن یہ اُس حد تک دُور نہ ہو سکا، جس کی آرزو سب کو تھی۔ لہٰذا ایک مقام پر رہنے کے باوجود دونوں کے تعلّقات میں انقطاع کا سلسلہ جاری رہا، اگرچہ مولانا محمد بشیر جماعتِ چمرکنڈ کے مسلّمہ رئیس تھے اور مولوی فضل الٰہی جماعت کے کام میں دخل نہ دیتے تھے۔ یہی اختلاف تھا جس کی بنا پر سمجھا گیا کہ محمد بشیر پر قاتلانہ حملہ کرانے یا انھیں شہید کرنے میں مولوی صاحب کا بھی ہاتھ تھا۔ مولانا محمد بشیر نے خود مجھ سے ایک مرتبہ ایسی باتیں کیں، جن سے مترشّح ہوتا تھا کہ وہ مولوی فضل الٰہی کی طرف سے مطمئن نہیں، تاہم مجھے اب تک کوئی ایسی شہادت نہ مل سکی، جس سے مولوی فضل الٰہی پر عائد کردہ الزام کو خفیف سی بھی تقویت پہنچتی۔

ہجرت سے کچھ ہی مدّت بعد مولوی صاحب موصوف کی والدۂ ماجدہ اور بھائی محمد الٰہی کا انتقال ہو گیا، لیکن ان حوادث پر بھی انھوں نے ہندوستان آنا گوارا نہ کیا اور اپنے فیصلۂ ہجرت پر مستقیم رہے۔

سیّد صاحب کے متعلق عقیدہ حافظ عنایت اللہ صاحب امرت سری جو جامع اہل حدیث گجرات میں خطیب ہیں، فرماتے ہیں کہ اوائل میں مولوی فضل الٰہی سیّد احمد شہید کو شہید نہ مانتے تھے:

میں نے ایک مرتبہ سیّد صاحب کو شہید بتایا تو آپ سخت ناراض ہوئے۔ مجھے دھکّا دے کر چارپائی سے نیچے گرا دیا اور فرمایا کہ وہ زندہ اور غائب ہیں، عنقریب ظاہر ہوں گے۔ نیز آپ نے جماعت کا شایع کردہ ایک رسالہ بہ نام "خلاصہ" مجھے دکھایا، جس میں یہ حدیث درج تھی کہ اذا مضت الف و مئتان و اربعون سنۃ بعث اللہ

المہدی فیبایع علی یدہ خلق کثیر ثم یغیبہ اللہ فیرتدون الی دین اباۂم الا من اتبع کتاب اللہ و سنت نبیہ (جب ایک ہزار دو سو چالیس سال گزر جائیں گے تو اللہ تعالیٰ مہدی کو اٹھائے گا۔ بہت سی خلقت اس کے ہاتھ پر بیعت کرے گی۔ پھر اللہ اسے غائب کر دے گا اور لوگ اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ جائیں گے، سوا ان کے جو اللہ کی کتاب اور اس کے نبیؐ کی سنت کے پیرو ہوں)۔ مگر یہ روایت حدیث کی کسی بھی کتاب میں نہیں، بلکہ جو ذخیرہ موضوعات کے نام سے علمائے کرام نے جمع فرمایا ہے، اس میں بھی یہ روایت نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد یہ وضع کی گئی اور اس قسم کی بے سروپا حکایات سوانحِ احمدی میں بھی درج ہیں، مگر تقسیمِ ہند کے بعد مولوی صاحب مرکز چمرکنڈ سے اپنے وطن واپس تشریف لائے تو میرے روبرو آپ نے کئی بار سید صاحب کو شہید بتایا۔

گویا آخری دور میں ان کا عقیدہ بدل گیا تھا۔ میں اس مسئلے پر "سید احمد شہیدؒ" میں مفصل بحث کر چکا ہوں۔ اعادے کی ضرورت نہیں۔ سید صاحب کے زندہ اور غائب ہونے کا عقیدہ ہر نقطۂ نگاہ سے ناقابلِ قبول ہے۔

مولوی صاحب کی مراجعت عام روایت یہ ہے کہ مولوی صاحب اواخر جولائی ۱۹۴۸ء میں یاغستان سے وطن واپس آئے اور انھیں گرفتار کر لیا گیا، لیکن جلد رہا ہو گئے۔ مجھے بعض ذرائع سے معلوم ہوا کہ وہ تقسیم سے پیشتر چھپ چھپا کر ہندوستان پہنچ گئے تھے۔ کچھ مدت بنگال میں رہے۔ جب دہلی میں تقسیم کی بحثیں ہو رہی تھیں تو مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ بعض دوسرے اکابر سے بھی ملاقاتیں کرتے رہے۔ وہ جب تک یاغستان میں رہے، پکے کانگرسی تھے۔ "نہرو رپورٹ" کے بعد مسلمانوں میں کانگرس کے متعلق شدید بے اعتمادی پیدا ہو گئی تھی اور اکثر اکابر کانگرس کے مقابلے میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو ہم رائے اور ہم آہنگ بنانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ اس تحریک میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا شوکت علی مرحوم پیش پیش تھے۔ روزنامہ "انقلاب" اسلامی تنظیم کا علَم دار

بنا ہوا تھا۔ مولوی فضل الٰہی نے رمضان ۱۳۴۸ھ (جنوری ۱۹۳۰ء) میں ایک طویل مکتوب، جو فلسکیپ سائز کے چار صفحات پر مشتمل تھا، "انقلاب" کی وساطت سے مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو بھیجا تھا اور ایک مکتوب خود "انقلاب" کو لکھا تھا۔ ان میں انتہائی گرم جوشی سے کانگرس کے مسلک کی تائید اور ہمارے مسلک کی مخالفت کی گئی تھی۔ یہ دونوں مکتوب اب تک میرے پاس محفوظ ہیں، لیکن تقسیم ہند کے بعد وہ لاہور تشریف لائے تو کانگرس کے سخت مخالف اور لیگ کے سرگرم حامی بن چکے تھے۔

وفات | یہاں آکر انھوں نے جہادِ کشمیر میں بھی حصہ لیا تھا اور "جہادِ کشمیر" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ جماعتی حالات کے متعلق ان کے پاس بڑی بیش قیمت معلومات ہوں گی۔ میں نے بارہا عرض کیا کہ تھوڑی سی فرصت نکال کر ان معلومات سے مشرف فرمائیں، لیکن انھیں وقت نہ مل سکا وہ خود میرے پاس آنے کے وعدے کرتے رہے جنھیں مسلسل سفروں کے باعث پورا نہ کرسکے۔ انھوں نے ان لوگوں کے لیے مزروعہ زمین کے دو چک بھی مخصوص کرائے تھے، جنھیں جماعتِ مجاہدین کی خدمات کے سلسلے میں گوناگوں تکلیفیں پہنچی تھیں۔ ۵۔ مئی ۱۹۵۱ء کو وزیرآباد میں فوت ہوے۔ وصیت کے مطابق انھیں بمقام بالاکوٹ اس احاطے میں دفن کیا گیا، جس میں سید احمد شہید کی قبر بتائی جاتی ہے، حالانکہ سید صاحب کی قبر کا متعین نشان کوئی نہیں۔ موجودہ قبر کم وبیش باسٹھ سال بعد ۱۸۹۳ء میں بنائی گئی تھی۔ اگر سید صاحب اس قبر میں دفن ہوے تو میت صرف دو تین دن وہاں رہی پھر نہنگ سکھوں نے اسے نکال کر دریاے کنھار میں بہا دیا۔

بہرحال مولوی صاحب مرحوم کی کسی راے یا طریقِ عمل سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو، وہ بڑے مخلص مجاہد اور نہایت سرگرم کارکن تھے۔ زندگی کے بیشتر اور بہترین اوقات ان مشاغل میں بسر کیے، جن کے اختیار کی توفیق ملت میں سے بہت کم آدمیوں کو نصیب ہوئی اور ان بزرگوں کی عظمت کا اندازہ کون کر سکتا ہے، جو اعلیٰ دینی اور سیاسی مقاصد کے لیے جانیں ہتھیلیوں پر رکھے پھرتے رہے اور جنھوں نے راحت و آسایش کی بہاریں چھوڑ کر عمریں مصیبتوں اور پریشانیوں کے شعلہ زار میں گزار دیں، اس لیے نہیں کہ خود انھیں کوئی اونچا منصب حاصل ہو جائے، صرف اس لیے کہ اسلام کا بول بالا ہو اور اس سرزمین کے سر پر آزادی کا تاج رکھا جائے۔ وہ جہاد کو ایک اہم اسلامی فرض سمجھ کر ادا کرتے رہے اور خدا کی رضا کے سوا ان کی کوئی غرض نہ تھی۔

چودھواں باب

مولوی محمد علی قصوری

خاندان | مولوی محمد علی قصوری اس خاندان کے چشم و چراغ تھے جس کے افراد نے دین، قوم اور ملک کی خدمت میں بہت بلند درجہ حاصل کیا۔ ان کا اصل وطن ضلع سیالکوٹ کا ایک گاؤں تھا۔ چنانچہ مولوی محمد علی کے پردادا قاضی غلام حسین وہاں سے ضلع گوجرانوالہ چلے آئے۔ جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں ان کے فرزند ارجمند مولوی غلام احمد سب سے پہلے اہل حدیث ہوئے۔ ان کے تین فرزند تھے: مولانا عبدالقادر، مولوی عبدالحق اور مولوی عبداللہ۔ مولانا عبدالقادر نے تعلیم سے فراغت کے بعد وکالت کا امتحان پاس کیا اور قصور کو پریکٹس کے لیے منتخب کیا۔ وہ غیر معمولی دل و دماغ کے انسان تھے۔ بہت جلد وکالت میں اتنا اونچا مرتبہ حاصل کر لیا کہ پنجاب کے مشہور و ممتاز وکلا میں شمار ہونے لگے۔ دولت کی ریل پیل شروع ہو گئی۔ بہت بڑی جائداد پیدا کی اور قصور ہی کو مستقل وطن بنا لیا۔ اس وجہ سے وہ خود اور خاندان کے تمام افراد "قصوری" مشہور ہوئے۔ وہ ان برگزیدہ انسانوں میں تھے، جن کی دینداری دنیوی وسائل کی فراوانی سے کبھی متاثر نہیں ہوتی۔ اپنی بود و ماند، وضع قطع، لباس ہمیشہ سادہ رکھا اور مال و زر دینی اور ملکی کاموں میں بے دریغ صرف کرتے رہے۔ مزید حالات آگے چل کر بیان ہوں گے۔

مولوی عبدالحق نے وکالت کے لیے گوجرانوالہ کو پسند کیا۔ مولوی عبداللہ ابتدا میں کابل میں ملازم رہے۔ بعد ازاں اسلامیہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر بن گئے۔ پھر تبلیغ اسلام کے لیے زندگی وقف کر دی۔

مولانا عبدالقادر کے چار صاحبزادے ہوئے: بڑے مولوی محی الدین احمد، ان سے چھوٹے مولوی محمد علی جن کے حالات ہم لکھ رہے ہیں، ان سے چھوٹے مولوی احمد علی اور سب سے چھوٹے مولوی محمود علی جو ہائی کورٹ کے ممتاز بیرسٹروں میں شمار ہوتے ہیں۔

ابتدائی زندگی مولوی محمد علی اگست ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک قصور میں تعلیم پائی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے امتیازی درجے میں ڈگری حاصل کی، پھر والد ماجد نے اعلیٰ تعلیم اور بیرسٹری کے لیے ولایت بھیج دیا۔ کیمبرج سے ریاضیات کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ بیرسٹری کے لکچر بھی پورے کر لیے تھے۔ سند نہ حاصل کر سکے تھے کہ گھر آئے اور جنگ یورپ شروع ہو گئی اس لیے واپس نہ جا سکے۔

حافظہ غیر معمولی تھا اور اپنے عہد کے چند مخصوص طلبہ میں شمار ہوتے تھے۔ پہلی جنگ سے صرف ایک مہینا پیشتر ہندوستان آئے تھے اور یقیناً انھیں بہتر سے بہتر سرکاری ملازمت مل سکتی تھی، لیکن قیام انگلستان ہی کے زمانے میں اپنی زندگی دینی، اسلامی اور ملکی کاموں کے لیے وقف کر چکے تھے۔ یہاں مختلف ملکی رہنماؤں سے مشوروں کے بعد طے کیا کہ افغانستان چلے جائیں، اس لیے کہ معلوم ہو چکا تھا برطانیہ اور روس طے کر چکے ہیں کہ ایران کی طرح افغانستان کو بھی زیر اثر لانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ مولوی صاحب موصوف کا عزم یہ تھا کہ حکومت افغانستان کو اس خوفناک خطرے سے آگاہ کریں۔ اس کے سدباب کے لیے جو کچھ ممکن ہو عمل میں لائیں اور اہل افغانستان کو اسلامیت و آزادی کے مقاصد کے لیے منظم کرنے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھیں۔ چنانچہ ان کے بیان کے مطابق ایک سرسری "تحریک" کے بعد امیر حبیب اللہ خاں نے انھیں حبیبیہ کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا اور وہ مارچ ۱۹۱۵ء میں کابل چلے گئے۔[1]

یہ اس پیکر خدمت کا پہلا ایثار تھا، جس کا شرف اسے حاصل ہوا۔ اس کے ثواب میں ان کے والد ماجد اور دوسرے عزیزوں کا بھی حصہ ہے، جنھوں نے ان کی تعلیم پر ہزاروں روپے خرچ کرنے کے باوجود اس ایثار کو خوش دلی سے منظور کر لیا۔

کابل میں سرگرمیاں افغانستان کی علمی ترقیات اور قومی تنظیمات کے متعلق انھوں نے اپنے ذہن میں جو خوشگوار تصورات قائم کر رکھے تھے، وہ کابل پہنچ جانے کے بعد سراسر غلط ثابت ہوئے، لیکن اہل حق مشکلات سے گھبرایا نہیں کرتے بلکہ صبر و استقلال سے پیش نظر کاموں میں منہمک ہو جاتے

[1] "مشاہدات کابل و یاغستان" ص۱۔

ہیں۔ منزل کی سنگلاخی اور راستے کی دشواری ان کی قوت رفتار پر کبھی اثر انداز نہیں ہوتی۔ مولوی محمد علی نے جلد سے جلد ایک موزوں نصاب تیار کیا اور انتہائی موانع کے باوجود اسے منظور کرا کے تعلیمی نظام کی درستی میں مصروف ہو گئے۔ ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ ان کا منصوبہ بظاہر یہ تھا کہ مختلف اصحاب کی امداد سے یاغستانی قبائل کو امیر حبیب اللہ خاں سے وابستہ کر کے اس اجتماعی قوت سے ہندوستان پر حملہ کرائیں، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، اس وقت ہندوستان میں فوج بہت کم تھی۔ حملہ ہو جاتا تو اس وسیع ملک کو آزاد کرا لینے کے قوی امکانات موجود تھے۔ اس کام میں مولانا محمد بشیر سب سے بڑھ کر معاون ثابت ہوئے۔

پھر ترکی اور جرمن وفد افغانستان پہنچ گیا، جو امیر حبیب اللہ خاں کے لیے مزید تقویت کا باعث تھا، تاہم امیر موصوف تذبذب کی کشمکش سے نجات نہ پا سکا۔ آخر ایک پیر کے استخارے نے اس منصوبے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ یہ داستان اپنے موقعے پر تفصیل سے سنائی جا چکی ہے۔

کابل سے یاغستان پیر صاحب نے محض ہندوستان پر حملے ہی سے نہ روکا تھا، یہ بھی کہہ دیا تھا کہ محمد علی افغانستان کا دشمن ہے اور اسے فوراً نکال دینا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ انگریزوں کے ایما کا کرشمہ تھا۔ امیر کے بھائی سردار نصر اللہ خاں اور نادر شاہ مرحوم نے جو اس زمانے میں سپہ سالار تھے، مولوی محمد علی کو نکالنے کی سخت مخالفت کی، اس لیے امیر حبیب اللہ خاں اپنے ارادے کو لباس عمل نہ پہنا سکا۔

تاہم خود مولوی صاحب تعطل و بے عملی کی زندگی بسر کرنے پر تیار نہ تھے لہذا وہ افغانستان سے باہر نکل جانے کی تجویزیں سوچنے لگے۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ انگریزوں کو اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ اس اثنا میں انھیں افغانستان کا وکیل بنا کر جرمنی بھیجنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ وہ ابھی تیاری ہی میں مصروف تھے کہ امیر کے بعض حواریوں کی خفیہ سازش سے ان کے مکان پر مسلح ڈاکا ڈالا گیا۔ مدعا یہ تھا کہ مولوی صاحب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ وہ تو خوش قسمتی سے بچ گئے، البتہ ان کا سامان اور تمام کاغذات ڈاکو اٹھا کر لے گئے۔ چند روز کے بعد امیر کے فرمان کے مطابق ایک سو آدمیوں نے ان کے

مکان کا محاصرہ کر لیا۔ نادر شاہ مرحوم کی سعی سے ان کے لیے چھپ چھپا کر باہر نکلنے کا انتظام ہوا اور وہ اپنے ایک رفیق شیخ محمد ابراہیم سندھی نیز بعض مہاجر طلبہ اور مولانا بشیر کی معیت میں کنٹر پہنچ گئے، جہاں سید جمال الدین افغانی کے گھرانے کے ایک شخص سید عبد القادر نے ان کا استقبال کیا۔ کنٹر ہی میں سوٹ بوٹ اتار کر ملاؤں کا سا لباس پہنا اور دریائی پہاڑ کو عبور کر کے چمر کنڈ چلے گئے[1]۔

یاغستان میں کام کابل سے وہ جون ۱۹۱۶ء میں نکلے تھے، گویا صرف سوا سال میں انھوں نے وہ تمام کام انجام دیے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یاغستان اس غرض سے گئے تھے کہ قبائل کو منظم کر کے ہندوستان پر حملوں کے لیے تیار کر دیں، پھر امیر افغانستان کو ان کی تائید و حمایت میں اقدام کی دعوت دیں تاکہ جو منصوبہ پہلے ناکام ہو چکا تھا، اسے دوبارہ معرض نفاذ میں لائیں۔ پہلے امیر کو اٹھانے اور سرگرم عمل ہونے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اب یہ سوچا کہ قبائل کی عملی سرگرمیوں کے دلخواہ نتائج اس کے سامنے پیش کیے جائیں، شاید اس کی رگ غیرت کا منجمد خون حرکت میں آ جائے۔ چنانچہ مولوی صاحب، حاجی صاحب ترنگ زئی اور ملا صاحب بابڑہ کے مراکز میں پہنچے۔ صوات، امب، چترال اور دوسرے خوانین و رؤسا کے پاس قاصد بھیجے۔ مختلف اجتماعات میں پُرزور تقریریں کیں۔ سب کو جہاد کے لیے آمادہ ہو جانے کی دعوت دی۔ رزمک، پارا چنار، کوہاٹ درہ، تھل، پشاور وغیرہ کی سمت میں حملوں کا منصوبہ تیار کیا اور مولانا محمد بشیر کو امیر حبیب اللہ خاں کے پاس کابل بھیجا۔ خود فرماتے ہیں کہ اس اثنا میں ہم نے مشق کے طور پر ایک حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ:

> میں اور حاجی صاحب ترنگ زئی، گنداب، شب قدر اور مچنی کے محاذ پر حملہ آور ہوئے، ملا صاحب بابڑہ اپنے محاذ پر۔ ہمارے ساتھ کوئی تیس ہزار کا لشکر ہوگا۔ اسے مختلف ٹولیوں میں بانٹ کر ہم نے تمام درے پر قبضہ کر لیا اور انگریزی کی پیش قدمی کی تمام راہیں روک دیں۔ ایک اگلے مورچے پر میں خود مع ایک سو تیس مجاہدین کے تھا۔ ہم سے کوئی دو سو گز پر انگریزی گورہ فوج خندقیں کھود کر مورچوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے عقب میں شب قدر کا قلعہ تھا۔ گیارہ ہوائی جہاز ہمارے مورچوں پر پرواز کر کے لشکریوں کی نشان دہی کر رہے تھے تاکہ قلعے

[1] مشاہدات کابل و یاغستان ص ۳۹-۱۰۱۔

کی آتش بار توپیں ہمارے مورچوں پر گولہ اندازی کریں ۔ . . . قلعے سے بہتر توپیں بیک وقت صرف ہمارے مورچے پر گولے پھینکتی تھیں [۱]

یہ لڑائی تین دن اور تین رات جاری رہی ۔ اس مدت میں کھانے کو کچھ نہ ملا ، صرف پانی پی کر گزارا کیا ۔ مولوی صاحب کے مورچے میں گیارہ مجاہد شہید ہوئے ۔ آخر انگریزی فوج پسپائی پر مجبور ہوئی ۔ مجاہدین ان کی خندقوں پر پل پڑے ۔ سیکڑوں بندوقیں اور لاکھوں کارتوس ان کے ہاتھ آئے [۲]

امیر حبیب اللہ کی بے ہمتی | تمام مجاہدانہ سرگرمیوں کی مثال ایک انگریزی اسلوب بیان کے مطابق شہزادے کے بغیر ہیملٹ کے ڈرامے کی تھی ۔ اس قسم کے متفرق چھاپے یقیناً بہ کثرت مارے جا سکتے تھے ، لیکن محض چھاپوں سے ہندوستان میں مستحکم انگریزی سلطنت کی بنیاد پر خراش بھی نہ لگ سکتی تھی ۔ تزلزل کا تو ذکر ہی نہ کرنا چاہیے ۔ منظم جنگ آزمائی امیر صاحب کی سرگرم اعانت پر موقوف تھی ۔ افسوس کہ مولانا محمد بشیر کابل سے بالکل بے نیلِ مرام واپس آئے ۔ انھوں نے بتایا کہ امیر حبیب اللہ علانیہ ملاقات پر بھی راضی نہ ہوا ۔ رات کے بارہ بجے خواب گاہ میں بلایا اور سرسری بات چیت کے بعد واپس کر دیا ۔ سردار نصر اللہ خاں نے مختلف طریقوں پر معذرت کی کوشش کی اور بارہ یا پندرہ ہزار روپے نیز اسلحہ دے کر رخصت کر دیا [۳]

مولانا عبید اللہ مرحوم کا خیال ہے کہ امیر حبیب اللہ خاں جو روپیہ قبائل پر خرچ کر رہے تھے ، وہ بھی انگریزوں کا دیا ہوا تھا ۔ جب انگریزوں نے دیکھا کہ یاغستانی قبائل کو چھاپوں کے لیے منظم کیا جا رہا ہے تو ان میں بہ زور یہ پروپیگنڈا کرایا گیا کہ امیر کے بغیر جہاد نہیں ہو سکتا اور قبائل کی امارت کا حق امیرِ افغانستان کو پہنچتا ہے ۔ جب تک وہ اعلانِ جہاد نہ کرے قبائل کے لیے لڑنا از روے شریعت درست نہیں ۔ اس طرح امیر صاحب اور قبائل کو ایک رشتے میں مرتبط کر کے دونوں کو وابستہ تعطل کر دیا گیا [۴]

---

[۱] مشاہدات کابل و یاغستان ص ۶۴ ۔ [۲] ایضاً ص ۶۵ ۔ [۳] ایضاً ص ۶۷ ۔ [۴] مولانا عبید اللہ سندھی کی ذاتی ڈائری ص ۱۲۵ ۔

آخری دَور | مولوی محمد علی چمرکنڈ سے نکلے تو صوات ہوتے ہوئے سمست پہنچ گئے۔ وہاں بھی انھوں نے خاصی مدت گزاری۔ چونکہ امرائے جماعت کے حالات ان کے نزدیک اطمینان بخش نہ تھے، اس لیے باقاعدہ جماعت سے وابستگی اختیار نہ کی یعنی امیر کی بیعت کا حلقہ اپنی گردن میں نہ ڈالا۔ جب روس میں بالشویکوں نے زار کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا تو امید بندھی کہ روس جنگ سے کنارہ کش ہو جائے گا اور جرمن فوج فرانس میں اتحادی عساکر کا کچومر نکال کر رکھ دے گی۔ مولوی صاحب نے روس کے راستے جرمنی پہنچنے کی سکیم تیار کر لی۔ انتظامات مکمل ہونے کے انتظار میں سندھ گڑھی کے علاقے کا دورہ کیا۔ اس اثنا میں جنگ کا پانسا پلٹنے لگا۔ جرمنی کی جنگی قوت میں اضمحلال کے آثار نمودار ہوئے۔ قبائل کے سرداروں نے سرحد کے چیف کمشنر سر جارج روس کیپل کے پاس جا کر مصالحت کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کر دی۔ مولوی صاحب نے یاغستان میں "سلیمان" نام اختیار کر لیا تھا اور وہ اسی نام سے مشہور تھے۔ روس کیپل نے خوانین و قبائل کے سامنے ایک تجویز یہ پیش کی کہ مولوی "سلیمان" آکر بالمشافہ بات چیت کر لیں۔ خوانین کے کہنے کے مطابق صاحبزادہ سر عبدالقیوم کی طرف سے باقاعدہ دعوت نامہ بھی بھیج دیا گیا۔ چنانچہ مولوی محمد علی صاحب پشاور پہنچے۔ طویل گفتگو ہوئی۔ روس کیپل نے کہا کہ آپ واپس آجائیں اور اطمینان سے اپنے گھر رہیں۔ چاہیں تو نہایت اعلیٰ ملازمت کا بندوبست ہو سکتا ہے، بلکہ فوری طور پر اسلامیہ کالج پشاور میں پرنسپل کا عہدہ پیش کر دیا تھا نیز کہا کہ اگر جماعتِ مجاہدین اور یاغستانی مہموں کے پورے حالات لکھ دیں تو میں خود یہ کتاب ایڈٹ کروں گا۔ حکومت کے خرچ سے اسے چھپواؤں گا اور آپ کو ایک لاکھ روپیہ رائلٹی کا ملے گا۔ مولوی صاحب نے اپنے اقربا اور مجاہدین کے مشورے سے واپسی منظور کر لی۔ باقی دونوں پیشکشیں مسترد کر دیں[1]۔ واپسی کے وقت روس کیپل نے

---

[1] مولانا عبید اللہ مرحوم نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب صاحبزادہ عبدالقیوم کی معرفت کسی طرح معافی لے کر ہندوستان چلے گئے۔ (کابل میں سات سال ص ۴۷)۔ یہ صحیح نہیں۔ حقیقت وہی ہے جو متن میں عرض کی گئی اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مولوی محمد علی کی مجاہدانہ سرگرمیاں برابر جاری رہیں۔

انھیں دو سو پونڈ کی تھیلی دی۔ انھوں نے یہ رقم ڈپٹی برکت علی کے حوالے کر دی جو ایک مقدمے میں ماخوذ ہونے کے باعث سزا سے بچنے کے لیے یاغستان چلے گئے تھے۔ مولوی محمد علی نے ان کے لیے واپسی کا انتظام کر دیا تھا، مگر یہ طے ہوا تھا کہ وہ دو سال مانسہرہ میں رہیں اور اس اثنا میں ان کے فرزند ارجمند کو سب پوسٹ ماسٹر بنا کر مانسہرہ میں تعینات کر دیا گیا تھا۔

بقیہ زندگی مولوی محمد علی نے مراجعت کے بعد بھی اپنے تمام سابقہ روابط بدستور قائم رکھے۔ ایک مرتبہ مولانا محمد بشیر اور ان کے بعض رفقا نے طے کیا تھا کہ ہندوستان سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو یاغستان بلایا جائے۔ مولوی محمد علی اس تحریک کو فروغ دینے کا بھی ایک بہت بڑا مرکز تھے۔ وہ بڑی سے بڑی ملازمت لے سکتے تھے، لیکن غور و مشورہ کے بعد انھوں نے تجارت کا شغل اختیار کیا۔ بمبئی اور مدراس میں کئی سال گزارے۔ یہ داستان بجائے خود بڑی اہم ہے لیکن ہم یہاں اسے تفصیلاً پیش نہیں کر سکتے۔ اپنے بڑے بھائی مولوی محی الدین احمد اور خسر محترم مولانا عبداللہ کو جمعیت دعوت و تبلیغ کے کارفرما بنایا۔ ان کے اور جمعیت کے پورے مصارف اپنے ذمے لے لیے۔ چنانچہ یہ اصحاب سالہا سال ملیبار، پونا اور دوسرے حصوں میں کام کرتے رہے۔ مولوی محمد علی کی طرف سے انھیں اور جمعیت کو دو ہزار ساٹھ روپے ماہانہ ملتے تھے۔ پندرہ سو روپے ایک اور صاحب دیتے تھے۔ تقسیم کے بعد مولوی صاحب نے نمک کی تجارت شروع کر دی تھی۔ آخری دَور میں وہ ایک کارخانے سے وابستہ ہو گئے تھے۔ متعدد کتابیں چھاپیں۔ قیام لاہور کے زمانے میں قرآن مجید کا درس دیتے تھے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ان کے درس کو خاص درجہ قبول حاصل تھا۔ تمام قومی اور مذہبی تحریکات میں پیش پیش رہے، خود کبھی کسی جماعت یا فرد کی طرف سے ایک حبّے کے بھی ممنون نہ ہوئے۔

۱۲۔ جنوری ۱۹۵۶ء (مطابق ۲۷۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ) بروز پنجشنبہ صبح ساڑھے آٹھ بجے یکایک حرکتِ قلب بند ہونے سے وفات پائی۔

شخصیّت مولوی صاحب کا قد ان کے والد ماجد کی طرح متوسط تھا۔ رنگ اتنا گورا کہ انگریزی لباس پہن لیتے تو دیسی کے بجائے ولایتی معلوم ہوتے تھے۔ ڈاڑھی مونچھوں کے بال بہت کم تھے، بایں ہمہ ڈاڑھی

ہمیشہ رکھی۔ اسلامی اخلاق و عادات کا ایک عجیب پیکر تھے۔ انگریزی، اردو، عربی اور فارسی کے یکساں ادیب مانے جاتے تھے۔ چاروں زبانوں میں بے تکلف لکھتے اور بولتے۔ مطالعے کا ہمیشہ شوق رہا اور جو کچھ پڑھا حافظے میں پیوست ہو گیا، کسی مجلس میں بیٹھے بیٹھے دو چار منٹ کے لیے بھی اٹھنا پڑتا تو جب واپس آتے "سلام علیکم" کہ کر بیٹھتے۔ دینی علوم سے خاص دلچسپی تھی۔ حدیث و تفسیر کی تقریباً تمام کتابیں دیکھ چکے تھے۔ حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیمؒ کی تصانیف سے بہت شغف تھا۔

روپے پیسے سے کبھی محبت نہ ہوئی۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ہے کہ کابل میں ایک مرتبہ ڈاکٹر خوشی محمد کو، جن کا اختیاری نام میرزا محمد علی تھا، روس بھیجنے کی ضرورت پڑی، روپیہ پاس نہ تھا۔ مولوی محمد علی سے اگرچہ سرسری تعارف تھا، لیکن جب اپنی تکلیف کا ذکر ملکے الفاظ میں ان سے کیا تو بہت متاثر ہوئے اور دو ماہ کی تنخواہ پیشگی لے کر ہماری ضرورت پوری کر دی۔ روسی کیمپ نے انھیں دو سو پونڈ دیے تھے[1] یہ رقم انھوں نے بے توقف ڈپٹی برکت علی کی نذر کر دی۔ کابل سے روانگی کے وقت جو کچھ پاس تھا اس میں سے[2] نصف انقلابی کام کے لیے دے دیا اور خود صرف تین پونڈ لے کر روانہ ہو گئے۔ یہ ہم بتا ہی چکے ہیں کہ لمبی مدت تک دو ہزار روپے ماہوار تبلیغ کے لیے دیتے رہے۔ ہزاروں روپے دوسرے ملّی کاموں کی نذر کیے۔

---

[1] کابل میں سات سال صـ۶۵۔

[2] مشاہدات کابل و یاغستان صـ۳۶۔

پندرھواں باب

ایک گمنام مجاہد

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

محمد حسین آپ نے اب تک ان اصحاب کے حالات ملاحظہ فرمائے، جن کے ناموں سے دنیا ناآشنا نہ تھی، اگرچہ ان کے پورے حالات یا مجاہدانہ کارناموں سے آگاہ نہ ہو، لیکن اب ایک ایسے مجاہد کے حالات پیش کیے جاتے ہیں، جس کا نام بھی کبھی منظرِ عام پر نہ آیا، حالانکہ وہ خلوص، سرگرمیِ عمل، استقامت اور پیشِ نظر مقصد کے لیے جانفشانی میں مشہور مجاہدین کرام سے قطعاً فروتر نہ تھا۔ یہ محمد حسین تھا، جس نے جماعت مجاہدین میں پہنچ کر محمد عمر نام اختیار کر لیا تھا +

محمد حسین کا وطن کوٹ بھوانی داس (ضلع گوجرانوالہ) تھا۔ اس کا والد پیر محمد قوم ارائیں، تھوڑی سی زمین کا مالک اور گاؤں کا نمبردار تھا اور اس نے مولانا غلام رسول سکنہ قلعہ میہاں سنگھ سے فیض حاصل کیا تھا۔ کتاب و سنّت کا پابند، زاہد اور عزلت پسند تھا۔ ۱۸۹۵ء میں ترکِ وطن کا خیال اس درجہ غالب ہوا کہ سب کچھ چھوڑ کر چلا گیا، پھر واپس نہ آیا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ باقی زندگی نام بدل کر جماعت مجاہدین میں گزاری یا کسی دوسری جگہ وفات پائی۔ قاضی کوٹ کے مقدمے میں چمرکنڈ کے ایک مجاہد عبدالصمد عرف پیر محمد کا ذکر آیا ہے۔ ممکن ہے یہ وہی پیر محمد ہو جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں +

محمد حسین کی پیدائش ۱۸۹۲ء-۹۳ء میں ہوئی، گویا والد کی ہجرت کے وقت اس کی عمر صرف دو تین برس کی ہوگی۔ اس سے بڑے دو بھائی تھے اور ایک بہن۔ ایک بہن اس سے چھوٹی تھی، جو والد کی ہجرت کے وقت شیر خوار بچی ہوگی +

فیصلۂ ہجرت ۲-۱۹۰۱ء میں ضلع گوجرانوالہ اور آس پاس کے دیہاتی علاقے میں مولانا ولی محمد ساکن فتوحی والا، ضلع فیروز پور اور سید اکبر شاہ ساکن سکھانہ، ضلع سیالکوٹ کے دورے شروع ہوئے۔ یہ دونوں بزرگ نہایت متقی اور پرہیز گار تھے اور جماعتِ مجاہدین کے سرگرم مبلّغ۔ بہت سادہ انداز میں وعظ فرماتے، تاہم وعظ ایسے پُر تاثیر ہوتے کہ جو سُنتا اس کے قلب میں اسلامیت کی روح بیدار ہو جاتی۔ سیکڑوں اصحاب راہِ حق میں جانبازی کے لیے تیار ہو گئے۔ محمد حسین کی عمر اس وقت آٹھ نو سال کی ہوگی، لیکن کلمۂ حق کی پذیرائی، دل کی صفائی، جذبات کی پاکیزگی، اخلاق کی طہارت اور ذہن کی تنویر پر موقوف ہے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ انسان شہور وسنین کی خاصی منزلیں طے کرلے اور علوم کے دفاتر چاٹ لے۔ محمد حسین اوائل طفلی ہی سے متاثر ہوتا رہا۔ ۱۲-۱۹۱۱ء میں جب اس کی عمر اٹھارہ انیس سال کی تھی، وطن سے ہجرت کر کے جماعت مجاہدین میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ افراد خاندان میں سے چھوٹی ہمشیر کے سوا کوئی اس کا رازدار نہ تھا۔ اٹھارہ انیس سال کا سادہ دیہاتی نوجوان اتنا بڑا فیصلہ کرتا ہے اور سولہ سترہ سال کی ہمشیر اس کی مویّد و حامی ہے۔ اسی ہمشیر نے اپنا زیور زادِ راہ کے لیے نذر کیا۔ گویا وہ بھی اپنی زندگی بھائی کی طرح خدمتِ حق کے لیے وقف کرچکی تھی، البتہ عورت ذات ہونے کے باعث باہر نہ جا سکتی تھی۔

جماعت کا کام جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اسمست پہنچنے کے بعد محمد حسین کا نام "محمد عمر" رکھا گیا اور اس کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ ڈاک لائے، لے جائے نیز ہندوستان سے روپے اور آدمی مرکز میں پہنچاتا رہے۔ اس خدمت میں بعض دوسرے اصحاب بھی اس کے ساتھ شامل تھے۔ مثلاً خان محمد اور عبید اللہ جو ۱۹۲۱ء میں قاضی کوٹ کے مقدمہ بم کے ملزم تھے۔

یوں تو دار الجہاد میں جماعت کا کوئی کام بھی سہل نہ ہو سکتا تھا، اس لیے کہ ہر کام میں جان ہتھیلی پر رکھنی پڑتی تھی، لیکن قاصد کی خدمات انجام دینے کا مطلب یہ تھا کہ زندگی ہر لمحہ پریشانی اور سراسیمگی میں گزرے۔ ہر لحظہ راز افشا ہو جانے کا اضطراب، ہر وقت گرفتاری کا خطرہ۔ گرفتاری اور اسیری نظر بہ ظاہر جان دے دینے سے بڑی قربانی نہ تھی، تاہم جن خوش نصیبوں کے دل عشقِ مقاصد سے

لبریز تھے، انھیں گرفتاری موت سے بڑھ کر تکلیف دہ نظر آتی تھی، اول اس لیے کہ جماعت کے کام کو نقصان پہنچے گا۔ دوم اس لیے کہ ممکن ہے برطانوی خفیہ پولیس کے جلادوں کی بازپرس اور خوفناک اذیت رسانی میں کوئی ایسی بات زبان سے نکل جائے، جو عہدِ اخفا کے نقض کے باعث بن جائے یا ممکن ہے اچانک جماعت کی کوئی تحریر دشمن کے قبضے میں چلی جائے اور اس سے اصل کام میں خلل پیدا ہو یا بعض اہم راز بے نقاب ہو جائیں۔ سوم اس لیے کہ زندگی کے جن اوقات کو ایک بلند نصب العین کے لیے وقف کیا تھا۔ اس سے طویل بے تعلقی پیدا ہو جائے گی اور خدا جانے کتنی مدت قید و بند کی بے چارگی میں گزارنی پڑے۔ یہ سب کچھ درست تھا، مگر کسی نہ کسی کو تو یہ کام انجام دینا ہی تھا اور جب محمد حسین کو اس فرض کے لیے منتخب کر لیا گیا تو اس کے لیے بساط کے مطابق بجا آوری کے سوا چارہ نہ تھا۔

شانِ عزیمت محمد حسین کی شانِ عزیمت ملاحظہ ہو کہ رخصت ہوتے وقت چھوٹی ہمشیر کے سوا کسی کو خبر نہ کی، پھر چار سال تک ہمشیر کے سوا کسی سے ملاقات پر راضی نہ ہوا۔ اسے یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں والدہ اور بھائی اسے ترکِ ہجرت پر مجبور نہ کر دیں۔ اتنے قریبی عزیزوں سے اس قسم کا انقطاع گوارا کر لینا کھیل نہیں۔ خدا جانے محمد حسین کے محبّت پرور دل نے یہ منزل طے کرنے میں کتنی زحمت اٹھائی ہوگی لیکن عزیزوں کے حلقہ خاص میں پہنچ کر ان کے پیہم اصرار و الحاح کا مقابلہ بہت مشکل تھا۔ اس اثنا میں اس نے اپنی ہمشیر سے خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہمشیر نے آہستہ آہستہ والدہ اور بھائیوں کو راضی کر لیا کہ محمد حسین کو ترکِ ہجرت پر مجبور نہ کیا جائے۔ انھوں نے بھی یہ سمجھ کر اس واقعے کو بصبر و شکر گوارا کر لیا کہ ان کا عزیز ایک شرعی فریضے کی بجا آوری میں مشغول ہے، اگر خود اس میں سرگرم شرکت و تعاون کا مقامِ عزیمت حاصل نہیں کر سکتے تو کم از کم اسے روکنے کا گناہِ عظیم تو اپنے سر لیں۔

اس کے بعد محمد حسین والدہ سے ملاقات پر راضی ہو گیا چنانچہ ایک سفر میں رات کے وقت ملاقات کی جگہ اور ساعت مقرر ہو گئی۔ خدا جانے کس ذریعے سے خفیہ پولیس کو بھی اس کی اطلاع مل گئی اور اس نے محمد حسین کی گرفتاری کے انتظامات مکمل کر لیے۔ دوسری طرف محمد حسین نے پولیس کی تگ و دو دیکھی

تو اندازہ کر لیا کہ معاملہ خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے چنانچہ اپنے خاص ذرائع سے اس نے والدہ اور ہمشیر کو بھی اطلاع دے دی، پھر رات کا بڑا حصّہ مقامات اور اوقات ملاقات کے تغیر و تبدل ہی میں گزر گیا۔ انجام کار ایک غیر معروف راستے میں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات کے بعد وہ پولیس کے چنگل سے بچتا ہوا، بہ خیریت نکل گیا۔ دیکھا آپ نے؟ یہ ایک نوجوان دیہاتی تھا جس کی تعلیم بھی زیادہ نہ تھی، لیکن اس کے دل و دماغ کی بلندی، اس کی ہمت، عزیمت، دور اندیشی اور اندازہ شناسی ملاحظہ ہو کہ پولیس کی کوئی دام گستری اس کی سرگرمیوں پر اثر انداز نہ ہو سکی۔

قاضی کوٹ کے مقدمے کی روداد سے واضح ہوتا ہے کہ محمد حسین برابر یہاں آتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ مولوی فضل الٰہی کے ہاں آیا اور کہا کہ جو بم آپ کو پہنچائے گئے تھے، انھیں استعمال کیوں نہیں کیا؟ اگر آپ کو استعمال میں تامل ہے تو مجھے دے دیجیے تاکہ میں استعمال کروں۔ مولوی فضل الٰہی نے جواب دیا کہ تمھاری معرفت میں یہ کام نہ کروں گا۔ کیونکہ اگر جماعت کا کوئی آدمی ایسا کام کرتا ہوا پکڑا جائے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہو گی۔

گرفتاری اور اسیری

وہ آٹھ سال تک جماعت کی خدمات انجام دیتا رہا۔ اسمست کے بجائے وہ چمرکنڈ کے مرکز سے متعلق ہو گیا تھا۔ پشاور سے ضروری سامان کی خرید کا سارا کاروبار اسی کے حوالے کر دیا گیا تھا، اس لیے کہ وہ تمام خفیہ راستوں سے واقف تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ خطرے کے وقت بچاؤ کے لیے کیا کیا تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں۔ یاد ہو گا کہ ۱۸۶۳ء میں روپے اور آدمیوں کی بہم رسانی کا سراغ لگانے کے لیے مردان کے ایک پٹھان نے اپنے بیٹے کو ملکا بھیج دیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں بھی حکومت نے اپنے ایک کارندے کو مجاہد کے بھیس میں چمرکنڈ روانہ کر دیا، جہاں وہ جماعت میں گھل مل گیا اور بھید معلوم کرتا رہا۔ ایک مرتبہ محمد حسین اسباب خریدنے کے لیے پشاور آیا تو یہ انگریزی جاسوس بھی رکنِ جماعت کی حیثیت میں ساتھ آیا۔ اسباب خریدا جا چکا اور مراجعت کا وقت آیا تو بدبخت جاسوس نے محمد حسین سے کہا کہ ذرا ٹھہرو میں ایک آدمی سے مل آؤں۔ محمد حسین بہ اطمینان سامان کے پاس بیٹھا رہا۔ جاسوس نے پولیس کو خبر پہنچا دی، یوں اچانک گھیرا ڈال کر محمد حسین کو بے خبری میں گرفتار کر لیا گیا۔

انھیں دنوں جا بجا بم گرے تھے، مثلاً ڈین ہوٹل پشاور میں، رسال پور چھاؤنی میں، ایک بم راولپنڈی میں پولیس کے ایک بڑے افسر کی کوٹھی پر گرا تھا۔ ان واقعات کو مجاہدین سے منسوب کر کے محمد حسین کو سات سال قید بامشقت کی سزا سنادی گئی ٭

مصیبت بالائے مصیبت چونکہ محمد حسین کے پاس کوئی رقم نہ تھی اور نہ کوئی شخص اس کا شناسا تھا کہ دفاع کا خرچ برداشت کرنے کے لیے تیار ہوتا۔ غالباً مجاہدین کے سوا کسی کو اس واقعے کا علم بھی نہ تھا اور مجاہدین اپنے خاص حالات کی بنا پر کچھ کر نہ سکتے تھے۔ اس لیے عام قاعدے کے مطابق خیراتی فنڈ سے اپیل کی تجویز ہوئی۔ اس سلسلے میں ضروری تھا کہ محمد حسین کے متعلق نیک چلنی کی تصدیق گوجرانوالہ کی پولیس سے حاصل کی جاتی۔ چنانچہ کاغذات گوجرانوالہ بھیج دیے گئے۔ یہاں اس زمانے میں قاضی کوٹ کے بم کا مقدمہ چل رہا تھا اور پولیس کو محمد حسین عرف محمد عمر کی تلاش تھی۔ پہلی سزا کے خلاف اپیل کا معاملہ تو وہیں رک گیا اور محمد حسین کو گوجرانوالہ لاکر قاضی کوٹ کے مقدمے میں چودہ سال قید بامشقت اور پانسو روپے جرمانے کی مزید سزا دے دی گئی۔ اس لیے کہ استغاثے اور سلطانی گواہ کے بیان کے مطابق جو تین آدمی بم، کارتوس وغیرہ چمرکنڈ سے لائے تھے، ان میں ایک محمد حسین عرف محمد عمر بھی تھا ٭

ہمّت و استقامت اب محمد حسین کی پوری سزائے قید اکیس سال کی ہوگئی تھی اور پانسو روپے جرمانہ۔ اس وقت وہ زندگی کے اٹھائیسویں، انتیسویں مرحلے میں تھا اور مسلسل دس سال جماعت کی خدمت انجام دینے میں بسر کر چکا تھا، جن میں سے ہر خدمت عرفی کے اس مشہور شعر کی تصویر تھی:

غافل مرو کہ تا در بیت الحرام عشق
صد منزل است و منزل اوّل قیامت است

اس کے دل میں بھی راحت و آسایش اور فارغ البالی و کامجوئی کی وہ تمام آرزوئیں موجزن ہوں گی جو سلیم القویٰ جوانوں کے دلوں میں موجزن ہوتی ہیں۔ وہ امیر نہ سہی لیکن اتنا غریب بھی نہ تھا کہ اطمینان کی زندگی بسر نہ کر سکتا۔ پھر والدہ کے علاوہ چار ماں جائی ہستیوں کی آنکھیں اس کی راہِ محبّت میں بچھنے کے لیے تیار تھیں، لیکن اس نے یہ چیزیں ایک بلند مقصد کے لیے قربان کر دیں،

جو اس کے نزدیک شرعی فریضے کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہر لحظہ خطرے، تگ و دو، جانبازی یا اسیری و دلگیری کی زندگی پسند کر لی اور پوری مدتِ قید صبر و استقامت سے گزار دی۔

شیخ وین محمد صاحب نے جو مختلف عہدوں پر مامور رہنے کے بعد آج کل وزیر امور کشمیر ہیں، محمد حسین کے حالات سے متاثر ہو کر بلا معاوضہ اپیل دائر کی اور انتہائی دل سوزی سے کام کیا، تاہم نتیجہ صرف یہ نکلا کہ ہائی کورٹ نے دونوں سزائیں بہ یک وقت شروع کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ گویا مجموعی سزا بہ اعتبار حبس چودہ سال رہ گئی اور جرمانہ معاف ہو گیا۔

آخری دَور ۱۹۲۳ء میں آخری فیصلہ ہوا تو اسے دور دراز کے جیل خانوں میں بھیج دیا گیا، یہاں تک کہ متعلقین کے لیے ملاقات کی بھی کوئی صورت نہ رہی۔ اس کا زیادہ تر وقت جبل پور (وسط ہند) کے جیل میں گزرا۔ چار پانچ سال کے بعد ایک کارڈ آیا کہ جبل پور میں ہوں اور بہ خیریت ہوں۔ دس سال میں ایسے کل تین چار خط آئے۔

۳۱-۱۹۳۰ء میں اس کی بائیں ران میں درد شروع ہوا اور ہڈی کا ناسور ہو گیا۔ ڈاکٹر کے علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ دس سال میں قواعدِ جیل کے مطابق دو سال کی رعایت مل چکی تھی۔ یوں چودہ سال میں سے صرف دو سال کی قید باقی تھی کہ مئی ۱۹۳۳ء میں حکومت نے پولیس کے زیرِ نگرانی اسے گوجرانوالہ بھیج دیا۔ وہاں سے اسے حسب ہدایت کوٹ بھوانی داس پہنچا دیا گیا۔ گویا حکومت کو یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ تندرست نہ ہو گا اور ناسور اس کی جان لے کر رہے گا۔ بے دردی ملاحظہ ہو کہ اس حالت میں بھی ایک پابندی یہ لگائی گئی کہ [illegible]ٹنٹ پولیس سے تحریری اجازت لیے بغیر گاؤں سے باہر نہ جائے، دوسری یہ کہ ہر ہفتے قلعہ دیدار سنگھ [illegible] حاضری کی رپورٹ دیا کرے۔

اگرچہ اس غریب کے لیے چلنا پھرنا سخت دوبھر تھا تاہم وہ صابرانہ ان احکام کی تعمیل کرتا رہا۔ کچھ مدت بعد ناسور پھٹ گیا اور نقل و حرکت بالکل ممکن نہ رہی، اس وقت حکم ہوا کہ چوکیدار اور نمبردار گاؤں میں محمد حسین کی موجودگی کی رپورٹ باقاعدہ دیتے رہیں۔ اواخر ستمبر ۱۹۳۳ء میں یعنی رہائی سے صرف چار ماہ بعد اس کی بوڑھی والدہ نے وفات پائی، صرف دو روز بعد مجاہد محمد حسین بھی

راہگرائے عالمِ بقا ہوا۔ پولیس کو اطلاع دی گئی، سب انسپکٹر پولیس نے موقع پر آکر محمد حسین کی موت کی تصدیق کی۔ اس کے بعد اس مرحوم و مغفور کی نعش کو آغوشِ قبر میں سلایا گیا۔

جیل خانے کے زمانے کی بابت تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن زندگی کے جو آخری چار مہینے اس نے اقربا میں گزارے، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ بیماری کے باوجود اس کا دل ایک لمحے کے لیے بھی چمرکنڈ اور اسمست کے خیال سے غافل نہ ہوا۔ گویا انتہائی آرزو یہ تھی کہ جس طور بھی ممکن ہو وہاں پہنچ جائے کہ شاید اس حالت میں بھی کوئی خدمت انجام دے سکے[1]۔

شہیدوں کی یاد کیا کہا جا سکتا ہے کہ ایسے کتنے بہادر و جانباز جوان تھے، جنھوں نے اپنی بیش قیمت زندگیاں اسلامیت و آزادی کے لیے اس جہاد آرائی کی نذر کیں، جس کی علم داری کا شرف ایک صدی تک جماعت مجاہدین کو حاصل رہا۔ آج جو لوگ حصول آزادی پر فخر و مسرت کے نعروں سے فضا کو ہنگامہ زار بنا دینے کے آرزومند ہیں، کیا انھیں کبھی خیال آیا ہے کہ ان جوانمردوں کی یاد بھی تازہ کریں؟ ایک ایرانی شاعر نے اپنے وطن کے شہیدانِ حریت کی یاد تازہ رکھنے کے لیے جن روح افروز جذبات کو نظم کا لباس پہنایا تھا، وہ ہر ملک کے کامگارانِ آزادی کے لیے ایک زندہ و پایندہ درسِ عبرت و تنبیہ ہیں:

اے مرغِ سحر چو ایں شبِ تار ۔۔۔ بگزاشت ز سر سیاہ کاری
وز نغمۂ روح بخشِ اسحار ۔۔۔ رفت از سرِ خفتگاں خماری
بکشود گرہ ز زلفِ زر تار ۔۔۔ محبوبۂ نیلگوں عماری
یزداں بہ کمال شد نمودار ۔۔۔ و اہرمنِ زشت خو حصاری

یاد آر ز شمع مُردہ یاد آر

---

[1] یہ تمام حالات قاضی عبدالرحیم صاحب ساکن قاضی کوٹ نے لکھ کر بھیجے، جن کے لیے میں ان کا اور مولانا محمد اسمٰعیل ناظم اعلیٰ جماعت اہل حدیث کا ممنون ہوں۔

یعنی جب غلامی اور محکومی کی شبِ تاریک ختم ہو جائے، صبح کے روح افروز نغمے سونے والوں کی آنکھوں سے نیند کا خمار زائل کر دیں، آزادی کا سورج اپنی سنہری زلفوں کی گرہیں کھول دے، خدا کی رحمت ہر طرف اوجِ کمال پر نمودار ہو جائے اور شیطان کو اس کے تمام شر انگیز ہتھکنڈوں کے ساتھ قید و بند میں ڈال دیا جائے، تو ان شمعوں کی یاد فراموش نہ ہونی چاہیے جو جل جل کر رات کی تاریکی میں روشنی کا سامان بہم پہنچاتی رہیں اور اسی جانفشانی میں بجھ کر رہ گئیں ۔

ساتواں حصّہ

اندرونِ ملک

(آخری دَور)

پہلا باب

جماعت کی اعانت اور طریقِ کار

اسلامی حمیت کا بے پناہ سمندر ہم بتا چکے ہیں کہ ابتدا ہی سے ملک کے اندر دعوت و تبلیغ، نیز جمع مال و فراہمی مجاہدین کا ایک نہایت وسیع اور مستحکم نظام قائم ہو گیا تھا، جس میں سرگرمی سے کام ہوتا تھا۔ یہاں سے مجاہدین کی بڑی جماعت سرحد پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو لیکن روپیہ خاصی مقدار میں پہنچ جاتا تھا۔ ہر صوبے میں سیکڑوں افراد چپ چاپ اس کام میں مصروف تھے اور ان سب کے متعلق خاص ذمہ دار اصحاب کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ جنگ امبیلہ کے بعد حکومت نے اس نظام کو درہم برہم کر ڈالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ پے درپے مختلف کارکنوں اور کارفرماؤں پر مقدمے چلائے گئے اور عموماً ملزمین کو ضبطی جایداد نیز حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزائیں دی گئیں۔ مقصود یہ تھا کہ ان سزاؤں سے تمام لوگوں کے دلوں میں دہشت بیٹھ جائے اور آیندہ کوئی بھی بہ آسانی کاروبارِ اعانت میں حصہ لینے کے لیے تیار نہ ہو سکے۔ کم و بیش آٹھ دس سال کی سختیوں اور تشدد آرائیوں کے بعد حکومت کو یقین ہو گیا تھا کہ اب ملک کی داخلی تحریک اعانت میں کوئی روح باقی نہیں رہی، لہٰذا اس کی روش بھی بدل گئی اور مزید آٹھ دس سال گزر جانے کے بعد انڈیمان کے وہ قیدی بھی رہا کر دیے گئے، جن کے سفینہ ہائے حیات امواج تشدد کے تھپیڑے کھانے کے باوجود سلامت رہے تھے۔ تاہم اصل نظام بہ دستور قائم رہا اور اعانتی کاروبار میں کوئی خلل پیدا نہ ہوا۔ بانیانِ تحریک کے خلوص و حسن نیت کے اس اعجاز سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جب حکومت بہ زعم خود تمام ممتاز کارفرماؤں اور کارکنوں کو دار و گیر کی زنجیروں میں جکڑ چکی تھی تو خود بخود نئے افراد بروئے کار آتے رہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سید احمد شہید نے اسلامیت اور آزادی کی جو حرارت و حمیت قلوب و ارواح میں پیدا کر دی

تھی، وہ کتنی استوار و پایدار تھی اور اس کا دائرہ کس درجہ وسیع و ہمہ گیر تھا۔

کارکنوں کے لشکر میں نے ہر چند کوشش کی کہ اس نظام کے تمام کارکنوں کی سرگزشت ہائے حیات معلوم ہو سکیں یا نہ ہو سکیں، لیکن ممتاز افراد کے پورے کام کی کیفیت تو سامنے آجانی چاہیے لیکن دس بیس اصحاب کے سوا کسی کے بارے میں کچھ پتا نہ چل سکا اور ان کے متعلق بھی زیادہ سے زیادہ یہ بتایا گیا کہ وہ اس نظام سے وابستہ تھے۔ مثلاً بہار میں مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا عبداللہ غازی پوری، پنجاب میں مولانا عبدالقادر قصوری، مولوی ولی محمد فتوحی والا، مولوی فضل الٰہی وزیرآبادی، حافظ محمد صدیق، رتلام اور بمبئی میں حافظ عبدالغفور، مدراس میں کاکا عمر صاحب، دہلی میں پنجابی اہلِ حدیث، کلکتہ میں کپڑے اور لوہے کے اہلِ حدیث تاجر۔[1] گویا آخری دَور میں اعانت مجاہدین کا اکثر و بیشتر کام زیادہ تر اہلِ حدیث حضرات ہی نے انجام دیا۔ اس جماعت کے افراد کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ یہ ملازمتیں پسند نہ کرتے تھے اور اکثر تجارتی مشاغل میں مصروف رہتے تھے یا کوئی صنعتی کارخانہ قائم کر لیتے تھے۔ زکوٰۃ پابندی سے نکالتے اور یہ روپیہ عموماً مجاہدین کی نذر کر دیتے۔ اس کے علاوہ صدقات کی رقمیں بھی اسی مد میں دے دیتے۔ موقع پاتے تو کاروبار میں نفع کا اندازہ کرتے ہوئے عطیات میں بھی کوتاہی نہ کرتے، مجاہدین کی اعانت کے علاوہ ان کا روپیہ اصلاح عقائد کی مفید کتابیں شایع کرنے میں صرف ہوتا، مثلاً "تقویۃ الایمان" یا بعض دوسرے رسائل و کتب۔

بعض ایسی ہستیاں بھی اس کام میں سرگرمی سے شریک رہیں، جن کے متعلق کسی کو خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ انھیں ایسے مشاغل سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے، مثلاً مولوی عبدالحق مرحوم مالک رفاہ عام پریس، جنھوں نے غالباً ۱۹۲۴ء میں "مسلم آوٹ لک" نکالا تھا۔ وہ لاہور میں جماعت مجاہدین کے اعانتی کام کا ایک ممتاز مرکز تھے، جس حد تک مجھے علم ہے، وہ زندگی کی آخری ساعت تک یہ کام انجام دیتے رہے

---

[1] مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۱۹، ۱۲۰۔

اگرچہ اس میں ان کے لیے بڑے خطرے تھے اور ایک مرتبہ وہ گرفتار بھی ہو چکے تھے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالقوی لقمان کے والد ماجد مولانا محمد احمد، جو عام طور پر صوفی احمد مشہور تھے۔ مولانا احمد علی ناظم انجمن خدام الدین، خواجہ عبدالحی، مولانا عبیدالقادر قصوری مرحوم کا پورا خاندان، وغیرہ سب شریک تھے۔ گوجرانوالہ، وزیرآباد اور سیالکوٹ کے بہت سے اصحاب مثلاً قاضی عبدالرؤف اور قاضی عبیداللہ (قاضی کوٹ)، حافظ عنایت اللہ اثری، مستری ابراہیم حافظ آبادی، سید اکبر شاہ ملکانہ (ضلع سیالکوٹ) ان میں سے بعض اصحاب اور متعدد دوسرے اشخاص کے مختصر سے حالات آیندہ ابواب میں جا بجا بیان ہوں گے۔ پیشِ نظر باب میں صرف ان حضرات کے طریقِ کار کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

جمع زر کا نظام قاضی عبدالرحیم صاحب ساکن قاضی کوٹ (ضلع گوجرانوالہ) خود اس خاندان کے ایک جلیل القدر فرد ہیں، جو تحریک مجاہدین سے وابستہ رہا اور اس سلسلے میں قید و بند کی مشقتیں برداشت کیں، وہ فرماتے ہیں:

> مجاہدین کے لیے مالیات کے انتظام کی یہ صورت تھی کہ بنگال، ہندوستان (یوپی اور بہار)، پنجاب وغیرہ تمام علاقوں سے جماعت کے افراد زکوٰۃ اور عشر باقاعدہ جمع کر کے مرکز (اسمست و چمرکنڈ) کو بھیج دیتے اور بلا اجازت مرکز اس میں سے ایک پائی بھی خرچ کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ صدقاتِ فطر باقاعدہ جمع کر کے مقامی فقرا و مساکین پر خرچ کیے جاتے۔ اگر ان میں سے کچھ بچ جاتا تو مرکز کو بھیج دیا جاتا۔ بعض دفعہ بوقت ضرورت صدقات تطوّع بھی وصول کیے جاتے۔ چنانچہ ایک دفعہ اسی قسم کے چندے میں صرف قاضی کوٹ سے تین سو روپیہ فراہم کر کے بھیجا گیا۔ اس قسم کی رقمیں دوسرے تمام علاقوں سے بھی فراہم کی گئیں۔ ان کی صحیح مقدار اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے[1]۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جمع زر کا بڑا ذریعہ صرف زکوٰۃ، عشر اور صدقات کی تنظیم سے پیدا

---

[1] قاضی عبدالرحیم کا ایک مکتوب۔

کر لیا گیا تھا، البتہ ضرورت کے وقت تمام اصحاب مزید رقمیں پیش کر دیتے تھے۔ قاضی کوٹ صرف ایک موضع تھا۔ جب وہاں سے ایک مرتبہ تین سو روپے فراہم ہو گئے تو باقی دیہات و مقامات کے چندے ملا کر یقیناً بہت بڑی رقم جمع ہو گئی ہو گی۔ بنگال و بہار میں ابتدا سے یہ طریقہ رائج تھا کہ روزانہ کھانا پکاتے وقت مستورات ایک مٹھی چاول یا گندم ایک مٹکے میں ڈالتی جاتیں اور ہفتے یا مہینے کے بعد جنس یکجا جمع کر کے فروخت کر دی جاتی۔

قاضی کوٹ کے مقدمہ بم (۱۹۲۱ء) کے ایک بیان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مرتبہ پانچ ہزار روپے چمرکنڈ بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چار ہزار روپیہ حافظ رتلام سے لے آئے تھے، ایک ہزار مولوی فضل الٰہی وزیر آبادی نے فراہم شدہ رقوم میں سے دے دیا اور یہ رقم صرف ایک مرکز سے ایک مرتبہ گئی۔ دوسرے مراکز کی رقموں کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔

مولوی ولی محمد نے اس مقدمے میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ تنہا میں ہر سال تین سو کے اندر رقم بھیجتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ہزار عام چندہ ہوا اور تین ہزار جلال الدین ڈوگر ساکن بوڑے والے نے دیے۔ یوں چار ہزار چندہ بھیجا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں اپنے اسمست جانے سے پیشتر چار ہی ہزار کی رقم مولوی فضل الٰہی کی وساطت سے بھیجی تھی[1]۔

ایک اور بیان مظہر ہے کہ قاضی عطاء اللہ ساکن سانگلا اور ابراہیم ساکن ضلع فیروز پور آئے اور ڈیڑھ ہزار روپے چندے کے مولوی فضل الٰہی کے مکان پر دے گئے۔ یہ دونوں صاحب مولوی ولی محمد کے مرید تھے[2]۔

روپے کے مصارف یقیناً پورے ملک کے تمام حصوں سے روپیہ خاصی مقدار میں جاتا تھا۔ قاضی عبدالرحیم فرماتے ہیں:

جو روپیہ مرکز کو بھیجا جاتا تھا، وہ مرکزی جماعت کے افراد کی ضروریات سے بہت زیادہ

---

[1] روداد مقدمہ قاضی کوٹ۔ [2] ایضاً ایضاً۔

ہوا کرتا تھا لیکن ماحول اور سیاسی مصالح کے مدنظر اس کا بیشتر حصہ سرحدی قبائل پر صرف ہوتا تھا جماعت کے مصارف میں اس کا بہت تھوڑا حصہ آیا کرتا تھا۔ یہ سب کچھ مرکزی جماعت کے افراد اور اصحاب حل وعقد کے مشورے سے ہوا کرتا تھا، اس لیے افراد مرکز یا عوام جماعت کو اس سے کوئی شکایت پیدا نہ ہوتی تھی اور مجاہدین مرکز تمام تکالیف خندہ پیشانی سے گوارا کر لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سرحد میں جماعتِ مجاہدین کو بہت زیادہ اثر ورسوخ حاصل تھا اور قبائل بوقت ضرورت مجاہدین سے پیشتر ہی میدان جہاد میں کود پڑتے تھے[1]۔

اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو امیر عبدالکریم مرحوم کے عہد تک یہی حالت تھی۔ جماعت کے مشورے اور اتفاق سے روپے کا ایک حصہ گردوپیش کے قبائل کی نذر کیا جاتا تھا اور جماعت کی ضرورت کے لیے صرف اتنی رقم رکھی جاتی، جس میں معمولی خوردونوش اور پوشش کا انتظام ہوسکتا۔ البتہ اسلحہ کی خرید لوازم میں داخل تھی اور ان پر رقم خرچ کیے بغیر چارہ نہ تھا۔

دیانت و امانت روپیہ فراہم کرنا بلاشبہہ بڑی محنت، مشقت، تنظیم اور سرگرمی عمل کا طلب گار تھا، لیکن اس سے بدرجہا زیادہ قابلِ ذکر اور مستحق صد ستایش امر یہ تھا کہ روپیہ مرکز تک پہنچانے والے تمام افراد مولوی محمد علی قصوری کے قول کے مطابق دیانت و امانت میں اپنی مثال آپ تھے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ جماعت کے قاصد روپیہ لینے کے لیے آجاتے۔ بعض اوقات مرکزوں سے مختلف لوگوں کو اسمست یا چمرکنڈ بھیج دیا جاتا۔ چھوٹے مرکزوں سے جو لوگ رقمیں لے کر بڑے مرکزوں میں پہنچاتے، وہ اصل رقموں میں سے ایک دمڑی بھی خرچ نہ کرتے۔ کم وبیش ایک سو سال تک یہ نظام قائم رہا لیکن پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ بنگال و بمبئی کے دور افتادہ مراکز سے باغستان تک کبھی ایک حبہ بھی ضائع نہ ہوا اور نہ کسی کے تصرف میں آیا۔

میں اس سلسلے کی صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ حافظ عنایت اللہ اثری وزیرآبادی

---

[1] قاضی عبدالرحیم کا مکتوب۔

جو آج کل جامع اہل حدیث گجرات میں خطیب ہیں، اکتوبر ۱۹۱۵ء میں ایک رقم اسمست پہنچانے پر مامور ہوئے تھے جو اشرفیوں کی شکل میں دو ڈھائی سیر سے کم نہ تھی۔ یعنی کم و بیش چار ہزار۔ آمد و رفت میں جو خرچ ہوا حافظ صاحب نے اپنے پاس سے خرچ کیا۔ یہ رقم پہنچا کر وہ اواخر دسمبر میں واپس ہوئے تو ان کے پاس صرف اتنے پیسے تھے کہ ہری پور سے جہلم تک کا ٹکٹ خرید سکیں۔ جہلم پہنچ کر ایک درزی کی دکان پر دو چار روز کام کیا۔ جب وزیر آباد تک کے لیے ٹکٹ کی رقم فراہم ہوگئی تو باقی سفر طے کیا۔ کیا جماعتی رقوم میں دیانت و امانت کی ایسی کوئی مثال ہمارے عہد کی بڑی بڑی سیاسی انجمنوں اور جمعیتوں میں بھی مل سکتی ہے؟ حافظ صاحب اگر مرکز سے واپسی کا خرچ لے لیتے تو یہ ہرگز غیر مناسب نہ سمجھا جاتا مگر انھوں نے ایک دمڑی بھی نہ لی۔ یہ غیر معمولی دیانت و امانت اس امر کا نتیجہ تھی کہ مجاہدین کی پوری تحریک اصول دین پر منظم ہوئی تھی اور اسی بنیادی مذہبی حیثیت نے اس میں وہ روح پیدا کر دی تھی، جس کی کوئی نظیر ہمارے عہد کی کسی دوسری تنظیم میں نہیں مل سکتی۔

رازداری جو لوگ اسمست و چمرکنڈ اور مراکز وطن کے درمیان آمد و رفت پر مامور ہوتے، وہ چونکہ اکثر اہل حدیث ہوتے لہٰذا انھیں تاکید کر دی جاتی کہ راستے میں نماز پڑھتے وقت سینے پر ہاتھ نہ باندھیں، رفع یدین اور رفع سبابہ نہ کریں، آمین بلند آواز سے نہ کہیں۔ وہ کسی مخلص دوست یا رفیق پر بھی اپنا راز ظاہر نہ کرتے تھے[1]۔ طویل تجربے کے بعد کسی کی پختہ کاری کا یقین ہو جاتا تو اسے صرف وہ باتیں بتائی جاتیں، جن کا اظہار ناگزیر ہوتا۔

یہ لوگ عموماً رات کو سفر کرتے، دن کے وقت محفوظ مقامات پر اقامت اختیار کر لیتے۔ آنے جانے والے افراد کا علم ہندوستان کے مختلف مرکزوں کی جماعتوں کے صرف امیروں کو ہوتا۔ عوام کی نظروں میں ان کی کیفیت عام درویشوں یا طلبہ سے زیادہ نہ ہوتی، بلکہ بعض مقامات پر وہ سادھوؤں کا بھیس اختیار کر لیتے۔ جس علاقے میں سے گزرنا ہوتا، اسی کا لباس اور طریق کلام و معاشرت اختیار کر لیتے یا یہ ظاہر کرتے کہ وہ بولنے سے معذور ہیں[2]۔ یہ سب تدبیریں صرف رازداری اور اخفاء کی غرض سے

---

[1] حافظ عنایت اللہ کا مکتوب۔ [2] قاضی عبدالرحیم کا مکتوب۔

ضروری سمجھی گئی تھیں ؂

قاصد مولوی محمد علی قصوری کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ جماعت مجاہدین میں قاصدوں کی خدمات انجام دینے کے لیے جن اصحاب کو منتخب کیا جاتا تھا، وہ ایسے اوصاف کے مالک ہوتے تھے جیسے ہر شخص میں جمع نہیں ہو سکتے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ قاصد نہایت ہوشیار، زیرک اور معتمد علیہ آدمی ہوتے تھے۔ وہ بھروپ بھرنے میں استاد اور اپنا حُلیہ بدلنے میں مشّاق ہوتے تھے۔ خفیہ پولیس اور سپیشل پولیس کے آدمی ہر وقت ان کے تعاقب میں رہتے تھے لیکن جماعت مجاہدین کے قاصد انھیں چکمہ دیتے اور ان کے چنگل سے بچتے ہوئے روپیہ اور پیغامات اسمست تک پہنچانے میں شرلاک ہومز کے افسانوں کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔ یہ لوگ عموماً ہری پور سے ہزارہ کے دوسرے مقامات یا پشاور سے حکومتِ ہند کی سرحد میں داخل ہوتے اور پنجاب، دہلی، یوپی، بہار، کلکتہ، سی پی، ترلام، بمبئی، منگلور اور مدراس تک کے چکّر لگا کر مختلف مراکز میں جمع شدہ رقمیں یا جماعت کے لیے نئے رنگروٹ ساتھ لے آتے تھے۔ جماعت کے کسی فرد کو کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ کتنے اصحاب قاصدی کی خدمات انجام دیتے ہیں ؂

یہ عجیب و غریب طریق پر بھیس بدلتے تھے، کبھی یورپین لباس پہن لیتے، کبھی کالج کے طالب علم بن جاتے، کبھی سرحد کے رئیس زادوں کی سی پوشاک زیب بر کر لیتے اور سر ہتھیلی پر رکھ کر کام کرتے۔ ہندوستانی مراکز ان لوگوں کی جانبازی اور اعلیٰ سیرت سے بے حد متاثر ہوتے تھے[1]

مولوی صاحب نے فرمایا کہ وہ حد درجہ امین اور بے غرض ہونے کے باوجود جماعت کے لیے حیرت انگیز جھوٹا پروپیگنڈا کرتے تھے[2]۔ موصوف نے اس کی تفصیل نہیں بتائی، لیکن یہ غالباً اسی دور کا ذکر ہے جب مرکز کی حالت پہلے کی سی نہ رہی تھی تاہم ظاہر ہے کہ کسی امیر یا اس کے مشیرانِ خاص کی حیثیت بدل جانے سے جماعت کے مقصد و نصب العین پر کوئی اثر نہ پڑ سکتا تھا اور مخلص کارکنوں کا

---

[1] مشاہدات کابل و یاغستان صفحہ ۱۲۰-۱۲۱ ؂ [2] ایضاً ایضاً ؂

اوّلین فرض یہی تھا کہ جماعت کے نظامِ اعانت کو بگڑنے سے بچائے رکھیں اور سمجھیں کہ زود یا بہ دیر حالت ضرور پلٹے گی۔ بعض وقتی خرابیوں کی بناء پر کسی جمعیت کو بگاڑ لینا سہل ہے لیکن اس کی جگہ نئی ہیئت قائم کرنا اور اسے مقبول بنانا سہل نہیں ٭

عبدالقادر انھیں قاصدوں میں محمد حسین بھی شامل تھا، جس کا ذکر ہم "گمنام مجاہد" کے زیرِ عنوان کر چکے ہیں۔ ان میں متعدد دوسرے اصحاب بھی شامل تھے جو بم، کارتوس، بندوقیں اور ریوالور یہاں پہنچاتے رہے۔ مولوی محمد علی نے اس سلسلے میں عبدالقادر، عبداللہ اور عبدالرحمٰن کا ذکر بہ طور خاص کیا ہے۔ عبدالقادر کے متعلق لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ ہندوستان کا چکر کاٹ کر ہری پور کے راستے اسمست جا رہا تھا۔ دربند پہنچا تو گورے سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس نے اپنے کوٹ کے اندر بہت سی رقم نوٹوں کی شکل میں سلوا رکھی تھی اور ہندوستان کے بعض بڑے بڑے لیڈروں کے خطوط بھی تھے۔ گوروں نے یہ کوٹ اتروا کر رکھ لیا اور عبدالقادر کو حوالات میں بند کر دیا۔ اگر وہ کوٹ کی سلوائی ادھڑوا کر دیکھ لیتے تو روپیہ بھی مل جاتا اور خطوط بھی۔ مولوی صاحب اس وقت اسمست میں تھے۔ وہاں عصر کے وقت عبدالقادر کی گرفتاری کی اطلاع ملی۔ سب کو صدمہ ہوا۔ مولوی صاحب نے افطار کے وقت گڑگڑا کر بارگاہِ باری تعالیٰ میں عبدالقادر کی رہائی کے لیے دعا کی۔ رات کو خواب بھی دیکھا کہ عبدالقادر رہا ہو گیا۔ وہ واقعی رہا ہو گیا اور اسمست پہنچ کر قصہ یہ سُنایا کہ تہجد کے وقت ایک بزرگ آئے، حوالات کا دروازہ کھولا، کوٹ میرے حوالے کیا اور کہا کہ یہاں سے نکال دینا میرا کام تھا، اب بھاگ کر بچ نکلنا تمھارا کام ہے۔ چنانچہ یہ دریا کو عبور کر کے آزاد علاقے میں داخل ہو گیا، پھر بہ اطمینان اسمست پہنچ گیا ٭

دوسرا باب

قاضی کوٹ کا مقدمہ

تمہید یہ مقدمہ ۱۹۲۰ئ میں دائر ہوا تھا اور ۱۹۲۱ئ میں اس کے ملزموں کو سزا کا حکم سنایا گیا تھا۔ اس زمانے میں اخباروں نے اسے "بم کیس" یعنی "بم کا مقدمہ" قرار دیا تھا، حالانکہ یہ موضع قاضی کوٹ سے ناجائز اسلحہ کی برآمد کا مقدمہ تھا، جن میں بم بھی تھے، رائفلیں بھی، ریوالور بھی اور کارتوس بھی +

قاضی کوٹ ایک گاؤں ہے، جو گوجرانوالہ شہر سے دس میل شمال مغرب میں واقع ہے۔ مغلوں کے عہد عروج میں یہ موضع پرگنہ ایمن آباد کے قاضیوں کی جاگیر کا ایک حصّہ تھا، جو غالباً کئی پشتوں تک منصب قضا پر فائز رہے۔ مغلوں کے عہدِ زوال میں بدامنی کا دور دورہ ہوا تو ان لوگوں نے اس موضع میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کا پہلا نام شہزادپور تھا، لیکن قاضیوں کی وجہ سے "قاضی کوٹ" کا نام شہرت پذیر ہوا +

خاندان کے بعض افراد گلاب سنگھ اور رنبیر سنگھ والیانِ کشمیر کے ہاں بھی معزز عہدوں پر فائز رہے۔ ان میں از سرِ نو دینی ذوق و شیفتگی کا آغاز قاضی نظام الدین (ابن قاضی قمر الدین بن قاضی بدر الدین) سے ہوا جنھیں سید امیر حیدر شاہ صاحب[۱]

---

[۱] مولانا سید عبداللہ غزنوی کی ذات گرامی کو تو شہرت عام حاصل ہے اور ان کا خاندان آج بھی علوم کتاب و سنت کا ممتاز مرکز ہے، لیکن سید امیر حیدر شاہ کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ خان پور گکھڑاں ضلع راولپنڈی ان کا آبائی مسکن تھا۔ انھیں شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک روز شکار کھیل کر واپس آئے تو ایک لکڑہارے نے کہا ذرا بیٹھ جائیے۔ انھوں نے پروا نہ کی۔ دوسرے روز بھی یہی ہوا۔ تیسرے روز اس نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور اتار لیا، مصافحہ کرتے ہی شکار کا شوق ختم ہو گیا۔ وہیں ٹھہر گئے۔ چند روز کے بعد لکڑہارا انھیں سوتا چھوڑ کر چلا گیا، پھر یہ اسی رہنما کی تلاش میں مولانا غلام رسول قلعہ میہاں سنگھ والے کے پاس گئے، ان سے فیض حاصل کر کے درجہ کمال پر پہنچے (سوانح حیات ص ۱۳۱-۱۳۲) +

خان پوری ہزاروی سے عقیدت ہوگئی تھی۔ پھر سید موصوف کی وساطت سے مولانا عبداللہ الغزنوی سے رشتہ ارادت استوار ہوگیا اور خاندان کے اکثر افراد جماعت اہل حدیث میں داخل ہو گئے۔ انگریزی حکومت سے بیزاری اور لاتعاون کا سلسلہ پہلے ہی سے جاری تھا۔ امیر حیدر شاہ اور مولانا عبداللہ الغزنوی کی صحبت نے ڈوگروں کی ملازمت سے بھی کراہت کا جذبہ بیدار کر دیا اور اہلِ خاندان نے زراعت کے علاوہ طبابت کو ذریعہ معاش بنالیا۔ میرا خیال ہے کہ قاضی نظام الدین ہی کے عہد میں جماعت مجاہدین سے اک گونہ ربط ضبط پیدا ہوگیا ہوگا، لیکن خاندان کے جن افراد کا تعلق حکومت کی دار وگیر کے سلسلے میں منظرِ عام پہ آیا، وہ دو تھے: ایک قاضی عبدالرؤف (ابن قاضی محمد حنیف، بن قاضی قطب الدین، بن قاضی رکن الدین، بن قاضی بدرالدین) اور دوسرے عبیداللہ (بن قاضی عبداللہ، بن قاضی نظام الدین، بن قاضی شرف الدین، بن قاضی بدرالدین)۔ ان دونوں نے اعانت مجاہدین کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا اور میرے اندازے کے مطابق دونوں ۱۹۰۳ء-۱۹۰۴ء سے گرفتاری (جون ۱۹۲۰ء) تک انتہائی سرگرمی کے ساتھ کام کرتے رہے، یہاں تک کہ اسمست بھی گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خاندان کے دوسرے افراد بھی بہرحال ان کے شریک و معاون ہوں گے، اگرچہ ان کی گرفتاری کے بعد کسی دوسرے کے ربط و تعلق کا اثبات قرینِ دانشمندی نہ تھا۔

مقدمے کی کیفیت مقدمے کی سرسری کیفیت یہ ہے کہ کارکنانِ جماعت مجاہدین میں سے چار پانچ افراد یعنی یعقوب درویش، محمد حسین عرف محمد عمر، سلیمان عرف ایوب، غلام محمد عرف محمد، احمد عرف خان بہادر بم، ریوالور، بندوقیں اور کارتوس یاغستان سے لائے۔ یہ مولانا محمد بشیر اور مولوی یوسف[1] نے مرکز اسمست سے بھیجے تھے اور ہدایت کر دی تھی کہ مولوی فضل الٰہی وزیرآبادی کو دے دیے جائیں۔ یہ سب چیزیں بطور امانت لوہے کے ایک صندوق میں بند کر کے قاضی کوٹ میں قاضی عبدالرؤف کے

---

[1] یہ مولوی یوسف وہی ہیں، جنھوں نے کچھ مدت بعد امیر نعمت اللہ کو قتل کیا اور خود موقع پر مارے گئے۔ میں نے عرف کے طور پر کارکنوں کے وہ نام لکھے ہیں، جو انھوں نے جماعت مجاہدین میں پہنچنے کے بعد اختیار کر لیے تھے۔ ابتدائی نام ان کے اصل نام ہیں۔

مکان کی ایک کوٹھری کے اندر دفن کر دی گئیں ۔

۲۷ - جون ۱۹۲۰ء کو علی محمد کنسٹیبل متعینہ فیروز پور صبح کے چار ساڑھے چار بجے ملتانی دروازے کو کھول کر امرتسری دروازہ کھولنے کے لیے جارہا تھا - قصوری دروازے کے قریب اس نے دیکھا کہ ایک آدمی کھیت میں بیٹھا ہے - آواز دی: کون ہے ؟ کچھ جواب نہ ملا ، پھر آواز دی اور کنسٹیبل اس آدمی کی طرف گیا - آدمی نے اٹھتے ہی پستول چلایا ، لیکن گولی علی محمد کے پاس سے نکل گئی - اس نے دوسری مرتبہ پستول چلانا چاہا ، نہ چل سکا - اس اثنا میں ایک شخص نے پیچھے سے آکر پستول چھین لیا - آدمی پکڑا گیا تو اس نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا - جب محکمہ پولیس نے پرانے کاغذات دیکھ کر فیصلہ کیا کہ یہ شخص ڈکیتی کی تین مختلف وارداتوں کا مفرور اور اشتہاری مجرم ہے تو اس نے بتا دیا کہ میرا نام احمد ہے ، خان بہادر کے نام سے مشہور ہوں ، جماعت مجاہدین کا کام کرتا ہوں ، میرے والد کا نام مانان ہے - ذات کا بھٹی ہوں ، موضع دھتہ تھانہ جلال آباد ضلع فیروز پور کا باشندہ ہوں ، میں اور میرے فلاں فلاں ساتھی مرکز مجاہدین سے اسلحہ لے کر آئے اور وہ اسلحہ قاضی کوٹ میں قاضی عبدالرؤف کے گھر دفن ہے ۔

اس کے بعد حسب ہدایت گوجرانوالہ کی پولیس نے قاضی عبدالرؤف کے گھر کی ناکہ بندی کر لی - اس سے ہتھیاروں کے متعلق پوچھا گیا تو اس نے انکار کر دیا ، لیکن احمد عرف خان بہادر نے قاضی عبدالرؤف کے سامنے اپنا بیان دہرا دیا تو اقرار و اقبال کے سوا چارہ نہ رہا - دفن شدہ صندوق نکالا گیا - خان بہادر کے علاوہ قاضی عبدالرؤف اور قاضی عبیداللہ بھی گرفتار ہو گئے - مولوی فضل الٰہی ، محمد حسین عرف محمد عمر ، سلیمان عرف ایوب ، غلام محمد عرف محمد کا اس وقت کوئی پتا نہ تھا - قاضی عبیداللہ کو سلطانی گواہ بنا لیا گیا ، ان کے اور احمد عرف خان بہادر کے بیانات سے اکثر کارکنوں کے ناموں کا علم ہو گیا - ان سب کو گرفتار کر کے مقدمے میں پھانسنے کی کوشش کی گئی - مثلاً خواجہ عبدالعزیز دفتر اکونٹنٹ سے ، مولوی الٰہی بخش بمبانوالہ سے - محمد رمضان ، مستری ابراہیم اور حافظ عنایت اللہ اثری خطیب جامع اہل حدیث گجرات وزیرآباد سے ، حاجی بشیر الدین جوتے والے اور خلیفہ اسحاق دہلی سے گرفتار ہو کر آئے - ان حضرات نے بہت تکلیفیں اٹھائیں ، لیکن شرکت جرم کا کوئی ثبوت نہ ملنے کے باعث رہا کر دیے گئے ۔

بعض تعجّب انگیز امور اس مقدمے کے سلسلے میں بعض امور سراسر حیران کن ہیں، مثلاً :

۱ - احمد عرف خان بہادر نے، جو ایک مخلص کارکن تھا، کس بنا پر گرفتار ہوتے ہی تمام راز افشا کر دیے ؟

۲ - قاضی عبید اللہ کے مخلص اور صادق العہد ہونے میں کلام نہ تھا ۔ وہ اس سے پیشتر بھی ایک مرتبہ مولوی فضل الٰہی کے زمانہ اسیری میں موصوف سے خط و کتابت کے باعث گرفتار ہو چکے تھے اور کم و بیش سولہ سال تک جماعت کا کام انجام دیتے رہے تھے ۔ انھوں نے کس وجہ سے سلطانی گواہ بننا منظور کر لیا ؟ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ان کے اقبالی بیان سے کسی دوسرے ملزم کو نقصان پہنچتا یا نہ پہنچتا ، لیکن ملزموں میں قاضی عبدالرؤف بھی شامل تھے، جو قاضی عبید اللہ کے ہم خاندان ہونے کے علاوہ ان کے بہنوئی بھی تھے ۔ کیا قاضی عبید اللہ کو یہ خیال نہ آیا کہ اپنے اتنے قریبی رشتہ دار کے خلاف ایک سنگین الزام کے اثبات میں حکومت کا معاون بننا کسی حالت میں بھی مناسب نہیں ؟

۳ - اس مقدمے میں استغاثے کی طرف سے شہادتیں دینے والے بعض وہ حضرات تھے، جو جماعت کے سرگرم کارکن رہ چکے تھے ، مثلاً تاج محمد عرف نصراللہ ، اللہ دتا عرف عبدالحکیم ، مولوی ولی محمد صاحب ساکن فتوحی والا بھی گواہان استغاثہ ہی میں شامل تھے ، حالانکہ وہ سولہ سترہ سال دعوت جہاد کی مشعل لیے پنجاب کے مختلف اضلاع میں دورے کرتے اور مسلمانوں کے سینوں میں دینی حمیت کے چراغ جلاتے رہے تھے اور سیکڑوں مسلمان انھیں کے وعظ و تذکیر سے متاثر ہو کر جماعت مجاہدین میں شامل ہوئے تھے ۔

میرا اندازہ بادی النظر میں ان امور کے متعلق کوئی اطمینان بخش اور دل پذیر توجیہ ذہن میں نہیں آتی ۔ احمد عرف خان بہادر کے متعلق میرا احساس ابتدا ہی سے یہ ہے کہ گرفتار ہوتے ہی اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی ۔ جب پولیس نے اپنے خاص ہتھکنڈوں سے کام لے کر اسے تین سنگین وارداتوں کا مسلّمہ مجرم قرار دے لیا تو اس نے سمجھا کہ اپنے اصل تعلق کا اعتراف کر لے خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہو اور ان الزامات سے بچ جائے، جن سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا ۔ جب جماعت مجاہدین سے تعلق کا اقرار کر لیا تو پولیس نے

باقی راز بھی اگلوا لیے۔ قاضی عبید اللہ کے سامنے احمد عرف خان بہادر کا اقبالی بیان آیا تو انھوں نے سمجھ لیا کہ اب انکار یا سکوت بالکل بے سود ہے لہٰذا جو کچھ معلوم تھا صاف صاف بتا دیا۔

باقی تین اصحاب کی حیثیت خان بہادر اور قاضی عبید اللہ سے مختلف ہے۔ وہ خاص تصورات کی بنا پر جماعتِ مجاہدین سے وابستہ ہوئے تھے جو امیر عبد اللہ اور امیر عبد الکریم کے عہد تک بالکل بجا و درست تھے۔ یہ زمانہ گزر چکا، نیا دَور آیا اور انھیں اسمست میں طویل قیام کا موقع ملا، تو دیکھا کہ جو تصورات انھوں نے قائم کر رکھے تھے وہ ہرگز درست نہ تھے۔ اس طرح ان کے دل ٹوٹ گئے اور یقین ہو گیا کہ جو کچھ انھوں نے کہا اور کیا تھا، وہ سراسر غلط تھا۔ وہ "برّ و تقویٰ" کے لیے قربانیاں کرتے اور قربانیوں کی طرف دعوت دیتے رہے تھے، لیکن ان کا سارا عمل "اثم و عدوان" سے تعاون پر منتج ہوا۔ اس وجہ سے وہ جماعت کو چھوڑ کر چلے آئے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں انھیں جماعت کی کسی مصلحت سے کوئی دلچسپی نہ ہو سکتی تھی، بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنے خیال کے مطابق ایک شدید گناہ کے مرتکب ہوئے تھے اور اس کی تلافی کی صورت یہی تھی کہ تمام اصحاب کو اس سے بچانے کی امکانی کوشش کرتے، چنانچہ انھوں نے بے تکلف مخالفانہ بیان دے دیے۔

پیشیاں اور سزائیں مقدمہ ابتدائی تحقیقات کے لیے خان غلام حسن خاں مجسٹریٹ درجہ اول گوجرانوالہ کی عدالت میں پیش ہوا۔ اس میں بہت سے اصحاب نے استغاثے کی طرف سے شہادتیں دیں۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑھ کر دلچسپ شہادت میر فضل امام انسپکٹر سی آئی ڈی کی تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ مقدمہ ایک بہت بڑی اور وسیع سازش کا جزو ہے، جس میں بہت سے اصحاب شامل ہیں مثلاً: امیر امان اللہ خاں (فرمانروائے افغانستان)، جنرل نادر خاں (جو بعد ازاں نادر شاہ کے لقب سے فرمانروائے افغانستان بنے)، مولوی عبد الرحیم عرف محمد بشیر، مولانا عبید اللہ سندھی، مولوی یعقوب جو مجاہدین چمرکنڈ میں شامل ہے، ملا نجیم[1]، عبد الصمد عرف پیر محمد (چمرکنڈ)، ذو القرنین عرف کرم الٰہی (چمرکنڈ)

[1] معلوم نہ ہو سکا یہ کن صاحب کی طرف اشارہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے مراد ملا نجم الدین عرف ملا صاحب ہڈا ہیں، حالانکہ موصوف اس سے پیشتر واصل بہ حق ہو چکے تھے۔

امیر نعمت اللہ (امیر مجاہدین) وغیرہ۔

۲۳-دسمبر ۱۹۲۰ء کو خان غلام حسن خاں نے ملزم سیشن سپرد کر دیے۔ ۱۴-جنوری سے رائے بہادر گنگا رام سیشن جج کی عدالت میں سماعت شروع ہو گئی۔ قاضی عبدالرؤف کی طرف سے شیخ دین محمد وکیل تھے۔

۲۱-اپریل ۱۹۲۱ء کو سیشن جج نے یہ حکم سنایا:

۱- احمد عرف خان بہادر زیر دفعہ ۱۲۰ بی-۳۰۲ تعزیرات ہند سات سال قید، ایک ہزار روپیہ جرمانہ اور زیر دفعہ ۲۰ قانون اسلحہ سات سال قید۔

۲- قاضی عبدالرؤف زیر دفعہ ۱۲۰ بی-۳۰۲ تعزیرات ہند چار سال قید، چار سو روپیہ جرمانہ اور زیر دفعہ ۲۰ قانونِ اسلحہ چار سال قید۔

ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔ ۱۰-اگست ۱۹۲۱ء کو جسٹس مارٹینو نے فیصلہ سنایا۔ سزائیں بحال رکھی گئیں، لیکن یہ حکم دے دیا کہ قید کی دونوں سزائیں بہ یک وقت شروع ہوں۔ چنانچہ احمد عرف خان بہادر سات سال کی سزا پوری کر کے رہا ہوا اور غالباً ۱۹۵۰ء میں وفات پائی۔ قاضی عبدالرؤف بعد انقضائے سزا رہا ہوئے۔ آج کل چک ۴۹ مجاہد آباد (ڈاک خانہ لودھراں ضلع ملتان) میں سکونت پذیر ہیں۔ مولوی فضل الٰہی نے اٹھائیس تیس مربعے زمین ان اصحاب کے لیے حاصل کی تھی جنھیں تحریک مجاہدین کے سلسلے میں نقصان پہنچا تھا، ان میں سے دو مربعے قاضی صاحب موصوف کو دیے گئے۔ اکاسی بیاسی سال کی عمر ہے، بینائی اور سماعت میں خلل آ چکا ہے، چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔

محمد حسین عرف محمد عمر پشاور میں گرفتار ہوا، وہاں سے سات سال کی سزا ہوئی، پھر زیر غور مقدمے میں اسے چودہ سال کی سزا دی گئی۔ اس کے حالات پہلے پیش کیے جا چکے ہیں۔

قاضی عبدالرؤف کا بیان میں نے شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل اور قاضی حکیم عبدالرحیم صاحب کی عنایت سے مقدمہ قاضی کوٹ کی مثلیں دیکھ لی تھیں، مجھے ان میں قاضی عبدالرؤف اور خان بہادر کے بیانات نہ ملے۔ اب قاضی عبدالرؤف سے پورے واقعات معلوم کر لیے۔ اس بیان سے بعض ایسی باتیں روشنی میں آئیں، جو پہلے معلوم نہ تھیں، وہ خلاصۃً ذیل میں درج ہیں:

۱ - اسلحہ قاضی عبید اللہ کے پاس بھیجے گئے تھے، وہ سرگودھا میں تھے، قاضی عبد الرؤف نے لانے والوں کو قاضی عبید اللہ کے مہمان سمجھ کر کھانا کھلایا، پھر ان کی خواہش کے مطابق مولانا فضل الٰہی کو وزیر آباد سے بلوا دیا - خود قاضی عبد الرؤف کو اسلحہ وغیرہ کا اس وقت تک کوئی علم نہ تھا ۔

۲ - وہ مولوی فضل الٰہی کے ہاتھ پر بیعتِ امارت کر چکے تھے - مولوی فضل الٰہی نے قرآن پر ہاتھ رکھوا کر بیعت کی تصدیق کرائی، پھر اسلحہ کے متعلق بتایا اور قاضی عبد الرؤف نے اسلحہ کا صندوق اپنے مکان میں دفن کرا دیا - بعد ازاں مزید بم آئے - اس وقت قاضی عبید اللہ بھی آئے ہوئے تھے، لہٰذا عبد الرؤف اور عبید اللہ دونوں نے یہ بم بھی صندوق میں رکھ دیے ۔

۳ - خان بہادر کی والدہ بیمار تھی، وہ مولانا فضل الٰہی سے پانسو روپے لے کر فیروز پور چلا گیا اور وہاں پکڑا گیا - تفصیل وہی ہے جو اوپر پیش کی جا چکی ہے ۔

۴ - جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، خان بہادر نے گرفتاری کے بعد سب کچھ بتا دیا اور سرکاری گواہ بننے کی کوشش کی - یہ واقعہ قاضی عبید اللہ اور قاضی عبد الرؤف دونوں کے لیے اس طرح اچانک پیش آ گیا کہ انھیں انکار و اختلاف کی گنجائش ہی نظر نہ آئی - حکومت نے سوچ سمجھ کر قاضی عبید اللہ کو سرکاری گواہ بنا لیا اور معافی کا وعدہ کر لیا ۔

۵ - قاضی عبد الرؤف خود گرفتار ہو چکے تھے لیکن انھوں نے مولانا فضل الٰہی کو بر وقت پیغام بھیج دیا اور وہ بچ کر سرحد آزاد میں پہنچ گئے ۔

ایک اہم معاملہ قاضی عبد الرؤف نے جو سب سے بڑھ کر اہم اور بہ طورِ خاص توجہ طلب بات بتائی، یہ تھی کہ مولانا نعمت اللہ امیر جماعتِ مجاہدین نے ایک بم اسی سائز اور رنگ کا انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا جیسے بم قاضی کوٹ بھیجے گئے تھے - یہ بم بطور ثبوت بھیجا گیا تھا اور سرحد سے ایک انگریز افسر نے آ کر اسے عدالت میں پیش کیا - شیخ دین محمد نے محمد حسین وغیرہ کے علاوہ قاضی عبد الرؤف کی وکالت بھی احسن طریق پر کی - غالباً امیر نعمت اللہ کا بم عدالت میں پیش ہونے ہی کی بنا پر مولانا فضل الٰہی نیز ان کے بعض رفیقوں اور امیر صاحب کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہوا یہاں تک کہ اسی وجہ سے امیر صاحب

بالآخر قتل ہوئے ۔

قاضی عبدالرؤف نے اپنی طرف سے مولانا ثناءُ اللہ مرحوم امرتسری اور مولانا محمد ابراہیم مرحوم میر سیالکوٹی کو بھی بہ طورِ گواہ پیش کیا۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، قاضی صاحب کو مختلف دفعات کے ماتحت چار چار سال قید اور چار سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی تھی۔ ہائی کورٹ نے قید کی دونوں سزائیں بہ یک وقت شروع کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ قاضی صاحب سزا پوری کر کے اکتوبر ۱۹۲۴ء میں رہا ہوئے ۔

خاندانِ قاضیاں کا شجرہ نسب

قاضی بدر الدین
- قاضی رکن الدین
  - قاضی قطب الدین
    - قاضی محمد شریف
    - قاضی محمد حنیف
      - قاضی عبدالرؤف (ملزم مقدمہ ہم)
    - قاضی محمد یوسف
- قاضی شرف الدین
  - قاضی قمر الدین
    - قاضی نظام الدین
      - قاضی عبداللہ
        - قاضی عبیداللہ (ملزم مقدمہ ہم)
        - قاضی عبدالرحیم
        - قاضی عبدالعزیز
      - قاضی بدر الاسلام
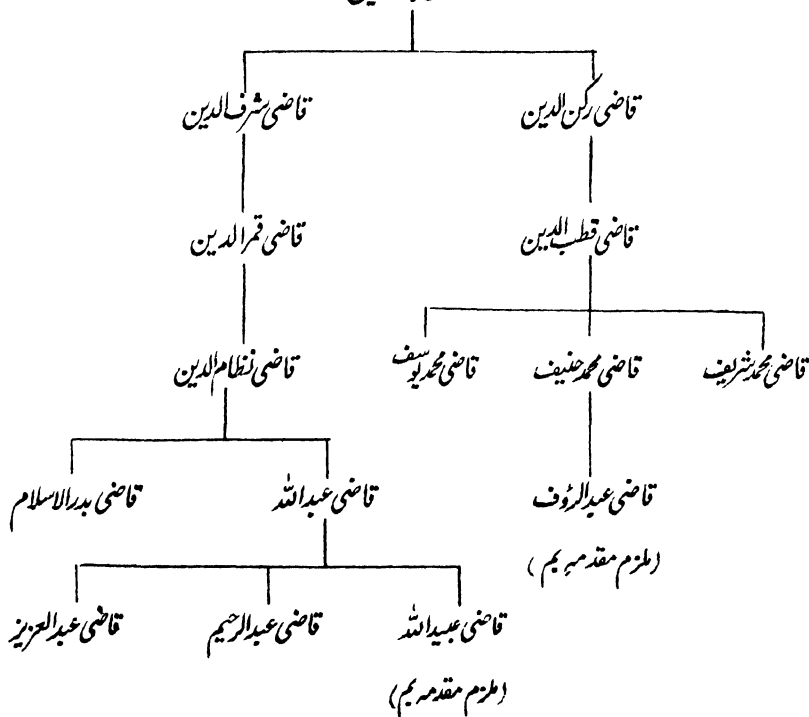
تیسرا باب

مولانا عبدالقادر قصوری

مولانا عبدالقادر قصوری اب ہم ان اربابِ عزیمت کے حالات پر پہنچ گئے ہیں، جنھوں نے ملک کے اندر رہ کر جماعت مجاہدین کا کام کیا یا وہ ترک وطن کرکے مرکز میں پہنچے اور وہاں کچھ مدت گزار کر واپس آگئے یا باقی عمر باہر ہی گزاری یا دوسرے مشاغل کے باوجود جماعتِ مجاہدین کے کام کو تقویت پہنچائی۔ ان سب کے اسما و احوال سے آگاہی نہ ہوسکی اور فی الحال اپنی معلومات پیش کر دینے کے سوا چارہ نہیں۔ اس سلسلے کا آغاز مولانا عبدالقادر قصوری سے کرتے ہیں ؛

مولانا کے خاندانی حالات کا سرسری ذکر ان کے فرزند ارجمند مولوی محمد علی کے تذکرے میں آچکا ہے اور ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ مولانا کے والد مولوی غلام احمد اور قلعہ میہاں سنگھ کے مشہور بزرگ مولانا غلام رسول میں گھرے دوستانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ مولانا کی رسم بسم اللہ مولانا غلام رسول ہی نے ادا کی تھی۔ دینیات کی تعلیم گھر پر پائی، پھر اورنٹیل کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں اورنٹیل کالج کے طلبہ بھی انگریزی خواں طلبہ کے ساتھ امتحانوں میں بیٹھ سکتے تھے، البتہ وہ جواب اردو میں لکھتے تھے۔ مولانا عبدالقادر امتحان میں سب سے اوّل نمبر پر آئے اور انگریزی خواں طلبہ میں سے بھی کوئی ان کے برابر نہ پہنچ سکا۔ ممتحنوں کو یقین نہ آیا کہ کوئی اردو خواں طالب علم انگریزی خواں طلبہ پر بھی سبقت لے جا سکتا ہے۔ پرچے واپس کیے گئے اور امتحان دوبارہ ہوا۔ مولانا نے دوبارہ اوّل درجہ حاصل کیا اور انھیں سولہ روپے ماہوار وظیفہ ملا۔ مولانا کا کمال ایثار ملاحظہ ہو کہ وظیفے کی رقم پوری کی پوری اپنے چھوٹے بھائی عبدالحق کی تعلیم کے لیے دے دیتے اور خود اس قلیل سی رقم میں گزران کرتے جو ان کے والد بھیجتے۔ قانون کا امتحان بھی اعزاز سے پاس کیا ؛

وکالت وہ سوچ رہے تھے کہ کہاں وکالت شروع کریں۔ اس دوران میں قصور کا ایک مقدمہ مل گیا۔ غالباً پانچ روپے اس کی فیس تھی۔ مولانا ایک آدمی کو ساتھ لے کر قصور پہنچے۔ یہ خیال بھی تھا کہ دیکھیں قصور میں وکالت شروع کرنے کے امکانات اچھے ہیں یا نہیں مختصر سا سامان ہمراہ تھا۔ تحصیلدار کے ہاں مقدمے کی پیشی تھی، فیصلہ مولانا کے حق میں ہوا۔ قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ تحصیلدار پہلے ہی مقدمے میں مولانا کی جرح سُن کر حد درجہ متاثر ہوا۔ مقدمے کے بعد انھیں تاکیدی مشورہ دیا کہ آپ قصور ہی میں ٹھہر جائیں، ماشاءاللہ بہت جلد ترقی کریں گے اور بہترین وکیلوں میں آپ کا شمار ہوگا۔

یہ پیشگوئی درست ثابت ہوئی، مولانا تھوڑی ہی دیر میں نامور وکیل بن گئے۔ چنانچہ قصور ہی میں توطن اختیار کر لیا۔ اسی مقام کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ جایداد بھی خرید لی اور عالی شان مکان بھی بنالیا۔ وفات کے بعد اسی سرزمین کی آغوش میں آسودگی پائی۔

وکیلوں اور بیرسٹروں کے خاص طبعی رجحانات ہوتے ہیں۔ بعض فوجداری میں کمال پیدا کر لیتے ہیں اور بعض دیوانی میں۔ مولانا کا کمال یہ تھا کہ وہ دیوانی و فوجداری دونوں میں یکساں درجۂ امتیاز پر پہنچے۔ آخر میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ دُور دُور کے اضلاع سے لوگ آتے اور گراں قدر فیس دے کر انھیں ساتھ لے جاتے۔

بدیشی اشیا سے احتراز وہ طبعاً سادگی پسند تھے، اگرچہ مالی لحاظ سے امیروں میں محسوب ہوتے تھے۔ ہزاروں روپے خرچ کر کے اپنے دو فرزندوں اور ایک بھتیجے کو ولایت بھیجا۔ ہزاروں روپے قومی کاموں میں صرف کیے دوستوں کی ضمانتوں میں ہزاروں روپے کا نقصان اٹھایا۔ دسترخوان پر ہمیشہ پانچ دس مہمان ضرور ہوتے، لیکن ان کا اپنا طریق بود و ماند ہر قسم کے تکلفات سے پاک رہا۔ عمر بھر سادہ لباس پہنا، معمولی پاجامہ جس کی وضع نیم شلوار کی سی ہوتی تھی، معمولی قمیص اور بند گلے کا لمبا کوٹ، سر پر معمولی ٹوپی۔ سردیوں میں گرم صدری اور کوٹ پہنتے تھے، پاؤں میں گرگابی نما دیسی جوتا۔

بدیشی اشیا سے پہلے بھی چنداں دل بستگی نہ تھی، ابتدائی دور ہی میں ایک خاص واقعہ پیش آگیا، جس کے باعث بدیشی اشیا سے امکانی احتراز کا پختہ عہد کر لیا اور زندگی بھر اس عہد کے پابند رہے۔

ان کے والد وقتاً فوقتاً قصور آتے رہتے تھے۔ وہ روزانہ دس پارے تلاوت کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ آئے تو مکان کے صحن میں دو تخت بچھے ہوئے تھے۔ نماز فجر سے فراغت کے بعد وہ تلاوت کے لیے ایک تخت پر بیٹھ گئے۔ دوسرے تخت پر مولانا مقدمات کی تیاری کرنے لگے۔ انھوں نے پنسل بنانے کے لیے چاقو اٹھایا تو والد کی نظر اتفاقیہ اس پر پڑ گئی۔ پوچھا یہ کیسا چاقو ہے؟ مولانا نے عرض کیا کہ جرمنی کی ایک فرم راجرس کا بنا ہوا ہے اور ساڑھے سات آنے میں خریدا ہے۔ یہ سنتے ہی والد بولے: کیا تمھیں اپنے ہمسایے کا بھی کچھ خیال ہے، جو چھ پیسے میں چاقو دیتا ہے اور جب چاہو اسے سان پر لگوا کر تیز کرا سکتے ہو؟ سب لوگ باہر کے چاقو خریدنے لگیں گے تو اس ہمسایے کے چاقو کون خریدے گا اور اسے کہاں سے روزی ملے گی؟ بس اس واقعے نے مولانا کو بدیشی اشیا سے مزید متنفر کر دیا۔ چنانچہ بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک یہاں جاری ہونے سے بہت پہلے وہ دیسی اشیا کا استعمال پابندی سے شروع کر چکے تھے۔

یگانہ استقامت ترک موالات کی تحریک میں وکالت چھوڑی تو ان کی آمدنی ہزاروں روپے ماہوار تھی۔ ۲۵-۱۹۲۴ء میں ترک موالات کی تحریک عملاً ختم ہو چکی تھی اور ان کے بہت سے رفیق وکالت شروع کر چکے تھے۔ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے وفد ان کے پاس پہنچتے اور اصرار کرتے رہے کہ دوبارہ وکالت شروع کر دیں، لیکن وہ جس کام کو غیر مناسب سمجھتے ہوئے ایک مرتبہ ترک کر چکے ہیں دوبارہ اس کے اختیار پر آمادہ نہ ہوئے، اگرچہ ان کی مالی حالت ویسی نہ رہی تھی جیسی ترک وکالت کے آغاز میں تھی اور وہ اگر محض قانونی مشورے دینے پر بھی آمادہ ہو جاتے تو ہزاروں روپے کی آمدنی ہو سکتی تھی۔ لطف یہ کہ مولانا اس وقت ترک موالات کے پورے پروگرام کی صحت کے قائل نہ رہے تھے اور سوراج پارٹی کے ہم خیال تھے جو کونسلوں میں جاتے اور اندر جا کر حکومت کے کاروبار میں زیادہ سے زیادہ خلل ڈالنے کی حامی تھی۔ وہ پختہ عزائم، استوار ارادوں اور بلند اصول کے بزرگ تھے۔ زمانے کے تغیرات ان کی استقامت پر کبھی اثر انداز نہ ہوئے۔

بے مثال دیانت مولانا پنجاب میں خلافت اور کانگرس کی تحریک کے روح و رواں تھے، جب تک مجلس خلافت باقی رہی، اس کے صدر رہے۔ اصابت رائے اور شانِ استقامت و ایثار

کی بدولت انھیں آل انڈیا مجالس میں بھی عزت وتکریم کا ممتاز درجہ حاصل تھا۔ اس مدت میں سیکڑوں مرتبہ انھیں دور دراز کے سفروں اور دوروں ضرورت پیش آئی۔ اضلاع پنجاب کے دورے تو بہ کثرت ہوتے رہے۔ ابتدا میں وہ اپنا اور رفیقوں تک کا کرایہ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ جب مالی حالت زیادہ اچھی نہ رہی تو اس وقت بھی اپنے سفر یا دوسرے مصارف کا بار خلافت یا کانگرس پر کبھی نہ ڈالا۔ نہ کسی بھی شکل میں ان مجالس کے سرمایوں سے کبھی کوئی بڑی یا چھوٹی رقم وصول کی۔

انھیں اکثر لاہور آنا پڑتا اور بعض اوقات کئی کئی دن یہاں ٹھہرتے۔ دن بھر قومی کام کرتے۔ بیسیوں مہمانوں کے لیے دفتر خلافت میں کھانا تیار ہوتا۔ مولانا صبح کی نماز سے فارغ ہوتے ہی اپنے بھائی مولوی عبداللہ کے مکان سے دفتر میں پہنچ جاتے۔ اپنے پیسوں سے موسم کا کوئی میوہ اور دودھ منگوا کر ناشتہ کر لیتے۔ دونوں وقت کا کھانا اپنے بھائی کے ہاں کھاتے۔ مجلس کا کھانا کبھی نہ کھایا۔ حد یہ ہے کہ دفتر میں بیٹھے بیٹھے کوئی ذاتی خط لکھنے کی ضرورت پیش آتی تو کاغذ اور لفافہ بھی دفتر سے نہ لیتے، اپنے پیسے دے کر بازار سے منگواتے۔

وزارت کی پیشکش حج کے لیے گئے تو سلطان عبدالعزیز آل سعود سے اصلاح نظام حکومت کے متعلق مفصّل گفتگو ہوئی۔ سلطان مولانا کی بات چیت سے اتنا متاثر ہوا کہ اصرار کیا حجاز میں وزیر یا مشیر کا عہدہ قبول فرما لیں۔ مولانا نے صاف انکار کر دیا۔ واپس آئے تو ایک مرتبہ عزیزوں اور دوستوں کی مختصر سی مجلس میں حالات سُناتے ہوئے اس بات کا بھی ذکر فرمایا۔ سب نے بالاتفاق کہا کہ اس پیشکش کو قبول کر لینے میں کیا مضائقہ تھا۔ بہرحال یہ ایک اسلامی مملکت کی خدمت تھی، یہ رائے پیش کرنے والوں میں ان کے فرزند مولوی محمد علی بھی تھے۔ مولانا نے جواب دیا:

سُنو، محمد علی، مجھے خدمت قبول کر لینے کا مشورہ دیتے ہو تو پہلے میرے لیے تین ہزار روپے ماہوار کا مستقل انتظام اپنے پاس سے کر دو۔ میں واپس جا کر خدمت اپنے ذمّے لے لیتا ہوں، لیکن سلطان سے تنخواہ لے کر خدمت کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ اسلام و مسلمین کی بہتری یا ملکی مصالح کے پیشِ نظر جو کچھ ضروری ہوگا، اسی صورت میں سلطان

سے صاف صاف کہ سکوں گا جب اس کا یا اس کی حکومت کا کوئی احسان مجھ پر نہ ہو گا، ورنہ ہو سکتا ہے کہ حق گوئی اور حق نمائی کے بجائے صرف اپنی ملازمت کی حفاظت میرا نصب العین رہ جائے۔ اس طرح خدمت کا حقیقی شرف کیوں کر قائم رہ سکے گا؟ یا آج خدمت قبول کر لینے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کل اسے چھوڑنا پڑے۔ اصل مقصد یوں بھی پورا نہ ہو گا۔

اعانت مجاہدین انھوں نے ملکی اور سیاسی کاموں میں جس سرگرمی، انہماک اور جوش حمیت سے حصہ لیا اور جو جو کارنامے انجام دیے، ان کی تفصیل پیش نظر کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ یہ حالات تفصیلاً ہمارے عہد کی سیاسی تاریخ میں بیان ہوں گے جو اس وقت زیر تالیف ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا ضروری ہے کہ مولانا اپنی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں جماعت مجاہدین سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہ اپنی آمدنی کا خاصا حصہ اس کام میں صرف کرتے تھے اور ان کے پاس جماعت کے کارکن بھی آتے رہتے تھے، جو لوگ ہجرت کے آرزومند تھے، وہ بھی مشورے کے لیے مولانا کے پاس پہنچتے تھے اور اب تک ایسے اصحاب موجود ہیں جو مولانا کے حکم سے مختلف آدمیوں کو سرحد آزاد میں پہنچاتے رہے۔

مولوی محمد علی مرحوم نے دو تین مرتبہ ذکر کیا کہ میری عمر زیادہ نہ تھی، جب والد محترم کے پاس ایسے آدمی بہ کثرت آیا کرتے تھے، جنھیں جماعت مجاہدین ہی کے رکن سمجھا جا سکتا تھا، لیکن مولانا کے ضبط و احتیاط کا اہتمام ملاحظہ ہو کہ حقیقتِ حال کبھی اپنے عزیز فرزندوں پر بھی ظاہر نہ ہونے دی، حالانکہ انھیں تمام مشوروں میں شریک رکھتے تھے۔ مولوی محی الدین احمد کو بھی ایسے کئی واقعے یاد ہوں گے۔ ایک مرتبہ انھوں نے فرمایا کہ مولوی ولی محمد (ساکن فتوحی والے) میری موجودگی میں آئے اور والد محترم سے کہا کہ اتنے پونڈ دے دیجیے[1]، میں ایک خاص رقم پوری کر کے مجاہدین کو بھیجنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے غالباً دو مرتبہ خلافت کے سرمایے میں سے بھی خاصی بڑی رقم جماعتِ مجاہدین کو بھجوائی تھی، غالباً یہ رقم کسی ایک فرد یا مختلف افراد نے اسی غرض سے دی تھی۔

---

[1] مولوی محی الدین احمد کو صحیح رقم یاد نہ تھی۔

پیکرِ محاسن مولانا کی صحت آخری دنوں میں اچھی نہ رہی تھی، لیکن وہ کاموں میں لگے رہتے تھے۔ مشورے لینے والے دوستوں اور نیازمندوں کو مشورے دیتے، خواہ مشورے ذاتی معاملات کے متعلق ہوتے یا قانونی معاملات کے متعلق۔ ہمدردی اور لطف و نوازش کا یہ عالم تھا کہ جو بھی ان کے پاس پہنچ جاتا، اس کے ہر کام میں ہر ممکن مدد دیتے خواہ سیاسی و عوامی دائرے میں اس سے کتنا ہی اختلاف ہوتا۔ وہ واحد بزرگ دیکھے، جنھوں نے سیاسی اختلافات اور ذاتی تعلقات کو ہمیشہ الگ الگ رکھا اور اختلاف کی انتہائی شدّت میں بھی ذاتی تعلقات کو اس شان سے نباہا گویا کبھی کوئی اختلاف پیش ہی نہ آیا تھا۔ جن لوگوں نے قومی کاموں میں تکلیفیں یا نقصان اٹھائے تھے، ان کی بے حد قدر فرماتے۔ جب تک اپنی مالی حالت اچھی تھی، اس طریق پر ان کی امداد کرتے کہ امداد لینے والے کے سوا آج تک کوئی اس سے آگاہ نہ ہو سکا۔ غور و فکر کے بعد جو رائے قائم کر لیتے تھے، اس پر مضبوطی سے قائم رہتے۔ وسعتِ حوصلہ کا یہ رنگ تھا کہ اختلاف رکھنے والوں کی بھی قدر کرتے۔ کبھی کسی کے اختلاف پر ملال نہ پیدا ہوا اور کبھی کسی کے اختلاف کو سوءِ ظن پر محمول نہ کیا۔ اپنی رائے ہر مجلس میں بے تکلّف پیش کر دیتے تھے۔ کبھی کسی "بڑے آدمی" کی غیر مناسب رعایت ضروری نہ سمجھی، لیکن گفتگو کا طریقہ ایسا نہ تھا کہ کسی کو خواہ مخواہ رنج پیدا ہو۔ ہمیشہ رائے کو دلائل سے موثق بناتے اور دوسرے کے نقطۂ نگاہ کی تضعیف بھی دلائل سے کرتے۔ غرض سیاسی لیڈروں میں مولانا جیسا جامع اوصاف شخص بہت کم دیکھنے میں آیا ؂

وفات اگرچہ آخری دنوں میں سرگرم سیاسی مشاغل سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی، لیکن پوری زندگی وسیع دائرہ احباب و رفقا میں گزاری تھی، اس لیے لوگ بہ کثرت ان کے پاس آتے رہتے تھے۔ بیماری کا شدید دورہ اس زمانے میں ہوا، جب وہ اپنے بھتیجے ڈاکٹر جنید کے پاس رام پور گئے ہوئے تھے۔ ذرا طبیعت اچھی ہوئی تو لاہور آ گئے اور اپنے فرزند ارجمند مولوی محمد علی بیرسٹرایٹ لا کے پاس ٹھہر گئے، جو اس زمانے میں لٹن روڈ پر رہتے تھے۔ طبیعت کمزور ضرور تھی، اس لیے لیٹے رہتے تھے یا کبھی چارپائی پر سہارا لے کر بیٹھ جاتے، لیکن یہ خیال نہ ہو سکتا تھا کہ دائمی مفارقت کا وقت اتنا قریب آ پہنچا ہے۔ میں نے اس زمانے میں کئی مرتبہ گھنٹوں ان سے باتیں کیں۔ ۱۶۔ نومبر ۱۹۴۲ء (۶۔ ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ) بروز دوشنبہ

پانچ بجے شام لاہور میں انتقال کیا۔ دوسرے روز صبح کے وقت میّت کو قصور لے جاکر دفن کیا گیا ◆

مولوی محی الدین احمد | مولانا عبدالقادر کے فرزند اکبر ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے پاس کر لینے کے بعد مولانا انھیں بیرسٹری کے لیے ولایت بھیجنا چاہتے تھے انھوں نے اس پیشے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی محمد علی ولایت گئے۔ کیمبرج سے ڈگری لینے کے علاوہ بیرسٹری کے لکچر بھی پورے کر لیے تھے، امتحان نہ دے سکے تھے کہ وطن آئے، اس اثنا میں جنگ یورپ چھڑ گئی اور بیرسٹری رہ گئی ◆

محی الدین احمد نے کچھ مدت لا کالج میں گزاری، انھوں نے خود ایک مرتبہ بہ طور لطیفہ سنایا کہ ہم دونوں بھائیوں میں سے کوئی بھی آبائی پیشے کے قابل نہ بنا حالانکہ والد محترم کی خواہش یہی تھی۔ ایک مرتبہ کسی عزیز کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ اتفاقیہ یہی مسئلہ زیر گفتگو آگیا۔ خواجہ حافظ کا دیوان سامنے پڑا تھا۔ مَیں نے بہ طور تفنّن اس میں سے فال نکالی تو یہ شعر نکلا:

چند بہ ناز پرورم مہر بتانِ سنگ دل
یادِ پدر نمے کنند ایں پسرانِ ناخلف

میں نے آخری مصرع والد محترم کے سامنے بدل کر یوں پڑھا:

"کارِ" پدر نمے کنند ایں پسرانِ ناخلف

اور کہا کہ لیجیے خواجہ حافظ بھی ہمارے ہم رائے ہیں۔ والد مسکرا کر خاموش ہو گئے ◆

مولانا کے سب سے چھوٹے فرزند محمود علی نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور آج وہ ممتاز ترین وکلا میں شمار ہوتے ہیں ◆

اخبار نویسی اور نظر بندی | مولوی محی الدین احمد کچھ مدت متفرق مشاغل میں بسر کرنے کے بعد کلکتہ چلے گئے اور وہاں سے مولانا ابوالکلام آزاد کی سرپرستی میں "اقدام" کے نام سے ایک عالی شان روزنامہ جاری کیا۔ جنگ کا زمانہ تھا، مولانا آزاد کے لیے بنگال سے اخراج کا حکم جاری ہوگیا اور وہ رانچی چلے گئے۔ مختلف صوبوں کی حکومتوں نے اپنے اپنے علاقوں میں "اقدام" کا داخلہ بند کر دیا۔ مولوی محی الدین احمد

مجبوراً اخبار کو بند کرکے وطن واپس آئے۔ قصور سے انھیں لاہور بلایا گیا اور آناً فاناً گرفتار کرکے لاہور جیل میں بند کردیا گیا، پھر سی آئی ڈی کے ایک افسر کے روبرو پیشی ہوئی۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا کہ ہمیں معتبر ذریعے سے سب کچھ معلوم ہوچکا ہے اگر سچ سچ بتا دو تو خیر ورنہ بڑی سخت سزا دی جائے گی۔ محی الدین احمد نے بے تکلف جواب دیا کہ اگر آپ کو سب کچھ معلوم ہوچکا ہے، تو مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں؟ اگر میں کوئی بات آپ کی معلومات کے خلاف کہ دوں گا تو ظاہر ہے کہ آپ سمجھیں گے یہ معتبر ذریعے سے حاصل کردہ معلومات کے خلاف ہے۔

وہ افسر بہت جز بز ہوا اور حکم دے دیا کہ محی الدین احمد کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف کرکے ہتھکڑی لگاؤ اور اسے تھرڈ کلاس میں سوار کرکے ہوشیار پور چھوڑ آؤ۔ اس جابرانہ حکم کی تعمیل ہوئی۔ محی الدین احمد کے پاس نہ کوئی پیسہ تھا، نہ کسی عزیز کو اطلاع تھی کہ کیا صورت پیش آئی۔ ہوشیار پور پہنچے تو حکم ہوا کہ انھیں دسوہہ کا ٹکٹ لے دو۔ چنانچہ یہ دسوہہ پہنچے، وہاں کے ہیڈ ماسٹر سے ملے۔ اس نے گرمجوشی سے استقبال کیا۔ دوسرے روز ان کے والد کو بھی اطلاع مل گئی اور انھوں نے ایک آدمی سامان دے کر دسوہہ بھیج دیا۔ جنگ کا زمانہ مولوی محی الدین نے وہیں گزارا۔ فروری ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے۔ ان کی نظر بندی کے زمانے میں مولانا عبدالقادر نے چارپائی پر سونا ترک کردیا تھا۔ ایک چبوترے پر صف بچھی رہتی تھی، اسی پر لیٹ جاتے۔

قومی خدمات قصور واپس آئے تو راؤلٹ ایکٹ کے سلسلے میں ہنگامے شروع ہوگئے۔ ان ہنگاموں میں مولانا عبدالقادر اور مولوی محی الدین دونوں گرفتار ہوئے۔ اس ابتلا سے نجات ملی تو پونا میں ایک یتیم خانے کا انتظام سنبھال لیا۔ نیز جمعیت دعوت و تبلیغ کی نظامت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس دوران میں ان کے بھائی محمد علی ایک بندھی رقم ماہوار انھیں دے دیتے تھے۔ یہی زمانہ ہے جب مولانا عبدالقادر کے چھوٹے بھائی مولوی عبداللہ بھی دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہے۔ یہی دَور ہے جس میں ملیبار کے ماپلوں کے متعلق ان حضرات نے عالی شان تعمیری کارنامے انجام دیے، لیکن ان کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

مولوی محی الدین احمد اور مولوی عبداللہ دونوں بقدر فرصت مجاہدین کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ ان دونوں نے مولوی ولی محمد (فتوحی والا) کے ہاتھ پر بیعت جہاد بھی کی تھی۔ غرض اس خاندان کے بیشتر افراد جماعت مجاہدین سے کم وبیش وابستہ رہے اور دینی خدمات کی بجاآوری میں تو کسی نے بھی حتی الامکان کوتاہی نہ کی۔ مولانا عبدالقادر نے حب دین اور عشق آزادی کا جو چراغ روشن کیا تھا اس سے خاندان کے ہر ایک فرد نے کسب ضیا کا شرف حاصل کیا۔

چوتھا باب

مولوی ولی محمد

ابتدائی حالات ضلع فیروز پور میں دریائے ستلج کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے "فتوحی والا" مولوی ولی محمد یہیں کے رہنے والے تھے۔ ذات کے سندھو جاٹ تھے، والد کا نام الہ دین تھا۔ ان کی پیدائش ۱۸۷۵ء کے آس پاس ہوئی، اس لیے کہ قاضی کوٹ کے مقدمے میں گواہی دیتے ہوئے مولوی صاحب نے اپنی عمر پینتالیس سال بتائی تھی اور قاضی کوٹ کا مقدمہ ۱۹۲۱ء میں ہوا تھا۔

میں نے متعدد اصحاب سے پوچھا کہ مولوی صاحب نے کن کن اصحاب سے دینی تعلیم حاصل کی تھی۔ کوئی کچھ نہ بتا سکا۔ مولوی محی الدین احمد قصوری فرماتے تھے کہ انھوں نے ذاتی مطالعے سے دینی معلومات حاصل کی تھیں اور اندازہ ہے کہ وہ کوئی بڑے عالم نہ تھے۔ ان کے پاس امام احمد بن حنبل کی مسند تھی جو مولوی محی الدین احمد کو دے دی تھی، اس پر جا بجا نشان لگے ہوئے ہیں اور حواشی پر نوٹ بھی ہیں۔

انتہائی سادگی ان کا لباس بہت معمولی تھا، نیلے رنگ کا تہمد باندھتے، کھدر کا کرتا اور کھدر کی پگڑی۔ سردیوں میں معمولی لوئی یا پٹو اوڑھ لیتے۔ مولوی محی الدین احمد اور ان کے عمِ محترم مولوی عبد اللہ ایک مرتبہ ان سے ملنے کے لیے فتوحی والا پہنچے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مولوی صاحب نے ایک نہایت سادہ مسجد بنا رکھی تھی۔ کچی دیواریں اور اس پر معمولی چھت، پاس اپنے رہنے کا ایک کچا حجرہ تھا۔ ہم نے اطلاع کرائی تو آتے ہی پوچھا: کھانا تو آپ ضرور کھائیں گے۔ تھوڑی دیر میں بھنا ہوا قیمہ لے آئے۔ اس پر تعجب ہوا کہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں جہاں کوئی بازار نہیں، اتنی جلدی قیمہ کہاں سے حاصل کر لیا۔ مولوی صاحب نے خود فرمایا کہ قربانیوں کے موقع پر میں اپنے حصے کا گوشت خشک کر کے رکھ لیتا ہوں اور جب کوئی شہری مہمان اتفاقیہ آجاتا ہے تو اس کی تواضع میں صرف ہوتا ہے۔ باتیں بھی انتہائی سادگی سے کرتے

تھے، ان میں عالمانہ شان کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ لب ولہجہ بھی ٹھیٹھ دیہاتی تھا +

خداداد تاثیر وعظ وتذکیر میں خدا نے غیر معمولی تاثیر عطا کی تھی۔ جو دینی حرارت ان کے قلب میں موجزن تھی، اسے سامعین کے دلوں میں اتار دیتے۔ قاضی کوٹ کے مقدمے میں جن اصحاب نے گواہیاں دی تھیں، ان میں سے بیشتر اصحاب مولوی ولی محمد کے مرید و معتقد تھے۔ ان سب نے بیان کیا کہ مولوی صاحب کے وعظ سے متاثر ہو کر انھوں نے اہل حدیث کا مسلک اختیار کیا اور انھیں کی تلقین سے وہ جماعت مجاہدین کے ساتھ وابستہ ہوئے۔ مولوی صاحب عموماً دورے کرتے رہتے تھے۔ گوجرانوالہ، سیالکوٹ وغیرہ اضلاع میں ہزاروں آدمی ان کے ہم نوا بنے، ان میں سے ایسے بھی تھے جو مولوی صاحب کا حکم پاتے ہی گھر بار چھوڑ کر نکل گئے اور اسمست یا چمرکنڈ میں ہر قسم کی خدمات انجام دیتے رہے اور ایسا کوئی بھی نہ تھا جو باقاعدہ زکوٰۃ نہ نکالتا ہو۔ زکوٰۃ کی تمام رقمیں مولوی صاحب کے پاس یا ان کے مقرر کیے ہوئے آدمی کے پاس جمع کر دی جاتیں اور وہاں سے یہ مجاہدین کے مراکز میں پہنچا دی جاتیں +

طریق وعظ وتذکیر وعظ بھی بہت سادہ طریق پر کہتے تھے۔ مولوی محمد اسحاق صاحب مدیر "الاعتصام" نے بتایا کہ عموماً چارپائی پر کھڑے ہو کر مجمعوں میں گفتگو کیا کرتے تھے، یہ سن کر بے حد تعجب ہوا۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ مقرر اور خطیب اپنی تقریروں میں تاثیر و نفوذ پیدا کرنے کے خیال سے لباس بھی اچھا پہنتے ہیں اور جو کچھ کہنا ہوتا ہے، اسے بھی پہلے سے ذہن میں ترتیب دے لیتے ہیں۔ پھر ہر مطلب کو تقویت پہنچانے کی غرض سے دلچسپ و موزوں مثالیں پیش کرتے ہیں۔ علاوہ بریں ان کے لیے تخت بچھتے ہیں اور ان پر قالین بچھائے جاتے ہیں۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ سننے والے تقریر کے آغاز سے پیشتر ہی ایک حد تک متاثر ہو جائیں یا اس طرح ان کے جذبۂ پذیرائی کو خوب بیدار کر لیا جائے۔ مولوی ولی محمد کا سارا طریقہ اس کے برعکس تھا۔ کیا ہمارے عہد میں کوئی شخص کسی ایسے مقرر و خطیب کو وقیع سمجھ سکتا ہے جو معمولی چارپائی پر کھڑا ہو کر مجمع کو خطاب کرے؟ مولوی ولی محمد کو تکلفات سے کوئی مناسبت نہ تھی، تاہم وہ جو کچھ کہتے، دلوں میں اتار دیتے +

ایک عجیب واقعہ مولوی محی الدین احمد نے ایک عجیب واقعہ بیان کیا کہ ہمارے عزیزوں میں

ضلع سیالکوٹ کے ایک صاحب تھے، کبھی نماز نہ پڑھی اور کسی دینی کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سارا دن حقہ پیتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مولوی ولی محمد سیالکوٹ گئے۔ بہت شہرت تھی کہ ان کی بات چیت میں بے حد پُرتاثیر ہوتی ہے۔ ہمارے عزیز کو بھی اس کا علم تھا، چنانچہ وہ تجربے اور امتحان کی غرض سے مولوی صاحب کے پاس سیالکوٹ پہنچا۔ مولوی صاحب نے یوں بات چیت شروع کی کہ ہم تو ایسے آدمیوں سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے۔ پھر آہستہ آہستہ سمجھانے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہمارے عزیز کی یہ کیفیت ہوئی کہ آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ رہے تھے۔ اسی وقت توبہ کی۔ وہ نہ صرف پکا نمازی بلکہ پکا تہجد خواں بن گیا اور اس وقت سے تادم واپسیں حقے کو منہ نہ لگایا۔

جماعت مجاہدین سے تعلق یہ نہ معلوم ہو سکا کہ جماعتِ مجاہدین سے مولوی صاحب کا تعلق کیوں کر پیدا ہوا؟ اغلب ہے جماعت کے کسی کارکن سے اتفاقیہ ملاقات ہو گئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کی تجویزیں سوچتے سوچتے وہ مجاہدین کی طرف راغب ہو گئے ہوں۔ انھوں نے قاضی کوٹ کے مقدمے میں گواہی دیتے ہوئے بیان کیا کہ میں پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام کے پندرھویں سالانہ جلسے پر یاغستان گیا تھا۔ گویا یہ ۱۸۹۵ء کا واقعہ تھا، جب ان کی عمر تقریباً بلیس سال کی ہوگی۔ اس وقت مولانا عبد اللہ مجاہدین کے امیر تھے اور ٹیلوائی میں جماعت کا مرکز تھا۔ اس کے بعد بھی وہ چند مرتبہ ضرور یاغستان گئے، لیکن اندازہ یہ ہے کہ چند روز سے زیادہ قیام نہ رہا۔ انھوں نے خود فرمایا کہ میں نے یکے بعد دیگرے تین امیروں کی بیعت کی۔ امیر عبد اللہ سے تو ملاقات کا ذکر آ ہی چکا ہے، اس کے بعد امیر عبد الکریم کے عہد میں بھی وہ گئے اور بیعت کی اور امیر نعمت اللہ کے عہد میں انھوں نے خاصی لمبی مدت مرکز میں گزاری۔

ملک کے اندر کام سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیوں مرکز میں نہ ٹھہرے اور بار بار واپس کیوں آتے رہے؟ اس کا سبب بالکل واضح ہے۔ وعظ و تذکیر کے ذریعے سے جماعتی کاروبار کو تقویت پہنچانے کی ان میں خاص صلاحیت تھی، لہٰذا ان کا صحیح مقام یہی تھا کہ ملک کے اندر رہ کر روپے اور آدمیوں کا بندوبست کرتے۔ انھوں نے یہ کام یقیناً اتنے اعلیٰ پیمانے پر انجام دیا کہ چند بڑے بڑے اور ممتاز کارکنوں کو چھوڑ کر، جیسے مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی وغیرہ، کوئی بھی مولوی ولی محمد کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اگر یورپ

میں جنگ نہ چھڑ جاتی، ملک کے اندر یا شمالی و مغربی سرحد پر انگریزی حکومت کے نقطۂ نگاہ سے بعض تشویشناک حالات نہ پیدا ہو جاتے اور مولوی ولی محمد کو اطمینان و دلجمعی سے کام جاری رکھنے کا موقع مل جاتا تو یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت کو جہاد کے لیے تیار کر دیتے ۔

ہجرت جنگ چھڑ جانے کے بعد یہاں دار و گیر شروع ہوئی تو مولوی صاحب کو بھی گرفتاری کا اندیشہ لاحق ہوا یا کم از کم یہ واضح ہو گیا کہ اب وعظ و تذکیر کا کام جاری نہ رہ سکے گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ارادت مندوں کو بھی ہجرت کا حکم دے دیا اور خود بھی وطن چھوڑ کر اسمست چلے گئے۔ وہ امیر عبداللہ اور امیر عبدالکریم کے عہد میں جماعتِ مجاہدین کا جو نقشہ دیکھ چکے تھے، امیر نعمت اللہ کے عہد میں وہ باقی نہ رہا تھا۔ چنانچہ اسمست پہنچ کر حالات سراپا بدلے ہوئے دیکھے تو دل پر چوٹ لگی اور وہ حد درجہ پریشان ہو گئے کہ کیا کریں۔ جس مقصد کے پیشِ نظر انھوں نے اپنی اور ہزاروں مسلمانوں کی زندگیاں خطرے میں ڈالی تھیں، اس کے لیے مجاہدانہ سعی و کوشش کا بہ ظاہر کوئی امکان نہ تھا۔ اس پر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ خوش فہمی میں جس خوفناک غلطی کا ارتکاب کر چکے ہیں، اس کی تلافی کی کوئی تدبیر اختیار کرنی چاہیے ۔

مولوی محمد علی قصوری کا بیان سرحد پہنچ کر مولوی ولی محمد نے "محمد موسیٰ" نام اختیار کر لیا تھا۔ مولوی محمد علی قصوری لکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ ایک سو پنجابی مجاہدین نے ہجرت کی تھی[1]۔ امیر نعمت اللہ نے انھیں اپنے ہاتھ میں لینے کی غرض سے ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ نکاح کرا دیا۔ چند ماہ بعد دوسرے نکاح کا انتظام کر دیا۔ پہلی بیوی کے بطن سے ایک لڑکا بھی پیدا ہو چکا تھا اور مولوی صاحب پوری طرح تاہلی کی زنجیروں میں جکڑے جا چکے تھے۔ ان کے لیے امیر صاحب کی طرف سے معقول وظیفہ مقرر تھا۔ ویسے بھی تمام کاموں میں ان سے مشورہ لیا جاتا تھا[2] ۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے اُکھڑے ہوئے دل کو جمائے رکھنے کی یہ تدبیریں کارگر نہ ہو سکیں چنانچہ انھوں نے تنہائی میں مولوی محمد علی قصوری سے کہا کہ امیر صاحب کو عورتوں سے شغف ہے، جہاد سے

---

[1] خود مولوی صاحب نے اپنے بیان میں کہا کہ ہجرت کرنے والوں میں سے میرے مریدوں کی تعداد پچاس تھی ۔

[2] مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۱۲ ۔

اعراض برتا جا رہا ہے۔ جماعتی سرمایہ ذاتی اغراض کے لیے بے دریغ استعمال ہوتا ہے۔ مجھے تو شرم آتی ہے کہ پنجاب میں اتنا جھوٹا پروپیگنڈا کرتا رہا یہاں آکر معلوم ہوا کہ پہلے خواب میں تھا اور اب آنکھیں کھلی ہیں۔ کاش میں ہندوستان ہی مارا جاتا اور یہاں نہ آتا۔ میرا ایمان متزلزل ہو رہا ہے۔ کیا مذہب اسی کا نام ہے؟

ساتھ ہی اعتراف کیا کہ امیر نے شادیاں کرا دیں، اچھی بیویاں مل گئیں۔ ان کی بدولت اب دنیاوی زندگی سے اتنی دل بستگی ہوگئی ہے کہ امیر کے خلاف زبان نہیں ہلا سکتا۔[1]

جماعت سے علیحدگی مولوی صاحب کی طبیعت تو عام حالات دیکھ کر ہی بیزار ہو چکی تھی، لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا وجہ پیش کر کے علیحدہ ہوں۔ انھوں نے خود جو کیفیت بتائی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جماعت اسمست حضرت سید احمد کو شہید نہ مانتی تھی۔ کہتی تھی کہ وہ غائب ہیں۔ جب خراسان کی طرف سے امیر کابل انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کرے گا تو سید صاحب امام مہدی بن کر ظاہر ہوں گے۔ ظہور کی تاریخ ۱۳۳۵ھ (۱۷-۱۹۱۶ء) بتائی گئی تھی۔ مولوی صاحب اسمست ہی میں تھے، جب مولانا محمد بشیر کا ایک مکتوب کابل سے آیا جس کا مضمون یہ تھا کہ جرمنوں اور ترکوں کا وفد کابل میں پہنچا ہوا ہے۔ امیر کابل ۱۳۳۵ھ میں ضرور انگریزوں سے لڑے گا۔ مجاہدین کو بھی تیار رہنا چاہیے تاکہ امیر کے ساتھ ہو جائیں اور مفتوحہ ملک میں سے حصہ لینے میں پیچھے نہ رہ جائیں۔[2]

۱۳۳۵ھ کا سال گزر گیا اور امام کا ظہور نہ ہوا۔ جنگ یورپ بھی ختم ہوگئی اور امیر کابل نے انگریزوں کے خلاف ایک قدم بھی نہ اٹھایا۔ پھر امیر حبیب اللہ خاں مارا گیا اور امان اللہ خاں فرمانروائے افغانستان بنا۔

---

[1] مشاہدات کابل و یاغستان صفحات ۱۱۳، ۱۱۴۔ [2] حافظ عنایت اللہ اثری کا ایک بیان اس سلسلے میں پہلے نقل ہو چکا ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ ۱۳۳۵ھ میں امام مہدی یا سید صاحب کے ظہور کی تاریخ کہاں سے پیدا کی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جماعت میں بعض غیر مستند روایات رائج تھیں، یقیناً یہ اعلیٰ مقاصد کے پیش نظر پھیلائی گئی ہوں گی، لیکن ظاہر ہے کہ یہ طریقہ سراسر غلط تھا اور اس کا انجام قطعاً اچھا نہ ہوا۔

انگریزوں سے لڑائی بھی چھڑی لیکن جلد صلح ہوگئی اور امام کے ظہور کا معاملہ پیش نہ آیا۔ بس اسی بنا پر مولوی ولی محمد نے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی ٭

واپسی انھوں نے خود بیان کیا کہ میں نے امیر نعمت اللہ سے اس بارے میں گفتگو کی اور کہا کہ امام مہدی کے ظہور کی پیشگوئی بالکل غلط اور جھوٹی ہے۔ تلخ کلامی بھی ہوئی۔ اس کے بعد مجھے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اسمست سے نکل جاؤں ٭

چنانچہ وہ نکل کر سب سے پہلے ریاست امب کے علاقے میں پہنچے جو سرحد آزاد سے متصل تھا اور اسمست سے یہ علاقہ زیادہ دور نہ تھا۔ وہاں سیّد عبدالجبار شاہ ستھانوی سے ملاقات ہوئی، جو اس زمانے میں ریاست امب کے وزیر تھے۔ انھوں نے ستھانہ میں مولوی صاحب کے لیے قیام کا بندوبست کر دیا اور خود پشاور گئے۔ وہاں معلوم نہیں کس کس سے ملے اور کیا بات چیت ہوئی۔ واپس آئے تو مولوی صاحب کو مشورہ دیا کہ صاحبزادہ سر عبدالقیوم سے ملیے ٭

وہ رخصت لے کر اپنے وطن ٹوپی میں مقیم تھے۔ مولوی صاحب ان سے ملے تو انھوں نے ایک مکتوب دیا جسے لے کر مولوی صاحب پشاور پہنچے۔ بائیس روز وہاں ٹھہرے رہے۔ سب معاملات طے ہوگئے تو انھیں لاہور آنے کی اجازت ملی۔ مولوی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ مجھ پر صرف ایک شرط عائد کی گئی تھی اور وہ یہ کہ ایسا کام پھر نہ کرنا[1] ٭

فروری ۱۹۲۱ء میں آئے تھے، پھر ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں وفات پائی ٭

ضروری گزارش مولوی صاحب کے ابتدائی دورِ حیات اور آخری دورِ حیات میں بیّن تفاوت شاید بعض طبیعتوں پر شاق گزرے۔ مثلاً یہ بات کہ واپس آکر انھوں نے قاضی کورٹ کے مقدمے میں ایسی گواہیاں دیں، جنھیں بہرحال سرکاری گواہیاں ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ بے شک یہ طرزِ عمل کھٹکتا ہے لیکن

---

[1] یہ حالات خود مولوی صاحب کے بیان سے ماخوذ ہیں ٭

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ انسانوں کی طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں۔ بعض لوگ ایک خاص تصور کے ماتحت انتہائی مجاہدانہ سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ جب ان پر واضح ہوتا ہے کہ اصل تصوّر درست نہ تھا تو نیک طبعی کی بنا پر مناسب یہی سمجھتے ہیں کہ جو غلطی انھوں نے کی تھی، اس کی تلافی کر دینی چاہیے اور اس سلسلے میں جائز حدود کا بھی چنداں خیال نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ حالات کو خلاف توقع سخت سے سخت ناسازگار پاکر عزم و ہمّت میں اور زیادہ استوار اور کوششوں میں اور زیادہ سرگرم ہو جاتے ہیں۔ مولوی ولی محمد اپنے بعض خداداد جوہروں کے باوجود، جو بالکل نادر تھے، پہلے طبقے کے آدمی تھے، دوسرے طبقے کے نہ تھے۔ ہو سکتا ہے بعض اصحاب اس روش کو بہت اچھا نہ سمجھیں، لیکن اس سے نہ مولوی صاحب کے نیک کام پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ خدانخواستہ انگریزوں کے ہم نوا بن گئے تھے یا کسی لالچ کی بنا پر انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ حاشا وکلاّ۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ گناہ کا کفارہ اسی صورت میں ادا ہو سکتا ہے۔ خواہ اس رائے سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو ان کی نیک طبعی کا یہ روشن ثبوت ہے کہ ہندوستان میں نہ ٹھہرے بلکہ مکہ معظّمہ چلے گئے۔

حافظ عنایت اللہ اثری

اب مختلف اصحاب کے تذکرے یکجا ملاحظہ فرمائیے :

حافظ عنایت اللہ وزیر آباد کے رہنے والے اور حافظ عبدالمنان محدث وزیر آبادی کے شاگرد ہیں غالباً ۱۹۱۳ء سے جماعت مجاہدین کے ساتھ آپ کی وابستگی کا آغاز ہوا۔ مارچ ۱۹۱۳ء میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا اجلاس بمقام امرت سر منعقد ہوا تھا۔ اس میں مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی بھی تشریف لائے۔ اجلاس کے بعد وزیر آباد کو بھی اپنے قدوم سے مشرف فرمایا۔ حافظ عنایت اللہ اس زمانے میں حافظ عبدالمنان سے پڑھتے بھی تھے اور اپنی دکان پر درزی کا کام بھی کرتے تھے۔ مولانا رحیم آبادی نے بھی کچھ کام دیا، وہ پورا کر دیا تو مولانا رحیم آبادی بہت خوش ہوئے۔ دہلی پہنچ کر تار کے ذریعے سے بلالیا۔ تعلیم کے لیے حافظ عبداللہ غازی پوری کے سپرد کیا جو مدرسہ ریاض العلوم میں پڑھاتے تھے اور میرزا ولی اللہ بیگ سے فرمایا کہ عنایت اللہ کو بنوٹ سکھا دیجیے۔

مولانا رحیم آبادی جب دہلی تشریف لاتے تو شیخ عطاء الرحمن اور شیخ عبدالرحمن کے ہاں پھاٹک حبشی خاں میں قیام فرماتے۔ جمعہ پڑھاتے تو خطبے میں سورۂ قٓ اول سے آخر تک پڑھتے اور مختصر سی تقریر بھی فرماتے۔ پھر وہ حافظ عبداللہ غازی پوری اور دوسرے علماء و رؤساے دہلی اوکھلا میں جمع ہوتے۔ وہاں بنوٹ کے کرتب دکھائے جاتے جنھیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ انھیں اور حافظ غازی پوری کو مجاہدین سے بڑی الفت تھی اور جہاد کا بہت شوق تھا۔ اسی خیال سے وہ موزوں جوانوں کو منتخب کر کے ان کے لیے سپاہیانہ فنون کے سیکھنے کا انتظام فرما دیا کرتے تھے۔ گھر سے آسودہ حال تھے۔ ہزاروں روپے جماعتی کاموں

میں خرچ کیے۔ مولانا شبلی کی سیرۃ النعمان پر جو انتقاد انھوں نے "حسن البیان" کے نام سے شائع کیا، اس کا جواب آج تک کوئی نہ دے سکا ؎

پھر حافظ عنایت اللہ مولوی فضل الٰہی کے ذریعے سے جماعت مجاہدین کے ساتھ وابستہ ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں اسمست گئے۔ وہاں کے حالات، امیر نعمت اللہ سے گفتگو، جماعت کے بعض معتقدات کے متعلق تاثرات اور سفر آمد و رفت کی کیفیت ہم پیش کر چکے ہیں۔ بم کے مقدمے میں وہ بھی گرفتار ہوئے تھے لیکن ثبوت نہ ملنے کے باعث رہا کر دیے گئے۔ آج کل جامع مسجد اہل حدیث گجرات میں خطیب ہیں ؎

مستری ابراہیم | یہ نظام آباد (متصل وزیر آباد) کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام امام دین۔ مقدمہ قاضی کوٹ کے وقت ان کی عمر بیالیس سال کی تھی۔ مولانا حافظ عبدالمنان محدّث سے فیض یافتہ تھے۔ مولوی ولی محمد کی تلقین سے اہل حدیث ہوئے اور مولوی فضل الٰہی کی وساطت سے جماعت مجاہدین کے ساتھ وابستگی پیدا کی۔ یہ آہنگروں کے اس خاندان میں سے تھے، جسے ہنرمندی اور کاریگری میں خاص شہرت حاصل تھی۔ حکومت سے اسلحہ سازی کا لائسنس حاصل کر لیا تھا۔ سرکاری رائفلوں کی مرمّت و درستی کا ٹھیکہ بھی انھیں مل گیا تھا۔ عموماً تلواریں اور بندوقیں بناتے تھے۔ مالی اعانت کے علاوہ حسب استطاعت جماعت مجاہدین کو اسلحہ بھی بھیجا کرتے تھے۔ مولوی فضل الٰہی انھیں انتظامی مشوروں میں شریک رکھتے تھے اور ان کے ذمے خاص کام یہ تھا کہ اسمست جانے والے جتنے آدمی وزیر آباد پہنچیں، انھیں ریل پر سوار کرا دیا کریں۔ قاضی کوٹ کے مقدمے میں انھیں بھی گرفتار کیا گیا تھا، لیکن کوئی ثبوت ان کے خلاف بہم نہ پہنچا، لہٰذا تفتیش کی کھینچا تانی کے سوا وہ ہر آزار سے محفوظ رہے۔ ۱۹۳۵ء کے قریب وفات پائی۔ قاضی عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ مستری صاحب نہایت شریف انسان اور پابند احکام شریعت تھے ؎

تاج محمد | تاج محمد ولد جلال الدین باجوہ جاٹ، ساکن موضع سکھانہ ضلع گوجرانوالہ۔ قاضی کوٹ کے مقدمے کے وقت پینتیس سال کی عمر تھی۔ مولوی ولی محمد کی تلقین سے اہل حدیث ہوئے، پھر پورا خاندان مولوی صاحب موصوف کا مرید ہو گیا۔ جماعت مجاہدین سے تاج محمد کا تعلق ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوا۔ یہ کھیتی باڑی کرتا تھا اور ہر سال پیداوار کا عُشر باقاعدہ مجاہدین کو بھجوا دیا کرتا تھا۔ مولوی ولی محمد ہجرت

کر کے اسمست پہنچ گئے تو اپنے تمام مریدوں کے پاس پیغامات بھیجے کہ ہندوستان دارالکفر ہے، وہاں سے ہجرت کر کے اسمست آجاؤ۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں تاج محمد بھی اسمست چلا گیا اور وہاں اپنا نام نصراللہ رکھا۔ دو تین ماہ تک اسمست میں قواعد کرتا اور نشانہ بازی سیکھتا رہا۔ پھر اسے چمرکنڈ بھیج دیا گیا، جہاں یہ مختلف چھاپوں میں شریک رہا۔ چمرکنڈ سے دوبارہ اسمست آیا تو سنا کہ مولوی ولی محمد صاحب مرکز کو چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے ہیں۔ پھر اسے چمرکنڈ بھیجا گیا تو وہاں کی جماعت کے امیر مولوی عبدالکریم صاحب، اللہ دتا اور بلال کو مولوی فضل الٰہی کے پاس روپیہ کے لیے بھیج چکے تھے۔ ان کی واپسی میں تاخیر ہو گئی تو امیر موصوف نے تاج محمد اور عبداللہ عرف عبدالرحمٰن ساکن وزیرآباد کو بھی روانہ کر دیا۔ اس اثنا میں اسمست سے عبداللہ، سلیم اللہ اور ایوب آ گئے تھے جنھیں مولوی یوسف نے ایک خط دے کر مولوی عبدالحق ملک رفاہ عام کے پاس بھیجا تھا کہ اگر بم پھنکواؤ تو ان کا انتظام کر دیا جائے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ تاج محمد نے مستری ابراہیم کی معرفت پانسو تیس روپے مولوی فضل الٰہی کے گھر سے منگوائے اور عبداللہ عرف عبدالرحمٰن کو یہ رقم دے کر چمرکنڈ واپس کر دیا۔ خود اپنے گھر چلا گیا۔ بارہ تیرہ روز بعد قاضی کوٹ کے مقدمۂ بم کے سلسلے میں گرفتار ہو گیا اور اس مقدمے میں استغاثے کی طرف سے گواہی دی۔

اللہ دتّا عرف عبدالحکیم یہ بھی مولوی ولی محمد کی وجہ سے اہل حدیث ہوا اور مولوی صاحب ہی کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔ جب موصوف کی طرف سے پیغام آیا تو ہجرت کر کے اسمست چلا گیا۔ وہاں سے چمرکنڈ پہنچا اور مجاہدین کی تمام سرگرمیوں میں شریک رہا۔ امیر امان اللہ خاں کی حکومت مستقل ہو گئی تو امیر نعمت اللہ نے ایک انگشتری اور گلے کا ایک زیور امیر امان اللہ خاں کی خدمت میں پہنچانے کے لیے مولوی عبدالکریم امیر جماعت چمرکنڈ کے پاس بھیجا۔ وہاں سے مولوی عبدالکریم کے علاوہ مولانا محمد بشیر، مولوی محمد حنیف اور مولوی عبدالحمید جشن میں شامل ہونے کے لیے کابل گئے تو اللہ دتّا اور بعض دوسرے اصحاب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس سفر میں مولانا محمد بشیر نے امیر موصوف سے یہ درخواستیں کیں کہ اوّل جماعت مجاہدین کو کچھ زمین عطا کی جائے، دوم ہمیں جو امدادی رقم ملتی ہے اس میں اضافہ

کیا جائے تاکہ گزارا بخوبی ہو سکے۔ سوم بم مہیا کیے جائیں جنھیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھنکوایا جائے۔ چہارم ایک مطبع کا انتظام کر دیا جائے تاکہ اشتہار چھاپ چھاپ کر ہندوستان میں تقسیم کیے جائیں یہ درخواستیں منظور ہو گئیں۔ ان کے علاوہ امیر نے ارکان وفد اور چمرکنڈ و اسمست کے بعض دوسرے اکابر کے لیے چغے، لنگیاں، پوستین اور تمغے دیے۔ کابل سے واپسی پر مولوی عبدالکریم نے اللہ دتا اور بلال کو یہ پیغام دے کر مولوی فضل الٰہی کے پاس بھیجا کہ جلد سے جلد آدمی ارسال کیے جائیں کیونکہ لڑائی شروع ہونے والی ہے۔ مولوی صاحب نے چند روز کے توقف کی ہدایت کی۔ اللہ دتا گھر چلا گیا، معلوم ہوا کہ اس کے خسر کا انتقال ہو چکا ہے، ایک چھوٹا بچہ بھی فوت ہو گیا ہے اور گھر بار کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں، لہٰذا وہ یہیں ٹھہر گیا۔ قاضی کوٹ کے مقدمے میں گرفتار ہوا اور استغاثے کی طرف سے شہادت دی۔ عبداللہ عرف عبدالرحمٰن ساکن سنبھلہ اللہ دتا کا برادر عمزاد تھا، جس کا ذکر جماعت کے قاصدوں میں بار بار آیا ہے۔

اللہ دتا ہی کے بیان سے واضح ہوا کہ فیروز پور کے ایک مجاہد داؤد نے چمرکنڈ سے آکر ڈاکہ ڈالا تھا۔ احمد عرف خان بہادر بھی اس کے ہمراہ تھا۔ داؤد گرفتار ہو گیا خان بہادر بچ کر نکلا اور چمرکنڈ پہنچ گیا۔

چودھری الہ داد چودھری صاحب موضع سنبھلہ ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ عنفوانِ شباب ہی میں ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ ان کا صرف ایک بچہ تھا، اسماعیل نام جس کی عمر چھ سات سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ اہلیہ سے اپنے ارادے کا ذکر کیا تو وہ معیت کے لیے تیار نہ ہو سکی۔ یہ صورتِ حال دیکھی تو اہلیہ کو طلاق دے دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اہلیہ اور اقارب نے موصوف کو مشورہ دیا کہ طلاق نہ دو، ویسے چلے جاؤ، اگر وہاں مستقل قیام کی صورت پیدا ہو جائے تو بے شک طلاق بھیج دینا لیکن چودھری صاحب نے کہا میں ہجرت اور جہاد کی نیت سے جا رہا ہوں، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ واپس آؤں یا نہ آؤں اور ایسی حالت میں نہیں جا سکتا کہ اہلیہ کے حقوق کا بوجھ میری گردن پر ہو۔ چنانچہ طلاق دے دی اور اپنے نابالغ بچے کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ تین چار سال یاغستان میں گزارے۔ جب وہاں حالات کی ناسازگاری حدِ برداشت سے باہر ہو گئی تو مجبوراً واپس آ گئے۔ ۱۹۴۵ء کے لگ بھگ موضع سنبھلہ میں وفات پائی۔

ظاہر ہے کہ ان میں سے اکثر اصحاب معمولی دیہاتی تھے اور زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ انھیں سیاسیات

سے بھی زیادہ آگاہی نہ تھی۔ آزادی اور اسلامیت کے لیے جنگ کو ایک اہم دینی خدمت سمجھ کر بے تکلف
ہر قربانی کے لیے تیار ہو گئے۔ بعض کے کاروبار کو نقصان پہنچا، بعض کے گھر بار تباہ ہوئے اور معلوم ہے
کہ کامیابی کی حالت میں ان کے لیے نہ شہرت و انعام کی کوئی امید تھی اور نہ جاگیر و وظیفہ کی۔ نہ اس قسم
کے خیالات سے ان کے دل و دماغ کا دامن کبھی ملوث ہوا۔ دینی حرارت کے یہ شعلے اسی آگ سے بھڑکتے
تھے جو انیسویں صدی کے ربع اول میں سید احمد شہید نے سلگائی تھی۔ ان کے ارادت مند اس آگ پر
مسلسل و متواتر بے مثال قربانیوں کا تیل ڈالتے رہے ؂

مولوی عبدالرزاق ان کا اصل وطن رائے چک ہے، جو کلانور (ضلع گورداسپور) سے چار میل
کے فاصلے پر ہے۔ والد ماجد جن کا نام نورالدین تھا، خاصے تعلیم یافتہ تھے۔ مولوی محمد حسین بٹالوی اور
مولوی سید عبدالجبار غزنوی سے خاص تعلق تھا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ خود اہل حدیث ہوئے یا خاندان
اس سے پیشتر ہی اہل حدیث ہو چکا تھا ؂

عبدالرزاق نے ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی مولوی مولا بخش کے پاس حاصل کی، جو لاہور میں
چودھری شہاب الدین کے ادارہ مطبوعات قانونی کے مہتمم تھے۔ مولوی مولا بخش، مولانا محمد بشیر (عبدالرحیم)
کے گہرے دوست تھے، اس وجہ سے عبدالرزاق بھی وہاں آنے جانے لگے۔ مولانا محمد بشیر نے ہجرت
کی تو تاکید کر دی تھی کہ مولوی مولا بخش ان کا حساب و کتاب دیکھ لیا کریں۔ چنانچہ وہ خاصی دیر تک یہ
کام انجام دیتے رہے۔ اس زمانے میں بعض اوقات چار سو روپے روزانہ کی آمدنی تھی۔ آہستہ
آہستہ یہ سلسلہ درہم برہم ہو گیا ؂

عبدالرزاق نے کچھ اسلامی کتابیں اور رسالے پڑھے تو شوق پیدا ہو گیا کہ کسی طرح یاغستان پہنچیں۔
مولوی عبدالحق مالک رفاہ عام پریس کے پاس مجاہدین کے قاصد آتے رہتے تھے۔ ان میں سے عبدالقادر
کو خاص شہرت تھی، جس کا ذکر مولوی محمد علی کے حالات میں بھی آ چکا تھا۔ یہ سرحد کے قریب انگریزی علاقے
میں رہتا تھا۔ اس سے عہد و پیمان کر کے عبدالرزاق روانہ ہوئے۔ ہری پور سے دربند ہوتے ہوئے،
اسمست پہنچے۔ وہاں مہمان خانے میں رہے۔ دو تین روز کے بعد بیعت کی۔ اس زمانے میں بنگالی

ہندوستانی تنولی وغیرہ جماعتیں الگ الگ تھیں اور ہر جماعت میں پچاس آدمی ہوتے تھے۔

جماعتی فرائض بیعت کے بعد ان کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ ضرورت کی چیزیں ہندوستان سے لایا کریں یا وہاں سے آنے والے آدمیوں کو لے آیا کریں۔ چنانچہ انھیں تمام راستے دکھا دیے گئے۔ عبدالرزاق نے متعدد سفر کیے۔ مولوی ولی محمد فتوحی والا کے اکثر مریدین کو انھیں نے اسمست پہنچایا۔ یہاں سے مولانا عبدالقادر قصوری کو جب ضرورت پیش آتی تھی تو وہ بھی کسی نہ کسی آدمی کے ہمراہ انھیں بھیج دیتے تھے۔ مثلاً ڈپٹی برکت علی کو عبدالرزاق ہی لے کر گئے تھے۔ ایک مرتبہ راولپنڈی میں ایک مخلص فوجی جمعدار نے بندوق کا انتظام کیا اور پیغام بھیجا کہ بندوق منگوالی جائے۔ چنانچہ اسمست سے عبدالرزاق ہی راولپنڈی آئے۔ ایک بندوق اور دو سو کارتوس روئی کی بوری میں رکھ کر لے گئے۔ دربند سے دریا کو عبور کر کے آزاد علاقے میں پہنچے تو روئی کی بوری کسی کو دے دی، بندوق اور کارتوس اسمست پہنچا دیے۔

ایک مرتبہ جا رہے تھے تو دیکھا کہ دار و گیر بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ انھیں بھی ہری پور میں روک کر واپس بھیج دیا گیا۔ یہاں باز پرس شروع ہو گئی۔ لوگوں کی گرفتاریاں ہونے لگیں۔ عبدالرزاق یہ حالت دیکھ کر لاہور سے روپڑ چلے گئے۔ وہاں سے آگے بڑھ کر ایک پہاڑی گاؤں میں مقیم ہو گئے۔ اس اثنا میں بلوغ المرام پڑھی۔

مستقل ہجرت کچھ مدت کے بعد خیال آیا کہ وطن پہنچنا چاہیے۔ زیادہ تر فاصلہ پیدل طے کیا تا کہ پہچانے نہ جائیں، لیکن رائے چک پہنچتے ہی گرفتار ہو گئے اور انھیں لاہور پہنچا دیا گیا۔ اس جگہ غالباً دو یا تین روز حوالات میں رہے۔ چودھری علی گوہر نام ایک پولیس افسر کے سامنے پیشی ہوئی۔ وہ چودھری شہاب الدین کے عزیز تھے اور مولوی عبدالرزاق کے بھائی مولوی مولا بخش کو خوب جانتے تھے۔ انھوں نے رہا کر دیا اور یہ کچھ مدت تعلیم پاتے رہے۔ دل میں خدمت ملت و ملک کی جو حرارت بھری ہوئی تھی، وہ چین نہ لینے دیتی وقتاً فوقتاً اپنے پرانے مرکزوں میں بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ جب مولانا محمد بشیر اور مولوی یوسف نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہندوستان سے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان بھیجے جائیں، تو عبدالرزاق نے اس سلسلے میں بھی خاصا کام کیا۔ پھر خود بھی چلے گئے۔ خاصا وقت اسمست اور چمرکنڈ میں گزارا۔ بالآخر کابل میں مقیم ہو گئے۔ ۱۹۴۶ء میں بعض ناخوشگوار حالات سے مجبور ہو کر واپس آئے اور مدت تک خفیہ پولیس کی بے سبب

آزاری کا نشانہ بنے رہے۔ آج کل لاہور میں مقیم ہیں۔ ان کے بعض حالات ڈاکٹر رحمت کے سلسلے میں بیان ہوں گے۔

مولوی عبدالواسع بعض اصحاب اختیاراً نہیں بلکہ اضطراراً مرکز مجاہدین میں پہنچے اور جماعتی کاموں میں شریک رہے۔ ان میں سے ایک مولوی ولی اللہ قصوری تھے، جو ریاست فرید کوٹ میں میر منشی بن گئے تھے۔ بڑی دولت پیدا کی۔ قصور کے رئیس سمجھے جاتے تھے۔ فرید کوٹ کا ایک راجا فوت ہوا تو حکومت نے اس کے جانشین کی نابالغی کے زمانے میں ایک انتظامی مجلس بنا دی جو نظم و نسق ریاست کی نگراں تھی۔ مولوی ولی اللہ اس مجلس کے رکن بنا دیے گئے۔ جب نئے راجا نے بالغ ہو کر عنان انتظام اپنے ہاتھ میں لی تو انتظامی مجلس کے ارکان پر سختیاں شروع کر دیں۔ مولوی ولی اللہ پر بھی مقدمہ بنا دیا گیا اور چار سال کے لیے قید کر دیے گئے۔ مولانا عبدالقادر قصوری نے بمشکل انھیں ضمانت پر رہا کرایا، پھر وہ راتوں رات نکل کر مولانا ے مرحوم کے زیر انتظام اسمست پہنچ گئے۔ وہاں اپنا نام بدل کر عبدالواسع رکھا[1]۔ امیر المجاہدین نے انھیں اپنا میر منشی بنا لیا تھا۔ مولوی محمد علی لکھتے ہیں:

> وہ نہایت اعلیٰ درجے کے خوش نویس تھے اور فارسی پر ایسی قدرت تھی کہ ان کے مکتوبات ابوالفضل کے انشا کی یاد تازہ کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں کابل میں تھا اور ان کے مراسلے امیر حبیب اللہ کی خدمت میں پہنچتے تھے تو وہ انھیں مکرر سہ کرر پڑھا کرتے تھے اور مولوی صاحب کے اعلیٰ فارسی انشا کی داد دیتے اور ان کی خوش خطی کی تعریف کرتے۔ کابل میں اس زمانے میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو فارسی میں ان کی ہمسری کر سکتا[2]۔

ڈپٹی برکت علی ڈپٹی صاحب گوجرانوالہ کے رہنے والے اور پنجاب میں سنیئر سب جج تھے۔ وہ

---

[1] قاضی کوٹ کے مقدمے میں جو بیانات ہوئے، ان میں نام عبدالباسط بتایا گیا ہے۔ میرے نزدیک مولوی محمد علی کا بیان زیادہ مستند ہے۔ [2] مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۱۵-۱۱۶۔

پنشن پر سبک دوش ہونے کے قریب پہنچے تو بالادست حکام کے عتاب میں آ گئے اور ان پر رشوت کے دو مقدمے بنا دیے گئے۔ دونوں میں دو دو سال قید کی سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ ڈپٹی صاحب مولانا عبدالقادر قصوری کے دوست تھے۔ مولانا نے اس سزا کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی اور ڈپٹی صاحب کو پانچ ہزار کی ضمانت پر رہا کرا لیا۔ قرائن کی بنا پر یقین ہو چکا تھا کہ اپیل مسترد ہو جائے گی اور سزا بحال رہے گی، اس لیے کہ ہندو چیف جج کو ڈپٹی صاحب سے خاص کاوش تھی۔ مولانا عبدالقادر نے خود پانچ ہزار کا نقصان برداشت کر لیا اور ڈپٹی صاحب کو خفیہ خفیہ ہندوستان سے اسمست بھیج دیا۔ مولوی محمد علی قصوری اسمست پہنچے تو ان کی تلقین سے ڈپٹی صاحب نے قرآن مجید کا ترجمہ بھی پڑھا، حدیث کی کتابیں بھی دیکھیں اور نہایت متشرع اور تہجد گزار مسلمان بن گئے[۱]

مولوی محمد علی کے لیے روس کیپل نے واپسی کا انتظام کرا دیا تو انھوں نے اصرار کر کے ڈپٹی صاحب کو آزادی دلانے کی کوشش کی۔ حکومت پنجاب تو راضی نہ ہوئی لیکن روس کیپل نے یہ انتظام کر دیا کہ ڈپٹی صاحب میعاد قید کے دو سال سرحد میں گزار لیں۔ چنانچہ مانسہرہ کا مقام ان کے لیے تجویز ہو گیا۔ اس اثنا میں ان کے صاحبزادے کو مانسہرہ ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا۔ اس طرح ڈپٹی صاحب اپنے بال بچوں سے مل گئے اور دو سال کی مدت مانسہرہ میں گزار کر پنجاب آ گئے[۲]

مولانا محمد علی لکھوی آپ پنجاب کے مشہور عالم و مفسر مولانا محمد لکھوی کے پوتے ہیں، جن کی منظوم پنجابی تفسیر ہمارے ہاں بہت متداول ہے۔ مولانا محمد کے والد حافظ بارک اللہ تھے۔ زہد و تقدس اور علم و فضل کی وجہ سے تمام لوگ ان کا بہت ادب کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب ممدوٹ ان سے ملنے کے لیے "لکھوکے" آئے، جو ریاست ممدوٹ ہی کا ایک موضع تھا۔ مصافحہ کے وقت نواب صاحب کی کلائی پر ہاتھ پڑا تو معلوم ہوا کہ سونے کے کنگن پہن رکھے ہیں۔ حافظ صاحب بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ دین سے بے پروا لوگ ہمیں گوشہ تنہائی میں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتے اور ناجائز چیزیں پہن کر

---

[۱] مشاہدات کابل و یاغستان ص ۔۔۔ [۲] ایضاً ص ۔۔۔

آجاتے ہیں۔ نواب سخت ناراض ہوا اور حافظ صاحب کو ریاست سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ وہ اہل خاندان کو لے کر ریاست بہاول پور میں جا بیٹھے۔ پھر دریائے ستلج میں ایسی طغیانی آئی کہ نواب ممدوٹ کے محل بھی خطرے میں پڑ گئے۔ اس وقت نواب کو احساس ہوا کہ یہ مصیبت حافظ صاحب جیسے مقدس بزرگ کو ریاست سے نکالنے کی پاداش میں نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ انھیں منت والتماس سے باعزاز واپس بلایا گیا۔ سید جعفر علی نقوی ۱۲۴۵ھ میں مجاہدین کا ایک قافلہ لے کر سید صاحب کے پاس سرحد گئے تھے تو ریاست بہاول پور سے گزرتے ہوئے حافظ بارک اللہ سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ حافظ صاحب کی جلا وطنی ہی کے زمانے کا واقعہ ہے[1]۔

حافظ صاحب کے فرزند ارجمند حافظ محمد بطور مصنف مشہور ہیں۔ ان کی تصانیف میں سے تفسیر محمدی تو پنجاب کے لاکھوں مسلمانوں نے پڑھی اور سنی ہوگی۔ حافظ محمد کے ایک صاحبزادے مولانا عبدالرحمٰن تھے جنھوں نے دہلی جا کر شیخ الکل میاں نذیر حسین مرحوم سے حدیث پڑھی۔ مولانا محمد علی انھیں کے فرزند ہیں جو ۱۳۰۵ھ میں ہجرت کرکے مدینہ منورہ چلے گئے۔ وہیں قیام پذیر ہیں۔ مسجد النبی میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔

مولانا محمد علی سالہا سال چمرکنڈ میں مجاہدین کے ساتھ رہے۔ اس سے پہلے اور بعد مجاہدین کی مالی امداد کا سلسلہ بھی برابر جاری رکھا۔ افسوس کہ ان کی سرگرمیوں کے مفصل حالات معلوم نہ ہو سکے اور اتنا موقع نہ مل سکا کہ کسی ذریعے سے خود مولانا کو حالات لکھ دینے کی زحمت دی جاتی۔ ہندوستان سے ہجرت کا سبب یہی تھا کہ وہ غیر مسلم اجنبی حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنا اسلامیت حقہ کے منافی سمجھتے تھے اور انگریزی حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کی جو کوششیں وہ مجاہدین کے ذریعے سے کرتے

---

[1] ملاحظہ ہو جماعت مجاہدین ص۲۰۳ وہاں غلطی سے حافظ صاحب کا نام تبارک اللہ لکھا گیا۔ مولانا نور محمد کے متعلق بھی ایک ایسا ہی واقعہ میرے علم میں آیا۔ نواب بہاول پور سے ملاقات کے لیے گئے تو اس وجہ سے مصافحہ نہ کیا کہ نواب نے سونے کے کنگن پہن رکھے تھے۔

رہے تھے، ان کی کامیابی مشتبہ ہوگئی تھی۔ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات میں بھی مولانا محمد علی نے سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔

تقسیم کے بعد مولانا کا پورا خاندان اوکاڑہ میں مقیم ہوگیا۔ وہاں مولانا محمد علی کے ایک صاحبزادے نے جامعہ محمدیہ کے نام سے ایک دینی درسگاہ قائم کرلی ہے[1]

صوفی عبداللہ صوفی صاحب نے خود فرمایا کہ میں مولوی ولی محمد فتوحی والا اور مولوی فضل الٰہی کی دل نواز اور ایمان افروز تقریریں سن کر جماعت مجاہدین سے وابستہ ہوا۔ یہ ملکہ وکٹوریا کی وفات سے بعد کی بات ہے یعنی صوفی صاحب موجودہ صدی کے اوائل ہی میں اپنی زندگی مجاہدانہ خدمات کے لیے وقف کرچکے تھے۔ شروع میں مولوی فضل الٰہی کے ساتھ چندہ فراہم کرنے کے لیے دورے کیا کرتے تھے۔ مولوی فضل الٰہی قید ہوگئے تو صوفی صاحب اکیلے جماعت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ قاضی کوٹ کا مقدمہ قائم ہوا اور مولوی فضل الٰہی ہندوستان سے ہجرت کرکے جلال آباد و کابل ہوتے ہوئے چمرکنڈ پہنچے تو صوفی عبداللہ کا دل بھی وطن سے اچاٹ ہوگیا، چنانچہ وہ بھی چمرکنڈ پہنچ کر مجاہدین میں کام کرتے رہے۔ کئی سال وہاں گزارے۔ جب مولانا محمد بشیر اور مولوی فضل الٰہی میں اختلافات پیدا ہوئے تو صوفی صاحب واپس آگئے[2]

---

[1] یہ حالات مجھے مولوی محمد اسحاق مدیر "الاعتصام" سے معلوم ہوئے۔ [2] خود صوفی صاحب نے اختلاف کی جو کیفیت بتائی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عبدالکریم قنوجی کی وفات پر مولوی فضل الٰہی امیر بنے۔ مولانا بشیر وزیرستان سے واپس آئے تو انھوں نے امارت کا دعویٰ اس بنا پر کیا کہ مولوی فضل الٰہی سے پہلے ہجرت کرکے آئے تھے۔ مولوی فضل الٰہی نے امارت چھوڑ دی۔ اہل چمرکنڈ نے یہ فیصلہ قبول نہ کیا۔ مولانا محمد بشیر اسمست گئے اور وہاں سے ایک جماعت مجاہدین کی ساتھ لائے۔ آتے ہی امارت سنبھال لی اور خزانچی بھی اپنا مقرر کیا۔

میرا اندازہ ہے کہ صوفی صاحب کو یا تو غلط فہمی ہوئی یا انھوں نے صرف ایک فریق کے بیانات کو درست سمجھ لیا۔ جس حد تک مجھے علم ہے اور یہ علم بیسیوں ذمہ دار افراد کے بیانات پر مبنی ہے، مولانا محمد بشیر نے کبھی امارت کی خواہش نہ کی۔ وزیرستان سے واپس آکر ان کے اسمست جانے کی وجہ یہ تھی کہ امیر نعمت اللہ کے واقعے میں انھیں بھی ملزم گردانا جا رہا تھا اس لیے کہ امیر کے قاتل یوسف سے مولانا کے خاندان کا خاص تعلق تھا۔ جب اسمست میں ان کی بے گناہی ثابت ہوگئی تو مرکز کی طرف سے انھیں امیر بنا دیا گیا۔ البتہ یہ درست ہے کہ ان کے اور مولوی فضل الٰہی کے درمیان کشمکش جاری رہی۔

مشکلات کار مجاہدین کا ہر کام واقعی جانبازی کا کام تھا، لیکن جن لوگوں کو ہندوستان سے چندہ لانے کے لیے بھیجا جاتا تھا، ان کا تو ایک ایک لمحہ بے اطمینانی میں گزرتا تھا۔ صوفی صاحب کو بھی چندے کی غرض سے بھیجا جاتا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ محض ہندوستان ہی میں خطرات نہ تھے سرحد آزاد میں بھی قزاقی کا خوف دامن گیر رہتا تھا۔ مجاہدین نے کسی ذریعے سے پشاور میں ایک مکان کرایے پر لے رکھا تھا۔ آنے جانے والے اس مکان میں ٹھہرتے تھے۔ بعض اوقات قافلے کے انتظار میں ان کا قیام ممتد ہو جاتا تھا۔

ایک مرتبہ صوفی صاحب روپے لے کر گئے اور چند روز پشاور میں ٹھہرے رہے جب قافلے کی صورت نہ بنی تو اکیلے روانہ ہو گئے۔ راستے میں ڈاکوؤں سے سابقہ پڑا۔ صوفی صاحب جھٹ پیشاب کے بہانے بیٹھ گئے اور جو رقم ان کے پاس تھی، وہ بیٹھے بیٹھے زمین میں دفن کر دی۔ ڈاکوؤں نے تلاشی لی تو کچھ نہ پایا اور انھیں رخصت کر دیا۔ جب ڈاکو خاصی دور نکل گئے تو صوفی صاحب نے رقم نکالی اور چمرکنڈ پہنچ گئے۔

ایک مرتبہ اکیلے جا رہے تھے کہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر رات کے وقت ایک بہت بڑا سانپ ملا، جسے صوفی صاحب نے اژدہا سمجھا۔ چنانچہ آپ نے سَلَامٌ عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ کا ورد شروع کر دیا۔ خدا نے اس بلا کو ٹالا تو صوفی صاحب آگے بڑھے پھر ایک گاؤں سے گھوڑا لے کر منزل مقصود پر فائز ہوئے۔

دینی درسگاہ کا قیام صوفی صاحب کو خدا نے عمل کا پیکر بنایا ہے۔ چمرکنڈ سے واپس آئے تو دیکھا کہ لائل پور کے علاقے میں اہل حدیث کی کوئی درسگاہ نہیں۔ چنانچہ رجب ۱۳۵۷ھ (ستمبر ۱۹۳۸ء) کو خدا کا نام لے کر ایک درسگاہ کی بنیاد رکھ دی۔ آج یہ ایک کامیاب درسگاہ ہے، جس میں پنجاب کے علاوہ بنگال، مدراس، یوپی، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

جماعت کے اساتین صوفی صاحب کے بیان کے مطابق مندرجہ ذیل حضرات جماعت مجاہدین کی امداد و اعانت کے ستون تھے: (۱) مولانا عین القضاۃ لکھنوی (۲) مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی

(۳) مولانا زین العابدین، ڈھاکہ (۴) مولانا لیاقت الوری (۵) ڈاکٹر فرید، دربھنگہ (۶) مولانا عبداللہ سیتامڑھی (۷) مولانا عبدالسبحان جھنگڑوا (۸) حافظ شریف، جھمکا (۹) حافظ عبدالغفور تلام (۱۰) حافظ اسحاق، دہلی (۱۱) شیخ عطاء الرحمٰن، مدرسہ رحمانیہ دہلی (۱۲) حافظ حمید اللہ کشن گنج (۱۳) حاجی خدا بخش جودھپوری (۱۴) محمد حنیف صاحب جودھپوری (۱۵) مولانا ابراہیم بنارسی (۱۶) سیٹھ عبدالمتین بنارسی (۱۷) سیٹھ عبداللہ کوچین (۱۸) سیٹھ داؤد، دہلی (۱۹) حاجی عطاء اللہ، وڈانوالہ (۲۰) حاجی ابراہیم ماڑی اتاری (۲۱) جناب محمد صاحب راوی والے (۲۲) حافظ عبداللہ غازی پوری (۲۳) مولانا عبدالخبیر عظیم آبادی ۔

چھٹا باب

اسلامیت کے جواہر پارے

(۲)

مولوی سلطان محمد جماعت مجاہدین کے ایک خاموش اور گوشہ نشین کارکن مولوی سلطان محمد تھے، جن کے متعلق عوام میں مشہور ہو گیا تھا کہ وہ نوٹ بناتے ہیں اور انھیں اس فن میں ایسا کمال حاصل ہے کہ تجربہ کار مبصر بھی اصل و نقل میں تمیز نہیں کر سکتا۔ جس حد تک میں معلوم کر سکا ہوں، مولوی صاحب نے خود کبھی نوٹ نہیں بنائے، البتہ انھیں کیمیا گری کا شوق تھا۔ غالباً چاندی بنا لیتے تھے اور سونا بنانے کے نسخوں کی تلاش میں سرگرم رہتے تھے۔ پشاور یا یاغستان کا ایک گروہ ان کا رفیق بن گیا تھا، وہ گروہ نوٹ ضرور بناتا تھا۔ مولوی صاحب کے پاس سو سو روپے کے نوٹوں کے صندوق بھرے آتے تھے۔ خود انھوں نے ان میں سے کبھی ایک حبّہ تک نہ لیا اور پوری رقمیں صرف دو کاموں میں صرف کرتے رہے: اول جماعت مجاہدین کی اعانت، جو زیادہ تر اسلحہ کی شکل میں ہوتی تھی، دوم اپنے انقلابی منصوبے کے لیے اسلحہ کی فراہمی۔ مولوی صاحب کا اپنا یہ حال تھا کہ نہایت سادہ لباس پہنتے، ایک روٹی اور دو پیسے کی دال کھا کر گزارا کرتے۔

وہ ایک معزز خاندان کے فرد تھے۔ لاہور کے سرکاری چھاپے خانے میں کمپوزیٹر کے طور پر ملازم ہوئے۔ چونکہ ابتدا ہی سے انھیں اسلامی اور وطنی کاموں کے ساتھ خاص دل بستگی تھی، اس لیے اپنے دو ہم مشرب رفیقوں کو شریک کار بنا کر نوشہرہ میں ایک پریس قائم کر لیا، جس کا نام غالباً "ملٹری پریس" تھا۔ نوشہرہ کو کاروبار کے لیے منتخب کرنے کی اصل وجہ غالباً یہ تھی کہ سرحد آزاد کے قریب پہنچ کر اعانتِ مجاہدین بہتر طریق پر انجام دے سکیں اور آس پاس مختلف مقامات پر مرکز قائم کر دیں، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے

جو کچھ انھیں ملتا تھا، اسلحہ کی خریداری پر صرف کر دیتے تھے ۔ واقفِ حال اصحاب کے بیانات کو درست تسلیم کیا جائے تو ان کے پاس بارہا اسلحہ کے صندوق بھرے ہوئے آئے، لیکن کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ اسلحہ کہاں بنتے اور کس ذریعے سے آتے ہیں ۔

ترک موالات کے ابتدائی دور میں بعض ہندوستانی لیڈر مسلح انقلاب کے آرزومند تھے ۔ پُرامن انقلاب کے حامی دوسری دلیلوں کے علاوہ یہ عذر بھی پیش کیا کرتے تھے کہ مسلح انقلاب کے لیے ہتھیار کہاں سے آئیں گے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک موقع پر مولوی سلطان محمد نے بعض ممتاز لیڈروں کی مجلس میں بہ مقام امرتسر اسلحہ کے دو صندوق بہ طور نمونہ پیش کیے تھے اور پوچھا تھا کہ ایسے کتنے صندوق درکار ہیں تاکہ ان کا انتظام کر دیا جائے ، پھر جس خفیہ ذریعے سے یہ صندوق لائے گئے تھے، اسی خفیہ ذریعے سے محفوظ مقام پر پہنچا دیے گئے ۔

مولوی صاحب کا منصوبہ مولوی صاحب نوشہرہ سے لاہور چلے آئے تھے ۔ انھوں نے بہ طور خود انقلاب کی جو سکیم تیار کی تھی، وہ کچھ اس قسم کی تھی کہ بہروں اور خانساموں کی ایک بہت بڑی تعداد کو اپنی جماعت میں شامل کریں ۔ انھیں ہتھیار دے کر ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں اور چھاؤنیوں میں پھیلا دیں ۔ پھر بہ یک وقت ہر مقام کے بڑے بڑے انگریز افسروں کو قبضے میں لے لیا جائے اور نظامِ حکومت خود سنبھال لیا جائے ۔ اس سکیم کی پوری تفصیلات کہیں سے معلوم نہ ہو سکیں ۔ مولوی صاحب کی زندگی میں یہ سکیم مکمل نہ ہو سکی اور نہ اس پر عمل کی نوبت آئی ۔ اس دوران میں اچانک ان کے خلاف نوٹوں کا مقدمہ قائم ہو گیا، جس میں غالباً سات سال کی سزا پائی ۔ رہائی کے بعد طبابت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ بظاہر بالکل خاموشی اور گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے ۔ کچھ مدت پیشتر وفات پائی ۔ انھیں لوگ عام طور پر مولوی صاحب نہیں " بابو صاحب " کہتے تھے ۔

مولوی صاحب اگرچہ کہنے کو بے تعلق اور گوشہ نشین سے آدمی تھے، لیکن اپنے دائرہ عمل میں ان کا اثر و رسوخ بہت وسیع تھا ۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اچانک ان کی در بندی ہو گئی ۔ ان کے مکان میں ایک یا دو صندوق اسلحہ سے بھرے ہوئے موجود تھے ۔ تھوڑی ہی دیر میں اپنے کارکنانِ خاص کو تاکیدی ہدایات بھیجیں اور تلاشی باقاعدہ شروع ہونے سے پیشتر اسلحہ کے صندوق بدل کر ان کی جگہ ویسے ہی دوسرے صندوق رکھ

دیے گئے۔ یہ سب کچھ کس طرح پایۂ تکمیل کو پہنچا؟ اس کا علم کسی کو نہ ہو سکا[1]۔

مولوی عبداللہ پشاوری یہ مولوی صاحب صوات یا بونیر کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۱۰ء کے آس پاس لاہور آئے اور یہاں "پشاوری" کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ غلام حسن شیشہ گر کے مکان پر قرآن مجید کا درس شروع کیا۔ غلام حسن ہی غالباً ان کے ضروری مصارف کا کفیل تھا۔ وقتاً فوقتاً وعظ بھی فرمایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور کی گراؤنڈ براندرتھ روڈ (کیلیاں والی سڑک) کی طرف سے کھلی ہوئی تھی اور انجمن حمایت اسلام نے مکانوں اور دکانوں کی جو قطار بنوا رکھی ہے، یہ نہ بنی تھی۔ احمدیہ بلڈنگس کی جانب بھی صرف چند عمارتیں نظر آتی تھیں۔ مولوی عبداللہ کبھی کبھی نماز مغرب کے بعد گراؤنڈ میں تقریر فرماتے اور کبھی مذہبی جلسوں کی صدارت کرتے۔ وعظ کا طریقہ ایسا تھا جس کی مثال کبھی نہ دیکھی گئی۔ تقریر کرتے کرتے لے میں آجاتے تو مترنم انداز میں بولنے لگتے۔ بعض الفاظ کے مخصوص افغانی تلفظ کے ساتھ یہ ترنم بڑا مزا دیتا تھا۔ مسائل میں بڑے متشدد اور سخت گیر تھے۔ ایک مرتبہ معراج کے جسمانی یا روحانی ہونے کی بحث چھڑ گئی، ایک مشہور مسلمان لیڈر نے کہہ دیا کہ یہ اختلاف چنداں قابل توجہ نہیں۔ مولوی عبداللہ ایک دم جوش میں آگئے اور فرمایا یہ غلط ہے۔ پھر دلائل پیش کر کے اس لیڈر سے بسرِ عام توبہ کرائی۔ کالجوں کے جن طلبہ نے فروری ۱۹۱۵ء میں ہجرت کی تھی، کہا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض مولوی صاحب ہی کے وعظ و تبلیغ سے متاثر ہوئے تھے اور انھیں ہجرت پر آمادہ کرنے میں بھی مولوی صاحب کے مشورے شامل تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مولوی صاحب اور اوڈوائر ۱۹۱۵ء میں انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس ہوا تو اس میں مولوی عبداللہ پشاوری کے لیے بھی تقریر کا وقت مقرر تھا۔ ان کی تقریر کے دوران میں مائیکل اوڈوائر آگیا، جو پنجاب کا گورنر تھا۔ جنگ یورپ بڑے زوروں پر جاری تھی، ترک انگریزوں کے خلاف جرمنی کے حلیف

---

[1] یہ حالات مجھے اپنے عزیز دوست شمس الدین صاحب (گرنڈلے بنک لاہور) سے معلوم ہوئے۔ وہ مولوی سلطان محمد کے خاص نیازمندوں میں شامل تھے۔

کی حیثیت میں لڑ رہے تھے ۔ مائیکل اوڈوائر اگرچہ نیا نیا آیا تھا اور اس کی جابریت آشکارا نہ ہوئی تھی، تاہم مشہور تھا کہ وہ بڑا سخت حاکم ہے اور پنجاب جنگی بھرتی کا خاص مرکز تھا۔ اوڈوائر اردو بخوبی سمجھتا اور بولتا تھا۔ کارفرمایانِ انجمن نے مولوی صاحب سے درخواست کی کہ اب اپنی تقریر ختم کیجیے اس لیے کہ آپ کا وقت ہو چکا ہے۔ انھوں نے فرمایا "بہتر، اب صرف دعا باقی ہے۔" چنانچہ فوراً ہاتھ اٹھا کر دعا شروع کر دی۔ دعا اس مضمون کی تھی: "اے اللہ مسلمانوں کو قوتِ ایمان دے، انھیں اسلام پر ثابت قدم رکھ، نیک عملی کی توفیق عطا کر، انھیں یہ دے، وہ دے۔" مجمع دعا کے ہر فقرے پر بلند آواز سے "آمین" "آمین" کہہ رہا تھا، یکایک مولوی صاحب نے کہا:

اے اللہ! مسلمانوں کو حکومت کا مزا بھی چکھا دے، اگر انگریزوں کی حکومت نہیں دیتا، نہ دے، روس ہی کی حکومت دے دے ۔

اہلِ جلسہ نے زور شور سے آمین کہی اور مولوی صاحب ایک دم مجمع سے غائب ہو گئے ۔

وہ مسلسل مجاہدین کی اعانت کا کام انجام دیتے رہے اور شاید اسی غرض سے لاہور آئے تھے۔ یہاں ان کی تمام سرگرمیاں انگریزوں کے خلاف رہیں۔ آخر ان کی گرفتاری کا فیصلہ ہو گیا، لیکن مولوی صاحب گرفتاری سے تھوڑی دیر پہلے چھپ چھپا کر بچ نکلے اور پشاور پہنچ گئے۔ پولیس نے شدت سے ان کا تعاقب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مقام پر ان کی گرفتاری یقینی ہو گئی تھی، لیکن وہ دیوار توڑ کر نکل گئے۔ پھر معلوم نہ ہو سکا کہ زندگی کے باقی اوقات کہاں گزارے اور کب وفات پائی۔ جب وہ یہاں تھے تو مشہور تھا کہ عقیدے کے رو سے اہلِ حدیث ہیں ۔

مولوی کرم الٰہی | مولوی صاحب ان خاموش کارکنوں میں سے تھے، جن کی مثالیں ہمارے عہد میں بہت کم رہ گئی ہیں۔ اصل وطن تادروالا، تحصیل زیرہ، ضلع فیروز پور تھا۔ ۱۸۸۵ء کے قریب پیدا ہوئے ۔ مدت دراز تک گورنمنٹ ہائی سکول لدھیانہ میں عربی کے ٹیچر رہے ۔ مولوی عبدالرزاق صاحب ان سے کئی مرتبہ ملے تھے ۔ وہ بتاتے تھے کہ تنخواہ میں سے تھوڑی سی رقم اپنے گزارے کے لیے رکھ لیتے، باقی مجاہدین کو بھجوا دیتے ۔ لدھیانہ میں حافظ نور دین بھی مولوی صاحب کے معاون و رفیق تھے ۔ ظاہر ہے کہ جو

بزرگ ذاتی مشاہرے کا بیشتر حصہ خدا کی راہ میں دے دیتے تھے، وہ دوسرے افراد سے بھی ضرور چندہ فراہم کرتے ہوں گے، لیکن ان کے طریق کار کی کوئی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ جماعت کے آدمی خفیہ خفیہ ان کے پاس آتے رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً انھیں کے ہاتھ رقمیں بھیجی جاتی تھیں۔ مولوی صاحب کے صاحبزادے نے بتایا کہ حکومت کو موصوف کی سرگرمیوں کا علم ہو چکا تھا اور مجاہدین سے ہمدردی کے باعث ان پر کڑی نگرانی کا انتظام ہو گیا تھا، تاہم وہ جس کام کو ایک اہم دینی فرض سمجھ کر ادا کرتے تھے، اسے ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور نگرانی کے باوجود ہر ممکن ذریعے سے روپیہ مجاہدین کو پہنچاتے رہے۔

آخر ان کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول لدھیانہ سے گورنمنٹ ہائی سکول جالندھر میں ہو گیا۔ یقین ہے کہ جالندھر میں بھی انھوں نے خدمتِ مجاہدین کا کام جاری رکھا ہوگا۔ ۱۹۳۳ء میں سرکاری ملازمت سے وظیفہ لے کر قادر والا میں مقیم ہو گئے اور تقسیم تک وہیں رہے۔

فسادات شروع ہوئے تو دوسرے لاکھوں مسلمانوں کی طرح مولوی کرم الٰہی صاحب کو بھی وطنِ مالوف سے ہجرت کرنی پڑی۔ قصور پہنچے تو ہیضے میں مبتلا ہو گئے۔ بیماری ہی کی حالت میں اپنے خلفِ اکبر چودھری عبدالرحمٰن صاحب بی۔ اے، بی۔ ٹی کے پاس پاک پتن پہنچ گئے۔ وہیں تین روز بعد وفات پائی۔ گویا یہ غالباً ستمبر ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے۔ ان کی اولاد میں چار صاحبزادے ہیں اور تین صاحبزادیاں۔ یہ لوگ خانیوال میں رہتے ہیں[1]۔

حاجی نور محمد صرّاف

حاجی صاحب نے فیروز پور میں صرّافہ کی دکان قائم کر رکھی تھی۔ اس سے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے اور نہ یہ پتہ چلا کہ ان کے کاروبار کا کیا حال تھا۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ابتدائی دور ہی سے جماعت مجاہدین کے لیے رقمیں جمع کر کے بھیجتے رہتے تھے، بلکہ اپنی دکان کا ایک حصہ صرف اس غرض سے وقف کر رکھا تھا کہ جماعت کے قاصدوں یا اسمست وچمرکنڈ جانے والوں

[1] ان میں سے کچھ حالات میرے عزیز دوست مولوی عبدالرزاق نے بیان کیے۔ بعد ازاں مولوی صاحب مرحوم کے صاحبزادے چودھری محمد عبداللہ صاحب بی۔ اے مالک فیروز پور سٹورز خانیوال نے مولوی محمد اسحاق مدیر "الاعتصام" کے ایما پر مختصر سوانح لکھ بھیجے۔

میں سے کوئی پہنچ جائے تو بہ طمینان ٹھہرے اور آرام کر سکے۔ حاجی صاحب ایسے مہمانوں کے لیے کھانے یا دوسری ضروریات کا انتظام کر دیتے تھے۔

مولوی محمد اسحاق صاحب مدیر "الاعتصام" نے بتایا کہ حاجی صاحب اگرچہ بڑے محتاط تھے، لیکن حکومت کو ان کی سرگرمیوں کی اطلاع کسی ذریعے سے پہنچ گئی اور ۱۹۱۱ء میں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ تاہم کوئی واضح ثبوت نہ مل سکا، اس لیے چھوڑ دیا گیا۔ غالباً ۱۹۳۰ء میں انھوں نے وفات پائی۔

میاں غلام حسین یہ بزرگ مولوی ولی محمد کے ہم وطن تھے یعنی ان کا گاؤں بھی فتوحی والا تھا۔ ان کے بھی زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے، البتہ مولوی محمد اسحاق صاحب نے بتایا کہ فیروز پور اور آس پاس سے تمام روپیہ انھیں کے ذریعے سے مجاہدین کو پہنچتا تھا۔ کچھ پتا نہیں کہ انھوں نے ارسالِ زر کے کیا کیا وسائل اختیار کر رکھے، لیکن زندگی بھر یہ خدمت چپ چاپ انجام دیتے رہے۔

صوفی جلال الدین موضع سہریہ والا ریاست فریدکوٹ اصل وطن ہے۔ اب چک ۵۳ گ ب تحصیل جڑانوالہ ضلع لائل پور میں مقیم ہیں۔ یہ بھی مولوی ولی محمد فتوحی والا کی تقریروں اور وعظوں سے متاثر ہو کر جماعت سے وابستہ ہوئے اور مولوی ولی محمد کے ایک قاصد کے ہمراہ اسمست پہنچ کر امیر نعمت اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ وہاں فوجی قواعد سیکھی۔ مولوی الٰہی بخش پیرو والا اور مولوی عین الدین ساکن سانده (ضلع لاہور) ان کے ساتھ تھے۔ اسمست میں کسب نام اختیار کیا۔ مولوی الٰہی بخش کا نام عبدالاول اور مولوی عین الدین کا ابوبکر رکھا گیا۔ قواعد سیکھ چکے تو مجاہدین میں شامل ہوئے۔ سرکاوئی کی جنگ میں شریک رہے جس کا ذکر ہم نے رستم کی جنگ نام سے کیا ہے۔ انگریزی چھاؤنیوں پر شبخون بھی مارے۔ چار برس رہ کر امیر کی ہدایت کے مطابق واپس آ گئے۔ اس کے بعد بھی سال میں ایک مرتبہ ضرور چمرکنڈ جایا کرتے تھے۔

ان کے گاؤں میں ۹۹ فی صد سکھ آباد تھے، اس لیے جگہ محفوظ تھی۔ چنانچہ بنگال، بہار، یوپی سے جو حضرات خدمت مجاہدین کے سلسلے میں آتے تھے، ان کا ایک خاص پڑاؤ صوفی صاحب کا مکان تھا۔ وہاں کسی جاسوس کی خبر رسانی یا پولیس کی تلاشی کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ بماں والا کے مقدمہ بندوق اور قاضی کوٹ کے مقدمے سے صرف اس لیے بچ گئے کہ ان کے خلاف کوئی عینی گواہ نہ مل سکا۔ چنانچہ مجسٹریٹ نے یہی کہ کر

رہا کیا کہ تیری قسمت اچھی ہے، موقع کی کوئی شہادت نہیں ملی ۔

معاونینِ جماعت صوفی صاحب کے بیان کے مطابق مندرجہ ذیل حضرات جماعت مجاہدین کے خاص معاون تھے : (۱) مولانا عبدالقادر قصوری، (۲) مولانا قاضی سلیمان منصور پوری مصنف "رحمۃ للعالمین" وغیرہ، (۳) مولانا عبدالتواب ملتانی، (۴) مولانا محمد علی لکھوی، (۵) مولانا عطاء اللہ لکھوی، (۶) مولانا عبداللہ کھسے والا ضلع فیروزپور، (۷) عبداللہ کوٹے والا ضلع فیروزپور، (۸) صوفی محمد سلیمان روڑی والا اور (۹) ان کے صاحبزادے مولانا حکیم عبداللہ، (۱۰) میاں شمس الدین (ضلع لاہور)، (۱۱) میاں غلام حسین فتوحی والا، (۱۲) علمائے اہل حدیث بڈھی وال (ضلع فیروزپور) ۔ صوفی صاحب وقتاً فوقتاً آدمی بھی اسمست بھیجتے رہتے تھے ۔ چنانچہ ایک دفعہ محمد عمر نام ایک لوہار کو بھیجا تھا جو دس سال وہاں رہا ۔

متفرق اصحاب ان کے علاوہ بھی فیروزپور کے مختلف اصحاب نے اعانت مجاہدین کا کام سنبھال رکھا تھا ۔ مثلاً :

۱ ۔ مولوی عبدالکریم صاحب جو "گرے کنال" میں ایس ڈی او تھے ۔ تقسیم کے بعد لاہور آ گئے اور کچھ مدت لاہور اور ملتان میں اہم خدمتوں پر مامور رہے ۔ آج کل ریٹائر ہو چکے ہیں ۔ صاحب موصوف خلوص، محبت، اسلامیت اور اخوت کا ایک ایسا پیکر ہیں، جن کی مثالیں بہت کم ملیں گی ۔

۲ ۔ چودھری عبدالستار خاں، یہ خاص فیروزپور میں رہتے تھے ۔

۳ ۔ عبدالسلام ساکن تلونڈی ضلع فیروزپور ۔

۴ ۔ سلیمان ساکن ضلع فیروزپور، جس نے سرحد میں ایوب نام اختیار کر لیا تھا ۔

ضلع سیالکوٹ کے بھی متعدد اصحاب کے اسماء مختلف سلسلوں میں آئے ہیں ۔ مثلاً سلیم اللہ، غلام محمد ۔ آخر الذکر سرحد میں "محمد" کے نام سے مشہور تھا ۔

ساتواں باب

اسلامیّت کے جواہر پارے

(۳)

تمہید اب آخر میں ان طلبہ کے حالات اختصاراً لکھ دینا چاہتا ہوں، جو فروری ۱۹۱۵ء میں جہاد کی نیت سے کالج چھوڑ کر گئے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ وہ سب مجاہدین سے وابستہ نہ رہے، تاہم:

۱ - انھیں سرحد آزاد میں پہنچانے کے ذمہ دار وہی اصحاب تھے، جو جماعت مجاہدین کا کام کرتے تھے۔

۲ - ان کی پہلی منزل وہی جگہ تھی جہاں مجاہدین قیام پذیر تھے۔

۳ - ان میں سے بعض نے آگے چل کر جماعت مجاہدین سے وابستگی اختیار کر لی۔

۴ - دوسرے اصحاب نے بھی حتی الامکان جماعت کی سرگرمیوں میں اعانت کا سلسلہ برابر جاری رکھا یا کم از کم جماعت مجاہدین سے ان کی ہمدردیاں کم نہ ہوئیں اور بعض اوقات اس سے انتساب کی بنا پر رفع مشکلات میں بھی مدد ملی۔

۵ - ان اصحاب نے قربانیوں کا جو نمونہ پیش کیا، وہی تھا، جس کی مثالیں جماعت مجاہدین سے باہر شاذ ہی ملیں گی۔

کیفیت سفر میری آرزو تھی کہ کوئی صاحب ایسے مل جائیں، جن سے ان کے سفر کی کیفیت تفصیلاً معلوم ہو جائے۔ اتفاقیہ ڈاکٹر رحمت علی مل گئے، جو ربع صدی سے بھی زیادہ مدت جلاوطنی میں گزار کر پاکستان آئے اور آج کل پنجاب یونیورسٹی میں فرانسیسی زبان کے پروفیسر ہیں۔ ان سے جو حالات سنے وہ اختصاراً ذیل میں درج ہیں:

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ کل طالب علم گیارہ تھے، چار میڈیکل کالج کے، دو ایم اے کے اور پانچ

بی اے کے۔ ان کے ساتھ بعض اور اصحاب بھی مل گئے تھے، جن کا ذکر موقع پر آئے گا۔

لاہور سے روانہ ہو کر یہ غیور نوجوان ہری پور پہنچے، جہاں کا سٹیشن ماسٹر مجاہدین کا خدمت گزار تھا اور اس نے ایک مکان صرف اسی غرض سے الگ لے رکھا تھا کہ آنے جانے والے مجاہدین یا ان کے قاصدوں کی خاطر تواضع کرتا رہے۔ چنانچہ ان سب کو اسی مکان میں ٹھہرایا، کھانا کھلایا۔ پھر سواری کا انتظام کر دیا اور یہ اصحاب دربند پہنچے، جو رئیس امب کا مرکز تھا۔

رئیس مذکور اگرچہ انگریزی حکومت کی مرضی کے خلاف کھلم کھلا کچھ نہ کر سکتا تھا، مگر مجاہدین کے تمام آدمیوں کو عزت و اکرام سے اپنے پاس ٹھہراتا تھا۔ وہاں نہایت پرتکلف کھانا کھلایا گیا۔ ایک رات دربند میں گزارنے کے بعد ان کے عبور کے لیے کشتی کا انتظام کر دیا گیا۔ دریائے اٹک سے پار ہوتے ہی آزاد علاقہ آ گیا۔ وہاں سب نے انگریزی حدود سے باہر نکلنے پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے عہد کیا کہ جب تک انگریزوں کو ہندوستان سے نکال نہ لیں گے، واپس نہ آئیں گے۔

مرکز مجاہدین

وہاں سے یہ لوگ پیادہ مرکز مجاہدین میں پہنچے۔ واضح رہے کہ تقریباً تمام طلبہ خاصے امیر گھرانوں کے چشم و چراغ تھے اور انھوں نے اپنی زندگی میں تکلیف و مشقت کا دور کبھی نہ دیکھا تھا لیکن جذبۂ آزادی و اسلامیت نے ہر مشقت بخوشی برداشت کر لینے پر آمادہ کر دیا۔ مرکز مجاہدین کی حالت دیکھ کر بظاہر ان پر کوئی اچھا اثر پڑنے کی امید نہ ہو سکتی تھی۔ وہ درویشوں کی آبادی تھی، جن کے پاس دنیوی ساز و سامان حقیقۃً کچھ نہ تھا، نہ توپیں، نہ اسلحہ کے کارخانے، نہ عالی شان بارکیں، نہ بڑے بڑے لشکر۔ مسکین لوگ ایک نصب العین کی عزت و احترام کا پرچم سنبھالے بیٹھے تھے۔ کھانا بہت معمولی، رہنا سہنا حد درجہ سادہ[1]۔ جہاں موقع مل جاتا دینی غیرت کی بنا پر جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر لڑنے کے لیے تیار رہتے۔ ڈاکٹر رحمت علی بتاتے ہیں کہ اگرچہ امیر مجاہدین بہت کہتے تھے، یہیں ٹھہر جائیے، لیکن ہمیں یقین

---

[1] ڈاکٹر رحمت علی نے بتایا کہ ایک مرتبہ ہمارے ایک ساتھی کو غسل کی ضرورت پڑی، اندھیرے میں اسے ایک دیگ ملی، اس نے سمجھا پانی ہے، لوٹے بھر بھر کر ڈالنے لگا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دیگ میں مجاہدین کے لیے دال پکائی گئی تھی۔

ہو چکا تھا کہ جو سروسامان مجاہدین کے پاس ہے، وہ انگریزوں سے جنگ کرنے اور انھیں شکست دینے کے لیے ہرگز قابلِ توجہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ لہٰذا ہمیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ سیدھے کابل جائیں اور امیرِ کابل سے مل کر اسلام کے نام پر اپیل کریں۔ وہ حرکت میں آجائے گا تو سرحدِ آزاد کا ایک ایک جانباز ساتھ ہوجائے گا اور ہندوستان کو آزاد کرا لینے کے دروازے کھل جائیں گے۔ امیرِ مجاہدین نے جب دیکھا کہ ہم رُکنے والے نہیں تو ایک رہبر ہمارے ساتھ کردیا جو ہمیں بہ حفاظت افغانستان لے گیا۔

جلال آباد یہ قافلہ جلال آباد پہنچا تو پولیس نے سب کو گھیرے میں لے لیا اور سرائے کی ایک کوٹھڑی میں بند کردیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سب کے لیے دو کوٹھڑیوں کا انتظام کردیا گیا۔ آخر وہاں کے گورنر سے ملاقات ہوئی۔ اس نے سمجھا کہ اگر ان لوگوں سے کوئی نامناسب سلوک ہوا اور افغانوں کو علم ہوگیا کہ یہ ہجرت کرکے آئے ہیں اور اسلامی ملک میں انھیں تکلیف دی جارہی ہے تو ہنگامہ بپا ہوجائے گا لہٰذا مصلحۃً سب کے لیے سواری اور باربرداری کی غرض سے یابوؤں کا انتظام کردیا۔ راستے کے لیے خرچ دے دیا۔ چودہ پندرہ سپاہی ساتھ کردیے اور حکم دے دیا کہ انھیں کابل لے جاؤ۔ اس طرح اگرچہ جلال آباد ہی سے اک گونہ نظربندی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، لیکن خود مہاجرین کو ایسا کوئی احساس نہ تھا اور کوئی تکلیف بھی پیش نہ آئی۔

کابل کابل پہنچے تو انھیں کوتوال کے بنگلے پر لے گئے۔ اس نے کہا کہ امیر صاحب کو آپ لوگوں کے آنے کی خبر ہے۔ اگر واپس جانا چاہو تو پورے آرام سے پہنچانے کا انتظام کردیا جائے گا۔ مہاجرین اس پر بگڑے اور کہا کہ ہمیں کسی ذریعے سے ترکی پہنچادو۔ جواب ملا کہ اس کی کوئی صورت نہیں، البتہ تمھیں اپنے پاس ٹھہراؤں گا۔ چنانچہ بنگلے ہی کے ایک حصے میں ٹھہرایا گیا، پہرے لگادیے گئے۔ اس وقت آشکارا ہوا کہ یہ آزادی نہیں قید ہے۔ ہر شخص کے لیے تیس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوگیا۔ انھوں نے کھانا پکانے کے سلسلے میں کام بانٹ لیے۔ کھانا پکتا، کھاتے اور بیٹھ رہتے۔ کبھی کبھی پولیس کے پہرے میں باہر بھی پھرایا جاتا۔ عین اس موقع پر سرحد کے طلبہ کی ایک جماعت بھی آگئی۔ وہ ہر جگہ یہی کہتی آئی تھی کہ جہاں ہم سے پہلے آنے والے لوگ جارہے ہیں، وہیں ہم بھی جائیں گے۔ چنانچہ انھیں بھی نظربند کردیا گیا۔

جب ترکی اور جرمنی کا وفد کابل پہنچا، مولانا برکت اللہ اور راجا مہندر پرتاپ وفد کے ساتھ آئے۔

ان کی سفارش پر پہرے اٹھا لیے گئے اور چلنے پھرنے کی آزادی مل گئی۔ یہی زمانہ ہے جس میں طلبہ کے مختلف وفود باہر کے ملکوں میں بھیجے گئے۔ تفصیل آگے بیان ہو گی۔ مشن ناکام واپس گیا تو پھر ان لوگوں کے لیے قید کا حکم ہو گیا۔ چنانچہ یہ ایک الگ مکان میں پہنچا دیے گئے، جس کے دروازے پر پہرے دار بیٹھے رہتے تھے۔ اب آپ ایک ایک کی داستان الگ الگ سنیں:

ڈاکٹر رحمت علی ڈاکٹر رحمت علی فرماتے ہیں کہ قید سے تنگ آ گیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو یہاں سے بھاگنا چاہیے۔ بھاگنے میں بڑی مصیبتیں تھیں، مکان کے دروازے پر ہر وقت پہرہ رہتا تھا۔ رات ہی کے وقت نکلنا ممکن تھا، لیکن اس زمانے میں نو بجے شب کو توپ چلتی تھی جس کے بعد کوئی شخص خاص اجازت نامے کے بغیر گھر سے باہر نہ پھر سکتا تھا۔ سوچ بچار کے بعد مولوی عبدالرزاق[1] کو ساتھی بنایا، یہ بھی ترکی جانے کے لیے مضطرب تھے۔ شہر کے کونے پہ ایک مسجد تھی، اسے ملاقات کا مقام مقرر کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے شب کے ساڑھے آٹھ بجے نکلنے کی ہمت کی۔ پہلے اپنی پوستین ایک رسّی میں باندھ کر طاقچے کے راستے نیچے گرائی جو ایک گلی میں کھلتا تھا، پھر خود نکلے اور توپ چلنے سے پیشتر مسجد میں پہنچے۔ وہاں عبدالرزاق صاحب نہ ملے۔ مسجد بند تھی، چنانچہ یہ شہر سے باہر نکل کر ایک ایسی مسجد میں جا پہنچے جو بے آباد تھی۔ پوستین اوڑھی اور ایک کونے میں ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

صبح کی نماز کے لیے توپ چلی تو یہ نماز ادا کر کے نکلے، بڑی سڑک پر پہنچے تو عبدالرزاق صاحب بھی مل گئے۔ انھوں نے رات پہلی مسجد میں گزاری تھی جس کے دروازے ملّا نے بند کر دیے تھے۔ دونوں نے اپنے آپ کو چمرکنڈ کے درویش قرار دیا جو ملا صاحب کے حکم سے بغرضِ زیارت مزار شریف جا رہے تھے۔ درۂ پنجشیر والا راستہ اختیار کیا جو بہت خطرناک تھا۔ راہداری کا ایک جعلی پروانہ تیار کر رکھا تھا، منزل بمنزل چلتے چلتے اور شدید موسم سرما کی مصیبتیں سہتے مزار شریف پہنچے۔ وہاں مجاہدین چمرکنڈ کا ایک محبّ موجود تھا، اس کے ذریعے سے بخارا جانے کا انتظام ہوا۔ بخارا میں بھی بڑی تکلیفیں پیش آئیں۔

ڈاکٹر رحمت علی نے چند سال روس میں بسر کیے، جہاں مولوی برکت اللہ کی توجہ سے ان کے لیے اچھا

---

[1] ان کے حالات پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

انتظام ہوگیا تھا، پھر یہ فرانس چلے گئے۔ وہاں بھی بے حد مشقتیں اٹھانی پڑیں۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کشایش کا انتظام کر دیا۔ فرانس ہی میں شادی کی، ان کے بچے وہیں تعلیم پا رہے ہیں ٭

قوموں کے لیے سرمایہ فخر ڈاکٹر صاحب کا قلب آج بھی آزادی اور اسلامیت کے انھیں مخلصانہ جذبات سے لبریز ہے، جو انھیں نوجوانی کے عالم میں وطن سے باہر لے گئے تھے اور جن کی وجہ سے انھوں نے عمر کا بڑا حصہ اجنبی ملکوں میں گزارا۔ جیسا کہ میں پہلے بارہا عرض کر چکا ہوں خدمتِ ملک و ملّت یا خدمت انسانیت کا راستہ بڑا ہی کٹھن ہے۔ جو لوگ وقتی جوش کی حالت میں یہ راستہ اختیار کر لیتے ہیں، وہ غیر معمولی آفات و حوادث پیش آنے پر عموماً متزلزل ہو جاتے ہیں، لیکن جو جوانمرد سوچ سمجھ کر اس میدان میں قدم رکھتے ہیں، انھیں مشکلات و موانع کبھی ہراساں نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھیے کہ کس طرح ہر آفت اور ہر حادثے کو مردانگی سے برداشت کیا۔ نہ ہمت ہاری، نہ وہ نصب العین چھوڑا جس کے لیے انھوں نے زندگی بسر کی تھی۔ ایسے ہی لوگ ملکوں اور قوموں کے لیے عزّت کا سرمایہ ہوتے ہیں اور انھیں کی بدولت زندگی کے ظلمت زار میں روشنی کی کرنیں جلوہ گر رہتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھی ہمارے لیے یقیناً فخر کا سامان ہیں ٭

عبدالرشید ان کے حالات پہلے بیان ہو چکے ہیں، انھوں نے یاغستان پہنچ کر اپنا نام "یوسف" رکھ لیا تھا۔ مولانا محمد بشیر انھیں کابل سے اپنے ہمراہ چمرکنڈ لے آئے تھے اور بیٹے کی طرح رکھتے تھے۔ غالباً یہ یاغستان کے ان دوروں میں بھی شریک رہے جو مولانا نے جا بجا مرکز قائم کرنے کے لیے اختیار کیے تھے۔ چمرکنڈ سے امیر نعمت اللہ نے انھیں اسمست بلا کر اپنا کاتبِ خاص اور معتمد مقرر کر لیا۔ صوفی عبداللہ کا بیان ہے کہ یہ چمرکنڈ کے امیر عبدالکریم قنوجی کے ہمراہ اسمست گئے تھے۔ کاتبِ خاص ہونے کے دوران میں یوسف پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ امیر نے انگریزوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی مفاہمت کر لی ہے، جس کی وجہ سے جماعت کی مجاہدانہ سرگرمیاں مختل ہو رہی ہیں۔ نیز ہندوستان سے جو روپیہ آتا تھا، وہ جماعتی کاموں میں صرف ہونے کے بجائے امیر کے ذاتی مصارف و مصالح کی نذر ہو جاتا تھا۔ اس وجہ سے مختلف اصحاب کے دل میں تکدّر پیدا ہو گیا تھا اور بعض پریشان و مایوس ہو کر واپس آ گئے

تھے۔ ان میں مولوی ولی محمد اور ان کے رفیق بھی تھے۔ یہ اطلاعات ہندوستان پہنچیں تو مختلف مرکزوں نے چندہ جمع کرنا چھوڑ دیا یا وہ رقمیں جمع کرتے تو اسمست کے بجائے جمرکنڈ بھیج دیتے۔ "یوسف" ان مصیبتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ طے کر لیا کہ امیر نعمت اللہ کو موت کے گھاٹ اتارے بغیر جماعت کا نظم و وقار قائم نہیں رہ سکتا اور اس کام کے لیے گنجایش پیدا نہیں ہو سکتی جو اس جماعت کا مقصد وحید تھا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، انھوں نے موقع پا کر امیر کو ختم کر دیا۔ پھر خود بھی اسی جگہ مارے گئے۔ جن اصحاب نے انھیں دیکھا تھا، وہ پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ یوسف بڑا ہی غیور، مخلص اور بہادر نوجوان تھا۔ مولانا محمد بشیر کی رائے بھی یہی تھی۔ وہ فرماتے تھے کہ شدید اشتعال کی حالت میں اس سے یہ حرکت سرزد ہوئی۔

محمد حسن | یہ ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں۔ سرحد پہنچ کر انھوں نے اپنا نام یعقوب رکھ لیا تھا اور اب تک اسی نام سے مشہور ہیں، پہلا نام بہت کم اصحاب کو معلوم ہے۔ وہ سرحد سے افغانستان پہنچے اور تمام مجاہدانہ سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے رہے۔ جب جرمن اور ترکی وفد نے خیری بے کو یاغستانی قبائل کی تنظیم پر مامور کیا تھا تو ہندوستانی کارکنوں میں سے مولوی یعقوب ہی کو خیری بے کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ یاغستانیوں میں سے جو لوگ انگریزوں کے زیر اثر تھے، انھوں نے خیری بے اور ان کی پارٹی پر حملے کرائے، پھر کھجوری میں انھیں خاصی دیر تک مخالفت کا ہدف بنائے رکھا۔ بہادر یعقوب نے تمام تکلیفوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا، پھر وہ کابل چلے گئے اور وہیں مقیم رہے۔ بچہ سقاؤ کے دورِ فساد میں بھی یعقوب نے افغانستان کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ وہ مرحوم نادر شاہ اور ان کے بھائیوں کے ہمراہ تھے۔ قبائل کی یہ حالت تھی کہ آج نادر کے ساتھ ہو جاتے اور دوسرے دن کوئی فضول و بے بنیاد عذر پیش کر کے مخالفوں کے ساتھی بن جاتے۔ مولوی یعقوب نے آخری وقت تک تحریکِ اصلاح کا ساتھ دیا اور جانبازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ کامیابی کے بعد انھیں دارالترجمہ میں کوئی عہدہ دے دیا گیا تھا۔ میں ۱۹۳۴ء میں ان سے ملا تھا تو دارالترجمہ ہی میں مامور تھے۔ حضرت شیخ الہند مرحوم کے ترجمہ قرآن اور تفسیری حواشی کا ترجمہ فارسی میں کرایا گیا تو مولوی یعقوب بھی اس کام میں معاون رہے۔

سُنا جاتا ہے کہ بعد میں ان کے متعلق حکومت افغانستان کو غلط فہمی پیدا ہو گئی، اب معلوم نہیں کس حال میں ہیں ؛

عبداللہ اور عبدالرحمٰن یہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ ان کے مجاہدانہ کارنامے بھی بڑے قابلِ قدر ہیں۔ مولوی عبدالرزاق نے مجھے بتایا ہے کہ عبداللہ کچھ مدت کابل میں گزارنے کے بعد چمرکنڈ آ گئے تھے اور جماعتی کاموں میں شریک رہے۔ اتفاق سے وہاں اختلافی صورت پیدا ہو گئی اور اسی میں وہ بیچارے موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اصل معاملے کی تفصیلی کیفیت واضح نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر رحمت علی فرماتے تھے کہ وہ جس زمانے میں یاغستانی قبائل کو منظم کر رہے تھے، کوئی جھگڑا پیدا ہوا اور اس میں شہید ہو گئے ؛

عبدالرحمٰن جب ساتھ گیا تو نوعمر تھا۔ اس نے بہ دستور اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ کچھ مدت کے لیے وہ چپ چاپ میانوالی کے ضلعے میں مقیم ہو گیا تھا۔ پھر افغانستان واپس چلا گیا۔ ایک مرتبہ وہاں کسی وجہ سے قید بھی ہو گیا تھا، رہائی کے بعد وہیں وفات پائی ؛

مولوی عبدالباری اور ڈاکٹر شجاع اللہ ہماری دستور ساز اسمبلی کے رکن مولوی عبدالباری بھی ان طلبہ میں شامل تھے جنھوں نے فروری ۱۹۱۵ء میں ہجرت کی تھی۔ کابل میں یہ مہاجر نوجوانوں کی جماعت کے صدر بن گئے تھے۔ جب ترکی اور جرمن مشن کابل پہنچا اور مولانا عبیداللہ نے اس کے ارکان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا تو مولوی عبدالباری ہی مولانا کے ترجمان کی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر حکومت موقتہ ہند (مقیم کابل) نے ایک وفد ترکی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے مولوی عبدالباری اور ڈاکٹر شجاع اللہ مقرر ہوئے اور یہ وفد ایران کے راستے ترکی روانہ ہوا۔ مولانا عبیداللہ نے اس کے لیے ایک سو پونڈ مولانا محمد بشیر سے قرض لیے تھے، جو بعد میں ادا کر دیے گئے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس وفد کو انگریزوں نے ایران میں گرفتار کر لیا اور دونوں صاحبوں کو لاہور لے آئے، یہاں ان سے حکومت موقتہ وغیرہ کے تمام حالات لکھوا لیے گئے اور انھیں کچھ عرصہ نظر بند رکھ کر رہا کر دیا ؛

ڈاکٹر شجاع اللہ شیخ عظیم اللہ کے بھائی تھے، افسوس کہ مدت ہوئی وہ فوت ہو چکے ہیں۔ مولوی عبدالباری نے مسلم لیگ کی تحریک میں جو کچھ کیا، اس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ آج کل وہ مجلس

دستور ساز پاکستان کے رکن ہیں ؀

عبدالقادر آزر | یہ گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے اور جب میں نے انھیں دیکھا تھا تو بڑے خوش پوش رہتے تھے۔ نظر بظاہر کسی کو احساس نہ ہو سکتا تھا کہ ہجرت اور جہاد کی بلا انگیزیوں کے لیے تیار ہو سکتے ہیں، تاہم جب کام کا وقت آیا تو انھیں آرام و راحت کی زندگی چھوڑ کر تکلیفوں اور مصیبتوں کے سیل رواں اختیار کرنے میں ایک لمحے کے لیے بھی تامل نہ ہوا۔ کابل سے حکومت موقتہ نے انھیں ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ جاپان بھیجا تھا اور افغانستان سے جاپان جانے کا محفوظ راستہ روس کے سوا کوئی نہ تھا۔ جونہی ڈاکٹر متھرا سنگھ اور عبدالقادر آزر نے سرحد روس میں قدم رکھا، حکومتِ روس نے انھیں گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ وہ لاہور لائے گئے۔ مولانا عبیداللہ کے بیان کے مطابق موصوف نے بھی مولوی عبدالباری کی تیار کردہ تحریر پر دستخط کر دیے[1]۔ کچھ دیر نظر بند رہ کر وہ بھی رہا ہو گئے۔ افسوس کہ انھوں نے جوانی ہی میں وفات پائی ؀

ڈاکٹر متھرا سنگھ بم کے ایک مقدمے کا مفرور تھا، اسے پھانسی کی سزا دی گئی[2] ؀

مہاجر طلبہ میں ایک عبدالحمید صاحب بھی تھے جنھیں ماسٹر عبدالحمید کہا جاتا تھا، وہ باہر مختلف قومی و وطنی سرگرمیوں میں شریک رہے، پھر واپس آ گئے تھے اب معلوم نہیں کہاں ہیں ؀

---

[1] کابل میں سات سال ص۴۳ ؀ [2] ایضاً ایضاً۔ مولوی محمد علی قصوری نے "مشاہدات کابل و یاغستان" میں ایک ڈاکٹر منگل سنگھ کا ذکر کیا ہے جس کا یہ نام اس وجہ سے رکھا گیا کہ وہ مولوی صاحب کے پاس منگل کے دن پہنچا تھا۔ میرے دل میں بار بار شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ڈاکٹر متھرا سنگھ ہی تھا۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بنگال کی دہشت پسند جماعت کا رکن تھا، اسے جرمنی بھیجنے کی تجویز تھی۔ روسیوں نے گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ جب پھانسی کی سزا کا حکم سنایا گیا تو اس نے مسکرا کر کہا کہ میری آخری تمنا پوری ہوئی۔ پھانسی کے وقت تک اس کا وزن بارہ پونڈ بڑھ گیا۔ سزا کے نفاذ کے وقت اس سے پوچھا گیا کہ کوئی خواہش ہو تو بتا دو۔ اس نے جواب دیا: میری آخری خواہش یہ ہے کہ میری موت انگریزی کفن میں آخری کیل ثابت ہو۔ غرض وہ بڑا ہی جری اور نڈر کارکن تھا (مشاہدات کابل و یاغستان ص۱۲۶-۱۲۸) راجا مہندر پرتاپ نے اس کا ایک نام شمشیر سنگھ لکھا ہے ؀

شیخ محمد ابراہیم | شیخ صاحب سندھ کے نومسلم تھے۔ حبیبیہ کالج کابل میں تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ مولوی محمد علی قصوری کے رفیق خاص تھے اور دونوں ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ مولانا عبیداللہ کابل پہنچے تو اس مکان سے قریب ہی ایک مکان کرایے پر لے لیا تھا اور شیخ محمد ابراہیم ہی کی وساطت سے مولانا ان لوگوں سے ملے جن کے لیے ان کے پاس تعارفی خطوط تھے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ان کا تمام اندوختہ ہمارے ہی کام میں صرف ہوا۔ مولوی محمد علی کے ساتھ انھیں بھی پروفیسری سے علیحدہ ہونا پڑا تھا اور یہ یاغستان چلے آئے تھے اور پشتو سیکھ کر لوگوں کو قرآن شریف کی تعلیم دیتے رہے[1]۔

مولوی محمد علی قصوری لکھتے ہیں کہ شیخ محمد ابراہیم کو دو اور رفیقوں کے ہمراہ ایران کے راستے ترکی بھیجا گیا تھا، مگر افسوس کہ وہ راستے ہی میں شہید کر دیے گئے۔ ان کے صحیح حالات ہم تک نہ پہنچ سکے کیوں کہ ان کے دونوں ساتھی بھی شہید کر دیے گئے تھے[2]۔ مولانا عبیداللہ فرماتے ہیں کہ شیخ محمد ابراہیم نے افغانستان سے گزر کر روس پہنچنے کی کوشش کی، لیکن افغانستان کے ایک گاؤں میں فوت ہو گئے:

> شبہہ کیا جاتا ہے کہ ڈاکو یاغستان سے ان کے ساتھ تھا۔ اس نے شیخ صاحب کو شہید کر دیا۔ آخری وقت میں شیخ محمد ابراہیم نے اپنے دوسرے ساتھی کو ایک خط لکھ دیا، وہ میں نے پڑھا ہے۔ اس کے ایک لفظ سے شبہہ ہوتا ہے کہ شیخ صاحب سمجھانا چاہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے وہ ڈاکو نہ ہو بلکہ انگریزوں کا کارندہ ہو[3]۔

---

[1] کابل میں سات سال ص ۳۷، ۶۵، ۷۴۔

[2] مشاہدات کابل و یاغستان ص ۱۲۸ - ۱۲۹۔

[3] کابل میں سات سال ص ۷۴۔

آٹھواں باب

اسلامیّت کے جواہر پارے

(۴)

سردار عبدالمجید خاں ڈاکٹر رحمت علی نے بتایا کہ یہ غالباً میانوالی کی طرف کے تھے۔ مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔ مولوی عبدالرزاق کے قول کے مطابق مہاجر طلبہ نے انھیں اپنا سردار بنالیا تھا۔ انھوں نے اسیری کی تکلیفیں بڑے صبر سے برداشت کیں اور غالباً ۲۶۔ جمادی الاخری ۱۳۳۵ھ (۱۹۔ اپریل ۱۹۱۷ء) کو کابل میں وفات پائی۔ مولوی عبدالرزاق نے بتایا کہ سردار مرحوم کے رفیق عبدالقادر آزر نے ان کے لوحِ مزار کے لیے ایک قطعہ کہا تھا، جس کے صرف دو شعر یاد رہ گئے:

آہ! عبدالمجید خاں مرحوم — کرد ہجرت زہند بہرِ غزا
بست و ششم جمادی الثانی — گشت راحل بسوے دارِ بقا[1]

میر ظفر حسن یہ کرنال کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے نہایت قابل طلبہ میں شمار ہوتے تھے اور ریاضی میں خصوصاً انھیں خاص کمال حاصل تھا۔ ہجرت کے بعد سمست ہوتے ہوے کابل گئے۔ وہاں ابتدا میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تکلیفیں اٹھائیں، لیکن ان اربابِ عزیمت میں سے تھے جو مشکلات کے ہجوم اور مصائب و نوازل کے تواتر کی بنا پر اپنا سوچا سمجھا ہوا راستہ بدلنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوے۔ نادر شاہ مرحوم کے خاندان سے بہت اچھے روابط پیدا ہو گئے تھے اور حق یہ ہے کہ یہاں سے جتنے اصحاب ہجرت کرکے کابل گئے، ان میں سے جس جس کو راحت و آسایش کی چند ساعتیں

[1] آخری شعر کے غیر موزوں ہونے سے بحث نہیں، یہ اشعار صرف بطور یادگار درج کیے جا رہے ہیں۔

نصیب ہوئیں، ان میں سب سے زیادہ حصہ اسی خاندان کی توجہات و مساعی کا تھا۔

قیامِ کابل کے دوران میں میر ظفر حسن ہر اس تحریک میں شریک رہے، جو ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے جاری ہوئی۔ افغانستان کی جنگِ استقلال میں امیر امان اللہ خاں نے نادر شاہ مرحوم کو خوست کے محاذ پر بھیجا۔ مرحوم کے بھائیوں میں سے سردار شاہ ولی خاں اور سردار شاہ محمود خاں ساتھ تھے۔ منظم اور قواعد دان فوجیں بہترین ساز و سامان کے ساتھ اس سے پیشتر ڈکا اور چمن کے محاذوں پر بھیجی جا چکی تھیں، اس لیے کہ امان اللّٰہی دور کے آغاز میں نادر شاہ مرحوم اور ان کا خاندان زیرِ عتاب تھا۔ جب حالات نے ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانا ناگزیر بنا دیا تو نہ تربیت یافتہ افسر باقی تھے اور نہ اچھا سامان، لیکن نادر شاہ خدا کا نام لے کر غیر قواعد دان اور غیر منظم لشکر ہی کے ساتھ حفاظت وطن کا فرض انجام دینے کے لیے نکل پڑے۔ میر ظفر حسن دیرینہ تعلقات کی بنا پر ان کے ساتھ ہو گئے۔

قابلِ فخر کام اس فوج کے ساتھ صرف چند توپیں تھیں، لیکن ماہر توپچی کوئی نہ تھا۔ توپ چلانا بھی خاصی مہارت کا کام تھا، لیکن اس سے بدرجہا زیادہ یہ ضروری تھا کہ توپوں کی شست ٹھیک رہتی تاکہ گولے نشانے پر بیٹھتے۔ یہ کام اسی صورت میں بطریقِ حسن انجام پا سکتا تھا کہ فاصلے کا اندازہ کر کے توپ کا زاویہ درست کر دیا جاتا۔ اس موقعے پر میر ظفر حسن کی ریاضی دانی بے حد کارگر ثابت ہوئی۔ وہ فاصلے کا حساب کر کے بتا دیتے کہ کون سا زاویہ رکھنا چاہیے اور اسی کے مطابق گولے برسائے جاتے۔ سب سے پہلا گولہ نادر شاہ مرحوم نے خود پھینکا۔ ٹل کی فتح اسی کارنامے کا نتیجہ تھی۔ اصل کارنامہ نادر شاہ مرحوم کا تھا لیکن میر ظفر حسن بھی اس میں شریک تھے۔ اسی فتح کے بعد متارکے کا فیصلہ ہوا۔ بعد ازاں شرائطِ صلح طے ہوئیں، جن کے مطابق افغانستان کی خارجہ پالیسی مدت مدید کے بعد آزاد ہوئی اور ملک کو استقلال ملا۔

مولانا عبید اللہ مرحوم فرماتے ہیں کہ ٹل کے محاذ پر میر ظفر حسن کے کارنامے بہت زیادہ تحسین کے قابل سمجھے گئے:

> سلطنتِ افغانیہ اسے (میر ظفر حسن کو) برائے نام خدمت کرنے پر مقررہ تنخواہ دیتی رہی، جس سے ہمارے کئی ہندوستانی بھائی گزارا کرتے رہے[1]۔

[1] کابل میں سات سال ص۶۸۔

مطلب یہ کہ اصل تنخواہ جنگِ ٹل کی خدمات جلیلہ کے صلے میں مقرر ہوئی تھی، لیکن ان سے ایک برائے نام خدمت بھی متعلق کر دی گئی تھی۔ میر ظفر حسن کی شانِ ایثار ملاحظہ ہو کہ اس تنخواہ میں سے صرف تھوڑی سی رقم اپنے گزارے کے لیے رکھ لیتے اور باقی رقم رفیقوں کے حوالے کر دیتے، جن کے گزارے کی کوئی صورت نہ تھی یا جو کچھ وہ کماتے تھے، تمام ضروریات کے لیے کفایت نہ کرتا تھا۔

افغانستان سے ترکی جب افغانستان میں حالات ناسازگار ہو گئے تو میر ظفر حسن بھی مولانا عبید اللہ کے ہمراہ وہاں سے نکلے۔ وہ روس ہی جا سکتے تھے، چنانچہ ادھر ہی کا رخ کر لیا۔ مولانا کے ایک اور رفیق ڈاکٹر خوشی محمد عرف محمد علی تھے، وہ پہلے بھی روس کا سفر کر چکے تھے اور کمیونسٹ بن گئے تھے۔ روس پہنچنے کے بعد ڈاکٹر خوشی محمد نے ایسی باتیں شروع کر دیں، جن کا مطلب یہ تھا کہ کمیونزم کی غیر مشروط تائید کے بغیر کام نہ چل سکے گا۔ مولانا کے لیے یہ مشکل پیش آئی کہ ان کا انحصار زیادہ تر ڈاکٹر خوشی محمد پر تھا اور اس کے بغیر موصوف کے لیے گزارے کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ میر ظفر حسن نے اپنی تنخواہ میں سے باون پونڈ کی رقم بچا رکھی تھی۔ وہ بے توقف مولانا کے حوالے کر دی تاکہ اسے اپنے صرف میں لائیں اور روزمرہ کی ضروریات سے بے پروا ہو کر ارکانِ حکومت سے آزادانہ گفتگو کریں۔ اس سے میر ظفر حسن کی عالی ہمتی، بلند نگاہی اور اصول پروری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کتنی مدت روس میں ٹھہرے۔ وہاں سے ترکی پہنچ گئے اور استنبول کے جنگی کالج میں تعلیم پا کر ترکی فوج میں معزز عہدے پر مامور ہوئے۔ پھر وہ جنگی کالج میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ترکی ہی میں شادی کی اور ظفر حسن ایبک مشہور ہوئے۔ اب پنشن لے چکے ہیں اور استنبول میں مقیم ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں دو تین مہینے کے لیے یہاں بھی آئے تھے، گویا چونتیس سال کے بعد انھوں نے اپنا وطن دوبارہ دیکھا اور وہ اس حال میں کہ ان کے تمام اقربا اصل وطن سے ہجرت کر کے پاکستان آ چکے تھے۔

جنگی خدمات کے علاوہ انھوں نے علمی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مولانا شبلی کی شہرۂ آفاق سیرت النبیؐ کو انھوں نے ترکی زبان میں منتقل کیا۔ اس قسم کے جامع اوصاف آدمی بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔

کابل میں ایک صحبت میں ۱۹۳۴ء میں کابل گیا تھا تو میر ظفر حسن کابل آئے ہوئے تھے۔ نادر شاہ مرحوم نے تخت نشینی کے بعد فوجی تعلیم کا انتظام از سرِ نو اعلیٰ پیمانے پر کیا تو ترکی حکومت سے چند افسروں کی خدمات مستعار لی تھیں، ان میں میر ظفر حسن کو بہ طورِ خاص بلوایا تھا۔ انھیں میرے متعلق علم ہوا تو بے تکلف آئے اور بڑی دیر تک خفگی آمیز باتیں کرتے رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں نے جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی، اس میں کانگرس سے کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ اصل معاملہ آیندہ کے نظام حکومت کا تھا۔ مسلمان ایسے تحفظات چاہتے تھے جن میں ان کی مستقل حیثیت محفوظ ہو سکے۔ اس پالیسی کے اسباب و تفصیلات سے باہر کے بھائی پوری طرح آگاہ نہ تھے اور ان کا احساس یہ تھا کہ مسلمان ہندوستان کی آزادی میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں۔ میر ظفر حسن کی خفگی کا سبب یہی تھا۔ میں نے عرض کیا کہ اس طرح تو ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ پہلے مجھ سے سنیے کہ حالات کیا ہیں، مسلمانوں کے مطالبات کیا ہیں اور جو کشمکش جاری ہے، اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے بعد جو رائے عالی ہو، اسے توجّہ سے سنوں گا اور اگر ہم لوگوں سے کوئی غلطی سرزد ہو رہی ہے تو اس کی تلافی میں تامّل نہ ہوگا۔

اس کے بعد ایک مرتبہ خود ان کے بنگلے پر اجتماع ہوا، جس میں مولانا محمد بشیر، ڈاکٹر نور محمد، مولوی عبدالرزاق، مولوی یعقوب اور بعض دوسرے احباب شریک تھے۔ دوسری مرتبہ ڈاکٹر نور محمد کے بنگلے پر بارہ بجے دوپہر سے رات کے بارہ بجے تک مسلسل گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ اور موقف تفصیل سے واضح کر دیا تو میر ظفر حسن نے فرمایا کہ ہمیں قومی مصالح میں خلل ڈالنے کا خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جو کچھ ضروری ہو کرو تاہم آزادی کی تحریک کو زیادہ سے زیادہ تقویت پہنچاؤ۔

اس دلکشا صحبت کی یاد اب تک ذہن میں تازہ ہے۔ میر ظفر حسن جب پاکستان آئے تو آرزو تھی کہ پھر ان سے اسی طرح بات چیت کا موقع مل جائے، لیکن وہ زیادہ وقت نکال نہ سکے، صرف دو گھنٹے کے لیے غریب خانہ کو مشرف فرمایا۔

سردار اللہ نواز خاں یہ ملتان کے ایک امیر گھرانے کے فرزند ہیں۔ کابل پہنچنے کے بعد

یہ بھی نادر شاہ مرحوم کے خاندان سے بہ طور وابستہ ہو گئے تھے۔ کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ انھوں نے پہلے کیا کیا کارنامے انجام دیے۔ راجا مہندر پرتاپ نے لکھا ہے کہ حکومت موقتہ میں انھیں سیکرٹری کا عہدہ دیا گیا تھا۔ بچہ سقاؤ کے دورِ اقتدار میں نادر شاہ مرحوم نے افغانستان کو فوضویت کے بحران سے نجات دلانے کے لیے جہاد شروع کیا تھا تو بڑی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہی وزیریوں کے اس لشکر کو تیار کر کے لے گئے تھے جس نے سردار شاہ ولی خاں اور سردار شاہ محمود خاں کی سرکردگی میں براہِ راست کابل پر پیش قدمی کی اور اسے فتح کر کے بچہ سقاؤ کا اقتدار ختم کیا۔ نادر شاہ مرحوم کو قوم نے بادشاہ منتخب کر لیا تو سردار اللہ نواز خاں کو دربار افغانستان کی طرف سے جرمنی میں سفیر مقرر کر دیا گیا۔

"ریشمی خط" سردار اللہ نواز خاں کا ایک بھائی محمد نواز خاں بھی ساتھ گیا تھا لیکن وہ جلد واپس آ گیا۔ شیخ عبدالحق سردار اللہ نواز خاں ہی کے خاندان کا ملازم تھا، جس کے ہاتھ مولانا عبیداللہ مرحوم نے ایک خط ریشمی پارچے پر لکھ کر حضرت شیخ الہند مرحوم کے پاس مکہ معظمہ بھیجنا چاہا تھا۔ شیخ عبدالحق کو تاکید کی تھی کہ یہ خط شیخ عبدالرحیم سندھی کو پہنچا دیا جائے۔ انھیں لکھ دیا تھا کہ وہ اسے خود شیخ الہند کے پاس حجاز لے جائیں یا کسی معتبر آدمی کے ہاتھ بھیج دیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

> اس اللہ کے بندے نے وہ خطوط اللہ نواز خاں کے والد خان بہادر رب نواز خاں کو دیے۔ خان صاحب نے وہ سر مائیکل اوڈوائر کو پہنچا دیے۔ اس کے بعد کے واقعات مشہور ہیں۔ ہندوستان میں گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ ہم حیران رہ گئے۔ چند روز کے بعد حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقا مکہ معظمہ سے گرفتار ہوئے۔ ایک عرصے کے بعد ہمیں حقیقت معلوم ہوئی۔ یہ واقعات ہمارے لیے موت سے زیادہ ناگوار تھے[۱]۔

ڈاکٹر خوشی محمد مولانا عبیداللہ مرحوم کے بیان کے مطابق یہ ضلع جالندھر کے تھے۔ میڈیکل کالج لاہور میں دو سال سے زیادہ تعلیم پا چکے تھے۔ دل مذہبی جذبات سے لبریز تھا۔ ہجرت کے بعد کابل

---

[۱] کابل میں سات سال ص۷۶۔

میں رفیقوں کے ہمراہ قید کی تکلیفیں اٹھائیں۔ قیام کابل کے دوران میں مولانا عبیداللہ سے وابستگی پیدا ہوئی۔ انھیں حکومت موقتہ میں سکرٹری بنادیا گیا تھا۔ جب حکومت موقتہ (مقیم کابل) کی طرف سے ایک وفد روس بھیجنے کا فیصلہ ہوا تو راجا مہندر پرتاپ چاہتے تھے کہ ڈاکٹر متھرا سنگھ کو بھیجا جائے، جو مقدمہ بم کا مفرور تھا اور اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مولانا عبیداللہ نے اصرار کیا کہ ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ ایک مسلمان نوجوان کو بھی جانا چاہیے تاکہ وفد کی حیثیت میں جامعیت پیدا ہو جائے اور سمجھا جائے کہ یہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں کا نمایندہ ہے۔ یہ مسئلہ سردار نصراللہ خاں نائب السلطنت کے سامنے پیش ہوا تو اس نے فریقین کے دلائل سن کر مولانا عبیداللہ کی تجویز منظور کر لی۔ چنانچہ ڈاکٹر خوشی محمد کو ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ بھیجا گیا اور ان کا نام "میرزا محمد علی" رکھا گیا۔

روس میں کام

ڈاکٹر متھرا سنگھ کے لیے راجا مہندر پرتاپ نے خرچ کا انتظام کر دیا، ڈاکٹر خوشی محمد کے مصارف سفر کے لیے مولانا عبیداللہ نے مولوی محمد علی قصوری سے ذکر کیا اور انھوں نے دو مہینے کی تنخواہ پیشگی حاصل کر کے مولانا کی نذر کر دی۔ ان کے ساتھ دو خادم بھی گئے۔ ایک مسلمان اور دوسرا کابلی سکھ۔ وفد تاشقند پہنچا تو زار کی طرف سے حکم آیا کہ ارکان کو گرفتار کر لیا جائے۔ تاشقند کے گورنر نے مداخلت کر کے انھیں قید سے بچایا اور یہ لوگ واپس آگئے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> یہ مشن بیکار ثابت نہیں ہوا، روسی و انگریزی اتحاد میں یہ کسی قدر مشکلات پیدا کر سکا، جن کی تلافی کے لیے لارڈ کچنر کو خود سفر کرنا پڑا۔ روسی انقلابیوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا، جس کا نام (روسی زبان میں) ہے "سونے کی پٹڑی" (یہ سونے کی پٹڑی پر کندہ کرایا گیا تھا) اس میں مشن کے متعلق خط و کتابت مذکور ہے[۱]۔

مولانا لکھتے ہیں کہ یہ وفد واپس آیا اور سردار نصراللہ خاں نے تفصیلات سفر معلوم کرنی چاہیں تو ڈاکٹر متھرا سنگھ ہر سوال کے جواب میں یہی کہتا: بہ خیر رفتیم و بہ خیر آمدیم (ہم خیریت سے گئے اور

---

[۱] کابل میں سات سال صفحہ ۶۹۔

خیریت سے آئے) ڈاکٹر خوشی محمد عرف میرزا محمد علی نے تخلیے میں یادداشتوں کی کتاب جیب سے نکالی اور مفصّل حالات سفر کے علاوہ مختلف لوگوں سے بات چیت کا خلاصہ بھی پیش کر دیا[1]۔

بعد کے حالات پھر ڈاکٹر خوشی محمد نے کچھ مدت کابل میں گزاری۔ جب مولانا نے روس جانے کا فیصلہ کیا تو ڈاکٹر خوشی محمد ساتھ تھے اور انھوں نے احمد حسن نام اختیار کر لیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہی سفر میں ان پر کمیونزم کا خاصا اثر ہو چکا تھا۔ دوسری مرتبہ روس پہنچے تو باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بن گئے۔ راجا مہندر پرتاپ لکھتے ہیں کہ انھیں تھرڈ انٹرنیشنل میں ایک اہم عہدہ مل گیا تھا[2]۔ مولانا روس سے ترکی ہوتے ہوئے حجاز پہنچ گئے، احمد حسن ماسکو ہی میں مقیم رہے۔ غالباً شادی بھی وہیں کر لی تھی۔ میری اخبار نویسی کے ابتدائی دَور میں ان کی طرف سے انگریزی میں ٹائپ شدہ بیانات وقتاً فوقتاً آیا کرتے تھے، جن میں کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیاں درج ہوتی تھیں اور بعض بین الاقوامی مسائل پر تبصرہ کیا جاتا تھا، پھر یہ سلسلہ مسدود ہو گیا۔ مولوی عبدالرزاق نے مجھے بتایا کہ ۱۹۳۴ء میں وہ کمیونسٹ پارٹی کی داخلی کشمکش کے سلسلے میں گرفتار ہوئے اور برسرِ اقتدار گروہ نے دوسرے ممتاز کمیونسٹوں کے ساتھ انھیں بھی موت کی سزا دے دی۔ سٹالین نے مختلف اوقات میں اپنے مخالفوں کا صفایا کرنے کے جو اقدامات کیے، انھیں میں سے ایک اقدام میں ہمارے اس بلند پایہ مجاہد کی جان بھی گئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

---

[1] کابل میں سات سال ص۵۵۔

[2] میری کہانی، حیات انگریزی ص۵۲۔

ضمیمہ

خواجہ اللہ دتا اور خواجہ عبدالعزیز

جماعت مجاہدین کے معاونوں اور کارکنوں میں سے جن جن کے حالات معلوم ہو سکے، بیان کر دیے گئے۔ مجھے یقین ہے کہ معاونوں کی تعداد ان سے بدرجہا زیادہ ہوگی، لیکن ان سب کے حالات یا نام معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ میسر نہ آسکا۔ بعض دوستوں نے اپنے اپنے دائرے میں بڑی سعی فرمائی، جن میں سے مولوی محمد اسحاق صاحب مدیر "الاعتصام" کا ذکر ایک سے زیادہ مرتبہ آچکا ہے۔ جن دو بزرگوں کے نام زیب عنوان ہیں، ان کے حالات بھی موصوف ہی نے خواجہ عبدالعزیز کے صاحبزادے خواجہ محمد یوسف سے لکھوائے ۔

خواجہ عبدالعزیز اکونٹنٹ جنرل کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ۱۹۴۳ء میں پنشن لی لیکن ۱۹۴۶ء میں دوبارہ ملازمت کر لی۔ ۱۹۴۷-۴۸ء میں ریاست قلات کے فنانشل سکرٹری تھے ۔ ترسٹھ سال کی عمر پاکر ۱۶- جون ۱۹۵۲ء کو وفات پائی ۔

خواجہ عبدالعزیز کے والد خواجہ اللہ دتا ریل کے محکمے میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ میرا خیال ہے کہ جماعت مجاہدین سے تعلق خواجہ اللہ دتا نے پیدا کیا، پھر یہ میراث خود خواجہ عبدالعزیز نے سنبھال لی۔ خواجہ صاحب، ان کے والد اور والدہ کے سوا کسی کو اس تعلق کا علم نہ ہو سکا اور یہ تینوں بے حد ضابط، دور اندیش اور محتاط تھے ۔

مولوی فضل الٰہی وزیر آبادی سے ان کا تعلق بہت گہرا تھا۔ خود مولوی صاحب موصوف نے سنایا کہ ۱۹۱۹ء میں ہجرت کر کے گھر سے نکلا تو قدم قدم پر گرفتاری کا اندیشہ تھا۔ پشاور پہنچا تو کوئی ایسا آدمی نظر نہ آیا جو مجھے پناہ دیتا۔ خواجہ عبدالعزیز ان دنوں پشاور میں تھے، رات کے وقت ان کے پاس پہنچا اور پورے حالات بیان کر دیے۔ انھوں نے بے تکلف ٹھہرا لیا۔ دفتر جاتے تو باہر سے قفل لگا جاتے، واپس آتے تو دن بھر کے حالات سُنا دیتے۔

کئی روز کے بعد مختلف لوگوں سے مل ملا کر رات کے وقت مجھے سرحد سے پار کر دیا۔ وہ سرکاری ملازم تھے، راز کھل جاتا تو ملازمت بھی جاتی اور اسیر بھی ہوتے، تاہم کوئی خطرہ انھیں قومی فرض سے روک نہ سکا۔

ایک واقعہ خود خواجہ صاحب نے سنایا کہ ۱۹۱۷ء میں ہم کوچہ بلوچاں مزنگ، لاہور میں رہتے تھے، جماعت مجاہدین کے چند کارکن قومی سرمایے کے پونڈ والد کے حوالے کر گئے۔ ان میں سے ایک پکڑا گیا اور خدا جانے پولیس نے کس تدبیر سے کام لیا کہ اس بیچارے نے پونڈوں کی مقدار بھی بتا دی اور ہمارے گھر کا پتا بھی دے دیا۔ چنانچہ پولیس ہمارے گھر پہنچی اور پوچھا تو ہم نے انکار کر دیا۔ والد کو لائے اور اس کارکن کا سامنا کرا دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ میں اس شخص کو جانتا ہی نہیں۔ پھر کہا گیا کہ اچھا آپ باہر کھڑے ہو کر گھر میں آواز دیں کہ اتنے پونڈ کی جو رقم میں نے کل رکھوائی تھی، وہ دے دی جائے، حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔ والد نے یہ بھی کیا لیکن والدہ نے کہلا بھیجا کہ آپ نے کبھی پونڈ مجھے نہیں دیے۔ آخر تلاشی کی گئی، لیکن جس ڈبے میں پونڈ رکھے ہوئے تھے، ہماری خوش نصیبی سے پولیس نے کھول کر ہی نہ دیکھا۔ اس طرح ہم محفوظ ہو گئے۔

خدا جانے انھیں زندگی میں ایسے خطرات کتنی مرتبہ قبول کرنے پڑے، لیکن مجاہدین کی اعانت کا کام بدستور جاری رکھا۔ ان کے پاس جماعت کے آدمی برابر آتے رہتے تھے۔

نذرِ شہیدانِ بالاکوٹ

یہ نظم جناب فضل احمد کریم صاحب فضلی سکریٹری (حکومت پاکستان) نے زیارت بالاکوٹ کے وقت کہی تھی، جسے "جماعت مجاہدین" میں شائع ہونا چاہیے تھا یہ کہیں کاغذات میں گم ہوگئی اب بہ طور یادگار یہاں شائع کی جاتی ہے:

مجاہدانِ صف شکن بڑھے جو نذرِ جاں لیے
تو موت باادب بڑھی حیاتِ جاوداں لیے
یہ وہ ہیں جن کے عمر بھر قدم نہ ڈگمگا سکے
مصیبتوں نے بارہا ہزار امتحاں لیے
یہ سخت کوش و سخت جاں عجب پیام دے گئے
کہ زندگی ہے بامزہ اگر ہے تلخیاں لیے
جلال بھی جمال بھی عجیب ان کی شان ہے
نظر میں بجلیاں لیے، نفس میں گلستاں لیے
جہاں بھی سر جھکا دیا وہیں پہ عرش آگیا
یہ سجدۂ شہید ہے جبیں میں آستاں لیے
یہ سیّدِ شہیدؒ یہ مجاہدان ہمسفر
کہ جیسے ماہتاب ہو جلو میں کہکشاں لیے
مجاہدانِ باصفا کی پیشوائی کے لیے
ملائکہ اُتر رہے ہیں مژدۂ جناں لیے

عقیدت و خلوص کے یہ چند پھول نذر ہیں
کھڑا ہے فضلیِ حزیں حقیر ارمغاں لیے